راہِ رواں
بانو قدسیہ

راہِ رواں

راہِ رواں

بانو قدسیہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.5 Bano Qudsia
Raah-e-Rawaan / Bano Qudsia.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2011.
636 + 55pp. : with pictures.
1. Urdu Literature - Biography.
I. Title.

2011

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2315-6
ISBN-13: 978-969-35-2315-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انیق — انیس — اثیر احمد کے نام

گھر سے گھر تک

(آغازِ کتاب)

آج کل کے بچے جگ سو پزل کا مشغلہ بڑی دلچسپی' انہماک' جوش و خروش اور خوش اوقاتی سے اپناتے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی تصویر کا ماسٹر پلان موجود ہوتا ہے۔ پھر اس منظر کو دیکھ دیکھ کر وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو اس سلیقے سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ہو بہو عین مین ٹکڑیوں کا منظر ماسٹر پلان کا منظر بن جاتا ہے اور وہ اس طرح کی کامیابی پر اپنے آپ کو پروبلم حل کرنے والی کسی بڑی شخصیت جیسا اہم محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جب بھی کوئی سوانح نگار بائیوگرافی لکھتا ہے یا کسی شخص کی زندگی کی جگ سو پزل تیار کرتا ہے تو اُسے بہت سی ٹکڑیاں غائب ملتی ہیں۔ پورا ڈیٹا نہ ہونے کے باعث نہ کوئی تیار شدہ ماسٹر پلان ہوتا ہے نہ کوئی روڈ میپ ہی' جس پر چل کر ہم اُس کی بلا دنگاری کر سکیں۔ تاریخ اور سوانح نگاری کے لیے عموماً ڈائریاں تلاش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کے انٹرویو' صاحب ذکر کی کتابیں' موصوف کے خاندان کے لوگوں سے ''سی آئی اے'' قسم کی چھان بین' ملازموں کی جانچ پڑتال کام آتی ہیں' لیکن بائیوگرافی پھر بھی نامکمل' حواشی کی محتاج اور صورت گری کے دھندلے پن میں منتج ہوتی ہے۔ پورا انسان اپنی قلبی' روحانی' نفسیاتی' ذہنی زندگی کو اپنے ساتھ ہی لے کر رخصت ہو جاتا ہے.... اُس کی پہیلی کا راز اب صرف روزِ قیامت ہی کھل سکتا ہے۔

میں نے بھی ایک معمولی سی کوشش خاں صاحب کو آپ سے روشناس کرانے کی خاطر کی ہے۔

ساتھ رہتے ہوئے بھی خاں صاحب ہر انسان کی طرح میرے لیے مانوس اجنبی تھے۔ میں انہیں کالج میں ملی۔ پھر ہم نے گھر بسایا۔ کرائے کے مکان بدلے اور آخری مرحلے میں اپنا گھر 121- سی' ماڈل ٹاؤن میں بنا لیا۔ جہاں سے وہ اپنے اصلی گھر کو روانہ ہو گئے۔ یہ گھر اُن کی رخصتی کے بعد گھر نہ رہا' شہرت مابعد کا خزینہ بن گیا۔

میں بھی اپنے طور پر اُن کی مہربانیوں' شفقت اور شاگردی کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن میں تحقیقی متجسس مین میخ نکالنے والی نہیں ہوں۔ میں عموماً سنی سنائی پر ایمان لے آتی ہوں۔ میں سرہنگ زادوں کی طرح حکم مان کر اُٹھ نکلتی ہوں'

لیکن کسی جہادی کی طرح ایمان کی قوت میرے ہمراہ نہیں ہوتی بلکہ صرف کر گزرنے کا جذبہ ساتھ رہتا ہے۔ ایسی مہم پر ماسٹر پلان کے بغیر نکلنا عموماً فیروزمندی کا موجب نہیں ہوتا۔

پھر بھی ''ہر کسے را بہ ہمت او ست'' کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے قلم اُٹھا لیا ہے۔ منظر کشی کے لیے میرے پاس خاں صاحب تک ترسیل کے کئی ذرائع تھے۔

ایک ذریعہ گھر تھا جہاں ہم دونوں نے بسیرا کیا۔ اسے خاں صاحب نے ہمیشہ کبوتر کی کا بک سمجھا کہ اُڑتے اور ہر اُڑان کے بعد اپنی اپنی کا بک ہی راس آتی۔ دوسرے میرے پاس حسن اتفاق سے وہ یادداشتیں جو ساتھ رہنے کے باعث میسر آئیں، موجود ہیں۔

اُن کے اندر کے موسم کے ساتھ ساتھ بیرونی اطلاعات بھی تھیں۔ شہروں کی نقشہ نویسی، اپنی نقل و حرکت، کام کی وابستگی، ذمہ داری کی تفصیلات بھی میسر آتی رہتی تھیں۔ میں نے پورا سال یہ سوچنے میں بسر کیا کہ کیا مجھے خاں صاحب کو بے نقاب کرنے کا حق ہے؟ کیا خاں صاحب اس بے تکلفی اور نقاب کشائی پر برافروختہ نہ ہوں گے؟ کیا ان کو آپ کے سپرد کرنے کی اصل وجہ خودستائی تو نہیں؟ کیا میں اس غلطی کی مرتکب تو نہیں کہ یہ قدم میں نے اپنی شخصیت کا تاج محل بنانے کی خاطر اٹھایا ہے؟

سال بھر سوچنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ آپ کے ساتھ اپنے ہم سفر کو کسی باغ کی اکیلی بینچ پر بیٹھ کر یاد کروں۔ اوپر سے خزاں دیدہ پتے درخت سے گریں، ہوا میں نومبر کے مہینے کی خنکی ہو..... دُور لان میں میرے بچوں کا بچپن آپ کو نظر آئے، آخری فوارے کے کنارے بیٹھے آپ کو خاں صاحب کے دوستوں کا جھرمٹ دکھائی دے..... ہولے ہولے شام کی سرخی غائب ہو جائے، پرندے گھروں کو لوٹ جائیں اور اندھیرے میں کسی گوشے سے خاں صاحب آگے بڑھیں اور مجھے میری غلطیوں سمیت اپنے گھر اپنی کا بک میں واپس لے جائیں۔

یہاں ایک اندیشہ اور بھی اُبھرتا ہے جو مجھے ان یادداشتوں کو پبلک کی پراپرٹی بنانے سے روکتا رہا۔ وہ کھٹکا یہ ہے کہ لوگ عموماً مین میخ نکالنے والے ہوا کرتے ہیں۔ کسی کی نیت سے ناآشنا ہونے کے باعث وہ کچھ سے کچھ اور ہی مطالب اخذ کر لیتے ہیں۔ اُن کی وابستگی چونکہ معروضی اور مزاحمتی ہوا کرتی ہے، بسا اوقات وہ ایسے ایسے کیڑے نکال کر ہتھیلی پر دھر دیتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

بدیر سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک طور سے تو یہ اور بڑی نقاب کشائی کا عمل ہوگا۔ میں عرفانِ ذات کے مرحلوں سے نہیں گزری اسی لیے مجھ پر اپنی اور خاں صاحب کی اندرونی جبلت، فطرت، طبیعت، کردار کے اصل بھید نہیں کھلے۔ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی ستون کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں موند آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ اور صرف اپنے متعلق سوچو..... اپنے ارادے، خواہشات، دوسروں کے ساتھ تعلقات کے الجھے دھاگے، عمل اور علم کی دُوری، ماضی کے پچھتاوے، مستقبل سے وابستہ اُمیدیں، ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور ان سے بگٹٹ بھاگ کر آزادی پا لینے کی حسرت، کردہ اور ناکردہ گناہوں کی ورق گردانی، اندر کے موسموں کی چھان بین..... غرض

پیکر ہولے ہولے پرت در پرت' حقیقت اور خواب کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا اور تمہیں اصلی شخص سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا جو تمہارے اندر جمناسٹک کرتا رہتا ہے۔

میں سمادھی نہ لگا سکتی ہوں نہ عرفانِ ذات کے جھنجھٹ میں پڑ سکتی ہوں کیونکہ عرفانِ ذات کے لمبے دباؤ سے گھبرا کر اپنے حواشی کو جاننا ایک لمبا پُر خطر راستہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی سمت معلوم کرنے کے لیے کسی اجنبی شہر میں کسی نامانوس چہرے سے رابطہ قائم کر لینا آسان ہے بہ نسبت لندن میں نقشہ نکال کر کسی سڑک پر اپنے دوست کا گھر معلوم کرنے کا شغل۔

میں نے ہر پڑھنے والے کے سامنے خاں صاحب سے وابستہ کچھ یادیں رکھ دی ہیں۔ اب آپ لوگ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری لن ترانیوں کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ہم کس قدر گنجے فرشتے تھے اور کس حد تک سفید کپڑوں میں میلی نظریں جھکائے خوشامدی' شیخی خورے' متکبر' خود غرض' کسی شیطانی ٹولے کے رفیق تھے۔

ہر انسان اول و آخر کھنکھناتی مٹی سے بنا ہے اور ٹوٹ کر پھر مٹی ہی کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم میں بشریت کے جملہ خصائص نہیں ہیں تو حتمی طور پر یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ میں بھی اُن لوگوں کی احسان مند رہوں گی جو اس کتاب سے معروضی انداز کے تخمینے لگائیں گے۔ اگر ان کی آواز مجھ تک جیتے جی پہنچ گئی تو میں ان کی شکر گزار رہوں گی۔ اگر میرے بعد اُن کی رائے دوسروں تک پہنچ پائی تو بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیونکہ وہ بُت شکنی کر کے بت پرستی کے شغل سے باز رکھیں گے اور خاں صاحب جن کے چاہنے والے ان گنت ہیں اپنی رائے میں تھوڑے سے محتاط ضرور ہو جائیں گے۔

ایک سب سے بڑی وجہ آپ تک یہ مواد پہنچانے کی یہ بھی ہے کہ آج کے نوجوان آزادی کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوئے آزادی کے درپے ہیں۔ جب بھی آزادی ملتی ہے اسی تناسب سے آزادی دینا بھی پڑتی ہے۔ اگر حقوق کے لیے سینہ سپر ہو جائیں تو حقوق ادا کر کے ہی جان چھوٹتی ہے۔ لکھنے کی آزادی ہم دونوں نے بغیر کسی سے اجازت لیے ہتھیالی تھی۔ اس کتاب سے اب ہم دونوں Commitment کے بند دائرے میں اُتر گئے ہیں۔ مسلسل اتنے سال اشارے' کنائے' اعتراف وارتکاب کی فضا میں رہتے ہوئے ہم نے خود فرار کی راہیں' فیصلے کی آزادی اور ایک دوسرے سے عذر خواہی کا حق چھین لیا تھا۔

ہمارے بابا جی نور والے کہا کرتے تھے کہ جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات تو عمر کے آخری حصے میں سمجھ میں آئی لیکن اُس وقت خاں صاحب کو خط لکھ کر' خط پا کر کچھ ایسا سرور ملتا تھا کہ اس شغل سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ محبت کا دماغ میں وہیں وقوف ہے جہاں عادت' نشہ' اکساہٹ اور لذت کا مقام ہے۔ سگریٹ' ہیروئن' چرس' بھنگ' افیون یہ سارے شوق ھل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت محبت کی بھی ہے..... یہ آخری بار مل لوں..... آخری بار دیکھ لوں..... بس یہی آخری لمس ہوگا۔ غالباً جنس اور محبت دو علیحدہ دماغی حصوں میں بسرام کرتے ہیں۔ محبت تسلسل کی آرزومند ہے جبکہ Sex اُبال کی شکل میں گھیرا ڈالتی ہے..... محبت کا متلاشی کبھی کبھی جان سے گزر جانے کو بھی کھیل سمجھتا ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب محبت میں اعتراف کی گانٹھ دونوں رسیوں میں مضبوط ہو جاتی ہے.....

اب اس محبت کو دائمی بنانے کی اُلجھن شادی کا کہا اور اَن کہا وعدہ بن جاتی ہے..... روزِ ازل سے مرد اور عورت جب کبھی محبت کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں' اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سفر جو اُنہیں ایک دوسرے سے commit کر رہا ہے' لمبا

بھی ہے اور پُر خطر بھی۔ اس میں وعدے کا پاس بسا اوقات گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ جس طرح کبھی کبھی منشیات بڑی قیمت وصول کرتی ہیں' ایسے ہی محبت اور شادی پر منتج ہونے والی محبت ایک بہت بڑا چیلنج بن کر زندگی میں داخل ہوتی ہے.....

جس درجے کی توفیق نہ ہو اُس کا اعلان کر چکنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ روزمرہ کی زندگی میں نشہ اور سرور کہاں گم ہو گیا؟ وہ ربطِ باہمی کس مقام پر کیوں اور کیسے Clash میں بدل گیا..... انسان چونکہ فطرتاً آزاد ہے۔ اس شادی کے بندھن میں جو سب سے بڑا چیلنج اُسے پیش آتا ہے' وہ یہی Free Will کی آزادی ہے۔

شادی کے بعد اپنا ارادہ' ذات اور فیصلے کسی کی خاطر ارپن کر کے مسرت محسوس کرنا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ بھی کسی شخص کو اُس وقت تک ہدایت نہیں دیتا جب تک انسان اپنی خوشی یا فیصلے سے اللہ سے ہدایت طلب نہ کرے۔ شادی میں بھی مکمل سرور اسی وقت ملتا ہے جب اپنے فیصلے سے اپنی قوتِ ارادی کو ساتھی کی خواہش پر قربان کرنے کا شوق' ولولہ اور جوش نہ ہو۔ اس سلسلے میں آج کل کے نوجوانوں کے لیے یہ کتاب رہنمائی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

جس قدر بڑی Commitment ہو اگر اعلان بھی اتنا ہی بلند بانگ ہو جائے گا تو اسی تناسب سے اپنی Free Will بھی چھوڑنا ہو گی۔ پھر رشتہ محمود و ایاز کا بن جائے گا' عاشق و معشوق کا نہ رہے گا۔ پھر نمرود کی آگ میں کود بھی جائیں تو آگ جلا نہ سکے گی' لیکن عام طور پر محبت اور نشے کی اوّلین حالت میں انسان نہ ذمے داری کو سمجھتا ہے نہ دور اندیشی ہی سے اُس کا تعلق ہوتا ہے۔

اسی لیے محبت کی شادیاں عموماً Disillusionment پر ختم ہوتی ہیں اور ساتھی توقعات لگانے کے بعد اپنا اپنا خیمہ اُکھاڑ کر یا تو طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں یا پھر Extra-marital تعلقات میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ تعلقات خلع یا طلاق کسی طور بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتے کہ غلطی تو انسان کی اپنی شخصیت' اُس کے اپنے مرکز میں ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنا ارادہ' فیصلہ' تجویز چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا.....

دوئی ہوتے ہوئے یکجائی پر اصرار کیوں؟ یہ کتاب اس اُمید پر چھاپ رہی ہوں کہ آج کل کے تیز رفتار' جلد اُکتا جانے والے ہمہ وقت تبدیلی کے آرزومند سوچ سمجھ کر اس دریا میں قدم ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں پانی گہرا ہو اور آپ کو تیرنا بھی نہ آتا ہو۔

میری شادی ہمارے دونوں گھر والوں کے لیے ایک لاینحل مسئلہ تھا۔ خاں صاحب کے خاندان والے روایات کے پابند' سکندری طبیعتوں کے مالک' خود اعتماد لوگ تھے۔ اُن کے خاندان میں کبھی کسی نے روایات توڑ کر باہر کی کسی لڑکی سے شادی کا سوچا بھی نہ تھا۔

جب خاں صاحب کی آوی جاوی کالج کے بعد 24- کینال پارک تک بڑھی تو گھر والے بے طور متوحش ہوئے۔ اُن کے گھر میں ریڈ الرٹ جاری ہو گیا۔ گھر والے منہ سے تو کم بولے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُونٹ چاہے کسی کروٹ بیٹھے' اُن کی روایات کو پامال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اِدھر جب میری والدہ نے اپنی معاملہ فہمی سے معاملے کا پڑتا لگایا تو ایک روز وہ چرخہ خرید لائیں۔ اسے

پیمانے میں لگایا۔ ساتھ روئی کی پونیاں ایک ٹوکری میں رکھیں اور کہنے لگی ''کا کی..... میں بی اے بی ٹی ہوں..... انسپکٹرس آف سکولز ہوں' لیکن میں سمجھتی ہوں مسائل کے سوچنے اُن کی کتر بیونت کے لیے چرخے سے اچھا کوئی مشغلہ نہیں۔ اتنی پونی کات لو کہ تمہارے کھیس تیار ہو جائیں اور تم اپنے شوہر کو دکھا سکو کہ تم سلیقہ شعار بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی.....''

پھر میری امی نے مجھے چرخے کی ہتھی پکڑا پونی اُٹھا کر دھاگے کو نہ ٹوٹنے دینے کا فن' مال پر نظر رکھنے کے گر سکھائے۔ میں جلد ہی چرخہ کاتنے کا ہنر سیکھ گئی۔ کروشیے پر تو عبور حاصل نہ کر سکی جس میں میری والدہ ماہر تھیں اور اپنے ہاتھ سے انہوں نے بہت سی جالیاں' ٹوپیاں' میز پوش بنا رکھے تھے' لیکن مجھے ٹیٹو کا شوق پیدا ہو گیا اور میں گرہیں ڈالنے اور ان سے دوپٹے کی لیس بنانے میں ماہر ہو گئی۔ مجھے سلیقہ شعار بنانے کے دوران ایک روز انہوں نے کہا..... ''میرے پاس اس وقت دو رشتے ہیں۔ بسوں کا سرکاری نیٹ ورک نیا نیا کھلا ہے وہ اس کا کرتا دھرتا ہے..... دوسرے ایک کرنل صاحب ہیں۔ یہ رشتہ تمہاری سہیلی محمودہ منظور لائی ہے۔ فیصلہ کر لو۔ زبانی نہ بتا سکو تو محمودہ کے ذریعے بتا دینا.....''

میں نے جرأت کر کے کہا..... ''مجھے اگر شادی کرنا ہے تو اپنی مرضی کی کرنا ہوگی۔ اگر بوجوہ وہاں میری شادی نہ ہو سکی تو میں ساری عمر نوکری کروں گی..... لاہور کالج فار ویمن میں اردو کی لیکچرار بن جاؤں گی۔ کنیرڈ میں پڑھا لوں گی۔''

انہوں نے میری مرضی نہ پوچھی اور رسان سے بولیں ''دیکھو کا کی! جب بھی آدمی اپنی مرضی کرتا ہے اُسے کچھ قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے..... اچھی طرح کاتتے وقت سوچ لو..... بھاری قیمت ادا کر لو گی؟''

تو قارئین! یہ کتاب وہ خام مواد ہے' جس کو کوئی ثقہ مشاق' گہرائی سے موتی نکالنے والا تحقیق نگار جناب اشفاق احمد پر ایک جامع کتاب لکھتے وقت کچھ کچھ استعمال کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی وقت کی گرد خود شخصیت کی تصویر پر اس طرح پڑ جاتی ہے کہ اس پر نہ تو کسی کو مزید کام کرنے کی سوجھتی ہے نہ نئی پود کو اپنے مشاہیر ہی کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بہرکیف میں نے یہ ساری یادداشتیں بہت سینت سینت کر امانتاً رکھی ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ یادوں میں قلبی' ذہنی' نفسیاتی کیفیات بڑی واضح ہو جاتی ہیں۔ انسان قلم اور کاغذ سے آگے اظہار کی ایک اور سرحد چھونے لگتا ہے جو گفتگو میں فروعی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔

انسان نے اظہار کے لیے ہمیشہ خطوط' پھول' مٹھائی' کپڑے' زیورات استعمال کیے ہیں۔ مشرق میں گجرے' موتیے' چنبیلی کے گتھے ہوئے اور گوٹے کناری سے بجے زیباشی ہار ہم سب کی یادوں میں پنہاں ہیں۔ مغرب کے لوگ گلدستے دینے کے عادی بن گئے ہیں۔ کارڈ بھیجنے اور اس پر خوبصورت عبارتیں لکھنے کے شوقین ہیں۔ اب تو ہم لوگ بھی گلدستے اور کارڈ بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں' لیکن ارتکازِ زر اور دولت کے شیدائی ہونے سے پہلے مشرق میں اپنا آپ ارپن کرنے کا رواج تھا۔ جس قدر تعلق خاطر ہوتا اُسی تناسب سے اپنا وجود ہاتھ جوڑ کر پیش کر دیا جاتا اور آرتی اُتارنے کے لیے یاد سے بہتر کوئی تھالی نہ تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ سارے بہن بھائیوں کی لکھائی اور گفتگو ایک سی ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ خاں صاحب کے والد ڈاکٹر بابا محمد کے آٹھوں بچے ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ ایک سا تڑپتے اور ایک سے الجھاؤ کا شکار تھے۔ ویسے تو زندگی گزارنے کا کوئی حتمی نسخہ ابھی ایجاد نہیں ہوا' لیکن ہر فرد اپنی Genetics اور ماحولیات سے جو کچھ

اخذ کرتا ہے وہی اُس کا خام مواد ہے۔

پھر اس مواد سے وہ کوزہ بنائے یا لوٹا' صراحی' طبلے یا سوہنی کا کچا گھڑا۔ بہرکیف اُسے راستہ خود ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان بہن بھائیوں نے بھی اپنے اپنے جینے کا ڈھنگ علیحدہ علیحدہ بنایا لیکن اس علیحدگی کے باوجود ان میں ایک مشابہت ہے جو نئے ملاقاتی کو بہت متاثر کرتی ہے..... یہ جادوگر قسم کے لوگ ہیں جو نظر بندی کا فن جانتے ہیں' لیکن کسی کو اندر کے انتشار کی خبر نہیں ہونے دیتے.....

ان یادوں سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کے اندر متضاد جذبات کی جنگ ہمیشہ جاری رہی۔ ان ہی جذبات کے باعث خاں صاحب کشمکش' اداسی' منزل پر پہنچ کر بھی منزل سے مایوسی کا چسکا پالتے رہے۔ انہیں منیر نیازی کی طرح کوئی موسم' کوئی جگہ' کوئی شہر مکمل طور پر راس نہیں آیا۔ یہ موسم جناب اشفاق احمد پر تو اُس وقت تک طاری رہا جب تک وہ جناب حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری کی وساطت سے بابا جی فضل شاہ نوروالے کے پاس نہ پہنچے۔

اپنے کسی خط میں انہوں نے اپنے والد بابا محمد خاں کو تحریر کیا ہوگا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ یہ خط چونکہ بابا جی کو لکھا گیا مجھے معلوم نہیں انہوں نے اسے محفوظ رکھا یا تلف کر دیا' لیکن اشفاق صاحب نے ایک بار مجھے اس خط کا متن بتایا تھا۔ بابا جی کا خط اُس باپ کی رائیگاں کوششوں کا بیانیہ ہیں جس نے ہر طرح سے بچوں میں خود اعتمادی' زندگی سے دست پنجہ کرنے کی صلاحیت اور تعلیم کو ہتھیار بنا کر استعمال کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیا تھا' لیکن کیا کیا جائے یہی تو زندگی ہے۔ سائنس اصول بناتی ہے اور اُس پر کاربند رہتی ہے' لیکن زندگی کوئی اصول نہ گھڑتی ہے نہ تجویز کرتی ہے..... کسی نتیجہ پر قابض نہیں۔ یہاں مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ زندگی بہرحال اصول کے ساتھ نہیں' اُوپر والے اصول ساز کے ساتھ چلتی ہے۔

خاں صاحب کی Genetics کو سمجھنے کے لیے اُن کی فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا مفید رہے گا۔ میں جو کچھ سنی سنائی جانتی ہوں وہی گوش گزار کر سکتی ہوں۔ لمبے ساتھ کی وجہ سے بہت کچھ جان گئی ہوں' لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر انسان سربستہ راز ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے وجود سے کلی طور پر آگاہ نہیں ہوتا۔ صرف عرفانِ ذات کے ماہر صوفی واقعی بڑی سہولت سے اپنے آپ کو جان کر اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں' لیکن یہ کسی نصیب والے کو آگاہی ملتی ہے کہ عرفانِ ذات ہی عرفانِ حق ہے۔

دراصل میں جب گورنمنٹ کالج میں تھی تو میں 1۔مزنگ روڈ سے واقف نہ تھی' لیکن جب ہماری رہائش 24-ایس کینال پارک میں ہوئی اور خاں صاحب میرے بڑے بھائی پرویز سے سرورق بنوانے کے سلسلے میں آنے جانے لگے تو 1- مزنگ روڈ میری زندگی میں کسی انجانی سلطنت کے دارالحکومت کی سی کشش اختیار کر گیا۔

بہار کا موسم ہو یا خزاں کی رُت' کچھ پودے اور درخت اپنے اپنے مقررہ وقت پر پتے ہوا کے دوش پر اُچھالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح درختوں' پھولوں سے بھی پولن جھڑ کر ہوا میں اُڑا کرتا ہے۔ سنبل کے پھوئیے' روئی کا پولن' چیڑ کے درخت سے جھڑنے والے جنگلی چلغوزے.....اور اسی طرح کینچلی اُتار پھینکنے والے سانپ' جھبرے بالوں والے

جانوروں کے بال، مرغابیاں اور کچھ مختلف قسم کی بطخیں اور migrate کرنے والے پرندوں کی سرشت میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت آتی ہے۔ وہ ڈاروں کی شکل میں پڑاؤ ڈالتے، ستاتے، نئے چشموں، سرد ہواؤں سے بچتے غیر شعوری طور پر نخلستانوں، باغوں اور ریتیلے ساحلوں (Beaches) پر اُترتے ہیں۔

ایک مدت انسان صحرا نورد، خانہ بدوش گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا رہا ہے۔ پہلے یہ ہجرت کا سلسلہ گروہ کی شکل میں ہوا کرتا تھا اور جب ڈنڈا ڈولی کر کے خانہ بدوش ساتھ ساتھ چلتے تو خوف، خوشی اور Excitement میں اُس کا موڈ بدل جاتا..... ہجرت کی روایت بہت پرانی اور انسان کے لہو میں ارتعاش اور تبدیلی پیدا کرنے والی رہی ہے.....

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہجرت کرنے والا عموماً اکیلا وطن چھوڑتا ہے۔ پردیس کی صعوبتیں سہتا، نئے ماحول اور موسم کے تھپیڑے کھاتا ہے۔ عموماً تحریک تلاشِ معاش ہوتی۔ اب نگری نگری گھومنے والے کو بنیادی طور پر فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ گروہی ہجرت یا Migration میں فیصلہ عموماً پورا قبیلہ یا گروہ کے سربراہ کیا کرتے تھے لیکن اب ہجرت ایک فرد کا نصیب ہے۔

خاں صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُس تضاد کو زیرِ غور رکھنا بے حد ضروری ہے جو ہر اقلیت کو درپیش رہتا ہے۔ ہر اقلیت جب ہجرت کر کے کسی نئے دیس میں بسرام کر لیتی ہے تو وہ اپنے رسم و رواج، بولی، اندازِ زیست و اقدار ساتھ لاتی ہے۔ نئے ماحول میں اُسے عجیب قسم کی Insecurity کا سامنا رہتا ہے۔ وہ خوف اور احساسِ کمتری کا اس لیے شکار ہوتی ہے کہ کہیں اکثریت میں اُس کی شناخت گم نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ لاشعوری طور پر اُسے ہموار اور متوازن زندگی کے لیے وہ سہولیات، مراعات اور رعائتیں بھی درکار ہوتی ہیں، جو کسی اکثریت کو اس طرح پیدائشی طور پر ملتی ہیں، جس طرح دریا میں بسنے والی مچھلی کو پانی۔ اکثریت کو کبھی اپنی خوش نصیبی کا شعوری احساس پیدا نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد کے بڑے بچوں نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان چھوڑ کر ترائی کی جانب پنجاب کی طرف جا بسیں۔ خدا جانے مہمند قبیلہ جتھوں کی شکل میں عازم سفر ہوا کہ چھوٹے چھوٹے خاندان اپنا اثاثہ باربردار جانوروں پر لاد مشکل راستوں سے ہو کر مختلف جغرافیائی حدود میں ہونٹ سکیڑے کچھ اُداس، کچھ پُرامید، کچھ ہراساں چلتے چلتے پنجاب میں آ بسے۔ ہوشیار پور کے مقام پر انہوں نے جوتوں کے تسمے کھول دیئے اور اپنی کاشتکاری کی روایت کو قائم رکھا۔

مہمند قبیلہ موروثی طور پر کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک تھا، لیکن چونکہ یہاں زمین دستیاب نہ تھی، محمد مستقیم خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقامی باراتوں کے ساتھ حفاظتی جتھہ بنا کر چلا کرتے۔ رفتہ رفتہ وہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ اسلحہ سجا کر حفاظتی گروہ بنا کر سفر کرنے لگے۔ دو تین پیڑھیوں کے بعد اسی خاندان میں محمد معظم خاں نے جنم لیا، جو اشفاق صاحب کے دادا کے والد تھے۔

جناب اشفاق احمد مہمند پٹھان تھے۔ وہ اپنی اس شناخت کو چھپاتے تھے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ خاں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا دیس ہوگا۔ وہاں نہ نسبی نہ علاقائی زبانوں ہی کا تفاخر ہوگا۔ یہ دھرتی مہاجر اور انصار کی سانجھی ہوگی اور انصاف کے تحت چلنے والا نظام رائج ہوگا۔ اسی خواب میں گم انہوں نے 39 برس تلقین شاہ لکھا، لیکن اصل تضاد یہی تھا کہ انہیں اپنے مہمند قبیلے سے بھی عشق تھا۔ وہ اپنی روایات سے بھی محبت

کرتے تھے۔ساتھ ساتھ وہ ذات برادری سے باہر شادی کر کے ان روایات کو توڑنا بھی نہ چاہتے تھے۔

ان کے پُرکھ جب ہجرت کر کے پنجاب میں پہنچے تو تمام اقلیتوں کی طرح انہوں نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے مٹھی بند معاشرہ قائم کیا۔ یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔انتہا کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دسترخوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔یہی تضاد اندر ہی اندر خاں صاحب کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔

جب انہوں نے مجھ سے شادی کا ارادہ کیا تو یہی تضاد آری کی طرح اُن کے اندر چلنے لگا۔اسی سے فرار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کئی راستے اختیار کیے۔کبھی مری' کبھی جہلم' کبھی کراچی اور آخر میں اٹلی ٹھکانا بنا کر ایک اور ہجرت کر لی۔

خاں صاحب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ خاں صاحب کے دادا دوست محمد خاں' خاندان کی آبرو اور پہلے قابلِ ذکر آدمی تھے۔ بے انتہا خوبصورت' ذہین اور دُھن کے پکے تھے۔بدقسمتی سے ان کی شادی ایک کریہہ صورت سانولی بدہیئت پٹھان لڑکی سے کر دی گئی۔ نہ انہیں شادی سے پہلے دلہن دکھائی گئی نہ کسی نے آمادگی ہی پوچھی۔دوست محمد خاں صاحب کے دادا جمال پرست تھے۔ بیوی کو دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔یہ پٹھان بچہ حسن میں بے مثال' وجاہت میں لاثانی تھا۔

ویسے تو شکل وصورت اُوپر والے کی دین ہے۔انسان اپنے آپ کو اس سلسلے میں تبدیل کرنے سے قاصر ہے لیکن کیا کیا جائے سفید قومیں' سیاہ اور براؤن جلد کو بھی معاف نہیں کرتیں اور عموماً اس درجہ خود پرست ہوتی ہیں کہ وہ سیاہ شکل وصورت والے فرد کو مکمل طور پر ہی رد کر دیتی ہیں۔یہی مسئلہ دوست محمد خاں کو درپیش ہوا۔بیوی کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی انہیں ابکائی آئی۔ بیوی گو پٹھانی تھی لیکن سانولی بھی تھی اور بدشکل بھی۔اُدھر دوست محمد خاں کا حسن گریک مجسّمے کا سا تھا۔

دوست محمد خاں نے دل میں ہجرت کی ٹھانی۔چپ چاپ حیدرآباد کا قصد کیا لیکن روحیں تو اُوپر والے کے علم سے رحم میں اترتی ہیں۔ بابا جی محمد خاں کو اس دنیا میں دوست محمد خاں جیسا پڑھا لکھا خوبصورت باپ ملنا تھا سو وہ اپنی بدصورت ماں کی گود میں پروان چڑھنے لگا۔دوست محمد خاں کے بیٹے اور خاں صاحب کے والد اپنی ماں سے مشابہ تھے۔ بابا جی محمد خاں کا قد چھوٹا' رنگ گہرا سانولا' چہرے پر چیچک کے داغ' ناک نقشہ بھدا تھا۔وہ اپنے نستعلیق باپ دوست محمد خاں سے ہر طور مختلف تھے۔

بابا جی دوست محمد خاں کی پذیرائی حیدرآباد دکن میں سرخ قالین پر ہوئی۔وہ دربار میں اپنی فضیلت' فارسی دانی اور علم دوستی کے باعث جلد اتالیق کے عہدے پر پہنچ گئے اور نواب زادوں کی تربیت خوب نبھانے لگے۔گو اُن کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ نہ تھا لیکن دوست محمد خاں باقاعدگی سے اپنی بیوی اور بچے کی کفالت کرتے تھے اور بیٹا گورنمنٹ کالج سے ملحق Montmorancy College میں جسے عوام ڈنگر ہسپتال کہتے تھے' تعلیم پانے لگے۔بابا جی محمد خاں شکل وصورت میں والدہ کی طرح تھے اور ذہانت' علم دوستی اور استقامت میں اپنے علم دوست باپ پر گئے تھے۔

میں یہ باتیں آپ کو کسی طور پر کسی دعویٰ کے ساتھ پیش نہیں کر رہی۔یہ ساری سنی سنائی' منہ در منہ کی کہانیاں ہیں۔ سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی مختلف انداز' لب ولہجہ اور بناوٹ میں سناتے تھے لیکن ہر ایک کے لہجے میں وہی تفاخر'

قدرتی صحت اور تازگی ہے۔ اس سارے خاندان کو اپنے دادا دوست محمد خاں کے حسن پر ناز اور اپنے پیرزادے ہونے پر فخر ہے۔

پردیس بلنے والے والد کی ساری توجہ کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب کے والد محمد خاں پڑھتے چلے گئے اور Montmorancy College سے ڈنگر ڈاکٹر بن کر نکلے۔ اب انہیں اپنی کلا جگانے کے لیے دو چیزیں درکار تھیں۔ ایک تو اپنی بدصورتی چھپانے کے لیے خوبصورت بیوی' دوسرے اپنے پروفیشن میں نام پیدا کرنے کے لیے مناسب مقام..... بابا جی محمد خاں نے خاں صاحب کی والدہ بی بی سردار بیگم سے شادی کی جو اس درجہ خوبصورت تھیں کہ ابھی تک ان کے سارے خاندان میں ان کے مدمقابل کوئی صورت نہیں آ سکی۔

قدرت ہر انسان کو اس کے عمل کی کچھ جزا یا سزا تو یہیں عطا کر دیتی ہے' کچھ حساب کتاب کے لیے اس نے روزِ قیامت کی شرط لگا رکھی ہے۔ جس طرح آواگان کا فلسفہ بہتر عمل کی طرف راغب کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ ایسے ہی قیامت کا اندیشہ بھی انسان کو نیک عمل کرنے پر اکساتا ہے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں لے کر اٹھنے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔

باپ کے رویے کی وجہ سے ڈاکٹر محمد خاں میں بھی ایک گہرے تضاد نے ہولے ہولے جڑیں پکڑ لیں۔ انہوں نے کبوتر پالنے اور پتنگ بازی کا مشغلہ جو انہیں دل سے پسند تھا' چھوڑ دیا۔ ذمہ داری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا' لیکن جس باپ کے احسان تلے وہ پس رہے تھے اس کے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی عدم موجودگی کے باعث وہ اسی سے شدید نفرت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ زندگی میں باپ سے بڑھ کر کچھ کر دکھائیں گے۔ ایک طرف تو وہ شادی کے بندھن سے نفرت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔

کسی وقت' کسی مقام اور لمحے نے فیصلہ کیا اور بابا جی نے منفی جذبات کو نیام میں بند کیا اور فیسرین کے موجد بن گئے۔ مختصر میں ایسے مشہور ڈنگر ڈاکٹر ہوئے جو گھوڑے کو ٹیکہ لگا کر اکیلا ہی ڈھا سکتا تھا۔ بڑے بڑے سکھ سردار ان کے مرید ہو گئے۔ ان کی خوبصورت بی بی سردار بیگم ان کی کارکردگی کے باعث ان کی مطیع ہو گئیں۔ ہولے ہولے انہوں نے جانور چھوڑ انسانوں کا علاج شروع کر دیا۔ شفا شامل حال رہی اور ان کے مریض دُور دُور سے آنے لگے۔

بابا جی محمد خاں بھی ایک بڑی تنومند شخصیت تھے۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنی دوررس دانش سے اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے نتائج اخذ کر لیتے۔ تجویز ان کی بیساکھی' لاٹھی' چوب' ہٹاؤ بچاؤ تھی۔ شاید ڈاکٹر محمد خاں کو علم نہ تھا کہ اول تو انسان کا علم قلیل ہے۔ پھر اس کی تجویز پانی دینے پر مامور ہے' لیکن پھل پھول لانے پر قادر نہیں۔ انسان کو رزقِ حلال کمانے کا حکم ضرور ملا ہے' لیکن وہ کس قدر رزق کما سکے گا اس کا کسی شخص کو علم نہیں۔ بابا جی محمد خاں بھی ہر محنتی' ترقی پسند' ناک کی سیدھ چلنے والے آدمی کی طرح اپنی محنت کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ انہیں Genetics کی کھیل کا علم نہ تھا نہ ماحول میں چھپے ہوئے شکست دینے والے عناصر ہی کا کوئی بچاؤ تھا۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ کئی بار بغیر ڈگریاں حاصل کیے انسان اللہ کی مہربانی سے فلسفی' شاعر' مجتہد' عالم بن کر وقت پر اثر انداز ہو جاتا ہے' لیکن اُسے علم نہیں ہوتا کہ یہ طاقت غیب سے کیونکر آئی۔ کیا اس کی تحریک کوئی دُعا تھی یا وہ وفورِ آرزو' شوق اور خواہش تھی جو آسمان چیرتی اللہ کے حضور پہنچتی رہی۔

بہر کیف اپنا پیشہ چمکانے کی خاطر انہوں نے مکتسر مشرقی پنجاب کا قصباتی گاؤں چنا۔ یہاں سکھ سرداروں کی لہلہاتی زمینوں پر گھوڑے بھینسیں' بکریاں' ٹٹو ہر قسم کے جانور تھے۔ ڈنگر ڈاکٹر کی لحظہ بہ لحظہ احتیاج رہتی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ خلقِ خدا کی نبضیں بھی دیکھنے لگے۔ عورتوں کے امراض پر بھی حاوی ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ایک حویلی نما گھر بھی بنالیا' جس میں باہر ایک باغ تھا جس کو باباجی پائیں باغ کہتے تھے۔ اب گھوڑوں کا اصطبل بھی وجود میں آ گیا۔ بھانت بھانت کے اعلیٰ نسلی گھوڑے بندھے نظر آنے لگے۔

باباجی کو گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا اعلیٰ نسل کی بیوی' اعلیٰ نسل کا کتا' اعلیٰ Pedigree کا گھوڑا' اعلیٰ نسل کے اشراف کی نشانی ہے۔ دراصل مرد کو ازل سے سواری کا شوق رہا ہے۔ آج کل کے زمانے میں گھوڑے نہیں چرائے جاتے' اب کاریں اس شوق کے زیرِ عتاب آ چکی ہیں۔ بڑی گاڑیاں Status سمبل بن چکی ہیں اور ان کے بغیر مرد اپنے آپ کو نامرد سمجھنے لگتا ہے۔ ہر بینک رہن پر گاڑی فروخت کر کے خلق کی گھڑ سواری کا شوق exploit کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں نے اپنے آٹھ بچوں کو گھڑ سواری سکھائی۔ آپا فرخندہ اور آپا فرحت تک یہ فن جانتی تھیں۔ حالانکہ مسلمان گھرانوں میں تب پردہ سخت تھا۔ آفتاب بھائی اور خاں صاحب پڑھنے لکھنے والی شخصیتیں تھیں۔ انہیں اس لہو و لعب کا کوئی شوق نہ تھا لیکن ان کو بھی بابا محمد خاں نے بدو بدی گھڑ سواری سکھائی۔ مارے باندھے یہ بھی باپ کے شوق میں شامل ہوتے رہے' لیکن گھڑ سوار نہ بن سکے نہ پولو جیسی کھیل ہی میں دلچسپی لے سکے۔ حالانکہ اسحٰق بھائی نے دیہاتی بچوں کی پولو ٹیم بنا رکھی تھی اور رات کو پولو کی گیند کو مٹی کا تیل لگا کر جلاتے اور دیہاتی لونڈوں کو پولو کھیلنا سکھاتے۔

دوسری تجویز باباجی نے علم کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگانے میں صرف کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہی انسان دوست محمد خاں بن سکتا ہے۔ باباجی محمد خاں اپنے تعلقات میں ہر بڑے آدمی کی طرح تضاد کا شکار رہتے تھے۔ جس والد سے احساسِ محرومی کے تحت انہوں نے نفرت پال رکھی تھی' وہی والد کہیں اُن کا رول ماڈل بھی بن گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بغیر تعلیم کے کوئی شخص نہ مکمل ہو سکتا ہے نہ اسے خاندان یا معاشرے میں کوئی مقام ہی حاصل ہونے کے امکانات تھے۔

اسی تجویز کے تحت انہوں نے گھر پر ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔ صبح سویرے چار بجے ہسپتال جانے سے پہلے اپنے بیٹوں کو اُٹھانے کا حکم تھا۔ ماسٹر جی آ جاتے۔ وہی ماسٹر جی جو خاں صاحب کو ''گولو مولو'' کہتے تھے اور دسویں میں پہلی بار فیل ہو جانے کے بعد ان ہی داؤجی کے گھر جناب اشفاق احمد خاں صاحب کو منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے اُس ''گڈریا'' کی شخصیت اخذ کی گئی جو بعد میں اُردو ادب کے کلاسیک کا حصہ بن گئی۔

مارے باندھے جمائیاں لیتے آفتاب بھائی' افتخار بھائی' اقبال بھائی، اسحٰق بھائی اور خاں صاحب اُٹھتے۔ رات کو گھر سے چوری چوری نکل کر اسحٰق بھائی کی ایجاد کردہ پولو کھیلنے سے ویسے ہی جسم چُور ہوتا لیکن باباجی کا خوف غالب رہتا اور مارے باندھے اٹھتے۔

زندگی کی کروٹوں کو لاکھ جوتش سے سمجھنے کی کوشش کریں' استخارے نکالیں' فال ڈال کر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کریں۔ یہ اپنی کروٹیں اپنی مرضی سے لیتی ہے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب کے بیٹے کا اتالیق اچانک بیمار ہو گیا۔ لاکھ درباری حکیم نے معجونیں' شربتیاں' عرق پلائے' لیکن افاقہ نہ ہوا۔ دوست محمد خاں پر فالج کا حملہ ہو گیا۔

بابا دوست محمد خاں نے اپنی بیوی کی بدصورتی کے ہاتھوں اپنے آپ کو فرار کے عمل سے دوچار کیا تھا لیکن اللہ تو توازن قائم کرنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ حیدر آباد میں جب بابا دوست محمد خاں پر اچانک فالج کا حملہ ہوا تو بابا جی محمد خاں جو بے پرواہ اپنے گھر کی چھت پر کبوتر اُڑایا کرتے تھے اور لاابالی طبیعت کے مالک تھے' اچانک سنبھل گئے۔ ایک فالج کی آفت سے اللہ نے باپ بیٹا دونوں کے رُخ موڑ دیئے۔ توازن کے پلڑے برابر کر دیئے گئے۔ بابا جی محمد خاں اپنی بے حد خوبصورت بیوی سردار بیگم کے پاس آئے اور بولے "میرے والد حیدر آباد میں بیمار پڑے ہیں۔ میں انہیں گھر لانا چاہتا ہوں۔" یہ عہد بیویوں سے ڈرنے کا نہیں تھا۔ مرد ابھی اپنی فضیلت کے نشے میں سرشار صیہونیت کو خوبی سمجھتے تھے۔

"لے آئیں جی..... جیسی آپ کی مرضی....." دراز قد اماں جی نے کہا۔

بابا جی نے کھج کھا کر کہا "اس بار میری مرضی نہیں تمہاری رضا چاہیے۔ بابا جی فالج کے مریض ہیں۔ ان کو نہلانا دھلانا' بول و براز کئی گندے کام ہوتے ہیں' کرلوگی؟..... میں تو ہسپتال میں رہتا ہوں۔ زیادہ بوجھ تو تم پر ہی ہوگا"

"میں بچوں کی ماں ہوں..... میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں....."

اب ڈاکٹر محمد خاں ملتسر سے حیدر آباد پہنچے۔ مردہ صورت باپ کو لے کر گھر پہنچے اور اپنی چاندی بیوی کو اُن کی نرس بنا دیا۔ اماں بی نے بھی یہ خدمت دل و جان سے قبول کی۔ باپ بیٹے میں تو مفاہمت کے دروازے نہ کھلے لیکن بہو نے اپنے سسر کا دل جیت لیا۔ کچھ خوبصورتی سے کچھ خوبصورت عمل کے ہاتھوں۔ واقعی اماں جی سردار بیگم کے لیے اپنے سسر کی تیمارداری کوئی مسئلہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کھلی ہوئی مسکراہٹ' پھرتیلے ہاتھوں اور لبیک لبیک کی سپرٹ کے ساتھ بابا جی دوست محمد خاں کی سیوا کا بیڑا اٹھایا اور خوب نبھایا۔

ملتسر میں بابا جی محمد خاں کا حویلی نما گھر تھا۔ اس کا آنگن کشادہ اور اس کے ویہڑے میں ڈرائنگ روم کی تمام خوبیاں تھیں۔ دیہاتی ماحول کی ساری خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اصلیں' ملازمین' اماں جی کی دیہاتی سہیلیاں' مزارعوں کی بیویاں بیٹیاں' اپنی رشتہ دار خواتین کا آنا جانا لگا رہتا۔ تنور سلگ رہے ہوتے۔ چولہے کے توے پر بھی روٹیاں دھپ دھپ پکتی چلی جاتیں۔ چارپائیاں اُٹھائی جاتی جاتیں۔ بچھانے کا عمل بھی اُسی سرعت سے جاری رہتا۔ ان ہی چارپائیوں کو ڈائننگ ٹیبل کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ پھر ان ہی چارپائیوں پر بچوں کو نہلانے' سکھانے' مالش کرنے کے مرحلے پیش آتے۔ ان ہی چارپائیوں پر سکول سج جاتا اور مولوی صاحب قرآن پڑھانے لگ جاتے۔ استاد صاحب کے آنے پر یہی نواڑی کچھ ادوائن والی چارپائیاں مکتب کی صورت اختیار کر لیتیں۔ تختیاں دھو کر ان ہی کے پائیوں کے ساتھ سکھانے کے لیے ٹکا دی جاتیں۔ ان ہی کے گرداگرد ایک دوسرے کو پکڑنا' چور سپاہی کھیلنا بچوں کا معمول ٹھہرتا۔ دیواروں پر پوتڑے سوکھتے' رضائیاں کھیس دھوپ سینکتے۔ دوپٹے لہکتے' لمبی ڈوریوں میں سبزیاں سوکھنے کے لیے لٹکتی نظر آتیں۔ ازار بند' موباف' پراندے' کمربند ہر نوع کی کھینچنے کسنے والی چیز نظر آتی۔

اسی آنگن سے ملحق فالج زدہ بابا جی دوست محمد خاں کا کمرہ تھا۔ فارسی اردو کی کتابوں سے آراستہ حیدر آباد دکن کے دربار کی تصویروں سے سجے کمرے میں نفیس کشمیری دوشالے' کمبل سے آراستہ بستر۔ اس نستعلیق کمرے کی فضا میں ..... جامی' حافظ' مولانا روم کی دانش مہکتی تھی۔ جب کبھی دو مختلف کلچر آپس میں ٹکراتے ہیں' تو ایک دوسرے پر اثر انداز

ہوئے بغیر نہیں رہتے یا اللہ تعالیٰ اسی طرح جمود توڑنے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

ہولے ہولے باہر کے اثرات اندر والے کمرے پر مرتب ہونے لگے۔ کام کرنے والیوں کی محبت نے بابا جی دوست محمد خاں صاحب کو لسّی، بیسنی روٹی، سرسوں کا ساگ، کڑہی، بڑیاں کھانے کا شوق ڈال دیا۔ وہ کچی سبزیوں کو پسند کرنے لگے۔ مٹی لپی انگیٹھی میں جلتے اپلوں کی گرمی پر ہاتھ سینکنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ سر میں اماں جی سردار بیگم سے سرسوں کا تیل جھسوانے پر آمادہ ہوگئے۔

اُدھر باہر کی آبادی بھی بابا جی دوست محمد خاں کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہولے ہولے ''جھاکا'' اُترنے لگا۔ دیہاتی عورتیں آنے بہانے بابا جی کو سلام کرنے اندر جانے لگیں۔ کبھی گرم پانی کی بوتل، کبھی بالٹی، کبھی چادر تبدیل کرنے کی خاطر، کبھی جھاڑو بہارو کو ویزا بنا کر لڑکیاں بارڈر کراس کرنے لگیں۔

نئے کلچر نے اُن کے اندر چکا چوند پیدا کر دی۔ بابا جی نے جامی، حافظ، مولانا روم کے اشعار اُنہیں رٹانے شروع کر دیئے۔ تلفظ خود سکھایا۔ آواز میں سے ڈنگر پن نکال کر شائستگی کی پیوند لگا دی۔ اب تو لڑکیاں بالیاں ڈھولک پر فارسی غزلیں گانے لگیں۔ عورتوں نے مولانا روم کے کلام سے پند و نصائح اُٹھا کر نئی پود کو عقل مت سکھانا شروع کر دی۔ گھر میں حیدر آبادی کھانے تو پکتے ہی تھے، سلام دعا کا طریق بھی بدل گیا۔ اب ہاتھ کا چپو بنا کر ذرا سا کمر کو لچکا کر آداب کہنے میں لطف آنے لگا۔

یہ اللہ کی عجب کارسازی ہے کہ وہ اچھے میں سے بُرا اور غلیظ میں سے پاکیزہ برآمد کرنے پر پوری طرح سے قادر ہے۔ بابا جی محمد خاں کے اندر بھڑکتے کوئلے دہکتے رہے۔ پھر سرد پڑ کر دباؤ سہہ کر چمکدار ہیروں میں بدل گئے۔ اُن کی ساری توجہ رنگ گورا کرنے، کیل مہاسے چھائیوں کے بدنما داغ دُور کرنے کی طرف مبذول ہوگئی۔

دستِ تہہ سنگ نے ایک بڑی ایجاد کو جنم دیا۔ بابا جی محمد خاں نے فیسرین کریم بنائی اور جا بجا اس کی سپلائی شروع کر دی۔ اب ذاتی غم و غصہ خلق کی ایک بڑی تکلیف رفع کرنے میں صرف ہونے لگا۔ پہلے یہ کریم معمولی کونڈی میں بنتی۔ اسے ملانے گھوٹنے کے لیے ایک عام ڈنڈا لیا جاتا۔ ہولے ہولے جب اس کی سپلائی سارے ہندوستان میں پھیل گئی تو بابا جی نے مشینوں کا سہارا لیا۔ اماں جی پیکنگ کرنے والی عورتوں کے مابین سردار قائم ہوگئیں اور کھٹا کھٹ پٹا پٹ فیسرین کی بوتلیں جن پر نہایت معمولی لیبل اور اُس سے بھی ناقابلِ ذکر انداز میں فیسرین لکھا ہوتا تھا، پیک ہونے لگیں۔ بکثرت میں سنا ہے بصری تیلن اس کام میں پیش پیش تھیں۔ لاہور میں جب فیسرین پیک کی جاتی تو رحمو نائین بڑی پھرتی سے ڈبیاں موڑتی جوڑتی اور اس میں سلیقے سے فیسرین کی بوتل پیک کر دیتی۔

لیکن بابا جی دوست محمد خاں اور بابا محمد خاں میں دُوری کی فضا قائم رہی۔ بابا محمد خاں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ میرے والد نے نہ کبھی میری والدہ کو اور نہ کبھی مجھے ہی قبول کیا۔ یہ زخم اتنا گہرا اور کاری تھا کہ اُن کی زندگی کا سارا تار و پود اسی زخم میں رنگا گیا۔

بابا جی محمد خاں دل کے انتہائی نرم تھے، لیکن اُن کے رویّے میں ایک ہیرے جیسی سختی تھی۔ کسی سے بغلگیر ہونا، مصافحہ کرنا، دوستانہ انداز میں ایک ہی تھالی سے کھانا، کسی لطیفے پر مل کر ہنسنا بابا جی کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ الگ تھلگ،

لیے دیئے' پتھریلی نظروں سے دیکھتے۔ بابا جی دوست محمد کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ اپنے سانولے رنگ' چھوٹے قد' چیچک زدہ چہرہ اُن کو یاددہانی کراتا رہا کہ ان ہی کی وجہ سے تمہارے والد کا دل تمہارے لیے ہمیشہ بند رہا۔

بڑے بابا جی کسی بچے کو فارسی کی غزل رٹا کر آنگن میں ایک کرسی پر چڑھا دیتے۔ گھر کے ملازمین' حاشیہ بردار ناظرین اردگرد اکٹھے ہو جاتے۔ شخصیت مانجھنے خوداعتمادی پیدا کرنے میں یہ تحریک خوب کام آتی۔ بچہ بولنے کا فن جلد سیکھ جاتا۔ اُس کی زبان کھل جاتی اور جب وہ ہندوستان دھرم سکول میں اپنے سکھ اور ہندو ہم مکتبوں سے ملتا تو ایسے بات کرتا گویا سکندر کسی پورس سے ہم کلام ہو۔ بچوں میں خوداعتمادی کا یہ سارا فن بابا جی دوست محمد خاں کا عطا کردہ تھا۔ سکھ استاد بھی ان فارسی آشنا شاہین بچوں سے ڈرتے تھے جو فرفر جامی' حافظ اور رومی کا کلام لحن کے ساتھ پڑھتے تھے۔

بابا محمد خاں کے گھر نو بچوں نے جنم لیا۔ عجب سی بات ہے کہ یہ بچے سب کے سب دو دو سال کے وقفے کے بعد 20 مئی کو پیدا ہوئے۔ صرف اشفاق صاحب 22 اگست 1925ء میں اس دنیا میں تشریف لائے۔ سنا ہے اسی دن بابا دوست محمد خاں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب اور اشتیاق کے درمیان ایک بچہ اور بھی تھا جسے سب کالی بھونڈی کہتے تھے' لیکن وہ دو سال بعد فوت ہو گیا۔

سنا ہے کہ خاں صاحب ہو بہو اپنے دادا سے مشابہ تھے۔ اگر لحظہ بھر ''آواگون'' پر اعتبار کر لیں تو لگتا ہے بابا دوست محمد دوبارہ دنیا میں آ گئے..... اگر اسلامی روایات کے مطابق ہم اپنے باپ دادا کے گناہوں کے وارث ہیں تو عین ممکن ہے کہ اُن کی موروثی خوبیوں کے بھی امین ہیں جو ہماری Genetics میں چلی آتی ہیں۔

مرنے سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے اشفاق صاحب قدرے آرام میں تھے۔ کہنے لگے قدسیہ! شہنشاہ بابر اور گورونانک جی کا مکالمہ سنو گی۔

''کونسا مکالمہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''بھائی سرورازل..... منشی تلوک چند محروم کا تحریر کردہ۔''

''اچھا اچھا وہ والا۔''

''اچھی ایم اے پاس ہو اس قدر ناواقفیت۔''

''یاد تو ہے پر کچھ کم کم۔''

''جب گورونانک شہنشاہ بابر کے دربار میں پہنچے تو بابر نے بڑی شان سے بابا گورونانک کو اپنی مہمان نوازی میں شامل کیا اور گویا ہوا۔

بابر: ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا بابا
تو بسم اللہ جامِ بادۂ احمر چڑھا بابا
جہاں میں آبِ زر سے کون ہے پاک تر پانی
کہ دُھل جاتا ہے جس سے دفترِ ماوشما بابا
نہ مے خانے کو دیکھا چاہیے چشمِ حقارت سے

کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا بابا
نہ یونہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
پہنچتی ہے نظر ان کی سرِ فوق السما بابا
صدا حق حق کی سنتے ہیں سدا وہ شیشہ مے سے
اسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا بابا
جرا حی کھولتی ہے راز دل جب بانگِ قلقل سے
فلک سے پکار اُٹھتے ہیں ملائک مرحبا بابا
نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہے
ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا بابا
غنیمت جان صحبت کو اک دو جام پیتا جا
میانِ محفلِ رنداں در و آشام پیتا جا

خاں صاحب اس لہک سے زبانی پڑھ رہے تھے گویا وہی بابر ہوں۔ پھر انہوں نے ناک پر انگلی رگڑ کر پوچھا
’’کچھ یاد ہے بابا گورونانک نے کیا جواب دیا تھا؟‘‘
’’ہاں جی۔‘‘
’’اچھا سنو..... بابا نانک بولے:

مبارک ہو مے احمر تجھے صاحبقراں تیری
رکھے بس سرور تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ جہاں تیری
مے انگور پی کر اگر کوئی متوالا ہوا تو کیا
نہ آئی دل میں مستی ہاتھ میں پیالہ ہوا تو کیا؟
وہ مے اپنی ہے جس سے بن پیے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چُور رہتے ہیں
وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے بزم و ساغر ہیں
جو صہبائے مروق سے سدا بھرپور رہتے ہیں
ہمارا دورِ مے ہر سرِ نفس کے ساتھ چلتا ہے

اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائش دنیا سے آتی ہے
شراب ظاہری سے اہل باطن دُور رہتے ہیں
چڑھا دوان کو سولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشار مئے منصور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنہوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں
کہاں وہ طالب افشردۂ انگور رہتے ہیں
مناسب ہے یہی ترک مئے انگور شاہا
ہمارے ہاتھ سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا''

نظم سنانے کے بعد انہوں نے تپائی پر پڑے ہوئے گلاس کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے گلاس میں باقی ماندہ چند قطرے پی کر کہا..... ''خاں صاحب! آپ کا کمال کا حافظہ ہے۔ آپ کو اس نعمت کا تحفہ پتہ نہیں کہاں سے ملا ہے۔''

''بابا جی دوست محمد خاں سے اور کہاں سے..... کہتے ہیں کہ ہماری Genetic Coding ہی دراصل ہماری قسمت ہے۔ شاید اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ گناہ سے بچو۔ ہم تمہارے گناہ تمہاری آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ مجھے بابا دوست محمد خاں کا حافظہ ملا ہے..... سنا ہے جس روز وہ فوت ہوئے اُسی دن میں اس دنیا میں آیا۔ انہوں نے جانے سے پہلے اپنی وراثت Genes کی شکل میں مجھے سونپ دی تھی۔''

آفتاب بھائی اور خاں صاحب کے اندر علم کی ایک بھوک تھی جو کورس کی کتابوں سے ماورا تھی۔ وہ دونوں ڈگریاں حاصل کرنے کے درپے اس لیے رہتے کہ کہیں اندر وہ ڈاکٹر محمد خاں سے خوفزدہ تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے محنت کرنا چاہتے تھے۔ آفتاب بھائی نے اپنے کمرے میں یہ تختی آویزاں کر رکھی تھی۔

''اپنے باپ کی خاطر''

یہی تختی اُن کی تحریک کا باعث بنی اور وہ L.L.B. کر گئے۔

اسی خوف تلے خاں صاحب نے ایم اے اردو کیا۔ پھر اٹلی چلے گئے۔ وہاں فرانسیسی میں ڈپلوما لیا۔ اطالوی سیکھی۔ اُن کا پڑھنا لکھنا مسلسل تھا' لیکن وہ خالی علم کے قائل نہ جوانی میں تھے نہ بڑھاپے میں۔ اُن کے نزدیک علم ہمیشہ زانوئے تلمذ تہہ کر کے مؤدب ہو کر اپنا آپ مرشد کو ارپن کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی اپنی Will سرنڈر نہیں کرتا' تربیت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا یہی تصور ہر عمر میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا حتیٰ کہ مرشد ہی کی تلاش انہیں بابا نگری میں لے گئی۔ جب وہ اردو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے تو اُن کے رفیق کار حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری اُنہیں دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کے ڈیرے پر لے گئے' جہاں سے انہیں بابوں کی فضیلت' تربیت' اندازِ زیست کا چسکا پڑ گیا۔

بابوں کی تربیت کا جزوِ اعظم یہی ہے کہ پہلے انہیں خلق سے علیحدہ کر کے اللہ کی رضا تلاش کرنا ہوتی ہے۔ بابا جی اسے مستی پہرہ کہا کرتے تھے۔ جب وہ کسی انسان کے قریب نہ تھے۔ جانوروں' پرندوں کے ساتھ حشرات الارض اور

فطرت کی بولی سیکھتے تھے' بھوک پیاس سہتے تھے۔ پھر جب مستی پہرہ مجاہدہ' مشقت' خود اذیتی کا باب ختم ہو جاتا پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا جاتا۔ یہی کچھ خاں صاحب کے ساتھ ہوا۔ پہلے وہ اپنے اندر گم ہوئے۔ اندر اندھے کنوئیں میں گرے رہے۔ پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا گیا۔

خاں صاحب کے چھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ جس طرح آج لوگ نیویارک دیکھے بغیر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسی طرح 1- مزنگ روڈ دیکھے بغیر میں اس کے طلسماتی سحر میں مبتلا ہو گئی۔ خاں صاحب کی سب سے بڑی بہن فرخندہ آپا تھیں۔ دراز قد' کھلے کھلے ہاتھ پاؤں والی گوری چٹی مردانہ وجاہت' لیکن بڑی نرم دل خاتون جو زندگی کو ساری عمر ڈر ڈر کر گزارتی رہیں۔ اُن کی آنکھ میں بڑا لحاظ تھا۔ وہ خود بھی رسالہ ''مخزن'' اور ''عصمت'' میں مضمون لکھتی رہی تھیں اور انہوں نے ہی اشفاق احمد کو بیٹی پر لگا کر افسانہ نگاری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں اور خاص طور پر عورتوں میں مذموم رسم و رواج اور جہالت پر قلم کاری کیا کرتی تھیں۔ وہابی خیالات کی خاتون تھیں اور تعویذ گنڈے' قبر پرستی' مزاروں پر حاضری وغیرہ کو مسلم سوسائٹی کے لیے دیمک کی طرح بگاڑ کی وجہ سمجھتی تھیں۔

آپا فرخندہ کی شادی ڈاکٹر ایوب احمد خاں سے ہوئی تھی' جو جنگِ اسپین میں شرکت کر کے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی بصیرت افروز کتاب بھی لکھی جس میں Zionists کا پول کھولا اور ایسے ایسے سلوگن ایجاد کیے:

Democracy is demon-cracy

Tis sale money and weapons of war

Which corrodes the nations through.

Axe down the curse of usury!

And the world blooms, with you,

Like the beautious flowers, red and blue.

(The Sages of Ages)

وہ مغربی طاقتوں کا پول کھولنے اور ان کی منافقت سے مشرقی ممالک کو آگاہ کرنے والوں میں بہت پہلے سے واویلا مچا رہے تھے۔ ان ہی کے صاحبزادے جواد احمد خاں ہیں۔ ایوب بھائی آدرشوں سے محبت کرنے والے' لکھنے پڑھنے کی تحریکیں چلانے' اسرائیل کو مسلمانوں کا دشمن سمجھنے والے آدمی تھے۔ جب وہ لندن میں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں گئے تو آپا فرخندہ مزنگ روڈ پر منتقل ہو گئیں اور یہیں پر اُن کی بیٹی ناہید اشفاق احمد اور دوسرے بہن بھائیوں کی بہن بن کر پلی۔ اُن سے خاں صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ناہید کو شہد سے میٹھی اور چاند سے پیاری جیسے القاب دے کر خط لکھا کرتے تھے۔

آپا فرخندہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور اپنی خوبصورتی کے باعث باپ کی لاڈلی تھیں۔ اُن کے لیے نوکرانیاں مقرر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آپا جی کے لیے لاہور سے Pears کے صابن منگواتے تھے۔ ان کے پیروں کو مساج کے لیے اٹلی سے زیتون کا تیل امپورٹ کیا جاتا۔ ہر قسم کی کولڈ اور Vanishing کریمیں گھر میں آتیں حتیٰ کہ بابا جی اپنی ذہانت کے باعث فیسرین کریم بنانے میں کامیاب ہو گئے جو آج بھی مہاسوں' چھائیوں اور دانوں کے لیے

اکسیر سمجھی جاتی ہے۔ آپا جی کی اولاد میں ڈاکٹر جواد ساجد قابل ذکر ہیں' جو نامور مصری ڈاکٹر مگدی کے دستِ راس رہے اور خود بڑے نامور ہارٹ سرجن ہیں۔ ڈاکٹر جواد احمد اس وقت ہارٹ کے سرجن ہیں اور PIC میں CEO ہیں۔ اُس کے کام کی اتنی شہرت ہے کہ اُسے ہلال پاکستان بھی مل چکا ہے لیکن اُس کا طرۂ امتیاز اُس کے اپنے نزدیک کچھ اور ہے۔

جواد کے آباؤ اجداد کا گاؤں جہان خیلاں ہے جہاں اُن کی ایک بڑی متبرک درگاہ ہے۔ جہان خیلاں ہوشیار پور میں واقع ہے۔ یہ درگاہ سکھوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے متبرک ہے۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے درگاہ کے سکھ عقیدت مندوں نے جواد کو وہاں مدعو کیا۔ اُس کے ساتھ مل کر درگاہ پر چادر چڑھائی۔ جواد کے سر پر پگڑی باندھی۔ عظمٰی کے سر کو چادر سے ڈھانپا اور بارڈر تک اُسے چھوڑنے آئے۔ وہ جس فخر سے اس واقعے کا ذکر کر رہا ہے اُس کے سامنے اُس کی ہارٹ سرجری ماند پڑ جاتی ہے۔

آپا فرخندہ کے بعد آپا فرحت کا نمبر آیا۔ دونوں بہنیں لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ بابا محمد خاں چونکہ آپا فرخندہ کو زندگی بھر اولیت بخشتے رہے اور آپا جی ہی کی خاطر انہوں نے فیسرین ایجاد کی اس لیے ایک طرح سے دونوں بہنوں میں Sibling جیلسی کا رشتہ قائم ہو گیا جو ساری عمر آپا فرحت کے لیے احساسِ کمتری کا باعث بنا رہا۔ آپا فرحت حسن میں آپا فرخندہ سے کمتر تھیں۔ اس لیے انہیں گھر پر بی کلاس سٹیزن سمجھا جاتا تھا' لیکن اس درگزری کی وجہ سے اُن میں اصول پرستی اور انصاف طلبی بڑھی اور انہیں پاکستان کی تحریک سے گہری محبت ہو گئی۔ ان ہی آپا جی سے خاں صاحب کا گہرا رشتہ تھا اور وہ ہر وقت ان کا دُم چھلا بنے رہتے۔ دسویں جماعت کے بعد وہ ان ہی کے پاس فیروز پور میں منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ڈی اے وی کالج میں بڑے مشاعرے' مباحثے اور پڑھائی میں توجہ دی۔

آپا جی کے میاں ڈاکٹر عبدالقادر گائے طبیعت آدمی تھے۔ کلینک پر مریضوں کا دُم چھلا اور گھر پر آپا فرحت کے کھونٹے سے بندھے رہتے۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں خاں صاحب مائیک پکڑ کر اونچی اونچی تقریریں کرتے۔ آپا جی کو ایک تقریر کے موقع پر قید کر لیا گیا۔ وہ اپنے آدرش کی خاطر خندہ پیشانی سے جیل چلی گئیں۔ یہی پاکستان سے آدرشی محبت دونوں بہن بھائی کو پاکستان ساتھ لے آئی اور اسی کے باعث خاں صاحب نے پورے 39 سال تلقین شاہ لکھا۔

آپا جی کو اپنے بڑے بیٹے جاوید طارق (جو ان دنوں ہائی نون لیبارٹریز کے چیئرمین ہیں) کی بہت فکر تھی۔ جاوید بی اے میں تھا اور پڑھائی سے مکمل طور پر بے پرواہ۔ دائیں بائیں دوستی' یار باشی کا چسکا' وقت کا ضیاع اس کے مشغلے تھے۔ آپا جی نے جاوید کو میری شاگردی میں دے دیا۔ میں اُسے زیادہ تر انگریزی پڑھاتی تھی۔ 1951ء میں اشفاق صاحب اٹلی جا چکے تھے اس لیے آپا جی کے پاس آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جاوید جب پڑھنے آتا تو بیشتر وقت اپنا چھوٹا سا کتا ساتھ لے آتا اور نوٹس بنانے کے بجائے صرف زبانی لیکچر سننے پر اکتفا کرتا۔ کتے کو گود میں لے کر پڑھنا اور پھر نانغے بھی کرنا اس کا معمول تھا' لیکن یہی جاوید آگے چل کر ہائی نون لیبارٹریز کا خالق بنا اور میرے بیٹے انیس احمد خاں کو اپنی دامادی میں قبول کیا۔ میں ان دنوں اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 60- فیروز پور روڈ میں رہتی تھی۔ جاوید اور ناہید یہاں ہی پڑھنے آتے رہے۔

ان دو بہنوں کے بعد آفتاب بھائی کا نمبر آتا ہے۔ وہ چھ فٹے لمبے دبلے پتلے' لڑکیوں کی طرح شرمیلے' میٹھی

مسکراہٹ اور ہلکی کھلکھلاہٹ والے آدمی تھے۔ وہ کورٹ سے نکلنے کے بعد کبھی کسی کے متعلق تجسس' کھوج نہ لگاتے۔ غیبت جیسے مشاغل سے دور رہتے۔ خاں صاحب کا تعلق جب ایم اے میں مجھ سے پیدا ہوا اور انہوں نے میری تربیت' پرورش اور خوداعتمادی کو سہارے دینا چاہے تو آفتاب بھائی اس محبت میں گپ چپ شامل ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی کچہری سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج کے سامنے والی پٹڑی سے ہو کر اپنے گھر 1- مزنگ روڈ جاتے۔ راستے میں مجھ سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی اور ایک ہی ملاقات کے بعد انہیں مزید تعارف کی ضرورت نہ رہی۔ میری والدہ کو وہ آپا جان کہتے تھے۔ جب میرا پہلا مضمون Our Men چھپا تو پہلا تعریفی خط اُن ہی کا تھا۔ جب خاں صاحب اٹلی چلے گئے اور ہم سمن آباد میں منتقل ہوئے تو آفتاب بھائی اور آپا فرحت بھی سمن آباد آ دبکے تھے۔

آفتاب بھائی کے بعد افتخار بھائی اس دنیا میں آئے۔ ان میں بغاوت کا مادہ تھا۔ انہوں نے غالباً اپنے والد صاحب کو چڑانے کے لیے پڑھائی ادھوری چھوڑی اور بی اے نہ کیا۔ جب ڈاکٹر محمد خاں اپنے بیٹوں کو مارتے تو یہی بھائیوں کو چھڑاتے۔ سب سے زیادہ انہوں نے خاں صاحب اور اشتیاق کو چھڑایا۔ وہ انوکھا راستہ' انوکھی بات' انوکھا رویہ اختیار کر کے سب کو چونکا دیتے تھے۔ جب شادی کا مسئلہ چھڑا تو اپنی خالہ کی بڑی بیٹی باجی ضیاء کے ساتھ بیاہ کرنے سے منکر ہو گئے اور چھوٹی بہن آپی منیر کو دلہن بنا لیا۔ فیسرین کا کام والد کی حیاتی میں نہ کیا اور تخشن خان کی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے چلے گئے۔

افتخار احمد خاں بقول ساری دنیا کے ''ڈیڈی جی'' اونچے لمبے براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والے دیہاتی عادتوں والے ڈیڈی جی بڑے من موہن تھے۔ ہر انسان کا چلتے چلتے باتوں باتوں میں دل چرانے کا فن جانتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر طارق بن افتخار شکاگو میں بڑے نامور آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب اور میری وہ تصویریں بنائی ہیں جو آپ ہماری کتابوں کے پچھلے صفحے پر دیکھا کرتے ہیں۔

لیکن بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا سہرا ڈیڈی جی کی بیگم آپی منیر کو جاتا ہے۔ ڈیڈی جی اور اقبال بھائی نے اپنی خالہ کی دو بیٹیوں سے شادی کی' لیکن یہاں بھی تھوڑا سا گھپلا ہوا۔ باجی ضیاء بڑی بہن تھیں۔ انہیں اصولاً افتخار بھائی کی بیگم بنایا جانا چاہیے تھا لیکن دونوں بھائیوں نے دونوں بہنوں میں باہمی رضامندی سے اس طرح شادی کی کہ چھوٹی آپی منیر تو بڑے بھائی افتخار سے بیاہی گئیں اور باجی ضیاء کی شادی اقبال بھائی سے طے پائی۔ ڈیڈی جی کو بچپن سے کتوں کا شوق' کھیتی باڑی سے دلبستگی تھی۔ اس کا آپی منیر کو دلی قلق تھا۔

خاں صاحب نے روم سے واپسی پر شادی کا ارادہ کر لیا' تو اس گم سم شہزادے کا کوئی مددگار 1- مزنگ روڈ میں نہ تھا۔ ان دنوں ڈیڈی جی نچلی منزل میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے بھائی کی مشکل کو بھانپ لیا۔ یا پھر مفتی جی نے انہیں رازداں بنایا۔ وہی میری والدہ تک پہنچے۔ وہی نکاح خواں لائے۔ ان ہی کے دستخط نکاح نامے پر ہوئے۔

455- این سمن آباد میں ہماری شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ میں نے پرانا سفید شلوار قمیض پہنا' خاں صاحب معمولی لکیروں والے کرتے میں ملبوس تھے۔ مفتی جی' محمد حسین آرٹسٹ اور ڈیڈی جی براتی تھے۔ ریزی اور محمودہ اصغر میری والدہ سمیت مائیکہ والے تھے۔

نہ کوئی ڈھولک بجی نہ کوئی مہندی کی رسم ہی ہوئی۔ نکاح کے بعد خاں صاحب نے اپنی پاس بک میرے ہاتھوں میں چپ چاپ تھمادی۔ اس میں نو سو روپے جمع تھے۔ محمودہ اصغر کی شناخت کا ایک حوالہ خالدہ حسین ہے جو اُس وقت چھوٹی سی خالدہ اصغر تھی۔ محمودہ اور خالدہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اصغر صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

اس شادی کی خبر جب پھیلی تو بابا جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا۔ البتہ افتخار بھائی اور آپی جی کو گھر سے نکال دیا۔ اپنا بوریا بستر اُٹھا کر اپنے بچوں سمیت ڈیڈی جی میری خالہ کے پاس 450-این سمن آباد آ گئے۔ آپی جی بڑی ہمت والی ساتھ نبھانے والی خاتون تھیں۔ اُن کے بیٹے طارق' حارث اور عدنان کریسنٹ ماڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ آپی جی نے بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ اپنے بیٹے طارق کو میری گود بٹھا کر گود بھرائی کی رسم ادا کی اور اس طرح طارق بن افتخار میرا متبنیٰ بن گیا۔ یہ نبھانے والے لوگ ہیں۔ طارق نے رسم کی لاج رکھی اور آج تک اُس نے اپنے چچا اور میری ایسی عزت اور محبت کا مظاہرہ کیا جو اس رسم کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کچھ دیر تک ڈیڈی جی اور آپی میری خالہ کے پاس رہے۔ اتنا بڑا حادثہ یا واقعہ رونما ہوا۔ گھر بدری کے باوجود آپی نے ہمت نہ ہاری اور بچوں کو اسی زور شور سے پڑھاتی رہیں' جیسے وہ 1-مزنگ روڈ پر کمر بستہ رہتی تھیں۔ میری خالہ بھی بچوں کو حساب پڑھانے میں آپی جی کی مدد کرتی رہیں۔

اور جب کچھ عرصہ بعد قتیل شفائی کے پڑوس میں ڈیڈی جی 427-این ٹاپ میں منتقل ہو گئے تو آپی جی بچوں کی تعلیم کی طرف اور بھی مستعد ہو گئیں۔ وہ بچوں کو بڑے جوش و خروش سے پڑھاتیں۔ محبت اپنی جگہ وہ مکے' گھونسے اور تھپڑے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ میں آپی جی کے اس پہلو سے بہت متاثر تھی۔

میں نے بھی کہیں اندر یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اولاد ہونے پر خود انہیں تعلیم دوں گی' لیکن ایم اے پاس ہونے کے باوجود معمولی ایف اے پاس آپی منیر کا میں مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ مجھ میں نہ وہ ڈسپلن تھا نہ میں سائنسی علوم ہی سے واقف تھی نہ پڑھانے کے علم سے آگاہ۔ آپی نے بچوں کو علم میں خود کفیل کر دیا۔ میں نے بچوں کے ہوم ورک خود کر کر کے انہیں اپنے اوپر انحصار کرنے کا طریقہ سکھا دیا۔

اس کی وجہ میری شخصیت کا نقص ہے جس کا علم اب مجھے حاصل ہوا۔ میں خدمت کر کے اپنا جھنڈا بلند کرنا چاہتی ہوں۔ میری شیخی مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتی کہ میں اس شخص کی فلاح کا سوچ سکوں جس کی مدد کرنے پر میں مصر ہوتی ہوں.....خیر!

میں اور خاں صاحب روز شام کو آپی جی اور ڈیڈی کے گھر جاتے۔ وہاں کھانا کھاتے۔ اُن کی بڑی بیٹی لبنیٰ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور کبھی کبھی میرے ساتھ سو جاتی تھی۔

مکتسر میں اقبال بھائی ایک طور پر بابا جی سے بغاوت پر آمادہ رہتے' لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ کبھی بھی منہ در منہ بحث کر سکتے۔ افتخار بھائی کی طرح انہیں بھی پڑھائی سے نفرت تھی۔ اقبال بھائی خاں صاحب سے مشابہہ بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے گرد حسیناؤں کا گھیرا رہتا۔ انہیں لوگوں کی توجہ لینا مشکل نہ تھی۔ گھر کی مامائیں' اصیلیں' مہریاں سب اُن کی بات جلدی مان لیتیں۔ سب سے پہلے اُن کے کپڑے دُھلتے۔ اُن کا بستر جھاڑا جاتا۔ اُنہیں لسی

ایسی دی جاتی جس میں مکھن کا پیڑا تیرتا۔ اسی وجاہت کے باعث وہ جلد اپنی خالہ زاد باجی ضیاء کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

اسحٰق بھائی بھائیوں میں ماسٹر مائنڈ تھے۔ انجینئر طبع سوچ اور عمل کے بندے تھے۔ اُن کے متعلق کچھ کہانیاں سب بہن بھائی اپنے اپنے رنگ میں سناتے ہیں۔ مکتسر میں ٹیلی فون صرف ڈاک بنگلے میں تھا۔ یا لدھا رام کے گھر تھا جو ہندو سیٹھ تھا اور کاٹن کا بزنس کرتا تھا۔

حسنِ اتفاق سے اس ٹیلی فون کی تار باباجی کے گھر سے گزرتی تھی۔ ججو بھائی کے دل میں سمائی کہ گھر کے اُوپر سے گزرنے والی تار پر ذاتی تار پھینک کر ٹیلی فون اپنے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اب ٹیلی فون کی تار کا مسئلہ اُٹھا۔ مکتسر سے کوٹ کپورہ سات میل دُور تھا۔ وہاں ٹیلی فون کی تار ملنے کے امکانات تھے۔ اس کام کے لیے خاں صاحب کو چنا گیا کیونکہ ججو بھائی کا خیال تھا کہ ان کا چہرہ بھولا بھالا ہے۔ کوئی تار کے متعلق سوال جواب نہ کرے گا۔

سکول سے فرار ہو کر خاں صاحب کوٹ کپورہ پہنچے۔ بڑی مشکل سے تار چرائی اور گھر آئے۔ اب ججو بھائی نے اوپر گزرنے والی تار پر کانٹی مار کر اپنی تار کا Connection لگایا۔ لیجیے چرایا ہوا فون اور کھسکائی ہوئی تار کامیاب رہے اور لدھا رام کی دکان سے فون مل گیا۔ اب فون پر کپاس کی خرید و فروخت اور روئی کے بھاؤ آنے لگے۔

اسحٰق بھائی نے سوچا کہ بم بنانا چاہیے۔ اس بم کا مصرف کیا ہوگا۔ یہ انہوں نے نہ سوچا۔ ایک طبعی سائنسدان کی طرح انہیں صرف بم کی ایجاد سے غرض تھی۔ اب گھریلو بم کے لیے منچھل پٹاس اور پارے کی ضرورت تھی۔ منچھل پٹاس تو بازار سے مہیا کی جا سکتی تھی لیکن پارہ کمیاب بھی تھا اور اس کے خریدنے کی پسلی بھی نہ تھی۔ سکول میں سائنس لیبارٹری میں قریباً دو سیر پارہ پڑا تھا۔

اب یہ سوچنا تھا کہ پارہ وہاں سے کیسے اُڑایا جائے؟ بڑے بھائیوں سے بات چیت مشکل تھی۔ اشتیاق ابھی چھوٹا اور بے سمجھ تھا۔ طے یہ ہوا کہ خاں صاحب اوور کوٹ پہن کر جائیں اور پارہ لیبارٹری کی بوتل سے چرا کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور گھر لے آئیں۔

جب شفقو اوور کوٹ پہن کر سکول پہنچے تو سب حیران کہ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کیوں؟ بہانہ بھی پہلے تراش کر دیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے سب سے کہا کہ ملیریا بخار ہے، بہت سردی لگ رہی ہے۔ مشکل سے لیبارٹری تک رسائی ہوئی۔ پارہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر چوروں کی طرح باہر نکلے۔

دو ڈھائی سیر پارے کی وجہ سے ایک سائیڈ جھکی ہوئی تھی۔ بہرکیف جیسے کیسے پارہ اوپر والے کمرے میں جہاں سائنسی تجربہ گاہ تھی، پہنچایا گیا۔ ججو بھائی نے منچھل پٹاس، پارہ اور جانے اور کیا اجزاء ملا کر ایک چھوٹا سا تجرباتی بم تیار کر لیا گیا۔ بدقسمتی سے یہاں ہی کبوتروں کی چھوٹی چھوٹی کابکیں تھیں۔ ماچس کی خالی ڈبیا میں ایک چھوٹا سا بم بنا کر رکھ دیا گیا۔

یہ بھائی مزے لے لے کر غلط انفرمیشن بہم پہنچاتے۔ لدھا رام علیحدہ پریشان۔ ڈاک بنگلے میں کسی نہ کسی افسر کی آمد کی اطلاع دیتے، کمرے بک کرا دیتے، متعلقہ افسر کبھی نہ پہنچ پاتا۔ ڈاک بنگلے کے کارندے بستر تولیے تبدیل کر کھانا وانا پکا کر منتظر رہتے۔ یہاں تک تو خیر ذہانت کی چمکار دکھانا مقصود تھا، لیکن ایک اور سائنسی تجربہ خطرناک صورت اختیار کر گیا۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اوپر والی منزل میں چھوٹی چھوٹی کابکیں باباجی کے کبوتروں کے لیے تھیں۔ ان میں کبوتر لمبی اڑانوں کے بعد بسرام کرتے۔ ان کابکوں کو صاف کرنے پر ملازم مامور تھا۔ جو بھائی کا تجرباتی بم ایک کابک میں چھپایا گیا تھا۔ جس وقت طوطی ان کابکوں کو صاف کر رہا تھا تو اُس نے ماچس کو گندی چیز سمجھ کر اپنے پیروں سے دوفٹ دور پھینکا۔ یوں تو شاید بم دیر تک پڑا رہتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی.....

اب جو اسے زور سے فرش پر دے مارا تو بم فعال ہوا اور اس نے یہ کرتب دکھایا کہ طوطی کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا اڑ گیا۔ لہو کی دھار ناک تک پہنچی۔ طوطی نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ باباجی کوٹھے پر بھاگے آئے۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد سب بچوں کو لائن اپ کرلیا۔ ایسی قرار واقعی سزا دی کہ سب کی سٹی گم ہوگئی۔ نانی اماں ہاتھ جوڑتی پھریں۔ اماں جی نے بچوں کی طرف سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں لیکن باباجی نہ مانے۔ اوپر کے کمروں تک اسحٰق، اشفاق اور اشتیاق کی رسائی بند ہوگئی۔

لیکن اس سزا کا سارا فائدہ بچوں ہی کو پہنچا۔ خاں صاحب اپنی ادبی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور جو بھائی کو بھی ادبی خمیر لگا دیا۔ تقو پیدائشی ایتھلیٹ تھا۔ وہ کھیلوں کی طرف راغب ہوگیا اور یوں ان تینوں کو اپنی صلاحیتوں کا سراغ مل گیا۔

اشتیاق اپنی فوجی صلاحیتوں کو بھانپ کر فوج میں چلا گیا۔ اسحٰق بھائی کو ہوائی جہازوں نے متاثر کیا اور وہ ایئر فورس میں بھرتی ہوگئے، لیکن جب وہ سکواڈرن لیڈر تھے تو اچانک نوکری چھوڑ کر مزنگ روڈ آ بسے۔ واپسی کا چکر ان کی ایجادات کی صلاحیت اور اُپج تھی۔ وہ فیسرین کریم کو نیا Get up اور خوبصورتی عطا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا لیبل ماڈرن کرنے کے آرزومند تھے۔ یہ میری شادی سے بہت پہلے کی باتیں ہیں۔

جو بھائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ باباجی پورے آمر ہیں انہوں نے مغربی ممالک کی کریم ساز کمپنیوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان میں نیویا، الزبتھ آرڈن، کی نائیٹ اور وینشنگ کریم پیش پیش تھیں، لیکن باباجی پرانے خیالات کے تھے۔ وہ کسی مارکیٹنگ کی خاطر نہ تو فیسرین کی شیشی بدلنا چاہتے تھے اور نہ اس کا لیبل ہی۔ اس دوغلی حکومت میں انجام کار دونوں ہی ناخوش ہوکر رہ گئے۔

پھر اماں جی سردار بیگم اور اسحٰق بھائی کی بیگم ذکیہ جی میں بھی خیالات کے ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ مزنگ روڈ میں کسی قسم کا تہوار، سالگرہ، عیدیں منانے کا رواج نہ تھا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ بڑے دھوم دھڑکے سے منائی۔ باباجی تو خیر شریک ہی نہ ہوئے۔ اماں جی موجود تو رہیں لیکن شریک نہ ہوئیں۔ اس سرد جنگ کے نتیجے میں جو بھائی نے بوریا بستر باندھا اور میسن روڈ پر واقعہ ایک بنگلے میں جا بسے۔

یہاں ایک نئے ماحول میں جو بھائی نے نیوسیما کریم ایجاد کی۔ اس کی مارکیٹنگ کے لیے کوشاں رہے لیکن ایک تیکر مشیت ایزدی بھی ہوا کرتا ہے۔ نیوسیما نہ چل سکی۔ ذکیہ جی ایک ایسی باحوصلہ بیوی تھیں جس نے ہر جگہ ہر کام میں اسحٰق بھائی کا ساتھ دیا۔ نیوسیما کریم بنانے، پیک کرنے میں ساتھ لگی رہی۔

جب نیوسیما فیل ہوگئی تو یہ میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ شادی سے پہلے ذکیہ جی نے ہال روڈ پر واقعہ سنگر کے

سکول سے سلائی اور کشیدہ کاری کا کورس کیا تھا۔ جب یہ دونوں کینیڈا پہنچے اور روزگار کی تلاش ہوئی تو ذکیہ جی نے اسی کورس کا فائدہ اٹھا کر وہ سلائی کی کہ دلہن کا سفید لباس سینے پر جلد ہی مامور ہو گئیں۔ وہاں بھی جو بھائی نے نیو سیما بنائی، لیکن مقابلہ سخت رہا اور یہ کریم مسابقت کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

بچپن میں خاں صاحب اور تقو اپنے رنگ لیڈر جو بھائی کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اقبال بھائی کی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ آفتاب بھائی سے فاصلے پر مؤدب رہ کر اُن کی عزت کیا کرتے تھے۔ اُن کی بہنوں نے انہیں گودوں کھلایا تھا۔ اُن سے رشتہ چھوٹی امی کا سا تھا۔

بچپن میں جب اُن کے کانوں میں پٹھانوں کی روایات اور رسم و رواج کا چرچا پڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ پٹھانوں کے دو قبیلے ہجرت کر کے پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ نیازی قبیلہ ہوشیار پور میں قیام پذیر ہوا۔ ان میں عمران خاں نے نیازی قبیلہ کا نام روشن کیا۔ یہ لوگ مہمند قبیلے سے زیادہ پڑھے لکھے اور فارغ البال تھے۔ مہمند قبیلے نے جالندھر میں پڑاؤ ڈالا اور ان کی شہرت کا باعث اشفاق احمد بنے۔

بابا جی ضلع فیروز پور میں مکتسر آ گئے۔ یہ سکھوں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ ان کے ایک گرو یہاں مقیم رہے۔ مکتسر کے لفظی معنی مکتی کا تالاب ہے۔ امرتسر میں امرت کا تالاب ایک بہت متبرک جگہ مانی جاتی ہے۔ بابا جی نے اپنے سارے بچے میونسپل بورڈ سکول میں داخل کروائے لیکن شاید اپنی شناخت کی فکر میں شفو جی کو اسلامیہ دینی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔

یہ سکول مسجد میں قائم تھا۔ یہاں ہی خاں صاحب نے بچپن ہی میں بہت سے دینی مسائل رٹ لیے۔ اس سکول میں ٹاٹوں پر بیٹھتے۔ قلمیں گھڑ کے دوات میں کپڑے کا سوف ڈال کر کالی سیاہی بنا کر قلم سے لکھا جاتا۔ خاں صاحب کو تختی پر لکھنا، تختی کو دھو کر گاچنی مل کر صاف کرنے کے لیے سکھانا بڑے تخلیقی عمل لگتے۔

پھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر پانچویں جماعت میں خاں صاحب کو بھی انگریزی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سرکاری سکول میں پہنچتے پہنچتے خاں صاحب کے پاس تقابلی مقابلے کا مواد بہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی پڑھنے والوں میں ایک خاص قسم کا تکبر تھا اور وہ مقامی لوگوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ اُن کی دائی مائی کا بیٹا مسجد سکول میں اُن کے ساتھ پڑھتا تھا اور اُس کی خطاطی بہت خوبصورت تھی اور شفو جی اُس سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

خاں صاحب کے گھر میں ایک ملازم بھینسوں کی دیکھ ریکھ پر مقرر تھا۔ وہ دُور سے آتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر بتا دیتا کہ بھینس کس کی ہے اور آٹھویں مہینے میں ہے اور اس بار کٹا دے گی۔ پھر جب اگلے مہینے بھینس کٹا دیتی اور اُس کی پیشانی پر ویسا ہی سفید داغ ہوتا جس کی پیش گوئی ملازم کر چکا ہوتا، تو شفو جی حیران نہ ہوتے۔

بادلوں کو دیکھ کر بارش کے متعلق جو کچھ ملازم بتاتے عموماً ٹھیک نکلتا۔ چھوٹی عمر میں خاں صاحب اس حقیقت سے دوچار ہو گئے کہ پڑھے لکھوں کا علم اپنی جگہ لیکن دانش و فراست میں تجربے اور زندگی سے سیکھنے کے عمل میں ان پڑھ بھی اپنا ایک جداگانہ علم اور مقام رکھتے ہیں۔

دسویں مکتسر سے کرنے کے بعد خاں صاحب اپنی بہن آپا فرحت کے پاس فیروز پور چلے گئے۔ یہاں پر آپا جی کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر پرائیویٹ پریکٹس کرتے تھے۔ شروع میں تو ان کی فیس چار آنے تھی اور پریکٹس میں بڑی دقت

پیش آئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی انسان دوستی اور اخلاق نے رنگ دکھایا۔ ڈاکٹری کا دھندا چل نکلا۔

خاں صاحب کو فیروز پور میں رام سکھ داس کالج میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں اُن کی نصابی کارکردگی تو نہ چمکی لیکن اپنی خوبصورتی، جامہ زیبی، طرحداری کی وجہ سے ہم جماعت طالب علموں میں ان کا نام اُبھرنے لگا۔ ان ہی دنوں اُن میں سے شاعر کروٹ لے کر بیدار ہوا جو پھر نثر کی طرف مڑ گیا اور پھر لمبا چکر کاٹ کر اردو بورڈ سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجابی نظموں کی شکل میں بیدار ہوا۔ وہ شاعری جو رام سکھ داس کالج میں جاگی اور ساری جوانی سلیپنگ بیوٹی کی طرح سوئی رہی، مجموعے لے کر ''کھیاوٹیا'' کی شکل میں دوبارہ بیدار ہوئی۔

سنا ہے جب وہ بی اے میں تھے تو کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ خاں صاحب کالی شلوار قمیض میں مائیکروفون پر پہنچے اور اپنی غزل پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس غزل کا ایک شعر جو سارے کالج میں زبانِ زد عام ہوا یہ تھا:

ع کہکشاں بن گئی ہر راہگذر آج کی رات

لیکن گورنمنٹ کالج پہنچ کر جو کچھ ہوا وہ تو آپ تک ہولے ہولے ہی پہنچ پائے گا۔

تقو بیچارہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ بڑے بھائیوں کا ٹولا اُسے قابلِ اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ اسحٰق بھائی اور شفو جی اُسے ساتھ ساتھ لیے پھرتے لیکن اُس کی حالت کنجی برادری سی تھی۔ دراصل خاں صاحب اور تقو کے درمیان ایک بیٹا اور بھی باباجی کو عطا ہوا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کا کے کو اشتیاق ''کالی بھونڈی'' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ خاں صاحب پورے چار سال تقو سے بڑے تھے۔ وہ اور جو بھائی تقو کو ساتھ ساتھ رکھتے لیکن جب وہ صبح کو ملتسر کے تالاب میں تیرنے جاتے تو تقو کو سوتا چھوڑ جاتے۔

تقو کو اس بے وفائی پر بہت ملال تھا۔ وہ خاں صاحب کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ تقو نے بالآخر یہ ترکیب سوچی کہ رات کو اس وقت تک جاگتا رہتا جب تک شفو جی سو نہ جاتے۔ پھر وہ کمال آہستگی سے اپنا ازاربند خاں صاحب کے کمربند سے باندھ دیتا۔ شفو جی جب تالاب پر جانے کے لیے اُٹھتے تو ازاربند کی کھینچ پڑتے ہی تقو جاگ جاتا۔

اب بڑے بھائی تقو کو ساتھ لے جانے پر متامل ہوتے لیکن تقو دھمکی دیتا کہ اگر مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے تو میں باباجی کو جگادوں گا۔ مارے باندھے تقو کو ساتھ لے جانے لگے اور بہت جلد تقو ان دونوں سے بہتر تیراک بن گیا۔

یوں تو ہر شخص پر بچپن کی چھاپ گہری ہوا کرتی ہے لیکن خاں صاحب اپنے اس آبائی وطن کو کبھی نہ بھولے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ کہیں اور پروان چڑھے ہوتے تو شاید اُن کی تخلیقی توتوں کو یوں پنپنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ ساری عمر اپنے اسی بچپن کی شکرگزاری میں مبتلا رہے جس نے انہیں کچھ باتیں ذہن نشین کرادیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ بچپن میں عام انسان کے اس قدر قریب نہ رہے ہوتے تو وہ کبھی سمجھ نہ پاتے کہ غریب آدمی کا بنیادی مسئلہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی ضرور ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ ''عزتِ نفس'' ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عام آدمی کو روٹی، کپڑا اور مکان میسر آجاتا ہے لیکن وہاں عزتِ نفس نہیں ملتی تو وہ بظاہر زندہ رہتا ہے لیکن اندر سے مر جاتا ہے۔

اُن کا یقین کامل تھا کہ پاکستان کا خواب دراصل اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دیکھا گیا تھا کیونکہ 1947ء سے پہلے اونچی ذات کا ہندو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ہندوستان کی باقی ساری جاتیاں شودر

تھیں۔ مسلمان تو خاص طور پر ایسے ملیچھ تھے جن کے برتنوں میں کھانا پینا' اپنا مذہب بھرشٹ کرنے کے مترادف تھا۔ ہر حکومت' تحریک' سیاست کا بنیادی مسئلہ دراصل عزت نفس کی بحالی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب نعرہ بازی ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنے نظریے میں حق بجانب تھے بھی یا نہیں؟

ان آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ آپا فرخندہ کی سب سے بڑی بیٹی ناہید بھی مزنگ روڈ میں ہی پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ خاں صاحب اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ناہید کی شادی جہلم میں پرائم گلاس فیکٹری کے ساجھے مالک رشید احمد خاں سے ہوئی۔ اُس کے چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ربیقہ بڑی صالح روح ہے۔ وہ عورت کی نو حاصل کردہ آزادی اور مذہب کی حدود کے امتزاج کو اعتدال سے سمجھ گئی ہے۔ حجاب بھی پہنتی ہے اور جہلم میں انگریزی میڈیم سکول کی منتظم بھی ہے۔ گاڑی بھی چلاتی ہے۔ اے لیول' او لیول کی تیاری بھی کراتی ہے لیکن آزادی کے ہمراہ بے راہ روی کو اپنے اُوپر جائز نہیں سمجھتی۔

ایک بیٹی ثانیہ جو ماں کی طرح آرٹسٹ نکلی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کینیڈا جا بسی۔ مغربی ماحول نے اُسے صیقل کیا۔ وہ اپنی تصویروں کی نمائش لگاتی ہے۔ فرانس جرمنی جا کر اُس نے اپنے کام کی بدولت بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔

ایک بیٹا میمون رشید اور اُس کی من موہنی بیوی ازکا لاہور میں سیٹل ہو گئے ہیں اور بڑی خاموشی سے ایک بڑی کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

لیکن ناہید کی اصل وجہ شہرت ڈاکٹر حسنات احمد خاں ہیں' جو غالباً آج کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حسنات اور ڈیانا کی محبت اب پبلک پراپرٹی ہے۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کئی پروگرام ٹیلی ویژن پر بھی آ چکے ہیں' جن میں ایک انٹرویو خاں صاحب کا بھی بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

میں نے تعارف کے طور پر آپ کو خاں صاحب کے گھر والوں سے ملا دیا ہے۔ اس گھر میں جا بجا چراغ' فانوس' شمعیں' روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاں صاحب کے علاوہ اس گھرانے میں طارق بن افتخار جیسے قابل سرجن ہیں جو انٹرنیشنل فوٹوگرافر بھی ہیں۔

جس طرح جواد ساجد نے آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب کا نام روشن کیا اور جیسے آپا فرحت کے بیٹے جاوید نے دوائیوں کی دنیا میں تہلکہ مچایا' ایسے ہی ڈاکٹر طارق بن افتخار نے بڑی انٹرنیشنل شہرت پائی ہے۔ دو سال پہلے جب باغ میں زلزلہ آیا تو طارق اپنے ساتھ کچھ امریکی سینٹر لے کر باغ پہنچا۔ سینٹر تو رفاہی کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن طارق نے ان گنت ہڈیاں جوڑیں..... لیکن خاندان میں اس کا چرچا نہ کیا۔ وہ کامیاب بھی ہے اور بڑا انسان بھی..... یہ دونوں خوبیاں ایک ہی انسان میں کم کم ہوتی ہیں۔

اور پھر حسنات ہے۔ وہ بھی بنیادی طور پر بچوں کے دل کا آپریشن کرتا ہے اور لندن میں اُس کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔

میں نے خاں صاحب کے خاندان اور اُن کے چیدہ چیدہ مشہور آدمیوں کو آپ سے اس لیے روشناس کرایا ہے

کہ شتے بھی ان لوگوں کی محبت میں گندھے ہوئے تھے۔

اشفاق صاحب نے دنیا کمائی تو بیوی بچوں کے لیے لیکن یقین جانئے وہ دنیا سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ تحقیق کی غلام گردشوں میں پھرتے رہے۔ ایک مدت انہوں نے رشتے ناطوں کو اپنا سرمایہ سمجھا۔ خاں صاحب کو سمجھنے کے لیے کسی وقت بھی یہ دھاگے ہاتھ سے چھوڑے نہیں جاسکتے۔ گو آخر میں غالباً وہ بھی جان گئے تھے یہ سب بتانِ وہم وگماں ہیں اور اُن کی تلاش کا راستہ اور جانب جا نکلا تھا لیکن ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھے بغیر ایک قاری اشفاق احمد کی تصویر میں لگی بیک گراؤنڈ کو نہیں سمجھ سکتا!

اسی لیے میں نے اُن کا شجرۂ نسب بھی ساتھ نتھی کر دیا ہے کیونکہ یہ نام، یہ رشتے جابجا آئیں گے، کبھی کبھی تو اتر کا شبہ ہوگا، کبھی دوہرائی بات دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن کیا کیا جائے زندگی ہمیشہ سیدھی لائن کا سفر نہیں کرتی۔ کبھی کبھی اس کا سفر دائرے کا بھی ہوتا ہے۔

محمد مستقیم خاں (ہجرت کر کے آنے والے)

↓

محمد معظم خاں

↓

دوست محمد خاں

↓

بابا محمد خاں + بی بی سردار بیگم

1. آپا فرخندہ (ڈاکٹر ایوب کی اہلیہ) 20 مئی 1912ء
2. جناب آفتاب احمد (سرکاری وکیل) 20 مئی 1912ء
3. آپا فرحت (زوجہ ڈاکٹر عبدالقادر) 16 مئی 1916ء جاوید طارق خاں وسیم خالدہ ندیم کی والدہ
   ↓
   جاوید طارق خاں ہائی ٹون لیبارٹری اشفاق صاحب کے سمدھی ثویلہ بیٹی سے جناب انیس احمد خاں کی شادی ہوئی
4. افتخار بھائی 18 مئی 1918ء (بخشن خاں کی زمینوں پر کھیتی باڑی اقبال بھائی کے سمدھی ڈاکٹر طارق بن افتخار سرجن کے والد)
5. اقبال بھائی (بابا محمد کے ٹرسٹ کے امین ۔ بخشن خاں) 20 مئی 1920ء افتخار بھائی کے سمدھی
6. اخلاق احمد خاں 18 مئی 1922ء
7. اشفاق احمد خاں 22 اگست 1925ء
8. اشتیاق کالی بھونڈی (عمر دو سال)
9. ریٹائرڈ بریگیڈیئر اشتیاق احمد خاں (کور کمانڈر) 1929ء

لیڈی میکلیگن کالج سے سانده کلاں تک

قیامِ پاکستان کے بعد فضا ابھی ایسی باتوں سے بوجھل تھی جن سے مسلمانوں کے نا آسودہ سوالات' ان کی بے چارگی کی کہانیاں اور چھوڑے ہوئے گھروں کے Nostalgia کی خوشبو آتی تھی۔ کچھ لوگ بہادر تھے جو جملہ قربانیوں کو اس ملک کے قیام کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں پچھلے گھر' آبائی وطن' وہاں کے موسم' رہن سہن' دوست احباب بھولے نہ بھولتے تھے۔ وہ پاکستان میں رہتے ہوئے یہاں کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے باوجود سدا بن پانی کے پودے کی طرح سسکتے رہتے۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو ابھی بین بین چل رہے تھے۔ کبھی نئے وطن کی عافیت اور راحت کے شکر گزار ہوتے' کبھی پچھلی یادوں میں ڈوب کر گلہ گزار بن جاتے۔

کئی پشتوں سے اشفاق صاحب کا گھرانہ تعلیم یافتہ اور سیاست سے وابستہ رہا تھا۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت نے جدوجہد پاکستان میں بڑا عملی حصہ لیا تھا۔ تقریریں کی تھیں۔ قائداعظمؒ کے مؤقف کو' پاکستان کی اہمیت کو لوگوں تک پہنچانے میں ریڑھوں پر چڑھ چڑھ کر مخاطب کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جیل بھی بھگتی تھی۔

جب لوگ نعرے لگاتے "پاکستان کا مطلب کیا؟"

تو خاں صاحب اُن کے ساتھ مل کر جواب دیتے "لا الہ الا اللہ۔"

پھر وہ مجمع کو دونوں ہاتھوں سے شانت کرتے اور اپنی تقریر کرتے جس میں ایک ہی بات پر زور ہوتا کہ پاکستان میں لوگ وسائل کے حصول کے لیے دیوانہ وار نہیں بھاگیں گے۔ چونکہ معاشرہ اسلامی اقدار پر قائم ہوگا اس لیے انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا' لیکن سب سے بڑی بات پاکستان میں یہ ہوگی کہ اس دیس میں سب کی عزتِ نفس محفوظ ہوگی۔ وہ ذلت جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کا نصیب تھی' اب ایسی ذلت سے کوئی مسلمان دوچار نہیں ہوگا۔

وہ جانتے تھے کہ قائداعظمؒ نے جداگانہ حق خود ارادیت کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں سے اُن ہی کا نمائندہ منتخب کیا جائے۔ پنڈت نہرو چودہ نکات پر مشتمل دستاویز پر کلی طور پر متفق تھے لیکن پھر اسی سے منکر ہوگئے.... قائداعظمؒ نہ دھرنا مارتے تھے نہ جھگڑا کرنے کے قائل تھے نہ

جیل جا کر وقت ضائع کرنے کے ہی شوقین تھے۔ انہیں آئینی جنگ جیتنے کا خیال رہتا۔ انہوں نے مسلمان اقلیت کو ایک نئے ملک کا سندیسہ دیا جس میں جا کر یہی اقلیت راتوں رات اکثریت میں بدل جائے گی۔

خاں صاحب پر قائداعظمؒ کی تعلیمات اور ترغیبات کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر نہ کبھی دھرنا اختیار کیا نہ باآواز بلند احتجاج کیا، نہ کبھی اپنے قلم کو مزاحمتی ادب کی طرف راغب کیا۔ وہ اپنے میں توانائی، تقویت، خودارادیت اور لگن پیدا کرتے اور بڑی ثابت قدمی سے استقامت کے ساتھ منزل کی طرف چلتے رہتے۔

اُن کا ہیرو گاندھی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوال کرتے کہ مہاتما گاندھی تو فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے۔ اُن کے چاہنے والوں نے سرکارِ انگلشیہ کی لاٹھیاں کھائیں، آنسو گیس کے ہاتھوں روئے، لیکن پلٹ کر ایک پتھر، روڑا بھی ان مظالم توڑنے والوں پر نہیں پھینکا۔ پھر یہی ہندو جنتا جس کا ''اہنسا'' پرچارک مسلک تھا، مسلمانوں کے خون سے کیوں داغ دار ہوا؟ ان کے ہاتھوں مسلمان خواتین کی عصمتیں کیوں داغدار ہوئیں؟ بہار کے مسلمانوں پر جب تشدد ہوا تو مہاتما گاندھی نے زبان کیوں نہ کھولی؟ وہ بہار کے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے کیوں نہ پہنچے؟ اس معاملے میں اُن کا فلسفہ عدم تشدد کیوں خاموش رہا؟ پھر جب پنڈت جواہر لعل نہرو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں خود جا کر کشمیریوں کا حق ارادیت مان آئے تھے تو پھر ہندوستان نے اس وعدے کا پاس کیوں نہ کیا؟ شیخ عبداللہ کو میر جعفر کا جیتا جاگتا روپ دے کر اُسے کشمیر پر مسلط کیوں کیا؟ کشمیریوں کی جنگ آزادی کو بغاوت کا نام دے کر اس پر فوج کشی کیوں کی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ساز باز کر کے گورداسپور کا علاقہ جہاں مسلم اکثریت تھی، ہندوستان کے حوالے کیسے کر دیا؟

گلی کوچوں میں، والٹن کیمپ میں جہاں جہاں رفیوجی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے، کہانیاں خون آشام تفاصیل سے داغدار گھوم پھر رہی تھیں۔ تیج بہادر سپرو، مظہر علی خاں، علی برادران، حسرت موہانی ابھی زندہ ہیرو تھے لیکن اس آدرشی گفتگو کے ساتھ دنیاوی مسائل حل کرنے کی ضرورت بھی بہت اہم تھی۔ مقامی انصار کی پُرجوش مدد ناکافی تھی۔ لوگ مال غنیمت سمیٹنے، تالے توڑنے، گھروں پر ناجائز قبضہ جمانے کا شعار بھی اپنائے ہوئے تھے۔ روزگار کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ حکومت ابھی استوار نہ ہوئی تھی۔ روزمرہ کے مسائل، مادی ضرورتیں، صبح وشام کے مسائل بھولے نہ بھولتے۔

اسی فضا میں جو تضاد تھا، نیکی اور بدی کی جو آمیزش تھی، گندے اور صاف لہو کا بیک وقت دل میں رہنے سے جو آری ہر وقت لوگوں کے اندر چلتی تھی، اس سے خاں صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

خاں صاحب کا خاندان لٹا پٹا پاکستان پہنچا۔ بابا جی اس چھوٹے سے قافلے کے سربراہ تھے۔ بابا جی کے چھ بیٹے اور دونوں بیٹیاں ساتھ تھیں۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اتنے سارے لوگ کہاں سے کھائیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ ایسے میں یہ لوگ یہ سارا لاؤ لشکر ماڈل ٹاؤن پہنچا۔

یہاں 96-ڈی ماڈل ٹاؤن میں اماں جی سردار بیگم کی بہن رشیدہ بیگم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُن کے شوہر بھائی فیاض پولیس میں آئی جی تھے۔ ماسی رشیدہ کا رشتہ گو بہن کا تھا، لیکن ماسی رشیدہ ہمیشہ اماں جی کو اپنی ماں جائی سمجھتی تھیں۔ نانی اماں جو بابا جی کے قافلے کے ساتھ آئی تھیں، عجیب صابر شاکر عورت تھیں۔ انہوں نے کبھی زندگی سے کوئی توقعات وابستہ نہ کی تھیں۔ عین جوانی میں اُن کا شوہر ایک گائے کو ساتھ لے کر کوئٹہ چلا گیا، لیکن انہوں نے کبھی شوہر کے خلاف

زبان نہ کھولی۔ آپا فرخندہ کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں لندن میں تھے اور آپا جی نے کبھی نہ پوچھا تھا کہ اُن کی واپسی کب ہوگی؟ بھائی ایوب ایف آر سی ایس کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے لیکن وہاں سے وہ ہسپانیہ کی جنگِ آزادی میں بھرتی ہو گئے لیکن آپا فرخندہ نے کبھی کوئی سوال نہ اپنے سے نہ کسی سے پوچھا۔ آپا فرحت کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر ان دنوں ساہیوال میں تھے اور وہیں آپا فرحت بھی چلی گئیں۔

کچھ دیر تو اماں جی اپنے کنبے کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں رہیں، لیکن پھر انہیں پتہ چلا کہ موج دریا کے قریب مزنگ روڈ پر ایک ڈھنڈار سا تین منزلہ مکان پڑا ہے۔ کوئی اس کا والی وارث نہیں۔ اس وقت جب لوگ کوٹھیوں کے تالے توڑ رہے تھے یہ لوگ 1- مزنگ روڈ پہنچے جس کے سارے دروازے کھڑکیاں چوپٹ کھلے تھے۔ اینٹیں جا بجا بکھری تھیں۔ پانی کے نل سوکھے اور بجلی کے میٹر غائب تھے۔ ایسے میں یہ لٹا پٹا کنبہ یہاں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ رشتہ داروں نے بابا جی پر تہمت لگائی کہ انہیں یہاں سے ایک سیف ملا جس میں لاکھوں کی نقدی تھی، لیکن افواہ، گمان اور شک تو مشرقی معاشرے کا ضمیر ہیں۔ ہم لوگ ان ہی تین جذبوں کے تحت اخبار بینی کا شوق پالتے ہیں اور غیبت کے چسکے لیتے ہیں۔

آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے، لیکن ابھی ان کا کچہری سے رابطہ استوار نہ ہوا تھا۔ اقبال بھائی نے ہانڈی روٹی چلانے کے لیے ایک انوکھا روزگار تلاش کیا۔ وہ بکر منڈی سے بکرا خریدتے، اسے اپنے مضبوط کندھوں پر سوار کرتے۔ دن بھر اسے بیچنے کے لیے گاہک تلاش کرتے اور پھر جب بکرا بک جاتا تو پیسے اماں جی کی ہتھیلی پر لا کر رکھتے۔ ان کی اس ترکیب سے سب کو روٹی میسر آ جاتی۔ بابا جی روز صبح انارکلی جاتے۔ یہاں بیلی رام کی دکان تھی۔ اس تاجر بچے نے بابا جی سے بہت اُدھار لے رکھا تھا۔ بابا جی کی آرزو تھی کہ کچھ رقم انہیں مل جائے لیکن دکان بند تھی اور ادھار ملنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

ٹھکو بھائی جنہیں سب ڈیڈی جی کہتے تھے اِدھر اُدھر نوکری تلاش کرنے کی بے سود کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ "داستان گو" کے دفتر سے بھی چھٹی لی جائے اور بخشن خاں جا کر بابا جی کی زمینوں کی جمع بندی پر توجہ دی جائے اور اس اراضی سے جو روپیہ حاصل ہو اُسے خاندان کی بحالی میں لگایا جائے، لیکن ابھی یہ سکیم بھی سرے نہ چڑھ سکی اور وہ بے کار صورت گھر والوں پر بوجھ بنے رہے۔

اشتیاق سب سے چھوٹا تھا۔ اُس سے کوئی توقع نہ کی جا سکتی تھی لیکن اُس نے کشمیر فرنٹ پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اماں جی اندرونی زخموں سے نڈھال تھیں اور ویسے بھی "تقو" چھوٹا ہونے کے ناطے انہیں سب سے پیارا تھا لیکن تب مسلمان مائیں بچوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے نہ روکتی تھیں۔ یہ جہاد نفس کی شکل میں ہوتا یا کسی فرد یا معاشرے کے حقوق بحال کرنے کے لیے پیش آتا، بخوشی اجازت مل جاتی۔ اسی جذبے کے تحت تقو آزاد کشمیر سدھارا اور غازی بن کر لوٹا۔

خاں صاحب کی مشکل اُس وقت سامنے آئی جب وہ متواتر محکمۂ روزگار کے دفتر جاتے اور ناکام لوٹتے۔ ایک روز خاں صاحب نے وہاں ایک مہربان صورت کلرک سے پوچھا "بھائی! میں روز آتا ہوں۔ آپ بغیر کسی وعدے کے لوٹا دیتے ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے؟"

کلرک تھوڑی دیر زیرِ لب مسکرایا۔ پھر بولا "جناب! آپ کے پاس بی اے کی ڈگری ہے اور ہمیں دسویں پاس درکار ہے۔ بی اے پاس نہ تین میں نہ تیرہ میں....."

''یہ تو آسان سا مسئلہ تھا۔ آپ میری دسویں کی ڈگری رکھ لیں اور مجھے نوکری دے دیں۔''

کلرک بادشاہ نے خاں صاحب کو والٹن کیمپ میں جونیئر کلرک کی آفر دی۔ اُن کی تنخواہ 65 روپے ماہانہ تھی۔ انہیں والٹن کیمپ میں مائیکروفون پر گم شدہ رشتہ داروں کے پیغامات بے گھروں' گم شدہ لوگوں تک براڈ کاسٹ کرنا تھے۔ خاں صاحب صبح ایک پوٹلی میں دو روٹیاں' اچار یا کچھ بچا کھچا سالن لے جاتے اور رات تک اس پر گزارہ کرتے۔ کچھ راستہ تو بس لے جاتی۔ باقی وہ پیدل چلتے۔ نہ کبھی وہ کوئی حرف شکایت منہ پر لائے' نہ کبھی اپنی Contribution ہی پر شیخی ماری۔ اس طرح کی شیخی اُن کے گھر میں حرف ممنوع تھی۔

یہیں انہیں ممتاز مفتی ملے جو اس یونٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ مہاجروں کی مشکلات کو رقم کرتے' ان کے حل تلاش کرتے اور ہر روز افسرانِ بالا کو رپورٹ کرتے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کی دوستی Instant کافی کی طرح تھی..... فوراً تیار۔ فوراً استعمال کے قابل.....

دونوں ادیب تھے۔ دونوں لوگوں کے ہمدرد تھے۔ دونوں کو عادت تھی کہ توجہ کی سرچ لائٹ اپنے تک نہ آنے دیتے۔

میری والدہ' بھائی پرویز چٹھہ اور میں گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے۔ ہمارے دل میں گورداسپور چھوڑنے کا بڑا قلق تھا۔ کیونکہ ہم اطمینان سے اس اُمید پر بیٹھے تھے کہ گورداسپور مسلم اکثریت کا علاقہ ہے یہ تو یقیناً پاکستان کا حصہ بنے گا' لیکن سیاسی جھوٹ تو سیاست کا ناگزیر حصہ ہوا کرتے ہیں۔ اصل حقیقت برسوں بعد چھان پھٹک کر سامنے آتی ہے جب اس سچ کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔

گورداسپور میں ہمارا گھر اُس سڑک پر واقع تھا جو تبتن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کا کالا پھاٹک عین سڑک پر کھلتا۔ پھر بائیں جانب چھوٹا سا کچن گارڈن تھا' جس میں پودینہ' دھنیا' گاجریں' کھیرے اور دو چار بوٹے بیریوں کے نظر آتے۔ دوسری طرف ایک لیٹرین اور اُجاڑ صورت جگہ تھی جس کی دیکھ ریکھ کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دونوں باغیچوں میں لمبا راستہ آگے چل کر ایک ڈیوڑھی میں کھلتا جس کے آگے پھر پھاٹک تھا اور اس کے دائیں بائیں دو کمرے تھے۔

ایک کمرہ تو ملازموں کے لیے مختص تھا اور دائیں جانب مہمان خانہ تصور کیا جاتا۔ اس کے بعد ایک کھلا صحن تھا جس میں بائیں ہاتھ باورچی خانہ تھا' جس میں ہمارا خانساماں چراغ دین کام کرتا تھا۔ وہ عادتاً کام چور اور ویسے بھی چور تھا۔ تمام مراعات ملنے کے باوجود وہ ہیرا پھیری سے باز نہ آتا۔ ایک روز جب اُسے میری والدہ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ طیش میں آ کر بولیں ''چراغ! میں بیوہ ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے بچے پالے ہیں۔ میری دعا تو پتہ نہیں لگتی ہے کہ نہیں لیکن میری بددُعا تمہیں ضرور لگے گی۔''

جب ہم لیڈی میکلیگن میں مقیم تھے تو ایک دن میری والدہ کو چراغ مانگتا ہوا انارکلی میں ملا۔ میری والدہ کو پہچان کر بولا ''بی بی جی..... یہ میری آنکھیں نہیں گئیں آپ کی بددُعا لگی ہے..... دیکھتی ہیں.....''

میری امی کئی دن پشیمان صورت پھرتی رہیں لیکن یہ بھی نیک لوگوں کے عمل کا ایک خاص منفی قسم کا اجر ہے۔

تو میں آپ کو گورداسپور کے گھر کے متعلق بتا رہی تھی۔ باورچی خانے اور صحن کے عین سامنے تین بڑے کشادہ کمرے غسلخانوں سمیت بنے تھے۔ ایک میں میری والدہ اور میں رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں میرا بھائی ریزی رہا کرتا تھا۔ لاہور میں جس روز بی میتھس کے اے کورس کا پرچہ تھا کینیرڈ کالج کے پچھواڑے آگ لگ گئی۔ ممتحن اعلیٰ نے ساری لڑکیوں سے پرچے اکٹھے کیے۔ ہمیں ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں ہم کینیرڈ کی لڑکیوں نے باقی پرچے دیئے۔ امتحان دے کر میں اور ریزی افراتفری میں گورداسپور پہنچے۔ امی انسپکٹرس آف سکولز تھیں، لیکن حالات کے پیش نظر انہوں نے کچھ دیر کے لیے دورے منسوخ کر دیئے تھے۔

گورداسپور ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ ہندو اکثریت کو کشمیر تک راہداری مل گئی۔ گورداسپور کی مسلم آبادی جان بچاتی گروہ در گروہ چمن کی طرف جانے لگی۔ میرے بھائی کے دل میں پاکستان کے تصور سے عملی محبت تھی۔ ایک روز اُس نے باہر جانے کے لیے باہر کا گیٹ کھولا تو چند بے آسرا غریب لوگوں کو ننگی تلواروں سے قتل کرنے کے عزم میں چند سکھ ٹوٹ پڑے۔ ریزی نے پھاٹک کھول کر ان چند نفوس کو اندر دھکیلا اور گیٹ لاک کر دیا۔ ریزی کی یہ عملی مدد اُس وقت بھی جاری رہی جب ہم عافیت کے ساتھ لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ قافلوں کی مدد کرنے کے لیے بسوں پر آیا کرتا۔ جو کچھ اُس سے بن پڑتی کرتا۔ اُس وقت جب سب لوگ جان بچانے کی فکر میں تھے، یوں جان ہتھیلی پر رکھ کر قافلوں کے ساتھ آنے جانے کی رسم وفا میں نے صرف ریزی میں دیکھی۔ وہ اسی طرح جان چھڑکنے والوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔

گورداسپور اب ہمارا گھر ایک طرح سے رفیوجی کیمپ بن گیا۔ ان لوگوں میں ایک زینب تھی جو پٹیالہ کے کسی تحصیلدار کی بیوی تھی اور جو بہت بعد میں کئی برس ہمارے گھر کھانا پکانے پر مامور رہی۔ اُس کے ساتھ اُس کا چھوٹا سا بیٹا لالو تھا اور جب میں 24-ایس کینال میں تھی تو یہی لالو میرے ساتھ کالج جایا کرتا تھا۔

شاید ہم چمن والے گھر سے نکلنے کا نہ سوچتے اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔ ہمارے گھر سے عین ملحق بائیں جانب ایک کھلی سی گراؤنڈ اور آرمی افسروں کی چند بیرکیں تھیں۔ یہاں اُن دنوں رونق تھی۔ پریڈ کی آواز بھی آتی تھی اور بگل بھی بجا کرتا تھا۔ ایک روز چراغ لمبا سا چہرہ لے کر میری والدہ کے پاس آیا ''بی بی! ایک بات ہے..... اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ بوریا بستر سمیٹیں اور لاہور چلیں۔''

''لیکن وجہ.....''

''وجہ یہ ہے جی.....'' اُس نے راز داری سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

''میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔ ساتھ والے فوجی افسر بات کر رہے تھے۔''

''کیا بات کر رہے تھے فوجی افسر؟''

''وہ جی کیسے عرض کروں وہ کہہ رہے تھے کہ چھوٹی بی بی کو اغوا کر کے بیرکوں میں لے جائیں گے۔''

''کیا کیا کیا.....'' امی گڑبڑائیں

''ہاں جی وہ تو اور بھی بڑی پلید باتیں کر رہے تھے جی.....''

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا، لیکن امی سٹ پٹا گئیں۔ پاکستان آنے کا فیصلہ آناً فاناً ہو گیا۔ جب محافظ ہی لومڑی صفت

ہوں تو حفاظت کیا معنی.....کونوائے کبھی کا جا چکا تھا۔ امی نے اپنا تمام اثر ورسوخ لگا کر ایک ٹرک لیا۔ اس میں وہ چند رفیوجی چڑھائے جو ہمارے گھر میں مقیم تھے۔ مجھے ایک رضائی میں لپیٹ کر ڈرائیور کے پیچھے والی روک کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ حکم تھا کہ کسی قیمت پر کبھی رضائی سے باہر سر نکال کر جھانکنا نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پاس دھر مسالے کی ایک ڈیزی گن تھی' جس سے وہ پرندے پھڑکایا کرتا تھا۔ اسی گن کو تو اُس نے ''جھاکے'' کے طور پر تھوڑا سا چھت سے نکال کر سارا سفر کسی فوجی کی سی مستعدی سے طے کیا۔

دو چار مرتبہ ٹرک کو راستے میں روکا گیا' لیکن عافیت گزری اور ہم بالآخر یونیورسٹی کیمپس پہنچے۔ یہاں یونیورسٹی بند تھی۔ ہم نے یونیورسٹی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر روٹی کے ساتھ کریلوں کا اچار کھایا جو چراغ کی عقلمندی سے ساتھ چلا آیا تھا۔

لاہور شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اس لیے ہماری والدہ نے اپنی بہن فیروزہ خالہ کے گھر کو تلاش کیا۔ وہ لٹے پٹے لاہور کی مین فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ یہ گھر مسز گیلانی کا تھا' جو سکول میں پوتا ماچھا (خالہ فیروزہ) کے نیچے پڑھاتی تھیں۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میری والدہ کو لیڈی میکلیگن کالج کی پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ کالج اساتذہ تیار کرنے کی درس گاہ تھی۔ یہاں جے وی اور بی ٹی کی سندیں حاصل کر کے لڑکیاں پڑھانے کے قابل ہو جاتی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انڈر ٹریننگ ٹیچرز کے عملی کام کے لیے ایک باقاعدہ سکول بھی تھا' جس میں دسویں تک جماعتیں تھیں۔ ایک اور اضافی کام یہاں یہ جاری ہوا کہ سکول میں مہاجر لاوارث چھوٹے بچوں کا کیمپ بھی کھول دیا گیا۔ یہاں بچوں کو مالی' طبی امداد دینے کے بعد ان کے وارثین کی تلاش کی جاتی یا پھر بچوں کے آرزومند والدین کے حوالے کر دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔ کالج کا احاطہ ختم ہوتے ہی ایک بڑی پختہ دیوار تھی' جس میں ایک دروازہ کالج اور پرنسپل لاج کے درمیان کھلتا تھا۔ اس دروازے کو صرف پرنسپل لاج کی طرف سے زنجیری کنڈی لگ سکتی تھی۔ پرنسپل ولا دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں پرنسپل اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریس رہا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے دوران امریکن پرنسپل مس رائس واپس چلی گئیں اور ہیڈ مسٹریس بھی غائب ہو گئیں۔

اب پورا پرنسپل ولا ہمارے قبضہ قدرت میں تھا۔ میرے بھائی اُن دو کمروں میں منتقل ہو گئے' جو ہیڈ مسٹریس کے لیے مختص تھے' لیکن وہ ان کو استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک چھوٹا کمرہ جس کا دروازہ برآمدے میں تھا' اسے گودام بنا لیا گیا۔ ریزی بھائی ہمارے ساتھ ہی کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔ لمبے سے برآمدے کے پیچھے تین بڑے کمرے تھے۔

دائیں طرف پہلا کمرہ ڈائننگ روم' پھر ڈرائنگ روم' آخر میں بیڈ روم۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم اور غسل خانے کے علاوہ ایک گودام سے مشابہ ایک اور کمرہ تھا' جس میں غیر ضروری چیزیں پڑی رہتیں۔ ہمارا زیادہ وقت برآمدے میں گزرتا تھا۔ یہاں کالج کی پروفیسریں' لڑکیوں کے والدین اور لواحقین' فسادات میں بچھڑے ہوئے ملاقاتی آتے رہتے۔

برآمدے کو آپ ایک طرح کا Visitors روم کہہ لیجئے۔ یہاں پاکستان کے حالیہ مسائل' سرکاری افسران کی مشکلات اور عوام کی بے چارگی' سیاست کے الجھاؤ' وسائل کی کمی اور نہ جانے کیا کچھ زیر بحث آتا۔ ابھی امن کی وہ شکل پیدا

[illegible] تھی جہاں پہنچ کر لوگ گھروں کی زیبائش، فرد کے لباس اور بچوں کی تعلیم کے پیچھے دیوانہ وار مسابقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ابھی دولت کی پوجا سے لوگ قریب قریب نا آشنا تھے۔

میری والدہ کو کالج کی مشغولیات مصروف رکھتیں اور وہ زیادہ وقت اپنے دفتر اور سٹاف روم میں گزارتیں۔ میرے بھائی ریزی ابھی تک اپنے سوشل ورک میں مصروف تھے۔ وہ کبھی امرتسر سے مہاجروں کے کونوائے لاتے۔ کبھی جان ہتھیلی پر رکھ کر جالندھر اور لدھیانے کی طرف سے آنے والی لاوارث سی بسوں کے ساتھ ہوتے۔ ریزی بھائی نے کبھی ان سفروں میں اپنے لیے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ سارا دن کے بھوکے پیاسے گھر پہنچتے۔ اُن کے ساتھ مہاجروں کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں، لیکن میری والدہ کے پاس ان کو سننے کا وقت نہ تھا۔

میں ویسے ہی کھلنڈری طبیعت کی مالک تھی۔ جب تک مسئلہ میرے جبڑے میں گھونسے مار کر مجھے متوجہ نہ کرے میں پریشان نہیں ہوتی۔ مجھے بھی ریزی کی کہانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے اپنا دل لگانے کے لیے پروفیسران میں بڑا بہت راستہ مل گیا تھا۔

کالج کی جانب پختہ دیوار میں بنے ہوئے دروازے کو میں کھولتی اور کالج کے اوقات کے بعد ہاتھ میں بیڈمنٹن ریکٹ لے کر کالج میں چلی جاتی۔ عین پرنسپل والے ملحق بیڈمنٹن کے کورٹس تھے۔ یہاں عموماً میرے ساتھ کوئی نہ کوئی کھیلنے والا مل جاتا۔ پرنسپل کے دفتر اور پی اے کے کمرے سے ملحقہ دو کمرے سٹاف کی رہائش گاہ تھے۔ یہاں میں رات کا کھانا کھا کر چلی جاتی اور یہ پروفیسران کچھ مجھے پرنسپل کی بیٹی سمجھ کر اور کچھ وقت کٹی کی خاطر میری دوستی کا دم بھرتی تھیں۔

ان میں سب سے پیش پیش جمیلہ ظفر تھیں۔ یہ میری ہم عمر، ہم مزاج اور ہم مشغلہ ساتھی بن گئیں۔ جمیلہ کا مزاج ٹھنڈا میٹھا تھا۔ ان کا خاندان بھی مہاجر تھا۔ بہن بھائی سب راولپنڈی میں تھے۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے ناچنے گانے کا شوق پالتے۔ اُن دنوں مجھے گانے کا اس قدر شوق تھا کہ آپی ملک نے میرا نام ''کوئل'' رکھ دیا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ صرف ''کو'' میں بدل گیا۔

جمیلہ ظفر کی شادی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر زیدی سے ہوگئی جو ایک بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ بدقسمتی سے زندگی نے وفا نہ کی اور جمیلہ بیوہ ہو گئیں...... ! لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ تب ہماری دوستی میں تیز چشمے کا سا بہاؤ تھا۔ اسی جوش کے تحت ہم نے کالج کے ہال میں ایک ناچ کو مرتب کیا جس میں میں نے زندگی کا رول کیا اور جمیلہ نے موت کا روپ دھارا۔

اس ٹیبلو نما ناچ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ زندگی چاہے کیسی ہی کیوں نہ اترائے، کدکڑے مارے بالآخر موت اُسے سر کر لیتی ہے۔ جب کالج میں ڈرامہ ہوا تو ہمیشہ کی طرح میں نے ڈرامہ ڈائریکٹ کیا اور اسی میں یہ ناچ زندگی اور موت کے نام سے دکھایا گیا۔ جمیلہ سے میرا رابطہ ساری زندگی رہا۔ گو ہم دونوں رہینِ غمِ روزگار رہے لیکن ایک دوسرے کو طاقِ نسیاں میں رکھ کر بھولے بھی نہیں۔

دوسری دلآویز شخصیت اقبال ملک تھیں، جنہیں ہم سب آپی ملک کہتے تھے۔ یہ وائس پرنسپل تھیں اور عمر میں ہم سے بڑی تھیں۔ بڑی شفیق، سادہ طبیعت اور کام کر خاتون تھیں۔ وہ خود تو میرے اور ٹوٹو کے مشاغل میں حصہ نہ لیتیں، لیکن

بڑی گرم جوشی سے تالیاں بجانے والوں میں شامل رہتیں۔

آپی ملک نے ساری عمر شادی نہ کی۔ پہلے وہ لیڈی میکلیگن کالج میں پڑھاتی رہیں۔ پھر ملتان میں گورنمنٹ کالج کی پرنسپل بن گئیں جہاں اُن دنوں میری والدہ انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ ملتان میں میری والدہ نے زمینوں کے چکر میں پھنس کر استعفیٰ دینے کی کوشش کی تو آپی ملک وہ واحد رکاوٹ بن گئیں جنھوں نے انھیں استعفیٰ دینے نہیں دیا۔ امی کا ارادہ لینڈ لارڈ بننے کا تھا۔ وہ برج جوزا کی پیدائش تھیں۔ یہ عموماً بہت خیال پرست ہوتے ہوئے توام بچوں کی صورت ہمیشہ تضاد اور دوئی کا شکار رہتے ہیں۔ ملکو آپی کے پاس ایک طرح سے امی کا گھر ہی بن گیا تھا۔ وہ زمینوں سے لوٹتیں تو آپی کے پاس ٹھہرتیں..... دورے سے آتیں تو اپنے گھر میں قیام کرنے کے بجائے سیدھا آپی کے پاس چلی جاتیں۔

یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔ اس وقت یہ سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپی ملک ملتان چلی جائیں گی۔ ابھی تو وہ وائس پرنسپل تھیں۔ ہمارے میں جمیلہ' آپی ملک کے علاوہ یہاں ایک اور معتبر پروفیسر امینہ ملک تھیں۔ دراز قد' گوری چٹی کشمیری خاتون' جن کی شادی بعد میں ادیب شفیق الرحمن سے ہوئی۔ اللہ نے انہیں بڑے خوبصورت دو بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک بیٹے کا نیک انجام نہ ہوا اور اس کی خودکشی کے بعد شفیق الرحمٰن بھی زندہ نہ رہ سکے..... لیکن ابھی یہ بکھیڑے قبضۂ قدرت سے منظرِ عام تک نہ آئے تھے۔ امینہ آپا بیڈمنٹن سے لے کر گانا بجانا' پارٹی' ڈراموں میں شمولیت اور گپ بازی کی شوقین تھیں۔ ایک بار جب سکول میں مغلِ اعظم کا ڈرامہ سٹیج کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو انہیں شہزادہ سلیم بنانے کی تجویز ہوئی۔

میرے ساتھ خصوصی رعایت ہوا کرتی تھی اس لیے مجھے نور جہاں کا رول دیا گیا۔ افسوس چند ریہرسلوں کے بعد یہ ڈرامہ پتہ نہیں کیوں بغیر سٹیج کیے ڈراپ سین کو پہنچ گیا' لیکن عجیب بات تھی کہ ہمارا گروپ ملال آشنا نہیں تھا۔ جو ہو گیا وہ بھی ٹھیک' جو نہ ہو سکا وہ بھی قابلِ قبول۔

اس گروپ میں ایک شخصیت انور کی بھی تھی۔ انور آرٹ کی پروفیسر تھیں اور ان کے والد سے میری والدہ کی جان پہچان تھی۔ انور رشید کے والد ملتان کے ڈی سی تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے میرے بھائی کو اس کی خدمات کے عوض سات مربعے سرکاری زمین کے الاٹ کیے تھے اور پھر میری والدہ ان ہی مربعوں کی وجہ سے نناوے کے چکر میں پھنس گئی تھیں اور انہوں نے پورے تیس مربعے الاٹ کرا لیے تھے۔

لیکن ابھی انور صرف سوئی تھی اور گروپ میں چینی کی طرح حلول کیے ہوئے تھی۔ وہ نہ بیڈمنٹن کھیلتی تھی نہ ناچتی گاتی تھی۔ اسے اپنی بہنوں کی طرح ڈراموں میں شرکت کا شوق بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی محفل اس کے بغیر مکمل نہ تھی۔

یہ باتیں بیان کرنے سے فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ میں کیسی بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں' لیکن میری والدہ یقیناً میرے لیے پریشان تھیں۔ جسے میں خوش وقتی سمجھ رہی تھی اسے وہ تعطل سے تعبیر کر رہی تھیں..... ایک روز ہمارے گھر زبیدہ آپا آ گئیں۔ غالباً وہ لاہور کے ڈی سی کی بیگم تھیں اور امی سے کسی تقریب میں ملی ہوں گی۔ لمبے برآمدے میں آپا زبیدہ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ لاوارث بچوں کا سروے کرنے آئی تھیں۔ اس وقت میں کالج کی طرف سے ریکٹ لے کر وارد ہوئی۔ شاید میں لان میں بنے ہوئے ٹیوب ویل کا معائنہ کرنے چلی جاتی لیکن امی

نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔

''یہ میری بیٹی قدسیہ ہے.....''

آپا زبیدہ نے میرے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

''آؤ بیٹھو.....کیا کرتی ہے؟''

امی نے تعارف کرایا ''بی اے کیا ہے' کنیئرڈ کالج سے۔ بے چاری کی فسٹ ڈویژن ماری گئی۔ بڑی افراتفری میں امتحان دیا ہے۔ اب کوئی ڈھنگ کا بندہ مل جائے تو بیاہ ڈالوں.....''

پتہ نہیں کیوں آپا زبیدہ جھنجھلاہٹ سے بولیں ''ایویں شادی کرائیں گی۔ چھوٹی سی ہے..... پہلے اسے ایم اے کر لینے دیں آرام سے..... کیا عمر ہے اس کی؟''

''انیس سال.....'' امی نے بتایا۔

''ناں ناں مسز چٹھہ ناں ایسا ظلم نہ کریں۔ پلیز..... اسے ایم اے کرنے دیں۔ شادی کونسی بھاگی جاتی ہے۔ ذرا کچھ ہو لینے دیں..... ساری عمر پڑی ہے شادی کے لیے.....''

اگر آج کا عہد ہوتا تو زبیدہ آپا ضرور تحریک Feminism کی سرگرم کارکن ہوتیں۔ ابھی عورتوں کی جاگرتی کی پو پھٹنے والی تھی اور کوئی عورت بھی زنانہ حقوق کی علمبردار بن کر آواز نہ اٹھاتی تھی۔

''اچھا ایم اے تو کرادوں لیکن کنیئرڈ کالج میں تو صرف بی اے تک تعلیم ہے.....''

''کنیئرڈ کالج کیوں؟ گورنمنٹ کالج بھیجیں۔ وہاں ایم اے اردو شروع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے داخلہ لے لیا ہے۔ پطرس بخاری سارا کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہوگی۔ آپ بے فکر رہیں۔''

امی کچھ متذبذب ہو کر بولیں ''لیکن جب یہ کنیئرڈ میں پڑھتی تھی تو اس کے ریاضیات کے پروفیسر سرداری لعل کہا کرتے تھے کہ اسے ایم اے Mathematics کرنا چاہیے۔''

''مس متھائی کہتی تھیں امی کہ میں اکنامکس میں ایم اے کر لوں۔'' میں نے اضافہ کیا۔

''چلو جی اس بات کو جانے دیں مسز چٹھہ..... وہ پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو اردو قومی زبان ہے..... پاکستان حقیقت ہے۔ ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے۔ آپ تو خود بڑی Educationist ہیں۔ محب وطن ہیں۔ مہاجروں کی خدمت کرتی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اردو کے بغیر پاکستانی کی شناخت ممکن نہیں..... وطن کا تصور اردو سے علیحدہ نہیں کیا ۔ سکتا۔ اگر ہم نے سندھ میں سندھی' بلوچستان میں بلوچی' پنجاب میں پنجابی اور صوبہ سرحد میں پشتو کو اولین جگہ دی تو ہماری شناخت بھی اتنے ہی حصوں میں بٹ جائے گی۔''

''نہیں بابا! تو بات کو کہاں سے کہاں لے گئی..... مجھے تو صرف اس قدر فکر ہے کہ گورنمنٹ کالج میں Co-education ہے اور..... میں.....''

''جی جی کیسا فکر؟''

''اس نے جب بی اے کا امتحان دیا تو بڑے مشکل حالات تھے۔ جس روز کاکی کا حساب کا پرچہ تھا کنیئرڈ کالج

میں کچھ فسادیوں نے آگ لگا دی۔ پرنسپل نے فوراً لڑکیوں کو امتحان گاہ سے نکالا اور ایف سی کالج لے گئیں۔ وہاں ہی انہوں نے حساب کا پرچہ دیا۔''

''پھر جی یہ تو حالات سب کے ہیں۔ پھر؟''

''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیٹی مخلوط تعلیم کو صرف اتنا جانتی ہے اس سے زیادہ اس کا Exposure نہیں ہے۔''

پتہ نہیں امی کو میری نیت پر شبہ تھا یا وہ مخلوط تعلیم کے حوالے سے لڑکیوں کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ وہ کچھ چپ سی ہو گئیں اور حامی نہ بھری۔ امی کا تذبذب بھانپ کر زبیدہ آپا بولیں ''لیجئے میں وہاں ہوں۔ مرغی کے پروں تلے قدسیہ رہے گی۔ آپ خدا کے لیے فکر نہ کریں.....''

ریزی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ خود ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کر رہا تھا' لیکن امی نے اُس کی پروانہ کی۔ دوسری مزاحمت بابو محمد یعقوب کی طرف سے آئی۔ بابو محمد یعقوب ان دنوں لیڈی میکلیگن کالج میں ہیڈ کلرک تھے۔ پی اے کا لفظ تو ابھی ایجاد نہ ہوا تھا' لیکن یوں سمجھئے کہ وہی صاحب کی تاریں کھینچنے والے اور اُسے پتلی کی طرح نچانے والی طاقت تھے۔

ایک اچھے Executive کے لیے ایک قابل پی اے نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ آئین اور اصولوں کو زبانی Quote کر سکتا ہے۔ افسر کو نکلنے کے راستے بتا سکتا ہے۔ حدود میں رکھنے اور حدود کو سلیقے سے توڑنے کی ترکیبیں سمجھا سکتا ہے تو ایسا افسر بڑی جلدی نیک نامی کو پہنچ جاتا ہے۔

بابو محمد یعقوب جالندھر میں ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ جب 1936ء میں میری والدہ جالندھر سے تبدیل ہو کر دھرمسالہ گئیں تو اُن کے پاس جالندھر شہر میں کچھ زمین تھی' جس پر سٹرابیری' رس بھری اور دیگر پھلوں اور سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی۔ بابو محمد یعقوب جالندھر کے سکول میں بھی امی کے ہیڈ کلرک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زمینیں اور ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے۔

اب لیڈی میکلیگن میں بابو جی محمد از سرِ نو امی کے ہیڈ کلرک بن گئے۔ یہی بابو جی بہت بعد میں چشتیہ مسلک کے پیر بن گئے۔ ان کے دربار پر قوالی ہوتی تھی۔ لوگ نذرانے پیش کرتے تھے اور وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے..... ''بھائی رجوع کرو۔ رجوع کرو۔ سب جواب مل جائیں گے۔ سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔ تم صرف رجوع کرو۔''

سنت نگر میں جہاں ان کا ڈیرہ بن گیا' بڑی محفلیں ہوئیں لیکن امی' ریزی اور میں نے کبھی رجوع نہیں کیا..... ہمارے لیے وہ ہمیشہ بابو جی رہے..... امی جی کے شفیق ہیڈ کلرک۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں ایم اے اردو کرنے گورنمنٹ کالج جانا چاہتی ہوں تو انہوں نے چند رجسٹر اُٹھائے' امی کے دفتر کی چق اٹھائی اور مے آئی کم ان پلیز کہے بغیر اندر داخل ہوئے۔

''جی ایک عرض کرنا تھی..... اگر آپ کے پاس وقت ہو۔''

''جی بابو جی۔''

''ویسے تو جی مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں' لیکن میں چھوٹی بی بی کو تب سے جانتا ہوں جب میں

ہر سال آیا کرتا تھا۔ وہ بہت بھولی روح ہے۔''

''ایسی روحوں کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔''

''بابو جی! میں نے ایسی تربیت کی ہے کہ وہ بھٹک نہیں سکتی۔''

اب سامنے ایک افسر بول رہا تھا۔ بابو جی کچھ گھبرا گئے ''دیکھ لیجئے آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن مخلوط تعلیم میں بیٹی کو بھیجنا میرا خیال ہے کہ..... عقلمندی نہیں ہے۔''

امی نے پتہ نہیں اندر کیا محسوس کیا لیکن معاملے کو Dismiss کر دیا اور تنخواہوں کے کاغذ سائن کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے امی کو ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے بھی منایا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ عربی کے سکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے Batch میں عربی کی کلاس اُن ہی کی ذمہ داری تھی۔ ایک روز وہ بی ٹی کی کلاس کو لیکچر دینے آئے تو بڑے ہال میں لیکچر کے بعد باتوں باتوں میں امی نے اُن سے ایم اے اردو کا ذکر کیا۔

''آپا جی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ فوراً قدسیہ کو داخل کرائیں۔ وقت بدل گیا ہے۔ اب لڑکیوں کا وقت بھی قیمتی ہے۔ پاکستان کو تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت ہے۔''

''لیکن میں اُس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ذرا سوچیں اگر آپ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں..... تو آج آپ بیوگی کے بعد بچوں کو لے کر کس کے پاس جاتیں؟ تعلیم تو جتنی ہو کم ہے۔ اس کی خاطر تو چین بھی جانا پڑے تو حکم سمجھ کے جانا چاہیے۔''

فیصلہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ہمارے گھر میں فیصلے عورتوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس مایا مچھندر میں ریزی اور بابو جی کی آواز ڈوب گئی۔ امی جی نے پرنسپل کرامت صاحب کو فون کیا اور میں کالج پہنچ گئی۔

کچھ باتیں گویا مقدر کا حصہ ہوتی ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کالج میں اشفاق احمد سے ملنا تھا۔ میرے مستقبل کا تعین، وقت، امکانات سب اس بات میں پوشیدہ تھے کہ میں گورنمنٹ کالج پہنچوں۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے مجھے بی اے کرایا گیا۔ حالانکہ 1947ء میں جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا' حالات دگرگوں تھے۔ جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا کنیرڈ کالج کے اُس بلاک میں جو لب سڑک تھا' آگ لگ گئی۔ اصولاً تو کالج بند ہو جانا چاہیے تھا' لیکن مجھے ایم اے کرنا تھا۔ مجھے خاں صاحب سے ایک مقررہ مقام پر ملنا تھا' اس لیے بی اے کا پرچہ دینا پڑا۔

اُس وقت کالج کی پرنسپل مس مکنیئر (Macnaire) تھیں۔ قریباً چھ فٹ اونچی لمبی' سخت قسم کی منظم خاتون نے بی اے کی لڑکیوں کو کمرہ امتحان سے نکالا۔ کالج بس میں سوار کیا۔ خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اور سیدھی ایف سی کالج پہنچیں۔ یہاں لڑکے بی اے کے پرچے دے رہے تھے۔ انہوں نے ممتحن سے ساز باز کی۔ ہمیں بٹھایا اور خود بکریوں کا رکھوالا بن کر کمرہ امتحان میں بیٹھ گئیں..... مخلوط تعلیم کا یہ پہلا منظر میری نگاہ نے دیکھا۔

ادھر اشفاق صاحب کو گویا حکم ملا کہ وہ ایم اے اردو کر لیں۔ وہ اس وقت تک منشی فاضل کر چکے تھے۔ مکتبہ جدید سے اُن کی کتاب ''ایک محبت سو افسانے'' چھپ رہی تھی اور انہیں ہرگز ایم اے اردو کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ

حب الوطنی کے سلسلے میں بڑی پُر جوش تقاریر کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ تبدیلی زندگی کا اہم حصہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی جانتے تھے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

فیصلہ میری تقدیر نے کیا یا میری والدہ نے۔ بہر کیف میں کالج پہنچی۔ پرنسپل آفس میں پروفیسر کرامت موجود تھے۔ اُن کی شخصیت میں بڑا میٹھا سا رُعب تھا۔ جیسے وہ پہلے آپ کی مان کر پھر اپنی منوانے کے عادی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم ایک بڑے انقلابی دور سے گزر رہی تھی۔ مسائل ان گنت تھے۔ وسائل کی کمی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اپنے ذاتی مسائل میں اُلجھ کر اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کی انا اپنی شناخت کے چکر میں تھی۔

پروفیسر کرامت صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

میں ہر خوف زدہ انسان کی طرح کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی۔

''آپ نے بی اے کہاں سے کیا؟''

''کنیئرڈ کالج سے جی۔''

''اور فسٹ ڈویژن آئی؟'' سوال ہوا۔

''جی فسٹ ڈویژن ضرور آتی..... لیکن جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا اُس دن جیل روڈ پر آگ لگ گئی۔ ہمیں بس میں بٹھا کر ایف سی کالج لے گئے۔ بڑی افراتفری میں ہنگامی سنٹر بنا..... ہم لڑکیاں اتنی نروس تھیں کہ پرچے زیادہ اچھے نہیں ہوئے ورنہ تو جی.....'' میں نے بار بار بتائی ہوئی حقیقت بیان کی۔

''اور بی اے میں کون کون سے سبجیکٹ لیے۔''

میں لجاجت سے بولی ''اے کورس Maths اور اکنامکس۔''

''اور میتھس کون پڑھاتا تھا؟''

''پروفیسر سرداری لعل۔''

''اچھا اچھا..... وہ تو ہمارے ہی پروفیسر ہیں اور اکنامکس۔''

''مس متھائی۔''

''جی۔''

''ساؤتھ سے آئی ہیں۔ اُن کے بھائی نے اکنامکس پر بڑی معرکے کی کتاب لکھی ہے۔ وہی مس متھائی۔''

''جی۔''

''پھر بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھ کر تم ایم اے اردو کر کے کیا کرو گی..... یا Math میں ایم اے کرو یا Economics میں۔''

''جی مجھے اردو کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔''

وہ ہلکا سا مسکرائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ پطرس بخاری صاحب نے اس سبجیکٹ میں ایم اے کا اجراء کیا ہے' لیکن اب وہ یونیسکو چلے گئے ہیں۔ ہم کچھ تجرباتی سا کام کر رہے ہیں۔ ابھی پروفیسروں کا بھی انتخاب مکمل نہیں ہوا۔ بہرکیف تم برسر صاحب سے مل لو۔ فیس وغیرہ داخل کروا دو..... فارم احتیاط سے بھرنا..... تھینک یو۔''

پرنسپل صاحب کھڑے ہوگئے یعنی مجھے برخاست کر دیا۔ میں نے دبی زبان میں شکریہ ادا کیا اور اُن کے کلرک کے پاس پہنچی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر ایک نوجوان کھڑا تھا۔

گورا چٹا خوبصورت لڑکا جس نے کھڑکی کے ساتھ کہنی ٹیک رکھی تھی۔ جس وقت میں وہاں پہنچی وہ فوراً مؤدب انداز میں ایک طرف ہوگیا۔ نظریں نیچی رکھیں اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں فیس دے چکی تو برسر صاحب نے تعارف کے انداز میں کہا ''بی بی یہ اشفاق احمد ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ ایم اے اردو کریں گے۔ ان کی فیس میں نے ابھی جمع کی ہے.....''

یہ میرا خاں صاحب سے پہلا تعارف تھا.....

لیڈی میکلیگن سے گورنمنٹ کالج تک دو چوراہوں کا راستہ تھا۔ پہلے سیکرٹریٹ کو جانے والا چوک آتا۔ اس کے بعد وہ چوک جس پر بھنگیوں کی توپ نصب تھی۔ اگر مال روڈ کی طرف رُخ کر کے دیکھیں تو دائیں ہاتھ وہ عمارت آتی جو بعد میں NCA کی درس گاہ بنی اور یہیں لاہور کا مشہور میوزیم تھا۔

بھنگیوں کی توپ کے دائیں ہاتھ ایک اور چوک آتا جو انارکلی بازار کا سنگم تھا۔ گورنمنٹ کالج کے عین سامنے چھوٹا سا باغ تھا اور یہی سڑک بائیں ہاتھ لڑکوں کے ہوسٹل کی طرف بھی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج کا پھاٹک کھلتے ہی وہ پکی سڑک آتی جس کے بائیں ہاتھ نشیب میں اوول کی گراؤنڈ تھی؛ جس میں ہر سال سپورٹس ڈے منایا جاتا۔ لڑکیوں کا چاٹی ریس میں حصہ لینا ایک بڑا پُر لطف Event تھا۔ اوول سے دوسری جانب سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پھر یہ سڑک ذرا سی چڑھائی چڑھ کر پرنسپل آفس تک پہنچتی۔

پرنسپل صاحب کی کار پورچ میں کھڑی نظر آتی تو طالب علم خاموشی سے گزرتے ورنہ ہنسنا بولنا فقرے کسنا آوازیں دینا تو اس عمر کا خاصا ہے۔ پرنسپل کے دفتر کے ساتھ ہی بائیں طرف ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے عین سامنے بھی کھلی جگہ تھی جس پر بعد میں اوپن ایئر تھیٹر تعمیر کیا گیا۔ اس لان سے ملحق سوئمنگ پول تھا جس میں سپورٹس کے دنوں میں بڑی جوش و خروش کی ریسیں ہوتیں۔

ففتھ ایئر کے آخر میں جب سوئمنگ Events ہوتے تو اس میں ایک ریس اپنی نوعیت کی اختراع تھی۔ ایک لڑکی سوئی دھاگہ پکڑ کر ٹینک کے آخری سرے پر بیٹھتی اور فری سٹائل میں تیرنے والا اُس تک پہنچتا۔ لڑکی سوئی میں دھاگہ پرو کر Contestant کو پکڑاتی۔ وہ اسے واپس لے جا کر ریفری کو پکڑاتا۔ اگر سوئی سے دھاگہ نکل جاتا تو اُس کے نمبر کٹ جاتے۔

اُن دنوں جب ہمارا ففتھ ایئر ختم ہوا تو ریزی بھائی کا دوست بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمارے گورداسپور سے مراسم چلے آتے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس ریس میں شرکت کی اور ریاض فسٹ آیا۔

لیڈی میکلیگن سے دو راستے گورنمنٹ کالج کو جاتے تھے۔ ایک راستہ تو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ دوسرا راستہ پرنسپل لاج کے سامنے سے گزر کر باہر نکلتا تھا۔ سامنے بہت بڑی گراؤنڈ تھی، جس میں ہر سال انٹر کالجیئٹ مقابلے ہوتے تھے اور بڑی بڑی ٹرافیاں لڑکیوں کو ملتی تھیں۔

حسن اتفاق سے دو مرتبہ ان کھیلوں کی اناؤنسمنٹ کرنے کا مجھے موقع ملا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اناؤنسمنٹ کرنے سے پہلے عموماً اشعار پڑھ کر ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ Master of Ceremony کو کیا کرنا چاہیے چونکہ ایم اے کی وجہ سے اشعار سے واقفیت تھی اس لیے میں نے از خود یہ طریقہ رائج کر لیا تھا۔

اس گراؤنڈ میں ملحق خواتین کے لیے سوئمنگ ٹینک تھا اور اس کے بعد سڑک پار کر کے ایم اے او کالج کی بلڈنگ آتی تھی۔ میں نے اس ٹینک کا بھی فائدہ اُٹھایا اور سوئمنگ سیکھی اور بالآخر مقابلے میں حصہ لے کر فرسٹ آئی اور کلر ہولڈر رہی۔

میں نے آپ کے لیے بساط بھر اپنی رہائش گاہ کی تفاصیل بیان کر دی ہیں۔ میری والدہ مجھے اس محاصرے سے نکال کر سڑکوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جب ہم دھرمسالہ میں تھے تو دسویں کرنے کے بعد مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا تو بوائز کالج بھیجنا پڑتا یا پھر لاہور میں داخلہ لینے کی ضرورت پیش آتی، لیکن میری والدہ مخلوط تعلیم کے حق میں نہ تھیں۔ انہوں نے چند معتبر لوگوں سے مل کر ایک چھوٹا سا پرائیویٹ کالج لوئر بازار میں کھول دیا۔ یہاں پر وہ تمام لڑکیاں داخل ہو گئیں جو لاہور جانے سے معذور تھیں۔

یہاں ہی موسیٰ کو چپڑاسی کی نوکری دی گئی۔ تیتی النسل، خاموش طبع، فربہی مائل درمیانے قد کا موسیٰ عموماً بے رنگ سے کپڑے پہنتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ موسیٰ نے امی کو تلاش کر لیا اور لیڈی میکلیگن آ پہنچا۔ اسے فوراً چپڑاسی کی نوکری مل گئی اور اسی کو مجھے کالج لانے لے جانے کی ڈیوٹی دے دی گئی۔

موسیٰ نے کبھی میرا نام نہ لیا۔ ہمیشہ بی بی جی کہہ کر بستہ پکڑ لیتا۔ ہولے ہولے ایک دو قدم پیچھے چلتا لیکن جب ہم پرنسپل کرامت کے دفتر کے قریب پہنچتے تو یکدم موسیٰ میرے آگے آگے چلنے لگتا۔ گورنمنٹ کالج کے برآمدے بڑے بڑے، خوبصورت اور گوتھک آرٹ کا نمونہ تھے۔ ایسا ہی ایک لمبا سا برآمدہ اردو کلاس کے سامنے بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر عموماً موسیٰ کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ جاتا اور جب میں اندر داخل ہو جاتی تو دروازہ بند کر کے غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد اوول کے گرد بنی ہوئی سڑک پر ہمیشہ ایک ہی بنچ پر بیٹھتا جو پرنسپل کے دفتر سے ذرا سی دُور تھی۔

جس روز پہلے دن میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہوئی۔ میں تھوڑی سی نروس تھی۔ ہر نئی چیز عموماً ہیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ کلاس کے کمرے میں ایک لمبی مستطیل میز بچھی تھی۔ اس کی لمبائی کے دونوں رُخ پر کرسیاں تھیں۔ میز سے قریباً چار سیڑھیاں اُونچا ایک ڈائس تھا جس پر ایک روسٹرم اور دیوار کے ساتھ لمبا سا بلیک بورڈ ٹنگا تھا۔ اس بلیک بورڈ پر عموماً عربی، فارسی اور انگریزی لکھی نظر آتی۔ بہت کم اردو کے الفاظ لکھے جاتے۔

پہلے دن کمرے میں کوئی پروفیسر موجود نہ تھا۔ لمبی میز پر سامنے کی طرف مولوی طوطا، قمر صاحب بیٹھے تھے۔

ٹیبل کی پشت دروازے کی طرف تھی اور اس وقت یہاں آپا زبیدہ اور ذکیہ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آپا نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابھی کاپیاں کتابیں رکھ کر سیٹل ہو ہی رہی تھی کہ ایک خوبصورت گورا چٹا اطالوی شکل وصورت کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اُس نے لٹھے کی شلوار، نیلی لکیروں والا سفید کرتا اور پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ وہ بڑی ملائمت کے ساتھ آگے بڑھا اور مردانہ قطار میں مولوی طوطا کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر نوجوان نے اپنا تعارف کرانے کے انداز میں کہا..... ''خواتین وحضرات! میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور سے آیا ہوں۔ ہمارے قصباتی شہر کا نام مکتسر ہے۔ میرے والد وہاں ڈنگر ڈاکٹر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ حیوان ناطق کا علاج بھی کرنے لگے..... ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت میں موج دریا کے پاس نمبر 1- مزنگ روڈ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک سائیکل ہے جس پر میں اس وقت آیا ہوں.....''

یہ کہہ کر اشفاق احمد نے کلاس کے لڑکے لڑکیوں پر نظر دوڑ آئی۔ سب خاموش تھے۔ ابھی Orientation کی کلاسوں کا رواج نہ تھا۔ لوگ اپنا تعارف' حدود اربعہ' ہسٹری بتاتے ہوئے شرماتے تھے۔ صرف اشفاق احمد نے سب کی سہولت کو مد نظر رکھ کر اپنا آپ تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا۔

آپا زبیدہ اور مولوی طوطا نے غالباً اسے شوخی سمجھا۔ ذکیہ جو بلند شہر سے آئی تھی' اشفاق احمد جیسے صاحب حسن و جمال سے متاثر ہوگئی۔ مجھے تو ویسے ہی متاثر ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے اندر بھی تھوڑا سا ردعمل پیدا ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مقابلہ سخت سہی لیکن میں محنت کروں گی اور بالآخر ضرور جیت جاؤں گی۔

سب سے پہلے غلام محی الدین کمرے میں آئے۔ انھوں نے اپنا تعارف آتے ہی انگریزی میں کرایا۔ بلیک بورڈ صاف کر کے کیپٹل لیٹرز میں اپنا نام لکھا۔ پھر روسٹرم پر آئے اور اپنا تعارف جاری رکھا۔ کچھ دیر انگریزی میں بولنے کے بعد وہ اردو میں جاری ہو گئے۔

اُن کا لب ولہجہ اس بات کا غماز نہ تھا کہ اُن کی اردو اکتسابی ہے۔ وہ زیادہ وقت انگریزی بولتے لیکن جب اردو میں لیکچر دیتے تو ایسی ٹکسالی اردو اور اس قدر روانی کے ساتھ جاری ہوتی کہ فلسفہ خودی' ''اسرار ورموز''، ''ارمغان حجاز'' سہل ممتنع بن جاتی۔ سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہوتی۔

ڈبلے پتلے ہری نیلی آنکھوں والے اثر صاحب انگریزی میں بولے..... ''میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف Examinations ہوں۔ میرا کمرہ لیڈیز روم کے بالکل سامنے ہے جہاں برآمدہ مڑتا ہے عین وہاں..... آپ میں سے کسی کو کسی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ میرے پاس آئے..... میں دیکھوں گا کہ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اس پہلی ملاقات میں ہی کس بنا پر اثر صاحب اور خاں صاحب نے ایک دوسرے کو لمبے دوستانے کے لیے چن لیا۔ بہت جلد خاں صاحب اثر صاحب کے گھر آنے جانے لگے لیکن کالج میں کبھی کسی کو شک تک نہ گزرا کہ اشفاق صاحب اور اثر صاحب میں کالج کے بعد ایک بے تکلفی کا رشتہ بھی ہے۔ اس دوستی کی گہرائی اور گیرائی کو بس

یہی دونوں جانتے ہیں۔

اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن مہاجر بن کر یہاں آ گئے اور ڈپٹی کمشنری کا رعب کبھی نہ جھاڑا۔ صرف میں انہیں ڈپٹی صاحب بلاتی تھی اور بلاتی رہی۔ وہ بیڈن روڈ کے عقب میں لکشمی مینشن کی ایک نچلی منزل میں اپنی اہلیہ آپا ممتاز کے ساتھ رہتے تھے۔

کالج کے اوقات کے بعد وہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے لیے کالم لکھتے۔ رفتہ رفتہ وہ اُسی اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ خاں صاحب بھی وہاں پہنچ جاتے۔ اثر صاحب آئی سی ایس تھے لیکن اُن میں وہ شیخی خو بو نہ تھی جو عموماً اس کلاس میں ہوتی ہے۔

اثر صاحب کو اقبال اور پاکستان کی محبت کھینچ لائی تھی۔ پاکستان آ کر ڈپٹی صاحب نے بڑی طوفانی زندگی گزاری۔ اُن کے بچے جاوید، کمال، سعیدہ، تہمینہ اور سلمٰی اپنے اپنے مقام پر نگینے تھے لیکن اثر صاحب میں عورتوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ ایک امیر کبیر بیگم اُن پر لٹو ہو گئیں اور دوسری شادی پر آمادہ کر لیا۔ ممتاز آپا کا کمال ہے کہ انہوں نے بھی اُف تک نہ کی اور بیگم صاحبہ جب گھر کے اوپر والے پورشن میں منتقل ہو گئیں تو بھی وہ خاموش رہیں۔

سعیدہ ٹیلیویژن کی بڑی آرٹسٹ بنی۔ تہمینہ کے نصیب میں ممتاز مفتی کی بہو اور عکسی مفتی کی بیوی بننا لکھا تھا۔ سلمٰی ابھی بھی ٹیلیویژن سے منسلک ہے اور جاوید اثر نے امریکہ جا کر ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی اور کمال پی آئی اے میں بڑا افسر بن گیا۔

اثر صاحب ایک آرٹسٹ تھے۔ اُن کی زندگی طوفانی تھی اور آخر تک رہی..... آرٹسٹ لوگ لہروں کی طرح ساحلوں پر پٹخنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم اُن کی حالت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک باپ کی طرح میری حفاظت کرتے تھے اور کرتے رہے۔

خاں صاحب ایم اے اردو میں منشی فاضل کر کے پہنچے تھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' چھپ چکا تھا۔ وہ کالج کے بعد عام طور پر مکتبہ جدید چلے جاتے' لیکن ہم سب ہم جماعت کم تجسس اُس سے کم انفرمیشن اور بے حد کم علم طالب علموں کا گروہ تھا۔

آپا زبیدہ ڈپٹی کمشنر کی بیگم ضرور تھی لیکن علم سے اُن کا کوئی ناطہ نہ تھا۔ ذکیہ لب ولہجہ کو اردو زبان پر عبوری کا سرٹیفکیٹ سمجھتی تھی۔ مولوی طوطا شاید اپنی عربی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اردو دان سمجھتے تھے۔ رہ گئے قمر الزماں یہ بڑے سادہ لوح انسان تھے۔ نہ انہیں کسی بات پر مان تھا نہ کسی بات کی شیخی ہی تھی۔ وہ بچوں کے سے تحیر کے ساتھ پروفیسروں کو دیکھا کرتے۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ جو کوئی بھی اُن دنوں کونونٹ یا کسی مشنری سکول کی شکل دیکھ لیتا تھا' اس میں مغربی کلچر' انگریزی زبان اور رہن سہن کی شدھ بدھ پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ مقامی کلچر' علم' زبان والے کو کمتر سمجھنے لگتا تھا۔ یہ احساس غالباً فاتح کے ساتھ مل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب انگریز تو رخصت ہو چکا تھا اور وجہ بھی وہ نہیں رہی کہ فاتح کا کلچر اپنا کر انسان اپنے آپ کو برتری کی خلعت

جاکرے لیکن سفید فام قوموں کا تہور پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ بہادر کے ہاتھ میں مشرقی قوموں کو سجدہ ریز رکھنے کا ہنر ہے۔ جاپانی، چینی تو اس رُعب تلے اس قدر دبے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن مسلمان قومیں آنکھیں بھی دکھا رہی ہیں اور ابھی حسب توفیق خوب کھا رہی ہیں۔ اگر وہ اینٹھتے ہیں تو بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ دہشت گرد بن جاتے ہیں اور اگر ہتھیار ڈالتے ہیں، تو لبرل تو بن جاتے ہیں لیکن بی کلاس سٹیزن کی طرح اُن کی اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔

کالج میں مجھے ان باتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ میرے پاس ''فسانہ آزاد'' کی ساری جلدیں تھیں اور میرا مبلغ علم یہی تک محدود تھا۔ میری عقل ملاحظہ فرمائیے کہ اتنی تعلیمی استعداد پر مجھ میں خود اعتمادی سب سے زیادہ تھی۔ جس اشفاق احمد کو ''گلستان''، ''بوستان''، ''حفظ تھی، جو فارسی عربی کا سکالر ہونے کے باوصف اردو کی ان گنت کتابیں کھنگال چکا تھا۔ میں اُسے اندر ہی اندر Underrate کر رہی تھی۔

اب مجھے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احساس کمتری میں مبتلا انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ دہشت گردوں سے جا ملے یا خودکش بم کے سہارے اپنا آپ ختم کر ڈالے۔ ذہنی مریض بن کر کسی ہسپتال میں جا پہنچے یا کسی قتل کا مرتکب ہو جائے۔ بہرکیف زندگی اُس کے لیے معنی کھو دیتی ہے۔

وہ ہم سب کی تھوڑی تھوڑی مدد یا رہنمائی کرتے رہتے تھے، لیکن ہمیں کسی شکر گزاری میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ میں ''ہمدردی'' لفظ کو ''ھمد دری'' لکھا کرتی تھی۔ اشفاق صاحب اپنی کاپی پر ہمدردی لکھ کر یوں آپا زبیدہ کو دکھاتے گویا اصلاح چاہتے ہیں۔ میری نظر پڑ جاتی تو میں اپنی اصلاح کر لیتی، لیکن مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ اعتراف شکست کرتی۔

ابھی Self-projection کی بیماری عام نہ ہوئی تھی اور خودستائشی انداز زیست کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ خاں صاحب تو اس معاملے میں بہت ہی شرمیلے اور گونگے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت اپنے جملہ نالائق ہم مکتبوں سے اپنا آپ کمتر ثابت کرنے میں صرف کیا کرتے۔ زیادہ جانتے اور کم ظاہر کرتے۔ اُن کی کتاب ''ایک محبت سو افسانے'' چھپ چکی تھی، لیکن اُن کے منہ سے اس کتاب کا ذکر بھی نہ سنا۔

اُن کی ذاتی لائبریری تھی جس میں ان گنت کتابیں تھیں۔ اُن کی ملاقات ادیبوں سے تھی۔ کافی ہاؤس میں باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ کالج سے مکتبہ جدید جانا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ اثر صاحب سے ملاقاتیں عام تھیں، لیکن ان ساری Activities کا خاں صاحب نے کسی کلاس میں کبھی ذکر نہ کیا۔ کلاس میں انہوں نے کبھی ذہانت کا سکہ جمانے کے لیے مشکل سوالات نہ پوچھے۔

ایک بات البتہ اُن کی علم دوستی کی غماز تھی اور وہ لائبریری کی کتابیں تھیں۔ ان کو بھی کوئی شمار کیے بغیر وہ کسی بچے کی طرح اُٹھائے پھرتے۔ میں نے یونیورسٹی لائبریری کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا۔ یہ لائبریری انارکلی جانے والے راستے پر تھی اور عام طالب علم کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایک روز جب میں لائبریری سے باہر نکلی تو برآمدے میں مجھے اشفاق احمد ملے۔ انہوں نے نہ مجھے سلام کیا نہ نوٹس لیا۔ بس آہستہ سے بولے..... ''کیا میں آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے کتابیں پیش کر دیں۔ انہوں نے چند لمحے اوراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر بولے "دیکھئے اگر آپ چاہیں تو ہم کتابیں Exchange کر لیتے ہیں۔ میں چند دن کے بعد آپ کو یہ ساری لوٹا دوں گا۔"

جب میں کتابیں لے کر گھر آئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کورس کے متعلق درست چوائس نہیں کی تھی اور میں درست نہج پر کتابیں نہیں پڑھ رہی تھی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے جو کتابیں تبادلے کے طور پر لی تھیں ایم اے کے مطالعے کی غرض سے بے کار تھیں، لیکن انہوں نے میری عزت نفس کا پاس رکھا۔ یوں میری انا مجروح کیے بغیر، مجھ پر اپنی علمیت کا رُعب ڈالے بغیر خاں صاحب نے مجھے تاریخ ادب اردو، موازنہ انیس و دبیر، مولوی عبدالحلیم شرر کے ناول، محمد حسن عسکری کے افکار پیش کر دیئے۔

عورتیں کن بلندیوں کو چھو سکتی ہیں اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے انہوں نے عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" اور قرۃ العین حیدر کے افسانے بھی ساتھ نتھی کر دیئے۔ میں نے اس کے بعد پنجاب لائبریری جانا چھوڑ دیا۔ مجھ تک کتابوں کی ترسیل مسلسل ہو گئی تھی۔ وہ اگر اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں مستعار دیتے تو ہمیشہ ظاہر کرتے گویا یہ بھی پنجاب پبلک لائبریری کی کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی آمد و رفت سے اچانک میں خوفزدہ ہو گئی۔

ایک روز میں گھر جانے کے لیے برآمدے میں نکلی ہی تھی کہ اشفاق احمد کہیں سے آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں حسب معمول کتابیں تھیں۔ چہرے پر جلتی بجھتی مسکراہٹ تھی۔

"آپ نے یہ خطوط پڑھے ہیں؟"

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کن خطوط کی بات کر رہے تھے؟

"جی نہیں....."

"یہ کورس کی کتاب نہیں ہے۔ ملینا (Malina) کے نام خطوط ہیں لیکن بڑے خوبصورت....."

وہ آؤٹ آف کورس بات کر رہے تھے چونکہ مجھے اُن کی کتابوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ میں نے ملینا کے خطوط بھی پکڑ لیے۔

یہ خط جذبات میں بھیگے ہوئے بلکہ آنسوؤں میں سنے ہوئے تھے۔ لکھنے والے نے بڑی عاجزی سے ملینا کے حضور عرض کی تھی کہ "جس کرسی پر تم بیٹھ کر جاتی ہو وہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہارے وجود سے بھری رہتی ہے۔ جس کمرے میں سے تمہارا وجود گزر جاتا ہے وہاں تمہاری خوشبو سانس لینا دشوار کر دیتی ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ تمہاری چھاپ لگی ہے۔ بتاؤ میں اس دیوانگی سے کیسے نجات پاؤں؟"

ان خطوں کو پڑھنے کے بعد میں چور سی بن گئی.....اب مجھے کتابیں پکڑتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ نہ ہو کسی دن کسی کتاب میں سے کوئی محبت نامہ نکل آئے اور پھر وہ خط مجھے اپنی والدہ کو دکھانا پڑے۔ اب میں نے اس کا یہ راستہ نکالا کہ کبھی کتابیں لے لیتی کبھی انکار کر دیتی۔ رفتہ رفتہ جب کتابوں کی ترسیل میں تواتر نہ رہا تو اشفاق صاحب نے ایک اور راستہ نکالا۔

مجھے برآمدے میں روک کر انہوں نے سوال کیا "آپ کے پاس دونی ہو گی؟"

جی.....ہے۔''

''دے دیجئے' میری سائیکل پنکچر ہو گئی ہے۔''

میں نے دونی نکال کر دے دی۔

بغیر شکریہ ادا کیے وہ چپکے سے چلے گئے۔

انہوں نے ہتھیلی بڑھائی۔ دونی یوں وصول کی گویا کسی دربار میں خلعت سے نوازے گئے ہوں۔ پھر شان استغنا سے بغیر شکریہ ادا کیے لوٹ گئے۔ سفید ہتھیلی کے آگے پست سوال صورت بڑھنا اور بگڑے دل شہزادے کی طرح لوٹ جانا.....دونی کا مثل جزیہ کے پیش کرنا اور برتھ ڈے کیک کی طرح قبول کیے جانا.....ایک کندھا جھکا کر پشاوری چپل پر بوجھ ڈالتے ہوئے براؤن رنگ کی آنکھوں والے کا تیکھی نظر سے دیکھنا اور پھر روہانسا ہو کر لوٹ جانا.....

یہ سب میری یاد کی چلمن پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ جب میرا جی چاہتا میں چلمن گرا کر اس کی سکرین پر بنی پرانی یادکی تصویریں دیکھ لیتی۔ جب جی نہ چاہتا اس چق نما چلمن کو لپیٹ کر اوپر کر دیتی۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں یادیں ایک عجیب وغریب رول ادا کرتی ہیں۔ ہر انسانی عمل کی طرح یاد کا طبائع پر مختلف اثر پڑتا ہے.....اس کے خصائص بھی انسانی اعمال کے جملہ خصائص کی طرح اچھے بھی مرتب ہوتے ہیں اور ان میں برائی کا نمک بھی شامل رہتا ہے۔

بابے لوگ کہا کرتے ہیں جو لوگ ماضی کی یاد اور مستقبل کے اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں' وہ اپنے حال کو برباد کر لیتے ہیں۔ وہ حال کی گھڑی پر جو کچھ میسر ہے اس کا نہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ حالیہ نقصان سے بچنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔

لیکن اس امر کو بھی کیا کیا جائے کہ ماضی اپنی گہری چھاپ یاد کی صورت چھوڑ ہی جاتا ہے' اور اس کی گرفت سے آزادی ممکن نہیں۔ جیسے ساحلِ سمندر پر گیلے پیروں کے نشان ریت پر دور تک نکل جائیں۔

یاد کا اپنی اپنی طبیعت' کردار' جملہ جرثومہ ہسٹری سے گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ معمولی درمیانی سطح کی زندگی گزارتے ہیں' جن کی وابستگی روح سے کم اور جسم سے زیادہ ہوتی ہے' جن کے Genes خوش رہنے کا فن جانتے ہیں اور جنہیں عادتاً میں کام' کرودھ' ہنکار نہیں ملا ہوتا' انہیں یادوں کا Lasso پکڑ کر زخرید نہیں بنا سکتا۔

یہ لوگ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے' نسل آگے بڑھانے اور سیر سپاٹے میں مگن زندگی کو بیہودہ یادوں کے حوالے نہیں کرتے.....ایسے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ خود ارتقائے انسانی میں حصہ لیتے ہیں نہ ارتقائے حیات کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ان کے لیے واقعات' حادثات' واجبات آئے اور چلے گئے۔ بیٹھ کر ان پر تاسف کرنا' حساب کتاب کرنا' جمع جتھا ملانا ان کی عادت نہیں۔ جب تک ان کی جسمانی ضرورتیں بمقدار وافر سہولت کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں انہیں کسی سنگ میل کنارے کھڑے ہو کر پرانے راستے کو دیکھتے رہنے کی حاجت پیش نہیں آتی۔

بنی نوع انسان زیادہ تر ایسے ہی انبوہ کثیر کی کثرت سے بنا ہے۔ یہ نہ ماضی کی یاد میں بے قرار ہوتا ہے نہ مستقبل کے اندیشے میں مبتلا ہوتا ہے۔ حال میں رہتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی حال میں مشغولیت بابوں جیسی نہیں ہوتی۔ بابے جب حال میں مشغول ہوتے ہیں تو غالباً وہ حال کی گھڑی کو رب سے منسوب کر کے راضی برضا ہونے کو زندگی کا

کندن بناتے ہیں۔

عام دنیادار آدمی کو نہ رب کی آگہی ہوتی ہے نہ راضی برضا ہونے کا فن آتا ہے۔ وہ گویا خالی الذہن ہو کر اپنی زندگی میں خوشی خوشی مگن، جسم کی ضرورت سے آگاہ چھوٹے بڑے کپڑے کو ناپتا چلا جاتا ہے۔ نہ اُسے مابعد کا خوف ہوتا ہے نہ نروان کا بھلیکا ستاتا ہے۔ نہ اُسے جنت اور دوزخ ہی کے وسوسوں کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہری ہری دھوپ کی طرح حدِ نظر تک سبزہ پھیلائے رکھتے ہیں اور آنکھ کا حالیہ منظر حسین رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے ہٹ کر کچھ لوگ فنونِ لطیفہ کے شیدائی، امر ہو جانے یا امر کر دینے کے شائقین، بے قرار، مضطرب..... ایسے لوگوں کے لیے یادیں تخلیق کا باعث بنتی ہیں..... ان کے لیے گزرے موسم ان کہی باتیں، ان چھوئے جسم، ادھورے واقعات، دھندلے چہرے، چھوٹی چھوٹی وارداتیں، غیر محسوس حد تک اُبھرنے والی خوشبوئیں، مسکراہٹیں، آنکھوں سے لوٹ جانے والے آنسو..... بستروں کی سلوٹیں، کھونٹیوں سے ٹنگے ہوئے پرانے کپڑے، پرانا ٹوتھ برش، ٹوٹا ہوا پین، کاغذوں پر ادھوری سطریں، سوکھے پن ہمیشہ بامعنی رہتے ہیں۔

یوں سمجھئے جو کچھ گزر گیا ان کے اندر کسی پتھر کی سل پر موہنجوداڑو کی عبارت بن کر مرتسم ہو گیا..... تخلیق کار اس عبارت کو پڑھنے میں برسوں صرف کرتا ہے۔ وہ ان ہی یادوں کے سہارے اُن لوگوں تک پہنچتا ہے، جو تخلیقی عمل میں تو داخل نہیں ہو پاتے لیکن یادوں کے ڈسے ہوئے رہتے ہیں۔

ان ہی یادوں کی کھنکناتی مٹی سے آرٹسٹ کبھی شعر لکھتا ہے کبھی مجسمہ بناتا ہے۔ کبھی صفحہ قرطاس پر شناسا چہرہ، بھولی بسری گلی، اداس دریچہ بنالیتا ہے۔ گانے والے کی لے میں اُس کے سوز و گداز میں یہی یادیں اُبھرتی ہیں اور سننے والے اور اُس کے مابین ایک رشتہ استوار کر لیتی ہیں۔

یادوں کے ایندھن کے بغیر کبھی بااثر آرٹ جنم نہیں لیتا۔ اس گندھی مٹی کے نہ ہونے پر کوئی مہاتما بدھ کا مجسمہ نہیں بنتا۔ جسے صدیوں بعد لوگ حیرت سے دیکھیں۔ یادوں کے بغیر کبھی ایسی Levitation ممکن نہیں جس سے ارض زمین کا گھیر دُور تک نظر آ سکے.....

کچھ عاشقوں کے لیے یاد زہر ہلاہل ہے۔ وہ مجنوں ہو یا کسی ہیر ہو یا ماروی..... اُن کے لیے ایک چھوٹی سی یاد ساری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ وہ اس یاد کے گرداب سے نکل نہیں پاتے۔ یہی اٹل یادیں انہیں امر کر دیتی ہیں۔ پھر وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک تو سفر کر سکتے ہیں، لیکن ان لمحوں سے نکل کر عام روایت، رسم و رواج، اقدار، مسلک کی پیروی نہیں کر سکتے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُن کے لیے ان ہی یادوں کا تریاق اور ان ہی کا زہر ہلاہل ساتھ ساتھ دو نہروں کی طرح چلتا ہے، جن میں آڑ تو رہتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

یاد ایک عمومی، اساسی بنیادی کیفیت ہے جو ہر دل پر اپنا وار کرتی ہے۔ محبت کی طرح یہ بھی ہر در پر دستک دیتی ہے۔ پھر ہر انسان اپنی طبیعت، کردار، جینز کی انجینئرنگ، موروثی افتادِ طبع، تلاش کے مطابق اس یاد کو اپنے فائدے یا نقصان میں ڈھال لیتا ہے..... کچھ لوگ یادوں سے ایسے ڈسے جاتے ہیں جیسے کوڑیالے ناگ کا ڈسا پانی نہ مانگے..... کچھ دریچہ کھولتے ہیں۔ دُور کا منظر دیکھتے ہیں اور کھڑکی بند کر کے آرام سے سو جاتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اس ''دونی'' کی وجہ سے کہیں بات نہ بڑھ جائے..... لیکن ہر بار وہ دونی مانگتے' لوٹانے کا وعدہ کرتے اور بغیر شکریہ ادا کیے آگے چلے جاتے..... بات کبھی آگے نہ بڑھی کیونکہ اشفاق احمد لڑکیوں کی طرح شرمیلے اور پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے۔

اشفاق احمد خاں اپنی خاندانی روایات کے تحت کسی غیر پٹھانی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کو اپنے گھر والے فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اتنے پسند تھے کہ وہ ان کی گرفت سے نکلنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ ایسے میں وہ ایک قدم میری جانب بڑھتے تو دس قدم پسپائی کے اختیار کر لیتے۔ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے ایک یہ خوبصورت Defense mechanism اپنا لیا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت جب وہ کالج آئے تو اُن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا چھلا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح شادی شدہ ہونے کا اعلان تمام لڑکیوں کو اور خاص کر مشنری سکول کی پڑھی لکھی لڑکی کو دُور باش رہنے کی لال جھنڈی دکھا دے گا..... وہ کبھی کبھی نوٹس لینے سے پہلے چھلے کو انگلی میں گھما کر ہاتھ میز پر بھی اعلانیہ انداز میں رکھ دیتے لیکن مجھ پر اس اعلان نے خاطر خواہ اثر نہ کیا۔

میں ایسا فقیر تھی جو مانگنے تو نکلے لیکن اپنی عزت نفس بچانے کے لیے کاسہ چھپائے رکھے۔ قرض مانگنے کی اشد ضرورت ہو لیکن ساتھ ہی یہ آرزو بھی پال رکھے کہ یہ قرض کبھی واپس نہ مانگا جائے۔ بیٹی کا رشتہ خود ہاتھ جوڑ کر کرانے پر مجبور ہو لیکن مشہور یہ کردے کہ لڑکے والوں نے پھیرے ڈال ڈال کر دہلیز توڑ دی ہے..... میں وہ لڑکی تھی جو عاشق کو اغوا پر مجبور کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ گھر والے' معاشرہ' قانون سب عاشق کو مورد الزام ٹھہرائیں..... ہنس ہنس کر یاری لگانے والی اور رو رو کر سارا کچا چٹھا بیان کرنے والی کا تضاد بڑا کربناک ہوتا ہے.....

ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی۔

اس خوف کا رنگ ہم دونوں میں یکساں نہ تھا۔ اشفاق خاں کا خوف شام کی دھندلی روشنی سے مشابہ تھا' جس میں نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن واضح کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خوف کا رنگ بسنتی تھا۔ سارے میں سرسوں کھلی تھی۔ مجھے سارا سچ سرسوں کے کھیت کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے ماننے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اس سے مقابلہ کرنے سے میں بدکتی تھی۔

میں ہر روز کسی معجزے کا انتظار کرتی اور پھر خوف کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔ خاں صاحب شام ڈھلے پر جھکے مارتی لالٹین کے لیے تیل خریدنے جاتے' لیکن دکان پر پہنچ کر وہ دونی دیتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتے اور اپنے آپ کو غالب کی طرح سمجھاتے کہ اب میری آرزو ہے کہ زندہ نہ رہوں۔ خواہش اور گریز آری کی صورت اُن کے انداز چلتے۔ نہ وہ خواہش کے میدان میں نبرد آزمائی کرنے کے اہل تھے نہ مکمل طور پر بھاگ جانے کے اہل ہی..... پہلے انہوں نے چھوٹے سفر اختیار کیے اور پھر اسی گریز کی خواہش نے انہیں روم پہنچا دیا۔

اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ نوٹس لکھا کرتے تھے جواب ملے ہیں۔ اُن کی شادی کا چھلا تو آپ کو دکھایا نہیں جا سکتا کہ اب وہ عکسی مفتی کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا سمبل نہیں بلکہ اشفاق احمد سے وابستگی کے طور پر پہنتا ہے لیکن خوف کے متعلق اُن کی کاپی سے یہ خیالات برآمد ہوتے ہیں۔

فیصلے دو تھے اور دونوں پر عمل پیرا ہونا خطرناک بھی تھا اور ناممکن بھی لیکن جب انسان اپنی بساط بھر دو فیصلے کر کے ان دونوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے تو عموماً اُسے دوہری ناکامی ملتی ہے۔ خاں صاحب نے بھی محبت کو شطرنج کی بازی سمجھ کر بار بار مہرے بدلے۔

جب اشفاق صاحب کی انگوٹھی نے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کیے۔ کتابوں کا رابطہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونی بار بار مانگنے کا کھیل بھی پھیکا پڑ گیا تو انہوں نے ایک اور سوانگ بھرا۔ وہ ایک دن کلاس میں آئے اور مولوی طوطا سے کہنے لگے..... ''کیا آپ نے اپنی اصلی عمر فارم میں بھری ہے؟''

''ہاں تو اور کیا.....''

''بڑی غلطی کی۔ آخر دو چار سال تو نوکری کی تلاش میں لگ جائیں گے۔ کیا پتہ ایم اے دو سالوں میں نہ ہو سکے تو پھر تو آپ سروس کے لیے Over age ہو جائیں گے۔''

سارے طالب علم چوکنے ہو کر سننے لگے۔

''میری عمر چھتیس سال ہے لیکن میں نے ساری باتوں کا پرتا لگا کر سچ نہیں لکھا..... یہ حکمت ہے۔ جھوٹ نہیں ہے.....''

یہاں اُن کا مقصد ایک بار پھر لڑکیوں کو بڑھاپے کا خوف دلا کر بھگانا تھا۔ اب بھی کبھی وہ کلاس میں کندھے پر مکیاں مارتے۔ اسپرو کی گولیاں پھانکتے..... چلنے میں لنگڑانے کی ایکٹنگ کرتے۔ مجھ سے آپا زبیدہ نے ایک روز کہا..... ''ہائے اشفاق! تو بڈھا ہے، لیکن لگتا نہیں ہے..... ہے نا.....''

میں چپ رہی۔ اُس زمانے میں واقعی چھتیس برس کا نوجوان بوڑھا لگتا تھا۔ مجھے سارے پروفیسران بھی عمر کے ناکارہ بوڑھے لگتے تھے، لیکن خاں صاحب کے متعلق مجھے شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ دوہرے فیصلے میں گھر کر یہ کھیل کھیلتے جا رہے ہیں۔ اُن کی عملی اور علمی مدد نے میری نالائقی کو اور مستحکم کر دیا تھا۔

اب بڑھاپا اُن کا نیا Defense mechanism بن گیا۔ اب بات بے بات بڑھاپے کا ذکر، بڑھاپے کا ڈھونگ، بڑھاپے کا رونا دھونا علانیہ اور اشارتاً ہونے لگا۔

اسی بڑھاپے کا ذکر انہوں نے اُن خطوں میں بھی کیا ہے جو انہوں نے اپنی بھانجی ناہید کو لکھے۔ اُسی کافر کو دیکھ کر جینا جس پر دم نکلے اُن کا وطیرہ حیات بن گیا۔ وہ محبت کو انسان کی معراج بھی سمجھتے تھے اور اس محبت سے کنارہ کشی بھی چاہتے تھے۔

بڑھاپے نے ابھی اصل صورت بھی نہ دکھائی تھی لیکن پودا جو ''زاویہ'' تک پہنچتے پہنچتے پورا چھتنار درخت بن گیا تھا اس کا بیج بہت پہلے بویا گیا۔ ان دنوں وہ اپنی نوٹ بک میں بڑھاپے کے متعلق جو کچھ ارشاد کرتے رہے حاضر خدمت ہے:

بڑھاپا

آج ایسا دن پھر پتہ نہیں کب آئے گا۔ اس وقت مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے اونچے اونچے گاتا ہوا باہر سڑک پر نکل جاؤں اور ہر نوجوان کو روک کر اس کے بالوں کو غور سے دیکھ کر ٹھٹھے مار کر ہنسوں اور چلا چلا کر کہوں جاؤ اپنی

بچوں سے کہانیاں سنو۔ اپنی اماں کو دھمکیاں دو۔ اپنے باپ سے پیسے مانگو!

صبح صبح شیو بناتے ہوئے آئینے میں ایک لمحے کے لیے میں نے صابن کے پھین سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے کو دیکھا۔ اپنی چنیاں سی آنکھوں کا جائزہ لیا اور اچانک میری نگاہ بائیں کنپٹی پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا وہاں ایک سفید بال چمکتے اور سیاہ بالوں کے درمیان سیمیں تار کی طرح چپٹا ہوا تھا۔ دوسرے بالوں کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اچھی طرح سے اس کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے دھوکا نہ ہوا ہو۔ لیکن واقعی وہ ایک سفید بال تھا۔ سفید بال۔ Gray hair۔ میری اُمیدوں کا محور، میرے ارمانوں کا روپہلی سپنا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے ایک مرتبہ تو چوم ہی لوں۔ بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی سے اُسے چھو کر میں نے اپنا پوتا چوم لیا.... صابن کے جھاگ کو اپنے چہرے پر اسی حالت میں چھوڑ کر میں جلدی جلدی نیچے اُترا۔ سیڑھیوں پر مجھے توقیر مل گیا۔ میں نے اُسے اپنی کنپٹی دکھا کر کہا ''دیکھنا یہاں ایک سفید بال بھی ہے؟''

تھوڑی سی تلاش کے بعد توقیر نے اُسے ڈھونڈ نکالا اور کہا ''ہاں ہے! کیا میں اسے اُکھاڑ دوں؟''

میں نے فوراً اپنے سر کو جھٹکا دے کر ہٹا لیا اور کہا ''نہ! نہ!! کہیں ایسا ظلم نہ کرنا۔ میری جان نکل جائے گی۔ میری موت واقع ہو جائے گی۔''

اپنے کمرے میں واپس آ کر میں نے جھاگ کو چہرے سے پونچھ ڈالا اور شیو نہیں بنائی۔ پھر میں کرسی کھینچ کر شیشے کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ''میری پیری کے پیامبر! تو دبے پاؤں میرے گھر آیا ہے ڈرتے جھجکتے جھجکتے لیکن میں ایک مفلس اور نادار ادھیڑ عمر کا آدمی ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خاطر کروں؟ لیکن اس قدر مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ میں تم سے ناراض بھی ہوں۔ بتاؤ تو تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔ تمہاری راہ تکتے تکتے میں نے حشر سے کئی دن گزار دیے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میں نے کئی راتیں سیاہ کر ڈالیں اور تم اتنی دیر کے بعد آئے اور اگر تمہیں دیر ہی سے آنا تھا تو اکیلے کیوں آئے؟

کیا تمہارے گروہ کو یقین نہ تھا کہ میرا سرِ تسلیم تمہارے لیے ہمیشہ خم رہتا ہے۔ کیا تمہارے قبیلے کو اعتبار نہیں آتا تھا کہ میرا سرِ نیاز اُن کے آستانے پر ازل سے جھکا ہوا ہے؟

بتاؤ نا تم اکیلے کیوں آئے؟

میں اپنے سفید بستر پر نسواری رنگ کی پلش کی رضائی لپیٹے بیٹھا تھا کہ میرا سب سے چھوٹا پوتا محمود میرے پاس آ کر کہنے لگا ''بابا جان! اکنی دو میں لٹو لوں گا''۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر اُسے دونی نکال کر دی۔ وہ دونی لے کر تیزی سے دوڑا۔ میں نے پکار کر کہا ''جانِ بابا آہستہ'' اُس نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا' پر اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ اُسے اس طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس کے ابی کا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی طرح دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح ضد کیا کرتا تھا اور ایسے ہی روتا تھا۔

اور میرا سب سے بڑا پوتا کالج میں داخل ہو کر کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہے۔ بلیزر پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں دبائے میرے پاس سے گزرا کرتا ہے اور مجھے بڑے ادب سے سلام کیا کرتا ہے۔ میں اس کے سلام کا جواب ہمیشہ ''جیتے رہو'' کہہ کر دیا کرتا ہوں۔ مجھے بس یہی ایک دعا آتی ہے اور یہی اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھار وہ میرے پاس رُک کر

پوچھا کرتا ہے ''بابا جان! آپ کے زمانے میں بھی کالج میں ٹیلیویژن تھیٹر تھا؟'' تو میں مومن کا دیوان بند کر کے اور اپنی عینک اُتار کر آہستہ سے کہا کرتا ہوں ''جب ہم تمہارے کالج میں پڑھتے تھے بیٹا تو سنا کرتے تھے کہ ٹیلیویژن ایجاد ہو چکا ہے اور امریکہ میں اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس وقت تھیٹر کہاں سے بنتا۔ یہ ہمارے بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو اس تھیٹر کی جگہ لائبریری ہوتی تھی اور اس کا لائبریرین اچھی عمر کا ایک سندھی تھا جو کب کا مر کھپ چکا ہوگا۔''

میرا چھوٹا پوتا آ کر کہتا ہے ''بابا میرا لٹو دیکھو! تمہیں گھمانا آتا ہے بابا؟''

میں چمکار کر کہتا ہوں ''اچھا ہے جانِ بابا۔ بڑا اچھا۔ اب مجھے گھمانا نہیں آتا۔ اب تم گھماؤ۔''

اور میرا پوتا اپنا مُنا ہاتھ کھول کر میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ''لو اتنے بڑے ہو گئے اور لٹو گھمانا نہیں آتا۔''

میں ہنس دیتا ہوں اور میرا پوتا بھی ہنسنے لگتا ہے۔

میری پوتی آ کر کہتی ہے ''بابا سارا دن لیٹے کیا کرتے رہتے ہو۔ مجھے ''دیوانِ غالب'' ہی پڑھا دیا کرو۔''

اور میں کہتا ہوں ''دیوانِ غالب'' کسی سے پڑھا نہیں کرتے بیٹا! خود ہی سمجھا کرتے ہیں اور پھر تمہارے ''دیوانِ غالب'' کو میں کیا پڑھاؤں گا۔ ہمارے زمانے میں تو ''دیوانِ غالب''

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سے شروع ہوا کرتا تھا اور تمہارے ''دیوانِ غالب'' کی سب سے پہلی غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

کے شعر سے شروع ہوتی ہے۔''

اور میری پوتی روٹھ جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پچھلے دیوان کی ترتیب غلط تھی اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب وہ اپنا دیوان میرے بستر پر چھوڑ گئی تھی اور میں نے اسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا تو اُس کے ہر صفحے پر ایس (S) لکھا ہوا تھا اور ایک جگہ (Shahid) لکھ کر کاٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بلا کر کہا ''اپنی کتابیں اس طرح خراب نہیں کیا کرتے بیٹا اور کتاب پر صرف اپنا ہی نام لکھا کرتے ہیں!''

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی کتاب لے کر واپس چلی گئی۔

میرے ان جگر گوشوں کا ابی شام کو دفتر سے آ کر ہر روز پوچھا کرتا ہے ''ابا جی! انگوڈین پی تھی؟'' اور میں مسکرا کر کہتا ہوں ''پی تھی بیٹا۔ پی لی تھی!'' اور وہ میری مسکراہٹ سے بھانپ جاتا ہے کہ میں نے دوا نہیں پی۔ چڑ کر کہتا ہے ''ابا جی! پتہ نہیں آپ کو کیا ہوا ہے۔ میری بکواس پر تو آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔'' میں پھر ہنس پڑتا ہوں اور کہتا ہوں ''تیری بکواس سننے کے لیے ہی تو زندہ ہوں۔ بھلا مجھے اب اور یہاں کیا کرنا ہے؟''

اس دوران میں میرا بڑا پوتا پھر آ کر پوچھنے لگتا ہے ''بابا جان! آپ کے زمانے میں کالج کی مسجد اتنی ہی بڑی

تھی؟" تو میں پچھلے دن یاد کر کے کہتا ہوں "مسجد کہاں تھی بیٹا! ایک چبوترہ سا تھا۔ اُس کے پاس یو۔او۔ٹی۔سی کے لڑکے چاند ماری کیا کرتے تھے۔ اس کے پہلو میں انگریز پرنسپل کے نام پر ڈنکلف ملک بار تھی اور اس کے ساتھ پھل فروش کی ایک مختصر سی دکان۔ میں اس چبوترے پر نماز پڑھنے تو کبھی نہیں گیا تھا لیکن اپنے ہم درسوں سے سنا کرتا تھا کہ وہاں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔"

پھر وہ پوچھنے لگتا ہے کہ اٹامک ریسرچ لیبارٹری میں.....

تو میرا بیٹا بات کاٹ کر کہتا ہے "کیا فضول چیزیں پوچھتے رہتے ہو۔ تمہیں کالج کی تاریخ لکھنا ہے کیا؟"

میرا پوتا خاموش ہو جاتا ہے اور میں اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہتا ہوں "پوچھنے دو تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ ہی سے پوچھتا ہے نا!"

اپنے زمانے کی ساری مشعلیں ایک ایک کر کے بجھ گئیں۔

اثر مر گیا۔ قمر صاحب کا جنازہ نکل گیا۔ ممتاز کی ہڈیاں بھی گل چکیں..... کو تپدق نے آ لیا اور وہ دو بچے چھوڑ کر مر گئی..... اپنی عمر کو پہنچ کر ختم ہو گئی..... کا پتہ نہیں۔ مری نہ ہو گی تو مرنے والی ہو گی۔ ایک ایک کر کے سارے ساتھی چھوٹ گئے۔ بس زوبی اور میں رہ گئے۔ دیکھوں ہم میں سے پہلے کون چلتا ہے!

☆ گزرتے ہوئے سال ہم سب کو بوڑھا بنا دیتے ہیں لیکن دانشمند کسی کسی کو بناتے ہیں۔

☆ بڑھاپا بھی دراصل پتھر اور دھات کے زمانے کی طرح دھات کا زمانہ ہوتا ہے۔ دانتوں میں سونے کے تار لگے ہوتے ہیں۔ بالوں میں چاندی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں قلعی کا رنگ ہوتا ہے۔ (اور شلوار میں سکہ لٹک رہا ہوتا ہے)۔

☆ انسان کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جوانی' درمیانی عمر اور "ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو۔"

☆ بوڑھے آدمی اس لیے اچھے ہو جاتے ہیں کہ اُن سے بُرے ہوا نہیں جاتا۔

☆ وہی بچے ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں جنہوں نے ہمیں بوڑھا بنایا ہوتا ہے۔

☆ جوانی میں ہم مشکلات میں پھنسے رہتے ہیں بڑھاپے میں مشکلات ہمارے اندر پھنسی رہتی ہیں۔

☆ جب آپ تجربات سے بھر جاتے ہیں تو اس قدر بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے تجربے کو ملازمت نہیں دیتا۔

☆ بھرپور بڑھاپا اس وقت آتا ہے جب آپ کی کالی ڈائری میں صرف ڈاکٹروں کے فون نمبر ہوتے ہیں۔

☆ بڑھاپے میں ہر روز دو دن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ بوڑھا ہونے میں یوں مزا نہیں کہ اُس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔

☆ بڑھاپے کا اندازہ اس وقت لگتا ہے جب چلے بغیر آپ کے پاؤں دُکھنے لگیں اور بستر سے اُترے بغیر آپ کی ٹانگیں تھک چکی ہوں۔

☆ بڑھاپے کا ایک مزا یہ بھی ہے کہ جس قدر شور کا لیول اونچا ہوتا جاتا ہے' سماعت کا لیول نیچا ہوتا جاتا ہے۔

☆ جب آدمی جھولا کرسی میں بیٹھا ہو اور اُس کو ہلا نہ سکتا ہو اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔
☆ مجھے اس وقت یقین آ گیا کہ میں واقعی بوڑھا ہو چکا ہوں جب ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس نے پوچھا آپ چائے پئیں گے یا کافی یا ماءاللحم؟
☆ بوڑھے ماضی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ ماضی بڑھاپے کے مقابلے میں کھلا، وسیع وعریض اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔
☆ جب آدمی بس میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کسی خاتون کو دینی چاہے اور اس سے کھڑے نہ ہوا جائے تو سمجھے بوڑھا ہو چکا ہے۔
☆ سو سال زندہ رہنے کا ایک راز ہے...... سانس لیتے جاؤ!
☆ اکیلے بوڑھے ہونا بڑی دردناک بات ہے۔ میری بیوی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں کئی سال پہلے کھڑی تھی۔
☆ سڑک میں اپنے ہاتھ دھونے اور سیدھے چلنے پر جس قدر کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے ایک بوڑھے کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔
☆ بوڑھا ہونے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جلدی نہ کرے۔ بس آہستہ آہستہ بڑھاپے میں داخل ہو۔
☆ آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب اپنے سارے دانت ایک گلاس میں ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔
☆ کئی بڈھے جوانی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہاں سب کچھ سستا پڑتا ہے۔
☆ لمبے سفر پر جب ابھی نقدی ہو اور طاقت ختم ہو جائے تو سمجھو کہ بوڑھے ہو گئے۔
☆ بڑھاپے کا کچھ طے نہیں ہے۔ آدمی ایک صبح اٹھتا ہے۔ منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔

آدمی بوڑھا کب ہوتا ہے:

☆ جب ہوٹل میں جا کر اِدھر اُدھر جلوہ لینے کے بجائے مینو دیکھنے لگ جائے اور قیمتوں کا موازنہ کرے۔
☆ جب اس کو 8 کا ہندسہ 3 نظر آنے لگے۔
☆ سیر کے لیے جائے اور جا کر بنچ پر بیٹھ جائے اور سارا وقت بیٹھ کر یہ سمجھے اس نے سیر کر لی۔
☆ جب اس کو سارے سوالوں کے جواب آتے ہوں اور کوئی بھی اس سے سوال پوچھنے والا نہ ہو!
☆ جب ہڈیاں سخت ہو جائیں۔ ناڑیاں سخت ہو جائیں..... نہیں جناب دل سخت ہو جائے!
☆ جب آدمی اُٹھنا چاہے اور اُٹھ نہ سکے۔ ہنس کے دکھا دے۔
☆ آدمی اُس وقت جوان ہوتا ہے جب صبح گیراج میں سے نکال کر سٹارٹ کرے تو سوئی صفر پر پہنچی ہوئی ہو اور بوڑھا اُن دنوں ہو جاتا ہے جب گیراج میں پہنچے ہمیشہ پٹرول کی ٹینکی فل پائے۔
☆ جب آرام کرنے میں زیادہ وقت لگے اور تھکنے میں کم تو سمجھو کہ بڑھاپا آ گیا۔
☆ بوڑھا ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہر وقت چھوٹوں کی نصیحتیں سننا پڑتی ہیں۔

- بڑھاپے سے گریز کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی چند نئے احمقانہ رویے سیکھ لے۔
- جب آدمی یہ سیکھ جاتا ہے کہ اُسے سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے اُس وقت قدم اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔
- بڑھاپے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی تمہاری کہانی نہیں سنتا اور کوئی تمہاری نصیحت پر عمل نہیں کرتا۔
- بہت سے آدمی بس زندگی میں بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔
- جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اس کی دواؤں کی الماری بڑی ہوتی جاتی ہے۔
- بڑھاپے میں ہر انگ میں درد ہونے لگتا ہے اور جس میں نہیں ہوتا وہ کام کا نہیں رہتا۔
- بڑھاپے میں جب آپ اس بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی کچھ ہی کہے آپ کو تکلیف نہیں ہوتی اس وقت کوئی بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا، کوئی کچھ بھی نہیں کرتا۔
- زندگی میں بس ایک بڑھاپا ہی ایسی کمال کی چیز ہے جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے خود بخود آ جاتا ہے۔
- دادا بننے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ دادی کا خاوند بننے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- آدمی اسوقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب ایئر ہوسٹس کی طرف دیکھنے کے بجائے کھانے کی ٹرے پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے۔
- ہر شخص لمبی عمر کا خواہاں ہے لیکن بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا۔
- بڑھاپے سے دور رہنے کے لیے نئے خیالات اپناتے رہنا چاہیے اور پرانی عادتیں چھوڑتے جانا چاہیے۔
- آدمی زندگی گزارنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی میں دلچسپی نہ لینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- بوڑھا ہونے سے بھی ایک بُری بات یہ ہے کہ بڈھا بوڑھے ہونے سے انکار کر دے۔
- بوڑھے ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی دیر سے بوڑھا ہوتا ہے۔
- اگر پرانے فرنیچر کی طرح پرانے بڈھوں کی بھی ایسی قدر افزائی ہوتی تو پھر بڑھاپے کا مزا تھا۔
- ایک شادی شدہ جوڑے کو بڑھاپے کے لیے صرف اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔
- جو لوگ بڑھاپے میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں انھوں نے جوانی میں ضرور چھوٹی چھوٹی خوشیاں خیرات کی ہوں گی۔
- آدمی سالوں کے گزرنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ اپنے اصول چھوڑ دینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- چالیس برس کی عمر جوانی کا بڑھاپا ہے اور پچاس برس کی عمر بڑھاپے کا بچپنا ہے۔
- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور دردناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال بڑے بھیانک اندیشوں میں گھرا رہا ہوں..... لیکن یہ سارے واقعات مجھ پر گزرے نہیں۔ بس مجھے دور سے ہی ڈراتے رہے اور میری زندگی اجیرن کرتے رہے۔
- بوڑھے ہونا ایک بُری عادت ہے جو انسان بڑی عمر میں پہنچ کر سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ مصروف رہے اور مسجد آتا جاتا رہے تو پھر یہ بُری عادت پڑ ہی نہیں سکتی۔

☆ اگر کوئی شے ''بوڑھی'' یا ''پرانی'' یا ''عمر رسیدہ'' ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی۔ اس لیے رہتی چلی آ رہی ہے اور رہتی چلی جائے گی۔

☆ جو شخص بیس برس کی عمر میں خوبصورت نہیں اور تیس برس کی عمر میں مضبوط اور طاقتور نہیں اور چالیس برس پر پہنچ کر امیر نہیں اور پچاس برس پر دانشمند نہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ وہ کبھی بھی خوبصورت' امیر' سمجھدار اور طاقتور نہیں رہا۔

☆ بڑھاپے میں جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو بڈھا کبھی بھی فون نہیں اُٹھاتا کہ میرے لیے تھوڑی ہوگا!

☆ دل کی عمر کا راز سفید بالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ عورت اپنی عمر کے بارے میں اُس وقت جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے جب اس کا چہرہ سچ بولنا شروع کر دے۔

☆ جب آدمی سیڑھیاں چڑھتے وقت اور سیڑھیاں اُترتے وقت ایک سا رہے جوان ہوتا ہے اور جب سیڑھیاں اُترتے وقت بھی اس کی سانس پھول جائے تو وہ بڈھا ہو چکا ہوتا ہے۔

بزرگ افراد کا یوم

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شروع تک تو بزرگوں کی عزت اور بزرگوں سے محبت مغرب میں بھی ایسے ہی تھی جیسے ہمارے یہاں مشرقی ممالک میں ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یورپ اپنی دھن میں مصروف ہو گیا۔ بہت زیادہ مصروف۔

وہاں رشتوں میں رخنے پڑنے لگے اور خاندان اور گھریلو زندگی اور کنبے کی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

صنعتی ریل پیل اور دولت کی افراط نے جہاں سارے انسانی رشتوں پر شبخون مارے وہاں بوڑھے بزرگوں بوڑھے عزیزوں اور بوڑھے لوگوں پر مصروف معاشرے کی توجہ سب سے کم ہو گئی۔

مالی اور معاشی طور پر تو بوڑھے لوگ..... کسی قسم کے ''خطرے'' کا شکار نہ ہوئے لیکن جذباتی اور ''تعلقاتی'' طور پر انسانی گروہ سے بچھڑ گئے اور تقریباً آدھی صدی تک بے توجہی کا شکار رہے۔

اس کے بعد مغرب کے مفکروں اور دانشوروں اور سیاستدانوں نے اپنے بزرگوں کی طرف دوبارہ توجہ دی اور انہیں ''سینئر سٹیزن'' کا نام دے کر دوبارہ معاشرے میں..... اُن کا کھویا ہوا مقام دلانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

وہ دن اور آج کا دن اب وہاں سینئر سٹیزن ڈے اور Senior Function اور..... سینئر سٹیزن Occasion بڑے شوق سے منایا جاتا ہے..... مشرق کے لوگ اور تیسری دنیا کے باسی بھی چونکہ ولایت کے مہذب دنیا کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لیے وہ بھی اس قسم کے تہوار منانے ضروری سمجھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا میں منائے جاتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ بوڑھے اور بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ ہمارے معاشرے کا ایک اٹوٹ جزو ہیں اور ان کے بغیر ہمارا معاشرہ مکمل نہیں ہوتا۔ ہم بہ امر مجبوری اس قسم کے ڈے منانے پر مجبور ہیں.....

اب یہ تو ہوئی ناں میری جذباتی بات اور وابستگی کی بات..... لیکن اگر ہم اپنی پکی روایت کے باوصف اپنے

بزرگوں کی حالت پر نگاہ ڈالیں تو بڑے معاشرے کی مختلف ٹکڑیوں میں ..... کہیں کہیں..... ان کی زندگی ویسی پُر وقار نہیں جیسی کہ ہمارے باپ دادوں کے زمانے میں تھی۔ وہ بالکل بھلائے تو نہیں گئے البتہ..... بے توجہی کا شکار ضرور ہیں۔

مجھ سے ابھی کوئی پوچھ رہا تھا کہ بزرگ کب ہوتا ہے۔ یعنی کوئی سینئر سٹیزن کب ہوتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ملازمت میں جب وہ ریٹائر ہو کر گھر آ جائے۔

اور دوسرا کام کاج' تجارت' صنعت' دکانداری کرتے ہوئے وان پرست دور میں داخل ہو جائے۔ ایک تو بچپنا ہوتا ہے۔ ایک گھر ہست دور ہوتا ہے اور اس کے بعد وان پرست دور ہوتا ہے۔ جب گھر کا بڑا دکان کی چابیاں بیٹے کو دے کر گھر کا رہ جاتا ہے اور باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں جانے لگتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد یا وان پرست دور کے بعد یا سینئر سٹیزن بن جانے کے بعد محلے کی مسجد میں جا کر نماز شروع کر دینا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں سینئر سٹیزن کو ایک روحانی اور معاشرتی کلب میں مفاہمت داخلہ مل جاتا ہے۔

''خوبی''

1- جب انسان میں کوئی چیز گنوانے کے قابل نہ ہو میرے آقا تو پھر اُسے سال ہی گنوانے پڑتے ہیں۔

2- جو شخص یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس نے کمال حاصل کر لیا ہے اور نکتہ عروج پر پہنچ گیا ہے تو سمجھئے کہ وہ فوت ہونے کے قریب ہے۔

3- بڑے درخت پھل زیادہ نہیں دیتے' سایہ زیادہ دیتے ہیں۔

4- لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تم نے کتنی جلدی کام کیا۔ یہ یاد رکھتے ہیں کہ کیسا کام کیا۔

5- دنیا میں سب سے بڑی لذت اُس کام کے کرنے میں ہے جس کو لوگ مشکل سمجھیں اور یہ کہیں کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔

"Old"

1- بالوں کے گرنے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا میرے آقا! جب وہ اپنے اصول چھوڑتا ہے اور Ideal چھوڑتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سال چہرے پر جھریاں ڈال دیتے ہیں اور ہمت اور امید کو چھوڑ دینے سے روح پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پریشانی' خوف' حزن و ملال' نا اُمیدی' مایوسی یہ انسانی سر کو جھکا دیتی ہیں اور روح خاک میں ملنے لگتی ہے۔

2- ایک پُر سکون بڑھاپا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان نے جوانی اچھی گزاری اور شرافت سے گزاری۔

3- میرا تایا محکمہ زراعت میں بیلدار تھا اور اپنی ماہوار تنخواہ میں سے بھی ہر مہینے کافی کچھ بچا لیتا تھا۔ (اس کے بچے اُس کو Old کہتے ہیں)۔

4- بڑھاپے کا ایک یہ فائدہ بھی ہے جی کہ انسان ایک بار جھکنے میں دو چیزیں اٹھا لیتا ہے (ایک پڑی ہوئی ہو تو سوچتا

ہے جب دوا کٹھی ہو جائیں گی اس وقت اُٹھاؤں گا)۔

5- جو عورتیں اپنی زندگی میں صرف خوبصورت رہی ہوتی ہیں ان کے لیے تو بڑھاپا موت ہے جی (شمسی) (بیگم صاحب)۔

6- جب دوست ایہ کہن لگ جان کہ شاہ جی اج تاں بہت جوان نظر آ رے او سمجھو بڑھاپا آ گیا اے اور چھا گیا اے۔

7- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور سہمناک راتیں گزاری ہیں اور کئی سال اندیشوں نے مینوں مارکٹ کے فنا کر دتا لیکن یہ سارے واقعات میرے پر وارد نہیں ہوئے بس ڈراندے ای رے۔

"Old Age"

☆ بڈھے ہونا ایک نہایت ای بُری عادت اے جونسی انسان بڑی عمر ماں پہنچ کے سکھ جاندا اے۔ اگر اوہ مصروف رے اور مسجد آندا جاندا رے تاں ایہے بُری عادت پے ای نئیں سکدی۔

☆ ڈاکٹر نے کہا ''اماں! میں تیریاں سب بماریاں سن لیاں ایں۔ میں آپ نوں جوان نہیں بنا سکدا۔'' اماں بولی ''میں کد کہندی ایں جوان بنا دے۔ میں تاں کہندی ایں بڈھا ای بنا دے۔ ایہ راہ ماں کیا بھسار رکھیا اے۔''

☆ دل کی عمر کا اندازہ سفید بالوں سے نہیں لگایا جا سکتا جی۔

☆ واہ جی واہ ایہہ عینک آپ پر بہت ای سوہنی لگدی اے۔ دس سال جوان لگدے او اپنی عمر تے۔ پھر میں یہ نہیں لوں گی۔ کیونکہ جب بھی اُتاروں گی عمر میں دس سال کا اضافہ نظر آیا کرے گا۔

☆ لڑکیوں نے پوچھا ''اماں! آپ اس عمر میں پہنچ کر بھی اتنی خوبصورت نظر آتی ہیں تو آپ کونسا میک اپ استعمال کرتی ہیں۔'' کہنے لگی ''میں ہونٹوں پر سچائی کی سرخی لگاتی ہوں۔ آواز میں دعا کے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔ آنکھوں میں ترس کا اور شفقت کا سرمہ ڈالتی ہوں۔ ہاتھوں پر خیرات کا لوشن استعمال کرتی ہوں۔ جسم کے لیے اپنے فگر کے لیے صداقت اور راستی استعمال میں لاتی ہوں اور دل کے لیے محبت کی ٹانک استعمال کرتی ہوں اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔''

☆ دیکھیں جی! اگر کوئی شے بوڑھی ہے یا پرانی ہے یا عمر رسیدہ ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی اس لیے رہی اور رہتی چلی جا رہی ہے۔ پُرانے خاندان ہیں۔ پُرانی رسمیں ہیں۔ پُرانی روائتیں ہیں یہ سب اس لیے زندہ ہیں کہ زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ان کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی یہ گارنٹی والی چیزیں تھیں۔ (ان کے تسلسل کی گارنٹی اس بات کی ضامن ہے کہ کوالٹی اچھی تھی) آپ ایک اعلیٰ پُرانی قدر کو نئی چیزوں کے طوفان میں غرق کر دیں تو نئی چیزوں سے جب زمانہ اچھائیاں اخذ کرے گا تو وہ پُرانی اعلیٰ قدر پھر اُبھر کر ساتھ آ ملے گی۔ پُرانی وضع کی مہمان نوازی پُرانی شرافت' اخلاقی تقاضے' تجارت

میں ایمانداری یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ مر نہیں سکتیں۔ لوٹ لوٹ کر پھر واپس آئیں گی۔

☆☆☆

خاں صاحب اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے' لیکن مجھ پر اللہ کی خصوصی رحمت تھی۔ ہر مقام پر ہر جگہ [illegible] مجھے خصوصی توجہ بڑے وقار سے مفت مل جاتی۔ اس کی نہ میں حقدار تھی نہ میرا کوئی میرٹ ہی تھا۔ بس کچھ اوپر والے کی رحمت تھی جو توجہ خاص بن کر مجھ پر ہلکی ہلکی پھوار بن کر برستی رہتی۔

یہاں ہی سے میرے اس اعتقاد کی پنیری لگی کہ صحت' عزت اور رزق خصوصی طور پر اللہ کی دین ہے اور وہ بعض شخص کو بعض پر ترجیح دیتا ہی چلا آیا ہے۔ اس کے باوجود سعی اور جدوجہد کا حکم بھی ہے کہ انسان اپنی محنت سے ان نعمتوں کو اپنے اوپر حلال کرتا رہے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے چکی تو مجھ پر پروفیسراں کی توجہ ٹارچ کی طرح پڑنے لگی۔ مجھے کالج میں پروفیسر سعید سے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان سے دھرمسالے میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ دسویں کا امتحان دینے کے بعد میری والدہ مجھے اکیلی لاہور بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔

دھرمسالہ میں لڑکوں کا کالج تھا جہاں میرا بھائی فسٹ ایئر میں داخل تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اُن کے ساتھ کالج میں مخلوط تعلیم کی قباحتوں کے حوالے ہو جاؤں۔ میری والدہ مجھے آگے پڑھانا بھی چاہتی تھیں اور نظروں سے دُور بھی بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے لبرل تعلیم یافتہ والدین کا ایک گروپ بنایا اور ان کی اعانت اور حوصلہ افزائی سے لوئر دھرمسالہ میں بازار سے کچھ ہی اُوپر ایک کوٹھی کرائے پر لی اور ایف اے تک کلاسیں شروع کر دیں۔

اس کالج میں صرف ہمارا Batch زیر تعلیم تھا۔ ہمارے گروپ میں وملا گیان سنگھ' مہندر کالسی اور طیبہ ٹکا بڑے [illegible] گھرانوں کی سادہ سی لڑکیاں تھیں۔

ہمارے کالج سے وہ سڑک گزرتی تھی جو اپر دھرمسالہ کی طرف رواں دواں تھی۔ اپر دھرمسالہ انگریزوں اور گورکھا پلٹن کی چھاؤنی تھی اور یہاں ہی ایک بڑا وی آئی پی قسم کا بازار تھا' جس میں ایک پارسی تاجر ناروجی کی دکان تھی۔ یہاں ٹین کے ڈبوں میں پیک پھل' جیم' چیز' مکھن' Sausages اور وہ سارا الم غلم ملتا تھا جو انگریز سولجر کھانا پسند کرتے تھے۔

گورکھا سپاہیوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر ساری شیخیاں اور Tatste اپنا لیے تھے جن کی وجہ سے وہ عام لوگوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ ترائی کی یہ سڑک کوتوالی بازار کے چوراہے سے بائیں ہاتھ تھی۔ دائیں ہاتھ نکلنے والی سڑک گھنیارا کی طرف جاتی تھی جہاں ایک چھوٹی واٹر فال گھنیارا تھی۔

اس سڑک پر کوتوالی بازار سے کوئی دو سو میٹر دور ''ہمالیہ ٹاکیز'' سینما تھا۔ سینما سڑک سے اُتر کر بنایا گیا تھا' لیکن اس کے Bill Board لب سڑک لگتے تھے اور بازار میں بھی عین چوراہے پر بڑا بورڈ نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا ''آجشبکو''۔

اس ''آج شب کو'' ہم نہ جانے کیوں کبھی سمجھ نہ پائے اور اسے ملا کر آجشبکو ہی پڑھتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

آجشبکو کے کیا معنی ہیں اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اس سینما کے مالک دھرمسالے میں ہمارے ہمسائے تھے اور پشاور کے ہندو Settlers تھے۔ اپنی وضع قطع سے یہ بھاٹیہ گھرانہ پٹھان لگتا تھا۔ ان کے مرد سروں پر پٹھانی پٹکے پہنتے اور لڑکیاں باہر نکلنے پر سروں پر چادریں اوڑھ کر جایا کرتیں۔

وملا گیان سنگھ کا گھر ہمارے یعنی 1۔ ٹمپل روڈ جانے والی سڑک کی بائیں طرف تھا۔ اس سے اوپر گھنا جنگل اور لیڈیز کلب تھا۔ گیان سنگھ بزنس مین تھے۔ اُن کی بسیں دھرمسالہ سے کانگڑہ اور دھرمسالہ سے پٹھان کوٹ کی طرف شیڈول سے چلتی تھیں۔ وملا کا ایک بھائی سندھ میں حرمقابلے میں مارا گیا تھا' لیکن یہ عہد نہ میڈیا کا تھا۔ نہ شیخی کا..... وہ اپنی امارت کا اظہار گفتگو میں نہیں کرتے تھے۔ وملا اور میں نے بی اے تک اکٹھے ہی تعلیم پائی۔

دوسری اہم لڑکی مہندر کالسی تھی۔ وہ کالسی سٹیٹ کی مہارانی کی بھتیجی تھی اور مہارانی بھی وہ ٹھسے دار خاتون جو مردانہ لباس پہنتی تھی۔ برجس چڑھا کر سر پر سولو ہیٹ لے کر وہ بینڈ ماسٹروں جیسی چھڑی بغل میں دبا کر وائسرائے کے دربار میں جایا کرتی اور وائسرائے بہادر اُس کے لیے کھڑا رہتا۔

مہندر کالسی سکول سے کچھ ہی اُوپر ایک خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پیدل کالج آتی اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا کرتی۔ نہ کبھی اُس کے ہونٹوں پر کالسی ریاست کا نام آیا نہ اُس نے اپنی پھوپھی صاحبہ ہی کا کبھی کوئی ذکر کیا۔ وہ عہد Status کو بگھارنے کا نہیں تھا۔ لوگ اپنی خوبیوں کو چھپانے اور عوام کا حصہ بنے رہنے پر مان کرتے تھے۔

تیسری وی آئی پی لڑکی طیبہ عتیق اللہ تھی۔ ان کے والد کی بھی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اگر کبھی آپ کو دھرمسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو یا آپ نے اس کا نقشہ دیکھا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شہر پہاڑی پر آباد تھا۔ ایک سڑک تھی جو لوئر دھرمسالہ سے اَپر دھرمسالہ کی طرف کوتوالی بازار کے چوراہے سے ہو کر جاتی تھی۔

اس شہر سے نشیب کی طرف بہت بڑی وادی تھی جس میں بھیڈی خانہ اور ریاست تکا عتیق اللہ تھی۔ طیبہ کا خاندان دھرمسالہ میں ہی قینچی موڑ والی سڑک پر تھا۔ طیبہ کالج بھی پیدل ہی آتی تھی حالانکہ اُن کے گھر میں کار تھی۔

میں نے ان لڑکیوں کا تعارف آپ سے اس لیے کرایا کہ ان کے مخیّر والدین کی بدولت میری والدہ نے ایک پرائیویٹ کالج کھولا۔ جس میں فل ٹائم صرف ایک پروفیسر مس متھائی تھی جو کیرالا سٹیٹ سے آئی تھی۔ ان کے علاوہ باقی تمام پروفیسر گورنمنٹ کالج فار بوائز سے چل کر آتے تھے۔

یہاں پر مجھے پروفیسر سرداری لعل سے ریاضیات پڑھنے کا اتفاق ہوا اور حسنِ اتفاق ملاحظہ کیجیے کہ بعد میں کنیئرڈ کالج میں بھی میں اور وملا گیان سنگھ ان سے میتھ پڑھتے رہے۔ مس متھائی بھی ہمیں دوبارہ کنیئرڈ میں اکنامکس پڑھاتی رہیں' لیکن پروفیسر سعید سے کنیئرڈ میں ساتھ چھوٹ گیا۔

کشمیری النسل خواجہ سعید نے ہمیں ایف اے میں غالبؔ کی چاٹ لگا دی۔ انہوں نے ہمیں پورا دیوان غالب شعر بہ شعر' ترکیب در ترکیب' حرف بہ حرف پڑھایا۔ غالبؔ کے ذومعنی' ابہام سے پُر اور باعثِ بحث شعروں پر وہ عموماً کہا کرتے ''یہ بات یوں ہے اور وہ بات یوں ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔'' یہ جملہ ہماری تفریح کا باعث تھا۔ تب ہمیں علم نہ تھا کہ اصلی تحقیق کی روح سمجھنے والے کا یہی رویہ اُسے زندگی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

"سائنس یوں کہتی ہے۔ مذہب یوں کہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بات یوں ہے اور یہ بات یوں ہے۔"

"ماں باپ یوں کہتے ہیں۔ بیوی یوں کہتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔"

"بہن بھائی یوں کہتے ہیں۔ دوست یوں کہتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی۔"

پروفیسر خواجہ سعید سے دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نہ تو کبھی دھرم سالے کا ذکر کیا۔ نہ کسی قسم کی خاص مراعات ہی دیں۔ باقی تمام طالب علموں کی طرح انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ وہ ہر لیکچر میں عام طور پر چوتھی صدی ہجری کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور لاتے اور اُسے بیسویں صدی تک کھینچ کھانچ کر ایک ہی لڑی میں پرو دیتے۔ اُن کے منہ سے ہم نے چوتھی صدی ہجری کا ذکر اتنی مرتبہ سنا کہ لڑکوں نے اُن کا نام ہی "چوتھی صدی ہجری" رکھ دیا۔ جب بھی وہ کلاس میں آتے..... ہولے ہولے "چوتھی صدی ہجری" کی کھسر پھسر سنائی دیتی۔

دوسرے پروفیسر جن کا ذکر میں ذرا پہلے کر چکی ہوں' اثر صاحب تھے۔ اثر صاحب بھی میرے معاملے میں بڑے Protective تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میری اردو کمزور ہے اور اردو ادب کی معلومات ناکافی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ بھری کلاس پر میرے عیب و ہنر نہفتہ باشند رہیں۔ اُن دنوں میں لیڈی میکلیگن سے ساندہ کلاں میں شفٹ ہو چکی تھی۔ کرشن نگر سے بس لے کر گورنمنٹ کالج آتی۔ ساندہ میں موسیٰ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب میرے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر موجود رہتا۔

مجھے اثر صاحب کی ایک خصوصی مہربانی آج تک یاد ہے۔

ففتھ ایئر کے امتحان تھے۔ جب میں کمرۂ امتحان میں پہنچی تو ممتحن اعلیٰ نے مجھے ہال میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں خاں صاحب اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے' لیکن نہ وہ میری طرف بڑھے نہ ممتحن اعلیٰ ہی کی طرف۔ شاید کسمسا کر رہ گئے۔

میں بھاگی بھاگی کنٹرولر امتحانات کے دفتر میں پہنچی..... وہ اقبال پر انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ رہے تھے۔ مجھے دروازے پر دستک دیتے دیکھ کر بولے "کم ان چائلڈ۔"

میں اندر گئی اور لجاجت سے بولی..... "سر میرا پرچہ ہے اور وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔"

"بٹ چائلڈ! آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ انڈر رولز اب کوئی ہال میں داخل نہیں ہو سکتا....."

"میں کیا کرتی سر..... کرشن نگر سے بس نہیں ملی ٹائم پر۔"

"کم ودمی..... آؤ۔"

وہ آگے آگے چلے۔ میں مسکین صورت پیچھے پیچھے ہولی۔ اس وقت اُن کی عمر بمشکل تمام چالیس بیالیس برس کی تھی۔ لیکن وہ مجھے خزاں رسیدہ بوڑھے نظر آئے۔ پھر چائلڈ چائلڈ کہنے والا میرے لیے فادر فگر بن گیا۔ پتہ نہیں انہوں نے ممتحن اعلیٰ سے کیا کہا مجھے پرچہ بھی مل گیا۔ سیٹ بھی اور جوابات رقم کرنے والی خالی کاپی بھی۔

عجیب سا اتفاق ہے کہ اپنی نالائقی کے باوجود میں ففتھ ایئر میں فسٹ آئی اور خاں صاحب سیکنڈ..... پتہ نہیں یہ خاں صاحب کی کرم نوازی تھی کہ پروفیسروں کی مہربانی' لیکن ایک بار پھر مجھے اہلیت نہ ہونے کے باوجود اللہ کی مہربانی سے

عزت مل گئی۔

سعید صاحب اور اثر صاحب کے علاوہ دوسرے پروفیسراں بھی ہمیں زیادہ تر انگریزی میں پڑھاتے تھے اور بڑی اعلیٰ Guidance دیتے تھے۔

پروفیسر آفتاب احمد ہمیں تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ زیادہ تر ایسی انگریزی کتابوں کا ذکر کرتے جن کا نام بھی ہم نے نہ سنا تھا۔ کبھی کبھی کچھ ایسی کتابیں اُن کے پاس ہوتیں جو وہ خاں صاحب کو اُدھار دے دیتے اور ایک طرح سے عمومی رابطے میں خصوصی توجہ کے مرتکب ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے بہت بعد میں غالبؔ پر بہت کام کیا اور انگریزی اور اردو دونوں میں معرکے کی کتابیں لکھیں' لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ہمیں عربی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ لیڈی میکلیگن میں بی ٹی کی کلاسوں کو لیکچر دینے آیا کرتے تھے اور میری والدہ سے اُن کی واقفیت تھی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے امی نے ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سے ہی استدعا کی کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ جب بھی وہ ہماری کلاس لیتے ایک ہی جملے سے لیکچر کا اجراء کرتے..... ''قدسیہ توجہ دو.....''

جاتے وقت بھی وہ ہمیشہ پوچھتے..... ''قدسیہ کیا تمہیں سمجھ آئی؟''

کبھی کبھی جب وہ دروازے تک ہی پہنچے ہوتے تو کوئی نہ کوئی لڑکا ہولے سے کہتا..... ''قدسیہ توجہ دو''

وہ بلیک بورڈ پر عربی حروف لکھتے۔ عربی میں جمع بنانے کے طریقے اور تثنیہ کے لیے خصوصی انداز سمجھاتے..... مجھے شاید ایک حرف بھی پلے نہ پڑتا لیکن فِفتھ ایئر میں چھٹیوں کے دوران جب میں کوئٹے گئی تھی جہاں مجھے میری ڈاکٹر خالہ نے پروفیسر محمد صادق سے عربی کی ٹیوشن لگوادی تھی۔ اتنے بڑے سکالر کی محنت اور توجہ سے میں عربی کی گرامر کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ محبت ہمیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ملی۔

کلاس میں آکر حکم لگاتے ''اٹھو اشفاق! یہ غزل پڑھو۔''

کبھی کہتے..... ''قمر! اس شعر کی تشریح کرو۔''

''بتاؤ متنازع فیہ کے ہجے کیا ہیں؟''

اس کلاس میں خاں صاحب خوب کھل کھیلتے۔ جان جان کر اٹک اٹک کر شعر کو بے وزن کر کے پڑھتے۔ صوفی صاحب جھڑکیاں دیتے۔ وہ جھڑکیاں سہہ کر منہ بناتے۔ دوبارہ شعر پڑھتے اور زیادہ خرابی بسیار پیدا کرتے اور لعن طعن سہتے۔ کسی اور کی باری بھی ہوتی تو خاں صاحب اُٹھ کر شعر پڑھنے لگ جاتے۔ یہاں ہی سے خاں صاحب اور صوفی صاحب کی چھیڑ چھاڑ سے گزر کر دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔

صوفی صاحب ہمارے ساتھ پانچویں جماعت کے طالب علموں کا سا سلوک کرتے۔ ہم کسی پروفیسر کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے' لیکن صوفی صاحب کے آتے ہی فوراً سلیوٹ کرنے کے انداز میں اُٹھ جاتے اور باجماعت سلام کرتے۔ ہمیں کھڑا پا کر وہ وعلیکم السلام وعلیکم السلام کہتے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ پھر دو ایک شعر

پڑھ کر اُن اشعار کی تقطیع کرتے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

اُن کے منہ سے اشعار کی بندر بانٹ بڑا آسان سا کام لگتا' لیکن گھر آ کر جب شعروں کو طبلے کی تھاپ میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی تو شعر کا ستیاناس ہو جاتا۔ صوفی صاحب جانتے تھے کہ کلاس میں ایک ہی گنیا آدمی ہے باقی سارا پھوکٹ مال ہے۔ اُن کا من چاہا شاگرد اشفاق احمد ہی تھا..... عموماً جملہ یوں شروع کرتے.....''اوئے پٹھانا ٹرن ٹو پیج نمبر باونجا (52) اور غزل پڑھ۔'' خاں صاحب بڑی مشکل سے انگلی کو تھوک لگا کر صفحہ باون نکالتے اور شعر یوں پڑھتے کہ کوئی ہم جماعت احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے۔

صوفی صاحب سے محبت اور دوستی کا رشتہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ جب خاں صاحب دیال سنگھ کالج میں پروفیسر لگ گئے تو کبھی کبھی صوفی صاحب سے ادبی محفلوں میں مٹھ بھیڑ ہو جاتی۔

صوفی صاحب کہتے.....''اوئے اشفاق! ملازم ہو گیا ہیں؟''

''جی صوفی صاحب۔''

''تنخواہ ملتی ہے؟''

''ہاں جی۔''

''پھر؟''

''جی..... پھر کیا؟''

صوفی صاحب ویسا ہی جھڑ کا لگاتے جیسا ایم اے میں صادر کرتے تھے.....''اوئے تیری کمائی میں سے میرے لیے پھوٹی کوڑی نہیں۔''

پکا سا منہ بنا کر خاں صاحب کہتے.....''صوفی صاحب! خرچے ہی پورے نہیں ہوتے۔''

''ہاں تیرے جیسوں کی اپنی ضرورتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اوئے کم عقلو! تم نے تو ماں باپ کی خدمت نہیں کی۔ اللہ کا شکر یہ کبھی قرض حسنہ کی شکل میں ادا نہیں کیا۔ تم کو کیا پتہ استاد کے کیا حق ہیں؟''

''جی..... واقعی۔''

''واقعی کے بچے دفع ہو جاؤ۔''

اور جب خاں صاحب واقعی دفع ہونے لگتے تو صوفی صاحب کہتے.....''اوئے اشفاق گھر آ جانا..... کلچے اور کشمیری چائے ملے گی..... میرے جیسے نان کلچے کوئی سارے شہر لاہور میں لگا کر تو دکھائے.....''

صوفی صاحب نے کبھی اپنی شاعری کی تعریف نہ چاہی تھی' لیکن کشمیری چائے اور نان کلچے کھا کر جو تالی نہ بجاتا اس سے صوفی صاحب ناراض ہو جاتے۔

جب ایران کلچرل کمپلیکس سے صوفی صاحب وابستہ ہو گئے تو ان کا ایک چھوٹا سا دفتر مال روڈ پر تھا۔ یہاں خاں صاحب باقاعدگی سے جاتے تھے۔ میں بھی شادی کے بعد دو ایک مرتبہ اُن کے ساتھ گئی۔ صوفی صاحب نے بڑی مزیدار

کشمیری چائے کے ساتھ کلچے کھلائے۔

''صوفی صاحب! پلیز مجھے بھی ایسی چائے بنانا سکھا دیجئے.....''

وہ کچھ دیر متامل رہے پھر مرے ہوئے لہجے میں ساری ترکیب سمجھائی۔ پھر مجھ سے اس ترکیب کا اعادہ کرنے کو کہا۔ میں نے اعادہ کر دیا۔

ہنس کر کہنے لگے..... ''زبانی تو ترکیب ٹھیک ہے لیکن عمل کا مرحلہ سوچ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہارے ہاتھ میں ذائقہ ہے؟''

میں نے اپنے ہاتھوں پر نگاہ ڈالی۔

''ہاں جی ہے.....ہے صوفی صاحب۔'' خاں صاحب نے پُرزور سفارش کی۔

''لو پھر تو بات بن گئی..... ذائقہ اللہ کی دین ہے اشفاق یار۔ کوئی کوئی ساری عمر پکاتا ہے پر لذت پیدا نہیں ہوتی۔ کوئی کوئی دو دن میں ماسٹر کک بن جاتا ہے۔''

صوفی صاحب نے مجھے خاص پتی بھی مرحمت فرمائی۔ طریقہ بھی دل لگا کر سمجھایا' لیکن کھانا پکانا ایک پریم ریتی ہے۔ کچھ ہاتھوں سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو کھانے پینے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ قہوہ بنانے میں جس محبت کی ضرورت تھی مجھ میں اُس کی کمی تھی۔ نہ میں ویسا رنگ پیدا کر سکی نہ خوشبو۔ یہی حال میرا تب ہوا جب اے حمید نے مجھے قہوے کی خوبصورت پیالیاں' کشمیری قہوہ اور چینی تک دی' لیکن میرا رزلٹ پاس پاس ہی رہا۔

لوگوں کو کھانا کھلا کر خود خوشی حاصل کرنا پریم ریتی کا جزوِ عظیم ہے۔ میں اس کام کو ساری عمر کرتی رہی ہوں لیکن مسرت حاصل کرنا کبھی بھی میری نیت نہ تھی۔ میں تو اس نظریئے سے لوگوں کے آگے کھانا پروستی رہی کہ وہ میری تعریف کریں۔ میرے پکے ہوئے کھانے کو سہلائیں۔ خود تعریفی کی یہ خواہش پوری ہوتی رہی.....لوگوں میں میری خدمت کے چرچے رہے.....

لیکن صوفی صاحب اور اے حمید جیسی چائے کبھی نہ بن سکی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے کبھی نان کلچے بنانے کی ٹرائی نہ لی۔ زندگی کے آخری دنوں تک خاں صاحب اصرار کرتے رہے کہ گیس کا تنور لے لو۔ کلچے نان' خمیری روٹی سب بہ سہولت سے بن جائیں گے' لیکن میں نے اس سکیم پر کبھی آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ میں پریم ریتی کی کمی ہے۔ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں۔

اب کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس معاملے میں نہ صوفی صاحب کی شاگردی کی نہ خاں صاحب کے کہنے ہی پر گیس کا تنور لگایا۔ میں نے کچھ نیا سیکھنے کا موقع گنوا دیا۔ انسان اسی طرح نئے مواقع کھو کر سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس میں کشش پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کی توجہ سہولت سے حاصل کیوں نہیں کر سکتا۔ اصلی پُرکشش انسان تو فعال پانیوں کی طرح شکل بدلتا جاتا ہے۔ کبھی بھنور کبھی لہر..... کبھی گرداب اور کبھی پُرسکون تال۔

ان مہربان پروفیسر حضرات کے علاوہ ڈاکٹر محمد صادق کا ذکر بھی بہت ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ کو توازن میں رکھنے والے منظم اعتدال پسند اور بڑے ہی ڈسپلن والے تھے۔ کلاس میں کوئی کاغذ چھلکا' بورڈ پر کوئی عبارت

کبھی کھڑکی، آڑے ترچھے بیٹھے لڑکے سب اُن کو پریشان کر دیتے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے لیکن اُن کی نظریں خشمگیں ہو کر آگ برسانے لگتیں۔ اُن کے لیے لڑکے اور لڑکیاں سب برابر تھے۔ وہ کسی سے رو رعایت نہیں برتتے تھے۔

آپ سے میں ذکر کر چکی ہوں کہ مجھے پہلے موسیٰ پھر لا لو کالج چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ پھر وہ کسی بنچ پر بیٹھ کر وقت گزارتا۔ ابھی مرد حضرات اپنی عزت نفس اور شرافت کی پاسبانی لڑکیوں کی طرح کیا کرتے تھے، لیکن اتنی احتیاط کے باوجود یار سے چھیڑ چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جب میں گھر جانے کے لیے اوول کے ساتھ ساتھ ڈھلوان کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچتی تو موسیٰ میرے ساتھ سائے کی طرح ہوتا۔ کچھ منچلے پیچھے سے قوالی کرتے..... ''سگ لیلیٰ سگ لیلیٰ..... کدھر آیا کدھر بھولا.....''

موسیٰ یہ تو نہ سمجھتا تھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں اور ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ لیلیٰ کون ہے اور سگِ لیلیٰ کس کو پکارا جا رہا ہے، لیکن اپنی چھٹی حس سے وہ اس قدر جان گیا تھا کہ لڑکوں کی ازلی شرارت رنگ لا رہی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

ابھی مرضی کی شادی، گینگ ریپ، بغیر نکاح کے کسی کے ساتھ رہنا، طلاق لیے بغیر دوسری شادی کر لینا..... ایسے تصورات اور ان سے وابستہ آزادی دُور کا خواب تھی، لیکن لڑکے بالے تو ازل سے شوخ ہوا کرتے ہیں۔ غلیل کا نشانہ بنانا، کسی پر پانی کا چھینٹا اچانک مارنا، بلاوجہ کھانسنا، سیٹی بجا کر توجہ لینا یہ تو بند بند سوسائٹی میں بھی رائج تھے۔

اب آپ آزادی کا فقدان کہہ لیجیے یا مشرقی اقدار کی سربلندی۔ ابھی کالجوں میں مخلوط تعلیم کے باوجود طالب علموں میں بڑے فاصلے تھے۔ معصوم چھیڑ چھاڑ، چھپی ہوئی لگاوٹ، تعلق جنس سے پاک تھا۔ محبت اگر ہو جاتی تو وہ ملنے جلنے کے ناجائز راستے تلاش نہ کرتی۔ ابھی محبت اور جنس الگ الگ تھیں۔ ابھی ایسی این جی اوز نہ بنی تھیں جو سکولوں میں جنس کی تعلیم پر اصرار کرتیں۔ کالج میں ایسے سوالنامے بھیجتیں جن میں پوچھا گیا تھا کہ بچپن میں کس کس نے آپ کو Abuse کیا؟ کیا قریبی رشتہ دار بھی اُن کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتے تھے..... ابھی ٹاپ سٹار بھی مائیکل جیکسن کی طرح Child abuse کے مقدموں میں ملوث نہ تھے۔ اگر تھے بھی تو میڈیا نے انہیں گھر گھر کی کہانی نہ بنا دیا تھا۔ انٹرنیٹ پر Chat کا تصور دُور کی بات تھی۔ ٹیلیفون ابھی سلف فون کے دور میں شامل نہ تھا۔ ابھی باتوں کے دوران ٹیپ ریکارڈر پر گفتگو کو ریکارڈ کرنے اور بعد ازاں اسے بلیک میل کرنے کی سہولت موجود نہ تھی۔ فون کے دوران تصویر بھی کھینچی جا سکتی ہے۔ اس کی ٹیکنالوجی انسان کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ سائنس کی برکات ابھی اسلحے کی جدید تخریب کاری سے ناآشنا تھیں۔ ایسی رنگ برنگی ایجادات سے زندگی میں نیرنگی، رنگارنگی اور تجرباتی عیاشی کی رفتار ہلکی تھی۔ ابھی آزادی کا تصور کم اور حیا میں لپٹی خوشی کا حصول زیادہ اہم تھا۔

اس روز ڈاکٹر صاحب کا لیکچر لمبا ہو گیا تھا۔ پرنسپل صاحب کے دفتر سے کچھ دُور ڈھلوان کی طرف لڑکوں کی ٹولی پتھروں پر طبلہ بجا کر قوالی کی پریکٹس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کی طوالت وجہ بنی کہ لڑکوں کی قوالی نے موسیٰ کو گھبرا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہمارے کمرے تک پہنچا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ موسیٰ نے آج تک ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج جانتے ہوئے میں کچھ گھبرا گئی۔

اس وقت خاں صاحب کھانستے ہوئے باہر چلے گئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہوں نے باہر جا کر موسیٰ کو سمجھایا ہوگا کیونکہ جب میں باہر نکلی تو موسیٰ نے ہلکا سا کھانس کر کہا..... ''وہ بی بی جی! آپ کی کلاس کا لڑکا آیا تھا۔ بولتا تھا کہ میں اندر نہ جاؤں.....''

اس سے زیادہ موسیٰ اور مجھ میں گفتگو نہ ہوئی۔

لیکن پروفیسر محمد صادق کے ساتھ کچھ دیر بعد ایک اور پھڈا ہو گیا۔

میرے بڑے بھائی ریزی بھی کالج میں داخل تھے اور ایف ایس سی کر رہے تھے۔ ہم ان دنوں لیڈی میکلیگن چھوڑ کر سانده کلاں میں جا بسے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریزی شکاری آدمی تھا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا ترنگ سمائی۔ اپنی ڈیزی گن اُٹھا کر گورنمنٹ کالج پہنچا۔

گورنمنٹ کالج کے اُونچے میناروں پر کبوتر رہا کرتے تھے۔ اتوار کے دن کالج قریباً سنسان تھا۔ ریزی نے دو تین کبوتر گن فائر کر کے مار گرائے۔ اتنے میں کہیں سے ڈاکٹر محمد صادق آ گئے۔ انہوں نے ریزی سے گن چھین لی۔ دوسرے دن کلاس میں پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا..... ''پرویز چٹھہ تمہارا بھائی ہے.....؟''

''جی سر.....''

''وہ اتوار کے روز کالج میں کیا کر رہا تھا۔ وہ بھی سائنس سٹوڈنٹ۔''

مجھے علم نہ تھا کہ ریزی اتوار کے روز بھی کالج آیا تھا۔

''اُس نے کالج کے Rules violate کیے ہیں۔ کوئی لڑکا کالج کے کبوتر مار نہیں سکتا اور تمہارے بھائی نے پورے تین کبوتر مار دیئے۔''

میں حیران اُن کا چہرہ دیکھنے لگی۔ خاں صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے..... جیسے وہ مارنے مرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔

''سر.....'' آہستہ سے خاں صاحب نے کہا ''سر! قدسیہ کا بھائی شکاری ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے ہیں۔ یہ اپنے گورکھا استاد کے ساتھ شکار کیا کرتا تھا۔ سر! ریزی نے ایک بار میرغ بھی مارا تھا۔''

نہ جانے انہیں یہ سب کیسے معلوم تھا۔

پروفیسر محمد صادق کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔

''شکاری ہوگا اپنے گھر۔ رولز آر رولز۔''

''پہلی بار تو معافی ملنی چاہیے۔'' اشفاق صاحب نے لجاجت سے کہا۔

''نو..... There is no first time ہر بار Last time ہوتا ہے۔ قدسیہ..... کل سے اپنے بھائی کو کالج نہ بھیجنا۔ اس کا نام Strike off کر دیا ہے.....''

خاں صاحب چپکے سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ اُن کے لیے بے عزتی کا یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔

مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ نیلی لکیروں والی سفید قمیض پہننے والا میرا گارڈین اینجل ہے..... وہ کیسے

ریزی کو جانتا تھا؟ اُس نے لالو سے کیا کچھ پوچھ رکھا تھا..... وہ کون تھا؟ کیا تھا؟..... کیا چاہتا تھا؟ اور کیا چاہنے سے گریز کرتا تھا؟ یہ بہت سے سوال مجھے سمجھ میں نہ آئے۔ اتنی بات ضرور پتہ چل گئی کہ اُس کی نیت نیک ہے اور وہ مجھے کسی مشکل میں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے.....

گھر واپسی پر زینب کے پاس باورچی خانے میں بیٹھ کر جب میں روٹی کھا رہی تھی تو لالو نے کہا..... ''صوفی صاحب..... وہ جو گورے صاحب آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا دروازے سے کبھی مت جھانکا کرو..... جب کبھی میں خود تمہیں بتا جاؤں گا۔ تم برآمدے میں نہ آنا۔''

''صوفی صاحب کس کی بات کرتا ہے لالو؟''

''مجھے کیا پتہ کون کون ہے اب تو نئی ففتھ ایئر بھی آ گئی ہے..... کیا پتہ چلتا ہے کون کہاں سے آیا ہے۔ رنگ رنگ کی بولی..... رنگ رنگ کے لوگ۔''

''یہ تو ٹھیک ہے صوفی صاحب۔''

پتہ نہیں کیوں زینب نہ مجھے آپا جی کہتی تھی نہ باجی..... بس اُس نے اپنے سے میرا نام صوفی صاحب رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے ریزی سے کبوتروں والی بات بھی نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا دل ڈاکٹر محمد صادق کی بات سن کر پریشان ہوگا۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے' لیکن کم آمیز اور کم گو رابطے میں ہر بات Share کرنے کی عادت نہ تھی۔

اُن دنوں جب میں گورنمنٹ کالج میں اپنا مقام تلاش کرنے میں مگن تھی اور لیڈی میکلیگن کالج سے موسیٰ کے ساتھ مل کر کالج پہنچتی تھی۔ خاں صاحب اپنے کنبے سمیت 1-مزنگ روڈ میں رہتے تھے۔ موج دریا کے سامنے اور ٹمپل روڈ کے آخر میں یہ رہائش گاہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ گھر کا ماتھا کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے پہلو سے سیڑھیاں اُوپر تیسری منزل کو جاتی تھیں جہاں خاں صاحب کا بسیرا تھا۔

سیمنٹ کی پکی دیوار بائیں طرف اُس چھوٹے سے مستطیل آنگن کے سامنے تھی جس میں اماں جی کا کھلا باورچی خانہ تھا۔ ہولے ہولے اس کھلے باورچی خانے کو چھت اور دیواریں نصیب ہو گئیں۔ اماں جی یہاں فراخ دلی سے بہت روٹیاں' کھلے شوربے پکاتی رہیں۔ جب وہ بیمار پڑ گئیں تو بی بی خیر جان جنہیں سب بی بی (ننھی جان) کہتے تھے ساری بات سنبھال کر گھریلو نظام کی سپر منیجر بن گئیں۔

باورچی خانے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اُس کے پیچھے بابا جی محمد خاں کا کمرہ اور اُس کے بائیں طرف اماں جی کا عوامی ڈرائنگ روم اور بائیں طرف ایک ڈرائنگ روم قسم کا لمبا کمرہ تھا' جس میں کچھ دیر کے لیے اسحٰق بھائی اور ذکیہ جی رہے اور باقی وقت یہ لمبا کمرہ اقبال بھائی کی تحویل میں رہا۔

دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا' جس میں بارشوں کے علاوہ بہت کم گوندھنا ریندھنا ہوتا تھا۔ اماں جی کو کچن گارڈن کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے انہوں نے کھلے باورچی خانے کے ساتھ جامن کا درخت' دو ایک دھریک کے قد آور پودے' کیاری میں دھنیا' پودینہ اُگا رکھا تھا۔ مہمند لوگ بنیادی طور پر کاشتکار ہوتے ہیں۔ ان کی رگ

پنجاب کے کاشتکاروں سے ملتی جلتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ دیکھ کر کچھ نہ کچھ بوڈا لنے پر اُکساتی رہتی ہے۔

دوسری منزل پر باہر والی سیڑھیاں بھی جاتی تھیں اور اندر سے بھی اُوپر راستہ جاتا تھا۔ یہاں اقبال احمد خاں اپنی زوجہ باجی ضیاء کے ساتھ رہتے۔ ان کے بچے فاروق' نیلو' ورداء بھی چھوٹے تھے۔

تیسری منزل پر صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا آنگن تھا۔ یہاں خاں صاحب بسیرا کرتے تھے۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ فرش پر سوتے۔ کمرے میں جابجا کتابوں کے ڈھیر اور سگریٹوں کے ٹوٹے۔ پیالیوں میں کافی اور چائے کا پس ماندہ پڑا رہتا۔ یہاں نہ کوئی صفائی والا چڑھتا نہ کوئی ملازم ہی آ کر خبر لیتا۔

اپنے چھوٹے سے سٹوو پر خود ہی چائے کافی بناتے۔ کھانے کی طلب ہوتی تو نیچے اماں جی کے پاس جا کر کھا لیتے۔ اماں جی اپنے اس درویش صفت بیٹے کے لیے پریشان رہتی تھیں' لیکن یہ بند بند لوگ تھے۔

اظہار محبت ان کے ضابطہ حیات میں موجود نہ تھا۔

تیسری منزل پر کمرے سے نکل کر ایک چھوٹا سا آنگن تھا' جس میں ایک مٹی کے مٹکے کو خاں صاحب نے حمام صورت بنا لیا تھا۔ پیتل کی ٹونٹی مٹکے میں فٹ کی تھی اور اسی کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر باسی برتنوں کو اشنان کرا کے خود کفیل رہنے کا فن خاں صاحب نے سیکھ لیا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ میں کبھی خاں صاحب کے کمرے تک نہ پہنچ پائی۔ میرے لیے 1-مزنگ روڈ جادو نگری تھا۔ یہاں ایک ایسا خاندان آباد تھا' جس کے رسم و رواج' اقدار' کلچر مقامی لوگوں سے مختلف تھے۔ وہ کسی کھڑکی' درز' ادھ کھلے دروازے سے جھانکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے آئے تھے۔ یہاں آ کر بھی ان ہجرت کرنے والوں نے مٹی کی دیواریں بنانا' ٹال پر لکڑیاں بیچنا یا پھر کسی زمین کے ٹکڑے پر آبادکاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عزت نفس ہجرت کرنے والوں کا بنیادی مسئلہ ہوا کرتا تھا۔

جب بھی کوئی وطن چھوڑ کر کسی نئی بستی میں آباد ہو جاتا ہے تو ہر وقت اُسے یہی خوف گھیرے رکھتا ہے کہ کہیں مقامی لوگ اُسے کمتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ اپنے میں جذب کرنے کی کوشش نہ کرنے لگ جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کو اپنے رسم و رواج کی پاسبانی کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آگے ڈھال لے کر چلنے کے عمل میں اُن کی سوشل لائف سکڑتی جاتی ہے اور ان کے اردگرد حصاری دیواریں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔

اسی لیے اظہار کے معاملے میں ہجرتی پٹھان گونگا ہو جاتا ہے۔ منیر نیازی ہمیشہ دیر کر دیتا ہے۔ اشفاق احمد چپ رہتے رہتے صوفی راستوں پر پڑ جاتا ہے۔ احمد فراز شاعری میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ خاں صاحب کو شادی کے فیصلے پر پہنچنے میں پورے سات سال لگے۔ اگر ممتاز مفتی' محمد حسین اُن کے پاس 1-مزنگ روڈ نہ آتے جاتے..... ڈیڈی جی اُن کا جیک نہ بنتے تو شاید خاں صاحب یہ قدم کبھی اُٹھا ہی نہ سکتے! وہ کبھی کالج میں مجھے روک کر نہ پوچھ سکتے کہ ''قدسیہ! تم مجھ سے سرگراں کیوں ہو؟''

اُدھر مجھ سی سبک سر سے بھی کوئی فیصلہ نہ پڑتا تھا۔ میری والدہ نے مجھے مخلوط تعلیم کے حوالے کر تو دیا تھا لیکن

مجھے یہ واضح کرتی رہتی تھیں..... ''کا کی! تم ایک بیوہ کی بیٹی ہو۔ تمہارے سر پر کوئی باپ نہیں جو تمہاری عزت کا تحفظ کر سکے۔ پھر تمہارے بھائی کا مسئلہ ہے۔ وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا۔ بی اے بھی ابھی فقط خواب ہے۔ تمہارا ایک غلط قدم تمہیں ساری زندگی کے لیے پٹڑی سے اُتار دے گا۔''

غلط قدم اُٹھانا تو دُور کی کوڑی لانا تھا۔ میں تو سیدھے سبھاؤ کسی سے بات کرنے کی بھی اہل نہ تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے اندھے کنوئیں میں اپنی اپنی موٹر سائیکل چلاتے رہتے۔ موت کے کنوئیں سے باہر نکلنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ دونوں میں اعتراف کرنے، قبول کرنے یا پھر کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ تھی۔

مجھے یہ وثوق سے علم نہ تھا کہ اشفاق صاحب مجھے پسند کرتے ہیں۔ وہ بھی غالباً میرے متعلق وثوق کی حد تک نہ جانتے تھے۔ دن میں کالج آنا جانا، پڑھنا پروفیسروں کی توجہ میں مگن رہنا جاری رہتا۔ شام کو میکلیگن کالج کی پروفیسروں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی۔ کالج کے سامنے یونیورسٹی کے سوئمنگ پول پر چلی جاتی۔ میری والدہ بڑی ڈسپلن کی عادی تھیں۔ وہ میرے اس میل جول سے خوش تو نہ تھیں، لیکن چپ رہتیں کہ زیادہ روک ٹوک سے کہیں بیٹی کی زبان نہ کھل جائے۔

اُن کی پتہ نہیں خدا نے کیسے سنی کہ محترمہ فاطمہ جناح کالج کی وزٹ پر آئیں۔ امی کے کام کو سراہا اور پھر انہیں مشورہ دیا کہ دیانتدار لوگوں کو کسی ایک ادارے میں جکڑ بند نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں ہیومن Resources کی کمی ہے۔ نیا ملک ہے ہر جگہ بہتر افسروں کی کمی ہے اس لیے اگر آپ کی تبدیلی کی جائے تو آپ انکار نہ کیجیے.....

امی کی تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر ہوگئی۔ میں اور میرا بھائی دونوں اُن کے ساتھ شیخوپورہ گئے لیکن ہم دونوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ میرا بھائی ابھی ایف اے کلیئر نہ کر سکا تھا۔ میں ایم اے کے فائنل میں تھی۔

ریزی بہت ذہین اور فطین تھا لیکن استقامت سے عاری..... وہ مکمل آرٹسٹ تھا۔ نہ تو دُوراندیش تھا نہ مالی منفعت ہی کی اُسے سمجھ آتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں چلا جاتا۔ اُسے خوش کرنے یا خوش ہونے کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کی ٹرافی درکار نہ تھی۔ بس زندگی ہی اُس کے لیے بڑی Excitement کا باعث تھی۔

اسی ریزی نے بڑی محبت کے ساتھ 1980ء میں میرے ناول ''راجہ گدھ'' کا سرورق بنایا۔ جس طرح ڈاکٹر طارق بن افتخار نے خاں صاحب کی اور میری وہ تصویر کھینچی جو ہماری قریباً ہر کتاب کے پیچھے پرنٹ کی ہوئی ہے۔ ریزی نے اُردو سائنس بورڈ کی ان گنت کتابوں کے سرورق بنائے۔ سکھی گھر رسالے کا آرٹ ڈائریکٹر رہا۔ امریکہ گیا۔ وہاں اپنے آرٹ کی نمائشیں کیں اور بغیر کسی دقت اور پریشانی کے آکر من آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگا۔

ریزی میں ایک بے قرار آرٹسٹ کی روح تھی۔ ایک شکاری، سائنس کے معجزات سے مسحور، پہاڑوں کو تسخیر کرنے والا، ستار پر زمزمے بجانے والا۔ وہ ان گنت سمتوں میں سفر کر کے ہنسی خوشی لوٹ آنے والا آرٹسٹ ہے۔

ابھی ہم لیڈی میکلیگن میں ہی تھے کہ ایک روز ریزی یونیورسٹی کلرز لے کر گھر آیا۔

''یہ کیسی ٹرافی ہے.....'' امی نے پوچھا۔

''میں سائیکل ریس میں سیکنڈ آیا ہوں۔''

اس ٹروفی پر امی خوش ہونے کے بجائے اُلٹا ریزی پر برس پڑیں..... ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اجازت کیوں نہ لی؟''

ابھی آپ اتھارٹی سے پوچھے بغیر خدا کو بھی تلاش نہ کر سکتے تھے۔

جب میری والدہ شیخوپورہ چلی گئیں تو ہم کو رہائش کی تکلیف کا اندازہ ہوا۔ ہمارا اب پرنسپل لاج پر کوئی حق نہ تھا۔ امی کی یہ خواہش تو پوری ہوئی کہ پروفیسراں سے گٹھ جوڑ ختم ہونے کی صورت نکل آئی' لیکن ایک اور مشکل یہ آن پڑی کہ اب گورنمنٹ کالج میں پڑھنے والے بچے کہاں سر چھپائیں۔ کرائے کا مکان اتنا مہنگا بھی نہ ہو کہ امی کرایہ نہ بھر سکیں۔

ایک روز میری والدہ نے مجھے اور ریزی کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔

''سانده کلاں میں گھر مل گیا ہے..... تم دونوں وہاں ٹھیک رہو گے۔ تمہارے پاس زینب اور لالو رہیں گے۔ کرشن نگر سے بس گورنمنٹ کالج تک آتی ہے..... کوئی فکر کی بات نہیں۔ میری تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹرس آف سکولز ہو گئی ہے۔''

انہوں نے کوئی لمبا چوڑا دم دلاسہ نہیں دیا۔ بس ہمارا سامان سانده کلاں پہنچا دیا۔

سانده کلاں کا یہ گھر ایک گلی میں تھا اور قریباً آخری گھر تھا۔ گورنمنٹ کالج سے بس لے کر میں پہلے کرشن نگر پہنچتی۔ پھر وہاں سے عموماً پیدل ہی سانده کلاں پہنچ جاتی۔

سانده کلاں میں ہمارے گھر کی دو سیڑھیاں چڑھ کر اندر دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ باورچی خانہ اور دو چھوٹے کمرے زینب اور لالو کی تحویل میں تھے۔ صحن پار کر کے چھوٹا سا برآمدہ اور دو بڑے کمرے تھے..... یہ گھر ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا۔

یہاں ہمارے ساتھ زینب اور لالو کہیں سے آ گئے..... زینب ہمارے ساتھ گورداسپور سے آئی تھی۔ وہاں جب گروہ در گروہ' قافلہ در قافلہ بے آسرا لوگ ستائے ہوئے درمانده پٹن کی طرف جاتے تو ان بے سروسامان لوگوں پر حملے ہو جاتے..... ہندو لوگ خود تو نہ اتیا چاری بنتے تھے نہ اہنسا کا پرچار کبھی چھوڑتے تھے' لیکن اُن کا کام سکھوں کو اُبھارنا اور پرانی دشمنی کو ہوا دینا تھا۔

یہاں پھر نیت کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اندر وہ اس نئے ملک کے قیام پر خوش نہ تھے۔ ہمارا گھر گورداسپور میں ترموڑ پر تھا جو پٹن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کے بڑے پھاٹک سے ایک لمبی روش گھر تک جاتی تھی۔ پھر ڈیوڑھی کا دروازہ آتا۔ یہ بیٹھک نما ڈیوڑھی اندر صحن میں کھلتی' جس کے چاروں طرف اور اُوپر بھی کمرے تھے۔

جب بھی سڑک پر شور و غوغا ہوتا' میرے بھائی ریزی بھاگ کر باہر والے پھاٹک تک جاتے اور کبھی کبھی دو تین لوگوں کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرے بھائی پرویز میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک تو وہ سو فیصد آرٹسٹ تھا' دوسرے نڈر تھا۔ اُسے شاید اپنے نفس سے جہاد کرنا نہیں آتا تھا لیکن ظلم ہوتا دیکھ کر وہ کبھی بیٹھا نہ رہ سکا۔

اُس شام زینب اور لالو پٹن کی طرف جا رہے تھے' جب سکھوں کا حملہ ہوا۔ ننگی کرپانیں نیم دھند لکے میں لشک رہی تھیں۔ ''جو بولے سو نہال'' کا نعرہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں ریزی نے زینب اور لالو کو اندر گھسیٹ کر

ـــ گیٹ کو تالا لگا دیا۔

زینب جیسے کچھ اور بے آسرا بھی اندر بیٹھک میں ڈرے بیٹھے تھے۔ یہاں سے زینب اور لالو ہمارے ساتھ ـــ آئے اور لاہور آ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اُن دنوں لوگ اپنوں کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بہہ جاتے تھے۔

پھر تلاش بسیار کے بعد جب زینب کو پٹیالے والے لوگ نہ ملے تو وہ ہمارے پاس سانده میں آ گئی..... ملنا اور بچھڑنا یہ تو زندگی کے کھیل میں شامل ہے لیکن اس میں بھی جو اسرار ہے، وہ بھی کُلّی طور پر انسان کو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

زینب پٹیالے میں کسی نمبردار کی بیوی تھی لیکن اب اُسے میرے گھر کی ورکر بننے میں کوئی عار نہ تھا۔

ادھر سانده کلاں میں ہم دونوں مکمل طور پر آزاد تھے اور کسی کو جواب دہ نہ تھے۔ اپنے عمل، کردار اور وقت کے ہر طرح سے ضامن ہم دونوں خوش تھے، لیکن خاں صاحب 1۔ مزنگ روڈ میں ایک بھرے پُرے خاندان میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی آزادی کی ایک معکوس شکل تیسری منزل کے الگ تھلگ کمرے میں نکال لی تھی۔

خاں صاحب ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھے جہاں سزا میں کھلم کھلا اظہار تھا، لیکن جزا کے سلسلے میں منہ بند رکھنے کا سلیقہ جاری تھا۔ شاید اس گھر کے بڑوں کا خیال تھا کہ تعریف و توصیف سے بچے سر چڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں ٹکلی لگانے چل نکلتے ہیں اور اس طرح فرعون صفت بچوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں بچوں کے آگے ہتھیار ڈالنا، اُن کی رائے طلب کرنا درست پرورش کے منافی تھا۔

ایسے میں خاں صاحب اظہار کو احساسِ شکست سمجھتے تھے۔ جب انہیں کُلّی یقین تھا کہ محبت کا ہلکا سا اعتراف بھی ان کی مکمل شکست پر منتج ہوگا۔ ابھی تو وہ اپنے خاندان کی روایات میں جکڑبند تھے۔ پھر قدسیہ بیگم کی ہتھکڑی بھی لگ جائے گی۔ یہی اندر کا تضاد انہیں کسی طور جینے نہ دیتا تھا۔ ایسے میں وہ عجیب طرح سے خوفزدہ ہو کر رہ گئے۔

1۔ مزنگ روڈ میں مفتی جی، محمد حسین، زوبی صاحب اور کبھی کبھار شہاب صاحب آتے جاتے رہتے۔ لیکن اشفاق صاحب رفتہ رفتہ وہ گم سم گونگے بن گئے جو اپنے کنوئیں کے پانیوں میں نہ تو کسی کو جھانکنے دیتا ہے نہ ٹھنڈے پانی کا چلو بھر پینے کی اجازت ہوتی ہے۔

اب یہ داستان گو، مُنسوڑ ہر لحظہ دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والا مفتی جی کا گونگا بن گیا تھا۔ ایسے میں لبوں پر آنے والی باتوں نے کاغذ قلم کی سرنگ بنالی اور خیالات کی گاڑی اندر ہی اندر چلنے لگی۔ کچھ نوٹ جواب اُن کے کاغذات سے ملے ہیں آپ کے درشنوں کے لیے حاضر خدمت ہیں۔ ذرا دیکھئے اُن کی قوتِ تخیل نے کیسے حال سے مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔

"خوف"

پتہ نہیں ڈر کیا ہے۔ کیوں لگتا ہے۔ کیسے لگتا ہے اور آج مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے رات کو کوئی آ کر میرا گلا گھونٹ دے گا۔ میں سمجھوں گا میں مر گیا لیکن میں مروں گا نہیں۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں اور وہ نہ مرے! کیسی خوفناک بات ہے۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں زندہ ہوں اور وہ جی نہ رہا ہو کس قدر کربناک بات ہے! باجی اوپر کے کمرے میں اس لیے نہیں جاتی کہ اُسے ڈر لگتا۔ میں نے اُسے ڈرا رکھا ہے کہ ڈاکٹر آپا کی روح اوپر کے کمروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

مرے ہوئے ''ڈپی'' کی روح اوپر کے کمروں میں یونہی گھوما کرتی ہے اور وہ آدھی رات کو دبی دبی چیخیں مارا کرتا ہے۔ اس لیے باجی کبھی اوپر نہیں جاتی۔ ظفر کہہ رہا تھا کہ دھرمسالے میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ کانگڑہ آوارہ روحوں کا مسکن ہے۔

ایک دن اُس نے ایک کہانی سنائی کہ وہ اپنے کسی دوست کے بھائی کی شادی پر دھرمسالے گیا تھا۔ یہ گرمیوں کے دنوں کی بات ہے۔ وہ رات گئے تک ایک کمرے میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور جب آدھی رات گزر گئی اور انہوں نے بسیرا لینے کے لیے اِدھر اُدھر کسی چارپائی کو دیکھا تو تمام چارپائیاں دوسروں کے تصرف میں آ چکی تھیں۔ ظفر کے دوست نے کہا یہاں سے ایک میل دور گھاٹی کی طرف ایک گاؤں ہے۔ وہاں میرا ایک دہقانی دوست رہتا ہے۔ چلو اُس کے پاس چل کر رات بسر کریں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔ رات بھی کٹ جائے گی اور تمہیں ایک کردار سے بھی ملائیں گے۔ پُر پیچ پہاڑی راستوں پر قدم اُٹھاتے وہ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آدھی راہ کٹ جانے پر ایک فقیر کی جھونپڑی نظر آئی۔ یہ لوگ جب اس کے قریب سے گزرے تو فقیر نے ظفر کے دوست کا نام لے کر کہا ''شاہ جی جا رہے ہیں؟'' اور شاہ جی نے اثبات میں جواب دیا۔ فقیر گڑگڑی بجاتے ہوئے ظفر کے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک ان کی اس بے معنی گفتگو نے ظفر کو آہستہ آہستہ چلنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی راہ لگ گیا۔ اگلا موڑ گزرنے پر ظفر نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے گھاس میں پاؤں چھپائے ایک نہایت جمیل عورت کھڑی ہے۔ اس میں اور ظفر میں کوئی آدھ فرلانگ کی دوری ہوگی۔ ظفر ٹھٹک گیا۔ اس عورت نے مسکرا کر ظفر کو آنکھ ماری اور یہ دم بخود ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی بھوؤں اور چتونوں سے بڑے لطیف اشارے کر رہی تھی۔ دفعتہً ظفر کو خیال آیا کہ رات اندھیری ہے اور میں اس عورت سے کافی دور کھڑا ہوں۔ پھر مجھے اس کے چھوٹے چھوٹے اشارے کیسے نظر آ رہے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے کے دامن سے چمٹے ہوئے پہاڑ اپنا وجود بالکل کھو چکے تھے۔ اس نے پھر اس عورت کو دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی اور اس کی کلائی سے لے کر کہنیوں تک سنہری بالوں کی لوئیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ظفر نے کہا یہ سوائے چڑیل کے اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی خوبصورت روپ دھار کر راہگیروں کو قتل کیا کرتی ہے' لیکن چڑیل کا تصور آتے ہی اس نے اُس کی چھاتیوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ بچپن میں چڑیلوں سے متعلق دو ہی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اپنے پستانوں کو اُٹھا کر کندھوں پر ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ ظفر کو اس کے پاؤں تو نظر نہیں آئے کیونکہ وہ گھاس میں کھڑی تھی لیکن اس کا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض پہن رکھی تھی اور اُس کی چھاتیاں انسانوں کی سی تھیں۔

اپنی مسکراہٹوں کو اِدھر اُدھر بکھیر کر وہ عورت آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ ظفر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو وہ تیزی سے قریب آنے لگی اور جب اس نے بھاگنا چاہا تو وہ اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک کے کنارے چند بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ ظفر اُچک کر ایک پتھر پر چڑھ گیا اور پھر وہاں سے کھسک کر اُس کے ساتھ والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس عورت نے پتھروں پر چڑھنے کی کوشش میں' جب اپنا پاؤں زمین سے اٹھا کر پتھر پر رکھا تو وہ اُلٹا تھا۔

اُس دن کاکی کہہ رہی تھی کہ ''اشفاق صاحب! رات کو میں کمرے سے پھل لینے گئی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اندھیرے کونے میں ہلکی سی سیٹی بجا کر انگلی چٹخائی ہو۔ میں چپ چاپ اسی طرح واپس آ گئی۔ مجھے ڈر تو لگتا ہے جی! پر کوئی

ساتھ چلے تو میں ذرا بھی خوف نہیں کھاتی۔"

اشتیاق خالص فوجی آدمی ہے۔ جسمانی تکلیفوں سے خائف نہیں ہوتا۔ روحانی مصائب اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ پر وہ گھیس والی کوٹھڑی سے اب بھی بہت ڈرتا ہے۔ آپا فرخندہ بچارے کو کس قدر تنگ کیا کرتی تھیں۔ بات بات پر گھیس والی کوٹھڑی کی طرف گھسیٹتیں۔

لیکن میرا ڈر تو کچھ عجیب سا ہے۔ میں اس لیے نہیں ڈرتا کہ اوپر کے کمروں میں ڈاکٹر آپا کی روح پھرتی ہے اور چیخیں مارا کرتا ہے۔ مجھے ایسا خیال کم ہی آیا ہے کہ ظفر کی طرح میں بھی کسی خوبصورت عورت سے دوچار ہوں گا اور میرا دل الٹا ہوگا اور اگر کسی اندھیرے کمرے میں چل پڑے ہوں تو چاہے وہاں انجن وسل دینے لگے۔ میں تو سیب اور امرود اٹھا کر ہی آؤں گا۔ اشتیاق کی گھیس؟ فیل ہو گی! مجھے یقین ہے کہ ڈر خارجی حالات سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہے کہ ماحول کی مہیب صورتیں کسی کو بھی ڈرا نہیں سکتیں۔ ڈر تو اندر پیدا ہوتا ہے۔ ڈر تو ایک داخلی کیفیت ہے لیکن پھر بھی میں نے اپنے کمرے کی چٹخنی آج پہلی مرتبہ کیوں چڑھائی ہے۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ کیوں بند کیا ہے۔ یہ بھی طرح سے جانتا ہوں کہ کوئی بھی باہر سے نہیں آئے گا۔

میرے کمرے میں میرے بکس سے میری الماری سے ایک صورت آگے بڑھے گی اور میرا گلا دبا دے گی اور میں سمجھوں گا کہ میں مر گیا اور میں مرا نہیں ہوں گا۔ اب بھی یہ سطور لکھتے ہوئے میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ جونہی میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا میرے پیچھے کھڑے ہونے والا وجود اسی تیزی سے پھر میرے پیچھے ہو جائے گا۔ شام کو کھانا کھا کر غسل خانے میں ہاتھ دھو کر گیلری میں جس ٹوٹی ہوئی کرسی کے پاس سے ہر روز گزر کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں وہی ٹوٹی ہوئی کرسی اس وقت میرے ذہن پر سوار ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اسی ٹوٹی ہوئی کرسی کے ہاتھوں قتل ہوں گا ضرور ہوں گا نہیں! مجھے اس ٹوٹی ہوئی کرسی پر کبھی کوئی ہیولے نظر نہیں آیا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کرسی کسی کے نیچے ہے جس پر اس وقت کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا۔ پتہ نہیں یہ کیسا ڈر ہے۔ نہ باجی کا نہ ظفر کا نہ کا کی اور نہ اشتیاق کا..... میرا خیال ہے کہ خوف ایک ایسی خفشیّج ہے جس کا تعلق نہ تو انسان کے جسم سے ہے اور نہ روح سے۔ بلکہ اس کا تعلق اس کے مقدر سے ہے۔

خفشیّج = جذبات + کیفیات + تاثرات = وجدانیات

خلوص + خوف + کرب + ہیبت + ترس

☆☆☆

اس خوبصورت گونگے آدمی کو معلوم نہ تھا کہ سانده کلاں سے پیدل کرشن نگر آنے والی اور کرشن نگر سے بس لے کر گورنمنٹ کالج کے مقابل ہوسٹل کے آگے بس سٹاپ پر جولڑکی آتی جاتی ہے' اُس کے دماغ میں بھی ایک خناس بھرا ہوا ہے۔ وہ اس قدر آزادی پسند ہے کہ کسی کو اپنا رازداں بنا کر اعترافِ شکست نہیں کر سکتی۔

مجھ میں سراندیپ کی سروپ لیکھا جیسا حوصلہ نہ تھا کہ شبک سر بن کر مہاراجہ رام چندر کے چرنوں میں پہنچ کر اپنا حالِ دل سناتی اور اپنی ناک کٹوا کر لنکا کوٹ لوٹ سکتی۔ اعترافِ شکست بڑے لوگوں کا کام ہے۔ وہ عموماً انا کا بُت

توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ہیرو کے بجائے ویلن بن جاتے ہیں لیکن ایسے بڑے لوگوں کو پرواہ نہیں ہوتی۔

ادھر خاں صاحب اپنی خواہش کے پیچھے سرپٹ بھاگنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی اس خواہش سے گریزاں بھی تھے۔ اس تضاد نے انہیں بکل کر رکھا تھا۔ وہ خواہش کو چھپانے اور اُس کا پرچم لہرانے سے روکے نہیں جا سکتے تھے۔ ایک طرف وہ پوری طرح Commitment کے آدمی تھے اور ساتھ ہی فرار کی راہیں بھی انہیں کشاں کشاں کھینچتی تھیں۔

یہ اُن کے جبلی جرثوموں میں موجود تضاد تھا۔ اس Genetic Coding کو اُن کے تمام گھر والوں میں بآسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ جو بھی اس جبلی تضاد سے رہائی پا سکا اُس نے دنیا میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا۔ اس کی مثال خالد آفتاب (وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی) ڈاکٹر طارق بن افتخار (ہڈیوں کے سرجن شکاگو) ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن) اور پھر خود اشفاق احمد ہیں لیکن اس تضاد سے نکلنے کے لیے اُنہیں قریباً سات سال لگے۔

وہ خاندان سے باہر ایک جاٹ لڑکی سے شادی کرنے کے آرزومند تھے اور ساتھ ہی خاندانی شناخت اور روایات کی پاسداری قریبی بہن بھائیوں بھتیجوں کی غیر مشروط محبت انہیں کوئی قدم اُٹھانے نہ دیتی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ بانو قدسیہ انہیں بے وفا ہرجائی سمجھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کے بھی آرزومند تھے کہ گھر والوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے اور وہ اُس اعتماد کو مجروح نہ کر بیٹھیں جو باباجی، اماں جی، سردار بیگم اور بہن بھائی اُن پر رکھتے ہیں۔ آری کی یہ کیفیت دن رات اُن پر گزرتی تھی۔ اُوپر جاتی تو بھی کاٹتی' نیچے آتی تو بھی ذبح کرتی۔

اُن کے جانے کے بعد سب رشتہ داروں سے میں نے تصویریں اور خط مانگے۔ اخبار میں اشتہار دیا لیکن کسی نے خاطر خواہ مدد نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب چھپ جانے کے بعد واویلا بعد از مرگ ہوگا' لیکن یہی آج کی تیز رفتار زندگی کا المیہ ہے۔ نہ ہم ماضی کو محفوظ کرنے کے اہل رہے ہیں نہ مستقبل کے لیے کسی مثبت پلان پر استقامت سے عمل پیرا ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ سب کچھ حال کی افراتفری کی نذر ہو گیا ہے۔

اشفاق صاحب 1۔ مزنگ روڈ سے کالج کبھی اپنی سائیکل پر کبھی پیدل راستہ ناپتے رہے لیکن دونوں طرف اعتراف شکست قسم کی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک روز میں اوول والی سڑک پر آرہی تھی۔ میرے دماغ میں ''سیب کا درخت'' کہانی گھوم رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو' پہاڑوں سے اُترتی ہوئی میگن سن۔''

جب میں لڑکوں کے ہوسٹل بمقابل بس سٹاپ کے قریب پہنچی تو مجھے لگا جیسے کوئی پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو اشفاق صاحب بڑی لجاجت اور بظاہر لاتعلقی سے چلے آرہے تھے۔ میں سمجھی شاید کچھ کتابیں مستعار دینا ہوں گی۔ میرے ساتھ ہی لالو بھی رُک کر سر کھجانے لگا۔

میں نے بات کا آغاز نہ کیا۔

پاس آکر وہ بولے ''قدسیہ! ادھر کچہری ہے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب کا یہی راستہ ہے۔''

میں سمجھ نہ پائی کہ آفتاب کون ہے اور اُن کا ذکر کیوں کیا جا رہا ہے۔ میرے چہرے پر So what? قسم کا تاثر دیکھ کر وہ بولے۔

"اگر اُنہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی' 1-مزنگ روڈ میں۔"

"تو آپ مجھ سے بات نہ کریں پلیز۔"

وہ چپ ہو گئے۔ ہم دونوں نے پھر کوئی بات نہ کی۔ راجہ رام چندر نے نہ... بردان دیا نہ جے مالا میرے گلے میں ڈالی۔ سروپ نکھا کی ناک ہی کاٹی۔ میں نے پلٹ کر کچھ نہ پوچھا اور بس پر... ئی۔ میں نے کھڑکی میں سے پیٹ کر نہ دیکھا نہ ہاتھ ہی ہلایا' لیکن میں جانتی ہوں بس سٹاپ خالی ہو جانے کے بعد بھی دیر تک اشفاق احمد وہیں کھڑے رہے۔ تب تجربہ اہم تھا۔ تجزیہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی تھی کہ میرے ہم جماعت کے اندر وہ کون سی باڑھ لگی ہے جسے وہ پھاند نہیں سکتا۔

بہر کیف تبدیلی تو چلی آ رہی تھی۔ تبدیلی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ کچھ لوگ شعوری طور پر کچھ لاشعوری طور پر تبدیلی سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی اپنی معصومیت کے سہارے اس تبدیلی کے آگے سر جھکا کر قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے معصوم لوگوں کو نہ کسی فلسفی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے نہ کسی صوفی کی دانش ہی۔ بیشتر لوگ تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی بھونچکا ہو جاتے ہیں پھر اُن میں زندگی کے ساتھ نپٹنے (Cope) کی سکت باقی نہیں رہتی۔

کچھ تبدیلیاں موسم کے ساتھ آتی ہیں۔ کچھ عمر بڑھنے کے ساتھ چپکے سے در آتی ہیں۔ گود کا بچہ ہمیشہ گود بالک نہیں رہ سکتا۔ کھیلنے کودنے کھانے پینے کی عمر نوبالغ کی آرزو بدلتے ہی جنس کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کیفیت بھی ایک پڑاؤ سلجھاؤ کی تلاش میں ایک نئی تبدیلی سے آشنا ہو جاتی ہے اور ہر بالغ 'اپنا گھونسلا' ساتھی اور بچوں کے تصورات میں گم ہو جاتا ہے۔ جونہی بچوں کی کفالت کی ڈگر ایک ہی ڈگر پر چلتے چلتے عادت سی بن جاتی ہے۔ ایک نئی تبدیلی انسان کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔

ہر انسان چالیس کے لگ بھگ پہنچ کر Midlife کے کرائسس (Crisis) اور اس سے جنم لینے والی تبدیلیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس عمر کو پختگی کی عمر کہہ لیجئے لیکن یہی عمر ہے جب عام آدمی بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور عمل میں ناپختگی کا ثبوت دیتا ہے۔ تبدیلی کو خاموشی سے قبول نہ کرنے کی وجہ سے کئی بار انسان کا image سوسائٹی میں بالکل برباد ہو جاتا ہے۔

پے در پے شادیاں' معاشقے' معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں' ماں باپ سے ہیجانی تصادم' اولاد سے بے توازن رابطہ غرضیکہ اس عہد کی تبدیلی میں زلزلے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہندو دھرم نے ان تبدیلیوں کے حساب سے چار ورن طے کر دیئے ہیں۔ بال آشرم..... گرہست شرم..... وان پرست آشرم اور بالآخر سنیاس آشرم.....

آخری تبدیلی عموماً بڑھاپے کے ساتھ آتی ہے۔ جب نہ اشیاء سے لگاؤ رہتا ہے نہ انسانی رشتے ہی بامعنی رہتے ہیں۔ اب اطمینانِ قلب صرف ذکرِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے' لیکن یہ بھی نصیب کی بات ہے۔

صوفی حضرات ان تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے شناسائی اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے "ماننے" کا درس دیتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی حدود کو جانتے ہیں اُن کے لیے ماننا مشکل نہیں ہوتا اور وہ عافیت کے امرکوٹ میں قلعہ بند رہتے ہیں۔ اُن کی عافیت اور راحت کچھ ایسی طاقتوں کے ذمے ہوتی ہے جو کبھی دغا نہیں دیتے۔ لیکن یہاں تھوڑی سی اڑچن لوگ اپنے لیے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی تجویز اور فیصلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں

دنیاوی مشکلات کا حل درکار رہتا ہے۔ انہیں مادی زندگی میں لاٹری نما حل کی تلاش ہوتی ہے اور ڈیرے پر وہ ان خواہشات کو چھپا کر یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ اللہ کی تلاش میں ہو۔

صوفی حضرات اللہ کا راستہ صعوبتیں سہنے' مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کا علم جانتے ہیں لیکن اُن کے پاس ایسے نسخے موجود نہیں ہوتے جو لوگوں میں راتوں رات' عزت اور امارت کی خوش کن تبدیلی لے آئے۔ عام خواہش کے آدمی اسی لیے ماننے کا حکم دل سے مان نہیں سکتے۔ روزِ قیامت پر فرشتوں اور جنات کے وجود پر نبیوں کے علم پر پورے یقین اور ایقان کے ساتھ چلنے والے کے لیے ماننا کچھ ایسا مشکل نہیں.....

خاں صاحب بھی اندر کے تضادات کا شافی حل ڈھونڈنے کے لیے بالآخر ڈیروں تک جا پہنچے لیکن ابھی وہ وقت دُور تھا۔ ابھی وہ اپنے اندر کے تضادات میں خود گھمن گھیریاں کھا رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے وہ مضمون بھی نہ لکھا تھا جو میں یہاں پیش کر رہی ہوں.....کیونکہ اس مضمون کے بغیر اُن کی گورنمنٹ کالج سے وابستگی مکمل نہیں ہوتی۔

چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راوین کے من کا مندر ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے مشہور شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برتری تحفظ' منفعت اور پاور کی سڑک ہے جس پر ایک جم غفیر رواں ہے۔ لیکن کچھ راستے جذباتی وادیوں سے ہو کر بھی اس منزل کی طرف جاتے ہیں.....ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت ہی کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ ایک گمنام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور کھنگریلے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھا نہ دے! نکال نہ دے!!

بانو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درسگاہ نہیں سمجھا۔ نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تبحر علمی سے مرعوب ہوئے۔ اس کی قدامت' اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی۔ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں' مانگا نہیں' دیا نہیں' دلوایا نہیں۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔ دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درسگاہ نہیں مانتے.....اس میں ''سین'' کے حرف کو وافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم سمن آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔ میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لیے درسی کتابیں لکھ کر ساٹھ' ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کما لیتی تھی۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔ اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آ گیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کو روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لیے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب انیق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔ اسے اسہال

...ے کی شکایت ہوئی جو دو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے کئی ٹوٹکے آزمائے لیکن کسی سے افاقہ نہ ہوا۔ بچے کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس لے جاؤ۔ بڑی سخت گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم "سالم تانگہ" کرا کر اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکلوڈ روڈ لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے کھول کر معائنہ کیا اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولے "بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جواب اس کو ہمارے پاس لایا ہے۔ اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ کرے" بانو زور زور سے رونے لگی اور جاہل فقیرنیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی اور وہ خوف کے مارے روئے جا رہی تھی...... ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دواؤں کے امتزاج سے سفید رنگ کا ایملشن تیار کیا۔ اپنی میز کی دراز سے دس پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک میں ایک پڑیا گھول کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔ بڑی بیدردی کے ساتھ انہوں نے انیق کے جبڑے میں انگلیاں کھود کر اس کا منہ کھولا اور دوائی اس کے منہ میں انڈیل دی۔ بچہ اپنی نحیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رویا تو میں نے اسے کندھے سے لگا لیا۔ گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھپکے جا رہی تھی۔ اتنے میں بچے نے منہ بھر کر قے کی۔ گرم اور بدبودار۔ تھوڑی سی میرے کندھے پر گری اور باقی کی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "بابا تم کیسا پیرنٹ ہے، بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا سارا فرش خراب کر دیا۔ یہ کلینک ہے تم لوگ کا گھر نہیں۔" ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔ شکل و صورت سے بھی ہم سہمے ہی سہمے تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔ بانو قدسیہ نے آدھا دوپٹہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر ڈال رکھا تھا۔ وہ روئے بھی جا رہی تھی، شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سبز رنگ کی شلوار تھی اور پاؤں میں ہوائی سلیپر تھے جس میں ایک فرش پر ٹاکی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ کچھ اینٹیں نیچے کو ہو گئی تھیں کچھ سیم کی وجہ سے اوپر کو ابھر آئی تھیں۔ اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا کافی مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے ہنرمند تجربے کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل حالت میں دیکھ کر کہا "بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے، سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔ اب اس کو باہر جا کر دھوؤ۔ اچھی طرح سے صاف کرو۔ اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔ بچے کے پاس نہیں لانا یہ کپڑا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب باہر نلکا ہے؟"

کہنے لگے "کیوں نہیں ہے۔ یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نیں۔ اس میں پانی ہی پانی

ہے۔ جا کر دھوؤ۔'' میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔ بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بیمار بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل وخوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اور اس سے مریض بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سر اوپر نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لیے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور بانو بار بار اس کے ماتھے اور لٹکتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار کم ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔

اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔ تھکے تھکے' خوفزدہ' مایوس' بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چلکور نے اس کے پپوٹے کھلنے نہ دیئے۔ ہم چلتے چلتے' سوچتے سوچتے' چپ چپاتے' جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈولتا ہوا سر ساکن کر لیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا ''گورنمنٹ کالج'' اور بانو حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انیق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بو سی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا ساتھ کا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک پیاری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گم گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا ''بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے۔'' خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے سٹل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیاں پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر کرتب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اترا اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں چابیوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہماری طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا ''کون لوگ ہو تم؟''

میں نے کہا ''ہم لوگ ہیں۔''

اس نے کہا ''یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''کس کا حکم نہیں۔''

"پرنسپل صاحب کا" اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کچھ کہنے والا
تھا کہ بابو نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور
آہستگی سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم
پھاٹک کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے
درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ کئی بیہودہ، نکمے، بدہیئت اور بے کار لوگ درگاہوں سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش
دھلوا دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگاہوں کی مورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یاتری اسی کی طرف کا
سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب سپیس شٹل زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف
نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔

خالدہ نے کچھ تاثرات اپنی محبت کے تحت لکھے ہیں۔ یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ اللہ اُسے میرا دل رکھنے کی
توفیق دے۔ ایسی محبت والی روحیں ہر روز کہاں پیدا ہوتی ہیں؟

"اے ترکِ غمزہ زن"

کتابِ زندگی کے کچھ اوراق ہم سینت سینت کے رکھتے ہیں۔ اُن کا ہماری روح کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہوتا
ہے جو سچائی اور تقدس کے پانیوں سے نمو پاتا حاصلِ حیات کا جزو بن جاتا ہے۔

قدسیہ آپا میری کتابِ زندگی کا ایسا ہی ورق ہے مگر اس اعتراف کی وضاحت کے لیے مجھے گزرے وقت میں
بہت دور تک جانا ہوگا۔

یہ سن پچاس، باون کے آس پاس کی بات ہے۔ لاہور کے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کے خاموش، بارعب
درختوں اور سرسبز روشوں پر وہاں کی پُر وقار پرنسپل مسز چھٹہ اپنی چاق و چوبند چال کے ساتھ آتی جاتی نظر آتیں۔ گریس
فل ساڑی، گھنگھریالے کالے سفید بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا، ٹک ٹک کرتے کورٹ شوز۔ ہم جنتر منتر کی باڑ کے اُس
پار سکول سیکشن کی بے بضاعت، چھٹی ساتویں جماعت کی لاغر لڑکیاں، دم سادھے جھانکا کرتیں۔ سانولے چہرے پر
شفقت اور سختی میں رلے ملے نقوش۔ ہمیں سب کچھ کسی اور ہی دنیا کا نظر آتا۔ وہ باڑھ کے پار ہمارے بہت قریب سے گزر
جاتیں مگر ہم وہیں منتظر کھڑے رہتے کیونکہ ان کے بعد کبھی کبھار ان کی چمپئی رنگت، کچھ نیپالی نقوش والی گیلی سی بیٹی اپنے
سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی جھلاتی، چھوٹے چھوٹے گورے پاؤں کے ساتھ کبوتری کی چال چلتی اُدھر سے گزرتی اور
کھلکھلا اٹھتی۔ جس روز ہم اُسے دیکھ لیتے باقی ماندہ دن کتنا اچھا گزرتا۔

پھر وہ سکول میں سٹیج ہونے والے ایک ٹیبلو "عشق اور موت" میں ایک قدسی روپ میں نظر آئی۔ موتیا رنگ
کے لباس میں۔ عشق کی قوت سے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑاتی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ قدسیہ آپا کے ساتھ میرا کیسا

علامتی تعارف ہوا جس نظریہ کی عملی تفسیر میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا تھی وہ کس طرح مجھ تک پہنچا۔

تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہی کامنی میری بہن کی عزیز ترین دوست ہوگی۔ میں اسے اتنا قریب سے دیکھوں گی بلکہ شب و روز کا ساتھ رہے گا اور ایک نئی دنیا کا دروازہ مجھ پر کھلے گا۔ لکھنے کی دنیا۔

پڑھنے کا خبط تو مجھے تھا ہی۔ کبھی نوخیز لڑکیوں جیسا اُلٹا سیدھا لکھ بھی لیتی تھی۔ قدسیہ آپا تب لکھتی تھیں مگر ابھی چھپنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی تخلیق فن کا پورا کلچر اُن کی ذات میں سانس لیتا تھا۔

تب مجھے اتنی باریکیوں کی سمجھ کہاں تھی۔ بس اتنا احساس ہوتا تھا کہ یہ جو قدسیہ آپا ہیں کسی کھلی، بے تحاشہ بڑی طلسماتی دنیا سے آتی ہیں۔ باجی، منجھلے بھائی اور میری تو خیر بات ہی کیا اپنے کاموں میں بے حد مصروف رہنے والی اماں تک اُن کی گرویدہ ہوگئیں۔

سمن آباد میں خود اُن کا اپنا گھر ہر ایک کے لیے کھلی آغوش کی مانند تھا۔ صاف ستھرا، سادہ سے سامان سے مزین کمرے جہاں ہر کوئی بے تکلف چلا آتا۔ قدسیہ آپا ان کے مصور بھائی پرویز (کیا کمال کے آرٹسٹ تھے) اور امی۔ یوں لگتا یہ سب پیدائشی میزبان ہیں۔ یہ لوگ محبت اور ناز اُٹھانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ سراپا شفقت، اُٹھتے بیٹھتے میں آپ کی آسائش و آرام کا خیال اور پھر باتیں۔ ایسی باتیں جو سارے غم فکر بھلا دیں۔ دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

اُن دونوں (بھائی بہن) میں تربیت کا مبہوت کر دینے والا کمال تھا۔ انگریزی، اردو، پنجابی سب میں یکساں رواں۔ رفتہ رفتہ مجھے قدسیہ آپا کے بچپن کے بہت سے واقعات اور شگفتہ کردار بالکل چشم دید محسوس ہونے لگے۔ گورداس پور، دھرم سالہ، شملہ جنہیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اپنے اپنے لگنے لگے۔ معلوم نہیں آج بھی ہم ان کی وضع کردہ کتنی اصطلاحیں اور روزمرے انجانے میں بولتے رہتے ہیں۔

دردمندی کے باوجود ان میں زندگی کی خوشگوار چیزوں سے محبت اور ناخوشگوار کو نظر انداز کر دینے کی تہذیب تھی۔ شاید یہ دل کے غنی لوگ تھے۔ ان کے ہاں خصوصی طور پر لڑکیوں کی گرومنگ کا ایک تصور تھا۔ ایسی تربیت جو لڑکیوں کو سراپا خدمت و ایثار، دوسروں کے لیے باعث راحت اور ماحول کو خوبصورت بنا دے۔

بزعم خود..... مجھے لگتا ہے کہ قدسیہ آپا کی صلاحیتوں کا جو شعور اور انداز مجھے ہے کسی اور کو شاید ہی ہو۔ انہوں نے میری بہن اور چند اور دوستوں کے ساتھ مل کر ان دنوں لاہور کے چھوٹے سے الحمرا ہال میں 'انارکلی' سٹیج کیا۔ ڈائریکشن اُن کی اپنی تھی، جنہوں نے میری بہن ایسی چھوٹی موٹی، معمولی سی ہستی سے شہزادہ سلیم کا کردار ادا کرا دیا۔ مناظر کے سیٹ اور کرداروں کے ملبوسات۔ ان سب کے لیے کتنا تاریخی و تہذیبی شعور اور ڈرامے کے فن پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ انارکلی کے کردار میں قدسیہ آپا خود تھیں۔ ڈرامہ ہٹ ہوگیا۔ (جو صرف خواتین کے لیے تھا)۔

وہ جو انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی اور سٹیج کے لیے لازوال ڈرامے تخلیق کیے تو وہ ٹیلنٹ اور کرافٹ کے قابل رشک تال میل کا نتیجہ تھے۔ انہیں رقص، موسیقی، فوک لور، اردو، فارسی، پنجابی اور عالمی شعر و ادب کا جو وسیع و عمیق علم حاصل ہے غیر معمولی کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک بہت ہی نادر مرکب جو قدرت کبھی کبھار ہی عطا کرتی ہے۔ صلاحیت اور محنت کا امتزاج ہے۔ عام طور پر یہ دونوں اتنی وافر مقدار میں ایک ساتھ نظر نہیں آتے مگر قدسیہ آپا میں ان تھک محنت، لگن، پتہ 'مارنے کی صلاحیتیں یکجا

یہ عجز، اتنا ایثار، اپنے آپ کو مٹانے کا اتنا حوصلہ..... مشکل...... بہت مشکل......قدسیہ آپا آپ نے لکھنے والوں، بلکہ پڑھنے والوں کے لیے کیا امتحان کھڑا کر دیا۔

ایک روایتی مسلم خاندان کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی خارجی دنیا کے ساتھ Exposure حیران کن تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کی سالانہ محفلِ موسیقی نہایت اعلیٰ سطح کی تقریب ہوتی تھی۔ قدسیہ آپا کے ساتھ ہم نے روشن آراء بیگم، عابدہ پروین، مہدی حسن، سائیں مرنا، اقبال بانو، فریدہ خانم اور بہت سے مشاہیر کو سنا۔

اوپن ایئر تھیٹر کے بے مثال ڈرامے تھے۔ ہالی ووڈ کی شاہکار فلموں سے انہوں نے ہمیں روشناس کرایا۔ تب کی تصویریں حقیقی معنوں میں ایک تخلیقی تجربہ ہوتی تھیں۔ گون وِد دا ونڈ، سپیس باونڈ، کم ستمبر، دا چائرز، فروم ہیر ٹو اٹرنٹی، ایڈ شوز برداز، وٹنس فار دی پروسی کیوشن اور ایسی درجنوں فلموں نے ہمارے فنی ذوق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس بھرپور تہذیبی اور ثقافتی دور میں کچھ تھا اور ہم قدسیہ آپا کے ساتھ اس میلے میں گھومتے پھرتے۔ عالم کی سیر میر کی صحبت میں اس طرح ہوتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے بہت کچھ لکھ رکھا تھا مگر اشفاق صاحب کی ہدایت کے مطابق چھپوانا شروع نہیں کیا تھا۔ ان دنوں وہ غالباً روم میں تھے۔ پھر وہ آئے اور قدسیہ آپا کو چھین لے گئے۔ بانو قدسیہ بنا کر...... معاف کیجئے گا قدسیہ آپا آپ کو میری یہ بات بارِ خاطر گزری ہو۔ مجھے معلوم ہے اشفاق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ تمام دنیا سے بہت کٹ ہو گئیں۔ پھر آپ وہ بنیں جو انہوں نے آپ کو بنانا چاہا۔ جو آپ کے نزدیک عورت کا حاصلِ حیات ہے۔

بانو قدسیہ ہو کر آپ ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے بڑے اور باکرامت لوگوں کے حصار میں چلی گئیں۔ عجیب بات ہے "گڈریا" ایسی کہانی لکھنے والا حال وقال کی دنیا میں نکل گیا اور قلمی ریاضت اور ایثار و خدمت کی سفیر نے یہ عظیم الشان ادبی اثاثہ ہم ایسوں کو دیا مگر انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ انارکلی کی صدا۔ اے ترکِ غمزہ کہ مقابل نشستہ" مجھے اب بھی مضطرب کر دیتی ہے اور میں گزرے وقت کی گلیوں میں اتر جاتی ہوں۔

میری سب دعائیں، عقیدت اور محبت آپ کے لیے۔ قدسیہ آپا۔

(خالدہ حسین)

ایک خط جمیلہ ظفر نے مجھے لکھا۔ میرے ساتھ ناچنے والی جمیلہ شادی کے بعد کہیں کھو گئی۔ خالد فوج میں تھا۔ کشمیر محاذ پر شہید ہو گیا۔ پھر مجھے یہ خط ملا۔

Sunny Bano

Murree.

11-9-48

پیاری قدسیہ بہن

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ جواب کیا دوں۔ حیران ہوں دیکھ جو اللہ میاں کی بے نیازی۔ خواہ مخواہ میری دُنیا برباد کر ڈالی۔

سمجھ نہیں آتی کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ پھر بھی ہر دم اُس کی شکر گزار ہوں۔

میرا خالد مجھ سے چھین کر آخر خدا کو کیا مل گیا۔ بالکل..... نہیں آتا۔ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ دل یہی کہتا ہے وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ رہے گا۔ بھلا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ کیسے جا سکتا ہے لیکن یہ میرا وہم ہے۔ سراسر پاگل پن۔ سب سمجھتی ہوں لیکن سمجھتے ہوئے نہیں سمجھتی۔

قدسیہ! وہ اپنے وطن اپنے اسلام پر قربان ہو گیا۔ اللہ یہ قربانی قبول کرے اور اس کے عوض کشمیر ہمیں مل جائے تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جائے۔ وہ تو شہید ہے۔ تمہاری جمیلہ بہن اب ایک شہید کی دُلہن ہے۔ ہمارا ایمان ہمیں کہتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ تو پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے کیوں ملنے نہیں آتا۔ میں تو اُس کا انتظار کر کر کے بھی تھک گئی۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ کیسے پکڑ لاؤں۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ سب چپ ہیں کوئی نہیں بولتا۔

وہ تو مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا۔ اپنے پاس بلاتا ہوگا لیکن کوئی اُس کے پاس جانے نہیں دیتا۔ مجھے جینے کی آرزو نہیں۔ زندگی کی تمنا نہیں لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں، سخت مجبور۔ کیا معلوم تھا خالد اس قدر بے وفا نکلے گا۔ اتنی جلدی مجھ سے روٹھ جائے گا۔ وہ تو مجھ سے کبھی خفا نہ ہوا۔ معلوم نہیں ایکدم کیوں بدل گیا۔ جب آیا تو میں نے اُسے اس قدر بلایا۔ آوازیں دیں۔ روئی، چلائی لیکن وہ چپکے لیٹے رہا۔ جیسے اُس کو کچھ خبر نہیں۔ بھلا اتنی بھی لاپرواہی کیا ہوتی۔ میں نے اب پکا ارادہ کر لیا ہے کہ چاہے وہ مجھے کتنا ہی بلائے۔ منتیں کرے۔ میں بھی اُس سے نہ بولوں گی۔ خوب ستاؤں گی۔ دیکھنا پھر وہ خود بخود سیدھا ہوتا ہے یا نہیں۔

بس اب لکھا نہیں جاتا۔ سر چکرا رہا ہے۔ خط لکھتی رہنا۔

بدنصیب

جمیلہ

جنوری 1951ء

31 دسمبر کی آدھی رات گزر جانے کے بعد روشنی کے ایک ٹکڑے نے میرے کمرے میں آ کر مجھے جگایا اور کہا ''میں تمہارے محبوب کے مقدر کا ستارہ ہوں۔'' میں نے لحاف سے سر نکال کر کہا ''چائے تھرموس میں پڑی ہے اور بسکٹ میرے میز کی دراز میں اور سینما کا پاس میری پتلون کی جیب میں رکھا ہے۔'' پھر میں نے اپنا منہ رضائی کے اندر کر لیا۔

کڑوی دوا میرے حلق میں یوں اُترتی ہے جیسے ریاضی داں لڑکی کا سنگیت کانوں میں!

دریائے جہلم میں چاند ستارے والے ایک روپے کو پڑے ہوئے دیکھ کر ایک کچھوے نے کہا ''اچھا تو سکندر

...چلا گیا!''

جب زندگی کے سارے باب بند ہو جاتے ہیں اور فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو موت چور دروازے سے ... کرکہتی ہے ''آؤ بھاگ چلیں۔''

میرے لیے میری ماں کا وجود اُس ٹائم پیس کی طرح ہے جسے میں نے مدت سے چابی نہیں دی' لیکن جسے میں ... صبح کو جاگنے کے لیے چلا بھی دیتا ہوں اور الارم بھی لگا دیتا ہوں۔

ایک ماں نو بچوں کی نگہداشت کرسکتی ہے لیکن نو بچے ایک ماں کی نگہداشت نہیں کر سکتے۔ (ترکی مقولہ)

اس سے بڑھ کر اور کوئی احمق نہیں ہوسکتا جو ساری دُنیا کو اور اپنے باپ کو خوش کرنے کے ارادے رکھتا ہو۔

(La Fontaine)

1- مزنگ روڈ سے کینال پارک 24-ایس

ابھی ہمارے ایم۔اے کے امتحان نہ ہوئے تھے کہ ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

میری والدہ سانده والے گھر میں تشریف لائیں اور نادر شاہی حکم فرمایا کہ "یہ گھر خالی کر دو۔ میں نے تمہارا انتظام کینال پارک میں کر دیا ہے۔ اچھی کھلی جگہ ہے...... تم لوگ بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا سکو گے۔"

ان دنوں والدین کو جواب دینے کا رواج نہ تھا، نہ اپنے حکم کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کی تاویل ہی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی بوریا بستر باندھ 24-ایس کینال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل روڈ سے جو راستہ گلبرگ کی طرف جاتا ہے، اسی پر نہر کے پُل سے گزرتے ہی دائیں ہاتھ ایک راستہ نہر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ دوسرے راستے سے کینال پارک کی بستی شروع ہو جاتی ہے۔

ایک سڑک کینال پارک کی کوٹھیوں سے گزر کر جاتی ہے۔ دوسرا راستہ کچا تھا اور کچھ دو کانوں سے ہوتا ہوا آگے چل کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا۔ میں اسی راستے سے شناسا تھی۔ یہی سڑک اور کچا راستہ مل کر ہمارے 24-ایس کینال پارک کے سامنے سے گزر کر آگے بازار میں جا نکلتا تھا۔

24-ایس کینال پارک ایک چھ کینال کی کوٹھی تھی، جس کا کالا پھاٹک تھا۔ جیسا پھاٹک اب 121-سی کے سامنے ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کالے پھاٹک کے ساتھ کچھ میری تقدیر کا گہرا لنک ہے۔ جب بھی میرے گھر کے آگے ایسا پھاٹک ہوتا ہے، میں بڑا تحفظ محسوس کرتی ہوں۔

یہ پھاٹک کھلتے ہی بائیں ہاتھ ایک بڑا سا درخت تھا۔ اس سے آگے ساری جگہ ڈھنڈار، اُجاڑ، جڑی بوٹیوں اور جنگلی پودوں سے اٹی ہوئی تھی۔ پھاٹک سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر کوٹھی تھی۔ ایک عرصہ سے بند رہنے کی وجہ سے عمارت خستہ حال تو نہ تھی لیکن بوسیدہ سی لگتی تھی۔

سب سے پہلے چند سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ آتا' جس کے فرش پر کالی اور پیلی موزیک کی شطرنجی بچھی تھی۔ اس برآمدے کے دونوں جانب کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ عین شروع میں جو کمرہ تھا اُسے میں نے اپنا پڑھائی کا کمرہ بنا لیا۔

کمرے کی دوسری طرف باورچی خانہ تھا، جو زینب اور لالو کی راجدھانی تھا۔ میرے آفس سے پیچھے ایک کمرہ اور غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھولیں تو تھوڑی سی خالی جگہ تھی، جس میں ایک لیٹرین بنی تھی، جسے زینب اور لالو استعمال کرتے تھے۔

میرے بیڈروم سے ملحق اور برآمدے کے پیچھے دو بڑے کمرے اور ان سے پیچھے تین چھوٹے کمرے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس سے پیچھے گودام صورت کمرے میں ریزی نے چارپائی ڈال لی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں کاٹھ کباڑ اور کھانے کے کمرے کے پچھلے کمرے میں زینب اور لالو رہتے تھے۔ باورچی خانے کے سامنے ایک حوض تھا، جس میں دستی نلکہ لگا ہوا تھا۔

میں نے گھر کی تفصیل اس لیے بیان کی کہ آپ کو بتا سکوں کہ گھر کے ماحول میں رہائش گاہ بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے مکینوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں قدم پڑتے ہی آفس پر قبضہ کیا۔ پھر اس سے ملحق اپنا بیڈروم اور غسل خانہ چھین لیا۔ زینب اور لالو ایک طرح سے میرے ملازم تھے۔ میں نے کبھی انہیں ریزی بھائی کے لیے کوئی خصوصی اہمیت دیتے نہیں دیکھا۔ ہر جگہ میں ہی اہم تھی۔

میں نے دیکھا ہے جن گھروں میں مجھ جیسی خوداعتماد عورتیں یا لڑکیاں ہوا کرتی ہیں، وہاں ایسی شیرنیوں سے ڈر کر مرد اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ جب وہ اپنی منوا نہیں سکتے تو اپنے اندر ہی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ عموماً مردوں کا جھکاؤ اور اُن کے ڈپریشن کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مردوں کی طرح ایسی عورتوں کو بھی اتھارٹی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

میں نے بھی لائق بن کر اپنا رعب والدہ صاحبہ پر ڈال دیا تھا۔ وہ گھریلو خرچ کے پیسے مجھے دیتیں۔ جب بھی وہ مجھ سے ملنے آتیں، میرے ساتھ سوتیں۔ جب اُن کی تبدیلی ملتان ہوگئی تو وہ مجھے ملتان سے خط لکھتیں۔ ریزی کے لیے ان خطوں میں کوئی چھوٹا موٹا پیغام بھی نہ ہوتا۔ جب بھی ذکر ہوتا ضمنی یا سرسری ہوتا۔

ریزی بھائی طبعاً شریف آدمی تھے۔ مجھ سے زیادہ ذہین۔ ہر طرح سے زیادہ Deserving تھے۔ اسی شرافت اور محبت کے باعث تقاضا کرنا اُن کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ نہ وہ مسابقت میں یقین رکھتے تھے نہ کبھی کسی چیلنج ہی کو قبول کرتے تھے۔ جو کچھ زینب پکا دیتی کھا لیتے۔ جو کچھ میں کہہ دیتی فوراً مان لیتے۔

موئی لیڈی میکلگن میں ہی رہ گیا تھا۔ میں صبح لالو کے ساتھ بغلی کچے راستے سے ہو کر جیل روڈ پر پہنچی جہاں نہر کے پل سے کچھ پہلے بس سٹاپ تھا۔ یہاں سے بس سیدھی مال روڈ پر پہنچتی اور بھنگیوں کی توپ کے پاس والے بس سٹاپ سے اتر کر میں اور لالو کالج پہنچتے۔

پنجاب یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہمارا فائنل کا امتحان ہوا۔ برآمدہ گزرتے ہی اندر بڑے ہال میں ہر طالب علم کے لیے ڈسک اور کرسی تھی۔ غالباً یہ چوتھے پرچے والے دن کا واقعہ ہے۔

اشفاق احمد کو کاسہ بردار کا رول پسند تھا۔ وہ مجھ سے دونی مانگ کر کچھ اُدھار لے کر مجھے غالباً یہ یقین دلانا چاہتے تھے وہ مجھ سے کمتر ہیں۔ اُن کی یہ عادت میں نے دوسروں کے معاملے میں بھی راسخ دیکھی۔ وہ اپنے سے کمتر کو فرمائش کر کے کچھ نہ کچھ مانگتے۔ لڑکیوں سے بڑی عاجزی سے کچھ نہ کچھ پکا کر لانے کو کہتے اور پھر اس پکوان کو ایسی نیازمندی سے

کھاتے گویا اس سے پہلے کبھی اس جنت کے میوے کا مزہ نہ چکھا ہو۔ تحفے لینے کا فن جیسا خاں صاحب کو آتا تھا۔ میں نے اس عاجزی کے ساتھ پھر کبھی کسی کو اس طرح تحفے قبول کرتے نہیں دیکھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ غالباً چوتھے پرچے کا ذکر ہے......

خاں صاحب کے دل میں وہی عاجزی در آئی۔ اپنا پن اُٹھا کر میری سیٹ تک آئے اور بولے ''آپ کے پاس بلو بلیک انک ہوگی؟''

قطاروں میں چکر لگانے والے Invigilator نے انہیں دیکھا۔ یکدم مڑا اور دور سے آواز لگائی۔

''کیوں بھئی کیا ہے؟''

میری دوات اُٹھا کر اشفاق صاحب نے اُسے دکھائی۔ وہ بات سمجھ نہ پایا۔ قریب آ کر بولا۔

''کیوں بھئی آپ کو کیا چاہیے؟''

''سر! میرے پن میں سیاہی ختم ہوگئی ہے۔ میں ان محترمہ سے سیاہی مانگنے آیا تھا۔''

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کمرہ امتحان میں آپ کسی سے بات نہیں کر سکتے؟''

بڑی معصومیت سے بھولے سے بن کر اشفاق احمد بولے۔ ''جی میں بات تو نہیں کر رہا۔ میں تو سیاہی مانگ رہا ہوں۔''

''آپ مجھ سے اپنی ضرورت کا ذکر کرتے۔ ممتحنِ اعلیٰ سے بات کرتے۔''

''سوری سر! نہ میرے پاس کوئی بوٹی ہے نہ ان کے پاس۔ آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔''

Invigilator نے غصے سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اُس کے چہرے پر ملائمت آ گئی۔ ''آپ اشفاق احمد ہیں؟''

''جی......جی!''

''آپ ادیب ہیں؟ آپ نے ''ایک محبت سو افسانے'' لکھی ہے؟''

''جی...... حسنِ اتفاق ہے۔''

''بڑی خوبصورت کہانیاں ہیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات سے آپ اتنی بڑی بڑی کہانیاں کیسے بنا لیتے ہیں؟''

جواب دینے کی نوبت نہ آئی۔ اس وقت ممتحنِ اعلیٰ ڈائس سے اُتر کر ہمارے پاس آ گئے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''یہ پن میں سیاہی بھرنا چاہتے ہیں۔ میں پاس کھڑے ہو کر سیاہی بھروا رہا ہوں کہ کہیں کوئی چیٹنگ نہ ہو جائے۔''

''Oh I see.''

سپرنٹنڈنٹ واپس چلا گیا۔ خاں صاحب نے سیاہی بھری اور میرا شکریہ ادا کیے بغیر یوں مڑ گئے گویا دوات اُن

تھی اور انہیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے آج تک کبھی پن میں سیاہی نہیں بھری۔ میرے لیے یہ بڑا
والا ٹیکنیکل سا کام ہے۔ میں نے نہ جانے کیوں بڑی دیر تک اس دوات کو سنبھالے رکھا۔

ان ہی امتحانوں کے دنوں میں میرا پہلا تعارف خاں صاحب کے خاندان سے ہوا۔ پرچہ ختم ہونے پر ہم لوگ
ہال سے باہر نکلے۔ ہال کے باہر برآمدے میں اشتیاق احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔

''یہ میرا چھوٹا بھائی اشتیاق ہے۔ ہم سب اسے تقو کہتے ہیں۔ فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا ہے......''

تقو نے بڑی اُجلی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

خاں صاحب نے عجب اپنائیت سے میرے ہاتھ سے قلم' کاغذوں کے نیچے رکھنے والا گتہ پکڑا اور اسے تقو کے
حوالے کر دیا۔

''یہ قدسیہ میری ہم جماعت ہیں۔ تم انہیں کا کی کہہ کر پکار سکتے ہو۔''

نہ جانے کس طرح اشفاق صاحب میرا گھریلو نام جانتے تھے۔

مجھے کچھ پوچھنے کا وقت نہ ملا کیونکہ تقو نے بڑی محبت سے پوچھا ''شقو پرچہ کیسا ہوا؟''

اب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اشفاق صاحب کا نِک نیم شقو ہے۔

''بس ہو گیا۔ چپ چاپ چلے آؤ۔ ان کا ملازم غالباً گورنمنٹ کالج میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں تک جانا
ہے۔ تو کہیں ہوتا ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں۔''

تقو بڑی خاموشی کے ساتھ ہم دونوں سے دو قدم پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اُس نے شقو اور کا کی سے کوئی بات نہ کی۔
خاں صاحب اور قدسیہ ہی نے آپس میں کوئی رابطہ قائم کیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہ پوچھا کہ کون کون سے سوال کیے گئے اور پرچہ
کیسا ہوا؟ گیٹ کے قریب ہی لالو منتظر نظر آیا۔ خاں صاحب نے تقو سے میری چیزیں پکڑ کر لالو کو پکڑا دیں اور دونوں بھائی
چلے گئے گویا سرے سے واقف ہی نہ ہوں۔

اشتیاق ابھی فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ وہ کاکول میں کیڈٹ تھا اور انڈر ٹریننگ تھا۔ وہ اپنے خاندان سے نیا نیا
الگ ہوا تھا اور سخت زندگی کی چھاپ ابھی اُس کے چہرے پر نہ تھی۔ چھ فٹ دو انچ لمبا۔ گورا چٹا سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں
والا تقو اگر خاموش رہتا تو امریکن لگتا۔

اس پہلی ملاقات میں تقو اور میری دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہولے ہولے یہ دوستی گہری ہوتی گئی۔ وہ جہاں بھی
ہوتا مجھے خط ضرور لکھتا اور میں بھی اُس کے خط کا جواب اہتماماً دیتی۔ ڈیڈی جی سے محبت کا رشتہ ضرور تھا لیکن اس میں احترام
کا عنصر تھا۔ تقو اور ناہید سے بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ساری زندگی میرا رازداں، دوست، بھائی، مددگار رہا۔ ایک عاشق کا
رشتہ ہم نہ ہو سکا باقی سارے رشتے مضبوطی سے قائم رہے۔ غالباً یہ سکھوں کے ساتھ رہنے کا اثر تھا کہ ہم دونوں ایسے
دیور تھے جو سکھ خاندانی نظام کرشن چوڑا کی بازگشت تھے۔

یہ امتحانوں کے بعد کی بات ہے۔ میں بڑے درخت کے جھولے پر تھی جس وقت کالا پھاٹک ہولے سے کھلا۔
میں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ہمارے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ میری والدہ ان دنوں ملتان میں انسپکٹرس آف

سکولز تھیں۔ اُنہوں نے نادر شاہی حکم دے رکھا تھا کہ شہر میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ جب تک میں موجود نہ ہوں کسی سے دوستی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریزی کو بھی آرڈر دے رکھا تھا کہ کسی دوست کو گھر بُلانے کی تکلیف نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

پھاٹک کُھلا۔ سائیکل کا ایک پہیہ اندر گھسا۔ پھر ہینڈل پر ایک سفید ہاتھ نظر آیا جس پر سنہری بال تھے۔ پھر سائیکل اندر آئی۔ خاں صاحب نے احتیاط کے ساتھ اپنے پیچھے کالا پھاٹک بند کر دیا۔ میرا جھولا رُک گیا۔ میں حیرانی سے سراپا استقبال بن گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ 1- مزنگ روڈ کی تیسری منزل پر رہنے والے کو میرا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ پھاٹک کے ساتھ دائیں طرف اینٹوں کا لال روڑی ملا ملبہ پڑا تھا۔ خاں صاحب نے سائیکل وہاں کھڑی کر دی اور درخت سے لٹکے گھریلو قسم کے جھولے کی طرف آئے۔

''السلام علیکم......'' چھوٹی سی بے ترتیب باڑ اُلانگ کر وہ قریب آتے ہوئے بولے۔

''جی السلام علیکم......''

''آپ جی کا بہت استعمال کرتی ہیں۔ میں نے کالج میں بھی یہ محسوس کیا تھا......''

''جی......جی......''

میں اُنہیں بتا نہ سکی کہ خوفزدہ لوگوں کے پاس جی جی کی تکرار ایک نوعیت کی ڈھال ہوا کرتی ہے۔ مراثی، مزارعہ، یتیم، مسکین، ملازم کے پاس یہ ایک قسم کا Defense mechanism ہے جسے استعمال کر کے وہ جاگیردار، نمبردار، آمر، ڈکٹیٹر، مالک غرضیکہ ہر قسم کے اپنے سے برتر کے دل میں جذبۂ ترحم اُبھارتا ہے اور کسی کے رحم و کرم پر تکیہ کر کے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچاتا ہے۔

میں نے شتو کو جھولے کے پاس بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہاں دو تین بوسیدہ سے ڈگندگی نما موڑھے پڑے تھے۔ میں برآمدے کی طرف چلی۔ وہ مؤدب انداز میں پیچھے پیچھے ہو لیے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں فرش تو موزیک کا تھا لیکن اس کا ڈیزائن کالے اور پیلے رنگ کی شطرنجی کا تھا۔ یہاں خوبصورت آرام دہ ٹیک لکڑی کی بنی ہوئی گول گول پشت کی کرسیاں تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور جی کہنے سے گریز کیا۔

''مجھے ریزی کی تلاش ہے...... آپ اُسے بُلا دیں گی؟''

آج تک پرویز کو کسی نے ریزی نہ کہا تھا۔ اب ایک لمحہ میں اُس کا نام ہمیشہ کے لیے ریزی پڑ گیا۔

''وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔''

''کب تک آئے گا؟ مجھے اُس سے ایک سرورق بنوانا تھا۔''

''بس جی آتا ہی ہو گا جی......'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ حالانکہ مجھے ریزی کی آنیاں جانیاں کبھی ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکیں۔

''میں جی پوچھ کر بتاتی ہوں۔'' میں اُٹھ کر باورچی خانے تک گئی۔

زینب دروازے میں کھڑی تھی۔

میں اندر چلی گئی...... ''ذرا لالو کو بازار بھیج کر نمک پارے اور برفی منگوا لو۔ ساتھ چائے بھی بھیج دینا۔''

''یہ کون ہے صوفی صاب؟''

''میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ پرویز بھائی کا پوچھنے آئے ہیں۔''

''اتنے سوہنے صوفی صاب، اتنے سوہنے...... ہائے ربا اتنے سوہنے۔'' زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ چپ ہو گئی۔ غالباً اس وقت زینب نے کوئی دعا مانگی ہو گی جو بعد میں میرے کام آئی۔

''دیر نہ کرنا...... یہ رُکنے والے نہیں ...... جلدی لالو کو بازار بھیجو۔''

کینال پارک کا بازار بالکل چینڈ و صورت تھا۔ اس میں چھوٹی موٹی دکانیں اور سستے سودے تھے۔ ایک حلوائی کی تھی جس کا بنیادی کام دہی دودھ بیچنا تھا۔ لیکن وہ اپنی دکان کی عزت بڑھانے کے لیے نمک پارے اور برفی بھی رکھتا تھا۔ خاں صاحب نے یہ برفی اور نمک پارے اس طرح کھائے جیسے من و سلویٰ کھا رہے ہوں اور یہ نعمتیں انہوں نے پہلی بار چکھی ہوں۔

''آپ کو علم ہے کہ میں مزنگ روڈ پر رہتا ہوں؟''

''جی...... پتہ ہے۔''

''کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم پاکستان آئے تو پہلے ہم اپنی خالہ رشیدہ کے پاس ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں مزنگ روڈ کا پتہ چلا۔ آپ کو پتہ ہے ہم...... بے سروساماں تھے۔ تقو اور میں چھوٹے تھے۔ ججو بھائی کراچی میں تھے۔ بیچ منجدھار میں...... بابا جی میرے والد ساری پونجی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اقبال بھائی نے بڑی ہمت کی۔ وہ چوری چھپے منہ اندھیرے مویشی منڈی جاتے۔ ایک آدھ بکرا خرید کر اپنے کندھوں پر سوار کرتے اور پھر اسے گھوم پھر کر بیچتے اور گھر آ کر ساری بچت اماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔''

میں بلاٹنگ پیپر کی طرح ساری انفرمیشن چوس رہی تھی۔

''آپ نہیں سمجھ سکتیں کتنی مشکلات تھیں۔ میری بڑی آپا فرخندہ حاملہ تھیں۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں انہیں ہمارے پاس چھوڑ کر لندن جا چکے تھے۔ بالو بھائی کے پیسوں سے گزارا ہوتا تھا۔ پھر میں نے سوچا......''

''مجھے سمجھ آئی کہ یقیناً اقبال احمد ہی بالو بھائی ہیں۔''

''میں نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ میں کوئی نوکری تلاش کر لوں۔ مجھے پتہ چلا کہ والٹن کیمپ میں ایک کلرک کی اسامی خالی ہے۔ میں بڑے رعب سے اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچا۔ لیکن کلرک نے ڈگری دیکھ کر کہا، بھائی یہاں میٹرک پاس آدمی چاہیے۔ دوسرے دن میں اپنی دسویں کی ڈگری لے کر گیا اور مجھے نوکر رکھ لیا گیا۔''

میرا دل ترس سے بھر گیا لیکن میں نے منہ سے کوئی اظہار نہ کیا۔

وہ کہتے گئے...... ''والٹن میں ان دنوں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ تھا۔ ٹولے، فرد، قافلے' اُجڑے بچھڑے لوگ آئے ہوئے تھے۔ حیران پریشان پڑاؤ ڈال کر سارے کیمپ میں گھومتے پھرتے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ انہیں اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کی تلاش تھی۔ چھت سے محروم یہ لوگ گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ روزگار نہ تھا اور انہیں معلوم نہ تھا کہ

روزی کا وسیلہ کیسے بنے گا؟

''میں کیمپ میں معمولی کلرک تھا۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں مہاجروں کے نام، پتے، کوائف اور اُن کی شکا...
اپنی نوٹ بک میں لکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ایک مائیکروفون مل گیا۔ میں اس پر اہم اناؤنسمنٹ کرنے لگا۔ پھر سلسلہ ...
اور مجھے ملتان کیمپ بھی جانے کا حکم ملا۔

''ہوائی جہاز پر دورے ہونے لگے۔ یہ میرے پہلے ہوائی سفر تھے اور میں ان سے بہت مسحور ہوتا تھا۔ صر...
ایک مشکل تھی میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ 1- مزنگ روڈ سے والٹن پیدل جانا پڑتا۔ واپسی پر بہت تھک جاتا......''

وہ لحہ بھر کو رُکے تو میں نے سوچا بھلا یہ فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں لاہور کی سڑکوں، یہاں کے محلوں سے قطعی ناواقف
تھی۔ اس لیے اس فاصلے کا اندازہ لگانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔

''والٹن میں ہی ممتاز مفتی مجھ سے ملے۔ بڑا بھلا آدمی ہے۔ وہ بظاہر اڑب لگتا ہے لیکن دل رکھنے کی ریت اُس
سے زیادہ کسی کو نہیں آتی۔''

بات کرنے والا داستان گو بلا کا سحر البیان تھا۔ میں سنی سنائی سے گزر کر والٹن کیمپ میں پہنچ گئی اور قریب سے
ممتاز مفتی کو دیکھنے لگی۔

وہ مجھے Entertain کر رہے تھے۔ بار بار وہ پھاٹک کی طرف اس طرح دیکھتے کہ مجھے یقین ہو جائے وہ واقعی
ریزی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی کسی طرح اُن کی گفتگو سے آؤ بھگت کرنی چاہیے۔ میں اندر گئی
اور اپنی ایک پسندیدہ البم اُٹھا لائی۔

''یہ البم میں نے بڑی مشکل سے تصویریں اکٹھی کر کے بنائی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟''

''آپ کی فیملی البم ہے؟''

''جی نہیں یہ اُن فلمی ایکٹرز اور ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں جو مجھے جی جان سے پسند ہیں۔ جب ہم دھرمسالہ میں
ہوتے تھے تو وہاں ایک سینما گھر ہمالہ ٹاکیز ہوا کرتا تھا۔ ان کا بل بورڈ کوتوالی بازار کے چوراہے میں لگتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا
''آ جسکو......'' مجھے کبھی سمجھ نہ آئی کہ یہ آ جسکو کیا چیز ہے۔''

وہ ہلکا سا مسکرائے......

''ہمالہ ٹاکیز کے مالک ہمارے پڑوسی تھے۔ یہاں سے مجھے اور ریزی کو فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔''

''مزے تھے تمہارے۔ مفت فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں......'' شفو جی نے کہا۔

''ناں ناں جی میری امی نے بھائیہ صاحب کو بڑی شدت سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کو بغیر ٹکٹ خریدے ہال
میں نہ جانے دیں۔'' میں نے جلدی سے ٹوکا۔

''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ سینما کے مالک آپ کے ہمسائے تھے۔''

''ہمسائیگی اور چیز ہے ٹکٹ اور معاملہ تھا۔''

البم کے پہلے صفحے پر کندن لعل سہگل کی تصویریں تھیں۔ کندن لعل سہگل نے پہلی مرتبہ فلم ''دیوداس'' میں رول

[illegible] کیا کہ راس کماری سے لے کر پشاور تک سینما کے شائقین عش عش کر اُٹھے۔ اس فلم میں پارو کا رول دُبلی پتلی [illegible] تھی اور بروا نے اُس کے شوہر کا رول ادا کیا تھا۔

[illegible] کے عجیب کام ہیں۔ وہ عروج کے مقامات بدلتا رہتا ہے اور زوال کو بھی کسی ایک مقام یا شخص پر مستقل نہیں [illegible] بھارت میں بھی فلمی عروج کی داستان کچھ اسی طرح تھی کہ سب سے پہلے بمبئی ٹاکیز نے تہلکہ مچایا۔ ''اچھوت [illegible] فلمیں بنائی گئیں، جس میں دیو کا رانی نے شودر لڑکی کا رول ادا کیا۔ ان کے ساتھ ایک کھیپ بڑے ایکٹروں اور [illegible] کی پیدا ہوگئی۔

پھر گویا اُوپر سے اشارہ ہوا اور ساری شہرت سارا عروج نیو تھیٹرز کی شکل میں بمبئی سے کلکتہ منتقل ہو گیا۔ کندن [illegible] ملک کی آواز نے ڈھانپ لیا۔ مدھو بالا، سلوچنا کو بھول کر لوگ کانن بالا کے گن گانے لگے۔ میں خود کانن [illegible] بڑی فین تھی اور اُس کی ''جواب'' فلم نے مجھ پر جادو کر رکھا تھا۔

سہگل جب دیوداس کے روپ میں گاتا...... ''دُکھ کے اب دن بیتت ناہیں'' تو دل میں شام سی پڑ جاتی۔

کانن بالا جب منت بھرے لہجے میں گاتی......

''جانے نہ دیں گے نہ جانے دیں
لیٹ رہیں گے راہوں میں''

تو گویا ہیروئن کے ساتھ ساتھ ٹکٹ خریدنے والے بھی ہیرو کو روکنا چاہتے۔

کندن لال سہگل ایک مرتبہ دھرمسالہ آئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہاں ہم اُن سے اُسی عقیدت [illegible] گئے جس طرح سارے فین (عقیدت مند) جاتے ہیں۔ سہگل اپنا ایک ٹی سیٹ بیچ رہے تھے۔ امی نے وہ ٹی [illegible] روپے میں خرید لیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ سیٹ میرے پاس C-121 تک رہا اور بالآخر میں نے اسے ایک ایسے [illegible] کیا جو سہگل کی یادیں جمع کر رہا تھا۔

میں یہ البم خاں صاحب کو پوری جانکاری، دلچسپی اور توجہ سے دکھا رہی تھی لیکن وہ بظاہر متوجہ لیکن بہ باطن وہ کسی [illegible] میں تھے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے...... ''یہ تو بڑی اچھی ہابی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سنجیدہ قسم کی [illegible] آپ کے بھائی تو بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا مشغلہ؟''

''اشفاق صاحب میں...... کچھ کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ ایسے ہی...... ٹامک ٹوئیاں...... کچھ مہاجر کیمپوں سے [illegible] کہانیاں...... کچھ اردگرد کا تجربہ۔''

''واہ یہ بات ہوئی ناں...... یہ شوق تو بہت ہی مثبت ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کہانیاں دکھا سکتی ہیں؟''

میں اپنے آفس میں چلی گئی...... میز کی دراز سے میں نے وہ پیلے کاغذ نکالے جن پر میری کہانیاں رقم تھیں۔ [illegible] اوپر ''فاطمہ'' کہانی تھی۔ بہت بعد میں اس کہانی کا ڈرامہ ''صبح کا تارا'' بنایا گیا۔ جسے پہلی مرتبہ آغا ناصر نے [illegible] کیا اور انور سجاد نے اس میں ہیرو کا رول کیا۔

جب میں کاغذوں کا پلندہ لے کر آئی تو خاں صاحب بڑی بے تکلفی سے لالو سے مشغول گفتگو تھے۔ اُن کا انداز

ایسا تھا گویا وہ برسوں سے لالو کو جانتے ہوں۔ مجھ سے اُنھوں نے افسانے پکڑ لیے اور بڑی دلچسپی سے ورق گردانی کرنے لگے۔ ایک مبتدی کی طرح میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

''کا کی! آپ صفحہ نمبر نہیں لکھتیں......''

میں نے کبھی پوری توجہ اور اہتمام سے یہ کام نہ کیا تھا۔ یہ تو وقت کٹی کا ایک شغل تھا۔ اچانک یہ افسانے ایک نئے رابطے کا سنگِ بنیاد بن گئے۔

''جی بات یہ ہے کہ میں نے جلدی میں کچھ ترتیب سے کاغذ اکٹھے نہیں کیے۔''

''دیکھیے کوئی جلدی نہیں، آرام اطمینان سے الگ الگ کر کے افسانے مرتب کر لیجیے۔ میں پھر آ جاؤں گا۔ ریزی تو ابھی آیا نہیں، اچھا پھر سہی۔''

کالے پھاٹک کے پاس کھڑی سائیکل باہر نکالی۔ اس کے سوار نے نہ مڑ کر ٹا ٹا بائی بائی کرنے کی کوشش کی نہ کوئی الوداعی جملے ہی کہے۔ بس ایک دردناک سی خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ پھر مری سے اُن کا خط آیا کہ وہ جلد لاہور آئیں گے اور افسانے ضرور دیکھیں گے۔

ایسے ہی ہوا۔ جب دوبارہ وہ ہمارے گھر آئے تو چند افسانے اپنے ساتھ لے گئے۔ میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میرا پہلا افسانہ ''واماندگیِ شوق'' ادبِ لطیف میں چھپ گیا۔ وہ یہ رسالہ دستی لے کر میرے پاس آئے۔

''لیجیے مبارک ہو۔ ادبی سفر شروع ہو گیا۔''

رسالے کے اوپر لکھا تھا ''کاش میں بھی ایسا ایک افسانہ لکھ سکتا!''

کہانی پر میرا نام بانو قدسیہ لکھا تھا۔ یہ نام خاں صاحب نے اپنی طرف سے عنایت کیا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا یہی نام شہرت پکڑتا گیا اور میں اپنا آبائی نام قدسیہ چٹھہ خود بھی بھول گئی۔

یہ ''نام'' کی بھی عجب کہانی ہے۔

میری والدہ نے کبھی مجھے قدسیہ کہہ کر نہ پکارا۔ وہ مجھے کا کی اور ریزی بھائی کو کا کا کہتی تھیں۔ لیڈی میکلیگن میں میری سہیلیاں جمیلہ ظفر، امینہ ملک، انور ملک اور آپی اقبال ملک مجھے ''کو'' کہہ کر پکارتیں۔ میں بھی اس نام پر خوش رہی۔ مفتی جی مجھے قدسی پکارتے رہے لیکن شہاب صاحب نے جب مجھے بانو کہہ کر بلانا شروع کیا تو ہر نام ماند پڑ گیا۔ اب تک یہی نام مستعمل ہے۔ چھوٹے بڑے مجھے ''بانو آپا'' کہہ کر پکارتے ہیں اور میں اس نام کے ساتھ اندر باہر بڑی مناسبت محسوس کرتی ہوں۔

ایک دفعہ بانو قدسیہ بن جانے کے بعد مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، لیکن شفقو میرے لیے پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میری اردو کمزور، مشاہدہ کمزور تر اور تخیل بھی واجبی سا ہے۔ لیکن اب اُن کے پاس کینال پارک آنے کا بڑا اچھا جواز پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے کبھی کبھار کچھ لکھنے کے لیے دے جاتے اور پھر اس ورق کو بڑے احترام سے لے جاتے۔ اصلاح کرنے کا یہ انوکھا ڈھنگ خاص اُن کی اختراع تھی۔

اسی جذبے کے تحت اُنھوں نے بعد میں مجھے ''داستان گو'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کبھی کبھار وہ ''من چلے کا سودا'' کہتے

وقت مجھے ایک آدھ سین کی ون لائن پکڑا دیتے اور لکھنے کی فرمائش کرتے۔ یہ سب کچھ میرا مان بڑھانے کے لیے تھا۔ اس سے اُن کا اپنا کوئی فائدہ ملحوظ خاطر نہ تھا۔ بس میری خود اعتمادی اور انا کے لیے بڑھاوا تھا۔

یہاں اشفاق احمد کی ایک مشکل سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ ہمارے گھر کا قریباً فرد بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ جونہی وہ زیادہ اپنائیت محسوس کرتے۔ نمک پارے اور برفی کھاتے ہوئے اُنہیں محسوس ہوتا کہ وہ اب دور نہیں جاسکتے۔ پھر بڑی شدت سے وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے۔

1950ء سے 1955ء تک بڑے طوفانی سال ہیں۔ میں کبھی ملتان چلی جاتی تو اُن کے خطوط میرا تعاقب کرتے۔ میں ملتان سے آتی تو چند بے ربط سی ملاقاتیں ہوتیں۔ پھر وہ کبھی جہلم، کبھی مری، کبھی تراڑ کھیل میں ریڈیو کی نوکری کرنے چلے گئے لیکن دور بھاگنے کے باوجود وہ اس تعلق سے کلّی طور پر شفایاب نہ ہوئے۔ گریز کا پہیہ انہیں کینال پارک سے دُور بھگاتا رہا لیکن لوٹ آنے کے لیے راستہ چھوڑتا رہا۔

ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ وہ جہاں بھی گئے ہمیشہ خط لکھتے۔ یہ خط جذبے سے عاری ادیبانہ موشگافیوں سے بھرے ہوتے لیکن اندر ہی اندر وہ سوچ رہے تھے کہ یہ دوری یہ فاصلہ کافی نہیں۔ انہیں ضرور کسی لمبی اُڑان پر جانا ہوگا تاکہ گھر والوں کی روایات اور وفاداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ گویا اُنہیں ایک ایک قطرے کا مجھے اور اپنے گھر والوں کو حساب دینا تھا۔ وہ اس سوچ میں حق بجانب تھے کہ اب وہ کسی کا دل نہیں دُکھا رہے۔

دراصل اشفاق احمد نے بڑی کرب کی زندگی گزاری اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کی دلآزاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن پر یہ حقیقت نہ کھلی کہ دل شکنی زندگی کا ایک وصف ہے۔ اللہ میاں کبھی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر آفت بنا کر نازل کر دیتا ہے، کبھی رحمت بنا دیتا ہے۔ یہ سب اُس کے کھیل ہیں۔

اس حقیقت کو طائف کے واقعے یا رحمتِ دو عالمؐ پر کوڑا پھینکنے والی مائی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ ہمارے نبیؐ نے کبھی ان لوگوں کو موردِ الزام نہیں سمجھا بلکہ یہی جانا کہ بیچارے لوگ معیشت کے ہاتھ میں اس آشوب کا ہتھیار بنے ہوئے ہیں۔

اس کو کیا کیا جائے کہ قدم قدم پر ہر لحہ ہر موسم اور مقام پر دل ٹوٹتے ہیں۔ کبھی کسی غلط فہمی کے تحت کبھی خوش فہمی کے باعث دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی حسد حق تلفی کا باعث بنتا ہے کبھی طیش۔ انسانی جذبوں نے قلب اور نفس میں جو دھما چوکڑی مچا رکھی ہے دماغ کی شریانیں بیرون کی جن تبدیلیوں سے متاثر ہوا کرتی ہیں، وہ سب حالات کی تبدیلی سے مل کر شکست و ریخت کا باعث بنتے ہیں۔

شاید اسی لیے تمام مسلک خواہش سے دُور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ضرورت بھر کھانا، حدود کے اندر مقید جنس، انکساری کے ہمراہ ضرورت بھر عزتِ نفس کا حصول، رزقِ حلال کی بازیافت اسلامی تعلیم ضرور ہے لیکن یہ عام آدمی کے بس کی نہیں۔ خواہش ہمیشہ ان ضروریات کو بڑھا دیتی ہے اور انسان اس خواہش کے حصول میں دلآزاری کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔

خاں صاحب نے ایک بار اپنے مسائل سے ستانے کا وقفہ لیا اور جہلم چلے گئے۔ یہاں پرائم گلاس فیکٹری تھی

جس کے مالک سعید احمد خاں تھے جواماں سردار بیگم کے کزن تھے۔ یہ پاکستان کی پہلی گلاس فیکٹری تھی۔ Amroc سے تو وجود میں آئی تھی۔ گیس سارے شہروں میں پہنچی لیکن جہلم محروم رہا اور بالآخر گیس نہ ہونے کی وجہ سے فیکٹری بند ہوگئی۔

ان دنوں پرائم گلاس فیکٹری کو گیس نہ ملی تھی اور وہ تیل کی بھٹیوں سے کام کر رہے تھے۔ یہاں جتنی مرتبہ خاں صاحب گئے اُنہوں نے مجھے خط لکھے جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اُنہیں اپنے خاندان کے لوگوں سے کس قدر محبت تھی اور ان سے بانہہ چھڑانے کے بعد وہ کس کرب سے گزرے ہوں گے۔

دراصل پٹھانوں میں جو کلچرل یک جہتی ہے وہ انوکھی چیز ہے۔ وہ کبھی اپنوں کے قرب سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ اگر بوجوہ بچھڑ بھی جائیں تو چھپکلی کی کٹی دم کی طرح پھڑ کتے رہتے ہیں۔ وہ عم زاد کی محبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ اُنہیں حفاظت کا احساس اپنے رشتہ داروں سے گھلے ملے رہنے سے ملتا ہے۔

غیر پٹھانوں کے ساتھ کھانے پینے، اعتقادات، رسم رواج کا Osmosis جاری رہتا ہے لیکن وہ غیر پٹھانوں میں ضم نہیں ہوسکتے۔ ہر پٹھان غیر پٹھان کے ساتھ دوستی تو کر سکتا ہے، محبت کا مرتکب ہوسکتا ہے، قلب میں سیڑھی لگا کر اتر سکتا ہے لیکن غیر پٹھان کے ساتھ مکمل طور پر کمفرٹیبل نہیں ہوسکتا۔

اگر مجھے درست یاد ہو تو تراڑ کھیل میں یوسف ظفر، ممتاز مفتی، عمر صاحب (جنہیں خاں صاحب عمر بکری کہا کرتے تھے کیونکہ عمر ہر پہاڑی پر بکری کی طرح چڑھ جاتے تھے) یہ بھی سنی سنائی سمجھیے کہ یہ چاروں مری سے ایسے پروگرام نشر کرنے میں مشغول تھے جو پاکستانی نقطہ نظر کی وضاحت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کر سکیں۔

''ہم آگئے'' پروگرام نشر ہونے لگا۔ اس پروگرام کی خوبی یہ تھی کہ پندرہ منٹ پہلے جو پروگرام بھارت سے ہوتا اُس کا جواب خاں صاحب ڈنکے کی چوٹ لکھتے اور جوابی حملہ اس قدر منہ زور اور سخت ہوتا کہ غالباً ہندوستان والے سارا دن اس کا جواب ہی سوچتے رہتے۔

تراڑ کھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہاں کا سماں عجیب تھا کہ ٹرک میں باہر کے شور سے چھٹکارا پانے کے لیے مائیکروفون اور ایکٹر اپنے اوپر رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ یہ اختراع اس لیے کی گئی تھی کہ ہندوستان سے ہونے والے پروپیگنڈہ پروگراموں کا فوراً جواب دیا جائے۔ خاں صاحب کے ذمے ''ہم آگئے'' کا سکرپٹ لکھنا تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام سنتے۔ ساتھ ساتھ حاضر جوابی سے سارے اعتراضات کا جواب رقم کرتے۔ جونہی بھارتی پروگرام بند ہوتا تو تراڑ کھیل سے اناؤنسمنٹ ہوتی...... ''ہم آگئے!''

اس پروگرام میں مشہور آرٹسٹ محمد حسین اور تاج صاحب پیش پیش تھے۔ کبھی خاں صاحب بھی صداکاری کرتے لیکن زیادہ تر وہ سکرپٹ ہی لکھتے تھے۔ ممتاز مفتی بھی وہیں تھے اور وہ بھی سکرپٹ لکھا کرتے تھے۔ خواتین صداکاروں میں جمیلہ اختر سے خاں صاحب کی یہیں ملاقات ہوئی تھی۔ خاں صاحب ازل سے محنتی تھے۔ اُن کے لیے گھر سے دوری، کانٹے پھاٹک والی سے فاصلہ، اپنی تنہائی کا غم اس پروگرام کے سامنے دھندلا جاتا۔

یہیں رہ کر غالباً سب سے پہلے اُن پر یہ بات واضح ہوئی کہ اُن کے دل میں پاکستان کی محبت دائمی ہے۔ یہی محبت پھر جوان ہو کر ''تلقین شاہ'' پروگرام میں اُبھری جو پورے 39 سال نشر ہوتا رہا۔ اس پروگرام سے اُن کی وفاداری

ہے۔ اُن کی محنت طلبی کا ایک عجیب واقعہ بھی ہے کہ جب بابا جی محمد خاں اس جہان سے چلے گئے تو ابھی اُن کا جنازہ گھر پہ تھا اور خاں صاحب ماتم داروں سے چھپ کر ''تلقین شاہ'' لکھ رہے تھے۔

پاکستان سے والہانہ محبت نے 1971ء کی جنگ میں ''داد ولوہار'' کا روپ دھارا۔ اس پروگرام کو وہ لاہور سے ...سیح کیا کرتے تھے اور اس میں صدا کار بھی شفو ہی تھے۔

خاں صاحب شاید تراڑ کھیل سے جلد واپس نہ آتے لیکن ایم اے کا رزلٹ نکل آیا۔ ہم دونوں پاس ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے مبارک باد کا تار بھیجا تو مجھے لگا جیسے میری محنت ٹھکانے لگی۔ امتحان میں خاں صاحب فسٹ آئے۔ میں دوسرے نمبر پر آئی لیکن مجھے ایک بار بھی اس بات کا رنج نہ ہوا۔

وہ ترنت ہی لاہور واپس آئے۔

کالا پھاٹک کھلا...... اشفاق صاحب نے اپنا ہو پر سائیکل لال بجری کے ساتھ دائیں کونے میں رکھا۔ سیڑھیاں چڑھے اور برآمدے کی آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر یوں بیٹھے جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر سفر سے گھر لوٹتا ہے۔

ایک لمبا وقفہ خاموشی کا گزرا۔ پھر نہ تو کوئی بات تراڑ کھیل کی ہوئی نہ امتحانوں کے متعلق دہرائی گئی۔ اشفاق صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا ''دیکھیے میری اماں کو شوق چڑھا ہے کہ وہ میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کریں۔ آپ مزنگ روڈ آئیں۔ کل رات قریباً سات آٹھ کے درمیان۔''

میری والدہ ملتان میں تھیں اور اُن کی اجازت کے بغیر میں کہیں جا نہ سکتی تھی۔ ویسے بھی خوف میری شخصیت کا خمیر ہے۔ خود بخود پھلتا پھولتا ہے۔ خود بخود دیوانہ وار مجھ پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں ابھی لڑکیاں اتنی ماڈرن نہ ہوئی تھیں کہ یوں آزادانہ گھوم پھر سکیں۔ ابھی تو سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے خیال آیا کہ میں 1- مزنگ روڈ جا کر اپنے آپ کو بے وقعت اور Cheap ثابت کروں گی۔

''مشکل یہ ہے کہ میں تو آپ کے گھر نہیں آ سکوں گی۔ آئی ایم سوری، یہ ممکن نہیں۔''

شفو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے...... ''میں تو اماں کو مرغیاں خرید کر دے آیا تھا۔''

میرا انکار سن کر غیرت مند پٹھان بچے نے اصرار نہ کیا۔ سیڑھیاں اُترے ہو پر سائیکل سنبھالا، کالا پھاٹک کھولا اور چلا گیا۔

چند دنوں بعد مجھے ایک خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ خاں صاحب نے وہ تمام مرغیاں اماں سے لے کر کوٹھے پر پھینک دیں اور چیلیں اُن کی خوشی کو مرغیوں سمیت نوچ نوچ کر کھا گئیں۔

خاں صاحب نے اس کے بعد فرار کے کئی راستے اختیار کیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے۔

لیکن دعوت کی یہ خفگی تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شفو اپنے چھوٹے بھائی تقو کو لے کر ہمارے یہاں آئے۔ اشتیاق کو کچھ دنوں کی چھٹی تھی اور کیڈٹ صاحب اپنے خاندان سے کچھ ہمت، حوصلہ افزائی اور محبت کی گرمی کا تھیلا بھروانے آیا تھا۔ بابا جی محمد خاں سے تو سب بچوں کا دوری اور سرد مہری کا رابطہ تھا لیکن اماں جی ان ساری کوتاہیوں کو گرمجوشی سے برابر کر دیتیں۔

تقو کے سنہری بالوں میں سرسوں کے تیل کا مساج کیا جاتا۔ اُس کی پسند کے کھانے پکائے جاتے۔ تقو اماں جی کے کمرے میں سوتا۔ وہ پھل شوق سے کھاتا جو اماں جی امیری بیگم سے خرید کر الماری میں رکھتی تھیں۔

ہمارے گھر میں گھستے ہی تقو نے مجھے بے تکلفی سے پوچھا ''کا کی! تمہارے پاس کرکٹ کا بلا ہے؟''

''تم آرام سے برفی کھاؤ۔ تمہیں کرکٹ سے کیا'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی میں Sportsman ہوں۔ روز جوگنگ کرتا ہوں۔ سوئمنگ میری عادت ہے۔ میں یوں بیٹھ کر صرف باتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں مزنگ روڈ میں بھی کوئی نہیں کھیلتا۔ نہ ان ڈور نہ آؤٹ ڈور.....''

اتنے میں ریزی کہیں سے ایک بیس بال کا ڈنڈا تلاش کر کے لے آیا۔ یہ ڈنڈا اس کوٹھی میں پرانا پڑا ہوا تھا۔

''کیا اس ڈنڈے سے کام بن جائے گا؟'' ریزی نے سوال کیا۔

''ذرا ہٹ لگانا مشکل ہوگا لیکن گزارہ ہو جائے گا.....اور وکٹیں؟'' تقو نے پوچھا۔

''یار کیا مصیبت ڈال رہے ہو'' چائے پیتے ہوئے خاں صاحب بولے۔

''دیکھیں تو سہی کیا مزا آتا ہے۔'' تقو نے کہا۔

اس کے بعد تقو اور ریزی نے جنگلی سرکنڈوں میں سے خشک ڈنڈے تلاش کر کے برابر کی وکٹیں بنائیں۔ لالو بازار بھیج کر گیند منگوایا۔ یہاں بازار میں کھیلوں کی دوکان نہ تھی۔ پتہ نہیں لالو کس دکاندار سے ٹینس کا ایک بال لے آیا۔

کھیل کا بنیادی سامان تیار ہو گیا۔ ہم سب بیڈمنٹن، سوئمنگ، کیرم بورڈ، لوڈو کے شوقین تھے۔ فٹافٹ تیار ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ چونکہ زیادہ کھلاڑی موجود نہیں اس لیے ہر کھلاڑی اپنی اپنی رنز بنائے گا اور جو سب سے زیادہ رنز بنائے وہی جیت گیا۔

وکٹیں سیڑھیوں کی طرف فٹ کی گئیں اور باؤلر پھاٹک کی طرف سے حملہ آور ہونے لگا۔ ہر کھلاڑی دو دو اوور گیند دینے کا مجاز تھا۔ ان بارہ گیندوں میں اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ بیٹس مین آؤٹ ہو جائے۔ نلکے والے حوض سے آگے چھکا شمار ہوتا۔ اس کھیل میں ہر کھلاڑی کافی روندی مارتا۔ اپیلیں ہوتیں اور ہر کھلاڑی چونکہ بزعم خود ریفری بھی تھا کھیل میں ہلا گلا رہتا۔

میرے کزن معظم سب سے کمزور کھلاڑی تھے۔ وہ دو چار گیندوں میں آؤٹ ہونا شروع ہو جاتے لیکن اُن کا آرٹ یہ تھا کہ پورے دو اوور کھیل کر نکلتے۔ کبھی کبھی میری سہیلی محمودہ منظور آ جاتی۔ اس کا نام چھوٹتے ہی تقو نے ''بتو'' رکھ دیا تھا اور کبھی کبھی وہ نام رکھنے کی وجہ اس مصرع سے دیتا ''بتو دا لک چیتے ورگا۔''

بتو متحمل مزاج تھی، جلدی آؤٹ ہونے پر اُس نے کبھی برا منایا نہ کسی کے بتو پکارنے ہی کا.....ہم سب کھیلنے کے شوقین تھے۔ ہمیں جیتنے یا ہارنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس کھیل کے علاوہ اشتیاق نے ایک اور کھیل بھی ہمیں سکھایا۔ یہ ایک طرح سے چور سپاہی کا کھیل تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب چھپ جاتے اور ایک کھلاڑی سپاہی بن کر تلاش میں نکلتا۔ جب اُسے کوئی دوسرا کھلاڑی نظر آتا۔ وہ کہتا ''سمی Smy۔'' یعنی (It is me) اور کھوجنے والا کھلاڑی پھر سپاہی بن جاتا۔ کھیل کھلاڑی میں مشغول سب

سبت سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

ہم سے بچھڑ کر جب تقو واپس ''کاکول'' جاتا تو اُس کے خط مجھے، ریزی اور معظم کو آتے رہتے۔ یہاں بھی بے میں کبھی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی۔ خاں صاحب البتہ محتاط رہتے۔ وہ اگر دو قدم آگے بڑھتے تو تین قدم پیچھے بھی اُسی ے لوٹ جاتے۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا جو جھڑکتا، ٹوکتا لیکن ابھی اقدار زندہ تھیں۔ ان دیکھے والدین کی ناراضگی بھی اور معاشرے سے ڈر بھی نئی پود کو بے راہ روی سے روکے رکھتا۔

اشتیاق کے بعد ''نیلو'' ہمارے گھر کا فرد بن گئی۔ نیلی آنکھوں والی ڈیڑھ دو برس کی بچی ریزی اور مجھے پسند تھی۔ بھائی اور باجی ضیاء کی بیٹی نیلو کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سائیکل سٹینڈ پر اُس کے دو تین جانگیے رکھ کر خاں جناح پارک آتے۔ ان دنوں لاہور کی سڑکوں پر رش نہ تھا۔ اتنا لمبا سفر خاں صاحب بڑی سہولت سے طے کر لیتے ی حادثے کا خوف دامن گیر نہ ہوتا۔ ٹریفک مہربان تھی۔ سڑکیں کشادہ اور ویران۔

نیلو سائیکل کی سیر پر خوش ہوتی اور خاں صاحب اُسے خوش دیکھ کر نہال ہوتے۔ ابھی خاندان مٹھی بند ایک کی محبت میں سرشار لوگوں کا مجموعہ تھا۔ مزنگ روڈ والے شقو پر تو اعتماد کرتے ہی تھے، رفتہ رفتہ اُنہیں ہم پر بھی اعتبار گیا۔

اس چھوٹی سی بچی میں خاں صاحب کی جان تھی۔ ریزی میں محبت کرنے والی روح تھی۔ وہ نیلو کو دودھ پلا کر ۔ نیلو کے آتے ہی اس اُجاڑ، ڈھنڈار پرانی بوسیدہ کوٹھی میں جان پڑ جاتی۔ جس چھوٹے سے چوبچہ نما حوض کا ذکر کر چکی ہوں یہ نیلو اور میری بہشت تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں نیلو کو نلکے کے نیچے کھڑا کر دیتی اور ہتھی اوپر نیچے کرنے لگتی۔ نیلو پانی کی دھار تلے کھڑی ہو جاتی۔ جونہی ٹھنڈا پانی پڑتا وہ ہلکی سی سسکی بھر کر تھوڑا سا لرزتی۔ لیکن اگر پانی بند کر دیتے تو وہ رونے لگتی۔ وہ اتنی دیر تک بھیگی رہتی جب تک اُس کا جسم ٹھنڈا برف نہ ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں دھند سی چھا جاتی اور اُس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ پھر میں اُسے تولیے میں لپیٹ کر اندر لے جاتی۔

نیلو کے آنے سے ہم لوگ جیسے ''گھر گھر'' کھیلنے لگتے۔ نیلو کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب نے کبھی کوئی ہدایت نہ دیں۔ میں نے کبھی اُن سے نہ پوچھا کہ وہ کیا کھائے گی؟ کیا پئے گی؟ کب جاگے گی؟ بس اس ننھی گھرداری کی بھی زبان خاموشی تھی۔

ایک روز گہری شام کے وقت کالا پھاٹک کھلا۔ اقبال بھائی اندر آئے۔ یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ دُبلا کسرتی جسم، خاں صاحب جیسا چہرہ، لب و لہجے میں شائستگی۔ بڑی لجاجت سے آگے بڑھے۔

''نیلو...... کیا نیلو یہاں ہے؟''

''جی آئی تھی لیکن شقو کے ساتھ چلی گئی۔''

''کتنی دیر ہوئی؟'' بھالو بھائی نے سوال کیا۔

''یہی کوئی آدھا گھنٹہ۔''

تشویش اُن کے چہرے پر تھی لیکن اُن کا لب ولہجہ اس تشویش کو ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

''شکریہ۔''

وہ لوٹنے لگے۔

''جی آپ بیٹھیں گے نہیں۔''

''میں ضرور بیٹھ جاتا لیکن باجی ذرا پریشان تھیں۔''

میں تھوڑی سی احساسِ جرم میں چلی گئی اور اصرار نہ کر سکی۔ کالی سائیکل پر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے یوں احساس ہوا گویا خاں صاحب واپس جا رہے ہوں۔

میں اس سال کے دوران کبھی کبھی ملتان چلی جاتی۔ کبھی امی ہمارے ہاں دورے پر آ جاتیں۔ ریزی بھائی کام چھوڑ چکے تھے۔ وہ اور معظم کبھی مکتبہ جدید چلے جاتے۔ کبھی شفتو سے ملنے مزنگ روڈ کا پھیرا لگاتے۔ کبھی انارکلی اور مال کی سیر کرتے۔ ریزی بھائی اپنی پینٹنگ سے غافل نہیں تھے۔ کوئی ایک آدھ سرورق بنانے کو مل جاتا تو بروقت اسے ڈال لیتے۔

آسان سے وقت تھے۔ ابھی بیرون زمانے نے تیزی اختیار نہیں کی تھی لیکن خاں صاحب نے اپنے اندر تضاد کے باعث بڑی مشکلات ایجاد کر رکھی تھیں۔ نہ انہیں بھاگنے اور گریز کرنے پر اختیار تھا۔ نہ وہ بار بار خطوں کے ذریعے ہی ملاقاتوں کا سہارا لے کر مجھ سے ہر بار از سرِ نو رابطہ قائم کرنے سے اپنے آپ کو روک سکتے تھے۔

آپ کو جو صوفی ''رنگ رلیاں'' افسانے میں نظر آتا ہے اُس صوفی کی ابتداء یہاں ہی سے ہوئی تھی۔ مندر میں رہنے والے بھگت، کسی ڈیرے پر جپ تپ کرنے والا راہب ایسی ہی مِنہ بند کیفیت سے گزرتا ہے۔ صوفی بھی عشق کرتا ہے۔ اُس کی ضروریات بھی اُسے ستاتی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اُس کے اندر بھی دنیاوی آسائش کے خواب انگڑائیاں لیتے ہیں۔

اگر صوفی ساتھ ساتھ شریعت کا بھی پابند ہو تو وہ اطلس و کمخواب کے فرشوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ میوے اُس پر جھکے چلے آتے ہیں۔ وہ ایسی حوروں کے خواب دیکھتا ہے جن کو نہ انسان نے ہاتھ لگایا ہو نہ کسی جن نے...... صوفی، راہب، بھگت اپنی جسمانی اور روحانی خواہشات سے بڑے سلیقے سے ان خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے جہادِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں میں خاں صاحب نے بھی جہادِ نفس کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ گر غالباً فرار کا تھا۔ جس مقام پر اپنی ڈھال حفاظت کے قابل نہ رہتی، وہ اس مقام پر بھونڈی جنگ کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی مصلحت سمجھتے۔

ایک صوفی کا واقعہ بہت بعد میں خاں صاحب اپنے چاہنے والوں کو بتایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی بادشاہ اپنے مرید کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک ندی آ گئی۔ پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک صاحبِ جمال جواں سال، طرحدار خاتون ندی کنارے کھڑی ہے۔ صوفی کو دیکھ کر بولی...... ''اے اللہ کے بندے! رات آیا چاہتی ہے مجھے پار پہنچنا ہے لیکن پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ کیا تو مجھے پار اترنے میں مدد دے سکتا ہے؟''

مرید اس وقت اپنے پائینچے اُٹھانے میں مشغول تھا۔ صوفی نے عورت سے یہ سوال نہ کیا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔ کیوں اس وقت پار جانا ضروری ہے۔ چپ چاپ اُسے کندھوں پر اُٹھایا اور پار لے گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر عورت نے کمال بے اعتنائی سے اپنا راستہ لیا۔

کچھ دیر تو مرید نے اپنے اندر کُھد بُد کو برداشت کیا۔ پھر قدرے حیرانی اور خفگی سے بولا۔

''یوں عورت کو کندھے پر اُٹھا کر دریا پار کرانا بابا جی...... کیا یہ گناہ نہیں؟''

بابا جی ہنسے اور محبت سے بولے ''واہ بھائی! میں نے عورت کو دریا پار کرتے ہی اُسے اپنے وجود سے اُتار دیا۔ تم ابھی تک اسی میں مشغول ہو۔''

یہی جہادِ نفس کی پختگی ہے۔ اس مقام تک کوئی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ خاں صاحب سلیقے سے زندگی گزارنے کا گُر تو رکھتے تھے لیکن کچے مرید کی طرح اس پر کاربند ہونے کی صلاحیت اُن میں نہ تھی۔ وہ تو ابھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے کے پیچھے بھاگنے والے تھے۔ اُنہیں ریزی اور معظم نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ زوبی صاحب کے چکر تھے۔ اثر صاحب اور شفقت باجی کو اُن کی محبت پر تکیہ تھا۔ اتنی ساری کھینچا تانی میں وہ سکونِ قلب کا نسخہ کیسے لکھ سکتے تھے۔

معظم میرے ماموں زاد بھائی پتہ نہیں کیسے ہمارے گھر منتقل ہو گئے تھے؟ ماموں فضل نے اُنہیں بی اے کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا تھا لیکن معظم دنیا جہاں کی کتابیں پڑھتے، کافی ہاؤس میں ادیبوں کی سنگت میں بحث مباحثہ کرتے لیکن کورس کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ریزی اور مجھ سے زیادہ معظم خاں صاحب کی زندگی میں دخیل ہو گئے۔

دیال سنگھ کالج میں نوکری کر کے جب خاں صاحب گھر لوٹتے تو معظم کو 1- مزنگ روڈ پر منتظر پاتے اور پھر تیسری منزل پر شفقوجی اور معظم باتوں کے غبارے اُڑایا کرتے۔ جس قدر معظم اردو ادب کا رسیا تھا اُسی قدر ریزی روایت سے دُور تھا۔ وہ کینوس رنگ اور پراسپکٹیو (Prospective) کے چکروں سے کبھی آزاد نہ ہوا۔

ابھی ہم کالج میں تھے۔ جب خاں صاحب کی دوستی غلام محی الدین اثر صاحب کے ساتھ طے ہو گئی تھی لیکن ایم اے کے دوران ہی ایک اور چکر چلا۔ سال کے بعد نئی کلاس نے داخلہ لیا۔ ان میں باجی شفقت تھیں۔ اُن کا لب و لہجہ شستہ تھا۔ نسائی قابلیت قابلِ مخدوش تھی۔

پروفیسروں کی عادت ہے وہ ہر نئی کلاس میں اپنے منظورِ نظر چن لیا کرتے ہیں۔ ہماری کلاس میں سے اثر صاحب نے میرا انتخاب کیا اور نئی ففتھ ایئر کی کلاس میں اُنہیں شفقت ایسی نظر آئیں جو قابلِ توجہ تھیں۔

جب چھوٹی اڑانوں سے خاں صاحب کی سیری نہ ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور سے کہیں اتنی دور نکل جائیں جہاں تک اُن کے اندرونی تضاد کی رسائی نہ ہو۔ ان دنوں خاں صاحب روم جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ایم اے او کالج میں ان دنوں سید عابد علی عابد پرنسپل تھے۔ جب روم یونیورسٹی سے ملحقہ ادارے (ISMEO) میں خاں صاحب کو اردو پڑھانے کا جاب مل گیا تو وہ چھٹی کے سلسلے میں سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔ پیتر سانتریالی کا Appointment لیٹر ہاتھ میں لیا اور اسے سید صاحب کی میز پر رکھ کر بولے ''روم سے یہ خط ملا لیکن اب چھٹی کا مسئلہ۔''

ہمیشہ کی طرح وہ تضاد کا شکار تھے۔ روم میں نوکری بھی کرنا چاہتے تھے اور دیال سنگھ کالج کو چھوڑنا اُنہیں قابل

قبول نہ تھا۔

سید عابد علی عابد نے خط دیکھا۔

''بھائی یہ تو اطالوی میں ہے۔''

''اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر میں بروقت پہنچ گیا تو نوکری مل جائے گی۔''

''سوچ لو یہ کوئی سرکاری خط معلوم نہیں ہوتا۔''

''بس آپ مہربانی فرمادیں، باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔''

عابد صاحب نے اجازت مرحمت فرمائی اور خاں صاحب نے روم کا رختِ سفر باندھ لیا لیکن 1956ء اور اکیاون اُن کے لیے بڑے طوفانی سال تھے۔ اب اُن کی ڈائریاں اور نوٹس دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کرب سے گزر رہے تھے۔ ذرا دیکھیے۔

اُس نے آگے بڑھ کر پیتل کے پتروں سے منڈھے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟''

اور اندر سے آنے والی آواز اس کے سینے میں ٹھڈے کی طرح لگی۔ وہ چبوترے سے گلی میں کودا اور شمال کی جانب بھاگ گیا۔ گلی کا ایک کتا عادتاً اس کے پیچھے بھاگا اور پھر کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چاند ایک کالی بدلی سے نکل کر دوسری میں چھپ گیا۔ سرس کے پتوں سے بارش کی کچھ بوندیں جھڑ کر اس کی مانگ میں ٹھنڈی سلائی کی طرح پھر گئیں۔ اس نے اپنی رفتار مدھم کر لی لیکن پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کسی نے ضرور دروازہ کھول کر ایک بار پھر پوچھا تھا...... ''کون ہے؟'' اس کی چھاتی نے دھوں کر کے خشک کھانسی کی آواز نکالی اور وہ پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

ٹین کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپاٹپ برس رہی تھیں اور پلیٹ فارم کی روشنی میں ریل کی سیاہ پٹڑی ڈھل رہی تھی۔ لوہے کے بنچ پر ساگوان کا موٹا تختہ لگا تھا اور فضا میں نمی کی وجہ سے اس پر جما ہوا میل لسلسا ہو گیا تھا۔ نیا سال طلوع ہونے میں پورے دو دن باقی تھے اور ساگوان کے تختے میں لگے ہوئے آہنی کابلے بڑے ٹھنڈے تھے۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر اُٹھا کر دونوں کان ڈھانپ لیے۔ کالروں کے نیچے کپڑے کا اصل رنگ نکل آیا۔ ایک بارہ ماشیا ہتھوڑی کے دستے میں ربڑ کی واشریں فٹ کرتا اندر آیا۔ اس نے کوٹ کا اصل رنگ دیکھے بغیر کہا۔ ''رات یہاں کاٹو گے؟''

''ہاں۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''لاہور۔''

''لیکن یہاں تو بہت سردی ہے۔ تمہارے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں؟''

''نہیں۔''

"اچھا۔"

اور "اچھا" اس کے سر پر دستِ شفقت بن کر پھر گیا۔ بارہ ماشیا مسافر خانے سے باہر نکل گیا اور پلیٹ فارم کی
ریل کی پٹڑی پھر ڈھلنے لگی۔

سورج کی پیلی روشنی میں پیتل کے پترے چمک رہے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔

اور چوکھٹ کے ایک طرف "میلارام داروغہ صفائی" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔

اب ڈی کوثر افضل کے دفتر میں موجود ہے اور اس سے قطعہ زمین کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے۔ افضل کچھ
سا اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے۔ اتنے میں پرویز دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظر ڈی کوثر پر پڑتی
ہے۔ وہ بھائی سے کہتا ہے کہ وہ میں سکوٹر کی چابی تو نیچے ہی بھول آیا۔ وہ چابی لینے جاتا ہے اور افضل کوثر سے پھر معذرت
کوثر بادلِ نخواستہ اس کے دفتر سے نکلتا ہے۔ سیڑھیوں پر اس کی مٹھ بھیڑ پرویز سے ہوتی ہے جو چابی لے کر واپس
پرویز کوثر کو روک کر پوچھتا ہے "آپ کا نام الہ داد تو نہیں؟" کوثر کہتا ہے "اللہ دتہ۔"

پرویز کہتا ہے "او شاید!"

اللہ دتہ کہتا ہے "لیکن اب میں اے ڈی کوثر کہلاتا ہوں۔"

پرویز کہتا ہے "ہم آپ کو آٹھویں میں پڑھتے رہے ہیں۔" مکار کوثر کہتا ہے۔ "اوہ ٹھیک، خوب یاد آیا۔"

پرویز زمین کی کہتا ہے وہ آسمان کی بتاتا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے سے تفصیلی حال پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا
ہے ڈی کوثر پراپرٹی ڈیلر ہے۔ پرویز اپنے بارے میں بھی بتاتا ہے اور کچھ کرنے اور تجارت میں بین الاقوامی شہرت
کا ذکر کرتا ہے۔

پرویز اسے اپنا پتہ دیتا ہے اور کوثر اس خوبی سے ملتا ہے کہ مزاج کے ساتھ ساتھ پرویز کے دل پر یہ بات بھی رقم
ہے کہ یہ اُس کا پرانا کلاس فیلو ہے۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چل دیتا ہے۔

Describe دے کر بتاتے ہیں کہ کوثر ایک کٹڑی میں ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچ کر نجیا کو بتاتا ہے کہ
بڑے بھائی کو گیا تھا لیکن چھوٹا بھائی شیشے میں خود اُترتا چلا آیا۔

تمناؤں کے تیز گام شبدیز کو دوڑاتے ہوئے میں ایک صحرا میں گر کر بے ہوش ہو گیا تو ایک ٹولے نے مجھے ہوش
میں لا کر کہا۔

"تو نے پیدل چلنے میں کیوں احتراز کیا؟" میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"اب تجھ سے پیدل بھی نہ چلا جائے گا۔"

ایک مرتبہ میری محبوبہ جہنم میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے کہا۔ "جانِ تمنا! اس سیاہ خانے میں تم کیوں چلی

اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ''مجھے کسی نے بتایا تھا کہ دوزخ کے شعلوں نے تمہاری بینائی چھین لی ہے۔ تمہاری بیمار پُرسی کو آئی ہوں۔''

آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے برآمدے کے بیچ میں نے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور کہا ''اب تمہاری ہے'' لیکن غلام گردش ٹس سے مس نہ ہوا اور میری باری یونہی چلتی رہی۔

راولپنڈی

(1951ء)

مہینے کا آخری دن ہے۔ ابھی ابھی راولپنڈی پہنچا ہوں اور اُسی ہوٹل میں قیام کر رہا ہوں جہاں دو مہینے گزر تھے۔ جہاں رات رات جاگ کر سکرپٹ لکھے تھے۔ اخبار یں نشان کی تھیں اور دفتر کی فائلوں میں سرکاری قسم کے ا کیے تھے۔ شہر وہی ہے، بازار وہی ہے، عمارت وہی لیکن کمرہ اور موسم بدل گیا ہے۔ پنڈی مجھے کبھی بھی اجنبی دیس نہ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اس شہر میں پیدا ہوا۔ اسی شہر کے کسی سکول میں پڑھتا رہا۔ یہیں سے میں نے بی اور پھر چند سال سی۔ ایم۔ اے میں ملازمت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اسی شہر کے راستوں پر تھوڑی دیر کو میرا جنازہ اور پھر مجھے بڑے قبرستان کے ایک گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے سارے ایام میں نے دیس میں گزارے اور اسی شہر میں بسر کیے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں اپنے ہوٹل سے ریڈیو سٹیشن کو جانے والی سڑک کے علاوہ اور کسی راستے واقف نہیں ہوں۔ میرا سارا سامان یہیں تھا۔ پنجاب کے سیلاب کی وجہ سے میں اپنا سب کچھ اٹھا کر لاہور نہ لے جا ٹرنک اور بستر مفتی کے پاس چھوڑ کر ایک اٹیچی کیس لے کر لاہور چلا گیا۔ آج مفتی نے میرا ٹرنک لا کر دیا۔ میں نے کھ مجھے ایسے لگا جیسے یہ میرا ٹرنک نہیں۔ اس میں کچھ کپڑے تھے، استعمال شدہ اور میلے۔ ایک کیمرہ تھا۔ کافی کا ایک سا تھا۔ دو پنسلیں۔ نشر شدہ ''ڈھول کے پول'' کی چند کاپیاں اور کچھ خطوط۔ میں دیر تک ان خطوں کو پڑھتا رہا اور ابھی م نے خطوط خوانی ختم کر کے قلم اٹھایا ہے۔''

(چند خطوط خاں صاحب کے نام)

(سب سے بڑے آفتاب بھائی خاں صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں جو انہوں نے تراڑکھیل سے لکھا۔)

عزیزم اشفاق سلمہ!

آپ کا پہلا خط بنام اماں جان اور دوسرا میرے نام تشریف لایا۔ دلی مسرت ہوئی۔ حیرت ہے کہ جو خط م نے آتے ہی آپ کو پشاور روڈ کے پتہ پر لکھا تھا، آپ کو کیوں نہیں ملا! اگر یہ آپ تک پہنچتا تو آپ اس کا تذکرہ ض کرتے۔

ہم بفضلِ تعالیٰ سیلاب کی زد میں نہیں آئے۔ کرشن نگر اور راجگڑھ روڈ وغیرہ میں پانی اب تک ہے لیکن اُسے [illegible] بس کہنا چاہیے۔ خطرناک نقصان ان دیہات کو پہنچا جو تحصیل شاہدرہ میں دریا کے کنارے آباد تھے۔ افتخار میاں اور [illegible] بچے نہیں آئے۔ مری میں آپ کے ساتھ جو راحت میں نے کنگز ہوٹل میں پائی، وہ آپ کے موجودہ ہوٹل میں [illegible]۔ جنت کا جھونپڑا جہنم کے محل سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ یہ آپ کو گمان محض ہے کہ مری میں مجھے تکلیف ہوئی۔ [illegible] اگر مجھے آرام نہ ملتا تو میں اتنا تنومند کیونکر ہو جاتا۔ میں تو ہمیشہ یہی کہوں گا کہ مری کی پُر بہار سیر صرف آپ کی [illegible]۔

(ایک خط جو اُنہیں بابا محمد خاں نے مری لکھا)

عزیز محترم سلامت رہو! السلام علیکم، مزاج شریف۔

آپ کا خط آیا، حالات سے آگاہی ہوئی۔ یادآوری کا شکریہ۔ تاحال مشینری کے متعلق کوئی انفریشن نہیں [illegible] محمد خان صاحب نے جب اُن کو سعید احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کا منشا مشینری لگانے کا ہے تو چچا صاحب [illegible] سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سعید احمد خاں کولڈ سٹوریج لگا رہے ہیں۔ اُن کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہم کو کچھ [illegible] دے سکیں گے۔ یہ بات اُنہوں نے بطور پیش بندی کے کی تھی۔ مبادا محمد خاں اُن سے کچھ روپیہ مانگ لے۔

نسرین سنو اور کریم کے لیے شیشی کی ضرورت ہے۔ سینٹ کی ضرورت ہے۔

اشتیاق میاں بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ افتخار بھائی مع بال بچوں کے لاہور آنے والے ہیں۔ آپ نے [illegible] مری کی بابت دریافت فرمایا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ہم کباب سوختہ ہیں ہمیں سردی گرمی سے کیا کام؟

فقط محمد خاں

(کاکی کا خط)

محترم اشفاق صاحب، السلام علیکم!

آج عید ہے۔ روایتی نہیں بلکہ اصلی۔ میرے ہاتھوں میں آج سی۔ ایم۔ جی (سول اینڈ ملٹری گزٹ) ہے اور [illegible] غور سے اردو ایم۔ اے کا رزلٹ پڑھ رہی ہوں۔ کاش آپ کی طرح مجھے بھی Subtle Thanks ادا کرنے [illegible] آتے تو میں بھی کوئی دس پندرہ برس پرانا واقعہ یاد کر کے اس کی روشنی میں آپ کو مبارک باد دیتی لیکن بہت [illegible] کے باوجود بھی نہایت معمولی واقعات یاد آ رہے ہیں اس لیے معذور ہوں۔

مجھے یہ بتایئے کہ آپ نے شکریہ ادا کرنے کے ڈھنگ کس سے سیکھے؟

شیخ سعدی سے؟

یہ آپ کی محنتوں کا ثمر ہے کہ کسی کی دعاؤں کا اعجاز؟ یا پھر کہیں درپردہ آپ نے بھی تو اپنی نئی سائیکل سے امداد [illegible] بہرکیف نتیجہ واقعی قابلِ رشک ہے۔ دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

من وسلویٰ کھلانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے کہ پھر...... چلیے صاحب! میں تو اس کا تقاضا کرنے کی نہیں۔ [illegible] ہم جماعتوں سے آپ خود نپٹ لیجیے۔ میں تو تھوڑی سی مٹھائی پر اکتفا کر لوں گی۔ وہ بھی اگر آپ کھلانا چاہیں تو۔

ماچھا، امی، پرویز اور معظم کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

(عمر کا خط)

اشفاق جی!

مہاجرین پروگرام میں گردوپیش (آج کل) لکھنے کے لیے آپ نے دو دن کا وعدہ کیا تھا لیکن مری آ کر نیت خراب ہوگئی ہے اور میں ایک دن اور یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری خاطر اسے ایک دن یعنی 4 تاریخ وار) اور سکرپٹ لکھ دیں گے۔ بے حد مشکور ہوں گا۔ باقی مری آ کر محسوس ہو رہا ہے کہ پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔

(پاس ہونے پر شفقت کا خط مری پہنچا)

شفقی بھیا نمستے! خوشیوں اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور شگفتگی اور اطمینان ہوئی ننھی سی مبارک کباد قبول ہو۔

گو میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کو یہ چند حروف لکھ سکوں کیونکہ میں بھی اسی لاہور کی باسی ہوں جس سے شدید نفرت ہے اور یوں بھی یہ مبارک باسی ہو چکی ہے۔ لیکن بقول غالبؔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ قبول نہیں ہوتی۔

اور سب خیریت ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خوش!

اس خط کے نیچے باجی کے انگریزی میں دستخط ہیں "S.Ara"

(منشی نعمت اللہ خاں کا خط)

گرانقدر۔ عالی مرتبہ اشفاق احمد خاں صاحب۔ ہمیشہ ہمیشہ سلامت باشد!

السلام علیکم با مصافحہ کے بعد واضح رائے عالی ہو کہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت مدام نیک مطلوب ہے۔ آپ نے راولپنڈی آ کر اپنی خیریت سے آگاہ نہیں فرمایا۔ اس لیے مقامِ شکوہ ہے۔ اُمید ہے آپ اللہ کریم کے فضل سے خوب ہشاش بشاش ہوں گے۔ آپ جس محبت اور خلوص سے خادم کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، بندہ اس کا احسان پشتوں تک نہ بھلا سکے گا۔ عرض یہ ہے کہ میرا لڑکا عرصہ پانچ سال سے گھر میں بے کار بیٹھا ہے۔ Type کا کام جانتا ہے۔ اگر آپ کے خیال شریف میں اس کے واسطے کوئی آدمی دکھائی دیوے تو تحریر فرمائیں۔ اس کی بے کاری نہایت ہی بُری ہے۔ قبیل داری میں تو ایک دن بھی بغیر آمدن کے گزارنا مشکل ہے۔ خیر آپ کے خیال مبارک میں کوئی تجویز ہو تو تحریر فرمائیں۔ خداوند کریم آپ کو خوش و خرم سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین۔

باقی مجھے اپنی صحت کے بارے میں ضرور اطلاع دیں کہ اب کیا حال ہے۔ خدا آپ جیسے لائق فرزند گھر گھر پیدا فرمائے۔ خدا کرے آپ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کریں۔ خوب عیش و عشرت وافر و جلال با اقبال زندگی بسر ہو۔ آمین ثم آمین۔

فقط والسلام

تابعدار منشی نعمت اللہ خاں

(اس خط میں خلوص کا لفظ قابلِ غور ہے)

ایک خط انصار کا ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے۔

شقو بھیا! یہ خط کسی کو دکھائیے نہیں۔

ایک کونے میں لکھا ہے۔

شقو بھیا! جواب میں ذرا ان باتوں کا ذکر نہ ہو کہیں۔

افتخار بھائی کے خط کے چند جملے (اپنے بیٹے رومیو کا ذکر)

شقو میاں سلامت رہو! عزیزی تمہاری بھتیجی بہت شرارتی ہوگئی ہے۔ ان دنوں رضیہ کے سکھلانے پر مجھے کہتی ہے۔ بالکل اپنے بچا ابا یعنی تمہاری تصویر ہے۔ ضد کا یہ عالم ہے کہ مجھے اس کی بات بات پر تم یاد آ جاتے ہو۔ تمہاری طرح زمین پر لیٹ کر اور مٹی میں لوٹ کر اپنی ہر بات منواتا ہے لیکن پھر بھی جب میں اُسے غور سے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تمہارے جیسی ضد کا بچہ ہمارے خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔

اس کی اور تمہاری ضد میں یہی فرق ہے کہ یہ رنگ برنگے غبارے لے کر مان جاتا ہے اور تم دونوں جہان کی نعمتیں لے کر بھی نہ مانا کرتے تھے۔ اب تو لاہور آ جائے گا۔ تمہیں بھی آنا چاہیے کیونکہ جو جو ظلم بچپن میں تمہارے جیسے بھائی بہن پر ہوتے رہے ہیں کہیں اس پر بھی نہ ہوں۔

منیر معذرت کرتی ہے کہ بچوں کی علالت کی وجہ سے تمہارے خطوں کا جواب نہ دے سکی۔ شقو میاں! اب چھوڑ دو یہ ایک نوکری۔ ریڈیو کی نوکری مری کی وجہ سے تھی نہ کہ نوکری کے سبب سے۔ عزیزی خدا مالک ہے فکر نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں تمہاری فکر کرنے کی طبیعت کب صحت یاب ہوگی۔

اثر کا خط (روسی سگریٹ۔ ریڈ لیبل کی چائے کا تحفہ ملنے پر)

عزیز من اشفاق!

کل شب کو تمہارا گراں بہا تحفہ ملا۔

اور آج طوفان اور آندھیوں میں لکھی ہوئی چھٹی۔ پرسوں زوبی نے کہیں سے ہاتھ مارا تھا اور حسب دستور حسب منشا مع بچوں کا نذرانہ عقیدت نکالا تھا۔ سٹوڈیو سے جھومتے جھامتے گھر پہنچے تو جاوید نے پارسل دیا۔ اول شب بصد عقیدت، ریڈ لیبل کا منہ میں تازہ تازہ لطیف ذائقہ اور انتہائے افلاس کے عالم میں روسی سگریٹ کا ڈبہ۔ ماشاء اللہ، خدا گواہ ہے کہ ہم جو ابھی کے نہیں اس کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے اور اللہ جانے تمہیں کیسی کیسی دعاہائے دارین دیں۔ تمہاری خوش ذوقی سے عقیدہ تھی اب جزو ایمان بن گئی ہے۔

آج تمہارا خط ملا۔ برق و باراں میں لکھا ہوا لیکن میری جان تمہیں یہ کیوں مشتبہ لگتا ہے کہ وہ مجھے ملے گا نہیں۔ ایک چھت کو تھامنے کے لیے دو دیواریں بہت ہوتی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ زندگیاں اس سے بھی مہین سہارے پر مدتوں قائم رہتی ہیں۔ چھت تو پھر بھی چھت ہوئی اور بالخصوص جب اس کے نیچے ایک ندی دبکی ہوئی ہو۔ موت کو زندگی سے کوئی رغبت نہیں۔ زندگی موت کی محبوبہ ہے۔ جس سے موت اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ موت زندگی کی گھات میں نہیں رہتی، زندگی موت کو ہم آغوش کرنے کے لیے دام بچھاتی ہے اور اپنی رنگینیاں دکھا دکھا کر اسے پھانستی ہے۔ پھر بھلا تمہاری چٹھی نہ ملتی تو کیونکر۔

کا کی کو حسب ہدایت تمہارا اسلام پہنچا دیا۔ وہ تم سے سخت ناراض ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم بڑے ناخلف بیٹے ہوئے اور یہ کہ اب وہ تمہاری ممی نہیں رہی۔

آخر تم آ کب رہے ہو؟

تمہارا

اثر

اور میں نے ان سارے خطوں کو جمع کر کے اور ان پر ایک آخری نظر ڈال کر Crescent Brand Safety Matches کی ایک تیلی سے جلا دیا۔

نہ جانے مجھے کیوں ہمیشہ کولمبس کی طرح ان دیکھے براعظموں کی طرف سفر کرنے کا شوق ہے۔ جوانی میں میری بڑی آرزو تھی کہ میں ماسکو سے ولاڈی واسٹک تک پورا ایک ہفتہ ٹرین میں گزاروں۔ اُس کے کھیت، شہر، قصبہ، نہریں، ندی سینما سکرین کی طرح کھڑکی سے گزر جائیں اور مجھے بغیر کسی واقعے سے دوچار ہوئے ان کا منظرنامہ مفت ہاتھ آ جائے۔

میرا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا لیکن 1975ء میں جب چند ادیبوں کو روس مدعو کیا گیا تو اس گروپ میں میرا نام بھی تھا۔ میرے علاوہ شیخ ایاز صاحب سندھ سے، خاطر غزنوی پشاور سے تھے۔ اس سفر میں مجھے ماسکو سے لینن گراڈ جانے کا اتفاق ہوا اور ہولی رشیا کی یہ زیارت کسی عجوبے سے کم نہ تھی۔

ایم اے اردو کے تجربے سے میں نے جو کچھ مال غنیمت اور بوٹی جمع کی اُس کا زیادہ تر تعلق اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حالات کو سمجھنے کا تھا۔ اب میرے پاس کچھ ایسی یادیں ہیں جن کا تعلق موسموں، ذومعنی باتوں، ابہام بھرے جملوں سے زیادہ نہیں۔ یہ ساری جھوٹی سچی ادھوری باتیں اس لیے بامعنی سمجھتی ہوں کہ شاید اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکے۔

گو کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدے، تخیل، احساس کے ہمراہ بھی قریب قریب ناممکن ہے۔ انسان کے سارے وجود پر اگر سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو ایسے اندھیرے کونے کھدرے میں ضرور رہ جاتے ہیں جن میں اس شخص کی کئی خوبیاں، خرابیاں دبکی رہتی ہیں۔

انسان کا پتھر و دھات کے زمانے سے اب تک یوں ارتقائی سفر میں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے ہوئے رازوں کی بدولت ہے۔ انسان کا علم اسی لیے ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے تمام اعمال کو جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی نیکی بھی بدنیتی پر محمول ہوتی ہے اور بار بار رابن ہڈ (Robin Hood) جیسے ڈاکوؤں کے سر پر کامیابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

میں نے ایک لمبا وقفہ خاں صاحب کے ساتھ گزارا۔ اُن کو قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے مشاہدہ کیا۔ بارہا یوں بھی ہوا کہ مجھے ان کے رویئے، عمل اور سوچ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات گورنمنٹ کالج کے اولین دنوں میں

ہوگئی تھی۔ شفو جی جو کچھ کرتے اُن کے نتائج جو کچھ نکلتے، اُن کی نیت صاف آئینے کی طرح آبدار رہتی۔ اسی نیت دو کسی شخص سے تادیر ناراض رہنے والے شخص نہ تھے۔

رشتے ٹوٹ جانے پر، حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی ڈول نہ ہوتی۔ اسی لیے اُن سے منافقت کبھی سرزد نہ ہوئی۔ غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی شرمساری سے اعتراف چھائی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی لیے اُن کی تحریروں میں مبالغہ آمیزی مبالغے سے کبھی انہوں نے زندگی آراستہ نہ کی۔

نیت کی صفائی کے باوجود جس تضاد کا وہ شکار تھے وہ بدستور قائم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفر، نوکریاں جب تشفی بخش نہ ہوئیں تو انہوں نے روم جانے کا ارادہ کرلیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے غالباً سکھ کا سانس لیا لیکن آزادی قیمت ادا کر کے ملتی ہے۔ کوئی قوم یا کوئی فرد کبھی بھی یہ قیمت ادا کیے بغیر آزاد نہیں ہو سکا۔

انہیں غالباً اس سفر میں مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھے لیکن روم سے ان کے خط آتے رہے اور پاکستان میں جو نیت تھا اب قدرے غیر محتاط ہو گیا۔ ایک Defense mechanism ہمیشہ کی طرح ساتھ تھا۔ وہ بیماری اور بار بار ذکر کرتے۔ مجھے علم تھا کہ وہ دلآزاری کو گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا مسلک غالباً محبت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا سے بڑا روپ ہے۔

اشفاق صاحب نے جب اردو بورڈ میں سروس کی تو یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا، برا بھلا کہا، لیکن یقین جانیے یہ کے تحت اپنی روزی حلال کرنے کے تحت کیا ہوگا۔ انہوں نے کبھی کسی کی اے سی آر خراب نہ کی۔ ان کے جانے چلا کہ بورڈ کے کچھ کارندوں کی وہ باقاعدگی سے مالی مدد بھی کرتے تھے لیکن اس کا ذکر بھی کبھی انہوں نے نہیں

گھر پر ان کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ پھر ان کی زندگی میں اُنہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ پڑ جاتی لیکن سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سبزی فروش ابھی تک چلے آتے ہیں اور روتے ہیں جیسے ان کا کوئی اپنا اُنہیں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

ان کے برعکس مجھے دوسروں کی دنیا سدھارنے کا اتنا شوق ہے۔ دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا چسکا ہے کہ اپنے ٹھیک کیے بغیر میں مجبور لوگوں کو مشورے دیئے چلی جاتی ہوں۔ میری نیت ہوتی ہے کہ لوگ مجھے سراہیں، میری کریں اور میری دانش کے قائل ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے جو وقت کے ساتھ اب بڑھتا چلا جاتا جہاں انہوں نے پڑھنے لکھنے میں میری مدد کی۔ میری تربیت میں اتنی تگ و دو کی وہاں مجھ سے ایک راز چھپا گئے کہ ہر میں نیت کے قطب نما کو کیسے سیدھا رکھا جاتا ہے۔

اتنی بات مجھ پر عیاں ہوگئی ہے کہ نیت کی صفائی سے ہی ان میں محبت کا چشمہ اندر ہی اندر بہنے لگا تھا۔ وہ اس کا اعلان کرتے نہ اس کا پرچار ہی کرتے۔ ان کا رابطہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بڑی خاموشی سے پروان چڑھتا رہتا۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے قارئین، ناظرین، مداحین کی چاہت بھی کسی طور ان

سے وقت کے ساتھ کم نہیں ہوئی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے بے
بیکار باتیں ہیں۔ محبت کرنے والا محبوب کی خوبیاں خرابیاں دیکھ نہیں پاتا بلکہ محبوب کی خرابیوں کو اپنی کج ادائیوں کی طرح
کرلیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور غالباً اسی محبت کی تلاش خلق کو بابوں کے قریب لے جاتی رہی۔

مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت کے اہل نہیں ہوتے۔ اُنہیں اپنی ذہانت پر اس قدر مان ہوتا ہے کہ وہ دوسر
میں کیڑے نکال کر، کسی اور کا قد چھوٹا کر کے، کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی عظمت کی کلا جگاتے ہیں
میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ ان میں انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی کے دریا ساتھ ساتھ بہتے
گے۔ ان میں بھی حب و جاہ کی طلب ہوگی لیکن ان کے چاہنے والوں کی توجہ کبھی ادھر نہیں گئی۔ وہ کبھی ان کی بشریت
دھیان نہ دے پائے اور اُنہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی اور انمول ادیب سمجھتے رہے۔

لیکن سوسائٹی میں کچھ نکتہ چیں قسم کے لوگ رہتے ہیں جو محبتی طریقہ نہیں اپنا سکتے اور پکڑ پکڑ کر، بینت بینت
خاں صاحب کی غلطیاں نکالنے کے درپے رہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں میں صرف رویے کا فرق ہے۔ مہربان لو
کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے اور عیب ڈھونڈنے والے اپنے پچ پر اپنی ذہانت پر اعتماد کرتے ہیں لیکن یہ بہت
باتیں ہیں۔ 24-ایس کینال پارک میں نہ مجھ میں یہ جاننے کی صلاحیت تھی۔ نہ اشفاق صاحب کسی ایسے مقام پر پہنچے
کہ اُن کے متعلق اندازے لگائیں۔ ابھی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت تھی نہ روحانیت کی، سب کچھ دن
کے چکر میں محبوس چل رہا تھا۔

اتنی بات ضرور تھی کہ خاں صاحب جس فرار کی راہ پر جاتے جس شہر میں پناہ لیتے وہاں سے خطوں کا سلسلہ جاری
رہتا۔ افسوس جو خط میں نے اُنہیں تحریر کیے، وہ اس لیے میں نے نذرِ آتش کیے کہ میں خوف کا پرندہ ہوں۔ مجھے ٹالا
جا سکتا ہے۔

• • • ● • • •

14-ایس، کینال پارک

اولاد اپنے ماں باپ کی محبت پر اس درجہ تکیہ کرتی ہے کہ اُسے کبھی علم نہیں ہوسکتا کہ وہ ماں باپ کی آزادی میں کس قدر رخنہ اور اُن کے لیے کیسی سردردی کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ پرویز بھائی اور میرا بھی یہی حال تھا۔ ہم کینال پارک میں بڑی آسودگی کی کمفرٹیبل زندگی بسر کررہے تھے۔ ہمارے پاس زینب جیسی جانثار اور لالو جیسا سعادت مند ملازم تھا لیکن پھر بھی والدہ اندر ہی اندر ہمارے لیے پریشان رہا کرتی تھیں۔ میری شادی نہ ہوچکی تھی۔ ریزی بھائی کا روزگار ڈھب کا نہ تھا۔ وہ مجھے ساتھ ملتان لے جاتیں تو وہاں اور مشکل پیش آتی۔ اُن دنوں افسران بالا ابھی فرعون صفت نہ ہوئے تھے۔ امی کا بیشتر وقت سرکاری میٹنگوں میں ہائی اتھارٹی افسران سے رہتا۔ وہ بھی امی سے بطریق احسن مہربانی سے پیش آتے۔

ڈاکٹر احمد خاں جو ملتان کی سرکاری زمینوں کے کرتا دھرتا تھے اور ڈاکٹر طوسی جو سرکاری ہسپتال کے انچارج تھے، ان کی چھوٹی بہن ممتاز طوسی میری والدہ کی ماتحت تھیں۔ جب کبھی میں ملتان جاتی ان دونوں ڈاکٹر صاحبان سے ملاقات ہو جاتی۔ مشکل یہ تھی کہ امی کو سکولوں کے معائنے کے لیے سارے ضلع میں دورے کرنے پڑتے۔ پاکستان بننے کے بعد ابھی تعلیمی ادارے اپنے طور پر سنبھلے نہ تھے۔ مجھے وہ ساتھ لے کر ریسٹ ہاؤس میں جانا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے ملتان سے مجھے لاہور لوٹا دیا جاتا جہاں کم از کم میرا بھائی تو ہمہ وقت میرے پاس رہتا تھا۔

لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمیں 24-ایس کینال پارک بھی چھوڑنا پڑا۔ پتہ نہیں کرائے کا مسئلہ تھا یا اس کوٹھی کے مالک کو خود اس رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ بہرکیف ہم نے بوریا بستر باندھا اور اس گھر کو خیرباد کہہ کر 14-ایس کینال پارک تک جا کر بسرام کیا۔

یہ نسبتاً نئی کوٹھی تھی۔ اگر پُل سے اتر کر سیدھے نہر کنارے چلتے جائیں تو پہلے موڑ پر بائیں جانب ایک پکی سڑک کینال پارک کی طرف مڑتی ہے۔ یہ گھومتی ہوئی سڑک اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہیں 14 ایس واقع تھی۔ کوٹھی کا بایاں حصہ ہماری تحویل میں دے دیا گیا۔ پتہ نہیں مالک مکان اوپر کی منزل پر رہتے تھے یا دائیں حصے میں۔ ان سے میل ملاقات بھی نہ تھی۔ ریزی کرایہ ادا کر دیتا، وہ لے لیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ریزی ان دنوں بیکار تھا۔ کرائے کا بوجھ بھی امی کو برداشت

کرنا پڑتا۔ 14-ایس کینال پارک میں ایک ہمارا گھر، ایک ملتان میں اُن کی دفتر سے پیچھے رہائش گاہ۔ تیسرا ریسٹ ہاؤسوں میں بخشیش کا سلسلہ۔ امی نہ جانے کس طرح گزارہ چلا رہی تھیں۔

ڈاکٹر محمد خاں کی مہربانی تھی۔ کچھ امی کے اندر ان کا آبائی خون جوش مارتا ہوگا۔ انہیں زمینوں کا خبط ہو گیا۔ اب وہ اس بات کے درپے تھیں کہ ایسی چودھرانی بن جائیں جس کو کچہری میں کُرسی ملا کرتی ہے۔ اسی الاٹمنٹ کے چکر میں وہ دن رات مگن رہتیں۔ بالآخر انہوں نے 23 مربعے الاٹ کروا لیے جن میں سے چھ مربعے تو اس قدر پیچیدہ مسئلے کے تھے کہ یہ اُن کی زندگی میں اُن کے نام نہ ہو سکے اور انہیں بار بار لاہور میں بورڈ آف ریونیو کے دفتر جانا پڑتا۔ شاید نوکری بھی چھوڑ دیتیں اگر مس اقبال ملک ان کو سختی سے منع نہ کرتیں اور ان کا استعفیٰ اپنے ہاتھوں نہ پھاڑ دیتیں۔ آپ لیڈی میکلیگن سے میری والدہ کے ساتھ رہی تھیں۔ ان دنوں وہ ملتان کے ڈگری کالج کی پرنسپل تھیں اور امی ان کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔

امی کے جو حالات ملتان میں تھے، ہم ان میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔ کینال پارک کی کوٹھی ہم دونوں کے لیے کافی تھی لیکن 24-ایس کینال پارک کی طرح کشادہ نہ تھی۔ لان میں سے گزر کر برآمدہ آتا پھر ایک بڑا کمرہ تھا جسے ہم دونوں نے بیڈروم، لیونگ روم بلکہ سب کچھ بنا رکھا تھا۔ باقی دو کمرے استعمال میں نہ تھے۔ ہماری خالہ فیروزہ جو شیخوپورہ میں ہیڈ مسٹریس تھیں، چھٹیوں میں اور ویسے بھی وقتاً فوقتاً ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اسی طرح میری سہیلی محمودہ منظور بھی کبھار آ جاتی۔

اس گھر سے وابستہ دو واقعے مجھے ابھی تک اچنبھے میں ڈال دیتے تھے۔ مزنگ روڈ والوں میں پتہ نہیں کیسی کھچڑی مچی ہوئی تھی۔ جب سے تقو اور نیلو ہمارے گھر آنے جانے لگے تھے، کچھ دو میٹنگز شاید اس شادی کے حق میں ہوگئی ہوں۔ بہر کیف وہاں کیا ہوتا تھا اور کیونکر ہوتا تھا اس کی مجھے واضح اطلاع نہ تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ ہماری چارپائیاں باہر سڑک پر بچھی تھیں۔ کچھ دیر پہلے سب اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ میں چارپائیاں اٹھا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں رکھ رہی تھی کہ بابا جی محمد خاں آ گئے۔ میں حیران رہ گئی۔ چارپائی ہاتھ سے رکھ کر اُن کا سواگت کیا۔ اچھوت کنیا کو آنکنے بھانپنے تول تکڑی پر پورا تولنے کے لیے بابا جی نے کل دس منٹ کا قیام کیا اور چلتے بنے۔

بہت بعد میں جب میری شادی ہوگئی اور مزنگ روڈ آنا جانا کھل گیا تو بابا جی نے مجھے ایک دن بتایا کہ انہوں نے اُسی روز فیصلہ کر لیا تھا جب مجھے چارپائیاں اٹھاتی دیکھا تھا کیونکہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ محنت عزیز تھی۔ وہ محنت کے آگے نہ تقدیر کو کچھ سمجھتے تھے نہ توفیق الٰہی کو۔ اس اکلوتے واقعے نے غالباً اُن پر یہ ثابت کیا کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے دماغ میں کچھ ایسا خناس بھرا ہوا نہیں ہوتا اور شاید گھریلو کام کاج اور روٹین اپناتے ہوئے اُنہیں شرم نہیں آتی۔ وہ بھی عام گھریلو زندگی گزار سکتی ہیں۔

ان دنوں میری والدہ جب وہ ایک مرتبہ ملتان سے آئیں تو انہوں نے ایک فکر کا اظہار مجھ سے کیا...... ''کاکی! میں تو ملتان میں رہتی ہوں۔ تم ہی ریزی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرو۔''

''رشتہ، امی پہلے یہ پڑھائی تو مکمل کر لے۔ کسی ڈھب کی نوکری پر تو لگ جائے۔''

"کر لی اس نے جس قدر پڑھائی کرنی تھی۔ اب اس کی شادی ہونی چاہیے ورنہ ایک اور بکھیڑا پڑ جائے گا۔ کسی صورت پر..."

"کیسا بکھیڑا؟"

"ویلا آدمی ہے، کچھ نہ کچھ گل تو کھلائے گا۔ بس تم کسی نائن سے مل کر یا پھر محمودہ منظور سے کہہ کر کوئی رشتہ تلاش کرو۔"

ریزی ان دنوں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا لیکن حکم عدولی بھی اس کی طبیعت میں نہ تھی۔ ایک رشتہ طے کر دیا گیا۔ لڑکی کا بھائی انارکلی بازار میں سونے کے زیورات بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر ہر قسم کے قیمتی پتھر، کنگن، چھلے، ہار، کانوں کے بُندے مگر بالیاں جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ میں نے ریزی کو حکم دیا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب اس سے جا کر لڑکی کے بھائی سے ملاقات کر لے۔ ریزی نے ایڈریس سنبھال لیا اور چپ چاپ چلا گیا۔

شام کو جب ریزی واپس آیا تو اس نے پورے سر کی حجامت کروا رکھی تھی۔ اُس کے چہرے پر جو روپ سروپ تھا اس کے نیم گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے ہی تھا۔ اُن دنوں چوڑ چپٹ گنجے پن کا فیشن نہ تھا۔ جب سے Yul Brynner ایکٹر نے ٹنڈ کرائی ہے، اس کی دیکھا دیکھی یہ ٹینڈ مردانہ وجاہت کا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن ابھی گنجے پن کو کسی طرح قبول کرنا سوسائٹی کے لیے ممکن نہ تھا۔ ستار صاحب ریزی بھائی سے ملے۔ بوتل پلائی، کچھ زیورات بھی دکھائے اور کچھ عام سے گاہک کی طرح رخصت کر دیا۔ ستار صاحب کی دکان کے اوپر رہائش گاہ تھی اور شاید کسی طور عورتوں نے بھی ریزی کو دیکھ لیا ہو۔ لڑکی نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور انکار کر دیا۔

"یہ آپ اس طرح گئے تھے؟"

"ہاں تو اور کس طرح؟"

"یوں سر پر اُسترا پھروا کر؟"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں بھی اُن کا عندیہ سمجھ گئی کہ وہ شادی پر رضامند نہیں ہیں۔ امی کو خط میں رپورٹ بھیجی تو وہ کچھ دنوں بعد آ گئیں۔ امی نے ہمارے ساتھ کبھی دل کی بات نہیں کی تھی۔ غالباً وہ اپنی اولاد سے مایوس تھیں۔ میں ایم اے کرنے کے بعد گھر بیٹھی تھی۔ ریزی نکھٹو ہو کر لاہور کی سڑکیں ناپتا، سرورق مل جاتا تو بنا لیتا لیکن اس کا مستقبل بھی مخدوش تھا۔ غالباً اولاد کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں زمینوں کا خیال آیا۔ بہادر عورت کی زندگی کا یہ دوہرا عذاب تھا۔ مامتا کو چھپا کر باپ کی پگڑی سر پہ اوپر اوڑھے وہ دانت بھینچ کر اندر ہی اندر تجویزیں اور فیصلے کرتیں اور پھر اکیلی ہی ان کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتیں۔

ان کے لیے اب دو گھروں کا خرچ اٹھانا بھی آسان نہ تھا۔ پھر اللہ ہی نے ان کی مدد کی۔ میری خالہ جو شیخوپورہ میں گورنمنٹ ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں، تبدیل ہو کر 60-فیروز پور روڈ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تعینات ہو گئیں۔ جونہی ماچھا جی لاہور میں سیٹل ہو گئیں تو امی نے ان سے استدعا کی کہ وہ ہم دونوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔

سامان پہلے ہی 24-ایس کینال پارک سے رخصت ہوتے ہوئے گوجرانوالہ میری کزن طلعت (کٹو) لے گئی تھی، اب تھوڑا سا سامان لے کر ہم دونوں خالہ کے سکول پہنچے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے نہ سوچا کہ مجھے اتنی تعلیم کے ساتھ کچھ ملازمت تلاش کرنی چاہیے۔ ریزی نے کسی مستقل نوکری کے متعلق لمحہ بھر کو توجہ نہ دی۔ ہم خالص بیوہ کی اولاد تھے جن پر ایک محاورہ صادق آتا ہے۔

بیوہ کا پوت...... کنالی میں موت

• • • ● • • •

ملتان

(نانا کے پاس)

(ملتان)

(معرفت ڈویژنل انسپکٹرس آف سکولز بیگم ذاکر چٹھہ)

طوفانی سال

اشفاق صاحب کی زندگی میں 1950ء سے لے کر 1956ء تک بڑے طوفانی سال گزرے۔ جب وہ ہر لمحے راہوں کے مسافر تھے۔ میری جانب ان کے خطوں کی تیز رفتاری کا اندازہ آپ ان خطوں سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے میری والدہ اور بھائی کے نام ملتان میں لکھے۔

وہ لاتعلقی پیدا کرنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتے۔ کبھی تراڑکھیل، کبھی جہلم، کبھی کراچی جادھمکتے لیکن ان چھوٹے سفروں سے ایک شدید قسم کی محرومی اور تشنگی ان کے اندر در آتی حتیٰ کہ 1952ء میں انہوں نے ملک چھوڑنے کا اہتمام کیا اور 1955ء تک روم میں ISMEO میں اردو پڑھاتے رہے۔ یہیں انہیں اسکندر باؤسانی (Alessandro Bausani) سے خوب گہرا رابطہ بنانے کا موقع ملا اور پیٹر سانتریالی کو اردو پڑھانے کی خوشی حاصل ہوئی۔

میرا بھی ان طوفانی سالوں میں کچھ عجیب سا حال تھا۔ ان دنوں اردو کی پروفیسراں قریب قریب ناپید تھیں۔ مجھے لاہور کالج فار ویمن میں جاب آفر ہوئی تھی لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ عورت جب مالی طور پر خود مختار ہو جاتی ہے تو پھر شادی کے قابل نہیں رہتی۔ میرے لیے بھی بس ایک شادی کا خواب باقی رہ گیا تھا۔

کبھی میں ملتان چلی جاتی، جہاں میری والدہ ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ کبھی لاہور آجاتی کیونکہ میری والدہ کا کام کچھ ایسا تھا کہ انہیں دوروں پر جانا پڑتا۔ شک وگمان کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کسی ریسٹ ہاؤس میں اکیلا چھوڑ کر مطمئن نہ ہو پاتیں اور جلد ہی مجھے واپس لاہور بھیج دیتیں۔ جہاں انہیں یقین تھا کہ میرا بھائی کم از کم موجود رہتا ہے۔

ملتان میں میری والدہ کی رہائش دفتر کے ساتھ ہی ملحق تین کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک مرتبہ اشفاق صاحب ریزی سے ملنے کے بہانے وہاں بھی تین دن کے لیے آئے تھے۔ یہ خطوط اور ملنا ملانا گویا جمود کے پانیوں میں پتھر مار کر کو پھر بھنور صورت متلاطم کرنا تھا۔ مجھے ان کی توجہ سے غلط قسم کی امیدیں بندھ جاتیں۔ وہ امید نہ دلاتے ہوئے بھی دلا جاتے اور پھر گھر والوں کی ناراضگی کے بھوت سے خوفزدہ اور سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھتے۔

آپ کو میری گواہی درست تو نہ لگے گی لیکن میں بار بار آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ دوست دشمن اپنے پرائے کسی کی دلآزاری کرنے کے اہل نہیں تھے اور اسی درماندہ کوشش کی بدولت وہ کئی دل توڑنے کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ یوں سمجھیے ایک کمزور دل انسان کی اس کمزوری نے کتنے لوگوں کو اداس کر دیا؟

ملتان میں امی کی وساطت سے مجھے ڈاکٹر احمد خاں ملے۔ وہ ملتان ڈویژن کی سرکاری زمینوں کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن ہی کی وجہ سے میری والدہ کو زمینوں کا خبط ہوا اور انہوں نے زمینیں خرید لیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے عزت کا ایسا مقام پیدا کر رہی ہیں، جہاں کچہری میں زمیندار کو کرسی ملتی ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں شوقیہ ہومیوپیتھک علاج بھی کرتے تھے اور بہت عرصہ بعد جب ہم داستان سرائے میں رہتے تھے تو ایک روز وہ ہمارے گھر آئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور موہنی روڈ پر ان کا کلینک ہے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ کوئی ڈاکٹر احمد خاں تشریف لائے ہیں۔ میں انہیں وقتی طور پر بھول چکی تھی۔

''آپ؟...... آیئے اندر بیٹھیے۔''

''نہیں مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔ قدسیہ! میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ گھر پر کون بیمار ہے؟''

میں حیران رہ گئی۔

میوہسپتال میں ڈاکٹر طارق بن افتخار کی نگرانی میں اثیر میاں کا Liver Abces کا آپریشن ہوا تھا لیکن آپریشن کے باوجود بخار نہ اترا۔ وہ مضمحل پھرتا تھا۔

''جی اثیر...... میرا چھوٹا بیٹا۔''

پھر میں نے ساری تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے۔ تم اسے لے کر میرے کلینک پہنچو۔ میرے پاس ایک ایسی مشین ہے جس پر لہو کی ایک بوند رکھتے ہی دوائی خود بخود تجویز ہو جاتی ہے۔''

اول تو ڈاکٹر صاحب کا آنا کم معجزہ نہ تھا پھر لہو کی بوند سے دوائی کا تجویز ہو جانا اور بھی محیر العقول تھا۔ اب آپ کو کیا بتاؤں کہ ان کی ہومیوپیتھک دوا سے ہی اثیر صحت یاب ہوا۔

کچھ لوگ آپ کو جب ملتے ہیں تو اُن کی افادیت کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا فیض بہت بعد میں کھلتا ہے۔ کچھ لوگ آپ کو فل سٹاپ کے طور پر ملتے ہیں جیسے تبدیلی، دور اور واقعات کے ختم ہو جانے کی نوید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی مجھے ملتان میں ملے اور ان کی افادیت داستان سرائے میں جا کر کھلی۔

ایسے ہی خاں صاحب کی بابرکت ذات تھی۔ وہ مجھے کالج میں ملے اور افادیت ان کی داستان سرائے میں آ کر

تب جب میں نے ان کی مہربانیوں کا پورا بادل برستے دیکھا۔ یہ خطوط اس مہربانی کی اولین پھوار ہیں۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے پیش کیے دیتی ہوں۔

شقو جی (اشفاق صاحب) کے خطوط
والدہ بانو قدسیہ کے نام

دیال سنگھ کالج

لاہور

19 اکتوبر 1951ء

حضور امی جان!

اس خط کو بہت پہلے آپ کی خدمت میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ چند ناگزیر حالات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ جس روز آپ ملتان کے لیے روانہ ہو رہی تھیں میں سٹیشن پر گیا تھا اور گاڑی کے روانہ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک آپ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اگلے دن اثر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ دوسرے دن صبح کی بس سے عازم ملتان ہوئی تھیں۔

قدسیہ کی وہ کہانیاں جو ایک عرصے سے میرے پاس تھیں، اچانک طلب کر لی گئیں۔ ایک رات اثر صاحب تشریف لائے اور کہا کہ کاکی نے لکھا ہے کہ وہ افسانے اشفاق سے لے کر اُسے پہنچا دیے جائیں۔ میں نے بلا چون وچرا کہانیاں اثر صاحب کے سپرد کر دیں اور انہوں نے اسے مقام مقصود تک پہنچا دیا۔

ان کے استفسار پر کاکی نے بتایا کہ اشفاق کو ہر گھڑی میری اور میرے گھر والوں کی تذلیل مقصود ہوتی ہے اور وہ جان بوجھ کر ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے امی کہتا رہا ہوں جب میں نے آپ کو دیکھا بھی نہ تھا اور میں آپ کو اس وقت تک امی ہی سمجھتا رہوں گا جب آپ مجھے دیکھا نہ کریں گی۔ اگر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ارادی یا غیر ارادی طور پر آپ کی ہتک کی ہو یا آپ لوگوں کو ہیٹا سمجھا ہو تو میری دعا ہے کہ میری ایک بچی ہو اور میری آنکھوں کے سامنے سر بازار اس کی اوڑھنی اتر جائے۔ چوراہے پر اس کی عصمت دری ہو اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میری موجودگی میں بھرے مجمع میں اس کا نیلام ہو۔ آسمانوں سے لعنتوں کا نزول ہو اور زمین مجھ پر تھتکار ہو اور خدا کرے کہ آپ بھی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ اس کے سوا میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ آپ کے یا اس کے ہاتھوں میں ہے جسے عرف عام میں خدا کہتے ہیں۔

والسلام

نیاز مند

اشفاق

دیال سنگھ کالج، لاہور

7 دسمبر 1951ء

امی جان!

آپ کا خط مجھے بڑے انتظار کے بعد ملا۔ میں ہر کلاس پڑھانے کے بعد سٹاف روم میں اپنی میز دیکھا کرتا اس پر گوہر مقصود نہ ہوتا۔ آخر آخر تو میں ناامید سا ہو گیا تھا لیکن آپ کا اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے جواب ملا۔ پرسوں سے اور معظم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

آپ میرے لیے سویٹر بنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ اس مرتبہ مجھے کافی سویٹر مل گئے ہیں۔ ایک میں خرید لیا ہے اور مواد ضرورت سے زیادہ فراہم ہو گیا ہے۔ اگلی سردیوں پر اگر زندہ رہا تو پھر آپ ہی سے درخواست کروں

اور کیا لکھوں۔ نہ کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے اور نہ میں ہونے ہی دیتا ہوں۔ آج طبیعت خراب سے چھٹی لے لی ہے۔ سٹاف روم میں بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا ہوں۔

تئیس تاریخ کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔ دیکھیے کب آتی ہے اور کیا لاتی ہے۔

میرا جی اس نوکری میں نہیں لگتا لیکن لاہور رہنے کے لیے اور سگریٹوں کا خرچ چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی نکالنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے جب سے سردیاں شروع ہوئی ہیں، ایک مرتبہ بھی کٹ کیٹ نہیں کھائی۔ آپ آئیں لائیں گی تو کھاؤں گا اور کسی کو نہیں دوں گا۔

آپ کا اپنا

شفقو

ڈی۔ ایس۔ کالج

لاہور

18 فروری 1952ء

امی جان!

میں کل آپ سے ملنے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ جا چکی ہیں۔ یوں تو میں دو تین گھنٹے وہاں بیٹھا لیکن وہ رہی تھی۔ آج طبیعت خراب تھی۔ اس پر اباجی نے ذرا سختی کی اور میری حالت غیر ہو گئی۔ گھر سے کالج آیا ہوں لیکن لے رکھی ہے اور لائبریری میں بیٹھ کر لائبریرین کے قلم دوات سے یہ خط لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں میں اور کالج میں ایک فرق تو ضرور ہے کہ..... لیکن میں آپ کو پریشان کیوں کروں۔

پھر کبھی لکھوں گا جس دن میرا ذہن میرے قلم کا ساتھ دے گا۔

آپ کا

شفقو

لاہور

7 اگست 1952ء

امی جان!

آپ کے تار کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے پتہ تھا اس دن آپ مجھے ضرور یاد کریں گی۔ اس لیے میں کچھ

...نے کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گھر آتا رہا۔

افسوس زندگی کے کتنے ہی سال رائیگاں گئے اور میں کسی کے کام نہ آسکا۔ نہ اپنے نہ اوروں کے! جب بھی کا کا ...شکایت ہوتی ہے تو وہ اسے افسانہ نگاری پر محمول کرتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ بات میرے جی سے نکلتی ہے۔

آپ لوگوں سے جو کچھ ملا ہے، اس کا تذکرہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے لیکن میری تنگ دامانی کو ہمیشہ شکوہ رہا کہ ... وسعت کے تصور سے واقف نہ ہوسکی اور مجھے اپنی کم نصیبی سے شکایت رہی۔

آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں لیکن مجھ پر ایک ہی خوف سوار رہتا ہے کہ کہیں مستقبل کی نحوستیں ...ٹ نہ لیں اور میں ویسے کا ویسا رہ جاؤں جیسا ماضی میں تھا۔

آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے شاید یہ آرزو جلد ہی پوری ہو۔ حال میں یا مستقبل قریب میں۔

والسلام

شفو

D.S.College

Lahore

2اپریل1952ء

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

امی جان سلامِ محبت!

ایک شام جب میں پرویز کو ایک ضروری چٹھی دینے کے لیے گیا تو وہ روح فرسا خبر ملی جس کی توقع نہ تھی اور جس ...میں تو کیا شاید آپ لوگ بھی تیار نہ تھے۔ ماچھا کو میں نے تین مرتبہ دیکھا تھا اور تینوں بار سینما میں۔ ایک بار حفیظ ...کی اور پوتر ماچھا کی دعوت کی تھی اور مجھے بھی بلایا تھا۔ دوسری مرتبہ جب میں اتفاق سے ریگل سینما میں موجود تھا اور ...اور آخری مرتبہ جب قمر صاحب کو کاکی سے کچھ کام تھا اور اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم پلازہ پہنچے تھے۔ پہلی اور ...ملاقات میں ان سے شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو۔ اسی قدر یاد ہے کہ انہوں نے مجھے محبت اور شفقت کی نگاہوں سے ...تھا اور میری بات کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسری دفعہ ان سے البتہ کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر فلم سے اور میرے حوصلے سے متعلق تھیں۔ میں Under Capricorn دیکھ کر از بسکہ متوحش ہوا تھا اور انہوں نے اسے کھیل جانا تھا اور مجھے بھی تلقین کی تھی کہ فلم کو فلم ہی ...سمجھوں۔ اگر جانتا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے تو اور بھی باتیں کرتا اور بھی یادیں جمع کرتا۔ ان کا چہرہ ذہن میں لاتا ...ہوں تو آ جاتا ہے مگر دھندلا سا اور ایسا ناپائیدار بن کر کہ زیادہ دیر تک کیفیات کے چکر میں نہیں رہتا۔

میں اس مختصر سی زندگی میں بہت سے تجربات کر چکا ہوں اور ان گنت چیزیں میرے مشاہدے میں آتی رہی ہیں ...کسی واقعے یا سانحے نے مجھے طرب پسند (Optimist) نہیں بنایا۔ ہم مشرق کے رہنے والے اکثر و بیشتر تقدیریے

ہیں اور قسمت کے پجاری ہیں۔ میں بھی لکھے کا قائل ہوں اور ریکھا کا ماننے والا ہوں۔

ماچھا کی وفات پر عمر خیام کی ایک بھولی بسری رباعی یاد آ گئی۔ اب یہ کئی دنوں سے میرے دماغ پر چھائی ہے اور خدا جانے کب تک چھائی رہے گی۔ آپ کی نگاہوں سے یقیناً گزری ہوگی لیکن اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ کو تسکین دینے کے لیے لکھتا ہوں۔

He moving finger writes; and having wit

Move on; nor all thy Piety nor wit

Shall lure it back to Cancal half a live,

Nor all thy Tears wash one word of it.

نہ آہوں کی دھند سے لکھا ہوا مٹتا ہے نہ آنسوؤں کے ریلے سے ہونی کے انمٹ دھبے ہیں پر کیا کیا جائے

جو تجھ سے چھٹ گئے ہیں ان کے آنسو آ ہی جاتے ہیں

کلیجہ دکھ ہی جاتا ہے تری یاد آ ہی جاتی ہے

میں تو اس جہان کے معمولی سے معمولی کام کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ یہ تو موت ہے۔ موت بیگانے کی بھی یگانے کی میرے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہے۔ صبر کی تلقین کرنا میرے مشرب میں نہیں۔ میں تو کہتا ہوں افسوس کرو جی بھر کے کرو لیکن ہمت شرط ہے!

نیلو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ امید ہے آپ عنقریب آئیں گی۔ تقو میاں آیا ہوا تھا۔ آج چلا گیا ہے۔ آپ کو خط لکھنے کو کہہ رہا تھا۔ دیکھوں لکھتا ہے کہ پھر بھول جاتا ہے۔

کوشش مسلسل ہست دیر شاں چو زلف یار

عیم مکن کہ در شب ہجر نوشتہ ام

خادم

شفو

امی جان!

آپ کا محبت نامہ ملا، میں کل بھی آپ کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کر چکا ہوں۔ اُمید ہے نظر سے گزرا ہوگا۔ آپ نے جس محبت اور خلوص سے میری روانگی کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس نے بلکہ مجھ پر الٹا اثر کیا اور میرا جی یہیں کا ہو رہنے کو کرنے لگا۔

روپوں کے بارے میں مَیں اس قدر پریشان نہیں ہوں۔ صرف ایک ہزار روپے کی ضرورت تھی، سو پوری ہوگئی۔ آپ ہرگز ہرگز تردد نہ کیجیے گا اور کاکا کو زمین فروخت کرنے کا مشورہ نہ دیجیے گا۔ کپڑے میرے پاس بہت کافی ہو گئے ہیں۔ صرف ایک جوتا اور ایک سوٹ کیس خریدنا باقی ہے۔ ان دونوں کے لیے آپ کو یا کاکا کو ضرور زحمت دوں گا۔ باقی سب ٹھیک ہے۔

وہاں پہنچ کر تو عزت سے بسر ہوگی۔ ماہ بہ ماہ تنخواہ ملا کرے گی اور اس کے علاوہ یقیناً کسی فلم کمپنی سے مکان کے
سمجھوتہ ہو جائے گا۔ کار لینے کا ارادہ میرا بھی ہے لیکن اپنے اندوختہ سے لوں گا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے
دعائیں مجھے بڑا آدمی بنا دیں گی، بہت بڑا آدمی لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈر بھی لگتا ہے کہ بڑا آدمی بن کر میں اُن لوگوں
جاؤں جو دل و جان سے مجھے چاہتے رہے ہیں۔
عابد صاحب نے یونیورسٹی روم کو خط لکھ کر میری خدمات انہیں سپرد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں
موصول نہیں ہوا۔ بس اس کا شدت سے انتظار ہے۔ یکم اکتوبر میں انشاءاللہ لاہور چھوڑ دوں گا اور پھر اس کے
بعد آپ کا اور اپنا آبائی وطن بھی۔
ایک مرتبہ پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کسی معاملے میں بھی پریشان نہ ہوں۔ افتخار بھائی نے بخشن خاں سے ڈیڑھ
بھیج دیا ہے۔
کا کا اور کا کی کو پیار۔

والسلام

خادم

شفقو

میری پیاری امی کو میرا اسلام پہنچے۔
پرسوں آپ کا خط ملا۔ باوجود اس کے کہ یہ کا کی والے خط کی پشت پر رقم تھا، میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا
ٹیشن کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر مزے مزے سے چائے پیتا رہا۔ جتنی مرتبہ میں نے آپ کے خط کو دیکھا گالوں سے لگایا
تنی دیر میں کینٹین میں بہت سے گاہک آئے اور چلے گئے لیکن میں بدستور اپنی جگہ پر جما رہا۔
جاتی دفعہ میں نے بیرے کو ڈبل ٹپ دی یعنی بیس لیرے (پورے دو پاکستانی آنے) اس پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ
سکتا۔ اس نے دو مرتبہ جھک کر سلام کیا اور تین دفعہ گراتسے (شکریہ) کہا۔ جب میں اپنا تھیلا اٹھا کر جانے لگا تو چونکہ
خبر ہو گئی تھی کہ پاکستان پروگرام والے نے بیس لیرے ٹپ کیا ہے، اس لیے ہر ایک نے یک زبان ہو کر ''بونا
کا سلام) کہا۔
اس رقم سے آپ کو یہاں کی ٹپ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ روم کے ہوٹلوں کی سب سے اچھی بات یہی ہے کہ یہاں
سے زیادہ سو لیرے (آٹھ آنے) ٹپ دی جاتی ہے اور جو سو لیرے دیتا ہے۔ یہ لوگ اس کا اوورکوٹ اُترواتے ہیں،
تے ہیں، چھتری لا کر دیتے ہیں، آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہیں اور ٹیکسی بلوا کر دیتے ہیں۔
یورپ کی کافی تکلیف دہ بات یہاں کی سردی اور بارش ہے۔ پتہ نہیں کب بارش ہونے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ
چھتری ہے۔ ہر ایک کے جسم پر برساتی ہے۔ اچانک ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ جل تھل ہو گیا اور گھڑی بھر میں
سڑکیں بالکل خشک ہو گئیں، گویا صدیوں سے بارش نہ ہوئی ہو۔
ککڑی یہاں بہت سستی ہے۔ ایک دن میں نے دریافت کیا تھا۔ بارہ آدمیوں کے کھانے کے نہایت نفیس

چھری کانٹے اور چمچ ایک خوبصورت مخملی بکس سمیت 33 روپے میں مل جاتے ہیں۔ اس سے گراں قیمت چیزیں بھی ہوتی ہیں اور اُن سے کم قیمت بھی۔ سبزی اور پھلوں کے معاملے میں یہ خطہ بہت خوش قسمت ہے۔ پاکستان کے سبزیاں زیادہ شاداب اور بہت سستی ہیں۔

پھل اتنے ہیں کہ جگہ جگہ ریڑھیاں نظر آتی ہیں۔ مونگ پھلی (چونکہ میں صرف یہی خرید سکا ہوں) زیادہ مزیدار مجھے اب تک کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ انگوروں کا تو اصلی گھر یہی ملک ہے۔ سفید انگور سے سیاہ زیادہ ہے۔ بگوگوشے یہاں کی خاص سوغات ہیں۔ نارنگیں اور مالٹے بے شمار و بے حساب ہیں۔ سیب سرخ آٹھ آنے ہے اور زرد تین آنے کا۔

ڈیری کا خالص مکھن والا دودھ چھ آنے کا ایک سیر ہے۔ دہی بارہ آنے سیر ہے۔ مکھن کی قیمت لیکن آپ منوں کے حساب سے خرید سکتے ہیں۔ قیمت دودھ دہی سے اندازہ کر لیجیے۔ انڈہ چھ پیسے کا ایک ہے۔ روپے کی۔ گوشت گائے کا البتہ مہنگا ہے۔ کوئی ساڑھے تین روپے سیر، سور کا گوشت اس سے بھی گراں ہے لیکن گوشت سستا ہے اور میں ان دنوں غالباً گھوڑے کا گوشت ہی کھا رہا ہوں۔ نہایت بدمزہ اور بے کیف ہوتا ہے۔

اگر کسی شخص کا اپنا گھر ہو تو زندگی بن جاتی ہے۔ باورچی خانوں میں گیس استعمال ہوتی ہے۔ اس کا روپے سے زیادہ نہیں اٹھتا (ماہوار) بجلی اس سے بھی سستی ہے اور ٹیلی فون کا بل ڈھائی روپے مہینہ بنتا ہے۔ جس چار کمرے ہوں یعنی ایک کھانے کا کمرہ، ایک ڈرائنگ روم، ایک سلیپنگ روم (مع دو پلنگ بستر) ایک متفرق کمرہ باورچی خانہ، ایک غسل خانہ، اس کا کرایہ سواسی روپے تک ہوتا ہے۔

مالک مکان ہر پیر کو بستر کی چادریں تبدیل کرتے ہیں اور ہر تیسرے دن دو تولیے بہم پہنچاتے ہیں۔ بہت سستی ہے۔ فی ٹرپ سٹیشن ویگن چار ہزار میں ملتی ہے۔ خواہ نقد لے لیجیے خواہ پچاس روپے ماہوار قسطوں پر۔ آنے میں ایک کپ اور خالص انگور کی شراب آٹھ آنے سیر۔ مچھلی عام ہے اور بہت سستی۔ زیتون کا تازہ تیل گھی سے مزیدار اور مکھن سے زیادہ صحت بخش ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی بارہ آنے سیر کے حساب سے ملتا ہے۔

یہاں اگر کوئی چیز مہنگی ہے تو وہ مکان ہے یعنی ڈیڑھ سو یا ایک سواسی روپے کے قریب لیکن بڑا ہوا دار ہوتا ہے۔ اب لیجیے نہانے کا خرچ۔ ایک مرتبہ گرم پانی اور صابن تولیے کے ساتھ نہانے پر ایک روپے خرچ اٹھتا اس میں پابندی یہ ہے کہ آپ تین گھنٹے لگاتار سے زیادہ نہیں نہا سکتے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں ایک مرتبہ نہا چینی کے اتنے لمبے ٹب میں لیٹ کر پھر اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نیند سی آنے لگتی ہے اور ہاتھ پاؤں کھل جاتے ہیں صابن اپنا ہو تو کوئی بارہ آنے دینے پڑتے ہیں اور بعد میں دس لیرے (ایک آنہ) اُس عورت کو دیئے جاتے ہیں کے دروازے پر خدمتگار بن کر کھڑی رہتی ہے۔

مکانوں سے زیادہ مہنگی چیز ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے عزیزوں کو لکھنے کے لیے ایک لیرے چاہئیں اور مجھ ایسا آدمی جسے یہاں روم میں بھی افسانے مانگنے والے نہیں چھوڑتے' قریباً ہر روز ایک خط لکھنا پڑتا باقی روم ہر طرح سستا اور اچھا شہر ہے۔ لوگ بڑے غریب اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ گاہے سڑکوں پر مانگنے

لیتے ہیں۔ انگریزوں والی اکڑ ان میں ہرگز نہیں۔ لڑتے بالکل نہیں، تلخ کلامی تک ہی معاملہ رہتا ہے۔ کسی کو تھپڑ قتل کرنے کے برابر ہے۔

یہاں کی سب سے بڑی گندی اور فحش گالی "جا دفع ہو جا" ہے۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہہ دے تو پھر مرنے مارنے ہوتے ہیں۔ جزیرہ سسلی کے رہنے والوں کے لیے سب سے بڑی گالی یہ "جا جا کے صابن کھا" یہ سن کر تو کوئی سسلی آپے میں نہیں رہتا۔ اگر آپ چوراہے پر کسی سپاہی کو مخاطب کر کے راستہ پوچھیں گے تو وہ دونوں ایڑیاں جوڑ کر آپ کو فوجی سلام کرے گا۔ پھر کہے گا فرمایئے حضور! چالان کے لیے کچہری نہیں جانا پڑتا۔ سپاہی چوراہے پر ہی رسید دے دیتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ یعنی تین سولیرے بہت بڑا چالان ہے۔

تیس ہزار لیرے پانے والا اچھا افسر ہوتا ہے۔ پچاس ہزار لیرے گزٹیڈ آفیسر کی تنخواہ ہے۔ اور ستر ہزار لیرے تصور کیا جاتا ہے۔ اوورکوٹ ڈیڑھ سو روپے میں بنتا ہے اور ہمارا گرم سوٹ ایک سو دس روپے میں اور اگر یک مشت ادائیگی کر دے تو اسے رئیس آدمی خیال کرتے ہیں۔

پاکستان کو یہ لوگ محض اس لیے امیر ملک تصور کرتے ہیں کہ سر آغا خاں کراچی کا رہنے والا ہے اور ہماری اس تے ہیں کہ ریٹا ہیورتھ پاکستان کی بہو ہے۔ موقع ملتا ہے تو اجنبیوں خاص طور پر امریکیوں اور پاکستانیوں سے لے لیتے ہیں۔ دکانیں مال روڈ والی بھی ہیں، انار کلی والی بھی اور ڈبی بازار والی بھی۔ اگر "دینا ہے تو دو ورنہ دکاندار دام کم بھی کر دیتے ہیں اور جلد ہی کر دیتے ہیں۔

یہاں کی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ بیویاں دوسرے مردوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں اور خاوند اور عورتوں کی شام کے وقت دریائے ٹائبر کے کنارے اپنے دوست کے ساتھ بوس و کنار کرتی ہے۔ بارہ بجے رات پہنچ جاتا ہے۔ گو کافی لوگ شراب پیتے ہیں لیکن شراب نہ پینے والے کی عزت کرتے ہیں اور اسے اچھا سمجھتے علاوہ اور کیا لکھوں میں تو اب تک یہی کچھ دیکھ سکا ہوں اور اسی حد تک محسوس کر سکا ہوں۔

امی! کاکی بھلا میرے خط پڑھ کر کیوں روتی ہے اور اس نے گھلنے والا رویہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ اگر وہ یہ سمجھتی مر چکا ہوں تو اسے تلاوت کرنی چاہیے اور ہر روز فاتحہ پڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھانے چاہئیں اور اگر زندہ سمجھتی ہے شعوری طور پر اسے کبھی ایذا نہیں پہنچائی اور لاشعوری طور پر کبھی سکھ نہیں دیا لیکن میں کیا کروں امی یہ تماشا سمجھتی ہیں) آپ سے آپ بن گیا ہے۔

میں یہاں اکیلا بالکل اکیلا بے یار و مددگار زندگی کے دنوں کو دھکے مار مار کر آگے لڑھکا رہا ہوں۔ پتہ نہیں ابھی اور میری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ امی! آپ دل پر ہاتھ رکھ کر میری قسم کھا کر سوچیں کیا میں برا ہوں؟ اور اگر کہے تو بس مجھے ایک خط میں یہ ایک لفظ لکھ کر بھیج دیجیے۔ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس کے بعد آپ اس کی شکل نہ دیکھیں گی۔

کبھی کبھی میں اپنے آپ کو بے ایمان اور بددیانت بھی تصور کرنے لگتا ہوں لیکن آپ کی محبت اور شفقت اس نہیں دیتی۔ آپ کے اس خط نے مجھے اپنی نگاہوں میں چور سا بنا دیا ہے اور میں اس وقت سے لے کر اب

تک سوچ رہا ہوں کہ شاید امی کی بات ٹھیک ہی ہو۔ پہلے مجھے اپنے دیس میں اپنے آپ سے شدید نفرت تھی، اب میں بھی مجھے اپنے وجود سے گھن آنے لگی ہے اور جرم کا احساس قوی تر ہو گیا ہے لیکن امی! میری امی! کیا تم بھی مجھ سے جاؤ گی؟

اگر ایسا ہوا تو مجھ پر موت بھی حرام ہو جائے گی اور میں...... لیکن امی یوں نہ ہونے دینا۔ بس میرا جی رکھنے لیے جھوٹ موٹ کہہ دینا کہ میں برا نہیں ہوں اور امی اُسے سمجھانا اتنا سمجھانا کہ وہ سمجھ جائے اور اگر اس کا رویہ نہ میں اس سے بڑا سخت انتقام لوں گا۔ جس مٹی سے وہ بنی ہے تقریباً اسی مواد سے میرا خمیر اٹھا ہے۔ اگر اس نے کی تو وہ وقت بہت قریب ہو جائے گا جب چلتے پھرتے اجسام آنسوؤں کے وجود بن جایا کرتے ہیں۔

آپ کا

شو

میری صحت پہلے سے دوچند بلکہ دہ چند ہو گئی ہے۔ ثبوت کے طور پر اپنی تازہ تصویریں بھیج رہا ہوں۔ آنکھوں کے نیچے وہ حلقے رہے ہیں اور نہ چہرے پر سلوٹیں ہی! کیا آپ بھی مجھے اپنی تازہ تصاویر بھیجیں گی؟

رومتہ الکبریٰ

(تاریخ پتہ درج نہیں کیا ہے)

امی جان!

آپ کا ایک خط ملتان سے، ایک خط پتہ نہیں کہاں سے کل ایک لفافہ لاہور سے موصول ہوا۔ اب میں اصول بنا لیا ہے کہ مختصر لکھوں گا مگر لکھوں گا ضرور۔ باقاعدگی سے اور ہنرمندی سے۔ لوگ پہلے ہی مجھ سے ناراض ہیں مزنگ والوں کے ساتھ تو میں نے خاصی زیادتی کر رکھی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سامان کا درپیش ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا پیک کیسے کروں اور کس کی مدد آپ دور ہیں، ریزی دور ہے اور کا کی صاحبہ کو اپنے ڈرامے کی فکر ہے۔ پتہ نہیں اس نے یہ مصیبت اپنے گلے کیوں لی ہے۔ میں اپنی ایک پریشانی میں مبتلا ہوں، دوسرے اس کی کامیابی کا تردد ہے۔ خواہ مخواہ بڑی بڑی باتوں میں دخل لگ جاتی ہے اور مجھے پریشان ہونے کے لیے کھونٹے سے باندھ دیتی ہے۔ اللہ اس کو ہدایت دے۔

ان دنوں ہر لمحہ ریزی یاد آتا ہے۔ میری کتابیں، جنہوں نے میری ساری کمائی ہڑپ کر لی ہے اس وقت پھاڑے میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اُن کو کیسے پیک کروں اور کس طرح بک کراؤں؟ اگر ریزی یہاں ہوتا تو مجھے مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اگر آپ مجھے خط لکھنا چاہیں تو 20 دسمبر تک یہیں روما لکھیں۔ اس کے بعد آپ کا خط میں آپ کے خط کو نہ مل سکوں گا۔

کل اپنی فرنچ کی اُستانی کو سلام کرنے گیا تو اس نے زبردستی کرسی پر بٹھا کر کاغذ سامنے رکھ دیا اور بولی مرتبہ recitation لکھتے جاؤ۔ دیکھوں کتنی غلطیاں کرتے ہو۔ میں نے کہا اُدھر قدسیہ ڈرامہ کر رہی ہے، میرا دماغ نہیں ہے۔ پر وہ نہ مانی اور مجھے لکھتے ہی بن پڑی اور تو اور ''باوجودیکہ'' Malgre کے سپیلنگ بھول گیا۔ اس پر

ہم سب کو معاف کرے۔ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اس کے خاوند نے مداخلت کر کے معافی دلوائی۔ خدا کی قسم
ے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ اطالوی زبان اور ادب کا جو امتحان دیا تھا اس میں تیس میں سے 28½ نمبر آئے۔
بچے لائق بچہ ہوں کہ نہیں؟

اور امی! آپ کا کی سے نہ بولا کریں۔ بہت بری لڑکی ہے۔ اس نے مجھے ایسے ایسے خراب خط لکھے
یقین نہیں آتا کہ یہ سب باتیں اس کے دماغ سے اُتری ہیں۔ آپ کی زمین کا کیا حال ہے؟ ہم وہاں شکار
آپ جائیں گے؟ ریزی کو پیار (اگر اس نے حجامت بنائی ہو اور اس کی ڈاڑھی نہ بڑھی ہو تو بے شک میری
ے منہ بھی چوم لیجیے گا۔)

آپ کا
شفقو

پوسٹ بکس 509
لاہور
4 ستمبر 1952ء

امی جان! آپ کے دونوں خط بہ یک وقت ملے۔ اُن کا مفصل جواب اگلے دن پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت
پاس پرویز بیٹھا ہے اور اس پر "ملک شیک" پینے کا موڈ سوار ہے۔ مجھے بھی ساتھ لیے جا رہا ہے۔ اس لیے تفصیلاً لکھنے
سے قاصر ہوں۔

آپ پیسوں کی فکر ہرگز نہ کریں۔ اکیس تاریخ کو جب آپ آئیں گی تو مجھے پانچ سو روپیہ دے دیجئے گا۔ اس
سے پہلے مجھے ایک دھیلے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی ابھی روما سے خط آیا ہے۔ ان لوگوں نے BOAC کی وساطت سے
ٹکٹ خرید لیا ہے جو مجھے عنقریب پہنچ جائے گا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے ہوائی سفر ہی اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ یہی اُن لوگوں کی خواہش ہے۔ آپ
فکر نہ کریں مجھ ایسے سخت جان کو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

فی الحال آپ میری عیدی بھی اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں آپ سے دستی وصول کروں گا۔ منی آرڈر نہ کیجیے گا۔
اچھی چیز ہے لیکن مزنگ روڈ والے اچھے لوگ نہیں۔ بہر کیف جو جی میں آئے کیجیے۔

والسلام
آپ کا
شفقو

لاہور
18 اکتوبر 1952ء
میری پیاری بقلم خود امی!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ میں اور آپ کے پاس آنے کی کوشش نہ کروں!

خدا گواہ ہے آپ سے ملنے کو تو بہت جی چاہتا ہے لیکن......

اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ خواہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو

آپ کے پاس پہنچوں۔ اُمید ہے اسی ہفتہ کے اندر یہ تمنا پوری ہو گی۔

گمان غالب ہے آپ اپنے ہیڈ کوارٹر ہی میں ہوں گی۔

اور کیا لکھوں؟ بہت سی باتیں ہیں جو میں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔

اُن کا علم میرے سوانح نگاروں کو بھی نہ ہو گا۔

آپ کا ایک ہی

ناخلف بیٹا

شقو

روما

2 دسمبر 1952ء

محترم امی جان!

ابھی میں ایک خط قدسیہ کے نام لکھ کر پوسٹ کر چکا ہوں۔ اُسے سپردِ ڈاک کرنے کے بعد خیال آیا کہ مجھے آپ کے نام لکھنا چاہیے تھا۔ وہ بھلا کیونکر میرے خط کا جواب لکھے گی۔ خدا کرے میرا خط پہنچنے تک اسے بالکل آرام ہو اور وہ اس قابل ہو چکی ہو کہ مجھے اپنی تحریر میں جواب لکھے۔

لیکن خدانخواستہ اگر یوں نہ ہو تو آپ مجھے واپسی ڈاک اس کی صحت اور تندرستی کے بارے میں لکھیے گا۔ یہاں آپ کا خط پا کر کافی پریشان ہو گیا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کا اگلا خط آنے پر یہ پریشانی دور ہو جائے گی۔ (انشاء اللہ)

میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں اتنی ٹھنڈ نہیں ہے جتنی لندن میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے موٹا سا اوورکوٹ سلوا لیا تھا۔ بس میں یا ٹرام میں سردی ہرگز نہیں لگتی۔ ریڈیو کے سٹوڈیو اور کلاس کے کمرے بجلی کے دانوں سے گرم کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہاں بھی کوٹ اتار کر کام کرنا پڑتا ہے۔

لینڈ لیڈی نے بڑی موٹی سی رضائی اوڑھنے کو دے رکھی ہے۔ اس لیے کسی مقام پر بھی سردی لگنے کا احتمال نہیں۔ صحت پہلے پہل ماحول کی ناموافقت کی وجہ سے گرنے لگی تھی، اب سنبھل گئی ہے۔ پھل بھی کھاتا ہوں اور دودھ بھی پیتا ہوں لیکن ریڈیو پر راولپنڈی ریڈیو جیسا کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ذہنی ورزش ہو جاتی ہے۔

آپ کو مفصل خط پھر کسی وقت تحریر کروں گا۔ اب شام چھا رہی ہے اور لوگ گھروں سے نکل کر تفریح گاہوں کلبوں کو جا رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں یہ چند سطور جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں۔

پرویز ان دنوں کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ لکھتے رہا کیجیے گا۔ وہ میری بات نہیں

...یت ہے لیکن وہ مجھے سب سے عزیز ہے۔

میرے نام سے پہلے پروفیسر ضرور لکھا کریں (معاف کیجیے گا) اس لیے کہ جس مینشن میں مَیں رہتا ہوں، وہاں سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ میرا نام ادا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر میرے نام کا ایک حصہ سمجھے گا کیونکہ اگر یہ نہ لکھا ہو تو ڈاکیہ بہت پریشان ہوتا ہے اور ہر ایک سے پوچھتا ہے اسحافاک کون ہے؟

والسلام

خادم

شفقو

روما

14 اپریل 1953ء

میری پیاری امی!

مجھے آپ کے دونوں خط ملے۔ ان دنوں چونکہ نظامی یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے انہیں سیر کے لیے ادھر ادھر جانا پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جواب میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ کے ڈیڑھ سو روپے مجھے بہت دن ہوئے مل گئے۔ اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

کاکی کے ساتھ میرا حساب چلتا ہے۔ آپ خدا کے لیے عید وغیرہ کے تحفہ کا سوال پیدا نہ کیجیے۔ میں نے ...ے ...نگے تھے۔ آپ سے تو میں پہلے ہی اس قدر شرمندہ ہوں کہ خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ خیر یہ تفصیلی بات ہے، پھر ... کروں گا۔

آپ کو زمین اور پرویز فارم کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میرے آنے تک تو اس میں فصل لہلہا رہی ہوگی۔ آپ نے مجھے لکھا کہ پانی کب نکلا ہے۔ مجھے فکر ہے کہ اس علاقے کا پانی فصلوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ خدا کرے ہمارے فارم کے لیے پانی میٹھا نکلا ہو۔ سانپ کے من کی بابت ابھی میں نے دریافت نہیں کیا۔ پرسوں پوری تفصیلات روانہ کروں گا۔

ملتان کے بشپ صاحب نے جو خط یہاں لکھا تھا وہ میں نے بھی پڑھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس طرح روپیہ بھیجنے ...ے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ وہ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ آئندہ ہرگز مت۔

مجھے ریڈیو روم نے Foreign Service کے Best اناؤنسر کے طور پر دو سو روپیہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھیے آپ مجھے اور پرویز کو نکما کہا کرتی ہیں۔ میں نے اکتالیس اناؤنسروں میں نام پیدا کیا ہے۔ مجھے شاباش دیجیے۔ گو یہ نام اور میرا کام میری صحت برباد کر گیا لیکن اکیلا کام ہی اس کی وجہ نہ تھی اور بھی دکھ ہیں...... اب مجھے شاباش دیجیے اور خوش ہو جائیے کہ میں محض سفید معظم نہیں ہوں۔ کیوں امی؟

میں نے ناچ سیکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ لڑکی جو میری پارٹنر بنتی تھی، اس کی ٹانگیں اور ٹخنے چھل گئے۔ بیچاری تھک گئی اور میرا ناچ ادھورا رہ گیا۔ استانی نے کہا تو میرے ساتھ ناچا کر۔ ایک دن اس کے ساتھ ناچا تو نیچے استانی اور اوپر

میں۔ وہ پتہ نہیں فرنچ میں مجھے گالیاں دینے لگی یا شاباش کہنے لگی۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں گیا۔

روم میں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ سردی چند دن کے لیے دور ہوئی تھی اب پھر بڑھ گئی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یورپ مجھ کو قلفی بنا دے گا۔

آپ کب تک ملتان میں ہیں اور اس کے بعد کس جگہ پر لگنے کا ارادہ ہے؟ یہاں کا محکمہ تعلیم تو بہت اچھا ہے۔ مثلاً مجھ ایسے غریب پروفیسر کو سینما، تھیٹر، کلب اور نمائشوں میں کہیں آدھے داموں پر اور کہیں مفت جانے کی اجازت ہے۔ دفتروں میں ہیرا پھیری بھی نہیں ہوتی۔

میری صحت بہت اچھی ہے۔ تازہ فوٹو کھنچواؤں گا تو بھیجوں گا۔ جانی ماموں کو بہت بہت سلام۔ وہ بہت یاد آتے ہیں اور ان کی باتیں ہمیشہ یاد آتی ہیں۔

آپ کا باورچی جو جیب میں دھنیا اور نمک چرا کر لے جاتا تھا اُس کا کیا حال ہے؟ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔

پرویز کی صحت کا کیا حال ہے۔ آپ اس کو زیادہ کام نہ کرنے دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بہت ہی حساس لڑکا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کا اُس پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر اس کی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور مجھے ہر دم اُس کی فکر رہتی ہے۔

آپ کے پاس وقت ہو تو جواب ضرور دیجئے گا۔

والسلام
آپ کا
شفقو

روم
8 جون 1953ء

میری پیاری امی!

خدا آپ کو لمبی عمر عطا کرے کہ آپ ہی ہم ایسے بے نوا لوگوں کا سہارا ہیں۔ ابھی آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ایک تو میرے دیس کا چھ پیسے والا لفافہ تھا جسے دیکھے ایک جگ بیت گیا تھا اور ایک ایئر لیٹر جو میرے لیے زندگی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ کا ایک محبت نامہ مجھے ملا تھا لیکن میں حسب دستور جواب نہ دے سکا۔ کبھی کبھی آپ کے ساتھ اپنی بے وفائیوں کو محسوس کر کے شرم آنے لگتی ہے لیکن کوئی میرے دل میں کہتا ہے کوئی بات نہیں اپنی امی ہی تو ہیں اور ہاں اگر ہم نے آپ کے ساتھ لاڈ نہ کیا تو اور کس کے ساتھ کریں گے؟

آپ نے مجھ کو اس مختصر سی زندگی میں اس قدر پیار بخشا ہے کہ یہ میرے لیے ساری زندگی کافی ہوگا۔ آپ کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ یاد آتا ہے اور امی مجھے اس وقت تو آپ بہت ہی یاد آتی ہیں جب ہوٹل کا بیرا شوربے کی پلیٹ ایک اور گرم پانی کی پلیٹ میں رکھ کر لاتا ہے۔ میں ہنس دیتا ہوں تو وہ پوچھتا ہے "Ricorda Mama"

...ہے ہو؟) اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں ہاں تھوڑا تھوڑا کیونکہ جب کسی کو زیادہ یاد کرتا ہوں تو پھر سگریٹ ... دیتی۔

آپ کی دو تصویریں میرے پاس ہیں۔ ایک میں آپ لکڑی کے پرانے (24-ایس کینال پارک والے) تخت ...ب چھیل رہی ہیں۔ یہ فوٹو میں نے اُتارا تھا اور دوسری میں آپ کا کی کے ساتھ کھڑی ہیں۔ یہ تصویر مجھے یہاں ...۔ دونوں تصویریں میری لکھنے والی میز کے سامنے دیوار پر لگی ہیں۔ میں نے اُن کو فریم نہیں کروایا۔ بس یونہی ... دیوار سے آویزاں کر دیا ہے۔

...اور امی! آپ نے یہ کیا کیا کہ فادر کو سو روپے اور دے دیئے۔ میرے پاس تو بہت سی رقم جمع ہو گئی ہے۔ اب تو ...ہے کہ آپ کو عید پر کچھ بھیجا کروں۔ الٹا آپ مجھے دیئے جا رہی ہیں۔ سچ مچ مجھے اس وقت روپے کی ضرورت ... جب پڑی تھی میں نے آپ سے مانگ لیا تھا۔ خدا کے لیے مجھے شرمسار نہ کیجیے۔ واقعی میں کسی جوگا ...ں کی نہ امی کی کوئی خدمت کر سکا۔

اور نہ ہی...... اور امی بھلا کا کی اداس کیوں ہے۔ ایسا تو نہیں چاہیے۔ میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ نہ کسی سے میل ...۔ سفارت خانہ کا رخ میں نہیں کرتا۔ یہاں کے لوگوں سے یاری میں نے نہیں لگائی۔ اس پر بھی میں اُداس نہیں تو ...میں رہتی ہے۔ یوں کیوں ہے۔ اُس کو آپ ایسا ہی محبت بھرا خط لکھیں جیسا کہ مجھے لکھا ہے کہ وہ خوش ہو جائے گی۔ ...مجھے کا کی اور کا کا سے بڑا ہی پیار ہے۔ شاید آپ دل میں کہیں اور جیسا کہ شرارت سے آپ کی آنکھیں چمکا کرتی ...ہی چمکا کر کہیں کہ شاید کا کی سے زیادہ۔ لیکن نہیں امی (اور اب مجھے پھر تھوڑی سی ہنسی آ رہی ہے) دونوں سے ایک ...آپ کو پتہ ہے کا کا جس نے کبھی کسی بڑے سے بڑے سے بھی تُو نہیں کہلوایا، میری ایسی ایسی جھڑکیاں برداشت کرتا رہا ...میں نے بابا جی کی بھی نہیں کہیں۔

وہ اتنا اچھا بھائی ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ سے ناراض نہیں۔ اپنی خالاؤں سے ناخوش ...ں کو تو بس ماضی میں کھوئے ہوئے وقت کا احساس ستاتا رہتا ہے اور اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ آپ کے ...خود اس کے پاس۔ آپ کی زمین میں کاشت کرنے سے لے کر ہوائی جہاز کی اُڑان تک اگر اس کو ایک مقام پر ...نصیب ہوگئی تو وہ دنیا کا Normal ترین انسان بن جائے گا۔ آپ بس دعا کیا کیجیے۔

آفتاب بھائی کا خط مجھے نہیں ملا حالانکہ وہ ہر ہفتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ شاید اب کے میرے خط میں کچھ بات ہی ...جس نے ان کو سراسیمہ کر دیا ہوگا۔ پتہ نہیں انہوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

آپ ریڈیو روما کو ریکارڈ ہرگز نہ بھیجیں اور اگر آپ واقعی کلچرل تعلقات اچھے کرنا چاہتی ہیں اور میری اور اپنے ...ت چاہتی ہیں تو Legation of Italia کو کراچی خط لکھ کر پوچھیے کہ آیا وہ آپ کے ریکارڈوں کا تحفہ Diplomatic تھیلے میں ڈال کر ریڈیو روما بھجوا دیں گے۔ ان کو بس اسی قدر لکھیے کہ میں ریڈیو روما کے پاکستانی پروگرام کو ...ند کرتی ہوں۔ اس لیے یہ تحفہ بھجوا رہی ہوں۔

اور امی میری پیاری امی! جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی میں خود مانگ لوں گا۔ آپ تو بس حد کر رہی ہیں!

اب ختم کرتا ہوں۔ میری کمر اور سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے کیونکہ دفتر سے ریڈیو اور ریڈیو سے یونیورسٹی بارش میں
اور گھومتا رہا۔ ایک تو موٹر سائیکل پھسلنے کا خطرہ اس پر آنکھیں بند کرنے والی بوچھاڑ اب بستر میں لیٹوں گا۔ انگیٹھی
گا۔ اس وقت آپ کا بھیجا ہوا سویٹر پہن رکھا ہے لیکن تھوڑی تھوڑی سردی لگ رہی ہے۔ ہاں سچ امی! کیا یہ بات
ملتان میں لو چلنے لگی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔

ایک بات اور سنیئے۔ یورپ میں اپنی امی اپنے ابی اور بھائی بہنوں (یعنی سب رشتہ داروں) کو "تو" کہہ
جاتا ہے۔ مجھے یورپ کی بس ایک یہی بات پسند آئی ہے۔ اگر میں آپ کو اسی طرح مخاطب کیا کروں تو آپ کو
لگے گا؟

اچھا امی! جب تیرا جواب آئے گا تو اور بھی باتیں لکھوں گا۔

تمہارا چھوٹا
شفو

Via Catome 16

Roma

25 اپریل 1954ء

میری پیاری امی!

ایک مدت کے بعد آپ کا خط ملا اور وہ بھی اس وقت جب میں روما میں نہیں تھا اور ابا جی کے کام سے میلان گیا
ہوا تھا۔ مجھے آپ کا خط پا کر اس قدر خوشی ہوئی کہ ملتان آنے کو جی للچانے لگا۔ آپ کے خط میں ایک فقرہ پڑھ کر میں
رہ گیا کہ آپ کے کھیت میں سبزیاں اُگ آئی ہیں اور خربوزے پک گئے ہیں۔ خربوزے تو گرمیوں میں پکا کرتے ہیں
کونسی رُت خربوزوں کی پاکستان میں چل نکلی ہے۔

میں اس وقت کمبل میں لپٹا ہوا یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ یہاں سخت سردی پڑ رہی ہے اور میرے ہاتھ
ہوئے جا رہے ہیں۔ جب میں میلان گیا تھا تو اپنا اوورکوٹ اس لیے ساتھ نہ لے گیا کہ اب تو گرمیاں آ گئی ہیں۔ جب
وہاں پہنچا سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں اپنے ہوٹل میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ایک ناول پڑھتا رہا۔

اگلے دن کام سے باہر نکلا تو پہلے بارش شروع ہوگئی۔ اس کے بعد برفباری نے گھیر لیا۔ میرے سینے میں سخت
شروع ہو گیا۔ جس فرم سے مجھے کام تھا، انہوں نے مجھے ٹیکسی میں ڈال کر ہوٹل پہنچا دیا۔ اس ایک دن میں کوئی برانڈی
آدھی بوتل حلق سے نیچے اُتری۔ گلا سوج گیا مگر سردی دور نہ ہوئی۔

میں نے آپ کو بہت یاد کیا اور سب لوگوں سے جی ہی جی میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگی لیکن اگلے دن آنکھ
تو میں بدستور زندہ تھا۔

کاکی نے اتنا اچھا موٹا سویٹر بھیجا تھا، میں وہ بھی ساتھ نہ لے گیا۔ مجھ سے بے وقوف صاحبزادے پیدا ہو
اب بند ہو گئے ہیں۔ آپ ذرا میری قدر کیجیے۔ لوگ کہتے ہیں ایسا موسم نہ یورپ میں پہلے دیکھا تھا اور نہ اس کی اُمید تھی

[illegible] میں پس چلا تھا مگر بچ گیا۔ کام پورا کر کے واپس روما آیا ہوں۔ اب تو مجھے آپ کی اور ابا جان کی طرف سے
[illegible] ہے۔

[illegible] بھی ریڈیو کے محکمہ موسم نے بتایا ہے کہ کل سورج نکلے گا۔ سو اس اُمید میں خوش بیٹھا ہوں اور گیت گا رہا ہوں۔
[illegible] نے خود بنایا ہے اور اس میں دس مرتبہ سورج کا پانچ مرتبہ دھوپ کا ذکر آتا ہے۔ اب یہ خط ختم کر لوں گا تو اس
[illegible] مرتبہ خربوزوں کا اضافہ بھی کروں گا۔ مجھے خربوزے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کے کھیت میں اتنا کام
[illegible] سکتا ہوں کہ ندیدے بچوں اور میری لالچی بیوی کے بہت سے خربوزے ہڑپ کر جانے کے بعد بھی آپ کو کوئی
[illegible] بیچے گا۔

آپ خدا کے لیے عیدی وعیدی کی فکر نہ کریں۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ رقم آپ کاکی کو دے دیں۔ مجھے
[illegible] چکا ہے اور وہ بار بار اس کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے نوآنے لے کر سگریٹ کی ڈبیا خریدی
[illegible] مرتبہ کہہ چکی ہے ''اشفاق صاحب ہے تو شرم کی بات اور مجھے بار بار تقاضا نہ کرنا چاہیے مگر آپ کو میرے نوآنے
[illegible] اور ایک مرتبہ امی! جب میں نے چڑ کر کہہ دیا تھا کہ جائیں نہیں دیتا۔ اس لیے کہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس
[illegible] سے میرے سر پر پنکھی ماری تھی۔ اس لیے نا کہ میں شریف آدمی ہوں اور آگے سے بولتا نہیں ہوں۔ اگر
[illegible] وقت ملے تو ذرا سختی سے اس سے پوچھیں کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی تھی۔

[illegible] اور سانتر یلی سے میری لڑائی ہوگئی ہے اور میں اس سے بولتا نہیں ہوں۔ اس لیے آپ ہرگز ہرگز اس کے
[illegible] سے نہ ملیں اور نہ عیدی وعیدی ہی کی درخواست کریں۔ یہ میری التجا ہے۔ سانتریلی ایسے برے عیسائی ہیں کہ
[illegible] ان کو پسند نہیں کریں گے۔ مجھ سے چمکار چمکار کر کام لیتے رہے اور جب ایک دن میں نے اُن سے کام کرنے کو
[illegible] ی ہو گئے۔ میں نے انہیں خوب خوب برا بھلا کہا۔ (جس کا مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا) اب میں ان سے
[illegible] ہیں۔ وہ دفتر کے سب لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ اشفاق کی مجھ سے صلح کرا دو لیکن میں کسی سے دبتا نہیں ہوں
[illegible] لوگ مجھ سے دبتے بھی ہیں۔ امید ہے اب آپ پر بات کھل گئی ہوگی۔

ٹوٹو یہاں آئی تھی اور ڈھائی دن رہ کر چلی گئی۔ لندن سے اُن کا ایک گروپ اطالیہ کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس میں
[illegible] ب چند سی لڑکیاں اور احمق سے لڑکے تھے۔ ٹوٹو کی میں کچھ بھی خاطر مدارات نہ کر سکا۔ دو دن کے بعد میری موٹر
[illegible] نے کیا ہوا کہ سٹارٹ نہ ہوتی تھی۔ بارش زوروں پر تھی اور مجھے اس کے ساتھ بس یا ٹرام میں جانا پڑا۔ ٹوٹو تو چلی گئی
[illegible] کے لوگوں نے میری زندگی آفت میں ڈال رکھی ہے۔

[illegible] بھی پوچھتے ہیں وہ حسین لڑکی پھر کب آئے گی؟ اس مشرقی حسن کی دیوی کا پتہ کیا ہے؟ میرے بہت سے
[illegible] اس کے لیے مسلمان تک ہونے کو تیار ہیں۔ ٹوٹو کو اس کے حسن کے Compliments جس قدر روما میں ملے ہیں
[illegible] نہ مل سکیں گے۔ وہ خود حیران ہو کر روما کے حسن کو دیکھتی تھی اور لوگ اس پر دیوانہ ہوئے جاتے تھے۔ اس ڈھائی
[illegible] دگی میں ایک مرتبہ جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، میری اور ٹوٹو کی لڑائی بھی ہوگئی۔

وہ کہہ رہی تھی آپی ملک نے تم کو خط لکھا ہے اور تم نے جواب نہیں دیا اور میں عرض کر رہا تھا کہ ملک نے

مجھے نہیں لکھا۔ پتہ نہیں ہم میں سے کون سچا تھا لیکن بات یہاں ختم ہوئی کہ مجھے ٹوٹو کے منہ سے ''سبھی مرد ایسے ہیں'' سننا پڑا۔ میری وجہ سے بیچاری ساری مرد قوم کی بے عزتی ہوئی۔ اس کے لیے میں مردوں کے سامنے شرمندہ رہوں گا۔

آپ حلوہ وغیرہ بھیجنے کی فکر نہ کریں۔ ہاں اگر آم روانہ کر سکیں تو کمال ہو جائے بلکہ یہ تو ضرور ہی بھیجئے گا۔ جن لوگوں نے اُن کا مزا چکھا ہے۔ اُنہوں نے دوسروں کی (جنہوں نے نہیں چکھا) زندگی حرام کر رکھی ہے۔ میں آپ کے بھیجے ہوئے آموں سے ایک پھانک بھی نہ کھاؤں گا۔ یہ اطالوی لوگ کھائیں گے تو خوش ہوں گے۔

یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ولونیکا صاحب (ہمارے مسلمان بھائی) کو ان کا حصہ ضرور دوں گا۔ اُن کا حصہ پہلے۔ اگر یہاں ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تو میں نپٹ لوں گا۔

پرسوں آپ کے خط کے ساتھ حکومت اطالیہ کا خط بھی ملا کہ اکتوبر میں آپ کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس معاہدہ کرنے کی مہربانی فرمائیے گا۔ اب کی بار حکومت کچھ اس قدر خوش ہوئی ہے کہ ایک سال کے بجائے پانچ سال کے معاہدے کی بات کر رہی ہے۔ میں چپ ہوں اور اس خط کو گول کر رہا ہوں۔

اگر کاکی کو یہ خبر سنائی جائے تو وہ قتل کر دے۔ واقعی اس کے ساتھ نو مہینے کا وعدہ تھا اور میں دو سال یہاں رہ گیا۔ یہاں نہ کچھ کھویا نہ پایا۔ بس اپنے ڈھرے پر زندگی چلتی رہی۔ پہلے ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا اب کانٹے سے کھاتا ہوں۔ پہلے لوٹا لے کر غسل خانے جاتا تھا، اب خالی ہاتھ سیٹی بجاتا جاتا ہوں اور خالی ہاتھ ہی واپس آتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آتی مرتبہ سیٹی نہیں بجتی کیونکہ طبیعت ذرا پریشان سی ہوتی ہے۔

سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ ان دو سالوں میں ایک بھی یورپی لڑکی سے عشق نہیں کر سکا۔ اول تو ملیں نہیں، بڑی محبت سے ملیں لیکن جب میرے چھن دیکھے تو واپس لوٹ گئیں۔ پاکستان واپس آنے سے پہلے کم از کم ایک حسینہ سے خطرناک طور پر محبت کرنی چاہتا ہوں لیکن ڈر ہے کہ ہو نہ سکے گی۔

اگر میں یورپ سے ایسا ہی الو کا الو لوٹ گیا تو میرے کالج میں سٹاف روم میں سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ آج سے چار مہینے پہلے تک میرے ساتھی پروفیسروں پر میرا اچھا اثر تھا کیونکہ میں نے انہیں لکھا تھا کہ زیادتی کا قائل ہوں۔ بس دن میں دو بوتل شراب پیتا ہوں اور ایک لڑکی بغل میں رکھتا ہوں۔ وہ خوش تھے کہ چلو بہت نہ سہی اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن چار مہینے پہلے پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمبخت یہاں آ دھمکا۔ اس نے جو مجھے دیکھا تو ایک تفصیلی خط دوستوں کو لکھ دیا۔ پاکستان سے بھی گیا گزرا ہو گیا ہے۔ اب سب لوگ مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ چنانچہ میں ایک عدد محبت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اس لڑکی کے خط اور فوٹو ساتھ لاؤں گا۔

اثر صاحب کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ آپ پھر اپنے دفتر آ گئی ہیں کیا؟ ملک کا کیا حال ہے۔ انہیں میرا اسلام کہنا۔

میرا افسانہ ''گڈریا'' پتہ نہیں لوگوں کو اتنا کیوں پسند آیا ہے کہ اب تک ہندوستان اور پاکستان سے خط آ رہے ہیں۔ مجھے افسانے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ میرے پبلشر نے بڑی محنت سے مجھے اس کا معاوضہ روانہ

کیا آپ مجھے جواب دیں گی؟

صرف آپ کا
شقو

C/o Zubey Artist.
Post Box 509
Lahore
24 نومبر 1951ء

[illegible]ی! اسلام مسنون۔

ابھی چند لمحوں کی بات ہے۔ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ صادق آیا اور یہ خط مجھے دے گیا۔ اس نے کہا کہ [illegible] نہیں جاسکا اور نہ بی بی جی کا یہ خط ہی مکتوب الیہ کو پہنچا سکا۔ آپ وہاں تو جائیں گے ہی۔ یہ خط لے لیجیے! میں نے [illegible] تو خط لے لیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ میں تو کینال پارک نہیں جا رہا ہوں...... بہرکیف خط ارسال خدمت ہے [illegible] کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ایک کارڈ بھی روانہ کر رہا ہوں۔ یہ آپ خود پڑھ کر کاکی کو سنا دیجیے۔ اُس نے تو مرزا والے خط کا برا مان کر سب [illegible] خراب کر دی تھی۔ اب اگر میں اس کارڈ پر رنجیدگی کا اظہار کروں تو کس مان پر؟

رات بلیک آؤٹ ہوا۔ بڑا مزا آیا۔ میں اپنے چوبارے کی بتی چٹک سے جلاتا۔ سیٹیاں بجنے لگتیں۔ ابا جی [illegible]تے اور مجھے بڑا لطف آتا۔ لڑائی کا انتظار کر رہا ہوں اور بڑی شدت سے کر رہا ہوں۔ پھر بہت مزا آئے گا۔

بچوں کو پیار۔

والسلام
احقر
شقو

1۔ مزنگ روڈ
لاہور
23 مئی 1951ء (11 بجے صبح)

کاکی! سلام مسنون۔ میں نے آج سیالکوٹ ایک اور تار دے دیا ہے کہ 24 ماہ حال سے پہلے نہیں [illegible] اور شاید میں نے اچھا ہی کیا۔ اس طرح میں کل صبح سنٹر پر شفقت کے لیے دعائے خیر کہنے جاسکوں گا۔ نوکری [illegible] ہی رہتی ہے لیکن ایسا موقع کم ہی ہاتھ آتا ہے۔ خدا کرے وہ پاس ہو جائے اور دنیوی اور اُخروی نعمتوں سے [illegible] ہو۔

امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ان کا مفصل حال مجھے کل بتانا۔ مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ مجھے بیمار پرسی کے طریقے نہیں آتے۔ خدا گواہ ہے کہ کسی صاحبِ فراش کو دیکھ کر مجھے اس سے بڑی محبت ہو جاتی ہے لیکن ایک عجیب قسم کی شرم باتیں نہیں کرنے دیتی۔ مجھے پتہ نہیں لگتا کہ میں کیا کروں اور اس سے کیا پوچھوں! لیکن میرا جی چاہتا رہتا ہے کہ وہ صحت مند ہو جائے اور پھر کبھی بیمار نہ ہو۔ امی کو میری اس فطرت سے مطلع نہ کرنا ورنہ ان پر میری سپاٹ فردیت کی ایک اور جہت اُجاگر ہو جائے گی۔

کل میرا چکور بھائی جان کی مسہری کی لاٹھی گرنے سے لنگڑا ہو گیا۔ ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا۔ میرے پاس کوئی دوائی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر بالوں کو لگانے والا تیل لگا دیا ہے۔ دعا کرنا کہ پھر اُسے چلتے پھرتے ہنستے بولتے دیکھوں۔ میرے لیے تو یہ صف شکن ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے علاقے میں اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ آج اخبار میں پڑھا کہ سکھر میں آدمی گرمی سے ہلاک ہو گئے۔ پتہ نہیں بیچارے قیدیوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی جنہیں شام کے سات بجے ہی بارکوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اسحاق بھائی آج صبح کراچی روانہ ہو گئے ہیں اور وہ ایک ہفتہ تک لندن پہنچ جائیں گے۔ میں ہاتھ کی ریکھا پر تھوڑا بہت یقین رکھتا تھا۔ اب ہتھیلی کے ان سنپولیوں پر ایمان لے آیا ہوں۔ واقعی ہر کام اُس کی لکیروں سے ہوتا ہے۔

سب کو سلام۔

والسلام

دعا گو

شفقو

17 اگست 1952ء

ابھی تمہارا تار ملا۔ مبارکباد کا شکریہ لیکن دیکھو پیارے زندگی کا ایک اور سال گھٹ گیا۔ ہے نا افسوس کی بات۔ کتاب کے حقوق ابھی تک فروخت نہیں کیے تھے کہ تمہارا تار ملا اور میں رُک گیا۔ تار میں لکھا ہے کہ پانچ ہزار روپے کا بندوبست ہو گیا۔ اس کا مطلب کیا؟

کیا سچ مچ کے پانچ ہزار روپے یا لاٹری، معمے کی رقم؟

کل کا دن مجھا اور صاحب کی حضوری میں گزرا۔ صاحب کی صحت دن بدن ٹھیک ہو رہی ہے۔ میں ان دنوں بہت زیادہ سونے لگا ہوں یعنی شام آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک۔ تم آ گئے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر پھر ویسی محنت شروع کر دیں گے۔

لاہور میں بارشیں بدستور ہو رہی ہیں لیکن تمہارے بغیر لطف نہیں۔

یونیورسٹی سے ابھی تک رقم نہیں ملی۔

جب بھی ملے گی ویسی کی ویسی رہے گی۔
آلو کی ٹکیوں اور آئس کریم کی بالٹیوں پر خرچ نہ ہوگی۔
سب کو سلام۔

تمہارا
شفتو

(ریزی کے نام)

پیارے پرویز!
اور سناؤ تم نے کراچی یونیورسٹی کا Cresent☆ بنایا تھا اُس کی رقم ملی یا نہیں۔ تم بھی بس سو گئے ہو گے۔ یار اس
کے منظور ہو جانے سے مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ پاگل ہو گیا۔
میں زندگی سے پہلے ہی تنگ تھا۔ یہ کار لے کر اور بھی دکھی ہو گیا ہوں۔ سالے سارے روم میں گھومتے رہو۔
(Parking) کی جگہ نہیں ملتی۔ کسی بھی جگہ کھڑی کرو، حرامزادے سپاہی سیٹیاں بجانے لگ جاتے ہیں۔ کبھی تو میرا
سالی کو آگ لگا کر بھاگ جاؤں۔ بھلا میرے جیسے شریف آدمی کو پارکنگ کی ہر جگہ اجازت کیوں نہیں دیتے؟
یہاں کے سپاہی ایسے الو کے پٹھے ہیں کہ چائے کافی کی رشوت بھی نہیں مانتے۔ بس کاپی نکال کر سر پر کھڑے
ہیں۔ اگر سیدھے شریف آدمیوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے رہو تو بھی روک لیتے ہیں اور بریک دبوا کر دیکھتے ہیں
جلتی ہے یا نہیں۔ یہ بھی اُلٹا ملک ہے کہ اگلی بتی جلے نہ جلے پچھلی ضرور جلے۔
بھیڑ سڑکوں پر اتنی ہوتی ہے کہ میں تو رام نام لے کر چلتا ہوں۔ اگر کسی گزرنے والے کے کوٹ سے موٹر لگ
پچاس روپے ہرجانہ لیتا ہے کہ مجھے خوفزدہ کیا۔ اس سالے سے کوئی پوچھے کہ ہمارے یہاں تو کوئی موٹر کے نیچے
تو بھی اُس سے کچھ نہیں لیتے۔ یہاں خوف کھانے کی رقم بھی لے لیتے ہیں۔
کیا تم زوبی صاحب سے کبھی ملے ہو؟ اُن کا کیا حال ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ روما کی لڑکیاں اُن کو پسند کرتی
میری بے عزتی کرتی ہیں کہ تم تو بدھو ہو۔ بس کتاب کا علم جانتے ہو اصلی علم نہیں جانتے۔ ہاں سچ ریزی...... نئے
"بچوں" لینے کا انعام لیا تھا۔ بس دھکا ہی کیا۔ خدا نے عزت رکھ لی ورنہ میرا تو برا......
بہت تنگ آگیا ہوں۔ جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسری ملتی ہے لیکن وہاں سردی بہت ہے۔ سردی کم
کے لیے پیٹ پر چادر ڈال کر سوتا ہوں۔ تم نے بہت بری بری عادتیں سکھا دی ہیں۔
اچھا اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کرو کہ کیمرہ خرید سکوں۔ جب تم کراچی آنا تو اپنے ساتھ سو دو سو روپیہ لے کر آنا۔
کی ڈیوٹی دے سکوں۔ نہیں تو میں Tape Recorder سمندر میں پھینک دوں گا۔ یہ Recorder میں نے
کے لیے لیا کہ وہ اچھا نہیں گاتی ہیں۔ ان کی آواز بھر کر ان کو سنائیں گے تو جنابہ قدسیہ چٹھہ کو پتہ چلے گا۔ ہاں سچ
آئی تھی۔ ریڈیو پر میں نے اُس کے ساتھ انٹرویو کیا۔ مگر بھائی! وہ تو ایسی تیزی سے بولی کہ پندرہ منٹ کا سکرپٹ
میں ختم کرنے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے مصیبت ٹالی۔ اب بتاؤ ہم ان لڑکیوں کو کیسے سمجھائیں۔

یہاں ایک ہندو لڑکی ایک دن کے لیے آئی تھی۔ اس سے مجھے عشق ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ امریکہ چلی گئی۔ وہاں سے اُس نے خط لکھا تو میں موٹر سائیکل سے گر کر بستر پر لیٹا تھا جواب نہ دے سکا۔ اب پتہ نہیں ہے۔ اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ بس یہ آخری عشق تھا۔ روما میں سب حرامزادی لڑکیوں نے میرا نام پادری صاحب دیا ہے۔ جب میرا بیٹا ہو گا تو میں اُس کو کھلی چھٹی دے کر روما بھیجوں گا۔

اچھا بھئی اب میں ذرا سا پیٹھا کھانے لگا ہوں۔ تمہارا ڈبہ اس کا سارا شیرہ چوس رہا ہے۔ بیدی آپا کا ... ہے۔ سالے کمینے کتے تُو نے بھی کئی گھر برباد کیے ہیں۔ میں آ کر تیرے جوتے لگاؤں گا۔

صرف تمہارا ہمیشہ تمہارا

شفقو

☆ ریزی نے 1952ء میں کراچی یونیورسٹی کا کریسنٹ بنایا تھا۔ آج تک وہی کریسنٹ چل رہا ہے۔

ریزی کے نام (والد کہہ کر مخاطب کرتے تھے)

8 اگست 1952ء

ابھی تمہارا خط ملا اور ابھی میں کچہری جا رہا ہوں۔ 5 ہزار روپیہ بھلا میرے کس کام آئے گا۔ مائی ڈیئر ... صرف ایک ہزار کی ضرورت تھی، سول گیا۔ تم اگر مجھے شاپنگ کرا دو اور اگر ہو سکے تو ایک عدد Sight Weight ... کیس لے دو۔

کھلونوں کا کام شروع کرو اور جب تمہارے پاس بارہ ہزار روپے ہو جائیں تو مجھے اطلاع دو۔

Senes کو تو میں روم سے بھجوا دوں گا۔ اس کے علاوہ گراموفون مشین کے بارے میں بھی تمہاری مدد کروں ... روم میں مَیں ریکارڈنگ کرا کر بھیجتا رہوں گا۔

شاید ہمارے اچھے دن قریب آ رہے ہیں۔ (صرف مالی لحاظ سے ذہنی لحاظ سے نہیں۔)

اچھا کچہری جاتا ہوں۔ اس کے بعد اثر صاحب سے ملنا ہے۔

تمہارا

بڑا والد

ممارخ ممارخ

Dear Maka,

If the 3rd of next month I have Lahore for Multan (By mail) would it ... you? Which station you suggest? Cantt. or City?

Your Shukko

27-5-1952

Lahore

26-5-1952

Dear Idiot,

Some three days before I wrote you a detailed letter having every description of my doings in your absence. It was placed in the dictionary for so intactness. But instead of steadiness it gave much to elopement and was kidnapped. Who removed it I do not know. When wish removed? I can say at the dead of night when as friend came to my house borrowed the book, took it to home and did what even he liked.

Anyway, dear idiot, I am well and happy and me serious very serious about Yousaf sahib date 7. I can easily smell a rat in every happening. And here I smell about two dozen of rates. He is a genuine man and can help.

To-day I will start brewing at home (24-Canal Park), don't worry. When are you coming back, I am trying to know "her" responsibilities and duties? If so, I may come to you. Let me know you are progressive. Should I come on 3-6-52?

I am keeping fast and rumbling wet cloth on my legs. All the nerves (which are concerned with writing) have refused to work. Kindly excuse me for this small letter and its telegraphic language.

Your's B. Wala

Shukko

Lahore

15-5-1952

Dear Bho Wala,

Drawing is too hard.

Thank you.

Do not write any letter to..............

For God's sake don't

Don't!

Don't!!

Don't!!!

Detailed letter with your portrait, Tomorrow!

Shukko

Lahore

17-5-1952

Dear Razee,

You must have received my last day's letter. Here I send you your ...ait. Is this the thing you required? How I managed to get it, is a long story ... you may hear from Qudsia.

You have taken great pains in delineating the drawing. I have shown it ... publisher and it has been forwarded to block maker who was much ...ished to see it and was compelled to praise the craft of the artist who has ... it with great skill for good results of 1/2 fore block

Dear one! Don't write any letter to bitter things are tasted once and left ... others to taste it for experience. You are exprienced enough and need not ... the path you had been traveling for some time off the trash you went. ...ybody saw you going astray and could not help. Do you still dare to write ...tter at the cost of you regulation? Every goal seeks certain pack of ...ematic movements in the man in whose favor it is going to be jelled. We ... most of the required movements. Let us credit them first in the ledger of ... courage and then proceed. If once you go bankrupt no money can drain ... disintegrated and ruptured honour. Think! And DO NOT write.

On the seventh of this month I reached there before time. Waited for ... about two hours. Puffed half of the Capstain's packets contents. Backed ... and down the canal for about 135 times. He did not turn up. Never sent a ...ssage. I think he must have been occupied. Must have gone some where. ... dead. If he still lives, I am sure he would come again. He would see us, ... us and help us. We the sons of humble parents!

Go on working. Anything may come out of labour. Any moment some red iron may appear. We may wake. Hit it and sleep again. And this slumber will never be disturbed. She who hit iron will protect our sleep. But the condition is to work and work. Bundle of kisses sweet, sour, litter, tasteless and pungent assorted kisses in large packing.

Your

Shukla

Idiot"

29-5-1952

Dear Idiot

1. Should I come on 3-6-52?
2. Where should I get down?
3. Where is your home situated?
4. And, if I am not granted to the required LEAVE will you excuse me.

Rigge Idiot

Shukla

To reduce material desires doesn't always
Brings peace to mind. In order to live in peace.
Spiritual desires must also be reduced

(Kappa, Akutagawa)

ALONE

Thy young son

Eating his lunch, heard a plane go overhead, and put down his spoon. Remarking, the pilot does not know I am eating a egg. He smell shocked, just as if he had never known nor suspected he was locked in, from the beginning alone.

Buried alive in a body not my own the work apish, the feet a slaves

...nds a woman's out of work.

The eyes as enemy's the teeth a dog's

The lips politic, the tongue a traitor's

The legs ill at ease, the ears not matched

the venal severed, the groin itchy.

The slain sun learned by day, goose fleshed at night.

The lungs drawing with air, the brain groggy

Buried alive in a body not my own.

(T.S.Mathews)

No one gives you a black eye,

You have to fight for it

The height of laziness

Is getting somebody else

To do you ours sting

Is a man

With a transplanted ticker

Living on borrowed time?

Modern technology

Owes ecology

An apology

Some have greatness thrust upon them

Others get is otherwise

Why the hell was mine all scattered

Round my waist and hips and thighs?

Over and above everything esle

Jeremy was in love with himself

But he did not get on then

Why am I here

(When half me's asleep

And the other's sill in bed)

Making the coffee

With tea bags.

I don't need you for testing

I have enough trouble with my own thoughts

The solution

To pollution

Is hold you breathe?

until your death

Is I

See on my back and cry

Tears collect in my ears

I am

Completely, hopelessly, madly

Passsionately, deeply, confusingly,

Totally, absolutely, felly,

Wholly, knowingly, desperately

In love

With you

I think.

Nostalgia's all right

But it's not it was

خاں صاحب کی رنگارنگ زندگی، اُن کی تخلیقی قوتوں کی نیرنگی، اُن کے سفر در سفر، مختلف طبقات میں تعلقات کی [illegible] کیا تھی؟ سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ سارا تنوع ایک طرح سے تلاش کا سفر تھا۔ یوں تو ہر انسان [illegible] کچھ تلاش کرنے کے درپے ہے لیکن اُن کی کہانیاں، ڈرامے، زندگی سب اس بات کے مظہر ہیں کہ ساری عمر وہ کسی [illegible] شے کو تلاش کرتے رہے۔

پتہ نہیں یہ اشرف المخلوقات کا نصیب ہے کہ وہ کھوئی ہوئی جنت اس دنیا میں ڈھونڈتا ہے یا پیچھے کی یاد اُسے جینے

نہیں دیتی۔ شاید یہی بے نام بے قراری خاں صاحب کا مقدر تھی اور وہ ساری عمر گم گشتہ جنت کی تلاش میں رہے
کا اصل مقصد جاننا چاہتے تھے۔ انسان کس لیے تخلیق کیا گیا ہے؟ اُس کی زندگی کیا کسی خاص مصرف کے لیے ہے
اُن کے لیے شاید یہ سمجھنا کارِ دارد تھا کہ مادی زندگی کا حصول اور روحانی سفر میں مطابقت کیسے کی جائے
ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ زندگی کی ٹرین کو ان دونوں پٹڑیوں پر توازن کے ساتھ چلا سکیں۔

جو لوگ ان کی کہانیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی پہلی کہانیوں میں "رنگ رلیاں" "تلاش
مظہر ہیں اور جو آخر آخر میں "من چلے کا سودا" "زاویہ" "صبحانے افسانے" میں بدل گئی۔

بہرکیف ذاتی زندگی میں جب جہلم، پنڈی، اسلام آباد، تراڑکھیل کے چھوٹے چھوٹے سفر نا کافی ثابت
اور اُن کے اندر کی کیفیت یا تضاد کسی طور پر حل نہ ہوا تو انہوں نے ایک لمبی اُڑان کی ٹھانی۔ زوبی ریڈیو روم
چکے تھے۔ سید عابد علی عابد نے خاں صاحب کو چھٹی دے دی۔

ISMEO سے پیپر سائنز لی کا Appointment Letter آ گیا۔ سب کوائف پورے ہوئے۔

شفقت کا مجھ سے بڑا دوستانہ تھا۔ وہ میرے پاس 24-ایس کینال پارک آتی رہتی تھی۔ کالج کی مشغولیت
ہمارا کافی وقت لے لیتیں۔ شفقت میں عجیب خود اعتمادی تھی۔ انارکلی کے باہر وہ کسی چوبارے میں رہتی تھی۔ میرا
یہ عالم تھا کہ کبھی اُس کے گھر اکیلی نہ جا سکی اور وہ تھی کہ اگر چاند کے سفر پر بھی اُسے جانا ہوتا اور پیراشوٹ سے چھلانگ
ہوتی تو وہ لمحے بھر کو نہ سوچتی۔

زوبی جب اٹلی جانے والے تھے تو خاں صاحب زوبی کو میرے پاس ایک بار لے آئے۔ پھر خاں صاحب
بھاگنے کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ زوبی صاحب کو روم کے لیے الوداع کہنے کراچی تک گئے۔ حسنِ اتفاق
زندگی میں جو سب سے لمبا خط ملا وہ کراچی سے ہی لکھا گیا تھا۔

آپ اندازہ لگا لیجیے کیسے اشفاق صاحب وقت کو ساکت کرنے کا فن جانتے تھے۔ سمندر کی متلاطم
دیکھتے ہوئے ساحلی ریت کو کاغذ پر سے جھاڑتے ہوئے اس خط کو پوسٹ کرتے وقت پتہ نہیں انہوں نے کتنی
ہوگا...... پوسٹ کروں...... یا پھاڑ دوں؟

پھر وقت گزر گیا۔ زوبی اپنا وقت پورا کر کے لوٹ آیا تو اشفاق صاحب بھی ایک اور نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔
علم ہو گیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے رابطے اور چھوٹے چھوٹے سفر سب بیکار ہیں۔ 1-مزنگ روڈ سے 24-ایس کینال
کی گردش بے ثمر۔

دیال سنگھ کالج کی پروفیسری نے انہیں دو ایک منظورِ نظر قسم کی لڑکیوں سے ضرور متعارف کر دیا تھا لیکن یہ
بھی بے سُود اُن کا وقت ضائع کر رہی تھیں۔ وہ کسی ایک سڑک پر، کسی ایک مسلک کے ساتھ، کسی ایک مصرف کا ہو کر
گزارنا چاہتے تھے۔

اسی لیے انہوں نے ایک لمبی اُڑان کا سوچا۔ 1952ء میں انہوں نے روم ہجرت کرنے کی ٹھانی۔ اُن
دوست زوبی روم ریڈیو پروگرام کر رہے تھے۔ اُن کی واپسی پر یہ جگہ خالی تھی اور خاں صاحب کو قوی امید تھی کہ انہیں

...ار دو سروس کی نوکری مل جائے گی۔ اس وقت وہ دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے۔ سید عابد علی عابد اُن دنوں
...تھے۔ وہ سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔
"کیوں بھائی چھٹی کیوں چاہتے ہو؟"
"مجھے روم جانا ہے سر۔"
"بھائی احمق نہ بنو۔ کیا وہاں سے نوکری کنفرم ہو جاتی ہے؟"
"جی یہ دیکھیے یہ پیٹر سانتریلی کا خط ہے۔"
اکتوبر کا مہینہ تھا، نہ سردی تھی نہ گرمی۔ میں اگر اپنے لیے افسردہ اور اداس تھی تو مجھے اتنی خوشی ضرور حاصل تھی کہ
...صاحب بالآخر مجھے چھوڑنے پر پوری طرح کاربند ہو چکے تھے۔ بالآخر کسی سے مشورہ کیے بغیر کسی اظہار میں جائے بنا
...نے ایک مثبت فیصلہ تو کر لیا۔
ریزی نے فیصلہ کیا کہ وہ شقو کو ملتان تک خدا حافظ کہنے جائے گا اور ملتان کے سٹیشن پر اتر کر امی کے پاس چلا
جائے گا۔ ریزی، لالو اور میں رات کے وقت میاں میر کے سٹیشن پر پہنچے۔ یہ ان دنوں ایک بہت معمولی سا پلیٹ فارم تھا
جہاں مسافروں کے لیے دو تین بنچیں پڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے، گاڑی بر وقت آئی۔
چونکہ یہاں گاڑی کا قیام کم کم ہوتا تھا، اس لیے جھپاک سے ریزی سوار ہو گیا۔ اماں جی اپنے بیٹے شقو کو کراچی
چھوڑنے جا رہی تھیں۔ شاید اماں نے سوچا ہو کہ کہیں قدسیہ بھی ساتھ ہمسفر تو نہیں۔ پھر سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا
چھڑایا۔
خاں صاحب نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ الوداعی کلمات یا خدا حافظ کا والہانہ انداز بھی نہ اپنایا۔ لمحاتی قیام کے بعد
...چی۔ کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ سفید ہاتھ اور بازو خدا حافظ کے انداز میں ہلے اور گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم
سے نکل گئی۔ رات کافی جا چکی تھی۔
میاں میر سٹیشن سے کینال پارک اچھا خاصا فاصلہ ہے لیکن تب خوف نامی چیز دلوں پر حکمران نہیں تھی۔ سڑکوں پر
...تمیں نہیں ہوتی تھیں۔ لڑکیاں بخوبی ٹمٹماتی روشنیوں میں آ جا سکتی تھیں۔ میں اور لالو آہستہ آہستہ کینال پارک کی طرف
چلے۔
ڈراپ سین ہو گیا۔
میرے اندر نہ امید تھی نہ نا امیدی ہی...... بس ایک کھوکھلا پن تھا جس میں بار بار گاڑی کی وِسل بجتی تھی اور بجے
جاتی تھی۔ ایک بہت بڑا باب ختم ہوا۔

● ● ● ● ● ● ●

450-این، سمن آباد

ہم بچوں کے ارادوں کی عموماً بڑوں کو خبر نہ ہوتی اور جونہی وہ کچھ ارادہ کر لیتے ہمارے منصوبے ریت کے
جاتے۔

عجیب اتفاق ہے یا اب تک میری سمجھ سے بالاتر بات ہے کہ خالہ نے فیروز پور روڈ کی اقامت چھوڑ کر
بستر اٹھایا اور 450-این، سمن آباد میں ہمیں ساتھ لے کر چلی گئیں۔ ان کی دو تین وجوہات یہ سمجھ میں آسکتی ہیں کہ
خوفزدہ تھیں کہ ہمارے ملنے والے خاص کر تقو، ڈیڈی جی اور ریزی بڑی باقاعدگی سے سکول کو اپنا ڈیرہ بنائے ہوئے
اس سے رنگ رنگ کی gossip چل نکلنے کا اندیشہ تھا۔ پھر ریزی کا لڑکیوں کے سکول میں کھپنا مشکل تھا۔ وہ غر
جانے کس طرح سارا دن گزارتا تھا۔

یہ مشکل بھی لاینحل تھی۔ خالہ جب 450-این میں شفٹ کر گئیں تو اُن کی مروت سے بعید تھا کہ وہ ہمیں
چھوڑ جاتیں۔ اب ہم دونوں بھی گویا اُن کے جہیز میں گئے۔

450-این، سمن آباد کی اس گلی میں آخری مکان تھا۔ اس طرح اسے دو رویہ پکی سڑک کا فائدہ تھا۔ ایک
عین اس کے سامنے تھی اور دوسری سڑک سمن آباد کے چھوٹے بازار کے سامنے سے گزرتی اور آگے مین بازار میں جا
اس گھر میں ایک بار پھر رونقیں ہوگئیں۔ مجھے ملنے 1۔ مزنگ روڈ والے کھلم کھلا وقت کی پابندی کو پس پشت
ڈال کر آنے لگے۔ گورنمنٹ کالج سے ریزی کا دوست ریاض نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ وہ بھی اب بلا دھڑ
آنے لگا۔

لیکن تبدیلی ہمارے تعاقب میں تھی۔ یکدم ہمارے ماموں فضل کے دونوں بچے سرفراز اور طلعت جسے ہم
گٹو بلاتے تھے، لاہور خالہ کے پاس آ گئے۔ سرفراز اُن دنوں I.C.S. کی تیاری کے آخری مرحلے میں تھا اور اُس کا
میں رہنا ناگزیر تھا۔ طلعت اپنے ایم۔ ایس۔ سی بائیولوجی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ان دونوں کے لیے تنہائی کی ضرورت تھی۔
سرفراز اس امتحان میں پاس ہو کر لاہور میں آئی جی پولیس لگ گیا اور طلعت ایم۔ ایس۔ سی کر کے

میں پروڈکشن اور کوالٹی کنٹرول میں چلی گئی۔ سال بھر بعد جب سرفراز نے امیر محمد کا لاباغ پر کیس بنا دیا تو ہر لینڈ طرح امیر محمد صاحب نے بہت بے عزتی کے بعد سرفراز کو پولیس سے ہی نکلوا دیا۔ اب سرفراز پر برے دنوں نے ... جدوجہد کے بعد ناکامی کے باعث وہ شدید Depression میں مبتلا ہو کر عین جوانی میں فوت ہو گیا لیکن یہ ... تھیں۔

جب 450۔این میں میرے اور ریزی کی وجہ سے گہما گہمی تھی۔ اشتیاق کی پوسٹنگ باہر ہو چکی تھی۔ وہ جب بھی ... آدھ دن ہمارے پاس گزارتا۔ ایسے میں کبھی کبھی اُسے رات پڑ جاتی اور وہ بھی ہمارے پاس ٹک جاتا۔ ان ... آباد کے گھروں کی دیواریں اونچی نہ تھیں۔ مین بازار کی طرف جانے والی سڑک کی جانب ایک تین فٹ اونچی ... ساتھ بنی تھی۔ رات کو تقو ریزی کا زرد پاجامہ پہن لیتا جو اُس کے گھٹنوں سے تھوڑا سا نیچے تک پہنچتا۔ ہم دونوں ... تک اس دیوار پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ تقو اپنے شفو بھائی کا دیوانہ تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں گویا وہ مجھ پر اپنی ... نگاہ رکھتا۔ میں تقو پر اس لیے مہربان تھی کہ وہ مجھے 1۔ مزنگ روڈ کی طرف ایک گیٹ راستہ لگتا تھا۔

لیکن پھر جب گٹو اور سرفراز آ گئے تو تقو بہت جلد گٹو کا دوست بن گیا لیکن رات کی محفلیں برخاست ہو گئیں۔

پتہ نہیں امی کی خودداری تھی یا اُنہیں گٹو اور سرفراز کا خیال تھا۔ اب وہ دو ایک بار ملتان سے آئیں تو کچھ سوچ ... تھیں۔ اسی لائن میں آگے چل کر ڈاکٹر سعید رہتے تھے۔ جب بھی ہمیں ضرورت پڑتی ہم اُن کے گھر جا کر بلا تکلف فون ... کر لیتے۔ ایک معمولی سا تھینک یو اور بس! بہت بعد میں جب سعید صاحب کی دونوں بیٹیاں ٹیلی ویژن سے وابستہ ... ٹاپ کی ایکٹریس بننے میں خاں صاحب سے بہت مدد ملی۔ پتہ نہیں کونسا مہرہ کس وقت استعمال میں آتا ہے ... کس وقت کس کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے۔ یہی دعا رکھنی چاہیے کہ اے باری تعالیٰ! تو اپنی مخلوق میں مجھے کسی پر آفت ... نہ فرما اور ہمیں کسی انسان کی بے عزتی کا باعث نہ بنا۔ اگر آپ اس دعا کو وطیرہ حیات بنا لیں تو آپ کو بہت جلد ... کہ آپ کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہنے لگیں گے جو معاملات میں اسلام کا بنیادی حکم ہے۔

60۔ فیروزپور روڈ سے میں اور ریزی کچھ دیر کے لیے اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 450۔این میں منتقل ہو گئے۔ ... دنوں سے پائی بھر بھی وصول نہ کرتی تھیں اور ان کی آزادی بھی سلب ہوتی تھی۔ شاید میری والدہ کی خودداری نے ایک فیصلہ کر دیا۔ خالہ سے چند گھر چھوڑ کر قریب ہی 455۔این خالی تھا۔ اس میں رہائش اختیار کی گئی اور ہم دونوں نے ... پھر بوریا بستر اٹھایا۔ تین کمروں کا یہ گھر اور باورچی خانہ ہمارے لیے بہت بڑا تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ، اس سے ملحق ... خانہ، سامنے صحن اور لیٹرین بہت کافی تھے۔ اب اس گھر میں ایک نامور ادیب اے حمید رہتا ہے، جس نے اپنے گھر ... ایک عجائب گھر میں بدل دیا ہے۔ کشمیری چائے، کلچے، نان اس گھر کا منہ ماتھا ہیں۔ اے حمید اور ان کی بیگم ریحانہ قمر بانو ... پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں یا پھر تواضع ان کا شعار ہے۔

خاں صاحب اطالیہ جا چکے تھے۔ ہم دونوں نہ کام پر لگے تھے نہ قرینہ سے ہمیں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ، طریقہ ... بھی زندگی کو بنانے کا ویسے بھی ہماری پود کو خیال تک نہ آتا۔ ہم میں ڈسپلن اور استقامت کی کمی تھی۔ میں نے اپنے ... زندگی کا ایک راستہ نکالا۔ ایک موسیقی کا استاد رکھ لیا۔ مجھے اُن دنوں گانے بجانے، ناچنے کا شوق تھا۔ ماسٹر صاحب

باقاعدگی کے ساتھ آنے لگے۔ میرا سارا وقت اُن کی شاگردی کی نذر ہونے لگا۔

اسی مصروفیت کے باعث ملازمہ کی تلاش ہوئی۔ اتفاقاً زینب اور لالو کہیں سے آ گئے اور باورچی خانہ نے سنبھال لیا۔ میں نے لکھنے کا شوق اور ناچنے کی مصروفیت جاری رکھی۔ سارے گاما لاپتے اور تھیا تھیا ناچنے کا عمل تھا۔ اُدھر ریزی بھائی بھی ہمیشہ کی طرح بیکار سڑکیں ناپنے کو بڑی مصروفیت سمجھتے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ استاد جی آتے رہے۔ میں اپنے ناول پر کام کرتی رہی۔ ایک دن اچانک اُستاد صاحب سے کہنے لگے۔ ''بی بی ایک بات تم سے کہنی تھی۔''

''جی فرمایئے۔''

''بات یہ ہے کہ میں اُدھر شاہی محلے میں بیبیوں کو تعلیم دینے جاتا ہوں۔ وہ میری کبھی اتنی عزت نہیں کرتیں جتنی آپ نے کی۔''

میں حیرانی سے اُن کا منہ تکنے لگی۔ میرے نزدیک تو اُستاد کا مقام ہی ایسا تھا کہ اُس کی عزت کیے بغیر چارہ نہ تھا۔

''آپ کو شاید پتہ نہیں نور جہاں بیگم کو بھی اُس کے اُستاد کی دعا ہے کہ ترقی کر رہی ہے۔ میں بھی آپ کو دعا دیتا ہوں اللہ آپ کو اقبال مند کرے، عروج حاصل ہو۔''

میں نے منہ جھکا کر کچھ شکریہ یہ کہنے کی کوشش کی۔

''میری ایک فرمائش ہے۔''

میں نے دل میں سوچا، اس تمہید کی اصل وجہ فرمائش تھی...... اب رنگ لائی گلہری!

''بات یہ ہے کہ مجھے یہ سارا علم میرے استاد کدر پیا نے سکھایا ہے۔ جب آپ کسی مقام پر پہنچ جائیں تو مہربانی فرما کر اُن کا کلام ضرور چھاپ دیں۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔'' ساتھ ہی انہوں نے مجھے کدر پیا کے کلام کے کاغذات پکڑا دیئے بطور نمونہ میں آپ کی خدمت میں ایک صفحہ پیش کرتی ہوں۔

کدر پیا

ٹھمری کھماج

آئی بدریا جھوم کارے کارے

انترہ

کہہ پیا پارس رُت آئی

آنگن اندھیاری چھائی

لو چھپ گئے سب ہیں تارے

ٹھمری کھماج

او چٹ گئی موری نیندریاں سن لی مرلی کی تان

انترہ کہہ رکو ؤ تمری ٹھمری بجاوت
یا تیجی بہت مورے پران

ٹھمری تلنگ

اے جی رسیارے دیکھی توری پیت
انترہ ہم سے بہانا سوتن گھر جانا
یا ہی کدرری توری ریت...... اے جی رسیارے

ٹھمری تلنگ

اے میں پیا سوں مان چلی۔ باٹ تکت تھی کب کی کھڑی
انترہ اپن دن بن کدر کل زہرت ہے
دیکھو گُسیاں نئی نئی پرت بُری

ٹھمری پیلو

ارے ری گیاں گئے کدر بدیسوا
رین دِن مورے رہے اندیسوا
انترہ گھڑی پل چھن موہے کل نہ پرت ہے
بنا سکھی اُن کا سندیسوا

ٹھمری تلک کا مود

ایسی سندر نار کہیں دیکھی ناہیں
انترہ گوری گات پرتنک نیں سونلاہٹ
کدر دیکھے پڑت ہے نین کی پرچھائیں

ٹھمری ایمن (سانجھ)

اپنی بپتا میں کا سے کہوں اے تمرے کارن جو جو دکھ پایا
تج دینو تن من دھن اور چھوڑا اپنا پرایا
انترہ کون کرے تھی ایسی برائی
کدر پیا نہیں تمری خطا کچھ
مور کہو مورے آگے آیا

ٹھمری تلنگ

اری سنولیا کا ہے پیت لگائی!
انترہ نت رہیں ہیں کدر سوتن سنگ

موسوں کرت چترائی!

ٹھمری بھیرویں

ایک نجر مکھڑا دکھلا جارے

انترہ — بن دیکھے کدر تورے کلنا پرت ہے

بھول جیوں سارا دوکھڑا اے..... ایک نجر

ٹھمری ملتانی خیال نما

آج کہو موری لاج گئی سب سکھن میں! مہاراج

انترہ — ہنس ہنس نرکھ نرکھ کدر

گر والگا ئیوا اپنے پرائے میں مہاراج.....

ٹھمری جھنجھوٹی

اب کو و پوچھے تری بات؟

تڑپے اوڈ چاہے دن رات!

انترہ — کدر پیا اُونکا ڈھونڈت ہیں

جیین تھا جن کے دم کے سات

ٹھمری کافی

استائی — بر ہمن زادا بکین لگا ہے

انترہ — ہر روز اگر نمی توانی ایماہ زلطف

گاہے گاہے

پوشیدہ اگر کنی ز اغیار

در سیر ریا من یا برا ہے

جان کر دفدا یقین نہ داری

تن بیجان شد گوا ہے

راست است کدر ہمیں کہ دانم

ظالم مفر بادشا ہے

ٹھمری شہانہ

بس ہٹو گیوں کی چترائی

انترہ — کاہے کدر اب بنتی کرت اے

اتنی کر کے ڈھٹائی

کوؤ جتن کے کچھ نہ مانوں

ایہہ تو کہو کہاں رین گنوائی

ٹھمری سندھڑا

بھٹکت نین رہے سو سورے آلی رے

انترہ کدر پیا کو سپنے میں دیکھا

چونک پڑی میں بھور بھئے

ٹھمری بھیرویں

پنگھٹوا پہ ڈھونڈن آئی میں سکھی

موری بندیا گئی رے

انترہ بھور بھئی مورے پنیاں بھرت

کدر پیا گروا لگائی

ٹھمری پیلو

استھائی پیت لگائی ہم سے چھپا کر...... ہار گئی سمجھا سمجھا کر

انترہ آکھو (آخر) کدر پیا کیو چھل کینو

گیاں اپنے بس میں لا کر

سوتن کے ڈوکھ ناہیں سنوں گی

سوئے رہوں گی میں کچھ کھا کر

ٹھمری پیلو بروا

استھائی پیت ناہیں رے گھروندے کا کھیل

کدر جب جانوں جو دوکھ جائے جھیل

انترہ بیوگ بپت پرت

تن من جلت

رکت گھٹت جیسے دلے کا پیت

ٹھمری سوہنی

پیت لگائی کا ہو سنگ؟

انترہ دیکھت ہوں میں سانج سکارے

کدر پیا لورے نت نئے ڈھنگ

ٹھمری کھماج

تمہاری بھولی بھولی صورت کے میں واری جاؤں

انترہ　　آٹھوں پیر موہے دھیان رہت ہے
کہت کدر کیسے پاؤں؟

ٹھمری دیس

تم بن مورا جیانہ بہلے

برا بھلا جو چاہے کہہ رہے

انترہ　　لاج سدم سب پت کھوئی
اسیسو توج نیہہ لگائی کوئی
کدر میں کا جانتی تھی پہلے

ٹھمری پیلو

جو گجرے تمرے من پر کدر وہ کا جانیں؟

انترہ　　اپنے جیا کی اُن سے کہو تو
چاہیں مانیں نہ مانیں

ٹھمری کافی

جانے دو موہے چھوڑ دو پیرودا

انترہ　　کدر پیا تو ہے لاج نہ ڈر ہے
اتنے لوگن یں لگانے بہت گردا

ٹھمری کھماج

جو کرموں میں ہو سو ہے سویا
تڑپت روت رب کا ہوت

انترہ　　آنکھ لگاوت ہے کدر من موہ لیو
نا کچھ جادو ٹونا

ٹھمری جھنجھوٹی

چھلا دیئو موراری کا ہے کرت بدنام

انترہ　　کدر پیا جن سے ہنست بولت ہو
ان ہی سے راکھو کام

ٹھمری پیلو

دیکھو کدر مورے گاری دینی رے

انترہ — میں تو کہنویں پر پنیاں بھرت تھی
اور نا ہک گاگر چھینی رے

ٹھمری بیاگ

دیکھو کدر نگر گگر موری بھاری
چھلکت بھیجت ساری

انترہ — بار بار پنیاں بھرن بھیجت
ساس دے دے گاری

ٹھمری کھماج وتلنگ

سکھی ری مورا جی گھر میں لگت ناہیں بن پی

انترہ — رک تو گئے کدر بدلیوا
دوج برت نندی

ٹھمری سندھڑا

سن اے ری بجنی مورے دھن دھن بھاگ

انترہ — رُک رے کدر ہمری سیجریاں
موہے لپٹ لپٹ گلے لاگ لاگ

ٹھمری کھماج

کدر پیا کیوں گئی
بولوں گی تم سے کاہی نیں

انترہ — چلو ہٹو کاہے بنتی کرت ہو
اُٹھو اُٹھو بس جاؤ وہیں

ٹھمری بھیروں

کہو کدر لاگی پار نیا دیا

انترہ — دیکھو نیا مورے بن کھویا
دوجے ہے منجدھار

ٹھمری کافی

کیو آج چھیل چھبل کنورے
چٹ پٹ لپٹ جھپٹ
مورا انچرا اینچ

اچانک کدر پیا مُکھ چوم لیو رے

ٹھمری دیس

کاہی کہوں گنیاں تمس میں رات کی بات

انترہ
سگری رین موہ پے جیسی گزری
اور جو کچھ کدر کہنی مورے سات

ٹھمری جنگلہ

کدر پیا کیسی آؤں توری پاس

انترہ
اک تو پائلیا چھن چھن باجے
دوجے جاگے موری ساس

ٹھمری جنگلہ

کدر پیا کیسے آؤں توری تیر
جات ہوں میں بھرتی نیر

انترہ
سانجھر کو سکھیاں پنیاں بھرت ہیں
پنگھٹ پر ہوئی بھیڑ

ٹھمری تلنگ

کاے کو پیت لگائی کدر چار دن کی ری

انترہ
اورن سے پیا ہنست بولت ہیں
ہم سے کرت چترائی

ٹھمری پیلو

کون بکھیڑے میں آن پھنسی گنیاں
درسن اُن کے
سُنیاں اسے جنکے
دیکھے بانکے سنولیا
رنگیلے بن کے

انترہ
گائیں بجائیں رجھائیں سکھی ری
وہ تو گُنی ہیں سب ہیں گن کے

انترہ
تب تو کدر کی ناہیں کدر تھی

اب تڑپت ہوں خبر سُن سُن کے

ٹھمری پرج

کب آئیں سیان موری گنیاں

میں توری میوں بلیاں

انترہ ساس نند موری بیرن بھوری

بابکسنا یک ہکالوئیاں لوبہاں

اپنی بپتا میں کاے کہوں کدر بن

جو جو پڑیاں سہیاں

ٹھمری بہاگ

کدر پیا نیہاں لگا کر پچھاے

انترہ ہم ترپت تم سوتن سنگ سووت ہو

نا ہک تمرے کہے میں آئے

ٹھمری کھماچ

کدر میں تو ناہیں ہوں توری ناری

کیوں بھجوئی چوز موری ساری

انترہ نہ موہے جانور نہ موہے چینو

کاہے ماری پچکاری

ٹھمری بھوپالی

کہور سیا چھل بل کیتو مائی

کر چترائی ساری رین گنوائی

انترہ کدر سوتن گھر آج گئے

اُن کی ڈھٹائی ایسی

مہکا نہ سہائی

ٹھمری جھنجوئی

بتی توری نہ مانوں نا پوچھوں توری بات

انترہ رات کدر کاہے سوتن سنگ سوئے

اور ہم سے کنیی گھات

ٹھمری کھماچ

میں پنیاں بھرن کیسے جاؤں کدر پیا؟
ایک گگر بھاری
دوجے دھک دھک کرت ناری
ڈگر چلت
پگ دھرت
ٹھہر ٹھہر کانپے جیا

ٹھمری پیلو

میں تو کدر کے کارن بھئی جوگن
تج کرتن میں بھئی بروگن
انترہ کانن کنڈل گلے مرگ چھالا
بن کے جوگن
میں پھری بن بن

ٹھمری جنگلہ پیلو

موری سکھیاں ڈھونڈ رہی
اونکا پاوت ناہیں کہیں
انترہ کدر پیا تم جنکا چاہت ہو
کا جانے کون دیس گیئں
کیسے اکھاں پھیر لیں کدر ہی ملن کی نہ آس
مورے آنسوڈ ھلنے لاگے گھلنے لاگا ماس

ٹھمری پرج

موری گجر گئی اون بن برسوں
ڈھونڈن نکسی ہوں گھر سوں
انترہ رین وفا ہمیں ترپ بیتی
اس پے درسن کے ہیں جیتی
آئی بسنت اور انبوا بورے
بہار آئی پھولی سرسوں
راہ تکت مورے نین تھکے

اب جائے کوئی یہ اُن سے کہے

جھوٹ کدرتم کیوں کرت ہو

دسونہیں کہت آج کل پرسوں

ٹھمری بارہ ماسہ

جب سے سیاں پردیسوا گیوری

من میں رہت واکا دھیان ری

انترہ
برسن گجری سیاں بن ہم کا

درسن کاارمان ری

اپنے پیا کو میں ڈھونڈن نکسی - کاہو کی نہ راکھی آن ری

انترہ
نیناں کی گھائل برہا کی مائی - ہمری یہی پہچان ری

پاتی میں لکھیو یہی موری گنیاں - تم بن نکسی پران ری

نیناں لگا کر من موہ لینو - تن من دھن اور جان ری

پیت نہ کرنا کدرسنگ کوؤ - ہم کا بھی اب کان ری

دادرا کافی

چلی گئی ہم سے سیاں مکھ موڑ

انترہ
اونکوتھا جانا کرت بہانہ کوؤ

سوتن کی اور

انترہ
دیکھے کدر کی یہ چترائی بہیاں چھڑا کر جور

دادرا پیلو

کہہ پیا ناہیں کہوں دُکھ اپنا

انترہ
ساس نند کا ڈر موہے کیسے؟

بولوں جیسے گونگی کا سپنا

ہولی پیلو

آگ لگی ایسی ہولی کو گنیاں

کیسی کدر نے مروری ہیں بہیاں

انترہ
چھین پچکاری موسے

سوتن پر رنگ ڈالا

دیکھونا ہک ہم کا جلاوت ہیں سیاں

تال ہولی کافی

اپنی بپتا کہوں کا سکھی من کی
تنک سدھ ناہیں ہم کا تن کی

انترہ — اب موری بجیا پیا، ناہیں آوت
ہو من لگی ایسی کن بیرن کی

ہولی کافی

اچانک انجرا پکڑ مورا کھینچا
چولیا مسک گئی چوریاں کرک گئیں
گروا لگت ایسے جورے سے پہنچا
کدر پیا اوروں میں تو ہنسی تھی
یہ سچ ہے بڑے مول کا سر پہنچا

ہولی کافی

پیا ہولی نہ کھیلونگی اب کی بار
تم تو بھاگت ہو رنگ ڈار ڈار

انترہ — جاؤ کدر کھیلو سب سکھین سنگ
مٹی رہی ہیں ہار ہار

ہولی کافی

رنگ نہ ڈارو پکڑ کرسیان
مانو کہا ذرا چھانڈو تو بتیاں

انترہ — کدر ہم سے تم کیوں ٹھٹھولی کرت ہو
اور بھی تو ہیں ساتھ کی گئیاں

ہولی کھماچ

کدر میں تو ناہیں ہوں توری ناری
کیوں بھجوئی چونر موری ساری

انترہ — نا موہے جانو نا موہے چینہو (چنی ہو)
کاہے ماری پچکاری

دوہڑہ جوگن

برسوں سے وہ آئے نہیں رہی اکیلی سوئے

ترپت رُوت بیٹھ رہے ہیں اسون سے منہ دھوئے
کدر پیا سے نہیہ لگائے سمجھ جنم کا سات
کدر پیا بن ہمکا گنیاں دن سوجھے نہ رات
کدر کی مورت آنکھ میں ہے پتلی وین بجھائے
تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے تو اور کہاں سے آئے
سرمہ دوں تو گر گر جائے کاجل دیا نہ جائے
جن نینن میں پی بسیں دوجا کون سمائے؟
آؤ پیا تم نینن میں پلک ڈھانپ تو ہے لوں
نا میں دیکھوں اور کونا تو ہے دیکھن دوں
ارے پپیہے بانورے تو آدھی رات نہ کوک
ہولی ہولی سلگن دے اک بارست بھوک
آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل بھی جال جائے
پاپی جیارا نہ جلے کہ جا میں آہ سمائے
سجن سکاری جائیں اور نین بریں گے لائے
بدھنا ایسی رین کو کہ بھور کبھی نہ ہوئے

دوہڑہ

جب دانتوں کی چمک پڑی تو رنگ بھیا سفید
بجلی گرتی رو کے کون اور کیا کرکے بید؟

روم سے...... 60' فیروز پور روڈ کا تعلق

ہمیں 14۔ایس کینال پارک کے مالک مکان نے پیغام بھجوایا کہ وہ سارا گھر استعمال میں لانا چاہتے لیے گھر کو خالی کر دیا جائے۔ وہ ایک ایسا عہد تھا جب مالک مکان بھی دھونس سے گھر خالی نہ کرواتے تھے نہ کسی دیتے تھے۔ ہم نے شرمندہ شرمندہ اپنا سامان ریڑھیوں پر لادا اور 60۔ فیروز پور روڈ روانہ ہو گئے۔ ان دنوں طرح سامان سے لدے ریڑھے عام نظر آتے تھے۔

یہ لڑکیوں کا سکول تھا جس میں دسویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ میری خالہ کے لیے ہمیں سٹاف اور چھپا کر رکھنا بڑی بدنامی کا باعث ہو سکتا تھا۔ محکمہ اُن کی انکوائری کر سکتا تھا، لیکن ابھی لہو سفید نہ ہوا تھا۔ ہماری خا تھیں اس لیے اُنھوں نے اپنی ساری شفقت مادری ہم پر مرکوز کر رکھی تھی۔

خالہ نے ہمیں سکول کے بائیں ہاتھ یہی دو چھوٹے چھوٹے کمرے رہنے کے لیے دیے جن کے ساتھ غسل خانہ بھی تھا۔ سکول کے پچھواڑے ایک گراؤنڈ تھی جس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ درخت اُگے ہوئے تھے ہاتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور سرونٹ کوارٹر تھا جس میں ہماری نئی ملازمہ اور اس کی بیٹی خورشید نے قیام ہیڈ مسٹریس کی رہائش گاہ تھی۔ ہیڈ مسٹریس کے رہنے کے لیے دو کمرے مختص تھے۔

یہ پاکستان کے ابتدائی ہیجانی سال تھے۔ اوپر سے ریزی بھائی کا مسئلہ گھمبیر تھا، بلکہ سارا مسئلہ ہی میں تو خالہ کے ساتھ کسی طرح کھپ سکتی تھی لیکن ریزی کا رکھنا دشوار تھا۔ وہ پہلی گھنٹی بجنے اور ''لب پہ آتی ہے دعا'' سے بہت پہلے سکول سے باہر نکل جاتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سڑکیں ناپتے، نوکری تلاش کرتے یا کام کی کھوج لگا سکول اُس وقت لوٹتے جب ساری بلڈنگ ویران ہو جاتی۔ کبھی باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا لیتے، کبھی خورشید کھانا لگا کر کمروں میں لے آتی۔

اس سکول میں شام کے وقت دسویں کی خالی جماعت میں ہمارے ملنے والے آ جاتے۔ اب 1-مزنگ والوں کا خوف اور دھڑکا بہت کم ہو چکا تھا۔ خاں صاحب روم سدھار چکے تھے۔ شادی کا سائرن بند تھا۔ افتخار بھائی

ہمارے پاس باقاعدگی سے آنے لگے۔ یہ بھی ایک دوہری Situation تھی۔ جس قدر 1- مزنگ روڈ
ملنے لگے تھے، اُسی قدر تواتر کے ساتھ روم سے خاں صاحب کے خطوں نے میرے اندر دھوم مچا رکھی
ختم ہوتا میں سکول کے باہر نکلتے ہوئے پوسٹ بکس کی طرف لپکتی۔ بہت کم ایسے ہوا کہ مجھے خاں صاحب کا

سے ہماری دوستی 24- کینال پارک میں ہو چکی تھی۔ وہ ایک Sportsman ہے۔ بیٹھ کر غیبت کرنا
اور کرنا اُس کا محبوب مشغلہ کبھی بھی نہیں رہا۔ کینال پارک میں اُس نے ہمیں خوب کرکٹ کھلائی اور
کی لکن میٹی "Smy" سے بھی متعارف کرایا۔ اس کی پوسٹنگ لاہور سے باہر ہوئی تھی لیکن جب بھی وہ
میں ملنے شام کے وقت ضرور آتا۔

کی محبت میں عجب اپنائیت تھی۔ اُسے دیکھ کر لگتا گویا ہم اکٹھے بڑھے پلے ہوں۔ اس پر سکھوں سے میل
۔ وہ بھابھی کے رشتے کو ماں، دوست، بہن اور آدھی گھر والی کے طور پر دیکھتا اور جانچتا اور پرکھتا تھا۔

بھی ریزی کی طرح شام یا گہری شام کے وقت آتا۔ وہ کبھی پچھلے کمروں میں نہ بیٹھتا بلکہ دسویں جماعت
روم میں کرسی نکال کر ڈسک پر کہنیاں جما کر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی چاک اٹھا کر ڈسک پر ہی الٹی سیدھی تصویر
کے وقت پچھلے باورچی خانے میں یا اسی ڈسک پر بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتا۔

سکول میں تقو کی ملاقات محمودہ منظور سے ہوئی۔ محمودہ منظور جے وی پاس تھی اور ملتان میں میری والدہ کی
۔ وہ اول اول تو میری والدہ کو خوش کرنے کے لیے اُن کا تعاقب کرتی رہی، لیکن پھر رفتہ رفتہ میری دوست بن گئی۔
یکطرفہ تھی کیونکہ اس میں محمودہ کی طرف سے بہت زیادہ جذبہ اور اظہار تھا۔ اُس کے والد تو حیات نہ تھے
والدہ باغبان پورہ میں رہتی تھیں اور ایک سکول چلاتی تھیں۔ مجھے اور ریزی کو کبھی اُن کے گھر جانے کا اتفاق نہ
میں بیشتر وقت وہ ہمارے ساتھ رہتی، یہیں اُس کی ملاقات تقو سے رہتی۔

محمودہ کا جسم بے حد متناسب تھا لیکن شکل سادہ تھی۔ کبھی کبھی تقو اس کا مورال بلند کرنے کے لیے کہتا...... "وہ بھی
جیسے ورگا" اسی سلوگن نے محمودہ کا نام "بجّو" ڈال دیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کرکٹ اور "سمی" (Smy) کھیلنے لگی
Smy چل نہ سکی کیونکہ کمروں میں ڈسک اور کرسیاں زیادہ تھیں۔ اس لیے کچھ دیر بعد یہ کھیل چھوڑ دی گئی اور
پر اکتفا کیا گیا۔

باقی مزنگ روڈ والے تو ابھی سکول کی طرف رخ نہ کرتے تھے لیکن تقو سے بھی زیادہ افتخار بھائی ہماری دلجوئی اور
کے لیے سکول کا رخ کرتے۔ وہ مجھ سے بہت کم بولتے تھے لیکن میری خالہ (ماسی جی) ماچھی جی اور ریزی سے اُن
کی چھنتی تھی۔ وہ ماچھا کو اپنی "کالی ماں" کہہ کر بلاتے تھے۔ ابھی افتخار بھائی میرے لیے ڈیڈی جی نہ بنے تھے۔
وہ مجھے جانچنے' آنکنے اور پرکھنے کے لیے آتے تھے۔ مجھے وہم پالنے کی عادت ہے۔ میں ان دونوں بھائیوں کے آنے
سے سمجھنے لگی کہ شاید میری جملہ کمتری کو دل سے مزنگ روڈ والوں نے معاف کر دیا ہے اور واقعی انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے
شاید وہ لوگ صرف اتنا سمجھتے تھے کہ خطرہ ٹل گیا۔ روم میں کوئی اطالوی لڑکی (میم) پسند آ جائے اور وہ خواہ مخواہ کی

بدمزگی مول نہ لیں۔

ڈیڈی جی دل کے نرم، انسان دوست اور کامریڈ قسم کے شخص تھے۔ جب باباجی کی وفات کے بعد کچھ عرصہ
لیے اُنہوں نے فیسرین کا کام بھی سنبھالا۔ یہاں اُن کا دفتر اُن سیڑھیوں کے ساتھ تھا جو اوپر شقو جی کے چوبارے
تھیں۔ یہاں اس دفتر میں اُن کی آدرشی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ اُن کے پاس آنے لگے اور اُن میں لیڈرشپ کی
اُبھرنے لگیں۔ شاید لیڈرشپ کی خوبی جس کی وجہ سے وہ بعد میں میری اور خاں صاحب کی شادی میں کود پڑے
شادی کی پاداش میں انہیں 1-مزنگ روڈ سے باباجی نے نکال دیا تھا، لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی 60-

ابھی تو میں آپ کو اُن لوگوں سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہی ہوں جو سکول میں ہماری بے سر
باوجود ہم سے جڑے رہے۔ ککھو ڈیڈی اور تقو کے بعد ناہید میرے پاس سکول آنے لگی۔ ناہید خاں صاحب
آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب احمد خاں کی بیٹی ہے (اور ڈاکٹر ایوب خاں ماڈل ٹاؤن میں 36-جی میں رہتے
فرخندہ کو کم اور اماں جی سردار بیگم کو اپنی والدہ زیادہ سمجھتی تھی۔

جن دنوں شقو جی مزنگ روڈ میں رہا کرتے تھے اور ناہید اپنے گھر ماڈل ٹاؤن میں رہنے کے بجائے
میں مقیم تھی تو خاں صاحب نے ناہید کو پڑھانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ ناہید پیدائشی آرٹسٹ تھی۔ وہ
تصویروں میں رنگ بھرنے میں مشغول رہتی تھی۔ ابھی اُس کا یہ جوہر آشکارنہ ہوا تھا لیکن ایک ست الوجود آرٹسٹ
اُسے کبھی اس فکر نے نہ ستایا کہ اُس کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے محنت، کوشش، جدوجہد کے ساتھ کسی منزل کے لیے
ہوگا۔

جب 1950ء میں ابھی خاں صاحب روم نہ سدھارے تھے، ناہید بڑی سعادت مندی کے ساتھ
دوپٹے سے ڈھانپ کتابیں ہاتھ میں لے کر اندر والی سیڑھیوں سے چڑھ کر خاں صاحب کے پاس اوپر چوبارے
پہنچتی۔ خاں صاحب اُسے پڑھاتے۔ وہ نہ کبھی کوئی چیز نوٹ کرتی نہ دوہراتی۔ دوسرے دن خاں صاحب پوچھتے۔
جو سوالات میں نے تمہیں حل کرنے کے لیے دیئے تھے، وہ ہوم ورک کر لیا؟''

ناہید کی خوبصورت براؤن آنکھیں تحیر سے بھر جاتیں۔ ''کون سے سوالات شقو بھائی؟''

''اچھا وہ مضمون پڑھ لیے جن پر میں نے نشان لگا کر دیا تھا؟''

وہ مظلوم بن کر نظریں جھکا لیتی اور مری سی آواز میں کہتی۔ ''کون سے نشان شقو بھائی؟''

خاں صاحب اپنی تمام تر قوت برداشت کے باوجود چڑ جاتے۔ ''سارا دن کیا کرتی رہتی ہے بریتی؟
ہے اپنے وقت کا؟ کس طرح اپنا سونا پیتل کرتی ہے؟''

ان جھڑکیوں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ معصومیت سے سوال کرتی۔ ''شقو بھائی! بریتی کیا ہوتی ہے؟''

پنسل سے اپنے بالوں کو کریدتے ہوئے شقو جی کہتے ''خشکی کا وہ ریتلا ٹکڑا جو دریا کے بیچ بھیگنے سے
ہے۔ پانی اُس کے دائیں بائیں سے گزرتا ہے لیکن وہ بریتی خشک رہتی ہے۔ تیرے اردگرد علم کا دریا بہہ رہا ہے غافل

[illegible] تو کسی یہ وقت واپس نہیں آئے گا اور کچھ نہیں تو پینٹنگ میں ہی نام پیدا کر۔ کوئی سمت کوئی شوق کوئی جہت تو ایسی [illegible] پر چل کر تو اپنی زندگی کو با مقصد بنائے۔ تیری کوئی اپنی شناخت ہو۔"

یہ مکالمہ شفو جی نے کئی بار دہرایا لیکن اس اُکسانے سے ناہید نے نہ کبھی کچھ سیکھا نہ برا ہی منایا۔ روم جانے سے پہلے [illegible] خاں صاحب نے مجھ سے کہا۔

"قدسیہ میرا ایک کام کر دو گی؟"

"جی۔"

"ناہید کو تم جانتی ہو۔ اُسے ذرا بی اے کرا دو۔ وہ شہد سے میٹھی اور سمندر سے گہری ہے لیکن میرے قابو میں بریتی [illegible]"

"جی میں کچھ باقاعدہ استاد نہیں ہوں۔ میری کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔"

"استاد ہونا ضروری نہیں، تم میں صبر زیادہ ہے۔"

بغیر سوچے سمجھے ہمیشہ کی طرح میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔

لیکن اس وعدے کو ایفا کرنے کا وقت 60-فیروز پور روڈ میں ایفا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پڑھانے میں [illegible] بھی ہوگی۔ پڑھانے سے پہلے میں رتی بھر خوفزدہ نہیں تھی کیونکہ میرے آئی کیو میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ میں کوئی [illegible] کیے بغیر کر لیتی ہوں۔ پھر اس Impulsive فیصلے کو توڑ نبھانے کے لیے صدقِ دل سے ایڑی چوٹی کا زور بھی [illegible] ہوں۔ عام طور پر اللہ میاں میری لاج رکھ لیتا ہے اور میرے عیوب کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے۔ اسی ستر پوشی کے طفیل [illegible] کا بھید معاشرے میں کھلنے نہیں دیتا اور میری محنت، لگن کو ترقی، کامیابی اور عزت میں بدل کر میری محنت [illegible] دیتا ہے۔

اس سکول میں میرے پاس ناہید کے آنے کی وجہ اُس کا بی اے کا درپیش مرحلہ تھا۔

تقو کی طرح ناہید بھی عموماً شام کو ہی سکول پہنچتی۔ ہم دونوں یا ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں یا پھر دسویں جماعت کی [illegible] کلاس میں بیٹھ کر پڑھتے۔ اگر اُسے کھانے کی طلب ہوتی تو وہ یہیں بیٹھ کر دال دلیہ کھا لیتی۔ ناہید کبھی بھی خوش خوراک [illegible]۔ اس زمانے میں ابھی ریستورانوں کی بھرمار نہ ہونے کی وجہ سے ہماری ساری پود گھر کے سادہ کھانے خوشی سے کھایا [illegible]۔ کمرے میں چاک کی خوشبو کسی ڈیسک پر ربڑ پنسل پڑی نظر آ جاتی۔ ڈائننگ روم تو کیا' مناسب میز بھی نہ ملتا۔

ناہید تو ازلی بریتی تھی لیکن مجھے اسے پڑھانے، اُکسانے اور محنت پر راغب کرنے کا طریقہ نہ آیا۔ وہ نہ تو کبھی [illegible] لکھتی نہ نوٹس بناتی نہ کبھی کسی جواب کو دوہرانے کی کوشش کرتی لیکن لڑکی بنیادی طور پر ذہین تھی۔ میں کورس کی کتابوں سے پڑھتے جاتی تو وہ بے توجہی سے سنے جاتی۔ جیسے کیسے امتحان کا وقت آ گیا۔

کنیئرڈ کالج اس کا سینٹر بنا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت پر امتحان دینے آ جاتی۔ اکیڈیمک کمروں میں امتحان گاہ میں پہنچ جاتی۔ مجھے ہر لحظہ خوف رہتا کہ کہیں وہ پرچہ نہ چھوڑ دے یا ماڈل ٹاؤن سے آنا ہی نہ بھول جائے۔ ریزی مجھے [illegible] سے بہت پہلے کالج کی لان میں چھوڑ جاتا۔ جب ناہید امتحانی گتا، جیومٹری بکس، پن، فتا لے کر مجھ تک پہنچتی تو میں

شکر کا سانس لیتی۔

''پرچہ کیسا ہوا؟''

''اچھا ہوا ہے قدسیہ آپا۔''

میں امتحانی پرچہ غور سے دیکھتی۔

''اور اس سوال پر نشان نہیں لگایا، یہ چھوڑ دیا؟''

''بس ٹائم نہیں ملا قدسیہ آپا۔''

میں اس خیال سے کہ کہیں اگلے پرچے نہ چھوڑ دے، چپ رہتی لیکن میری حیرانی کی حد نہ رہی جب صاحب کی لاڈلی چھوٹی بہن (یا بھانجی) نے رزلٹ آنے پر سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

ان ہی دنوں میں جب ہم سکول میں منتقل ہوئے تو آپا فرحت نے سمن آباد میں گھر خرید لیا اور وہ بھی ... ہو لے میرے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگیں لیکن اُن کی کتابیں دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں ... ثقیل کتابیں کبھی پڑھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ پھر بھی میں نے اُن کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی۔ وہ بھی بغیر ... کیے آتی جاتی رہیں لیکن ذہین آپا فرحت نے سمجھ لیا کہ یہ پڑھائی نہ استاد کے بس کی ہے نہ شاگرد اس سے کچھ حاصل ... ہے۔ رفتہ رفتہ ناغے پڑنے لگے۔ وہ نوٹس بنانا چاہتی تھیں۔ سوال کرنے کی خواہش مند تھیں۔ یہ سب کچھ میرے ... نہ تھا اور بالآخر آپا جی نے سکول آنا چھوڑ دیا۔

خاں صاحب کو جب یہ اطلاع ملی انہوں نے کسی خط میں مجھ سے برملا نہ پوچھا کہ ایسی کوتاہی کی وجہ ... آپا جی کیوں پڑھنا چھوڑ گئیں۔ خاں صاحب مجھے بغیر کسی سوال جواب کے خط لکھتے رہے۔ حالات کچھ امید افزا نہیں ... لیکن میرے اندر امید کا چھوٹا سا دیا جلتا رہا۔ غالباً اس دیئے کا تیل وہ خط اور کارڈ تھے جو مجھے روم سے ملتے تھے۔ ان خطوں میں کسی قسم کا وعدہ شادی کے لیے کوئی التجا وغیرہ کبھی رقم نہیں ہوئی لیکن اپنائیت سے لکھے گئے ان خطوں میں اپنے ... پیش آئے تجربات، مغربی لوگوں سے ملنے کے بعد تاثرات اور ثقافتی تقابل کی خوبصورت تفصیل ہوتی تھیں۔

میرے سکول میں رہنے کے باعث ایسی ٹیچرز سے دوستی ہوگئی جو نہ جانے کیوں میری طرف ملتفت تھیں۔ ... اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کی بھانجی تھی اور میرے کندھے پر بھی ایک اضافی بلا لگا تھا۔ ان دوستوں میں ... سے قابل ذکر محمودہ اصغر تھی۔ وہ 30-جیل روڈ پر رہتی تھی اور مورس کار میں سکول آیا کرتی۔ مجھے اس کا یہ دبدبہ اور ''شو شپا'' دل سے بھاتا۔ اس کا دنیاوی Status سکول والی مڈل کلاس استانیوں اور شاگردوں سمیت زیادہ تھا۔

محمودہ کے والد انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان سے کچھ تو میری دوستی کی وجہ سے اور کچھ میری خالہ کی مرعوبیت کے باعث تعلقات بڑھ گئے۔ اصغر صاحب بھی ہر بڑے آدمی کی طرح اندر سے تنہائی کا شکار تھے۔ ان کی بیگم ایک سیدھی سادی خاتون خانہ تھیں لیکن ان میں ایک خوبی اچھی خانہ داری کے علاوہ بھی تھی۔ وہ ڈھولک بہت عمدہ ... تھیں۔

ہم اُن کے گھر جاتے تو میری خالہ اصغر صاحب کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتیں۔ تاش اور ...

بچے خاندانی اِن ڈور کھیل تھے۔ محمودہ کی والدہ ہر بڑے آدمی کی بیوی کی طرح Left out محسوس کرتیں تو وہ میرے
ساتھ ڈھولک بجانے میں مشغول ہو جاتیں۔ میں روڑا یا چھوٹی چمچ بجاتی۔ پھر ہم دونوں مل کر شادی بیاہ کے گیت اور ادھر
ادھر سے اکٹھے کیے فوک گیت گاتے۔ محمودہ نہ تو تاش کھیلتی نہ کبھی ہمارے ساتھ سنگت ہی کرتی۔ اس کا وقت کبھی میز سجانے یا
گھر کی آرائش درست کرنے میں لگتا۔ محمودہ اصغر کے گھر لذیذ کھانے ہمیشہ ہمارا سواگت کرتے۔

محمودہ اصغر کی دو اور شناختیں بھی تھیں۔ اس کی شادی اظہر صاحب سے ہوئی جو پاکستانی حکومت کے پہلے
اکنامک ایڈوائزر رہے۔ کسی سفارش کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس زمانے میں Economic Wizard تھے اور
ساؤتھ ایشیا کی معیشت پر اُن کی گہری نظر تھی۔ دوسری پہچان محمودہ کی اس کی چھوٹی بہن مشہور و معروف ادیبہ خالدہ حسین
تھیں۔ سکول کے دور میں خالدہ بہت چھوٹی تھی۔ وہ ہم دونوں کی دوستی کو منہ میں انگلی ڈال کر دیکھنے کی عمر میں تھی۔

مجھے دوپہر کو سونے کی عادت ہمیشہ سے ہے۔ جب کبھی میں محمودہ کے گھر دوپہر کو ہوتی تو خالدہ بھی میرے اور
محمودہ کے ساتھ تکیہ جوڑ کر لیٹتی۔ خالدہ اُس زمانے میں پڑھنے کی رسیا تھی۔ یہی شوق آگے چل کر خود اُسے لکھنے کی شکل میں
لے گیا۔ اس شوق کے علاوہ اسے لڈی، بھنگڑا اور کچھ کچھ کلاسیکی ناچ کی طرف بھی رغبت تھی۔

محمودہ اظہر کے علاوہ میری پرانی دوست نسرین رشید اور شمیم رشید بھی آ جاتیں۔ ان دونوں لڑکیوں سے میری
ملاقات ایک آدھ بار ملتان میں بھی ہوئی تھی۔ وہاں اُن کے والد رشید صاحب ملتان میں ان دنوں ڈپٹی کمشنر تھے اور اُن کی
ہمارے نانا کے مراسم کافی جاندار تھے۔ ابھی نسرین بی اے کرنے کے مرحلے میں تھی۔

ناہید کی پڑھائی کا مرحلہ ختم ہوا تو ناہید آپا فرحت کے پاس سمن آباد میں منتقل ہو گئی۔ پھیرا تورا قائم رہا۔ میری
سہیلیاں ناہید کو جھونگے (بانگی) میں مل گئیں۔ ایک روز ہم سہیلیوں نے ناہید کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ پیدل نالے کے ساتھ
ساتھ قافلہ روانہ ہوا۔ اتفاقاً پیچھے سے ایک ریڑھے والا نظر آیا۔ ہم نے اُس کا راستہ روک کر ٹھہرایا۔ شریف آدمی نے بلا چون
و چرا ریڑھا روک لیا۔ سب اس میں سوار ہو گئیں اور سمن آباد کا رخ کیا۔ چندہ کر کے پیسے اکٹھے کیے جو غالباً اُجرت سے کم
تھے مگر شریف آدمی نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ ہمیں بغیر کوئی مذاق یا جھگڑا کیے سمن آباد آپا جی فرحت کے گھر اُتار دیا۔

ہم آج کی نوجوان نسل پر آزادروی کا لیبل لگاتے ہیں لیکن ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ ہر بیس پچیس سال
کے بعد آزادی کا معیار بدل جاتا ہے۔ یہی ارتقاء کا راستہ ہے۔ ہمیں پسند آئے نہ آئے اللہ اسی طرح تبدیلی لاتا چلا جاتا
ہے۔ ہمارے عہد میں بھی فاسٹ فوڈ تھا۔ گول گپے، دہی بھلے، چکڑ چھولے، پکوڑے ہماری پود کے پسندیدہ تھے اور ماں
باپ ان چسکوں سے منع کرتے تھے جیسے آج برگر، چپس اور سوفٹ ڈرنک سے منع کرتے ہیں۔ تب فون نہ تھے غائبانہ گفتگو
انٹرنیٹ پر ہو سکتی تھی نہ فون پر لیکن خطوں کے کبوتر اور چوری چھپے کی ملاقاتیں عام تھیں۔ ایک موت ایسی اٹل حقیقت ہے
جسے انسان آنکھوں سے دیکھتا اور جھٹلا نہیں سکتا۔ باقی سب کچھ اُس کی بصیرت اور آئی کیو اور جینز پر منحصر ہے۔ وہ کیا کچھ سمجھ
پاتا ہے کس چیز سے کیا سیکھتا ہے؟

میں نے اسی سکول میں اپنا ایک ناول قریب قریب مکمل کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد کے واقعات اور نشیب و
فراز مکمل نہ ہو سکے اور نیت کی تھیم پر یہ ناول تا حال نامکمل ہے۔ اپنے پڑھنے پڑھانے کے شغل میں مجھے پانچویں جماعت

میں انارکلی ڈرامے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں چھوٹی عمر سے انارکلی کے کردار میں ڈھل جانے کی خواہش رکھتی
اس خواب نے ابھر کر مجھے ستانا شروع کیا۔

میں نے سید امتیاز علی تاج کے اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کی ٹھان لی۔ پیچھے میری نیت یہ تھی کہ میں انارکلی
ادا کروں گی۔ محمودہ اظہر شہزادہ سلیم کا کردار تیار کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو بلایا اور استدعا کی کہ وہ دلآ رام کا رول
لیکن وہ بیچاری روایت پسند بدک گئی کیونکہ میں یہ ڈرامہ آرٹس کونسل میں کرنا چاہتی تھی۔ خیر سکول کی ایک ٹیچر بلقیس
دے دیا گیا۔ اکبر کے رول کے لیے تھوڑی سی مشکل درپیش تھی لیکن پھر نسرین نے یہ ذمہ داری اٹھائی۔

نسرین نے بادشاہ اکبر کا رول اپنایا۔ چونکہ قد ذرا چھوٹا تھا اس لیے ہیل والی جوتیاں پہن کر اُوپر
زیب تن کر کے سٹیج پر براجمان ہوتی۔ اس زمانے میں نسبت روڈ پر ایک ''ہالی وڈ ٹیلرز'' ہوا کرتے تھے۔ فلموں کے
لباسوں کا سٹاک رکھتے تھے۔ پیسے جمع کر کے ان سے ساری کاسٹ کے ملبوسات جمع کیے۔ ناہید کو ڈرامے میں
لیکن وہ سکول میں ہونے والی ریہرسلوں پر آ جاتی اور بڑے مزے کا وقت گزرتا۔

ہال کے لیے آرٹس کونسل کی طرف رجوع کیا۔ نئی بلڈنگ میں ایک لمبوترا سا سٹوڈیو دائیں طرف
جس پر سٹیج شو اور ڈرامے کبھی کبھی منعقد کیے جاتے۔ میں وہاں پہنچی، یہیں میری پہلی ملاقات انور سجاد سے ہوئی
کی طرح اُس میں قدرتی تجسس تھا۔

''آپ؟''

''میرا نام قدسیہ چٹھہ ہے اور میں یہاں انارکلی ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن یہ تو بہت Elaborate مغلیہ ماحول کا ڈرامہ ہے۔ آپ کیسے......؟''

''ہم کر لیں گے۔ آپ تاریخیں دے دیجیے۔''

''وہ تو میں دے ہی دوں گا لیکن کیا آپ کو ایسا کوئی تجربہ پہلے بھی ہے؟''

''جی نہیں تجربہ تو نہیں ہے لیکن کر لیں گے...... تجربہ۔''

''سلیم کا رول کون کرے گا؟'' انہوں نے چند فلمی ایکٹروں کے نام مدد کے لیے پیش کیے۔

''جی نہیں اس میں مرد کاسٹ شامل نہیں ہے۔ ہم لڑکیاں ہی سارا کام کریں گی۔''

انور سجاد نے ابرو اٹھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ چاپ تاریخیں دے دیں۔

اس ڈرامے کے دوران دو عجیب واقعات ہوئے۔ ناہید اپنے ساتھ اماں جی سردار بیگم کو لے کر ڈرامہ دیکھنے
آ گئیں۔ سٹیج کی لائٹیں اور مغلیہ سیٹ میرے بھائی ریزی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ واقعی سٹیج دیکھ کر لگتا تھا کہ مغلیہ دربار کا
حصہ روشن ہو گیا۔ جب وہ سین آیا جب شہزادہ سلیم سے لپٹ کر انارکلی اپنے کنیز ہونے پر روتی ہے اور شہزادے کو اپنی خواہش
سے باز رکھنا چاہتی ہے تو میں نے سٹیج پر وارفتگی کے عالم میں اتنے آنسو بہائے اور یوں محمودہ سے لپٹی کہ اس عشق و عاشقی
اماں جی جو پرانی وضع کی خاتون تھیں، برداشت نہ کر سکیں اور غصے سے اُٹھ کر باہر نکل گئیں۔ ناہید کو بھی بادل نخواستہ ساتھ
کر جانا پڑا۔

اس واقعے کا میں نے کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ اس وقت ڈرامہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔

دوسرا واقعہ اس سے بڑی حیرت کا موجب ہوا۔ اس ڈرامے کی سکول میں خوب ٹکٹیں بکی تھیں۔ لڑکیوں نے رشتہ داروں سے پیسے وصول کیے تھے اور ہماری خزانچی محمودہ نے بڑی رقم جمع کر لی تھی۔ جس وقت ہم سب اپنا سامان لے کر کمرے سے جانے کو تھے تو ایک بار پھر انور سجاد وارد ہو گئے۔

"آپ کا ڈرامہ تو بہت کامیاب گیا۔"

"ہاں جی۔"

"ایک بات ہے قدسیہ۔ میرے پاس ایک فلم کے ڈائریکٹر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"فلم ڈائریکٹر؟"

"وہ آپ کو اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے؟...... پر انہیں کیسے پتہ چلا؟"

"یہ فلمی لوگ ٹیلنٹ ہنٹ کرتے رہتے ہیں بانو صاحبہ۔ کسی سراغ رساں نے انہیں خبر دی ہوگی۔ آپ کرنا میرے آفس میں چل کر اُن سے مل لیں۔"

"نہیں سجاد صاحب! مجھے ایسی اجازت گھر سے نہیں ملے گی۔ اُن سے ملنے کا فائدہ۔"

میں انور سجاد کو انکار کر کے واپس لوٹی تو میرے دل میں عجیب قسم کا ملال تھا۔ شاید اس روز میرے Career کا فیصلہ آپ ہی آپ ہو گیا۔ اگر اس روز میں فلموں میں چلی جاتی تو شاید ادیب بننا میرے مقدر سے غائب کر دیا جاتا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کے ہر دوراہے پر انسان کو اپنا فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اللہ میاں بھی انسان کی اس آزادی میں حائل نہیں ہوتا۔ اُس نے تضاد سے انسانی لہو کی تشکیل کی ہے۔ یہاں صاف اور گندے لہو آپس میں گڈمڈ ہیں۔ بحکم اللہ کبھی نہیں دیتا۔ یہ ہر انسان کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے کہ وہ کس دوراہے پر پہنچ کر کونسی تضاد کی راہ اختیار کرے گا۔ اسی فیصلے میں اُس کے سفر کی چال، کامیابی اور ناکامی کا لیول مضمر ہے۔

ناہید نے جب اماں جی کے ساتھ چلے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس نے ماننے والوں سعادت مند لوگوں میں اپنا نام لکھ لیا۔ وہ دل سے ہم جیسی ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ تھی لیکن اس اندرونی سوچ کے باوجود اس کا عمل ثبت اور راسخ تھا۔ وہ کوئی کام نہ کرنا چاہتی تھی جس سے ان کے بزرگوں کے دل دُکھیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس فیصلے پر پہنچی کہ شاید مجھے بھی خود معاملگی اور خودساختہ آزادی کو خدا حافظ کہہ کر ہی اشفاق صاحب کے گھر میں داخلے کی ٹکٹ مل سکتی ہے۔ میں اس اپنے گروہ کی خود معین کردہ لیڈر تھی۔ ریزی غریب سارا دن غائب رہنے کے باعث اور بیکار ہونے کے ہاتھوں غریب ماں کی طرح کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ والدہ ملتان میں تھیں۔ خالہ ویسے ہی احسان جتا کر اب اپنا کیا دھرا ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے کبھی روک ٹوک کا سہارا نہیں لیا۔ اِدھر اس ساری خودسری کو ناہید کی طرح تج کر مجھے کچھ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ اُدھر اُن خطوں نے امید کا دیا روشن کر رکھا تھا۔

جب خاں صاحب روم سے لوٹے تو میں 455-این میں مقیم تھی۔ میری شیخیاں سُنیں تو منہ سے انہیں نہ کہا۔ صرف آہستہ سے بولے۔ ''اچھا وہ فارسی غزل جو تم نے گائی تھی ذرا وہ تو سناؤ'' میں نے گائے بغیر فارسی غزل پڑھ دیا۔ انہوں نے اپنا سر انگلی سے کھجلاتے ہوئے کہا ''قدسیہ! کسی سے تلفظ ٹھیک کروا لینا تھا۔ تمہیں معلوم ہے تلفظ سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔'' ''روکو مت جانے دو'' کے اور معنی ہیں اور ''روکو! مت جانے دو......'' کے کچھ اور معنی ہیں۔ وقفے سے سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔'' کچھ انور سجاد کا واقعہ مجھے سرد کر گیا تھا لیکن اس کے بعد میرا Career بیٹھ رک گیا۔ میں ایک عرصے سے ایکٹریس بننے کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق واجبی سا تھا راستے پر بورڈ لگ گیا۔ ''روکو! مت جانے دو۔''

آہستہ آہستہ خاں صاحب نے ہی میرے اس ثانوی شوق کی پرورش کی اور اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے ہی میرے دل میں یہ فیصلہ صادر کر دیا ورنہ اُس دوسرے راستے پر چل کر مجھے کچھ زیادہ ہی ناکامی کا سامنا ہوتا۔

اب میں برسوں کے لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرے لکھنے اور خاں صاحب کے لکھنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ Conviction کے آدمی تھے۔ انہوں نے جب بھی قلم اٹھایا اُن کی تحریر میں یہ Conviction صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

میں لکھتی ضرور ہوں لیکن میرے لیے یہ شغل ہمیشہ دوئم درجے کی Activity رہا۔

میں نے کبھی اسے اولیں جگہ نہیں دی۔ جس طرح خاں صاحب اور کچھ اور میرے واقف کار ادیب لکھنے کو ترجیح دے کر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ جو کچھ مجھے ایم اے کی تعلیم میں نصیب ہو گیا میرے لیے کافی تھا۔ میں جو کچھ پڑھتی تھی کسی افادیت کے پیشِ نظر مطالعہ نہ تھا۔

60-فیروز پور روڈ سے میری خالہ فیروزہ 450-این میں منتقل ہو گئیں۔

میں اور ریزی اُن کے دم چھلے بھی ساتھ گئے۔ یہاں خاں صاحب کے خطوں نے ڈھارس بندھائے رکھی۔ ان کی پوسٹنگ اُن دنوں کھاریاں میں تھی۔ وہ جب بھی آتا ہمارے پاس ضرور آتا۔ رات کو ریزی کا پاجامہ پہن لیتا جو اس کے گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے تک آتا تھا۔

سمن آباد کے اس کوارٹر کی ساخت ایسی تھی کہ اس کا فرنٹ سامنے والی سڑک پر اور ایک چھوٹی سی دیوار مارکیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر بنی تھی۔ میں اور تقو دیر تک اسی چھوٹی دیوار پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ اس نے الفاظ میں اپنی محبت یا وفاداری کا اظہار نہ کیا لیکن کوئی ایسی Frequency ضرور تھی جو اس کا جذبہ مجھ تک پہنچتا رہا۔ اس کے علاوہ کالی ماں سے ملنے افتخار بھائی آیا کرتے تھے۔ اب ناہید بھی قریب تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے آتی رہتی۔

لیکن پھر ایک بار تبدیلی کا حکم ہوا اور میری والدہ نے ہمیں 455-این کا کوارٹر کرائے پر لے دیا۔ اب ایک بار پھر ریزی اور میں مختارِ کُل تھے۔ ہم دونوں آزادی سے اپنے فیصلے سے راستے کا چناؤ کرتے۔ ہم کو اپنا وقت کیسے گزارنا ہے کیونکر گزارنا ہے، اس کے لیے ہم کسی کے جوابدہ نہ تھے۔

● ● ● ● ● ● ●

455-این، سمن آباد

اچانک استاد صاحب نے آنا چھوڑ دیا۔ یا تو وہ جس قدر جانتے تھے اُسے Deliver کر چکے تھے یا اُنہیں علم ہو گیا تھا کہ میں اس سے زیادہ علمِ موسیقی حاصل کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس مشغلے سے فراغت پا کر میں نے ہاتھ دھونے میں وقت ضائع نہ کیا۔ اب کچھ کچھ زیادہ وقت میں خالہ کے پاس جاتی یا اپنے ناول کو سیدھا کرنے میں لگی۔ ابھی صاحب کو روم سے آئے چند دن ہوئے تھے کہ میں نے ایک دن اُن کو مرعوب کرنے کی غرض سے شیخیاں مارنا شروع کر دیں کہ کس طرح ہم نے ڈرامہ کیا اور میں نے اس کا سکرپٹ لکھا۔ پھر کیسے سٹیج پر میں نے ''اک ترک غمزہ زن کہ ... ستی'' گانا گایا۔

چند لمحے خاں صاحب خاموش رہے پھر بولے ''ذرا مجھے گا کے تو سناؤ۔''

میں نے بڑے تکبر سے پہلا مصرعہ لگایا۔

وہ کچھ لمحے سوچ کر پھر بولے ''سنو کاکی! اس مصرعہ میں تو غلطیاں ہیں۔ پھر ویسے بھی تمہاری آواز کا پتی ہے۔ ... تمہیں نہیں آسکتا۔ ہو سکے تو کوئی اور مثبت کام کرو۔''

پھر خاں صاحب روم سے لوٹ آئے۔ ایک دو دن غالباً گھر والوں سے میل ملاقات میں گزرا۔ تیسرے دن شام کے وقت خاں صاحب ہمارے گھر آئے۔ یہاں برآمدہ گزر کر ایک لمبا کمرہ تھا جس میں ہم نے اپنی طرز کا ڈرائنگ اور کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اسی گول میز کے گرد چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر بیٹھ کر میں ناول لکھتی۔ ریزی صاحب اپنی تصویریں تخلیق کرتے اور ہم مل کر ناشتہ اور کھانا بھی کھاتے۔

خاں صاحب کو آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ ہم اسی گول میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک باجی ضیا آگئیں۔ چند لمحے علیک سلیک کے بعد انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ''چلو اٹھو شفقو! جہلم سے سعید بھائی آئے ہیں۔ گلاس فیکٹری کے مالک۔''

سعادت مند بھائی کی طرح خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے نہ الوداعی سلام کیا نہ پھر آنے کا وعدہ کیا اور

خاموشی سے باجی ضیا کے ساتھ چلے گئے۔

منزہ اور میں اُن دنوں اکٹھے ہوتے تو ہم سڑکیں ناپنے کے لیے چل نکلتے۔ ابھی منزہ اشتیاق کی بیوی
ہم دونوں میں ایک سی خواہش کہیں ہر وقت شور مچایا کرتی۔ اُس شام ہم دونوں نے 30۔ جیل روڈ محمودہ اصغر کے گھر
ارادہ کیا۔ بس ارادہ کرنے کی دیر تھی، ہم چل نکلیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر گاڑیوں کا رش نہ تھا۔ لڑکیوں کو اغوا کرنے کی
نہ پڑی تھی۔ جیل روڈ پر پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی "منو...... کا کی۔" میں بے پرواہی سے چلتی رہی۔
ہوئی...... "کا کی...... کا کی رُکنا......"

منزہ نے مجھے روکا۔

پیچھے ککھو ڈیڈی چلے آ رہے تھے۔

ہم دونوں نے سلام کیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"جی یہاں 30۔ جیل روڈ پر میری کیلی محمودہ رہتی ہے۔ اس سے ملنے جا رہی ہیں۔"

"کیا امی ملتان سے آ گئی ہیں؟"

"جی کل رات ہی پہنچی ہیں۔"

مجھے ہلکا سا شک بھی نہ گزرا کہ ککھو بھائی اتنا بڑا اندیشہ لے کر آئیں گے۔ دوسرے دن میں خالہ کے
ہوئی تھی تو ڈیڈی جی آئے۔ انہوں نے امی سے کہا...... "امی جی! مجھ سے اب شفو کا یہ سنتاپ دیکھا نہیں جاتا۔
بچہ نہیں ہے۔ پھر اسلام میں ایسی پابندی کہاں ہے؟ آپ کل تیار رہیں۔ کل میں شام کو عصر اور مغرب کے
آؤں گا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف سے دو گواہ مقرر کر لیے ہیں۔ محمد حسین آرٹسٹ اور قدیر ملک۔ مولوی
ساتھ ہوں گے۔"

امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

امی نے ذرا جرأت سے کہا...... "ککھو بیٹا! ایسی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو؟"

"آپ کی مجبوری نہیں، میرے بھائی کی مجبوری ہے۔"

"اچھا پھر تمہاری مرضی۔"

ڈیڈی نے ذرا ہچکچا کر کہا...... "ایک بات ہے امی۔"

"ہاں، وہ کیا؟"

"میری کالی ماں اور گٹو کو پتہ نہ چلے۔ ابھی 1۔ مزنگ روڈ کی فضا ٹھیک نہیں۔ اماں جی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔"

"لیکن وہ تو ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"یہ آپ جانیں اور آپ کا کام...... منزہ کو بھی پتہ نہ لگے۔"

میں اپنے آپ کو ایک جاسوسی ناول کی ہیروئن سمجھ رہی تھی۔ اس سارے Adventure میں مجھے لطف

پاس پہننے کے لیے نہ کوئی خوبصورت جوڑا تھا نہ کوئی زیور ہی۔ ہاں میں نے اتنی تیاری ضرور کی کہ ایک چوڑیاں
کانچ کی سرخ چوڑیاں خرید کر پہن لیں۔

16 دسمبر 1956ء کی یہ شام بڑی خاموشی لے کر آئی۔ محمودہ اصغر واقعے سے کچھ پہلے آ گئی۔ میرے پاس ایک
کرتہ، سفید دوپٹہ اور شلوار تھی۔ صرف قمیض تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی لیکن اسے سینے کا وقت بھی نہ تھا۔

''تم مجھے بتا دیتیں۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا جوڑا لے آتی۔''

''یہی ٹھیک ہے محمودہ، تم فکر نہ کرو۔''

میں اور محمودہ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ خاں صاحب، ڈیڈی جی، دونوں گواہان، ریزی
ان کے ہمراہ تھے۔ جب نکاح کی اولیں لکھت پڑھت ہوگئی تو میری اجازت لینے ڈیڈی جی اندر آئے۔
تین مرتبہ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا واقعی میں اس نکاح پر رضامند تھی؟ پھر میرے سائن کرائے۔ محمودہ
جان کر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا اور شفتو کو اندر بھیج دیا۔ خاں صاحب نے اپنی پاس بک مجھے دے کر

''میں کوئی انگوٹھی وغیرہ نہیں لایا...... بینک میں میرے نوسو روپے جمع ہیں، یہ تمہارے ہیں۔''

مبارک سلامت کا کوئی شور بلند نہ ہوا۔ میز پر ایک ڈبے میں مٹھائی اور ایک میں پانچ چھ پیسٹریاں پڑی تھیں۔
خیر دولہا پارٹی رخصت ہوگئی۔ محمودہ نے مزید باتیں کرنے کے بجائے چپ چاپ رخصت ہونے کو ترجیح دی اور
سمیت غائب ہوگئی۔ ہم تینوں نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور خاموشی سے کھانا کھا کر سو رہے۔

اب ہم دونوں میاں بیوی تھے۔

دو دن کے بعد مجھے خاں صاحب نے کہا۔

''قدسیہ! یہ چوڑیاں اُتار دو۔ تم عموماً ایسی شوخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ کہیں اماں جی کو شک نہ ہو جائے۔''

میں نے کوئی حجت نہ کی۔ بس چپ چاپ چوڑیاں اتار کر زینب کو دے دیں۔

امی نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ سامان باندھ کر ملتان جانے کی تیاری کر لی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔

''قدسیہ! اب خوش ہو؟''

''جی بہت خوش۔''

''یاد رکھو اپنی مرضی کا فیصلہ عموماً مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرتے وقت نہ حوصلہ ہارنا
کسی سے شکایت کرنا۔''

اس سے زیادہ تبصرہ اُن کی ڈکشنری میں نہ تھا۔

امی کے جانے کے بعد خاں صاحب رات دیر گئے میرے پاس آتے، بڑی رازداری ۔۔ رات رہتے اور صبح
ہو جاتے۔ میں نے اُن سے کبھی نہ پوچھا کہ ابھی کتنی دیر اور اس خبر کو صیغہ راز میں رکھنے کا ارادہ ہے۔ بہرکیف وہ
مطمئن تھے اور میں اپنے طور پر بہت خوش تھی۔

ایک روز علی الصبح ڈیڈی جی آئے اور میری کھڑکی پر دستک دی۔
''شقو...... شقو۔ گھر چلو...... اماں اوپر تمہیں ملنے آ رہی ہیں۔ چلو فوراً''
خاں صاحب بستر سے چھلانگ لگا کر اترے۔ تتو تھمبو کر کے کپڑے پہنے۔
اور یہ جا وہ جا۔
چند دن نہ خاں صاحب آئے نہ ڈیڈی جی۔ 1- مزنگ روڈ میں بم کا گولا پھٹا۔

بابا جی نے شقو کو تو کچھ نہ کہا، ڈیڈی جی سے بولے۔ ''مجھے پتہ ہے یہ ساری تیری کارستانی ہے۔ و...
کام میں تجھے مزہ ملتا ہے۔ شقو کی کیا مجال تھی کہ شادی کر لیتا۔ تو نے بدبخت اسے اُکسایا۔''

اس جرم کی پاداش میں ڈیڈی جی کو ''مزنگ نکالا'' برداشت کرنا پڑا۔ وہ دو ریڑھیوں پر سامان لا...
کے گھر پہنچے۔ آپی منیرا اور بچے بے قصور تھے لیکن کیا کرتے۔ ساتھ ہی آتے بن پڑی۔ ماچھا جی نے ماتھے پ...
اور ڈیڈی جی کی زبانی اُنہیں پہلی بار پتہ چلا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔

آپی منیر خاں صاحب کی خالہ زاد بہن اور باجی ضیاء کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے...
نکھٹو پن کی شکایت نہ کی۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں مشغول رہتیں۔ ایک شام البتہ انہوں نے مجھے حیران کر...
بچوں کو لے کر ہمارے گھر آ گئیں۔ ایک مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے طارق کو میری گو...
اُس کا منہ میٹھا کرنے کے بعد بولیں...... ''گود بھرائی کی رسم ہو گئی۔ آج سے یہ تمہارا متبنیٰ ہے۔''

اس رسم کی لاج ہمیشہ ڈاکٹر طارق بن افتخار نے رکھی۔ وہ نہ صرف شکاگو میں ایک عالمی شہرت کا...
سرجن ہے بلکہ اس کی بڑی ذاتی شناخت خاں صاحب کے حوالے سے ہے۔ اسے فوٹوگرافی اور ٹکٹیں جمع ک...
بہت شوق ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں خاص کر خاں صاحب کی کالے گرتے والی تصویر ان کی تمام کتابوں...
ہے۔ ابھی جب باغ میں زلزلہ آیا تو وہ چند امریکی سینیٹروں کے ہمراہ پہنچا۔ ہم چونکہ ہر وقت امریکیوں کی مہر...
محتاج ہیں اس لیے یہ بھی ایک ایسی شناخت ہے جو اہم ہے اور غالباً ککو (طارق) سے زیادہ ان سینیٹروں پر مہ...
دی۔ وہ تو ہڈیاں جوڑتا رہا اور سینیٹر امریکہ کی شناخت میں اضافہ کرتے رہے۔

اماں جی اور بابا جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا لیکن جب ڈیڈی جی مزنگ روڈ سے نکل آئے تو یہ خا...
کی مروت سے بعید تھا کہ وہ وہیں چوبارے پر ٹکے رہتے۔ اُنھوں نے اپنا سامان دو ریڑھوں پر لادا۔ ٹونٹی والا...
نشانی وہیں چھت پر رہا اور وہ سمن آباد آ گئے۔ ویسے بھی اُن کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں ہی گزرتا تھا۔

ایک روز دو ریڑھے ہمارے گھر کے آگے رُکے۔ اُن میں زیادہ تر خاں صاحب کی کتابیں اور...
الماریاں تھیں۔ اب وہ لمبا کمرہ جو ہمارا ڈرائنگ روم کم ڈائننگ روم تھا، اس کی لمبی دیوار کے ساتھ کتابوں کی الم...
گئیں اور گول میز پر بیٹھ کر خاں صاحب مطالعے میں غرق رہنے لگے۔

نکاح کے بعد باقاعدگی سے گھر آنے والے جناب محمد حسین شاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان اور...
ریکارڈسٹ ریڈیو پاکستان تھے۔ خاں صاحب ان سے باتیں کم ہی کرتے۔ نانا نے اُن سے دوستی کر لی اور یہ مجم...

ے میں بیٹھ کر تاش پر رمی یا بینک بینک کھیلتے۔ کبھی کبھی جب ڈیڈی جی آ جاتے تو اُن کو چوتھا پارٹنر مل جاتا۔ عموماً
مجھے بھی کھیلنے پر اُکساتے لیکن پتہ نہیں کیوں میں زیادہ وقت نہ نکال سکتی۔

اُن دنوں ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

آپا فرحت سمن آباد میں آ چکی تھیں۔ جاوید اپنی پڑھائی سے بہت غافل تھا۔ اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو
تھا لیکن اُس نے اپنے کلاس کے چند ناکارہ لڑکوں سے دوستی گانٹھ لی تھی اور ان کو اپنی جادو بیانی سے مطیع کر رکھا تھا۔
سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ جب میں 450-این میں خالہ کے پاس رہتی تھی۔

ایک روز آپا جی فرحت میرے پاس آئیں اور کہا...... ''قدسیہ! تم نے ناہید جیسی بے پروا کھلنڈری کو بی۔اے
اب جیدی مجھے بی۔اے کرتا نظر نہیں آتا۔ کچھ اس کی مدد کرو۔'' ہمیشہ کی طرح میں نے کام کی نوعیت سمجھے بغیر حامی

جاوید پڑھنے کے لیے آنے لگا۔ پڑھائی تو مشکل نہ تھی لیکن جاوید اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پلا لے آتا۔ سارا
میں پڑھاتی وہ اس کتے کو گود میں رکھ کر کبھی سہلاتا، کبھی گدگدیاں کرتا، کبھی غراتا...... اس مشغلے کے ساتھ پڑھنا
ہو گیا۔ ایک روز میں نے جاوید سے کہا۔ ''جیدی! تم کل سے کتا نہیں لاؤ گے۔ اگر کتا لانا ہے تو گھر بیٹھو۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ جیدی نے گھر آنا چھوڑ دیا۔

ایک روز آپا جی آئیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ ''قدسیہ! امتحان میں کم وقت رہ گیا ہے۔ جیدی آنے پر رضا مند نہیں
لگتی ہے کہ تم ہمارے گھر آ کر پڑھا جایا کرو؟''

اب میں باقاعدگی کے ساتھ آپا جی کے گھر جانے لگی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ایک صاف ستھری خانہ دار
عورت کو قریب سے دیکھا۔ آپا جی کے شوہر نامدار بھائی عبدالقادر ساہی وال میں ہی تھے اور آپا جی جاوید کی خاطر یہاں
آ بسی تھیں۔ ساتھ والے گھر میں آفتاب بھائی رہتے تھے۔ اُن کے گھر چونکہ بیوی نہ تھی۔ خالد آفتاب اور وہ آپا جی
کے ہاں کھانا کھاتے اور خالد سکول کے بعد اپنے کتے Lassi کے ساتھ سڑکیں ناپتا تھا۔

آپا جی کے گھر کے قریب چوہدری برکت علی کی کوٹھی تھی۔ اُس زمانے میں ان کا رسالہ ''ادب لطیف'' اپنا مقام
حلقے میں بنا چکا تھا اور اُن کے اعزہ رشید احمد چوہدری وغیرہ کے مکتبہ جدید سے خاں صاحب کی کتاب ''ایک محبت
'' چھپ چکی تھی۔ ریزی اُن کے سرورق بنانے کے لیے مکتبہ جدید جایا کرتا۔ چوہدری برکت علی فوت ہو گئے تو
بیٹوں سے اتنا بڑا کاروبار سنبھل نہ سکا لیکن چوہدری صاحب کی بیٹی گو اس وقت محض سولہ برس کی تھی، اس نے ہوش
ثبوت دیا۔ بہت زیادہ پڑھنے والی صدیقہ ذہانت کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے دل کی مالکہ تھی۔ جاوید پھرنے
شوقین، زندگی سے حظ اٹھانے کی عمر میں تھا۔ بسوں پر آتے جاتے، بس سٹاپ پر انتظار کے دوران دونوں کی
لگی۔ جاوید کی عمر اس وقت بمشکل تمام اُنیس برس کی تھی۔

پھر اچانک پتہ چلا کہ جاوید نے بھی پٹھان برادری کی روایت چکنا چور کر دی۔ اُس نے ایک غیر پٹھان
سے نکاح کر لیا اور آپا جی نے خاندان کی پاسداری میں جیدی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بوریا بستر لے کر

ہمارے گھر آ بسا۔

بظاہر یہ سارے کوائف اس بات کی دلیل تھے کہ جاوید ناکارہ، ناکام اور زندگی میں کسی مقام پر پہنچ
تھا لیکن زندگی کا کچھ علم نہیں۔ آج وہ ہائی نون لیبارٹریز کا مالک ہے جو ایشیا کی ایک بہت بڑی ادویات بنانے
ہے۔ کوئی شخص کن وجوہات سے کہاں پہنچتا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

یہاں کچھ لمحے توقف کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ اپنے تجربات سے اخذ کیا ہوا کچھ مشاہدہ Share
ہوں۔ باری تعالیٰ ہمیشہ نیکی سے نیکی کے نتائج اخذ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ نیک اعمال کے نتیجے میں برے حالات
لاتا ہے اور کبھی کبھی برائی بھی بڑی کارآمد شاندار مستقبل کی ضامن بن جاتی ہے۔

آج 2007ء ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ''مختاراں مائی'' نے کس عروج کو چھولیا ہے۔ وہ Rape کا
پتہ نہیں کیوں اور کیسے پہلے پاکستانی میڈیا نے اور پھر یورپی اور امریکی الیکٹرونک اور پریس میڈیا نے اُسے آ
دیا حتیٰ کہ وہ یو این او کی مہمان بن گئی اور شہرت کا وہ مقام پالیا جو محنت اور مثبت کاموں سے نکل نہ سکتا تھا۔

ہزاروں نہیں لاکھوں ایسی لڑکیاں ہیں جن سے اغوا اور جنسی تشدد کا واقعہ پیش آیا۔ تمام عمر ذلت
احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہیں لیکن وہ بے نیاز، قادرِ مطلق کسی کے مشورے کا محتاج نہیں نہ روادار ہی۔ وہ یہ دکھا
ہے کہ برائی سے بھی نیکی کے نتائج نکال سکتا ہے اور کئی بار ساری عمر کے نیک اعمال، عبادتیں بھی منفی نتائج نکال
ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان نیک اعمال سے منہ موڑ لے اور یہ سمجھنے لگے کہ اگر میں نتیجے پر قابض نہیں تو
مشقت سے حاصل! بات وہیں آ کر رکتی ہے کہ مالی کا کام پانی دینا ہے۔ پھل پھول لگانے والا کہیں اُوپر ہے
چاہے نہ چاہے اس بے نیاز کی مرضی۔ کسی کی محنت کو قبول نہیں کرتا اور کسی کی نااہلی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

455-این' سمن آباد کا گھر ہمارے لیے عجیب بابرکت ثابت ہوا۔ خاں صاحب اور میں دونوں ما
دُکھانے کے مرتکب ہوئے لیکن عجیب بات اس کا نتیجہ ہمارے لیے مثبت ملا۔ ہم دونوں ایک ہی دھکے میں پُر
اور تقویت سے پُر اپنی صلاحیت، قابلیت اور اہلیت کے متلاشی ہو گئے۔ یہاں ہی سے ''داستان گو'' رسالہ نکالا گیا
غالباً برصغیر میں پہلا اور اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا۔ ریزی کی بیکاری بھی خوب کام آئی۔ اُس نے کچھ دیر
صرف کی اور پھر ایک روز خاں صاحب رسالے کی ڈمی بنانے میں مشغول تھے کہ ریزی اُن کے پاس آیا۔

''یار شفو! میں ''داستان گو'' کا ایسا سرورق بنواؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے سلک سکرین پرنٹنگ (Silk screen printing) کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ میں وہ جالی
لوں گا جس پر جو بھی تصویر بنانا ہوگی بنا لوں گا۔ پھر ہم رنگ اوپر ڈال کر سکوجی پھیریں گے نقش نیچے کاغذ پر آ جائے

''یار یہ سکوجی کیا بلا ہے؟''

''جس طرح شیشوں کو صاف کرنے کے لیے ایک وائپر نہیں ہوتا، فرشوں پر پھیرنے والا وائپر؟''

''یار احمق نہ بنو ریزی۔ ابھی مغرب میں اس کی تحقیق تصدیق کو نہیں پہنچی۔ تم کہاں سے اتنے تیس مار خاں

""ہاں ہاں۔ جو مرضی مجھے کہہ لو۔ میں کر کے دکھاؤں گا۔ ایک مشکل ہے۔ جتنے رنگوں کا ٹائٹل ہوگا۔ اتنی مرتبہ ہر رنگ لگانا ہوگا جیسے لباس سفید، دوپٹہ گرین، قالین سرخ ہوا تو تین بار سرورق چھاپنا ہوگا۔"

"بھائی اتنے سارے کاغذ سکھائیں گے کیسے۔ باہر تو سکھانے کے لیے مشین ہوتی ہے۔" خاں صاحب بولے۔

"میں نے اُس کا علاج بھی تلاش کر لیا ہے۔"

"کیا؟ مسٹر واس کو ڈی گاما۔"

"ہمارے برآمدے میں جو چقیں لگی ہیں، ان کے کونوں میں جو خالی جگہ ہے وہاں سوکھنے کے لیے آرام سے لٹک جائیں گے۔"

"دیکھیں کہیں مروا نہ دیں۔ پہلے ہی خرچہ نہیں چلتا۔"

میں جو یونہی بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ میرا کام بھی متعین ہو گیا۔ میں ایک ایک کاغذ اٹھاتی اور اسے چق میں سکھانے کے لیے لگا دیتی۔ خاں صاحب نے رسالے سے پہلے مال روڈ پر دفتر "داستان گو" بنا لیا تھا۔ سلیم چوہدری یہاں بیٹھتے اور ان کے علاوہ کاتب یوسف رسالے کے میٹریل کی کتابت کرتے تھے۔ اُن دنوں ابھی کمپیوٹر ایجاد نہ ہوئے تھے اور خطاطی کا فن ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کاتب یوسف نے نہ کبھی اجرت مانگی نہ کبھی کسی قسم کا تقاضا ہی کیا۔ جب کام مل گیا تو کتابت کر لی نہ ملا تو دفتر میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ سلیم چوہدری محکمہ فوڈ میں ملازم تھے۔ وہ بھی کسی قسم کی تنخواہ یا پیسے کی خاطر نہ آتے۔ جب رسالہ چل نکلا اور دفتر میں لوگ آنے لگے تو اُن کا خیال کرتے، چائے پانی پیش کرتے۔ خاں صاحب آ جاتے تو پچھلی سیٹ اختیار کر لیتے۔

مجھے کبھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ میں گھر پر ہی بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ محمد علی رقعہ لے کر میرے پاس آتے۔ خاں صاحب عموماً "داستان گو" کی چھپی ہوئی پرچی پر لکھتے۔ "قدسیہ! یوسف خالی بیٹھا ہے، میٹریل نہیں ہے۔ کوئی مضمون؟ فوراً لکھ کر بھیجو۔"

تمام کام پس پشت ڈال کر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتی۔ رسالے میں اپنے پُراعتماد لوگوں کے نام سے کہانیاں، مضمون لکھ کر بھیج دیتی۔ جیدی، صدیقہ، ڈیڈی جی کے نام سے کئی کہانیاں لکھیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز ڈیڈی میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "کاکی! یہ تت کی آنکھ کیا چیز ہے؟"

"ڈیڈی جی! یہ مصر کے فرعون تت آخ موں کے نام سے مخفف بنایا۔"

"مُنّی! مجھے تو بتا دیا ہوتا۔ آج دفتر میں ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ کچھ معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔"

میں کچھ پریشان ہو گئی تو ڈیڈی جی بولے۔ "چل میں نے سنبھال لیا تھا تو ایویں فکر نہ کر۔"

عموماً ڈیڈی جی میری اور صدیقہ کی غلطیوں کو اسی طرح سنبھالنے کے عادی تھے۔ یہ جھوٹ کی وہ قسم ہے جو کسی کی دلداری کو بچانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ڈیڈی جی سری پائے اٹھا کر لے آئے۔ میں نے کبھی نہاری، سری پائے، مچھلی کباب وغیرہ نہ بنائے۔ مجھے ڈیڈی جی بولے۔ "یہ مُنّی! تیرے سپرد لیکن زینب سے نہ پکوانا خود پکانا۔"

وہ تو سودا پکڑا کر چلے گئے۔ میں ایک امتحان میں پڑ گئی۔ رات جب وہ اور ڈیڈی جی کھانے بیٹھے تو ڈیڈی جی

نے بڑے چسکے لے کر کھائے۔ میں سمجھی یہ پھر ڈیڈی جی میرا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اُن کے جا...
بعد میں نے تعریف طلب نظروں سے خاں صاحب کو دیکھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر بولے۔ ''واقعی قدسیہ اتم نے ...
کی طرح پائے پکا دیئے۔''

پھر انہوں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور اس پر سائن کر کے مجھے دے دیا۔ اُن کی داد دینے...
انوکھا طریقہ تھا۔ وہ ایک روپے کے نوٹ پر آٹوگراف کر کے تعریف کیا کرتے تھے۔

کچھ دیر تو ڈیڈی جی اپنی کالی ماں کے پاس رہے لیکن پھر غیرت مند آپی جی نے گھر تلاش کر لیا اور وہ...
کالونی بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے۔ میرا اور خاں صاحب کا معمول تھا کہ ہم شام کے وقت ڈیڈی جی کے گھر چلے...
یہ ہمارے لیے بہت خوشی اور آنند کی تقریب ہوتی۔ خاں صاحب اپنے گھر سے زیادہ ڈیڈی جی اور آپی مُنیر کے گھر...
Home محسوس کرتے۔ فرش پر چھوٹا سا میز پوش بچھا کر آپی جی، ڈیڈی جی اُن کے بچے لبنیٰ، ککو، حارث...
دسترخوان کے مزے لوٹتے۔ میں آپی جی سے پکانے کے گُر اور ترکیبیں سیکھتی۔ ڈیڈی اور خاں صاحب 1-مزنگ...
باتیں کیا کرتے۔

جب کبھی خاں صاحب شہر سے باہر جاتے، میں آپی جی کے پاس رات گزارتی اور لبنیٰ میرے پاس سوتی...
خاں صاحب کے گھر میں رواج تھا کہ عام طور پر چھوٹے ہی بڑوں کے گھروں سلام کرنے جاتے اور...
شاذ ہی چھوٹوں کے گھر گھنگھرے اڑاتے۔ جس طرح ہمیں ڈیڈی جی کے گھر جانے کی عادت تھی ویسے ہی صدیقہ...
قریباً ہر دوسرے تیسرے روز ہماری طرف آ جاتے۔

دن گزرتے گئے اور ہم بغیر شور مچائے ترقی کرتے چلے گئے۔

پھر وہ دن آ پہنچا۔ جب اللہ کو ہمارے گھر ایک نئی روح بھیجنا تھا۔ مجھے دیکھنے اور میرے حالات جا...
لیے ایک معمولی سی دائی حسین بی بی آیا کرتی تھی۔ دبلی پتلی دراز قد بڑی خاموش طبع۔ وہ چرب زبانی سے کم اور ہا...
آنکھوں سے کام لینے والی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتی اور مجھے دبانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ میں...
کبھی اس آسائش کو اپنے لیے جائز نہ سمجھا۔

جس روز انیق بیٹے کو دنیا میں آنا تھا۔ میری تکلیف کے تیور دیکھ کر امی نے مجھے خالہ کے گھر 450-این میں...
ہونے کے لیے کہا۔ انہوں نے چھوٹے بچے کے لیے اپنے ہاتھ سے آٹھ جوڑے سی رکھے تھے۔ ان کی پوٹلی بنائی...
چلمچی اٹھائی اور ہم دونوں نے ماچھا جی کے جا کر دستک دی۔ گویا دونوں بہنوں میں اس تقریب کے لیے پہلے سے...
ہو چکی تھی۔

فوراً حسین بی بی کو بلوا لیا گیا۔ پتہ نہیں ڈیڈی جی کو کیسے خبر ہو گئی۔ وہ واقعی میرے باپ کا رول ادا کر...
آ گئے۔ انہوں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر پورا وقت...
یٰسین پڑھتے رہے۔

جس وقت نو کی نے پہلی اضطرابی چیخ ماری، جمعے کی اذان ہو رہی تھی۔ ڈیڈی جی نے شکرانے کے دو نفل پڑھے...

بی بی نے نہایت خاموشی سے بچے کو نہلایا دُھلایا، صاف چادر میں کس کے باندھا اور ڈیڈی جی کے بازوؤں میں
ڈیڈی جی نے انیق بیٹے کے کان میں اذان دی اور بڑی خاموشی سے اُسے خان صاحب کی گود میں دے دیا۔

18 اکتوبر 1957ء میں انیق اس دنیا میں آئے۔

اور پورے سال بعد 16 ستمبر 1958ء کو انیس بیٹے نے ہمارے گھر کو روشنی بخشی۔ نانا تو گھر پر موجود تھیں لیکن
کی تبدیلی شیخوپورہ ہو چکی تھی اور وہ لاہور میں نہ تھیں۔ ڈیڈی جی بھی کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس بار ان کا سہارا
خان صاحب نے باہر والے برآمدے میں اپنی چارپائی بچھائی۔ اندر نانا اور حسین بی بی اپنی کارروائی اور میں اپنی
میں مبتلا ہو گئی۔ قریباً دو بجے کے قریب انیس بیٹے نے چیخ مار کر اپنی آمد کا ڈنکا بجایا۔ حسین بی بی نے اسے نہلا دُھلا کر
کس باندھ کر امی جی کو دیا تو وہ بولیں..... ''ہائے بیچارے کو اتنی سختی سے کیوں باندھ دیا ہے؟''

''بی بی جی! اس طرح بچہ ڈرتا نہیں اور روتا بھی کم ہے۔''

اس سے زیادہ حسین بی بی نے کوئی توجیہہ نہ دی۔ امی نے خان صاحب کو بچہ دیتے وقت بہت ہولے سے
دی۔ تالیاں بجا کر چیخیں مار کر خوشی کا اظہار کرنے والی غالباً پریشان تھیں کہ اوپر تلے کے بچے کیسے پالے جائیں
بیٹی اتنی سادہ لوح اور غیر Practical ہے کہ یہ اتنی ذمہ داری کیسے اٹھائے گی۔ وہ خود تو ملتان جاتی رہتی تھیں
لیے اس کام میں ہاتھ بٹانا ممکن نہ تھا۔

لیکن ہم دونوں کو علم نہ تھا کہ بچے تو آفرینش کا مسئلہ ہے۔ پرورش تو اوپر والے کی صفت ہے۔ وہ فقط ماں کے سر
کے لیے اس کارِ خیر میں اسے شامل کر لیتا ہے اور اس کی جزا بھی مقرر کر دی ہے۔

اس معاملے میں خان صاحب نے میری بہت مدد کی۔ چھوٹا سا انیق جب گھر دم اُٹھتا اور دودھ کے لیے ضد کرتا
صاحب اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے اور سڑک پر ٹہلاتے۔ اتنی دیر میں دودھ کی بوتل تیار ہو جاتی اور یوں بچے
رونے سے بچا لیا جاتا۔ میری خوراک اور صحت ایسی نہ رہی تھی کہ میں انیق کو اپنا دودھ پلاتی۔ تین چار مہینے کے بعد
بوتل پر لگانا پڑا۔

انیس کی پرورش میں اس قدر مشکل بھی پیش نہ آئی۔ ایک تو وہ اپنی Genetics کے اعتبار سے رونے دھونے
مچانے والا نہ تھا۔ پھر مجھے بھی بچہ پالنے کی اٹکل آ چکی تھی۔ بڑے آرام سے وقت گزرتا گیا۔ حسین بی بی انیق
پوتڑے دھونے آتی تھی۔ پھر انیس کی جوگان دھو جاتی۔ اس سے زیادہ وہ ہمکلامی کی عادی نہ تھی۔

میرے تیسرے بیٹے اثیر احمد کی پیدائش 15 جون 1962ء میں ہوئی۔ اب تک ہماری زندگی میں مالی سہولت
تھی۔ جاوید کے پاس ایک ہری موریس گاڑی تھی اور وہ بینک میں اچھی خاصی تنخواہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے ثویلہ کی
کے وقت ہمیں ایف سی کالج کے ہسپتال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ہم ڈاکٹر مارٹن جسے ہم لیڈی مارٹن کہتے تھے، واقفیت
بچے تھے۔

اثیر کی پیدائش کے وقت ہم نے حسین بی بی سے رابطہ نہ کیا۔ انسانی فطرت کے مطابق ہم اس کی خدمات کو
گئے۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ انیق کی باری تو میرا فلیبوٹ کی بہن جیوا نندن بروقت آ گئی تھیں اور انہوں نے دس

ٹانکے بغیر بے ہوش کیے لگا دیئے تھے لیکن اب صرف خوف ہی تھا، انتظام نہ تھا۔

جاوید ایک دن گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے اور خاں صاحب کو لے کر ایف سی کالج کے کرسچین ہسپتال میں

"معائنہ کرانے میں کوئی حرج نہیں ماموں۔ اگر معاملہ ٹھیک ہوا تو مامی کو واپس لے آئیں گے۔"

جب میں ہسپتال پہنچی تو ڈاکٹر مارٹن ان دونوں کو باہر چھوڑ کر مجھے ڈلیوری روم میں لے گئی۔ مجھے لیٹنے کا حکم

کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد اُس نے مجھے تعجب سے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ گیارھواں مہینہ ہے اور اگر ابھی بچہ کی ڈلیوری نہ کی گئی تو اُس کی جان کا خطرہ

اس کے بعد اُس نے مجھے جلدی سے اوپر تلے ٹیکے لگائے۔ بے ہوش رکھنے کا جتن کیا اور اثیر میاں بڑی مشکل سے

کے پہلے پہر اس دنیا میں آ گئے۔ اس طرح ہماری دنیا کو منور کرنے تین چاند ہماری خوش قسمتی کا مظہر بن گئے۔

یہاں کچھ اور بچوں کی آمد کا حوالہ دینے پر طبیعت آمادہ ہو رہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے بچے

پیدائش کا باب ممنوع تھا لیکن اب 2007ء یہ ایک منہ میں انگلی ڈالنے کا نہیں اور صحت کے ضمن میں اس کی انفرمیشن

جنسی تعلیم بچوں کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہے۔

ڈیڈی جی ان دنوں چوہدری کالونی میں رہتے تھے۔ انیق کی پیدائش سے ٹھیک دس دن بعد ڈیڈی جی کی

اس دنیا میں تشریف لائی۔ ابھی حسین بی بی کا سکہ چلتا تھا۔ میں نے اور خاں صاحب بھاگم بھاگ ڈیڈی جی کے گھر

خاں صاحب نے اس کے کانوں میں اذان دی۔ اس طرح بابا محمد خاں کے گھنے درخت میں ایک اور میٹھا پھل لگا۔

صدیقہ بیگم دمے کی مریضہ تھی۔ کبھی کبھی جب اُسے اٹیک ہوتا تو اُس کا دم اُکھڑ جاتا اور لگتا آخری

ہے۔ میں نے ایک دن صدیقہ کو مشورہ دیا کہ ایف سی کالج ہسپتال چلتے ہیں۔ تم اپنا معائنہ کراؤ۔ یہ کام حسین بی بی کے

بس کا نہیں لگتا۔

"لیکن مامی جائیں گے کیسے۔ گاڑی وغیرہ تو ہے نہیں۔ آپ کے بچے چھوٹے ہیں۔"

احمقوں کی طرح میں نے کہا۔ "بس میں چلیں گے۔ نہر کنارے تک بس لے جائے گی۔"

"اور اُس سے آگے۔"

"تھوڑا راستہ ہے نوکی چل لے گا۔ لالے کو میں اٹھا لوں گی۔"

"دیکھ لیں، آپ کو تکلیف ہو گی۔"

"کوئی تکلیف وکلیف نہیں ہوتی۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔"

تب سمن آباد سے نہر کے آخری سٹاپ تک ایک آدمی کی ٹکٹ دو روپے تھی۔

ہم دونوں مع بچگان ہسپتال پہنچے۔ یہاں اس وقت معائنے کی غرض سے عورتیں جمع تھیں اور باری باری

مارٹن سے مشورہ کرنے کے لیے اندر جا رہی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح میں ڈاکٹر مارٹن کا نام سن کر بڑی مرعوب ہوئی۔ سفید قوم کے گورے پن کی ہیبت کے سامنے

نے تمام ہتھیار ڈال دیئے۔ اندر ڈاکٹر مارٹن کے پاس پہنچ کر میں نے قدرے دلیرانہ انداز اختیار کیا اور اسے صورتحال

ایک۔ اس نے کچھ پڑتا لگا کر مجھے ایک چٹ دی جس پر وقت، تاریخ درج تھی اور لکھا تھا کہ پیدائش کے وقت میں صدیقہ کو لے کر ہسپتال پہنچ جاؤں۔ حُسنِ اتفاق سے نانا آ گئیں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جانا پڑا۔ جس وقت ہم ہسپتال پہنچے لیڈی ڈاکٹر نے پڑتے ہی صدیقہ بیگم کو اندر ڈلیوری روم میں بھیجنے کا حکم دیا۔

جاوید اور خاں صاحب مع میرے باہر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد لیڈی مارٹن باہر آئی اور مجھے ایک گاؤن پکڑا کر بولی "یہ کپڑے کا ماسک اور گاؤن پہن کر میرے ساتھ آؤ۔ مریضہ کی حالت ٹھیک نہیں۔"

خاں صاحب نے جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ میں گاؤن اور ماسک چڑھا کر میں بھاگ اندر پہنچی۔ صدیقہ قریب قریب بے سدھ تھی۔ پھر لیڈی مارٹن کی تگ و دو سے گھنٹے کے بعد ثوبیہ اس دنیا میں آئی۔ بچی Under-weight تھی۔ مشکل سے چھ پاؤنڈ کی ہوگی۔ بچی کو نہلا دھلا کر باہر لائے تو لیڈی مارٹن نے مجھے بچی کو دکھائی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سفید پلاسٹک کے منکوں کا ایک ہار سا اس کی کلائی میں پڑا تھا اور اس پر ثوبیہ کا بے بی آف جاوید لکھا تھا۔

مجھے بچی سونپتے ہوئے ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ "دیکھو، ماں کے زندہ رہنے کی امید کم ہے۔ تم قسم کھاؤ کہ تم بچی پال لوگی؟"

"میں...... لیکن میرے اپنے دو بچے ہیں۔ میں کیسے؟"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بچی تنہائی محسوس نہیں کرے۔ قسم کھاؤ اپنی ہولی بک کی کہ تم بچی کو دغا نہیں دوگی۔"

ہمیشہ کی طرح میں نے حامی بھر لی۔

عجیب بات ہے اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتا۔ میں تو اپنی کمزوری سے آگاہ نہیں تھی لیکن ثوبیہ کی معجزہ ہے اللہ نے صدیقہ کو صحت دے دی۔ پھر جاوید نے صدیقہ کا بڑا ساتھ دیا اور دونوں نے دو ہاتھ بن کر ثوبیہ کو پال نکالا۔

جب اثیر کچھ سال بعد اس دنیا میں آیا تو ثوبیہ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہوا اور ہم بروقت ہسپتال جا پہنچے۔ جب میری ڈلیوری کے بعد مجھے کچھ دن ہسپتال میں رہنا پڑا تو میرے پاس آپی منیر آ کر رہتی تھیں۔ وہ نو دس بجے ٹمن آباد سے بس پکڑتیں۔ اپنا کھانا ساتھ لاتیں اور شام کو میری سیوا، دیکھ ریکھ کرنے کے بعد گھر لوٹ جاتیں۔ اس غیرت مند خاتون نے مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایسے لوگوں سے سیکھنے کا موقع ملا۔

ماموں کی باتیں (ریزی کی باتیں)

اس تحریر کو لکھتے ہوئے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میرے ماموں اصل میں ایسے ہی انسان تھے۔ اس کتاب میں پیش کیے ہوئے افراد من گھڑت اور مصنوعی ہیں اور میرا کسی پر کیچڑ اُچھالنا اور کسی کے دامن پر داغ دھبہ لگانے کی منشا نہیں۔ میں اس کہانی میں آپ کی تفریح کا سامان مہیا کروں گا لیکن آپ کی بدمزاجی کے پیشِ نظر بچوں اور بیویوں کی سینڈلوں سے خوفزدہ آپ کو میری یہ تحریر فرسودہ اور فضول لگے گی۔

میری التماس ہے کہ اس کا پہلا باب پڑھ لیجیے اور اگر ممکن ہو تو پورا پڑھ لیجیے۔ اس کتاب کو خریدنے کی ضرورت

نہیں کیونکہ اس وقت جو کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہم نے ایڈیٹنگ کے لیے بنائی تھی لیکن ایک کلرک کی نااہلی کے باعث دوسری کتابوں میں اسے ملا دیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب بُک سٹال پر پہنچ گئی۔ دوسرے آپ کی ذہانت کو دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے کہ آپ نے اپنے قیمتی سرمائے میں سے اسے خرید لیا ہے جو درحقیقت Pre-editing کی کاپی ہے۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ بھلا دوپہر کا ذکر تو نہیں ہو رہا۔ میری گال پر کسی نے ہلکی سی چپت لگائی جس کی وجہ سے میں ڈرنے کے بجائے مایوسی کے عالم میں چلا گیا کیونکہ جب آنکھیں کھولیں، سامنے ماموں کا چہرہ نظر آیا۔ دل ہی دل میں خیال آیا کہ آج کا دن بھی مایوسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ویسے تو ماموں کے ساتھ ہماری بے تکلفی اور دوستی بہت گہری تھی لیکن خواب میں امریکی صدر کے الیکشن جیسا مرحلہ درپیش تھا، جہاں ذاتی سکینڈل اور Perjury جیسے واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً آپ میری تحریر سے واقف ہو چکے ہوں گے کہ چوبیس سالہ دوشیزہ مانیکا لیونسکی کے تعلق سے صرف دو تین سالوں کے فاصلے پر تھا اور یکدم اُٹھنے کے باعث ایک کالا کھیرا نما بکرا جس کے چند داڑھی کے بالوں سے مشابہت ہو، مجھے نظر آیا۔ آنکھیں ملنے پر تصویر اور صاف ہوئی تو یہ ہمارے ماموں تھے۔

یہ بات ابھی تک میرے لیے معیوب اور معنی خیز ہے کہ ہمارے نانا سرخ و سفید چھ فٹے باہمت آدمی تھے جن کی شادی پنجاب کی ایسی دوشیزاؤں میں سے ایک سے ہوئی جن کا تعلق بٹ خاندان سے تھا مگر چاند گرہن کے باعث ہمارے ماموں کی رنگت کچھ ایسی تھی کہ رات کو ہنستے وقت ان کو شمالاً جنوباً پہچاننا صرف دانتوں کے باعث ہوا کرتا۔

شاید ایسی صورت میں گھر والوں کی توجہ اپنے بیٹے پر کم تھی، جس کی بنا پر ماموں کی تعلیم و تربیت کچھ زیادہ مکمل نہ ہو پائی۔ آپ آٹھ کے پہاڑے سے زیادہ نہ جانتے تھے اور املا کو عاملا لکھا کرتے تھے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں ماموں کا ذہن چست اور جملے کی ادائیگی میں تیز و طرار تھا۔ میرے مشاہدے میں ایسا کوئی وقت نہ آیا جب ماموں نے حاضر جوابی سے کام نہ لیا ہو۔ آپ کی شہرت اور مشہوری بام عروج پر تھی۔ آپ کو معززین میں سے سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ داڑھی مونچھ منڈوانے والے کو زبردستی اُٹھا کر ماموں کی کرسی پیش کرتا۔ اس اُٹھک بیٹھک میں نہ صرف دوکان ہی میں ہنگامہ برپا ہوتا بلکہ کئی دفعہ متعدد اُستروں کے وار خالی جانے کی بنا پر اور ماموں کی جان مشکل سے بچتی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ بازار میں سائیکل مستری، کلچے فروش، پرچون والا اور دیگر دوکانداروں سے ماموں کا باضابطہ رویہ کیسا تھا۔

سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ چند مشکل اوقات بازار کا ادھار ماموں پر لگ بھگ پندرہ ہزار تھا لیکن اُن کی کریڈٹ کی لائن کسی IMF کی محتاج نہ تھی۔ رہا Debt Servicing کا معاملہ تو صرف شخصی Collateral کی بنا پر ایک Multiple Revolving Finance کا چکر تھا۔ کبھی تو گوشت والے سے پیسے لے کر سائیکل والے کو پکڑا دیے اور سائیکل والے سے لے کر نانبائی کو دے دیے جاتے لیکن اس سے اپنی کمیشن جھاڑنا نہ بھولتے۔ اس کریڈٹ کے چلتے پہیے سے سارا بازار خوش اور مطمئن تھا لیکن اس محاورے سے بازار ناواقف تھا کہ احمد کی پگڑی محمود کے سر اس خوش اسلوبی سے پہنائی جاتی ہے کہ احمد بھی دلفریب رہتا ہے اور محمود تو دلکش ہی ہوتا ہے کیونکہ پگڑی بار بار اُس کے سر پر آ جاتی ہے۔

● ● ● ● ● ● ●

479-این، سمن آباد

455-این سے 479-این، سمن آباد میں نقل مکانی کسی بڑی شبھ گھڑی ہوئی، کیونکہ اس مکان میں منتقل ہوتے ہی ہمیں ناداری اور غریبی سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ زندگی میں خصوصی مشکلات جو درپیش رہتی ہیں ان میں غریبی، بے جا سسرالی جھگڑے، ساس نندوں سے اڑچھیں، بے روزگاری، اولاد کی آزمائش، بیماری، موت جیسی تکلیفیں کس وقت کیسے آتی ہیں ان کا قیام کس قدر لمبا ہوتا ہے یہ انسانوں کی اپنی Genetics، ان کے فیصلے اور ان کے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی قوت پر منحصر ہے۔ جو کچھ مجھے سمجھ آئی وہ یوں ہے۔

جب بھی کسی شخص کو غریبی سے پالا پڑتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے راستے کسی نہ کسی طور پر بند گلی میں جا پہنچتے ہیں۔ بالکل معمولی ضرورتیں، ادھوری خواہشیں، نا آسودہ احساس کمتری کی فضا، خود اعتمادی اور بے مائیگی کی فضا ہر لحظہ قائم رہتی ہے۔ کچھ لوگ غریبی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رشتہ داروں سے جڑے رہتے ہیں اور اپنے حالات کی بہتری کو مانگے کی شفقتوں سے سینچتے رہتے ہیں۔ لیکن جونہی حالات بہتر ہو جاتے ہیں، وہ رشتے ناطے جو ذاتی ضرورت تک اہم تھے، غیر اہم ہونے لگتے ہیں جیسے کوئی ستارہ اپنے مدار سے نکل جائے اور واپس نہ لوٹ سکے۔

غریبی میں بنائے گئے روابط ساری عمر فٹ نہیں آتے۔ یہ یا تو کھلے ہوتے ہیں یا بہت تنگ..... دراصل غریبی میں صرف کام ہی ہتھیار بن سکتا ہے۔ غریبی میں صبر عموماً مجبوری کا نام ہے۔ حسرتوں کے چوکھٹے میں اس عہد کی تصویر ٹانگی جا سکتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ غریبی میں انسان اپنی اس کمزوری کے ہاتھوں مجبور، رنجور اور منہ اٹھائے آسمان کو تکتا رہتا ہے کہ کب حالات بدلیں۔ کب وہ ڈیپ فریزر میں جمے گوشت کی صورت باہر نکلے..... نہ بو باس نہ ذائقہ..... بس گوشت ہی گوشت۔ وہ بھی مجبوری میں صبر کی طرح ٹھنڈا اور جما ہوا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس امیری کچھ کم امتحان نہیں۔ امیری عجب تیزاب کا مٹکا ہے۔ اس میں آسائشیں، زیبائشیں، اسراف، بیہودگی، کام چوری بہت کچھ آدمی کو اپنے میں گھولنے لگتی ہے۔ وہ اس تیزاب کے مٹکے میں یوں حل ہونے لگتا ہے جیسے نمک کا ڈھیلا ہولے ہولے پانی میں حل ہوتا رہے.....

یہ مجھے بہت بعد میں ان دونوں امتحانوں سے گزر کر پختگی کی عمر کو پہنچ کر سمجھ میں آیا کہ انسان کو دراصل ایک
مسئلہ ہر وقت درپیش رہتا ہے اور وہ ہے روح کی آزادی۔ جو مسئلہ بھی روح کو جکڑے وہ انسان کے لیے ناقابلِ بر
ہو جاتا ہے۔ یہاں آ کر آج کی پود اور پچھلی پود کے نظریۂ حیات میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ بوڑھا نئی پود کو
ہر وقت بولتا رہتا ہے یا پھر اپنے عہد کی عافیت کا نقشہ کھینچتا رہتا ہے۔ یہ بولنا نصیحت کرنا بالکل بے کار رہتا ہے کیونکہ
جسم کے آزاد ہونے کے خواب دیکھتی ہے اور بوڑھے کو روح کی آزادی درکار ہوتی ہے۔ بوڑھے بھی غلط اور نوجو
سرپھرے۔

اب نوجوان اپنی سوچ کو اس قدر سیکولر بنا چکے ہیں کہ وہ اب سمجھنے لگے ہیں کہ مذہب کا انسان کی زند
رکاوٹ کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ جو مذہب سے پیار کرتا ہے وہ ساری عمر کسی بڈھے کی طرح دروازے ہی بند
ہے۔ کھڑکیوں میں چٹخنیاں اور گیٹ پر تالے ہی لگاتا رہتا ہے۔ وہ تازہ ہوا سے واقف نہیں ہوتا!

نوجوان پود کو یہ معلوم نہیں کہ اگر واقعی روح کی آزادی مطلوب ہو تو مذہب کی کشتی درکار ہوتی ہے۔ یہ
ہو نیلی ہو پیلی ہو اس میں شک وگمان کے سوراخ نہیں ہونا چاہئیں۔ اگر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر کھلے آسمان سے رابطہ
ہے تو کسی ایک راستے کا انتخاب ضروری ہوگا۔ جو لوگ بار بار پگڈنڈی' کشتی یا مسلک بدلتے رہتے ہیں ان کو
آزادی ممکن نہیں رہتی..... اگر آپ کو روح کی آزادی چاہیے اور دنیاوی منفعت کے لیے جان کھپا دیں تو بھی مذہب
مایوس کرتا رہے گا۔ اگر آپ ساری عمر دوسروں کی کشتیوں پر نمبر لگا کر ریس کا تماشا دیکھتے رہے تو آپ کو علم ہونا چاہیے
کی ساری جدوجہد اس کا کشٹ قربانیاں اور پروا لا دیکھتا ہے اور بالآخر وہی آزادی کی نعمت بطور تلافی عطا کرنے وال

آزادی انعام ہے..... حق نہیں.....

آزادی منزل ہے..... راستہ نہیں.....

آزادی' سکون' طمانیت اور شکر کا مقام ہے..... متلاطم کیفیت کا نہیں.....

479 ۔ این میں ہمارے ہاں ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ آپ محمد حسین کے
بخوبی واقف ہوں گے۔ یہی وہ آرٹسٹ ہیں جنہوں نے بڑی شہرت پائی۔ تراڑکھیل میں جب ایک ٹرک میں رضائی
کر اندر مائیکروفون لگا کر خاں صاحب پروگرام ''ہم آ گئے'' کیا کرتے تھے اس وقت بھائی محمد حسین ایک معاون
تھے۔ ان کے ساتھ دوسری آواز ایک آرٹسٹ تاج صاحب کی ہوا کرتی تھی جو بڑی بھاری کھرج میں بولا کرتے تھے۔
پروگرام کشمیر کی آزادی کے حوالے سے غالباً پہلا پروگرام تھا۔ اُدھر بھارت سے پروگرام نشر ہوتا۔ اِدھر ساتھ ساتھ
اشفاق صاحب اُس کا جواب لکھتے جاتے اور پھر دھڑلے کی آواز میں اشفاق صاحب للکارتے۔

''ہم آ گئے.....!''

اس پروگرام کے ختم ہونے پر خاں صاحب لاہور آ گئے۔ ریڈیو پر ان کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ سچ پوچھ
تو ڈائیلاگ لکھنا بھائی محمد حسین نے خاں صاحب کو سکھایا' جن سے بعد میں یہ علم میں نے ایسے جذب کیا جیسے سیاہی چ

[illegible]ب کرتا ہے۔

بھائی قدیر ریڈیو پر Recordist تھے۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور بڑی خاموشی' دیانت داری سے پروگرام [illegible] کرتے تھے۔ بعدازاں جب تلقین شاہ جاری ہوا تو اس کی ریکارڈنگ بھی ان ہی کی ذمہ داری ٹھہری۔

بھائی محمد حسین' قدیر ملک اور میری والدہ جب کبھی وہ ملتان سے آتیں' مل کر تاش کھیلا کرتے اور اس سے [illegible] گھر میں عجیب قسم کی رونق آ جاتی۔ گھر کا باسیوں سے عجب رشتہ ہوتا ہے۔ کھلے کھیتوں میں رہنے والا' کشادہ گھروں [illegible] پانے والے' بازاروں سے ملحق گھروں میں ہر لحظہ شور کے عادی' گلیوں کے باسی' سکولوں کی ہمسائیگی میں رہنے [illegible]وں کے شہزادے شہزادیاں غرضیکہ تمام لوگوں پر ان کے ضمنی اور زمینی ماحول کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر اسے [illegible] طرح خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو سمجھا ہی سکتے ہیں۔ لیکن رگوں میں دوڑنے پھرنے کی طرح یہ ماحول ہم میں رواں [illegible] ہے۔

479۔ این ہمارے پہلے گھر یعنی 455۔ این سے کشادہ اور مقابلتاً بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی دائیں سڑک اس [illegible] سے ٹیوب ویل کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہی سڑک دوسری جانب یعنی مین بازار سے ہو کر گولائی اختیار [illegible] یہ سڑک بھی بائیں جانب کو مڑ جاتی۔ عین ان دونوں سڑکوں کے سنگم پر 479۔ این واقع تھا۔ اس گھر کے عین [illegible] میں ایک بہت بڑی گراؤنڈ تھی جسے سب ڈونگی گراؤنڈ کہتے تھے جس میں بارش میں ستانے اور دھوپ سے [illegible] کے لیے ایک بارہ دری تھی جسے میرے بیٹے باندرادری کہا کرتے تھے۔

ہمارا کوٹھی نما گھر عین سڑک پر واقع تھا۔ ہمارے گھر سے آگے دائیں ہاتھ جمیل صاحب رہتے تھے جو گاڑیوں کی [illegible] چلاتے تھے۔ پھر یہ سڑک سیدھی چودھری کالونی کی طرف جا نکلتی تھی' جہاں میرے بھائی نے شادی کے بعد [illegible] پر گھر لیا تھا۔

گھر کے آگے ایک معمولی سا گیٹ تھا' جس کی گلی سیدھی صحن کی طرف جاتی۔ اندر کشادہ صحن میں بائیں ہاتھ [illegible] چھوٹا سا غسلخانہ اور متصل ٹائلٹ تھا۔ جب نظامی صاحب ریڈیو سٹیشن سے ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے ہمیں بہت سے [illegible] گملے تختے بھیجے جن سے پچھلا صحن اور سامنے والا برآمدہ آراستہ کر لیا گیا۔

پھاٹک کے سامنے قریباً پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ آسانی سے اندر جھانکنا ممکن نہ تھا۔ یہیں پر برآمدہ تھا۔ جب [illegible]ستان گو' رسالہ بند ہو گیا تو ہماری پرنٹنگ مشین جسے محمد علی چلایا کرتا تھا' اسی برآمدے میں لا کر دھر دی گئی۔ برآمدے [illegible] دروازے کھلتے تھے۔ ایک تو ٹاور نما گولائی لیے کمرہ تھا جسے ہم نے ڈرائنگ روم بنا لیا اور جس میں نانا کی تاش پارٹی [illegible] تھی۔

جالی کا دوسرا دروازہ ہمارے نانا کے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ اس کے آتش دان کے اوپر فون دھرا تھا جو ہماری نئی نئی [illegible]ت تھا۔ جب کبھی مہمان آتے تو اس کمرے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا' میرے دونوں بچے بڑے آرام سے اس آتش دان [illegible] نیچے بیٹھ کر باتیں سنتے رہتے۔ نعیم طاہر ان دنوں سائیکل پر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ ابھی تک انہیں ان بچوں کا [illegible] دان میں بیٹھنا نہیں بھولا۔

اس کمرے سے ایک ہی دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جسے ہم نے کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ یہ خوبصورت میز اور کرسیاں تھیں۔ یہ میز کرسیاں اس لیے خوبصورت تھیں کہ انہیں ٹیک وُڈ سے بنوایا تھا' آسٹریلیا سے پہلے وہ یہ میز اور سائیڈ بورڈ ہمیں دے گئے۔ ایک خوبصورت سائیڈ بورڈ کے علاوہ یہاں اور کسی فرنیچر کی گنجائش نہ تھی۔

اس کمرے میں بائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک بڑی پُر اسرار الماری تھی جس کے دونوں تختوں پر کوئی پالش۔ یہ الماری خاص الخاص خاں صاحب کی کھل جا سم سم تھی۔ اس میں سب سے اوپر والے تختے میں خاں صاحب ریزگاری چھپا کر رکھتے تھے۔ ضروری خط اور رسیدیں' چیک بک اور یادداشتیں بھی یہاں ہی ہوتیں۔ میں نے الماری کو کھول کر نہیں دیکھا' لیکن جب واصف اور سارہ (اسحاق بھائی کے بچے) ہمارے پاس آئے تو پھر یہ آئس کریم' گول گپے' چنے بتاشے والے خوانچہ فروشوں سے خریدنے کے لیے یہاں ہاتھ صاف کرلیا کرتے تھے۔ نہیں تھی میرے سامنے یہ کام ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ضرورت بھر ریزگاری لیں گے اور امیر ہو جانے کے بعد کی ان خواہشوں کا احترام کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔

اس کمرے سے پھر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جو صحن سے ملحق تھا۔ اس برآمدے کے آخر میں ایک غسل ہماری ضرورت کے لیے بہت بڑا تھا۔ کھانے والے کمرے سے ایک دروازہ عین الماری کے سامنے بیڈ روم میں اس بیڈ روم کی ایک لمبی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی اور پچھلی جانب ایک دروازہ کھل کر ایک گپت قسم کے غسلخانے میں یہاں سے اوپر گولائی میں سیڑھیاں اوپر چھت کی طرف چڑھتی تھیں' جب ہم یہاں شفٹ ہوئے تو رضائیوں والے ٹرنک کے لیے ان ہی سیڑھیوں پر چھت پر پہنچنے سے پہلے جگہ بنائی گئی۔ سردیوں میں نانا یا سلطان ملازم اوپر چھت سینکنے کے لیے چلے جاتے۔ ڈوگی گراؤنڈ کا ایک مالی میرے لیے پھولوں کے گلدستے کبھی کبھار لایا کرتا تھا اور اسی مالی نے قریباً اکیلے ہی یہ پیٹی اوپر چڑھائی تھی۔

پچھلے صحن والے غسلخانے میں ایک گولائی میں سیڑھیاں اوپر نیم چھتی کو چڑھتی تھیں۔ اوپر دو کمرے میں خاں صاحب کی لائبریری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اشفاق صاحب کی کتابیں ان کی زندگی میں بڑا اہم رول رہیں۔ جب وہ 1- مزنگ روڈ میں تھے تو کتابیں ان کے اوپر والے کمرے میں رہتی تھیں۔ وہ بوریا بستر اٹھا جب میں بنتا 455- این میں مقیم ہوئے تو ان کتابوں کو الماریاں ملیں اور یہ کچھ ڈرائنگ روم کی زینت بن گئیں اور کچھ الماریوں میں سجادی گئیں۔

جب ہم 479- این میں آ گئے تو ایک بار پھر ان کتابوں کو اچھا بسیرا نہ مل سکا۔ دو تین الماریاں تو پہلے کمرے میں لگ گئیں لیکن باقی نیم چھتی کے دوسرے کمرے میں تہہ در تہہ لگا کر رکھ دی گئیں۔

اس نیم چھتی میں ہمارا پہلا رہائشی مہمان عکسی مفتی آیا!

عکسی مفتی لاہور میں ایم اے سائیکالوجی کرنے آیا تھا۔ وہ کسی قسم کے آراستہ کمرے کا خواہش مند نہ تھا۔ مفتی اور عکسی مفتی میں خوشبو سونگھنے کی قوت ہے۔ وہ انسان کی نیت تک اسی خوبی کی وجہ سے پہنچ جاتے ہیں۔

صحن سے عین سامنے برآمدے سے ملحق ہمارا باورچی خانہ تھا۔ چھوٹا سا اور اس کے ساتھ ایک الماری تھی۔

طرف کھلنے والی ایک جالی دار کھڑکی جس میں دودھ وغیرہ ابال کر بڑے اہتمام سے رکھا جاتا۔ بعد میں جب ہم ہوگئے تو ہمارے پاس تیل کا چولہا بھی آ گیا۔ لیکن ابھی لکڑیوں کی آگ جلا کر میں روٹیاں پکاتی سینکتی اور جب روٹی پھول جاتی تو مجھے ایسی خوشی ہوتی جیسے اب افسانہ ختم کر کے ہوتی ہے۔

اس چولہے سے کوئی ایک فٹ دور ایک چھوٹی سی میز بھی تھی جس کے آگے تین چار ڈگڈگی نما چھوٹے چھوٹے مونڈھے تھے۔ ان مونڈھوں پر عکسی مفتی ہمارے ساتھ بیٹھ کر سادہ سادہ کھانے کھاتا اور بے تحاشا تعریف کرتا۔

عکسی مفتی نے آتے ہی اثیر بیٹے کو اپنی جاگیر بنا لیا۔ وہ اسے نہ اثیر پکارتا نہ شیری۔ اس نے اپنا ہی نام اختراع کیا۔ کھانے کے کمرے کے آخری دروازے پر کھڑا ہو کر وہ پکارتا ''چیری..... چیری..... چیری.....''

اثیر خاں نے ابھی مشکل سے چلنا سیکھا تھا لیکن اپنے گوڈ فادر کی آواز سن کر جہاں بھی ہوتا بھاگ نکلتا اور اپنا ہی چیری..... چیری پکارتا رہتا۔ عکسی اسے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اٹھا لیتا اور اپنی نیم چھتی میں لے جاتا۔ مجھے رونے کی آواز کبھی اوپر والے کمروں سے نہ آئی۔ جب کبھی عکسی گھر نہ بھی ہوتا تو کبھی کبھی چیری اسے تلاش کرنے سیڑھی اوپر جا نکلتا اور پھر اسے سلطان اٹھا کر نیچے لاتا۔

سلطان اور رحمت دو بہن بھائی تھے جو کہیں سے ہمارے گھر آ گئے تھے۔ رحمت جو بمشکل تمام بارہ سال کی ہوگی، وغیرہ دھوتی تھی اور باورچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچپن میں اسے شاید پولیو ہوا ہوگا، کیونکہ اس کی ایک ٹانگ تھی۔ رحمت تو دو ایک سال بعد کام چھوڑ گئی لیکن سلطان نے اثیر خاں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ وہ اسے بٹھا کر بھائیوں کے ساتھ ڈونگی گراؤنڈ میں لے جاتا۔

عکسی مفتی شروع سے زندگی کے اصل معنی تلاش کرنے میں مگن تھا۔ ابھی اس کی یہ خواہش ناپختہ تھی اور وہ پانیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ اس تلاش کی ایک مبہم سی شکل اس کے دوست تھے جن میں صادق ایک اہم تھی۔ وہ اپنے تین دوستوں کو لے کر کالج سے آتا۔ برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم میں ایک گول میز رکھی اس پر شیشے کا گلاس رکھا جاتا۔ چاروں دوست پوری توجہ، حیرت اور مجسم سوال بن کر گلاس پر انگلیاں رکھتے۔

عکسی کہتا:

Any soul passing by kindly enter the glass move it.

حیرانی کی بات ہے۔ دو تین مرتبہ جب عکسی یہ التجا کر چکتا تو گلاس لرزنے لگتا اور چلنے لگتا۔ اب سوالات کیے جاتے اور عکسی ہر سوال کے بعد پوچھتا: ''اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہے تو گلاس میں آئی روح آپ ہاں تک چلی جائیں اور اگر آپ کا جواب انکار میں ہے تو نو پر چلی جائیں.....''

گلاس کھٹا کھٹ پھٹا پھٹ جواب دینے لگتا۔ روح سے دنیاوی، دینی، روحانی کئی قسم کے سوال پے در پے پوچھے جاتے۔ خاں صاحب اور مجھے کبھی اس مشغلے میں شامل ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ عکسی دوستوں کی سنگت میں بلاتا ہے اور اس کے اس مشغلے سے ہماری زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اس لیے ہم حارج نہ ہوئے۔

بہت بعد کی بات ہے کہ ان دوستوں میں سے صادق اسلام آباد میں کمیونسٹ تحریک میں موردِ الزام ٹھہرا۔

مارشل لا کا زمانہ تھا۔ تحقیق کم اور گرفت زیادہ تھی۔ صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر بہت بعد میں صادق کو لاہور کی جیل میں
دیا گیا۔ یہاں سے اس کے خط میرے نام آیا کرتے تھے۔ پھر یکدم ایک دن خبر ملی کہ صادق کو کسی قیدی نے
کر دیا..... کچھ لوگوں کو قید میں بھی راستہ مل جایا کرتا تھا۔ غالباً راستے کی تلاش کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور شخصیت کا ذکر بھی کر دوں اور وہ کیپٹن یوسف ہیں۔ ان کا ذکر
صاحب کیا کرتے تھے۔ کیپٹن یوسف سے ایک دو مرتبہ میں اسلام آباد میں ملی تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ شہاب صاحب
سے کہا..... ''آج سے آپ میرے ابو ہیں۔''

شہاب صاحب نے بڑی شائستگی سے انکار میں سر ہلایا اور بولے: ''سوری یوسف! میں صرف ثاقب کا
ہوں۔ آپ کا یہ اعزاز قبول نہیں کر سکتا.....؟''

کیپٹن یوسف کو اس کے بعد مذہب کا جنون ہو گیا۔ وہ منبر پر چڑھ کر مائیکروفون کا سہارا لے کر تقریریں کرنے
لگے۔ کچھ لوگوں کے اعتقادات مجروح ہو گئے۔ یہ لوگ بھی باولے تھے لیکن سیاسی اعتبار سے طاقت ور بھی تھے۔ انہوں نے
یوسف سے بدلہ لیا اور اسے ہتھکڑی لگوا کر جیل میں ڈال دیا۔ جب تک خاں صاحب سلامت رہے ان کا یوسف سے
تھا یا نہیں تھا مجھے اس کی خبر نہیں..... لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے یوسف کے خط آنے لگے۔ ان خطوں میں کچھ
بھی تھے، یاس کی جھلکیاں بھی تھیں اور اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے کی خواہش بھی تھی..... پتہ نہیں یہ یوسف کی
کے نتیجے میں ہوا کہ قدرت کو اس کی رہائی مقصود تھی..... ایک روز یوسف کو ساتھی قیدی نے قتل کر دیا! یوں صادق اور یوسف
نے جیل سے رہائی پائی۔

میں نے کبھی ممتاز مفتی کی طرح سچ بولنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مفتی جی اور میں عموماً گھنٹوں اس بات پر بحث کیا کرتے
تھے۔ وہ سچ کے داعی تھے۔ مجھے دل رکھنے کی بیماری تھی۔ عام قاری کے لیے سچ بڑی پُر لطف چیز ہے۔ وہ ایسی کہانی
پسند کرتے ہیں جس میں لکھاری اپنے گندے کپڑے آپ کے سامنے دھوئے۔ جب ''علی پور کا ایلی'' مسودے کی شکل میں
ہمارے پاس آیا اور ''داستان گو'' کو اسے چھاپنے کا اعزاز ملا تو مفتی جی سے میرا ایک ہی جھگڑا تھا۔

میں کہتی..... مفتی جی! اگر آپ شہزاد کے کردار کو سچ کی مورت بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ پورا سچ آپ کی
بہادری بچوں کی بزدلی کا باعث نہیں بن جائے گی۔ آپ عکسی کے لیے اپنی بیٹیوں کے لیے کئی Complexes ورثے
میں چھوڑ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کوئی شخص بھی پورا سچ بولنے پر قادر نہیں کیونکہ ہر انسان کا علم الاّ قلیلا ہے۔ کوئی شخص
دوسرے کے متعلق تو کیا خود اپنے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔

میں سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ چونکہ ہمارے اندر گندا اور صاف لہو اکٹھا رواں دواں ہے اور
کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ یہ دونوں لہو قلب میں مل نہیں پاتے۔ سنا ہے ایسے ہی جنت میں دو دریا جاری ہیں جو ایک
دوسرے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ پر ان میں ایک قدرتی آڑ ہے۔ گویا اس دوئی یا تضاد نے انسان کی ساری زندگی کو
الجھاؤ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ مکمل طور پر فرشتہ بن جائے یہ ممکن نہیں، مجسم ابلیس بن کر اترائے اور تکبر کی صورت زندگی بسر
کرے یہ بھی یقینی نہیں۔ اللہ نے اسے آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ اگر ہدایت کا رخواستگار ہوا تو بدی کا سفر نیکی میں منتقل ہو جائے

کے سحر سے چھٹکارا حاصل نہ کرنا چاہے تو بھی فیصلہ اس کا صرف اپنا ہے۔ غیبی طاقت اسے تبدیلی پر آمادہ تو کرسکتی ہے لیکن تھانیداری نہیں کرسکتی۔

میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گی کہ میری کتاب سچ کی دعوے دار نہیں۔ میں نے سائنسی طریقہ کار کی طرح Pr طریقہ استعمال نہیں کیا۔ تخلیقی عمل کا تعلق ذہن سے کم اور قلب سے زیادہ ہے۔ یہاں تخیل، احساسات، Prem، پیش گوئیاں، تحت الواقعہ معنی، ذومعنی، ابہام پسند Interpretations اہم ہیں۔ یہاں معجزاتی صرف یقینِ محکم کا حصہ ہوا کرتے ہیں بلکہ ان کا انتظار لازمی اور زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے۔

اسی لیے جو کچھ میں خاں صاحب کے بارے میں بیان کروں گی کسی سلسلہ وار یا تاریخ وار ہسٹری کی ضامن نہیں، میری مجبوری ہے۔ میرے پاس جو مائیکروسکوپ ہے اس میں سے ذرات اسی طرح دیکھے جاسکتے ہیں۔

جب میں نے بہت بعد میں 121۔سی میں ''مردِ ابریشم'' لکھی تو ممتاز مفتی اور میرے درمیان ایک محاذ قائم ہو گیا۔ کتاب کا پہلا نسخہ مفتی جی کو بھیجا جس کے جواب میں فون پر بات ہوئی۔ مفتی جی بولے: ''کاکی! تو نے بڑی کچ کتاب کس کے بارے میں لکھی؟''

''کیوں مفتی جی کیا کیا میں نے؟''

''میں لاہور آرہا ہوں۔ آکر بتاؤں گا؟ یاد رکھ ایسی مَن مَن کن کن سے نہ لکھنے والے کا کچھ فائدہ ہوتا ہے نہ اس شخص کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔''

مفتی جی کے آنے تک میں نے بڑے تذبذب میں دن گزارے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کہاں غلطی کی تھی۔ مفتی جی آئے، بڑی محبت سے بسرام کیا۔ جب خاں صاحب روانہ ہوگئے تو ہم دونوں محاذ آرائی میں مشغول ہوگئے۔

''اوئے کاکی! تو بڑی لکھاری ہے لیکن اتنی جھوٹی ہے مجھے معلوم نہیں تھا۔''

''میں نے کیا جھوٹ لکھا مفتی جی؟''

''تو ہم سب سے زیادہ شہاب کو جانتی ہے..... وہ تیرے گھر میں آتا جاتا رہا، تو نے اسے بہت قریب سے دیکھا۔''

''پھر؟''

''تو جانتی ہے کہ اس کا روحانی دنیا میں کیا درجہ تھا۔ وہ قطب تھا، ابدال تھا، ولی تھا۔ تجھے اچھی طرح سے معلوم ہے۔ پھر تو نے ساری کتاب میں کہیں ایک جگہ اپنے آپ کو Commit نہیں کیا۔ کیا یہ بددیانتی نہیں ہے، قلمی بددیانتی؟''

''مفتی جی! میں شہاب صاحب کی اس جہت کو نہیں جانتی جس کا آپ ذکر کررہے ہیں۔''

''نئیں نئیں بلیئے۔ تو نہیں جانتی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ صرف تجھے بھی ایک بیماری ہوگئی۔ اپنے شوہر پُروقار High and mig کی طرح تجھے بھی وہم ہوگیا ہے کہ تجھ سے بڑا کوئی نہیں۔''

میں ہکا بکا رہ گئی۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جس وقت مفتی جی کی باڑ چڑھی ہو وہ کسی کی نہیں سنتے۔

''بول بول..... بول..... جانتی ہے نا کہ جھوٹی کتاب لکھی ہے اس لیے چپ ہے۔ سچا آدمی اپنے آپ کے حوالے نہیں کرتا..... سچا آدمی بولتا ہے اور گج وج کے بولتا ہے۔''

''مفتی جی! آپ مانیں گے نہیں۔ لیکن میں نے شہاب بھائی کو قرائن سے سمجھا۔ وہ جب جب بھی میرے ٹھہرے ہمیشہ خاں صاحب کے ساتھ دفتر چلے گئے اور واپسی پر اپنے کمرے میں مقید ہو گئے۔ اگر کبھی گھر پر ہوئے بچوں کی سنگت میں ملے۔ سب سے زیادہ انہوں نے اثیر کے ساتھ وقت گزارا۔ وہ حالات میں نے قلم بند کر سارے۔''

''بالکل ٹھیک..... اب سچی بات منہ پر آئی۔ تو نے شہاب کا نام لے کر اپنی فیملی کو Build کرنے کا اپنے ناخن کاٹنے والے شوہر کو ان کا خلیفہ بنا دیا۔ اثیر ڈرائیور کو نہ جانے کیوں یوں ظاہر کیا' گویا وہی ایک لاہور میں پرسان حال تھا..... شہاب بیچارے کا کچھ ذکر نہیں..... ساری شاعرانہ تعلّی ہے' شیخی ہے۔ یہ کتاب تو نے اپنے Build کرنے اور اپنے گھر والوں کی ہوا باندھنے کے لیے لکھی ہے۔''

سچی بات ہے مفتی جی جیسے خاکے کسی نے اردو ادب میں نہیں لکھے۔ شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ جنت کے مجذوب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا یہی وصف انہیں دنیائے ادب میں بھی معرکے کا مقام دلا گیا لیکن کروں آری کی طرح چلنے والا' تیر کی مانند کھب جانے والا' تین اور تیرہ کے درمیان کوتوال کی طرح الف کھڑا سچ مجھ نہیں جاتا۔ مجھے موم بتی کی روشنی میں' کھڑکی میں سے در آنے والی چاندنی' ٹارچ سے چابیاں تلاش کر کے تالا کھ کمرے کا منظر دیکھنا پسند ہے۔

جب عکسی ہمارے پاس تھا تو مفتی جی اسلام آباد سے ہمیں ملنے آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی عکسی خصوصی محبت کرتے نہیں دیکھا۔ وہ خاں صاحب اور مجھ میں مشغول رہتے۔ ہر مرتبہ جب وہ آتے تو ان کے ساتھ بھر تازہ بھونی ہوئی مونگ پھلیاں ہوتیں۔ ان میں سے ایک دانہ بھی کبھی ممتاز مفتی نے منہ لگایا نہ عکسی نے کھایا۔ میں یہ بوری اپنے بیڈروم میں محفوظ کر لیتی اور پھر خاں صاحب ان کے دوست اور میں اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

مفتی جی کا بسیرا بھی اوپر نیم چھتی میں ہوا کرتا تھا اور مفتی جی چونکہ مفتی جی تھے اور محبت کرنے والی روح روز اول سے ملی تھی' اس لیے انہوں نے بہت جلد اس اصول کو اپنا لیا کہ ہمارے دل میں جگہ بنانے کے لیے انیق اور سے محبت کرنا گزیر ہے۔ یہ دونوں بچے مفتی جی کے پاس اوپر نیم چھتی میں گھس رہتے' جہاں ممتاز مفتی اپنے کاغذوں کھلار ''علی پور کا ایلی'' لکھتے رہے۔ وقت پر نیچے آ جاتے باورچی خانے میں اپنا مونڈھا لیتے' بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ گویا کی بھوک ہو۔ ہر نوالے پر داد دیئے چلے جاتے۔

مفتی جی اپنی جلو میں ہمارے لیے ایک تحفہ مرزا جی لے کر آئے۔ یہ وہی مرزا جی ہیں جن کا ذکر ''سفر در سفر'' آپ پڑھ چکے ہیں۔ چھوٹے قد کے مرزا جی بڑے مزیدار آدمی تھے۔ ان کو سمجھنے کے لیے مزاح کی حس' قوت سماع آہستہ روی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے پرانے قصے بڑا لطف لے لے کے سناتے' خاص کر وہ واقعہ جب وہ بنگال میں انگریز کی فوج میں ٹھیکیدار تھے۔ باقی چھوٹی موٹی بے ایمانیاں تو ایک طرف' ایک مرتبہ انہوں نے باربردار ہاتھیوں کی پوری کھیپ

انگریز کرنیل کو قائل کرلیا کہ ہاتھی کہیں جنگل میں غائب ہو گئے ہیں اور اب ان کی تلاش بے کار ہے۔

مرزا کو کھانا پکانے کا بھی بہت شوق تھا۔ مفتی جی اور عکسی تو صرف کھانا کھانے آتے تھے لیکن مرزا جی کبھی کبھی ... دیتے۔ نئے نسخے بھی بتاتے۔ رنگ برنگے مصالحہ جات کا اضافہ بھی کرنے کو کہتے۔

"بانو اس میں تھوڑا سا زیرہ اور ادرک بھی پیس کر ڈال دینا۔ چنے کی دال کا ذائقہ اچھا ہو جائے گا۔ ثابت مرچ ... لہسن کے ساتھ۔"

"تیرے پاس کلونجی ہے کلونجی..... اور اجوائن؟"

"ہاں جی..... دیکھ لیتی ہوں مرزا جی....."

"دیکھ کیا لیتی ہے تجھے پتہ نہیں......؟" وہ قدرے ناخوش ہو کر کہتے۔

"جی کبھی ضرورت نہیں پڑی....."

"اوئے اشفاق سارا دن بیٹھا رہتا ہے۔ میں اس کے لیے بڑی اعلیٰ معجون بنا دوں گا۔ تجھی بھر ناشتے کے بعد کھلا ... ہوا وغیرہ سب خارج....."

"اچھا جی....."

"لا..... مجھے پیسے دے۔ میں فاروقی کی دکان سے سودا دیکھ کر لاتا ہوں....."

جب میں انہیں پیسے پکڑاتی تو وہ کسمسا کر کہتے..... "اوئے کڑیے! یہ تو تھوڑے ہیں۔ چل اچھا میں گزارہ کر ... لوں گا۔"

"ہوں" ان کا تکیہ کلام تھا۔ جو کچھ نہ ہو سکتا اس پر وہ "ہوں" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ جو کچھ سمجھ میں نہ آتا اس پر ... "ہوں" کہہ کر پردہ پوشی کر لیتے۔ جہاں سے محبت کی آرزو ہوتی اور محبت نہ مل پاتی تو وہ "ہوں" کہہ کر صبر کر لیتے۔ ... ان کا مجموعی فلسفہ حیات "ہوں" تھا۔ لیکن کبھی کبھی ہوں سے نکل کر وہ یکدم اکڑ بھی جاتے اور اپنی بات منوا کر رہتے۔

جب حجام آ جاتا تو مرزا جی چودھری بن جاتے۔

"اوئے چلو میں حجامتیں بنواؤں گا تمہاری..... نوکی۔ کیسی چلو....."

خاں صاحب کچھ ڈرتے ڈرتے کہتے "ناں یار تو کھچل نہ کر..... میں کروا لیتا ہوں۔"

"تو پڑھ بیٹھ کر پڑھا کو..... حجامت میں کراؤں گا۔ مجھے معلوم ہے خلیفے کتنے ظالم بے حس ہوتے ہیں۔ کھڑا ہو کر ... سے کراؤں گا....."

بچے جو حجامت کے نام پر بدکتے تھے پتہ نہیں کیوں مرزا جی کی معیت میں بال کٹوانے کو کھیل تماشا سمجھتے۔

"کوئی نیا تولیہ لا کا کی..... یہ تو گندا ہے۔"

"دھل جائے گا مرزا جی..... بال ہی تو کٹوانے ہیں۔"

"اور گندا تولیہ ڈال دوں..... ان کے کندھوں پر؟"

"اب مجھے ایک مگ اور ڈیٹول لا کر دے۔"

میں سمجھتی تھی کہ ڈیٹول صرف وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی زخم میں پیپ پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

''ڈیٹول کیا کرنی ہے مرزا جی؟''

''کیا کرنی ہے.....؟ ہے نا جھلی۔ میں خلیفے کا استرا' قینچی' سارے اوزار ڈیٹول میں بھگو کر خود صاف کروں
پتہ نہیں کن کم بختوں کی حجامتیں بناتا آیا ہے۔ ایویں بچے بیمار کرنے ہیں۔''

اس کے بعد وہ بڑے اہتمام سے تولیہ' ڈیٹول مگ مع بچگان لے کر باہر والے برآمدے کے سامنے
دونوں بچوں کو باری باری کرسی پر کھڑا کر کے کسی پولیس آپریشن کی طرح حجامت کرواتے۔ اس کے بعد سارے بال
سے جمع کرواتے اور میرے پاس لے کر آتے۔ ''دھئی! ان بالوں کو ایک تھیلی میں ڈال دے۔ میں خود جا کر نہر میں
گا۔ تھیلی نہ ہو تو کوئی خاکی لفافہ لا دے۔''

''آپ فکر نہ کریں میں احتیاط سے کوڑے میں پھینک دوں گی۔''

''ہے نا پاگل اوئے بالوں پر تو ٹونے ہوتے ہیں۔ لوگ توٹوہ میں رہتے ہیں۔''

غرضیکہ ایک حجامت یوں کروائی جاتی ہے جیسے کوئی بڑا پراجیکٹ ہو......

مرزا جی کو ہم دونوں سے بڑی محبت تھی لیکن اس کا اظہار انہوں نے کبھی برملا نہ کیا۔

کبھی کبھی جب ہم سب صحن میں بیٹھے مفتی جی والی مونگ پھلیاں کھا رہے ہوتے تو مرزا جی کہتے......''یار
بیوی کھری ہے کھری.....تو اس کی قدر کیا کر اشفاق۔''

''کھری سے آپ کی کیا مراد ہے مرزا جی؟''

''یار میں نے بڑی عورتیں ہنڈائی ہیں۔ میں عورت کو اس کی آنکھ سے پہچانتا ہوں۔ تیری بیوی کی آنکھ
مرد کے لیے لابھ نہیں۔ یہ کھری عورت کی نشانی ہے۔ اس کی آنکھ میلی نہیں ہوتی۔ بڑا خوش نصیب ہے تو اشفاق! تجھے
ہا سے بہانے میں یہ مرد کو کیسے ورغلا لیتی ہیں۔ ایک آنکھ کے اشارے سے بیچارا مرد الٹ بازی کھا جاتا ہے......''

مفتی جی چلے گئے۔

مرزا جی اگلے جہان سدھارے۔

مفتی جی اپنا نعم البدل عکسی کی صورت میں چھوڑ گئے۔

لیکن مرزا جی بھی اپنی نشانی چھوڑنے میں پیچھے نہیں رہے۔

مرزا جی اپنا بھانجا ڈاکٹر عاطف مرزا ہماری خدمت کے لیے دے گئے۔

جب خاں صاحب 2002ء میں بیمار رہنے لگے اور انہیں باقاعدہ ڈاکٹروں کی حاجت رہنے لگی تو ڈاکٹر
نے سر نکالا۔ ہائی نون لیبارٹریز میں ڈاکٹر صاحب غالباً کوالٹی کنٹرول کے چیف تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف مرزا جی
حوالے سے کروایا۔ پھر باقاعدگی سے خاں صاحب کو دیکھنے آتے رہتے۔ انہیں اصرار ہوتا کہ اپنا بریف کیس
سیٹتھوسکوپ وہ خود اٹھائیں گے۔

خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داری کو اور شدت سے محسوس کیا اور مجھے بھی

لگے۔ بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد عموماً ان کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری اور تشویش ابھر آتی..... کبھی لاتے' کبھی نسخے لکھ کر دے جاتے۔ ان کی شکل پر تشویش دیکھ کر بات ٹالنے کی غرض سے میں کٹر عاطف! آپ کی وائف بھی تو ڈاکٹر ہیں۔ وہ آج کل کیا کرتی ہیں؟''

''وہ جی آج کل قرآن پڑھاتی ہیں۔ الدعوۃ سے انہوں نے فرحت ہاشمی صاحب کا کورس کر لیا ہے۔''

''یعنی ڈاکٹری چھوڑ دی۔''

''اندرون شہر نوکری ملی تھی..... جاتی تھیں لیکن بہت دور جانا پڑتا تھا۔ بس' چھوڑ دیا۔''

عاطف مرزا کا گھرانہ مذہب کی طرف مائل ہے اور میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ داستان سرائے میں ایک کی بنا پر کھنچے چلے آتے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق جو رائے قائم کرتے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ ہمارا علم ہر مقام پر اُلا قلیلا کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عاطف بھی خاں صاحب کی سے یہ قیافہ لگا چکے تھے کہ شاید ہمارے گھرانے کو مذہب کی شیفتگی اور عمل ویسے ہی نصیب ہو گیا ہے جیسے عاطف کی کو میسر ہے۔ ڈاکٹر غریب کو معلوم نہیں کہ ہم تو سراغ رساں' شیخی خورے ہیں' جنہیں تلاش تو رہتی ہے لیکن بہت کم نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

لیکن اس گھر میں ہم تک جمیلہ ہاشمی کیسے پہنچیں' یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

جمیلہ ہاشمی تب اتنی بڑی ادیبہ نہ تھی۔ اس کی تخلیقی روح بڑی جاندار تھی لیکن ابھی ادب کا راستہ متعین نہ ہوا جانے مجھے کیسے خبر ہوئی یا جمیلہ نے مجھے فون کیا یا پھر کسی طور پر مجھے پتہ چلا کہ جمیلہ بہت بیمار ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

ان دنوں سائرہ ہاشمی امن آباد میں رہتی تھی۔ مین بازار کی سڑک جہاں گول دائرے پر منتج ہوتی ہے اس سے کچھ سائرہ کا گھر تھا۔ جونہی مجھے جمیلہ کا پیام ملا' میں بھاگم بھاگ سائرہ کے گھر پہنچی۔ جمیلہ بڑی دلبرداشتہ' پریشان ایک نما چارپائی پر عجب کسمپرسی کے عالم میں لیٹی تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''میں بہت بیمار ہوں قدسیہ۔''

''پھر چلو میں ڈاکٹر کو دکھا لاؤں.....'' میں نے فوراً مشورہ دیا۔

''نہیں..... میں ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں۔ وہ میری بیماری کا علاج آپریشن بتاتے ہیں۔''

''تو کرا لو ناں آپریشن۔ کیا ہرج ہے؟''

ہر احمق آدمی کی طرح میں نے بن مانگے مشورہ دیا۔

''اوئے نہیں بابا..... اگر آپریشن ہو گیا تو پھر میرے گھر بچہ کیسے ہو گا..... میرے میاں گدی نشین ہیں۔ ان گنت ہیں۔ وہ کیا ہوں گی؟''

مجھے معلوم نہ تھا کہ جمیلہ سردار محمد صاحب گدی نشین کی اہلیہ ہے اور اتنی لمبی چوڑی زمینوں کی مالک ہے۔

''اچھا تو پھر کیا کریں.....علاج کے بغیر تو جمیلہ کام مشکل ہے۔''

جمیلہ کہنی کے بل ہوگئی اور پُر اُمید لہجے میں بولی.....''میں نے سنا ہے کہ اشفاق کا کوئی ہومیو پیتھک واقف ہے۔تم میرا علاج اس سے کروادو۔''

واقعی مین بازار میں فاروقی کی دکان کے پاس ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ ہم بھی وقت بے وقت ان سے علاج کرواتے رہتے تھے۔

''چلو ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔شام کو خاں صاحب آئیں تو تمہیں لے چلوں گی۔''

''نہیں بھئی تم مجھے ابھی لے چلو.....اسی وقت۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔''

میں کچھ حیران سی ہوگئی۔

''بھائی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔کیسے لے چلوں؟''

''دیکھو تم مجھے اپنے گھر لے چلو قدسیہ.....اس وقت سائرہ گھر پر نہیں ہے۔ وہ آ گئی تو پھر موقع نہیں ملے گا۔ اسی وقت۔''

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری طبیعت میں عجلت بھی ہے اور ناسمجھی بھی۔ میں بغیر سوچے سمجھے فیصلہ کرتی اور پھر فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہوں۔ اس وقت کا فیصلہ بھی کسی دانشمندی پر مبنی نہ تھا۔ خاں صاحب عموماً مجھے کئی ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ ان میں ''تاولی.....لے بھج.....ہیجلی'' ان کے پسندیدہ تھے۔ سائرہ کے شوہر وکیل اقبال گھر پر تھے لیکن میں نے ان سے بھی مشورہ نہ کیا۔

میں نے فوراً چار مزدور بلائے۔ جمیلہ ہاشمی کے دو تین کپڑے' سادہ سی استعمال کی چند اور چیزیں چارپائی پر ڈالیں' جمیلہ کو کھاٹ پر لٹا کر مزدوروں کو آرڈر دیا کہ مریضہ کو 479۔این لے چلیں۔ میں چارپائی کے ساتھ ساتھ مارچ کرتی چلی۔

گھر میں برآمدے کے سامنے والا کمرہ جو نانا کے لیے مختص تھا' اس میں جمیلہ کو پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ یہ کمرہ کشادہ، ہوادار اور ٹھنڈا تھا۔قباحت صرف اتنی تھی کہ سڑک پر سے آنے والے ٹریفک کی آوازیں یہاں ذرا زیادہ بلند ہوتی تھیں۔

شام کو جب خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو میں نے انہیں نانا کے کمرے میں جانے سے روک دیا۔ وہ صورت حال سے ناواقف تھے۔

''لیکن کیوں مجھے وہاں کچھ چیزیں رکھنا ہیں ذاتی۔''

''وہاں جمیلہ ہاشمی آئی ہوئی ہیں.....بیمار ہیں ان کا علاج کرانا ہے ہومیو پیتھک.....''

پھر میں نے کچھ خوف کے ساتھ کچھ شیخی کے طور پر رام کہانی سنائی۔ خاں صاحب نے لمبی سی سانس لی۔ کی نہ کسی قسم کی لعن طعن.....بس چپ ہو گئے۔

ہاں ایک اور بات ضرور ہوئی۔ بچوں کا لمبی ٹرین کا کھیل بھی بند ہو گیا کیونکہ اب انہیں بیمار کے کمرے میں
اجازت نہ تھی.....

ہمارے گھر میں نہایت سادہ کھانا پکتا تھا۔ پھل وغیرہ آتے ضرور تھے لیکن وہ بھی کبھی کبھار۔ اگر خاں صاحب کو
جانے کا موقع مل جاتا تو پھر پھل میں افراط نظر آتی۔ ان دنوں دو موریہ پل کے قریب سبزی اور پھل کی منڈی لگا
تھی۔ ہمیں اتنی دور جانے میں بھی کوئی مشکل درپیش نہ آتی کیونکہ ہم غریبی کے دور سے نکل کر اپنے آپ کو امیر سمجھنے

جمیلہ کے کپڑے دھونے کے لیے اسے دبانے کے لیے وہی مائی آیا کرتی تھی جس کے ہاتھوں میں انیق اور
ہوئے تھے۔ بچے چھوٹے تھے۔ گھر کا کام بہت تھا۔ مجھے جمیلہ کے پاس بیٹھ کر گپ بازی کرنے کا وقت کم کم ملتا
روز میں اس کے لیے گلوکوز کا گلاس بنا کر لے گئی تو جمیلہ بولی۔

"تھوڑی دیر تو ٹک کر بیٹھ جایا کر قدسیہ۔"

میں حکم کی تعمیل میں بیٹھ گئی۔

"یہ کھانا کون پکاتا ہے بڑا معمولی درجے کا کھانا پکاتا ہے۔"

میں کچھ شرمندہ ہو کر بولی..... "کھانا تو خیر میں ہی پکاتی ہوں جمیلہ....."

"میرا یہ مطلب نہیں کہ کھانا خراب پکا ہوتا ہے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں انہیں طاقت ور خوراک
....."

"مثلاً....."

"مثلاً گوشت، مرغی، قیمہ..... مکھن، دہی....."

"وہ بھی پکتا ہے لیکن انیق اور انیس سبزیاں ہی پسند کرتے ہیں۔ خاں صاحب کو دال پسند ہے اور خاص کر کابلی
..... اثیر خاں ابھی دودھ پیتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔"

"تم کسی کی فکر نہ کرو جمیلہ میرے ساتھ فورمن کرسچین ہسپتال چلو..... وہاں ایک بڑی قابل لیڈی ڈاکٹر آئی ہے
علاج کرواؤ....."

"پھر وہی بات..... جس طرح میں تیری منطق نہیں سمجھتی تو میری بات نہیں جانتی۔ وہ پکڑ کر آپریشن کر دے
یہ ہومیو پیتھک علاج مجھے راس آرہا ہے۔ خدا کی قسم اب تو لگتا ہے مجھے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

واقعی لگتا تھا جیسے جمیلہ پوری تندرست ہو گئی تھی۔

جب چودھری سردار محمد جمیلہ کو لے کر گاؤں گئے تو میں حیران تھی کہ اتنے غلط فیصلے کا اس قدر مثبت نتیجہ کیسے نکل

خاں صاحب کو جانوروں سے بڑی محبت تھی۔ یہ جملہ بڑا بے معنی سا لگتا ہے جیسے کوئی آٹھویں جماعت کی لڑکی

فون پر آپ سے کہے کہ مجھے اپنی امی سے بڑا پیار ہے لیکن کبھی کبھی کلیشے کے جملے بڑے سچے بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب عہد گزر جاتا ہے تو اس سے مستعار لی ہوئی اقدار بھی ماضی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ آج ساری دنیا میں صنعتی ترقی کے اثرات کا بول بالا ہے۔ دیہات، دیہاتی رسم و رواج، دیہات سے وابستہ اقدار سب رول بیک کر رہے ہیں۔ وہ جو ساری دنیا کو کھانا پینا مہیا کرتے ہیں، پینڈو کہلائے جانے پر احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ شہری مہذب آدمی جب جانور سے محبت کرتا ہے تو کتے کے گلے میں پٹکا اور چین ڈالتا ہے۔ بلی کو پنجرے میں بند رکھتا ہے۔ سیزن آنے پر بلی کو ٹیکا لگوا کر اسے بانجھ کرنا پڑتا ہے۔ طوطا ہے تو پنجرے میں۔ مجبوری سرخا ہے۔ بلبلیں ہیں تو پنجرے میں۔ شہر میں ہر چیز کو قید کر کے محبت کی جاتی ہے۔

لیکن دیہاتی لوگوں کی زندگی کھیت، باڑے، آنگن میں گزرتی ہے جہاں ریوڑ، گھوڑے، کتے، بلیاں، مرغیاں، گائے بھینسیں سب ماحول کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک راستوں پر گھومتے جوہڑ میں بطخیں، چھتوں پر کبوتر، گھونسلوں سے چڑیا کے بوٹ نہ گریں۔ بچپن سے بچے جانوروں سے مانوس ہوتے ہیں۔ نہ انہیں کسی جانور سے خوف آتا ہے نہ وہ کسی Pet سے زبردستی پیار کرتے نظر آتے ہیں۔ دیہاتی گاجر، مولی، گنے، بیر کھاتے کئی میل کا پینڈا طے کر لیتے ہیں۔ انہیں کے ڈاکٹر سے کچی سلاد کا نسخہ لکھوانا نہیں پڑتا۔ وہ طبعاً بڑے فطری انداز میں جہاں جو چیز کچی نظر آئے منہ مارنے لگتے ہیں۔ چنے ابھی مشکل سے جھاڑیوں پر لگتے ہیں تو کچا چھولیا ''ہولیں'' بنالی جاتی ہیں۔ امبی ہری ہو تو اچار بن جاتا، چٹنی تیار ہو جاتی ہے۔ رس نکل سکے تو آم رس بننے لگتا ہے۔

صنعتی انقلاب نے جہاں زرعی طرز بود و باش گنوا کر (اب اس کی تلاش بے معنی اور بے منزل ہو گئی ہے) از سرِ نو اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ وہیں وہ اس دین سے بھی بچھڑ گیا ہے جس کی پالنا دیہات میں آسان ہے۔ خاں صاحب کو جانوروں سے فیشنی سی محبت نہ تھی۔ وہ گھوڑے، بھینسیں، کتے، مرغی، بلی، بچھڑے کے ساتھ رہ چکے تھے اور اس محبت میں مصنوعی پن نام کو نہ تھا۔

ان دنوں اثیر خاں بیمار تھا۔ اسے دودھ کی الرجی ہو گئی تھی۔ بھینس کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا۔ زبان پر سفید سی جم جاتی۔ کبھی کبھی قے کا عارضہ بھی ہو جاتا۔ سمن آباد کے بازار میں ہومیوپیتھک ڈاکٹر فاروقی سے ہم بچوں کی دوائیں لایا کرتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم اثیر خاں کو بکری کا دودھ پلایا کریں۔

ان دنوں جمیلہ ہاشمی ہمارے گھر میں مقیم تھیں۔ جب وہ اپنے گاؤں واپس جانے لگیں تو خاں صاحب نے صاحب سے فرمائش کی کہ اگر وہ کوئی گابھن بکری بھجوا سکیں تو ہم یہ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کچھ وقت کے بعد بکری آ گئی۔ مکمل طور پر شہری تھی۔ مجھے کتوں کا تو پھر بھی کچھ تجربہ تھا لیکن بکری سے میں نامانوس تھی۔ مجھے اس کے چارے سے بو سے گھن اور شکل سے بیزاری ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اثیر خاں کی خاطر اس کی ٹہل سیوا برداشت کی۔

سمن آباد کے اندرونی غسل خانے میں کالے پیروں والی سفید گابھن بکری کو باندھا جاتا۔ خاں صاحب آ جاتے تو بکری کو آنگن میں اُگے ہوئے دھریک کے نیچے لے آتے۔ محمد علی بکری کے لیے چارہ پتھے لاتا۔ خاں صاحب خود اسے بڑے پریم سے دانہ پتھے کھلاتے۔ میں ایک فاصلے سے ان کا شغل دیکھتی اور سوچتی کہ کیا انہیں بکری سے بو

...ے بھینچے ہوئے کھلے منہ سے خوف نہیں آتا۔ جس روز بکری نے بچے دیئے، یہ بھی عجیب سا دن تھا۔ ہمارے ...ے میں ایک غسلخانہ تھا، جس کے ساتھ اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ خاں صاحب صبح بکری بیگم کو اس غسلخانے ...ے مجھے ڈال کر چلے گئے۔ مجھے سمجھا گئے کہ بکری بچہ دینے والی ہے کبھی کبھی دیکھ لینا۔ اب گھر پر بچوں کے علاوہ ...ی نہ تھا۔ میرے پاس ان دنوں کوئی ملازم بھی نہ تھا جس سے میں مشورہ کر سکتی۔ ناناجی زمینوں پر گئی ہوئی تھیں۔ محمد ...ی "داستان گو" کے دفتر جا چکا تھا۔

میں بہت نروس تھی۔

جب میں نے سمجھا کہ اب وقت کم ہے اور کچھ کرنا چاہیے تو میں گھر کی گلی میں سے باہر نکلی۔ سنا ہے جاہلوں کی ...ے اللہ فرشتے بھیجتا ہے۔ اس وقت اثیر خاں میری گود میں تھا۔ گھر کے آگے سے ڈونگی گراونڈ کا ایک مالی گزرا۔ یہ ...ی کبھی پھولوں کا گلدستہ بنا سجا کر خاں صاحب کی خدمت میں دے جایا کرتا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے اپنی ...یل گلی میں رکھ دی اور پوچھا۔

"بی بی جی..... کیا حکم ہے؟"

مجھے اسے سمجھانا تو نہ آیا لیکن میں اسے اپنے ساتھ ساتھ گلی میں لائی۔ دروازہ کھولا تو بکری بلبلا رہی تھی۔ اس کی ...ن کر شاید وہ خود ہی سمجھ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مجھے تو نہ اسے کچھ بتانے کی ضرورت پیش آئی نہ اس نے کوئی ...ال جواب ہی کیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور بولا: "مبارک ہو بی بی جی ایک بچہ تو مرا ہوا تھا، دوسرا لیلا دودھ پی رہا ہے۔"

اس وقت محمد علی سکول سے انیق اور انیس کو لے کر آیا۔ گھر میں رونقیں ہو گئیں۔ خاں صاحب کو "لیل ونہار" کے ...تر میں فون کیا کہ گھر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ہوپر سائیکل پر کچھ دیر بعد پہنچ گئے۔ اب بکری کا ٹھکانہ یہی غسلخانہ ...ا۔ اس کی دیکھ ریکھ خاں صاحب اور محمد علی کرتے تھے لیکن اثیر خاں نے اپنی شہری والدہ کی طرح بکری کا دودھ بھی قبول نہ ...یا اور اس طرح اسے Cow & Gate کا خشک دودھ ہی پلانا پڑا۔ شہری بچے عموماً سوکھے دودھ اور بوتلوں پر ہی پلا ...تے ہیں۔ گھر سے بکری اور لیلا بھی رخصت ہو گئے۔ خاں صاحب کچھ دن کبھی درخت تلے، کبھی غسلخانے کے آگے ...ی اندر والی سیڑھیوں کی طرف جا کر کھڑے رہتے جیسے کچھ یاد کرتے ہوں۔ اپنی بے وفائی کا احساس اور بکری کا اس گھر ...یں نہ رہنے کا جواز ہولے ہولے روزمرہ کے حوالے ہو گیا اور مسائل جنم لینے لگے۔ مختلف راحتیں شکل دکھانے لگیں اور خاں ...احب نے اس بکری کا پھر کبھی ذکر نہ کیا جسے وہ بڑے پیار سے تھپتھپایا کرتے تھے اور ہاتھ سے پتے کھلایا کرتے تھے۔ وہ ...انتے تھے کہ شہری زندگی ایسی محبتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانور کو پنجرے میں بند، پٹے رسی میں قید، ڈسپلن کے کھونٹے ...ے باندھ کر ہی رکھا جا سکتا ہے۔

اثیر خاں سوکھا دودھ شوق سے پینے لگے۔ ان کی بوتل Sterilize کرنا پڑتی۔ دودھ ابلے پانی میں بنانا ہوتا۔ ...س دودھ کے کئی منٹے اور شرائط تھیں۔ بکری کے لیے کچھ بھی کرنا نہ پڑتا تھا۔ نہ میں نے اسے باندھا نہ کبھی دانہ چارہ دیا لیکن ...ب بکری محمد علی کو عنایت کر دی گئی تو میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ مجھے اب گھر سے بو نہیں آتی تھی۔ غسلخانے صاف ...تھرے ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگتا جیسے کوئی نحوست ختم ہو گئی۔ بکری غریب رشتہ دار تھی۔ رخصت ہوئی تو اطمینان ملا۔ نادار

رشتہ دار روٹیاں بھی پکاتا ہے۔ جھاڑ پونچھ صفائی ستھرائی بھی دیکھتا ہے۔ کپڑے دھونے میں بھی کوئی عار نہیں۔ ٹانگیں دبانے، پنکھا جھلنے میں بھی اپنی عزت محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس امیر صاحب حیثیت رشتہ دار پانی کا گلاس بھی خود لا کر نہیں دے سکتا۔ وہ آپ کی آراء پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ آپ چاہے پی ایچ۔ ڈی ہوں، چاہے امریکہ پلٹ سپیشلسٹ، وہ آپ کو کم علم، کم جانکار اور سوسائٹی کا ناکارہ پرزہ سمجھتا ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ میں بھی خالہ سے چھٹکارا حاصل کر کے بڑی پرسن تھی۔ اب میرے پاس خشک دودھ اور اس کی کہانی تھی۔ اس کے استعمال نے مجھے کئی طرح سے سربلند بھی کرنے میں مدد دی تھی۔

لیکن خاں صاحب دیر تک بکری کے بغیر خوش نہ رہ سکے۔ ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا اور سائیکل کے اوپر ایک لمبا سا ڈبہ دھرا تھا جس پر ہوائی جہاز کی تصویر بنی تھی۔ یہ ''لیل ونہار'' کی ایڈیٹری کا زمانہ تھا۔ خاں صاحب کے پاس ہوپر سائیکل تھی جسے ان کا آفس بوائے عبداللہ جان یوں صاف کرتا، جیسے وہ کوئی بی ایم ڈبلیو یا مرسڈیز ہو۔ پنجرہ گھر کے آنگن میں کھلنے والے برآمدے میں رکھا گیا۔ دوسرا ڈبہ خاں صاحب کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔ پنجرے میں سرخے تھے۔ انیق، انیس اور اثیر ٹھسکتے کھسکاتے پاس آ گئے۔ پنجرے کے اندر چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں باجرہ اور پانی ڈالا گیا۔

میرے تینوں بچوں میں سے انیس احمد خاں میں جانوروں سے موروثی محبت زیادہ ہے۔ وہ بڑی دیر تک پرندے اور جانوروں کی صحبت میں رہ سکتا ہے۔ انہیں شغف اور دلچسپی سے دیکھ سکتا ہے۔ ان کی خدمت میں اسے راحت ملتی ہے۔ وہ جانوروں کے ساتھ رہ کر اپنی ازلی معصومیت کے ساتھ ساتھ خوش رہتا ہے۔ سرخے بھی انیس کی ملکیت بن گئے۔

وہ پنجرے کے پاس بیٹھ کر ان کی چھوٹی چھوٹی اڑانیں دیکھتا۔ لڑکیوں جیسے نرم و نازک ہاتھوں سے انہیں دانہ ڈالتا۔ کبھی کبھی پھر پُھر کہہ کر اڑاتا۔ انیق خاں ایسے میں اسے منع کرتا کہ مداخلت ہے۔ طبیعتوں کے جوہر بچپن ہی سے واضح ہونے لگتے ہیں۔ انیق خاں شائستہ رو، شائستہ مزاج، کسی کو زبردستی اڑانے یا بٹھانے کا قائل نہ تھا۔

اثیر نے ان دنوں تھوڑا سا دوڑنا سیکھ لیا تھا۔ جب بھی دونوں بڑے بھائی پچھلے برآمدے میں سرخا پارٹی کرتے، وہ بھاگ کر آ تو جاتا لیکن اس کے لبوں پر ایک ہی تکرار ہوتی ''ٹیپ کارڈر لینا.....'' وہ ہمیشہ سے مشینوں کا شوقین تھا۔ موم بتی بھی مشین لگتی تھی۔ اگر کبھی بجلی چلی جاتی اور موم بتی جلانا پڑتی تو وہ بھاگا آتا ''باتی لینا.....موم باتی لینا'' اس کے ہونٹوں پر گیت کے مکھڑے کی طرح جاری رہتا۔

ہمارے گھر کے آگے دونوں جانب گراؤنڈیں تھیں۔ ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جس کے قریب صوفی صاحب کا گھر تھا اور جہاں خاں صاحب صوفی صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے۔ دوسری گراؤنڈ سے گزر کر بازار آ جاتا تھا جس میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ایک روز جب ہم وہاں پہنچے تو خاں صاحب نے کہا..... ''ڈاکٹر صاحب! مجھے انیس کی طبیعت پھر ٹھیک نہیں لگتی۔ دودھ تو وہ اب ڈبے کا پیتا ہے لیکن اس کی زبان صاف نہیں جیسے کچھ سفید چمٹا ہوا ہے۔ آنکھیں بھی دھندلی ہیں۔''

میں نے ان دونوں باتوں کا نوٹس نہ لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب تھوڑے مافوق الفطرت اشاروں کے آدمی بھی تھے۔

کہنے لگے..... ''کوئی پرندہ ورندہ تو نہیں پال رکھا؟''

''چھ سات سرخے ہیں۔ بڑی رونق لگا رکھی ہے۔ بچے انہیں باجرہ ڈال کر خوش ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب خاموشی سے پڑیاں بناتے رہے۔ ساتھ ساتھ ہوں ہاں کا شغل بھی جاری رہا۔

''یہ پڑیاں ہر چار گھنٹے بعد..... اور اگر آپ برا نہ مانیں خاں صاحب! پرندے آزاد کر دیں۔ آپ کے بیٹے کو آزادی مل جائے گی.....''

جس روز خاں صاحب نے سرخے آزاد کیے' وہ ڈبہ جس پر ہوائی جہاز کی تصویر تھی' لائبریری منگوایا گیا۔ یہ ایک پتلی سی تار اور بیٹری سے اڑتا تھا۔ اس کا ڈیزائن سامنے رکھ کر جوڑا گیا۔ خاں صاحب میں جو بچہ تھا' اس نے اپنے بچوں کی چھیڑ چھاڑ سے اسے بچا کر کھانے کے کمرے کی میز پر ماسٹر پلان بچھا کر جوڑا۔ بیٹری لگائی۔ سبھی چھت پر گئے۔ جب ہوائی جہاز کی اڑان تسلی بخش ہوگئی تو وہ بچوں کو اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔

ہوا میں اڑ جانے والے سرخے گویا اپنا نعم البدل چھوڑ گئے۔

اب ساری توجہ اس ہوائی جہاز پر تھی جو غالباً لاہور میں اپنی نوعیت کا پہلا کھلونا تھا۔

عجیب سی بات ہے سرخے اڑ جانے کے بعد اثیر خاں کی زبان بھی صاف ہوگئی اور باقاعدگی سے اپنے بھائیوں کے ہمراہ بھینس کا دودھ پینے لگا لیکن اس کی ایک خواہش سرد نہ پڑتی۔ اب بھی جب وہ کمروں میں بھاگتا..... ایک ہی ''ٹیپ کار ڈلینا..... موم بتی لینا.......''

موم بتی تو آسان کام تھا۔ ریکارڈر دینا ابھی میرے بس کی بات نہ تھی کیونکہ نیو ریلکو ٹیپ ابھی گھر میں نووارد تھا خاں صاحب سینت سینت کر رکھتے اور بڑی کنجوسی سے استعمال کرتے۔ انیس خاں نے اسے البتہ چلانا سیکھ لیا تھا لیکن ابو کی غیر موجودگی میں جب وہ اسے چلا لیتا تو انیق کا وہی لہجہ ہوتا..... ''اسے مت چلاؤ کیسی..... ابو ناراض ہوں

اس بیماری سے نجات تو مل گئی' لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ بیماریاں عموماً اپنے چنگے پوٹے انسانی جسم میں بطور ...جایا کرتی تھیں۔ لیکن ابھی کچھ دیر کے لیے عافیت رہی۔ پھر انیس بیمار پڑ گیا اور اسی سلسلے میں نہ جانے کہاں سے خاں صاحب ڈاکٹر ظہیر کو پکڑ کر لے آئے۔

کنہیا روپی ڈاکٹر ظہیر ہمارے گھر میں بڑی راحتیں لے کر آئے۔ وہ نہ صرف معالج تھے بلکہ نفسیات داں بھی تھے۔ علاج کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے خوف بھی دور کرتے اور ہمیں تسلی بھی دیا کرتے۔ ایک رات انیس کو بہت تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر نہ گئے بلکہ ہم دونوں کے ساتھ انیس کے پلنگ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ رہے۔ رات گئے انیس میری گود میں سویا ہوا تھا کہ اثیر آدھی رات کی فیڈ کے لیے جاگ گیا۔ ظہیر بولے..... ''خاں صاحب! اثیر کے لیے فیڈ بنا لائیں۔ انیس کو ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں۔''

''بھائی میں نے تو کبھی دودھ نہیں بنایا۔''

پہلے ڈاکٹر صاحب نے سمجھانا چاہا کہ ڈبے کے دودھ کا فارمولا اس کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔ اسے پڑھ کر... لیکن پھر ڈاکٹر اٹھ کر باہر چلے گئے..... کچھ دیر بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی.....

''آپ مجھے ساتھ لے چلتے ظہیر۔''

''ناں جی اصل کام تو کیا پڑا تھا۔ بوتل sterilize کرنا پڑتی تو وقت لگتا..... وہ تو تیار لائن میں پڑی ہیں...''

انیس کا بخار صبح سویرے ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں سراپا تشکر تھے۔

''اسے دوائی کونسی پلائی تھی ڈاکٹر صاحب۔ اتنے دنوں سے مسلسل بخار..... ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔''

''کچھ نہیں سر! ایک گولی اسپرو..... یہ بڑی زود اثر ہے۔ جب کبھی بڑی دوائیاں کام نہ دیں اسے آزمانا چاہیے۔''

یہاں سے ڈاکٹر اور خاں صاحب کی دوستی شروع ہوئی۔ ان کا کلینک موہنی روڈ پر تھا اور وہ زیادہ تر مریضوں کا مفت علاج کرتے تھے۔ ہمارے بھی وہ فیملی ڈاکٹر بن گئے۔

ابھی ہمارے پاس گاڑی نہیں تھی۔ ہوپر کی جگہ اب Lambretta سکوٹر آ گئی تھی جسے خاں صاحب خوشی سے چلاتے تھے گویا مرسیڈیز ہو۔ بڑا اچھا موسم تھا' نہ سردی نہ گرمی' بچے تگڑے تھے' ہم دونوں یو ایس آئی ایس سے وابستہ تھے اس لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ ایک شام خاں صاحب آئے' کچھ متفکر تھے۔

''کیا بات ہے شفو جی؟''

''وہ..... یامنی کرشنا مورتی آ رہی ہیں۔''

''کون؟''

''کیرالہ کی بہت بڑی فنکار ہیں۔ وہ لارنس باغ کے اوپن تھیٹر میں بھارت ناٹیم اور کتھک کلاسیکی ناچ کا مظاہرہ کریں گی۔ میری آرزو تھی کہ تمہیں اس کا شو دکھلاتا..... تم شادی سے پہلے ناچ سیکھا کرتی تھیں ناں.....''

''ہاں جی ایک استاد صاحب آیا کرتے تا دھی دھنا ندھی دھنا سکھایا کرتے۔ کچھ کلاسیکی بول تو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ لیکن میرا سیکھنا سکھانا کچھ دیر کے بعد آپ ہی بند گلی میں جا گھستا ہے۔ آپ کو پتہ ہے ناں کچھ دیر میں نے گانا سیکھا تھا۔''

''اچھا پچھلی باتیں چھوڑ۔ جانا چاہو گی؟''

''اس سے بہتر خوش اوقاتی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''لیکن بچوں کا کیا کریں..... کس کے پاس چھوڑیں؟''

''نانا آج ہی آئی ہیں۔ اندر بچوں کے ساتھ لوڈو کھیل رہی ہیں۔''

''لو جی مسئلہ حل ہو گیا۔ دو ٹکٹ تیار کر لو۔''

یامنی کرشنا مورتی نے اپنے ناچ سے سب کو مبہوت کر دیا۔ ایک ناچ تو خاص طور پر یادگار تھا۔ اس نے ایک

کا روپ دکھایا جو مہاراج کرشن کی عبادت کرنے جاتی ہے اور کیسے اپنے آپ کو اپنے ہار سنگھار کو لمحہ بھر کے لیے ... ایک ایک ایکشن تکبر، شیخی اور خودنمائی تھی۔ سارا اوپن ایئر تالیوں سے گونج اٹھا۔

مجھے اور خاں صاحب کو کسی مہربان نے بالکل سامنے والی قطار میں بٹھا دیا تھا۔ جونہی پروگرام ختم ہوا ہم بڑی ... کے ساتھ رش میں پھنسے بغیر باہر نکل آئے..... باہر ہمیں ظہیر اپنی کار میں منتظر ملا۔

"واہ آپ کو بھی شوق ہے کلاسیکی ڈانس کا....."

"نہیں خاں صاحب! میں گھر گیا تھا۔ امی نے بتایا آپ دونوں یہاں آئے ہیں۔ میں تو آپ کو لفٹ دینے آیا

"ہم سکوٹر پر چلے جائیں گے ڈاکٹر صاحب....."

"خاں صاحب! سکوٹر پر آ جائیں آپ میرے ساتھ چلیں۔" انہوں نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے کی ... سارے راستے ایک ٹرینڈ ڈرائیور کی طرح خاموش رہے۔

"... ونہار" کے ساتھ ساتھ خاں صاحب ریڈیو پاکستان سے 1963ء سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ تلقین شاہ ... لیکن تلقین شاہ پروگرام کرنے کی ایک وجہ ہو گئی۔ خاں صاحب یو آئی ایس پر V.O.A. (وائس آف ... کے لیے پروگرام کرتے تھے۔ یہاں انہیں مارلاک ملا جو V.O.A. پر وگرام کا کرتا دھرتا تھا۔ ایک مرتبہ خاں ... ایک پروگرام لکھا جس میں تلقین شاہ کا کیریکٹر ڈالا۔ اس کے پانچ رول تھے اور پانچ مختلف لب ولہجہ کے ساتھ ... نے یہ رول ادا کیے۔ مارلاک اردو، پنجابی یا سمانہ کی بولی تو نہیں جانتا تھا، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ... کرنے والے خواجہ سلیم اور چند دوسرے لوگ جو سٹوڈیو میں موجود تھے اس پروگرام سے بہت محظوظ ہوئے۔ ... امریکہ سے بھی آنے لگی اور اسے کئی بار لگایا گیا۔ ایک روز مارلاک نے خاں صاحب سے امریکن انگریزی

"اشفاق! تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟"

"تو پہلے کیا میں کم کام کرتا ہوں..... جو ایک اور بھی کر لوں؟"

"ایک پروگرام کرو ریڈیو پاکستان سے..... کئی پروگرام کرنے کے بجائے ایک پروگرام۔ خدا جانتا ہے یہ اتنا ... ہو گا کہ لوگ تمہیں اسی پروگرام کے حوالے سے یاد کریں گے۔ ایسا کردار پیش کرو جو بڑا Lovable ہو لیکن ... دوسروں کو نصیحت کرے اور اپنے پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائے۔"

مارلاک تو ماچس جلا کر خاموش ہو گیا لیکن خاں صاحب کی تخلیقی لکڑی میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے ترنت تلقین ... کردار گھڑ لیا۔ پھر اس کی کمینگی کو ابھارنے کے لیے ہدایت اللہ کو جنم دیا۔ ریڈیو سٹیشن سے انہیں بھائی نذیر حسینی مل گئے ... ہدایت اللہ کے روپ میں امر ہو گئے۔

میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ جب اللہ اچھے دنوں کی دستک دیتا ہے تو پھر وہ آپ کو وہ تقویت اور توانائی ... کر دیتا ہے جس کی مہربانی سے آپ ہمت طاقت سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بڑی استقامت سے

سارے کام بڑی کامیابی اور خوداعتمادی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے کہ اوپر والے کو آپ کی کامیابی
مطلوب ہو۔ سب سے بڑی امدادِ غیبی ہے کہ آپ کی تجویز، عمل اور فیصلہ مثبت نتائج مرتب کرنے لگتا ہے۔

تلقین شاہ آناً فاناً مشہور ہوگیا اور لوگ پروگرام کو شیڈول بنا کر دیکھنے لگے۔ جس قدر شہرت تلقین شاہ کو ملی
تھی، ایسی ہردلعزیزی ہدایت اللہ کے نصیب میں بھی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتے ان کے ساتھ خاں صاحب کے لیے
سانچی پان ضرور لاتے۔ تلقین شاہ 39 سال چلا ماسوائے دو سال کے جب بے نظیر بھٹو آئی تو اسے دو سال کے لیے بند کر دیا
گیا۔ اس کے ساتھ دو سال کے لیے انہیں اردو سائنس بورڈ سے بھی ہٹا دیا گیا لیکن نذیر حسینی کے کردار میں نہ پروگرام میں
کوئی تبدیلی آئی نہ ان کے رویے میں ہی۔ وہ پہلے دن سے لے کر آخری پروگرام تک شاہ جی کے مؤدب جاں نثار
رہے۔ شروع میں اس پروگرام میں رقیہ کا کردار ابوالاثر حفیظ جالندھری کی دوسری بیوی خورشید بیگم کیا کرتی تھیں۔
دوسرے کئی کردار آئے اور چلے گئے۔ عائشہ تسلیم ایک مدت اور مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدہ نے کافی دیر اس میں رول کیا۔
ریاض محمود صاحبزادہ صاحب کے روپ میں اس پروگرام میں شمولیت کرتے رہے لیکن ہدایت اللہ اور تلقین شاہ ہمیشہ
رہے۔ اب تو اس پروگرام کو ''گینز بک'' میں بھی تیسرے مقام پر جگہ مل گئی ہے کہ پاکستان میں اتنی دیر تک اور ان ہی
کرداروں کو مرکز بنا کر کوئی پروگرام نہیں چلا۔

خاں صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کوئی کام کرتے مجھے اس میں شرکت کی دعوت ضرور دیتے۔ میں نے
بھی کچھ عرصہ تلقین شاہ میں کام کیا لیکن میں یہ کام نبھا نہ سکی۔ ریڈیو سے قدیر ملک اس پروگرام کی ریکارڈنگ برسوں کرتے
رہے۔ پھر جب ہمارا گھر داستان سرائے میں بن گیا تو خاں صاحب نے اوپر والی منزل پر ریکارڈنگ روم اور سٹوڈیو بنا
لیا۔ انیس ایم بی اے کی تیاری کر رہے تھے، لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے ریکارڈنگ کی ساری ذمہ داری اٹھالی۔ انیس میں
ایک عجیب بات ہے کہ وہ جس شخص سے محبت کرتا ہے اس کے کام آنے کی کوشش کرتا ہے۔ انیس بیٹے کو باپ سے گہری
محبت تھی۔ اس نے ریکارڈنگ ہی نہیں کی بلکہ تلقین شاہ کے تمام اکاؤنٹ، اکاؤنٹ کی پے منٹ کی رسیدیں اور ایک
رجسٹر maintain کیا۔ وہ ہر تلقین شاہ کی تاریخ، سال، وقت تو نوٹ کرتا ہی تھا، لیکن اس رجسٹر میں ہر پروگرام کی پہلی سطر
اور آخری سطر بھی لکھتا۔ اب میں حیران ہوتی ہوں کہ نہ جانے کیسے وہ سارا حساب کتاب لے کر اور صداکاروں کی رسیدیں
ترتیب وار لے کر ٹیکس والوں کے دفتر بھی جاتا رہا اور ٹیکس کے ضمن میں خاں صاحب کو کبھی کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔

جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر انیس کراچی چلا گیا تو پھر اثیر نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ اثیر طبعاً مشینوں
کے قریب ہے۔ اسے مشین دکھا دیں تو وہ اس کی کارکردگی کو بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ اکاؤنٹ اور رجسٹر تو اس کے بس کی بات
نہ تھی، گو وہ مارے باندھے یہ بھی نپٹاتا تھا۔ لیکن پہلی ریکارڈنگ سے لے کر آخری ریکارڈنگ تک خاں صاحب کو کبھی
شکایت کا موقع نہ ملا۔

اثیر خاں کی شادی کے بعد رفیق میاں ہمارے ساؤنڈ انجینئر بنے۔ وہ باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اردو سائنس
بورڈ میں ملازم تھے، لیکن شام کو ہمارے پاس آ کر کام کرتے تھے۔ ساری مشینوں کی دیکھ ریکھ، بڑی ریلوں پر ان کی منتقلی،
ٹیپوں کی گنتی شمار، سکرپٹوں کو اہتمام سے رکھنا رفیق احمد کا معمول تھا۔ البتہ انیس کی طرح اکاؤنٹ نہ رکھے جا سکے جس کے

نے اپنی خدمات حاضر کر دیں۔ اب کاسٹ کے چیک اور رسیدیں میں بناتی تھی۔ ٹیکس کے لیے ایک وکیل مقرر کیے گئے جو سال بہ سال ٹیکس لگوانے کے لیے پیش ہوا کرتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک خاں صاحب تلقین شاہ سے بے وفائی نہیں کر گئے۔

اب یہ سارے اکاؤنٹ' رجسٹر غرضیکہ تلقین شاہ کی ہسٹری'' دبستان شہابیہ'' لوک ورثہ اسلام آباد میں محفوظ ہے۔ جو تحقیق اور تجسس کے نرغے میں رہتے ہیں' وہاں جا کر تحقیق کر سکتے ہیں۔

ہر پروگرام کے دو حصے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو Product کی شکل میں قارئین' سامعین اور ناظرین تک پہنچتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ تیاری کے مرحلے ہوا کرتے ہیں' جس میں سکرپٹ' کاسٹ' سٹوڈیو' کیمرے' تکنیکی سٹاف' لانے لے جانے کی گاڑیاں' مقررہ اوقات کی پابندی عجیب مصیبت ڈالتی ہے لیکن اصلی قباحت انسان اپنی طبعی خصوصیات کے باعث اپنے ذاتی حالات کے پیش نظر اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ یہاں عموماً کئی مجبوریاں باہم ٹکرا جاتی ہیں۔ بڑے آرٹسٹ عموماً خوشامد پسند اور وقت کو اپنے آپ پر لاگو نہیں سمجھتے۔ اگر وہ لیٹ ہیں تو لازماً سب کو خوشی سے انتظار کرنا چاہیے لیکن اگر کوئی دوسرا والدہ کے جنازے سے کچھ تاخیر سے پہنچے تو بڑا آرٹسٹ کسی کو بتائے بغیر گھڑی دیکھ کر رخصت ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ بڑا آرٹسٹ جان بوجھ کر بد دماغی یا بد مزاجی اختیار کرتا ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی میں ہی یہ built-in خرابی ہوتی ہے جیسے کسی کسی نئی مشین میں کبھی کبھی کوئی manufacturing نقص ہوتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ تلقین شاہ کی ریکارڈنگ میں خاں صاحب کو نہ کاسٹ کی مزاج داریاں اٹھانی پڑیں نہ ٹیکنیکل حد تک تفتیش کرنا پڑیں۔ خاں صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو محبت کے پالنے میں پروان چڑھے۔ کچھ لوگ شاید ان کی خوش نصیبی سے حسد کرتے ہوں لیکن کیا کیا جائے اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں پر ہر معاملے میں فضیلت بخشتا ہے۔ کیا کیا جائے اگر اس نے مرد کو عورت پر فوقیت عطا کی۔ اب عورتیں اس بات کو غلط ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں لیکن انہیں شاید علم نہیں کہ جہاں فضیلت ہوتی ہے وہاں ذمہ داری بھی تو اسی تناسب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہر مرد اسی فضیلت کے ہاتھوں عورت' گھربار' اولاد' والدین کا باربردار غلام بن جاتا ہے۔ ہر بڑا آدمی جسے بہت عزت' شہرت' سوسائٹی میں اونچا مقام مل جاتا ہے' اس پر معاشرے کو اسی تناسب سے احسن طریق پر بہتر چھوڑ کر جانے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ وہ اپنی لائف بوٹ گھاٹ پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ کئی بجرے' کشتیاں' چھوٹے چھوٹے پھٹوں پر سوار لوگ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ خاں صاحب بھی ساری زندگی نعمتوں کی وصولی کے بعد بڑے فراخ روپ میں قرض حسنہ کے طور پر اس بڑائی کی قیمت ادا کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی ذمہ داری ایک باپ کی طرح محسوس کیا کرتے تھے اور اس ذمے داری کا کوئی بوجھ محسوس نہ ہوتا۔

یوں کہہ لیجیے کہ 479۔این میں کیریئر کے اعتبار سے خاں صاحب نے کئی معرکے مارے۔ 479۔این ایک لحاظ سے بہت ہی اہم اور Eventful جگہ تھی۔ یہاں خاں کی اہمیت ان کے کام کے اعتبار سے بہت بڑھ گئی۔ 16 اگست 1966ء کو انہیں گلڈ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ یہ گلڈ ادیبوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ گلڈ میں کام کرنے

کے ساتھ ساتھ خاں صاحب کو ایڈیٹر ''لیل و نہار'' کی نوکری مل گئی۔ Progressive Papers کا دفتر میو ہسپتال کے سامنے تھا۔ اسی دفتر میں سیکرٹری سرفراز صاحب نے خاں صاحب کو 21 اپریل 1959ء کو نوکری دلائی۔ قریباً دو سال 15 مارچ 1961ء تک خاں صاحب ''لیل و نہار'' کا رسالہ باقاعدگی سے نکالتے رہے اور اپنی ہو پر سائیکل پر سمن آباد سے دفتر آتے جاتے رہے۔ اس کے بعد تو یو ایس آئی ایس نے خاں صاحب کو مکمل طور پر جذب کر لیا۔ حتیٰ کہ 1963ء میں برکلے Exchange پروگرام میں امریکہ چلے گئے۔

لیکن یو ایس آئی ایس ایک بالکل نیا تجربہ اس اعتبار سے تھا کہ پہلی بار خاں صاحب کے افق پر امریکہ ابھرا۔ مارلاک یو ایس آئی ایس میں وی او اے کا کرتا دھرتا تھا۔ دبلا پتلا، خوش شکل، امریکیوں کی طرح خوش مزاج اپنے آپ کو درست سمجھنے والا، ہر وقت اپنا نکتہ نظر سمجھانے پر مصر، شائستہ رُو، شائستہ زبان آدمی تھا۔ بہت بعد میں کسی نے یہ پتہ لگایا کہ مارلاک دراصل سی آئی اے کا آدمی تھا اور اس کی ڈیوٹی میں خاں صاحب کو monitor کرنے کی ذمہ داری بھی تھی۔ تب ہماری جنرل نولج اتنی نہ تھی کہ ہمیں امریکہ بہادر یا پھر سی آئی اے کی اچھی طرح سے سمجھ آ سکتی۔ ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ خاں صاحب کو ایک پروگرام لکھنے اور پھر اسے ریکارڈ کرنے کے لیے 180 روپے ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میں بھی کچھ پروگرام لکھنے لگی اور اس طرح ہمارے پاس پیسوں کی ریل پیل ہو گئی۔

مارلاک کی وساطت سے یو ایس آئی ایس کے دفتر میں خاں صاحب کی ملاقات خواجہ سلیم سے ہوئی۔ وہ وی او اے کے لیے خاں صاحب کے پروگرام ریکارڈ کرتے تھے۔ خواجہ سلیم ایک انتہائی شریف النفس، کم گو اور محبت میں رچے بسے انسان تھے۔ مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا برملا ذکر نہیں کیا۔ خواجہ جی خود نمائی کے خوگر نہ تھے اس لیے انہیں کسی قسم کے سرٹیفکیٹ دکھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ گھر آتے تو باورچی خانے میں موڑھے پر بیٹھ کر چپ چاپ جو کچھ ملتا، صبر و شکر سے کھاتے۔ ان کی محبت کا اظہار لڑکیوں جیسا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ پکڑے کھڑے رہتے اور انہیں تکنے جاتے۔ انیس ان کی طرف کھنچا جاتا۔ مجھے دیکھ کر بھابی بھابی جی کا ورد کیے جاتے۔ ان کی باتیں ایسی تھیں جیسے اجوہ کھجوریں خالص شہد میں ڈوبی ہوتی ہیں۔

جب خاں صاحب نے ''دھوپ سائے'' بنائی تو خواجہ جی ہی اس فلم کے Recordist تھے۔ انہیں دس مرتبہ retake کے لیے کہا جاتا۔ ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ٹھنڈے میٹھے مزاج کے خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد خواجہ جی میرے پاس آتے رہے۔ ان کی طبیعت پر گہرے Depression کے اثرات تھے جیسے وہ اپنی ہی مٹھاس کے ہاتھوں عاجز آ چکے ہوں۔ افسوس جس طرح خاں صاحب ان کا ہاتھ پکڑتے تھے مجھ سے خواجہ جی کی محبت لوٹائی نہ گئی۔ مجھ میں جو بناوٹ ہے غالباً اس کا بھید ان پر اور ان کی ڈاکٹر ناہید پر کھل گیا ہوگا۔ ہولے ہولے ان کے پھیرے کم ہوتے گئے اور خواجہ جی بھی بغیر رسمی طور پر ملے ہم سے رخصت ہو گئے۔

خواجہ جی کے ساتھ بھائی احمد علی کی بھی اسی یو ایس آئی ایس میں ملاقات ہوئی۔ جس قدر خواجہ جی دھیرج پسند تھے اسی قدر بھائی احمد علی بلند بانگ، رولا رپا اور اپنی منوانے والے تھے۔ رام پور سے ہجرت کر کے یہ غیرت مند پٹھان لاہور پہنچا تھا۔ غالباً سب سے زیادہ وہ خاں صاحب سے وابستہ تھے۔ وہ گھر آتے تو سب کو follow on کا حکم ملتا۔

بھی مجھے بھابی جی کہتے نہ تھکتے۔ انہیں سیخ کباب بنانے میں بڑی مہارت تھی۔ ان کے آنے پر باورچی خانہ ان میں چلا جاتا۔ وہ قیمہ ساتھ لاتے۔ اس میں کچھ بالائی ملاتے۔ تھوڑا قیمہ ابال کر ڈالتے۔ کسی کو کبابوں کی انگیٹھی کی اجازت نہ ہوتی۔ بڑے لذیذ کباب بناتے اور سب سے پہلے خاں صاحب کو چکھاتے اور صرف انہیں ہی کہ وہ پنکھا لے کر کبھی کبھی انگیٹھی سے شعلے اٹھا دیں۔ وہ دور نہ جانے کب ختم ہو گیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ بھائی احمد علی نے لاہور کالج میں ایک دکان کھولی جسے پی آئی اے نے Sponsor کیا پر سامان رعایتی قیمتوں پر ملا کرتا تھا۔ خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد بھائی احمد علی سے رابطہ قائم ہے لیکن سلوک' استقامت اور محبت نہ تھی جس سے رشتے ناطے سیراب ہوتے ہیں۔

یو ایس آئی ایس کی بدولت ہی 1963ء میں پہلی بار خاں صاحب امریکہ گئے۔ یہ Berkeley پروگرام تھا۔ اس میں چند لکھاری پاکستان کی طرف سے بریڈ فورڈ گئے' انہیں وہاں جا کر کچھ لکھنے لکھانے کی ریکارڈنگ کا فن سکھانے کی کوشش کی جانے والی تھی۔ امریکہ کے وہ دانشور جو اس پروگرام کے کرتا دھرتا تھے' ہمیشہ کی طرح یہ پروگرام بہت ابتدائی رکھا۔ امریکی یہ سمجھتا ہے کہ کالا آدمی سرے سے کچھ نہیں جانتا اور اسے دکھا کر یہ بھی بتانا چاہیے کہ "طالب علمو! یہ مائیکروفون ہے۔ اس سے آواز ریکارڈ کی جاتی ہے۔" یہ Creative کی کلاس کی تھی۔ خاں صاحب کے لیے جو کئی پروگرام ریڈیو پر کر چکے تھے' جو صاحب کتاب بھی تھے اور جو رسالہ "داستان گو" نکالتے رہے تھے اور "لیل و نہار" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ان کے لیے یہ ساری پریکٹس لیکن دوسرے ممالک اور ادیبوں سے دوستی کے لیے یہ عہد بار آور ثابت ہوا۔

جن دنوں خاں صاحب برکلے پروگرام پر گئے' وہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ظفر کو تاکید کر گئے۔ ظفر خاں کے رشتہ دار' دوست اور راز داں بھی تھے۔ درمیانہ قد' گوری رنگت' ذرا بھاری جسم والے ظفر کو بچے انکل ظفر کہتے تھے۔ اسی رعایت سے میں اور خاں صاحب بھی انہیں انکل ظفر ہی کہا کرتے تھے۔ بھاری چہرے پر موٹے شیشوں والی عینک رکھتی جس سے ان کا چہرہ بہت سنجیدہ لگتا۔ ظفر جوانی میں نہ بوڑھے تھے نہ جواں۔ انہیں اپنی کسی رشتہ دار لڑکی سے تھی' جو کسی اور شخص کے عشق میں مبتلا تھی۔

ظفر جب بھی میرا اور بچوں کا حال چال پوچھنے آتے کبھی برآمدے سے آگے نہ بڑھتے۔ بچوں سے رسمی گفتگو اپنی توجہ اثیر پر مرکوز کر کے پوچھتے: "کلیجی کھائی؟"

وہ نفی میں سر ہلاتا۔

"خدا کے لیے قدسیہ آپا اسے کلیجی کھلائیں۔ یہ ضد کر کے تو کلیجی نہیں مانگ سکتا۔"

میں ان سے کہنا چاہتی کہ ظفر اپنی ذہنی عیاشی ترک کر کے شادی کر لیں کیونکہ کوئی لڑکی ضد کر کے آپ سے نہیں کرے گی لیکن میری خواہش اس وقت پوری ہوئی جب ہم 121۔سی میں گئے اور انہیں انعام کے طور پر خاندان کی خوبصورت ترین لڑکی ارجمند عطا کر دی گئی۔ زندگی نے وفا نہ کی اور ظفر رخصت ہو گئے لیکن ارجمند کے تین بڑے بچے موسیٰ' منیرہ اور انکل ظفر کی نشانی بن کر ارجمند کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ سینت کر اپنی ذات پر خرچ نہ کر کے

انکل ظفر کافی اثاثہ اور ایک کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں چھوڑ گئے ہیں اور انکل ظفر کی بدولت یہ لوگ موج میلا مناتے ہیں۔

479۔این کی بات ہے ایک روز جب ہم ڈونگی گراؤنڈ کے سامنے کھڑے تھے انکل نے پوچھا:

''اشفاق کا خط پتر قدسیہ آپا؟''

''باقاعدہ خط آتے ہیں بلکہ بچوں کی تصویریں منگوائی ہیں؟''

''اچھا تو بھیجی آپ نے؟''

حسن اتفاق سے اس وقت ریزی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔

بچوں نے اصرار کیا کہ تصویریں ڈونگی گراؤنڈ میں کھنچوائی جائیں۔ محمد علی نے بچوں کو سنبھالا۔ میں نے سیم کو گود اٹھا لیا۔ پھر یہ قافلہ سڑک پار کر کے اس ڈھلوان پر پہنچا جس سے اتر کر ڈونگی گراؤنڈ اور باندرادری آتی تھی۔ ریزی نے انیق میاں نے انکل ظفر کو اپنی ٹوپی عطا کی اور کئی تصویریں بنائیں۔ جب یہ تصویریں امریکہ پہنچیں تو ایک فرانسیسی لڑکی نے خاں صاحب سے پوچھا: ''کیا یہ آپ کے کزن Confirmed bachelor ہیں؟''

''ہاں ابھی شادی نہیں ہوئی۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''ان کے چہرے پر لکھا ہے۔''

خاں صاحب نے اپنے خط میں لکھا: ''ایسی لڑکی جو تصویر دیکھ کر اتنے گہرے نتائج نکال لیتی ہے۔ کل اسے مجھے کلاس میں ایک ایسی کتاب کا مضمون پڑھنا پڑا جو امریکہ میں پانچویں کے طالب علم پڑھتے ہیں۔ اس سے اس پروگرام کی جہالت کا اندازہ لگائیے۔''

اسی برکلے ایکسچینج پروگرام میں خاں صاحب کو جیکولین کینیڈی سے ہم مکتب کی شکل میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس پروگرام میں بھانت بھانت کے ادیب جمع تھے اور اپنے اپنے ملک میں وہ بہت معرکے مار کر آئے تھے۔ لیکن امریکہ نہ اپنی امریکن انگریزی کے علاوہ کسی زبان کو اہم سمجھتا ہے نہ اپنے نوساختہ کلچر کے علاوہ اور کسی کلچر کے حسن کو مانتا ہے۔ وہ کسی گروہ سے تال میل کرتا ہے اسی احساسِ برتری کے باعث دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتا ہے۔

جب خاں صاحب برکلے سے واپس آئے تو انہیں جیکولین کینیڈی کی کتاب کا ترجمہ کرنے کی آفر ہوئی جو انہوں نے بطریق احسن پوری کی۔ اس کے علاوہ انہیں ایک اور کتاب ترجمہ کرنے کے لیے ملی۔ The Golden Hawks of Genghis Khan جو انہوں نے ''چنگیز خاں کے سنہری باز'' کے نام سے قارئین کے لیے چھوڑی ہے۔

ڈونگی گراؤنڈ اور باندرادری نے ہمیں ایک بڑے آدمی سے ملایا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے میں ہمارے استاد رہے تھے' اس لیے ان سے تعارف کی حاجت نہ تھی۔ صوفی صاحب ان دنوں ''ٹوٹ بٹوٹ'' کی نظمیں مرتب کر رہے تھے۔ وہ ان نظموں کا ردعمل دیکھنے کے لیے ڈونگی گراؤنڈ میں آتے' بچوں کو جمع کرتے اور ٹوٹ بٹوٹ کی نظمیں سناتے۔ ہمیں ملتے تو خاں صاحب سے لاڈ کے انداز میں کہتے: ''اوئے تیری روزی میں میرا کوئی حصہ نہیں؟''

''صوفی صاحب! ابھی قدسیہ ایسا کھانا نہیں پکا سکتی جو کسی کشمیری کو کھلایا جا سکے۔''

...ئے گدھے! تو میرا مطلب نہیں سمجھا۔ استاد کے گھر جا کر کھانا کھانا بھی اپنے ہی رزق سے کھانا ہے۔ ... گھر آؤ۔ میں بڑے اچھے کلچے خود لگاتا ہوں۔ کشمیری چائے کے ساتھ..... گولاش کھایا ہے کبھی؟ اوئے تم تو کبھی ... آئے۔ یہاں کیا آؤ گے۔''

... طرح ہم سرکتے سرکتے صوفی صاحب کے دسترخوان پر پائے جانے لگے۔ میں نے صوفی صاحب سے ... بنانے کا طریقہ سیکھا لیکن خدا گواہ ہے وہ ذائقہ کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ نہ کبھی شعروں سے مناسبت پیدا ہو سکی نہ ... میں لذت پیدا ہوئی۔ اب جا کر پتہ چلا کہ یہاں پھر ہماری جبلت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ہمیں جو موروثی ... ہیں ہم اسی Genetic Coding کے حساب سے خاص صلاحیتوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ استاد بھی ... محبت کرتا ہے لیکن وہ شاگرد جن کی مناسبت استاد کے علم کے ساتھ ہوتی ہے' وہ بہت جلد ترقی کر جاتے ہیں اور ... توجہ اور خواہش کے باوجود کہیں نہیں پہنچ پاتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ نذیر بیگم موسیقی میں بے حد ریاضت کیا ... لیکن نور جہاں بہت کم وقت میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث وہاں پہنچ جاتی جہاں پہنچنا نذیر بیگم کے لیے ...

... گھر میں ہمارے پاس کاچھا بھی آنے لگی۔

کاچھا آج کے مشہور نفسیات داں ڈاکٹر ترین کی بیوی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر ترین کچھ خاص مشہور نہ تھے۔ کاچھا ... کو Pram میں ڈال کر ہمارے گھر بلا دھڑک چلی آتی۔ اس کی ملاقات خاں صاحب سے ڈونگی گراؤنڈ میں ہوا ... تھی۔ یہاں سے وہ گھر آنے لگی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے 479۔ این کا حصہ رہی ہے۔

کاچھا کے ساتھ اس کی ایک سہیلی عارفی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئی۔ عارفی بیگم دراصل اشفاق صاحب کی ... تھی۔ وہ ''لیل و نہار'' میں بلا دھڑک چلی جاتی۔ خاں صاحب کام کرتے رہتے۔ وہ سامنے بیٹھ کر پنچھی کی طرح ... کی باتیں کرتی رہتی۔

یہ تو اب مجھے یاد نہیں کہ عارفی پہلے گھر آئی اور اس کے ساتھ کاچھا آئی یا کاچھا عارفی کو متعارف کروانے والی ... مجھے ایک دو باتیں عارفی کے متعلق یاد رہ گئی ہیں۔ عارفی کو میرے منجھلے بیٹے انیس سے بڑی محبت تھی۔ اس نے ... خوبصورت سویٹر انیس کے لیے بنایا تھا جس پر ایک سفید بلی اُونی دھاگوں سے Knit کی تھی۔

عارفی برآمدے کے ساتھ والے نانا کے کمرے میں عین آتش دان کے پاس والے صوفے پر بیٹھ کر سویٹر ... ساتھ والے ڈائننگ روم میں خاں صاحب بیٹھ کر لکھا کرتے۔ عارفی باتیں کیے جاتی اور خاں صاحب چھوٹے ... جواب دیتے رہتے۔ یہ ٹیلی گرافک سلسلہ ان دونوں کی دوستی کا باعث بنا۔ بعدازاں عارفی نے احمد رضا قصوری ... کی شادی کر لی' لیکن عارفی کا لمبا چوڑا ذکر اس جگہ درست نہیں۔

مفتی جی ہمیں مرزا جی کا تحفہ تو دے کر گئے ہی تھے' ایک عدد رہائشی مہمان قیصر مفتی کی شکل میں اور دے گئے۔ ... کراچی میں امریکنوں کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا ہمارے ہی گھر ٹھہرتا۔ مجھ سے اس کی خط و کتابت ... کے اصرار پر شروع ہوئی۔ ایک روز مفتی جی مجھے کہنے لگے: ''اوئے قدسیہ! تو ساری دنیا پر پٹو ڈال لیتی ہے' ایک

میرا کام کردے تو مانوں؟''

''فرمایئے۔''

''بھائی وہ قیصر تیرا بہت گرویدہ ہے۔ اگر تو اسے کسی طرح شادی پر رضا مند کرلے تو میں مانوں۔ آج تک
شادی سے بدکتا رہا ہے۔ اگر اس کا خوف ختم ہو جائے تو اس کی تنہائی کا علاج ہو جائے۔''

لیجیے کاتا اور لے دوڑی قسم کی قدسیہ کے لیے یہ بہت بڑی Activity تھی۔

اس گھر میں میری تجویزوں کے باعث شادیاں ہوئیں۔

قیصر مفتی کی شادی

میرے بھائی پرویز (ریزی) کا بیاہ

آپ کو شاید علم ہوگا کہ نصیر انور ان دنوں ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر تھے اور نصیر انور کے سا
صاحب کا گہرا دوستانہ تھا۔ نصیر انور ان دنوں فلیمنگ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ ان کی گھر والی کشور بہت جلد ہمارے سا
مل گئی۔ کشور بھی ریڈیو پاکستان کے لیے لکھتی تھی اور کافی مشہور ہو چکی تھی۔

فلیمنگ روڈ سے خاں صاحب کا رشتہ پرانا تھا۔ ریاض محمود اسی سڑک پر رہ چکے تھے۔

اس جہاں سے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے بھی ایک مرتبہ خاں صاحب اور میں لالی جان (کشور
گئے تھے۔

یہ خالصتاً کشمیری گھرانہ تھا۔ ان کے دستر خوان پر ہر قسم کی لذتیں تھیں۔ گھر والوں کی آپس میں بڑی
تھی۔ لالی جان سے چھوٹی بہن نصرت کبھی بچپن میں پولیو کی شکار ہو گئی تھی اور اب وہیل چیئر کی محتاج تھی۔ آج
آباد میں شبنم شکیل اور نصرت وہاں کی روحِ رواں ہیں۔ اس Handicap کے باوجود ''نجھی'' بڑی جان وار
ملنسار لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹی بہن جیداں تھی جس سے بعد ازاں قیصر کا رشتہ طے ہوا۔

لالی جان ہمارے گھر عموماً کھانے پکا کر لاتی تھی۔ ہم ان کے گھر بھی بڑے جذبے کے ساتھ جایا کر
لالی جان کی والدہ بھی بڑی شفیق خاتون تھیں۔ جب بھی ملتیں عموماً باورچی خانے میں پیڑھی پر سمائی ہوئی نظر آتیں
دعاؤں سے نوازا کرتی تھیں۔

جب لالی جان مان گئیں تو مفتی جی پردھان بن گئے اور اس طرح قیصر کی شادی جیداں سے ہو گئی
کراچی چلا گیا۔ قیصر سے رابطہ قائم رہا۔ 1984ء میں جب میں کینسر میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئی تو
قیصر مجھے ملنے آیا۔ وہ پریشان تھا، لیکن کھلنڈرا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اوئے یہ کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ سیدھی طرح گھر جا کر اپنے کاکے اشفاق احمد کی خبر لے..... کینسر وینسر
نہیں بگاڑ سکتا۔ تو مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہے باز آجا..... پلنگ چھوڑ دے..... نہیں تو.....''

گئیں تو یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد قیصر کینسر سے بیمار ہو کر آناً فاناً اس جہاں سے چلا گیا۔ ایک کہانی ختم ہوئی۔ ایک
[illegible] ہو گیا..... ایک دروازہ مقفل کر دیا گیا۔
یہی زندگی ہے......
اس گھر کی برکت سے ایک اور بڑے انسان سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ ان میں صدیقہ بیگم کا ذکر کرتی
[illegible]

صدیقہ بیگم چودھری برکت علی (مکتبہ اردو) کی ہونہار بیٹی تھی۔ باقی بہن بھائی تو باپ سے ادب کا شغف اخذ
[illegible] لیکن صدیقہ نے چھوٹی عمر میں لٹریچر سے بڑی شناسائی پیدا کر لی۔ وہ نصابی کتابوں کی طرف مائل نہ تھی لیکن ادب
[illegible] دسترس رکھتی تھی۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت اپنے بیٹے جاوید طارق خاں کے ساتھ سمن آباد میں
[illegible] اور جاوید ہر لاڈلے بیٹے کی طرح اس وہم میں مبتلا تھا کہ جو کچھ بھی وہ کر ڈالے آپا فرحت اُس سے ناخوش نہیں
[illegible]

چودھری برکت علی کی چھ کینال کی کوٹھی میں صدیقہ اپنے بہن بھائیوں اور سادہ لوح والدہ سمیت رہتی تھی۔ ان
[illegible] زندگی آسان اور سادہ تھی۔ جاوید اور صدیقہ کی مٹھ بھیڑ بس میں یا سڑکوں پر ہو جاتی۔ جاوید کو اپنے گھرانے سے ادب
[illegible] تھی۔ وہ بے شمار شعر زبانی سنا سکتا تھا۔ شاعروں، ادیبوں، تحریک پاکستان سے وابستہ لوگوں کے نام جانتا تھا۔ اس کا
[illegible] لیکن Presentation سوپر تھی۔ اسے اپنا لوہا منوانے میں کبھی دقت پیش نہیں آئی۔ صدیقہ چودھری برکت علی کی
[illegible] دار اور ادب پرست لڑکی تھی۔ مکتبہ اردو کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی جیسے
[illegible] والے اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔
یہ ملاپ آناً فاناً شادی کے وعدوں میں بدل گیا۔
جاوید بمشکل تمام انیس برس کا ہو گا۔ صدیقہ بھی صرف سولہ کی تھی۔ ان دونوں نے زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ
[illegible] خواب اور حقیقت ایک ہو گئے۔ روایت شکنی کی یہ شادی خاں کی شادی کے بعد دوسری بغاوت تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جس
[illegible] تھی۔ آپا جی جاوید طارق خاں سے ناراض ہو گئیں۔
صدیقہ ایک طرح سے میری بہو بن گئی اور دوسرا رشتہ جو اس سے جڑا وہ میری سمدھن بھی بن گئیں۔ اس کی بیٹی
[illegible] میرے بیٹے انیس احمد خاں سے بیاہی گئی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ جب ہم 121۔سی میں آ گئے تھے۔
یہ اس وقت کی بات ہے جب صدیقہ کے ثویلہ آنے والی تھی۔ اسے دمے کے دورے پڑتے تھے اور خدشہ تھا
[illegible] بچہ ضائع نہ ہو جائے۔ میں نے معتبری سے ایک راستہ یہ نکالا کہ صدیقہ کو ایف سی کالج کے زیر نگرانی چلنے والے ہسپتال
[illegible] لے گئی۔
یہاں ان دنوں زچہ بچہ کی ڈاکٹر مارٹن تھیں۔ جب ثویلہ اس دنیا میں آ گئی تو لیڈی مارٹن نے بچی کی کلائی میں اس
[illegible] "بے بی جاوید" پلاسٹک کے منکوں میں پرویا ہوا ڈال دیا۔ بچوں کی شناخت کے لیے ایسا ہار ضروری تھا۔
"ہوش کر صدیقہ..... خدا نے بیٹی دی ہے۔ اللہ کی رحمت گھر آئی ہے۔"

صدیقہ نے آنکھ کی جھری سے مجھے دیکھا۔ ''مامی..... اسے اٹھالیں..... یہ آپ کی ہے۔ آپ نے اس کو
ہے..... آج سے یہ آپ کی ہوئی۔''

پھر برس ہا برس بعد جاوید طارق خاں دوبئی میں تھے تو میاں بیوی نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ثوبیلہ ہمیں م
فرمائی۔ اس طرح صدیقہ پہلے میری بہو بنی پھر میں اس کی بیٹی کی ساس بن گئی۔ کچھ لوگ وعدے نبھانے میں خوب
ہیں۔ صدیقہ اس اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔

یہاں پر ریزی کی شادی کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔

کبھی سوچتی ہوں کہ شاید اپنے گندے کپڑے یوں سرعام دھونا آپ کی بدمزگی کا باعث نہ بنے لیکن بتانا
یہ مقصود ہے کہ زندگی کی کروٹیں عجیب وغریب ہوا کرتی ہیں اور بڑے انسان کی زندگی بھی معمولی واقعات سے
ہوتی ہے۔ اور وہ بھی بدی اور نیکی کی زد میں اسی طرح رہتا ہے جس طرح عام لوگ اس کے تھپیڑے کھاتے ہیں' لیکن
واقعات میں نہیں بڑے آدمی کے ردعمل میں مضمر ہوتی ہے۔

میرے بھائی ریزی کا رشتہ ملنا ذرا مشکل تھا۔ جب تک ''داستان گو' چلتا رہا' وہ ''داستان گو' کا حصہ
پاکستان میں سب سے پہلے Silk printing کی ایجاد ریزی نے کی تھی۔ وہ باہر کے مضامین پڑھ پڑھا کر بالآخر
چھوٹی سکرینیں بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ان پر وہ پتہ نہیں کیسے تصویر اتارتا بناتا اور پھر سکرین کو لکڑی کے فریم میں
اوپر پینٹ لگاتا۔ پھر ایک لکڑی کی سکوجی پھیرتا۔ نیچے پرنٹ آنے لگتا۔ یہ پروسس اسی کو سمجھ میں آسکتا ہے جس
''داستان گو' کے رسالے دیکھے ہیں۔ ہر ایک صفحہ علیحدہ ہاتھوں سے تیار ہوتا۔ 455۔ این میں یہ ریزی کر چکا تھا۔

گھر کے سامنے بڑے برآمدے میں چقیں آویزاں تھیں۔ میرا کام تھا کہ ہر ایک سرورق کو لے جا کر چق
کانوں (سرکنڈوں) کے درمیان سوکھنے کے لیے فٹ کر دیتی۔ سمن آباد کے پچھلے برآمدے میں خاں صاحب ریزی
کرتے۔ ریزی بہت دھیان سے سکوجی پھیرتا۔ میں کاغذ اٹھا کر باہر والے برآمدے میں لاتی۔ ریزی اور خاں صاحب
چونکہ تخلیقی لوگ تھے انہیں کبھی اس کام سے بوریت نہ ہوتی۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ انہیں
اپنے کام کی کامیابی کا سرور تھا۔ جیسے کرکٹ کے کھلاڑی کو سنچری کر کے ملتا ہے۔ یہ مشغلہ 479۔ این میں بھی جاری رہا۔

باورچی خانے سے ملحق گودام اور غسلخانے کے درمیان جو برآمدہ تھا' یہاں سلک سکرین پرنٹنگ کا اڈہ لگتا
بار چقیں نہیں تھیں۔ باہر چارپائیوں پر سرورق سکھانے کے لیے رکھے جاتے' لیکن پھر رسالہ بند ہوگیا۔ کچھ دیر ''لیل و نہار'
''داستان گو' اور یو ایس آئی ایس ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن پھر ''لیل و نہار'' میں خاں صاحب نے استعفیٰ دے
''داستان گو' کا دفتر گو پاس رہا۔ وہاں چودھری سلیم' محمد علی اور ریزی پردھان رہے۔ لیکن خاں صاحب کی ساری توجہ
یو ایس آئی ایس اور امریکہ میں برکلے ایکسچینج پروگرام میں شمولیت کے بعد ریڈیو پاکستان کی طرف مبذول ہوگئی' جہاں
سٹاف آرٹسٹ تھے۔ ان کا کوئی دفتر نہ تھا۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی لان میں بیٹھ کر کام کرتے اور کینٹین پر مختلف آرٹسٹوں کے ساتھ
بیٹھ کر اپنی داستان گوئی جاری کیے رکھتے لیکن خاں صاحب نے کبھی اس بات کو اہمیت نہ دی کہ وہ معمولی سٹاف آرٹسٹ

پر رعب ڈالنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی دفتر ہے نہ گھومنے والی کرسی۔ کمپیوٹر تو خیر تب تک ایجاد ہی نہ ہوا تھا۔

خاں صاحب اور ریزی دونوں پیدائشی تخلیق کار تھے۔

ایک مدت ہوئی ریزی گورنمنٹ کالج چھوڑ چکا تھا۔ ہر آرٹسٹ کی طرح اس کا کام افادیت سے نہ تھا۔ وہ دنیا میں گھومنے کے لیے عام راستے چن نہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں بھی نوکری کے لیے ڈگری اہم تھی۔ Establishment ۔۔۔نے کے لیے ہمیشہ ڈگری اہم رہی ہے۔ یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ریزی ایف ایس سی نہ ۔۔۔ کی وجہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ گورنمنٹ کالج میں جہاں گھڑی نصب ہے بہت سے جنگلی کبوتر آیا کرتے تھے۔ ریزی کے اندر ایک شکاری ہمیشہ تھا۔ ایک روز وہ صبح کے وقت اپنی ڈیزی گن لے کر کالج پہنچا۔ دو تین کبوتر پھڑکا دیے۔

دوسرے دن یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ میں تب ایم اے اردو میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر محمد صادق نے کلاس ۔۔۔ مجھ سے کہا..... ”قدسیہ! ہم لوگ ایک لڑکے پرویز کی تلاش میں تھے۔ پتہ چلا ہے کہ اس نے کالج کے مقدس کبوتر ۔۔۔ مارے ہیں۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو ریزی خود کالج چھوڑ دے یا مجھے آ کر explain کرے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“

جناب میرے بھائی صاحب نے کبھی کچھ کسی کو explain نہیں کیا تھا۔ جب ہم دھرم سالہ میں تھے اور ریزی دھرم سالہ کے بوائز کالج میں پڑھتا تھا۔ تب بھی اس نے کالج چھوڑ کر گھر پر ایک گورکھا ٹیچر رکھا تھا۔ اس استاد کے ساتھ پڑھنے کے بجائے وہ پہاڑوں پر بندوق لے کر شکار کرنے چلا جاتا۔ میری والدہ آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر ہلکان ہوتیں اور دھرم سالہ کے گھنے جنگلوں میں تلاش کرتی پھرتیں۔ یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ریزی ایک عرصہ ڈگریوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

لیکن لڑکی والے تو روزِ ازل سے مرد کی ساکھ' مالی حیثیت' معاشرے میں عزت سے وابستہ رہے ہیں۔ ریزی کے پاس معاشرے میں بھنوانے کے لیے کوئی کریڈٹ کارڈ نہ تھا۔ دو چار جگہ کوشش کی لیکن کورا جواب مل گیا۔

اب ایک پریشانی کا دور شروع ہوا۔ لڑکی تلاش کرنا میرے لیے مشکل تھا' لیکن پھر اس مشکل کو آسان بنانے کے لیے عزیز بیگم کہیں سے آ گئی۔ مجھے اس کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے کون ہے لیکن وہ دن ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کے تھے۔ 479۔ این میں ریزی کی شادی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جلد ہی اس نے ہمیں شہزادی ماہی کا رشتہ تلاش کر دیا۔ مجھے وہ اندرون شہر میں میاں تقی صاحب کے گھر لے گئی۔ میاں صاحب کی اس سارے محلے میں بڑی عزت تھی۔ ان کی ساس ان کے ساتھ اوپر چوبارے میں ماہی شہزادی کے ساتھ رہتی تھی۔

پہلے دن میں میاں تقی صاحب کے گھر پہنچی۔ اینٹوں والے آنگن سے گزر کر اندر ڈرائنگ روم میں ایک خوش شکل درمیانی عمر کی عورت بیٹھی تھی۔ یہ آپا مختار تھیں۔ شہزادی بیگم کی بڑی بہن اور میاں صاحب کی بیگم..... تھوڑی دیر کے بعد شہزادی آئیں۔

سبز آنکھیں..... گورا چٹا رنگ..... بہت خوبصورت نقش.....

آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

جو چیز اپنے میں نہ ہو ہمیشہ اس کی تلاش رہتی ہے۔ میرا بھائی اور میں ہمیشہ سے جمال پرست تھے۔ میں مکمل طور پر اس خاندان کی گرویدہ ہو گئی۔ شادی کی تاریخ جس دن طے ہونی تھی، خاں صاحب اور میں اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اچانک ریزی کی بے مائیگی کا پورا نقشہ ایک بار پھر ٹاپک بن گیا۔ شہزادی کے بھائی' بھائی نواز اور سرفراز اس شادی کے حق میں نہ تھے۔ میاں تقی اور مختار بیگم میرے ووٹ تھے۔ آخر میں معاملہ یہ طے پایا کہ میری والدہ اپنے مربعے ریزی کے نام وقف کر دیں تاکہ لڑکی کے لیے کچھ سکیورٹی کا بندوبست ہو جائے۔

بہر کیف جب اللہ کو منظور ہو تو کچھ معاملات خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ شادی طے ہو گئی۔ اس شادی کے کرتا دھرتا ہمارے ڈیڈی جی تھے۔ انہوں نے سکول جانے والی گراؤنڈ میں شامیانے لگوائے۔ بڑے اہتمام کیے۔ ڈیڈی جی نے اصرار کیا کہ ولیمے پر تلے ہوئے بادام ضرور ہوں۔ یقین کیجیے میں نے سیروں بادام چھیلے اور انہیں تل کر ڈیڈی جی کے سپرد کیا۔ بڑی رونق اور مزے داریوں میں شادی ہوئی اور ہم ریزی کی طرف سے سبکدوش ہو گئے۔

ریزی نے دو چار دن بھی ہمارے ساتھ نہ گزارے اور شہزادی کے ساتھ چودھری کالونی میں کرائے کا مکان لے لیا۔ وہ قریباً روز شہزادی کو میرے پاس چھوڑ جاتا۔ میں نے ایسی گائے عورت کبھی نہیں دیکھی۔ نہ اس کے منہ میں زبان تھی نہ دماغ میں طیش' نہ حرکات میں تیزی۔ وہ کسی کام میں دخل اندازی نہ کرتی۔ کچھ تبصرے کیے بغیر ساتھ رہتی تھی۔ اللہ نے شہزادی اور ریزی کو تین بیٹیاں عطا کیں۔ سب سے بڑی بیٹی ارم میرے بیٹے اثیر خاں سے سال بھر بڑی ہے۔ اسلام آباد کے پرائیویٹ ہسپتال میں پیدا ہوئی۔

وہ ریزی جس کی شادی کے امکانات بھی ناممکن تھے' شہر کی خوبصورت ترین لڑکی کا بلاشرکت غیرے مالک تھا.... اور بیوی شہزادی اس کے گن گاتی تھی۔

یہ زندگی میں عطا کے رنگ ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔ اسے کسی سے کاغذ پر منظوری لینے کی حاجت نہیں۔ جب چاہے جسے چاہے جو چاہے دے دیا۔

اسی 479۔ این میں خاں صاحب سے ان کے رشتہ داروں میں سے سب سے پہلے معافی نامہ بن کر جنگی آیا۔ جنگی جس کا اصلی نام نعیم احمد خاں تھا۔ ہوائی فوج میں کیڈٹ تھا۔ ابھی تک خاں صاحب اپنے خاندان سے بچھڑ کر اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ سودا بہت مہنگا ہے اور اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے وہ اہل نہیں۔ جس روز جنگی ہمارے گھر آیا' خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ خاں صاحب سے مشابہت تھی۔ میں نے اس سے کہا: "اندر آ جائیے۔"

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"جی نہیں.... لیکن اندر آ جائیے۔"

اس نے ذرا سا مسکرا کر کہا.... "واقعی شفو بھائی نے ایک سادہ لڑکی سے شادی کی ہے۔ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''میں اماں جی سردار بیگم کی چھوٹی بہن ماسی رشیدہ کا بیٹا نعیم احمد خاں ہوں۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں رہتے

اس پہلی ملاقات ہی میں جنگی اور میں Ideas کو ہر وقت discuss کرنے والے دوست بن گئے۔ جنگی تیموریاں' سوچیں اور خیالات کی آماجگاہ تھا۔ وہ ہر بار ایک نیا خیال شطرنج کی چال بنا کر پیش کرتا۔ میں شبہ لے ۔ ہم دونوں کبھی سچ کے متعلق اکٹھے سوچتے' کبھی الگ الگ سوچ پر اڑ جاتے۔ کبھی روایات اور بغاوت کی بیخ ۔ کبھی محبت زیرعتاب آجاتی۔ جنگی کے آنے جانے سے خاں صاحب نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ جس طرح کوئی ل میں اپنے میکے والوں کی ہلکی سی خبر پا کر نہال ہو جاتی ہے۔ خاں صاحب کو بھی ٹھنڈی ہوا کا احساس ہونے لگا۔

بہت وقفہ نہیں گزرا۔ جب ایک روز ماما جی فیاض کو بھی نعیم اپنے ساتھ لے آئے۔ ماما جی پولیس میں ایک بڑے تھے اور اماں سردار بیگم کی سب سے چھوٹی بہن رشیدہ بیگم کے شوہر تھے۔ ماما جی کا بڑا دبدبہ تھا۔ وہ مکمل طور پر اس کے شوہر تھے جن سے ماسی رشیدہ تھر تھر کانپتی تھی۔ رفتہ رفتہ نعیم کی مہربانی سے ماسی رشیدہ اور ماما جی فیاض ہمارے گھر ۔ ان کے آنے سے خاں صاحب کی تسلی ہوئی اور وہ اماں جی سے ملنے شاہی مسجد جانے لگے۔ جنگی عموماً مجھے یارے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں خط و کتابت اچھی خاصی تھی۔ افسوس زیادہ خط وقت کے ساتھ تلف ہو خط کی نقل پیش خدمت ہے۔

اچھی آپا قدسیہ!

ارے رے رے رے! یہ تو شروع ہی غلط ہو گیا۔ سوچا تو تھا کہ لکھوں گا ''بہت ہی خراب آپا قدسیہ'' لیکن جب شروع کرتا ہوں تو اچھی ہی لکھا جاتا ہے۔ جانے آپ کے ہاتھ کیا معجزہ ہے کہ آپ کی طرف سے دل میں ذرہ بھر بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کے خیال سے ہی ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ مچلنے لگتی ہے۔ مجھے تو ہر دفعہ وہ پہلا دن یاد آ جاتا ہے میں آیا تھا تو شفتو جی نے کہا تھا تو بھی قدسیہ یہ نعیم ہے ''نعیم؟'' آپ نے کہا' آپ کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا یہ نام کچھ غیر مانوس سا تھا۔ شفتو جی نے بھی یہ محسوس کیا۔ ''ارے بھئی اتنی دفعہ تو اس کا ذکر کیا ہے۔ جنگی یوں اور جنگی ''اوہ یہ ہے جنگی؟'' آپ نے کہا' کس قدر شیرینی تھی آپ کے لہجہ میں۔ کس قدر یگانگت۔ مجھے یوں محسوس ہوا میری آپ سے پہلی ملاقات تھی بلکہ ہمیشہ سے واقفیت تھی اور اب ایک لمبے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ آپ کی آنکھوں کی چمک کہہ رہی تھی۔ جنگی میں تو ہمیشہ سے تمہیں جانتی ہوں۔ میں نے ے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے اور اسی لمحہ آپ نے کہا: ''شفتو جی سے تمہارا اتنی بار ذکر ہوا ہے کہ معلوم ہے تمہیں ہمیشہ سے جانتی ہوں۔'' مجھے انتہائی طمانیت کا احساس ہوا اور میں ہمیشہ کے لیے آپ سے مانوس ہو گیا۔ نہ نے کہاں تک اپنے خیالات کا صحیح اظہار کر سکا ہوں اور خط بھی قاعدہ سے شروع نہیں ہوا۔ نہ القاب نہ آداب اور لگے بے بانکنے۔ لیکن مجھے کچھ بھی فکر نہیں۔ اگر آپ کو ہی بے تکا خط نہ لکھ سکوں تو شاید کسی کو بھی نہ لکھوں۔ آپ کو تو جو میرے من میں آ گیا لکھتا چلا جاتا ہوں۔ کچھ معنی ہوں یا نہ۔

اچھی آپا! آپ کا خط آنے سے کس قدر خوشی ہوئی۔ اس کا ذکر کرنا لاحاصل ہے کیونکہ میں اوّل تو بیان ہی نہ کر

سکوں گا اور اگر بیان کر بھی سکا تو آپ مبالغہ آمیزی کی تہمت لگائیں گی۔ بس یہ سوچ لیں کہ سکول سے واپس آیا تو سیدھ
میل روم پہنچا۔ آپ کے خط سے تو قطعاً نا امید ہو ہی چکا تھا۔ اب جو خط ملا تو وہیں کھول کر پڑھنے لگا لیکن وہاں کچھ
آفیسر کھڑے تھے جو مجھے گھورنے لگے۔ میں نے خط پڑھتے پڑھتے ہی چلنا شروع کر دیا۔ رستہ میں دو ایک آدمیوں سے ٹکر
ہوتے ہوتے بچی۔ بہر حال کمرہ میں صحیح سلامت پہنچ گیا۔ ارادہ تو اسی وقت جواب دینے کا تھا مگر کچھ لوگ آ پہنچے۔ "تم نے
ابھی تک کچھ کھایا پیا تو نہیں؟" میم صاحب ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی چیخیں "نہیں بھئی۔ ابھی ابھی تو سکول سے واپس آیا
ہوں۔" میں نے کہا: "تو بس پھر چلو۔" صاحب بولے: "آج ہم نے باربی کیو کا انتظام کیا ہے۔ تم کو لینے آئے ہیں جلدی
کرو۔" میں نے لاکھ کہا کہ ابھی مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔ دو خط اور آئے تھے جنہیں ابھی کھولا بھی نہیں۔ کپڑے بدلنے ہیں
گے۔ امتحان میں تین دن باقی رہ گئے مگر وہ لوگ گویا جھگڑے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ بس کپڑے بدلنے کی مہلت
دی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ رات کو جب واپس ہوا تو ڈھائی بج رہے تھے اور پھر اسی طرح دن گزرنے لگے۔ یہاں
زندگی اس قدر سبک رفتار ہے کہ وقت پھسلتا چلا جاتا ہے اور اگر ہر لمحہ پر نظر نہ رکھی جائے تو انسان بھٹک جاتا ہے۔ بہر حال
اب جا کر کہیں فرصت ملی ہے۔ یہ خط زریں کو لکھنا شروع کیا تھا مگر لکھ نہ سکا تھا۔ اب ادھار لے کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اسے
پھر لکھ دوں گا۔

آپا آپ کا خط پڑھ کر تو خاصہ فکر لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر بھی نہیں تھی۔ گھر سے مجھے کبھی بھی خبر نہیں ملتی
کوئی بیمار ہے یا کسی کی طبیعت خراب ہے۔ ہاں ٹھیک ہو جانے پر ضرور خبر ملتی ہے۔ "ننو کو اپینڈے سائٹس کا حملہ ہوا تھا
آپریشن کروا دیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہسپتال سے واپس آ گئی ہے۔" اس قسم کی خبریں ملتی ہیں۔ اللہ کرے
سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں۔ شفو جی کا بہت فکر ہے۔

رسالہ بھیجنے کی نیت کا لا انتہا شکریہ مگر اب تو میں اپنے واپسی کے سفر پر روانہ ہوں۔ واپس آ کر ہی پڑھوں گا۔
ہاں اچھی آپا۔ کیا سچ مچ میرا افسانہ چھپے گا؟ میں نے افسانہ آپ کو بھیج تو دیا تھا مگر دل میں پچھتا تا رہا کہ یونہی بھیجا۔ اور
جب کافی عرصہ جواب نہ ملا تو میں سمجھا کہ آپ بھول گئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ
نے افسانہ شائع کر کے واقعی میرا دماغ خراب کر دینا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ نہ جانے شادی سے پہلے کیسی تھیں؟ اب
جو میں لاہور آیا تو گفتگو کے لیے یہی موضوع رہے گا۔ میری طرف سے عارفی کو دلی مبارکباد پیش کریں۔

ارے میں بھی کتنا عجیب ہوں کہ کس ٹرمینل پر بیٹھا خط لکھ رہا ہوں اور یہ لکھا ہی نہیں کہ یہ میں یہاں کیونکر آ
گیا؟ یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اور آئندہ کیا ارادہ ہے؟ تو آپی بات یوں ہوئی کہ میرا کورس پندرہ روز ہوئے ختم ہو گیا۔ کورس
ختم ہونے پر میں نے ڈھائی ہفتے کی چھٹی لے لی۔ جیکسن، مسسپی، ہمفس، ٹینیسی ہوتا ہوا میں کل صبح یہاں یعنی سینٹ لوئس
پہنچ گیا اور آج یہاں یعنی اب سوا دس بجے رات کو سپرنگ فیلڈ الیانوائے کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، جہاں چند گھنٹے کے قیام
کے بعد شکاگو چلا جاؤں گا۔ وہاں سے انڈیاناپلس انڈیانا۔ ٹولیڈو اوہایو ہوتا ہوا ڈیٹرائے جاؤں گا۔ وہاں چار پانچ روز قیام
کا ارادہ ہے اور ارد گرد کا چکر لگاؤں گا۔ خیال ہے کہ گرانڈ ریپڈز، ہیز ربرو، این آربر اور کینیڈا کا چکر لگا لوں گا۔ پھر کلیولینڈ
پٹس برگ ہوتا ہوا واشنگٹن جاؤں گا۔ وہاں سے نارفوک، رالیج ہوتا ہوا چارلسٹن ساؤتھ کیرولینا جاؤں گا جہاں سے مجھے جہاز

ہے۔ اگر اس سفر کے بعد کچھ ڈالر بچ گئے تو شاید میامی فلوریڈا کا چکر بھی لگا آؤں۔ گو اس کی امید بہت کم ہے
دیکھ رہا ہوں یہاں پر سوائے بس کے کرائے کے ہر چیز بجٹ سے زیادہ پڑ رہی ہے۔ ڈالر یہاں پر چونیوں کی
طرح خرچ ہوتے ہیں۔
میری بس تیار ہے۔ اب بند کرتا ہوں۔ شقو جی‘ نوکی کو پیار۔ پرویز اور بھابی کو سلام۔ عارفی‘ جاوید‘ صادقہ سب
کو سلام۔

فقط آپ کا
جنگی

خدا کے لیے آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں۔ میرا خیال ہے شقو جی سے ہی بات کرنا پڑے گی۔ آپ
بھی کریں گی۔

28.07.61 شکاگو

آپ کا خط پوسٹ نہ کر سکا تھا یہاں پوسٹ کر رہا ہوں۔
خدا حافظ

جنگی

ادھر ماما جی اور جنگی گھر آنے لگے۔ اُدھر خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں جن کے متعلق میں نے
سنا تھا کہ وہ بندوق لے کر میرے گھر کے چکر لگاتے رہے ہیں کہ میری وجہ سے اماں جی اور بابا جی کو اس قدر تکلیف
ہوئی۔

ایک روز اسحاق بھائی اور ذکیہ اچانک ہمارے گھر آ گئے۔
ذکیہ جی تو بہت پہلے سنگر سلائی کورس میں میرے ساتھ تھی اور میں نے ان کے ساتھ مشین پر کشیدہ کاری کا کورس
کیا تھا۔ ابھی بھی میرے پاس ذکیہ کی خوبصورت Embroidery کے کئی میز پوش ہیں۔ لیکن اسحاق بھائی کو میں نے اس
سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔
میں تو ان دونوں سے قطعی ناواقف تھی۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم تھا کہ جو بھائی خاں صاحب کی خفیہ شادی
سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ پستول لے کر ہمارے گھر کے ارد گرد گھوما کرتے۔ انہیں اُس ولین کی تلاش تھی جس
نے ان کے والدین کا دل توڑا اور خاندانی روایات کو چکنا چور کرنے کی جرأت کی۔
جو بھائی سامنے بیٹھے تھے۔ عجب ملائمت اور خاں صاحب سے مشابہت نے مجھے فوراً ان کے قریب کر دیا۔
انہوں نے بھی نہ جانے کیوں مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔
”قدسیہ..... ایک کام ہے تم سے‘ کرو گی۔“
”جی حکم دیں جو بھائی۔“

''مجھے ایک بڑا اچھا سکالرشپ مل گیا ہے۔ یہ تو تمہیں اشفاق نے بتایا ہی ہوگا کہ میں ایئر فورس چھوڑ چکا ہوں۔ فیسرین کا کام بہت مشکل ہے۔ میں اسے ماڈرن basis پر چلانا چاہتا تھا۔ باباجی اس کی بوتل' ڈبیا اور اندر ریپر تک بدلنا نہیں چاہتے..... میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے لیکن اگر فرانس کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو Authentic ہو جاتا ہے۔''

مجھے اتنا معلوم تھا کہ اسحاق بھائی حسین روڈ پر منتقل ہو چکے تھے اور ''نیوسیما'' کریم بناتے تھے۔ میرے بھائی ریزی نے کی اس کریم کی ڈبیا کا لیبل ڈیزائن کیا تھا لیکن میں کبھی حسین روڈ نہیں گئی تھی۔

''جی میں کچھ سمجھ نہیں پائی؟''

''ذکیہ میرے ساتھ جائے گی لیکن بچوں کا جانا مشکل ہے سارا Jesus & Mary کونونٹ میں پڑھتی ہے۔ واصف کی پڑھائی کا بھی حرج ہوگا۔ سینٹ انتھونی میں اسے مشکل سے داخل کرایا ہے۔''

مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے۔ اس وقت ذکیہ نے میری مشکل حل کی۔

''قدسیہ جی..... بات یہ ہے کہ میری والدہ بیگم روڈ پر رہتی ہے۔ وہ ان بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہیں لیکن بچوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔ مجھے پتہ ہے کہ یہاں خوش رہیں گے۔ آپ کے بچے ماشاءاللہ انہیں جلد ہی ہماری جدائی بھلا دیں گے۔''

میں ''تفکروں'' کی عادی نہیں۔ سوچے سمجھے بغیر فیصلے کرنا میری جبلت میں ہے۔ میں نے فوراً وثوق سے کہا..... ''لیں یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ خاں صاحب آپ کے بھائی پہلے ہیں اور میرے شوہر بعد میں..... یہ گھر آپ کا پہلے ہے اور میرا بعد میں..... فوراً بچوں کو چھوڑ جایئے.....''

شکر ہے ان دنوں سامان سے اتنی محبت کرنے کا رواج نہیں تھا۔ بچے اپنے مختصر سامان کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔ واصف ان سب سے بڑا بھائی تھا۔ انیق اور سارا قریب قریب ہم عمر تھے اور پہلے دن سے ہی ان دونوں کی گاڑھی چھننے لگی۔ واصف نے آتے ہی اثیر پر قبضہ جما لیا۔ وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا۔ ڈونگی گراؤنڈ میں جاتا تو چیری ساتھ۔ سکول والی گراؤنڈ میں جاتا تو بچہ ڈھاک پر۔ کچھ رشتہ داروں نے سمجھا غالباً میں نے واصف کو کھلاوی بنانے کے لیے پاس رکھ لیا ہے لیکن خدا جانتا ہے میری ایسی نیت نہ تھی۔ مجھ میں نیت کو چھان پھٹک کر سچا کھوٹا جاننے کی بھی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔

سارہ' واصف کافی بڑے تھے۔

لیکن میں ان پانچوں کو برآمدے والے غسلخانے میں اکٹھا کر لیتی اور کل جماعتی غسل شروع ہو جاتا۔ ان پانچوں کو نہلا دھلا کر ''بیبے رانے'' بنا کر مجھے بڑا لطف ملتا۔ کھانا ہمیشہ کی طرح باورچی خانے میں چھوٹی چوکی کے آگے چھوٹے چھوٹے ڈگڈگی نما موڑھے لگا کر کھایا جاتا۔ جب سارہ اور واصف ہمارے پاس پہنچے گرمیوں کا موسم تھا' ہم آنگن میں چارپائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ ایک ہی پیڈسٹل فین تھا جو خاں صاحب کی چارپائی کے ساتھ لگایا جاتا۔ پھر سارہ اور میری چارپائی ہوتی۔ اس کے بعد نوکی اور انیس اکٹھے سوتے۔

بڑے مزے کے دن اور عیش کی راتیں تھیں۔ سارہ اور واصف کے آنے سے گھر بھرا بھرا اور خوشیوں سے نبض کی طرح جاندار ہوگیا۔ ان ہی دنوں واصف کو خاں صاحب کی اس الماری کا پتہ چل گیا جہاں وہ ریزگاری اور گھریلو ضرورت کے لیے پیسے رکھا کرتے تھے۔ یہ الماری کے کمرے میں برتنوں کی الماری کے ساتھ تھی۔ اس میں خاں صاحب دفتر سے آکر اپنے پن کا پیان کتابیں رکھا کرتے۔ اوپر والے خانے میں ایک ڈبے میں ریزگاری اور دوسرے میں نوٹ اور ریزگاری کے پیسے ہوتے۔ یہ بات میں اندازے سے کہہ رہی ہوں کیونکہ میں نے اوپر والے خانے میں کنسوئی لے کر اصل میں کبھی حاصل نہ کی..... جب بچوں کو آئس کریم، گول گپے، مکئی کے دانے وغیرہ لینے ہوتے تو اُدھر ہاتھ صاف کیا جاتا۔ میں نے انہیں منع کیا نہ اس کی رپورٹ ہی خاں صاحب سے کی۔

سارہ ہمارے گھر میں بیٹی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہمیشہ سے سارہ کو بھائیوں پر ترجیح اس لیے دی جاتی کہ ایک تو وہ اکیلی ٹھہرے اس کے انداز بڑے دل لبھانے والے تھے۔ ہنستی تو جھرنوں کی طرح۔ مذاق کرتی تو بغیر دلآویزی کے۔ ہنستی تو جو کچھ اچھا لگتا بانٹتی چلی جاتی۔ خاص کر اپنے بیلی انیق کی پلیٹ پر تو خاص عنایت تھی۔

پتہ نہیں آپا فرخندہ بھائی کی کشش میں ہمارے ہاں پہنچیں کہ انہیں پتہ چلا سارہ اور واصف ہمارے پاس ہیں اور دیکھنے کی خواہش ہم تک لے آئی۔ بہرکیف آپا جی فرخندہ اور بھائی ایوب اب خود بخود ہماری طرف کھنچے آتے۔

یہ دور واصف کے سٹیج پروڈیوسر کے کمالات کا دور تھا۔ اسے شوق تھا کہ وہ سٹیج سجائے۔ سامنے گھر کے لوگ ناظرین بن کر بیٹھے ہوں۔ وہ اپنے احکامات تلے سب کو دوڑائے، نچائے، بٹھائے۔ ایک روز جب آپا فرخندہ اور بھائی ایوب آئے تو واصف نے بڑی پُرلطف رچنا رچی۔ بھائی ایوب کے پیچھے سبز شنیل کا لمبا سا بادشاہوں کی طرح کپڑا الٹایا۔ تاج پہنایا۔ آپا فرخندہ کے پیچھے بھی ایسا ہی سبز شنیل کا کپڑا مغربی بادشاہوں اور دلہنوں جیسا لٹکایا۔ اسے سارہ، انیق اور نوکی نے تھام کر پیچھے پیچھے چلتے آئے۔ سامنے ناظرین میں خاں صاحب، انکل ظفر، شہاب صاحب، مفتی جی، عکسی اور میں اور میاں بیٹھے تھے۔ آپا جی تو ہنستی رہیں اور کچھ نہ بولیں۔ بھائی ایوب نے یہ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اور لمبی تقریر اسرائیل کے خلاف کی اور سب کو بتایا کہ سپین میں یہودی نے کیسی تباہی مچائی۔

Demon-cracy is Democracy ان کا فیورٹ موضوع تھا۔

اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑایا، جو اس پر انیس کو بٹھا کر گلی کی طرف لے گیا۔ اثیر خاں میری گود میں سو رہا تھا اس لیے وہ سائیکل کی Excitement میں شامل نہ ہوسکا۔

''قدسیہ آپا۔''

''جی۔''

''قدسیہ آپا۔''

''ہاں کہو۔''

''قدسیہ آپا۔''

''بتاؤ ناں ناہید کسی نے کچھ کہا ہے؟

"آپا جی، جواد..... سجاد؟ کوئی؟"

اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی سا سر ہلایا۔

"اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔"

"وہ جی آپ کو پتہ ہے ابو لیبیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابو جی کے پاس چلی جائیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔"

"اتنا آسان نہیں قدسیہ آپا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔"

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید آپا فرخندہ کی بڑی بیٹی تو جہلم پرائم فیکٹری والوں کی بہو تھی۔ اس کے سسر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد خاں جن کی ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے، وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے کی اجازت دیتے۔

"لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟"

"وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں کا امتحان دے گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں، تھوڑی سی ایب نارمل ہے۔ اس کی ساس، دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں ابھی سب لوگ 36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھرداری کر سکتی ہے نہ بے بی..... پھر بتایئے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی کا نظام چھوڑ کر جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری کون اٹھائے؟"

ڈاکٹر ایوب احمد خاں اور ان کے فیصلوں کو سمجھنے کے لیے چند لمحوں کے لیے یہیں توقف کیجیے۔ بڑے لوگوں کی طرح وہ فیصلہ پہلے کرتے تھے اور عمل کی دقتوں پر فکر کیے بغیر نتائج بعد میں بھگتتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب بڑے سرجن تھے۔ جب قیام پاکستان سے بہت پہلے انہوں نے ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بڑی بیٹی فرخندہ سے شادی کی تو اس دھوم دھام کی شادی کا چرچا دیر تک خاندان میں رہا کیونکہ اس شادی پر لاہور کے Stiffls ہوٹل سے پیسٹری منگوائی گئی تھی۔ یہ گویا سکھوں کے اکثریتی علاقے میں کلچرڈ اور پڑھے لکھے ہونے کا آخری ثبوت تھا۔

لیکن اس فیصلے کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر ایوب احمد خاں میو ہسپتال کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنی ڈاکٹری چمکا رہے تھے۔ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ بیوی کی دلجوئی کے لیے وہ اپنی والدہ کو ذمہ داری سونپ کر بے فکر تھے۔ انہیں علم نہ تھا کہ ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بڑی لاڈلی بیٹی فرخندہ جس کی خاطر بابا جی نے چار خادمائیں رکھی تھیں، جس کے چہرے پر ہلکا سا داغ پڑ گیا تو بابا جی نے فیسرین ایجاد کر ڈالی۔ یہ بیٹی جب روایتی ساس کے پلے پڑی تو سارا لاڈلا پن طاق پر دھرا رہ گیا۔ لکڑیوں کا چولہا جھونکنا، گوبر کی پاتھیاں لگانا، سسرالی رشتوں کو بہ عزت نبھانا اس لاڈلی کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کے مترادف تھا۔ اس ساری بدسلوکی کے بعد جب ڈاکٹر ایوب تھکے ہارے گھر پہنچتے تو چندری ساس کی طرح ان کی والدہ کہتیں۔

"تیری لاڈلی نے مجھے صبح کا دودھ تک نہیں دیا..... ناشتہ تو یہ کیا دیتی؟"

ایوب بھائی دن بھر کی تھکاوٹ کو Aggression میں بدل دیتے۔ پھر آپا فرخندہ کو تھپڑ تو ایک طرف، لاتوں سے بھی نواز دیا جاتا۔

یہ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔ ایک روز قبائلی بھائی مکتسر سے اپنی بہن کا حال چال پوچھنے 36۔ جی گئے تو انہوں نے ڈاکٹر ایوب کی مارپیٹ کا ڈراپ سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا لاڈلی بہن کا یہ حال دیکھ کر گھر لوٹے اور بھائیوں کو اس بات پر اکسایا کہ ہر بھائی کے ہاتھ میں ہاکی ہو اور وہ اسی بے دردی سے ایوب کو ماریں جس طرح کا منظر وہ دیکھ کر آئے ہیں۔ سارے بھائیوں کو یہ گیم اچھی لگی کیونکہ اس سے پہلے وہ سب ہاکیوں سے نائٹ گولف کی کھیل میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔

مکتسر جیسے گاؤں میں جہاں سکھ سرداروں کا راج تھا' بابا جی محمد خاں کے بیٹوں نے بابا جی سے بغاوت کے سلسلے میں یہ "ایجاد کیا تھا۔ بابا جی خوفزدہ آدمی تھے۔ وہ بچوں کو سمیٹ سات کر رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا سی شرارت پر چھڑی سے مارتے اور اماں جی کے سامنے ادھ موا کر دیتے۔ وہ تو اُف تک نہ کر سکتیں لیکن نانی اماں بیچ بچاؤ کے انداز میں مدافعت کرتیں۔

"چھوڑ دے محمد خاں اللہ کا واسطہ تھم جا..... بہت ہوگئی۔"

"اوئے چندریا اقبال تو ہی ہار مان لے..... معافی مانگ لو لکھو..... پیر پکڑ لے باپ کے۔ مجو..... سن تو ہی محمد خاں بھیڑیا۔"

نانی کی منتوں کا جانبین پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ نہ بابا جی کا غصہ اترتا نہ نواسے معافی مانگتے بلکہ ہر مار کے بعد شرارت اور انوکھے پن میں اضافہ ہو جاتا۔ ہائی IQ کے بچے تھے۔ تخلیقی کارکردگی ہر وقت راہ جھاتی رہتی۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ تھے۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے۔ باقی بھائی تو اپنے طور پر بڑی شرارتیں سوچتے ہی تھے لیکن اسحاق بھائی ماسٹر مائنڈ تھے۔ قلمی شورے اور پوٹاشیم کا آمیزہ بنا کر اس کا گھریلو بم بنانے میں ماہر تھے۔ بجلی کے مین سپلائی کی تاروں پر اپنی تار ڈال کر بجلی چرانے کی ریت بھی ان ہی کی ایجاد تھی۔

لیکن سب سے بڑا کام انہوں نے نائٹ گالف organize کر کے کیا۔ رات کے وقت سارے بچے اپنی ہاکیاں لے کر بستروں سے چوری چوری کھسکتے۔ بابا جی' دن بھر کے تھکے ہارے بے سدھ خراٹے لیتے رہ جاتے۔ مجو بھائی اور گالف ٹیم کے کھلے میدان میں گھر سے دور گھوڑوں پر جاتے۔ سارا دن گیند کو مٹی کے تیل میں بھگو کر رکھتے۔ رات کو اسے آگ لگا دی جاتی۔ اب ہاکی سٹک سے گھوڑوں پر سوار کھلاڑی گالف کھیلتے۔

یہ پیرا محض اعادے کے لیے رقم کیا کیونکہ مکتسر کی زندگی کے واقعات خود اشفاق صاحب اپنے افسانے "گڈریا" میں لکھ چکے ہیں۔ میں تو فقط اس قدر بیان کرنا چاہتی ہوں کہ سب بھائی اپنی اپنی ہاکی لے کر 36۔ جی پہنچے حتیٰ کہ چھوٹے آفتاب بھائی بھی پیچھے پیچھے رنجیدہ خاطر دل برداشتہ چلے آئے لیکن آپا فرخندہ کو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ منتیں کرتی باہر نکلیں: "بھائی! خدا کے لیے ایک بار اپنے بھائی ایوب کو معاف کر دو۔"

''کردیں گے لیکن ایک شرط پر۔''

''کیا شرط..... کیسی شرط؟''

''پہلے آپ کو شرط ماننی ہوگی ہماری۔''

بہت لے دے کے بعد آپا نے وعدہ کرلیا اور بھائیوں نے یہ شرط پیش کی کہ وہ اور بھائی ایوب مکتبر آ
آپا اب وعدہ کر چکنے پر مجبور تھیں۔

جو لوگ خاندانی نظام کے پروردہ ہوں جیسا کہ خاں صاحب تھے' انہیں بچوں کے ساتھ رہنے کا ایک
یا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ بچوں کو بھی خصوصی توجہ نہیں دیتے۔ کبھی ان کی سالگرہ نہیں مناتے۔ ان کی تفریح کا کوئی
جاتا۔ امتحانوں پر توجہ دیتا تو درکنار اگر بچے فرسٹ بھی آجائیں تو کسی کے منہ سے مبارک باد کا لفظ نہیں نکلتا۔ بچے
طرح Matter of fact ہوتے ہیں۔ جس قدر توجہ فرد اپنے آپ کو دیتا ہے اتنی ہی توجہ بچے کو ملتی ہے اور ا
خاندانی نظام سر سے چڑھتا ہے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزنگ روڈ منتقل ہوئے تو وہ صحن سے متصل بڑے کمرے میں رہنے
فیسرین کریم کو سنبھالنے' بہتر بنانے اور مارکیٹ کرنے کے خواب ساتھ لائے تھے۔ جو باباجی محمد خاں اور ان کی
باعث پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

ایک عدد بنیادی غلطی ذکیہ جی سے بھی ہوئی۔ گو یہ غلطی نہ تھی صرف نظریے کا اختلاف تھا۔ ذکیہ جی نے
جوش و خروش سے سارہ کی سالگرہ کو جشن صورت منا ڈالا۔ ہم دونوں بھی خراماں خراماں پہنچے۔ گو خاں صاحب خو
انہیں علم تھا کہ سالگرہ منانا باباجی اور اماں جی کی روایات سے کھلم کھلا انحراف ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شامل بھی
شمولیت سے باہر بھی تھے کیونکہ انہیں دونوں پارٹیوں کے دل کا خیال تھا۔ خاں صاحب کے دل کی یہی پھانس ان
فیصلے پر حاوی رہی..... وہ عموماً دو ایسی پارٹیوں کی طرف دار رہے جن کا آپس میں نظریاتی اختلاف تھا۔

اماں جی اس دعوت میں چند لمحوں کے لیے آئیں۔ پھر واصف کے سر پر ہاتھ پھیر کر غائب ہوگئیں۔ بابا
پارٹی کے وقت دفتر میں چلے گئے اور پھر اندر نہ آئے۔ ہم دونوں نے کچھ کھایا پیا' کچھ ہراساں ہوئے' کچھ
کچھ کیک کٹنے پر تالیاں بجائیں۔ اماں جی سے رخصت چاہی اور ملول سے جو بھائی کو چھوڑ کر آگئے۔ اس وقت
جنریشن خصوصی طور پر آمریت پسند تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں کے لیے بھی راستہ دینے کو تیار نہ تھی۔ روای
درجہ مضبوط تھی کہ بغاوت کے بغیر آزادی کی راہ ملنا ناممکن تھی۔

ابھی تک جہاں خاندان اکٹھے رہنے کے چکر میں ہیں اور جہاں خاندانی نظام چل رہا ہے یہی کیفیت
آزادی بغیر بغاوت کے نہیں ملتی اور ہر بغاوت سے روایات کی کچھ برجیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ
درمیانے درجے کے لوگوں کا ہوتا ہے جن قوموں میں درمیانہ طبقہ خوشحال' مطمئن اور پُروقار ہوتا ہے وہ بڑی ترقی
ہیں اور خوشحالی سے ہم کنار رہتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے درمیانے طبقے کو اوپر والے طبقے نے شیر آیا' شیر بن کر خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اس طبقے

اتنی ناکام نہیں ہوتیں جس قدر امیر لوگوں سے مستعار لیے ہوئے خواب انہیں پژمردہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی کاروں، سجے سجائے بنگلوں، انگریزی سکولوں میں بچوں کو تعلیم دلانے، بیرون ملک تفریح کی خاطر سیر سپاٹے، بازاروں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ قرضوں کے باوجود اوپر چڑھنا تو ممکن نہیں ہوتا۔ ہاں اپر مڈل کلاس Frustration کے ہاتھوں جلد ہی لوئر مڈل کلاس میں شامل ہو جاتی ہے۔ Process ہر خاندان میں بقدر Amount دیکھا جاسکتا ہے۔

مجھے اور خاں صاحب کو اس تنزلی سے نجات کچھ تو اوپر والے کی مہربانی سے ملی، دوسرے ہم دونوں اس خواب کے کہ ہمیں فی الحال کچھ اور درکار نہیں اور ہم شیخی خورے بڑے لوگ ہیں۔ شیخی بھی کبھی کبھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے کاموں سے بچانے میں ڈھال کی طرح کام آتی ہے۔ ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ مڈل کلاسیئے تھے لیکن شیخی بچائے رکھا۔

واصف اور سارہ کے اضافے کے ساتھ ان دنوں ایک اور خوبصورت واقعہ طارق بن افتخار تھا۔ ڈیڈی جی کا سب ان دنوں سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سکول گورنمنٹ کالج کے نزدیک ایک اچھا تعلیمی ادارہ تھا۔ ان عورتیں کو بچوں کی تعلیم کا اس قدر خوف نہ تھا، آپی جی ہر وقت اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ پتہ نہیں ڈیڈی جی کی وجہ سے تھا جنہوں نے بی اے کا امتحان نہ دیا۔ یا پھر وہ سمجھتی تھیں کہ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس کے بغیر معاشرے میں مقام پیدا نہیں کر سکتا۔

وہ بڑے زور و شور سے طارق، حارث، لبنیٰ کو پڑھاتیں۔ مارنے، جھڑکنے اور گھونسے رسید کرنے سے بھی باز نہ آپی جی خود بھی بچوں کو سختی اور تنظیم سے پڑھاتیں اور طارق اور حارث کو باقاعدگی سے میری خالہ کے پاس میں بھیجا کرتیں۔ گویا میری خالہ فیروزہ کا مزاج بڑا ہی نرم تھا اور وہ بڑی سے بڑی غلطی کا جواز خود ہی نکالنے کی تھیں۔

طارق کو جب بھی آپی جی سودا لینے کے لیے بھیجا کرتیں تو عزیزی طارق تھیلا اور پیسے لے کر میرے پاس ہم دونوں مل کر ''ٹائم'' رسالے کو بنیاد بنا کر بہت سی باتیں کرتے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ مضامین کو خوب سمجھتا تھا اور ان پر تبصرے کی استعداد رکھتا تھا۔

''میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔''

''ضرور لے جاؤ ککو۔''

''کل پڑھ کر آؤں گا۔''

''لیکن پہلے ہوم ورک کر لینا،'' میں بزرگوں والی نصیحت کرتی۔

''ضرور..... اُس کی آپ فکر نہ کریں..... میں خوب پڑھوں گا قدسیہ آپا..... لائق بنوں گا.....''

طارق بن افتخار سے تھوڑا سا تعارف اس مقام پر ضروری لگتا ہے۔

جب میری شادی ہوئی تھی تو ٹوٹے پھوٹے رواج جو اس وقت ممکن تھے، ان میں سے ایک رواج دلہن کی گود میں

بچہ بٹھانے کا بھی ہوا کرتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہوتی کہ اللہ جلد دلہن کو اولادِ نرینہ عطا فرمائے۔ میری گود میں ایک بو...
طارق بٹھایا گیا.....اور تب ہی سے ہم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ابھی تک وہ کسی نئے شخص سے ہمارا تعارف کراتا ہے...
حیثیت سے کراتا ہے۔

واقعی طارق بن افتخار نے اپنا ارادہ سچ کر دکھایا۔ خوب محنت کی۔ ہڈیوں کا ڈاکٹر بنا۔ ان دنوں وہ شکاگو میں...
بہت بڑا سرجن ہے۔ ملک اور خاندان کا نام روشن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ڈاکٹری کے علاوہ اس کے دو محب...
مشغلے ہیں۔ ٹکٹیں جمع کرنا اور تصویریں کھینچنا۔ اس کے پاس بھانت بھانت کے مختلف ممالک کے نئے اور پرانے...
ٹکٹ ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کو یہ ٹکٹیں پریت سے دکھاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دیکھنے والے پر عموماً ان ٹکٹوں کو دیکھ...
خوشی وارد ہوتی ہے نہ استعجاب۔ یہی اس جہانِ رنگ و بو کی بوالعجبی اور نیرنگی ہے۔ ہم جس مشغلے میں خود دلچسپی نہیں...
ہمارے لیے بے کار اور تضیع اوقات ہے۔ جس شخص کو ٹینس کا شوق نہیں وہ نہ ٹینس کے کھلاڑیوں کو جانتا ہے نہ اس کے...
رموز ہی سمجھتا ہے۔ جو ہسٹری کا دلدادہ نہیں اس کے لیے پرانے کھنڈر ماضی کی داستان بن کر نہیں ابھرتے.....اللہ...
ساری مخلوق کے لیے ان گنت شوق، مشغلے اور مصروفیات کی رنگ پچکاری ہر وقت جاری کر رکھی ہے۔ جو جس رنگ...
جاتا ہے اس کے لیے بس وہی حقیقت زندہ رہ جاتی ہے، باقی ساری مخلوق اور شوق بے کار ہو جاتے ہیں۔

ٹکٹوں کے علاوہ تصویریں کھینچنا اس کا دوسرا محبوب مشغلہ ہے۔

اس میں البتہ احباب دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ اپنی تصویر دیکھ کر ہر انسان کی انا پھن اٹھا کر دل ہی دل میں...
کہتی ہے: ''کیوں دیکھا پھر۔ ہے کوئی ہم سا تو سامنے آئے۔''

جو جادو آئینے میں ہے وہی سحر تصویر میں بھی ہے۔ انسان اپنی شبیہ سے متاثر ہو کر ایک عجیب قسم کے سرو...
جاتا ہے۔ آپ نے خاں صاحب کی کتابوں کے پچھلے سرورق پر ایک تصویر دیکھی ہوگی جس میں خاں صاحب نے...
اور میں نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔ یہ تصویر شکاگو میں طارق نے بڑی محبت سے کھینچی تھی۔ اس کے علاوہ دو اور...
بھی ٹکو نے کھینچی ہیں جو مختلف کتابوں کے پشتوں پر نظر آتی ہیں اور جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران ٹکو کو شاید اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے پسند کیا ہو لیکن طارق...
روایت پسند پٹھان بچہ تھا۔ اس نے اپنی چچازاد ورداء سے محبت کی اور اسی سے شادی کی۔ ورداء اقبال بھائی کی...
منفرد لڑکی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایسے انفرادی فیصلے کیے جو حیران کن بھی تھے اور فرحت انگیز بھی۔ جب اس کی شادی ہو...
تو ڈیڈی جی اور آپی جی اس شادی کے حق میں نہ تھے لیکن ورداء کے ارادے کے آگے کسی کی نہ چلی۔ شادی ہوئی اور خو...
نبھی۔

اب ورداء شکاگو کے اس علاقے میں رہائش پذیر ہے جو ڈاکٹروں کی ایک امیر بستی ہے۔ یہاں ورداء حجاب...
پہنتی ہے۔ اس کی جواں سال بیٹی کو بھی حجاب پہنتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ اس کے گھر کا ماحول سادہ اور اسلامی...
اقدار کا حامل ہے۔ میاں بیوی حج کر آئے ہیں۔ ایک مسجد بنوادی ہے اور باقاعدگی سے دینی کاموں میں مصروف رہتے...
ہیں۔ ان کا بیٹا ارسلان وکیل ہے اور ٹی وی پر ایک ایسا پروگرام کرتا ہے جو امریکی لوگوں کو اسلام کی اقدار، لبرل تعلیمات...

کے مسائل سمجھتا ہے۔

اس گہری تبدیلی میں جو طارق کی زندگی میں رونما ہوئی اور جو ارسلان' سویرا اور سلطان میں روح بن کر رواں
اس تبدیلی کا طارق کے فیصلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ خوبصورت سی داڑھی رکھ لینے والا سرجن اپنے کام اور ذاتی
میں وہ دائیں بائیں جھانکنے کا عادی نہیں۔

جب وردا ء ککو کے ساتھ امریکہ پہنچی تو غریبی کا سفر تھا۔ اس نے گھر پر رہ کر سلائی کی۔ روپیہ بنایا بچایا اور عقل
غریبی میں عموماً عقل مثبت ٹارچ بن جایا کرتی ہے۔ وردا ء کے سلیقے نے ککو کو ایف آر سی ایس کرنے کی
پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل تک پہنچنے کا ڈھب سکھایا۔ جب ککو سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو وردا ء اس کی
بے فکر اور آزاد تھی۔ جب طارق کو اس کے آپریشنوں کی داد ملنے لگی۔ نرسوں کے فون' نوجوان بیمار اور تیماردار
کے لجاجت بھرے شکریے میں بھیگے ہوئے ہڈی توڑ ہڈی جوڑ ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ آرزو سے لبریز فون آنے
کچھ اور ہو گیا۔ ایسے فون سن کر ککو کی انا، اس کے نفس کو خاص قسم کا Boost ملتا۔ وہ اوپر والی منزل سے شعر
گاتا نیچے اترتا..... وردا ء چوکنی ہو جاتی..... عورت کو عموماً اس وقت شوہر کی طرف سے بے اطمینانی زیادہ ملتی
گھر میں دولت کی ریل پیل ہونے لگے۔ کہیں اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اندر ابلیس کان میں شک کی
بجنے لگتا ہے۔ اُسے لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے اب تو میرا شوہر دوسری بیوی بھی afford کرسکتا ہے' رکھیل
میں سے ہے۔ گرل فرینڈز تو روز مرہ ہیں ہی۔

حالانکہ نہ شک کی کوئی وجہ تھی نہ امکانات..... ککو پٹھان بچہ روایت پسند تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں خاں
کے خاندان میں قیام کے بعد ہوشیار پور تک کے نوجوان ابھرے تھے۔ ایک وہ تھے جنھوں نے روایت کی ویسی ہی
کی جیسے ان کے آباؤ اجداد ہوشیار پور تک کرتے آئے تھے۔ اشفاق احمد صاحب' بریگیڈیئر اشتیاق' جاوید طارق
خالق وہ بغاوتی سپاہی تھے جن کی آنکھیں کسی طرح کھل گئی تھیں اور انہیں اپنے خاندان کے علاوہ بھی بہت کچھ
آنے لگا تھا۔ ککو مغرب میں رہنے کے باوجود ابھی تک مشرق سے وابستہ تھا۔ اس کے دل میں ماں کی محبت تازہ چشمے کی
رہی تھی۔ اس کا دھیان اپنے مرکز سے پرے کہیں نہ جاتا۔

لیکن وردا ء کے کان میں شک کی بانسری جب ایک بار بجنے لگی تو اس کی پیدا کردہ کھلبلی سے فرار کہیں نہ تھا۔
کی عورت ہے۔ اس نے جلد اس کا حل تلاش کر لیا۔ اسے سوائے مذہب کے اور کہیں پناہ نظر نہ آئی۔ جینز اور بنیان
ہو گئی۔ حجاب پردہ پوشی اور دور باش کے سلسلے میں پہنا گیا۔ نمازوں کی پابندی' مسجد سے رابطہ' درس کی کلاسوں میں
اللہ کی حضوری میں عاجزی' وردا ء کے شکوک نے عجب مثبت رنگ اختیار کر لیا۔

عجیب سی بات ہے۔

انسان عام طور پر جسمانی ساخت کے علاوہ بیرونی طور پر بہت کم بدلا کرتا ہے۔

اصلی تبدیلی اس کے اندر کہیں آتی ہے۔ وہ نئے راستوں' فیصلوں' ارادوں کی وجہ سے پہلے اندر بدلتا ہے پھر اس
میں تبدیلی در آتی ہے۔

کریسنٹ سکول میں پڑھنے والے طارق کے علاوہ اُن دنوں ہمارے رحمت خانے میں ایک اور طالب [illegible] قسم کا نوجوان بھی آیا کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ وہ پڑھائی سے فارغ نہ ہوا تھا اور ریڈیو سٹیشن پر [illegible] طاہر اور خاں صاحب کے ساتھ جب موقع مل جاتا صدا کاری کرتا۔

اس نوجوان کا نام نعیم طاہر تھا۔

ابھی آرٹس کونسل میں کرتا دھرتا ہونے کا اعزاز اسے حاصل نہ تھا۔ ابھی P.N.C.A. اسلام آباد کی کو[illegible] سگ نہ تھی..... یہ ساری شناختیں تو مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی منتظر تھیں لیکن ایک بات ضرور تھی، نعیم [illegible] آنکھوں میں اس کے رویے میں کچھ کرنے کی آرزو جھلکتی تھی۔ وہ بڑی انکساری سے ہمارے گھر آتا اور کبھی اپنے خوا[illegible] ذکر ہم سے نہ کرتا۔

اس کمرے میں جہاں نانا آ کر قیام کرتی تھیں اور جہاں جمیلہ ہاشمی رہ چکی تھیں، وہ آ کر بیٹھ جاتا۔ عجیب [illegible] ہے کہ اس کے آنے پر میرے دونوں بڑے بچے انیق اور انیس آتش دان میں آ کر بیٹھ جاتے اور ہماری باتیں خا[illegible] سنتے رہتے۔ نہ وہ توجہ کے طالب تھے نہ کسی کو انہیں توجہ دینے کا خیال آتا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو نعیم کو لے کر خاں [illegible] باورچی خانے میں آ جاتے۔ بے حد سادہ کھانے محبت سے کھائے اور کھلائے جاتے اور اسی لیے ان میں وہ لذت [illegible] جاتی جو مدتوں اطراف کو یاد رہتی۔

نعیم طاہر کے ساتھ ہی ایک اور یاد بھی رینگتی چلی آتی ہے۔

اور وہ ہے ایلسا باؤسانی۔

جب خاں صاحب فرار ہو کر روم پہنچے اور ISMEO میں اردو پڑھانے لگے تو ان دنوں اسکندر باؤسا[illegible] اطالوی میں Alessandro Bausani کہتے تھے اُن کے ساتھ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ باؤسانی [illegible] طور پر زبانیں سیکھنے کا پکا تھا۔ وہ اقبال پر کافی بڑی اتھارٹی تھا۔ مشرقی علوم میں اس کی دور رس نگاہ تنقیدی مقالوں [illegible] کی شکل میں رونما ہونے لگی تھی۔

لیکن بظاہر باؤسانی نہایت سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اطالوی لوگوں کی طرح دونوں بازو کھول کر [illegible] سے کہتا: ''ماما میا mama mia'' تو یقین آ جاتا کہ واقعی وہ کچھ نہیں جانتا۔ بھاری جسم پر بجھے بجھے رنگوں کے کپ[illegible] ملبوس باؤسانی کو ہر وقت ایلسا کی ضرورت رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایلسا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر ایلسا [illegible] پاس ہوتی اور باؤسانی آ کر مجبور صورت اسے دیکھتا تو ایلسا سب کچھ چھوڑ کر بھاگتی۔

ایلسا اطالوی عورتوں کی طرح خوبصورت اور دلکش تھی۔ پتی دھرم اس پر ختم تھا۔ باؤسانی کی ضروریات [illegible] آگے اس کی اپنی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے رب نے باؤسانی کی بیساکھی بنا کر بھیجا تھا۔ ایلسا میں محبت [illegible] والی روح تھی۔ وہ جس سے ملتی بڑی جلدی گھل مل جاتی۔ بچوں سے بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

''نوکی صاحب کھانا کھالیا؟''

''کیسی صاحب آپ کیا لکھ رہا ہے؟''

ٹوٹی پھوٹی اردو میں بچوں سے رابطہ قائم کر لیتی۔ جب خاں صاحب گھر ہوتے تو یہ تینوں فر فر اطالوی بولتے، کندھے اُچک کر ہاتھوں کو فعال کر کے، آنکھوں کے اشاروں سے گفتگو میں جان ڈالتے رہتے۔ ان کی اس میں ہم خاموش ناظرین کی طرح شامل رہتے۔

"تمہارا شوہر بہت اچھی اطالوی بولتا ہے قدسیہ..... مشکل یہ ہے کہ اس کی اطالوی خالص روم کی ہے اور میں Dolomites کی عورت ہوں۔ مجھے احساس کمتری ہوتا ہے Bravo!۔"

ایک روز نعیم طاہر نے ایلسا اور باؤ سانی کے ساتھ ہماری دعوت کی۔ مجھے نعیم اور یاسمین کے گھر اس سے پہلے اتفاق نہ ہوا تھا۔ نعیم اور یاسمین کا گھر عجائب گھر سے مختلف نہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ پرانے تھال، ظروف، ٹوکریاں سجے تھے۔ جلد ہی خاں صاحب اور باؤ سانی نے کسی کی دال گلنے نہ دی اور روم کی باتوں سے شام کو سجا دیا۔

ہم تانگے پر نعیم طاہر کے گھر گئے تھے۔ میں اور ایلسا تانگے کے سامنے اور باؤ سانی اور خاں صاحب پچھلی سیٹ تھے۔ جس وقت سمن آباد کے مین بازار میں تانگہ پہنچا، ایلسا پر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے کان کے لوئیں سرخ ہو گئیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"کیا بات ہوئی ایلسا۔" میں نے سوال کیا۔

"یہ دیوانی ہے..... کبھی کبھی اسی طرح ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

بڑی دیر بعد جب تانگہ بازار سے گزر چکا اور کوچوان صاحب اسے کئی بار حیرانی سے دیکھ چکے تو ایلسا نے بتایا کہ اسے جگ پر ہنسی آ رہی تھی۔

"جگ صاحب نے پھر کہا....."

میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ وہ کسی انسان کو جگ کہہ کر پکار رہی تھی کہ کسی ظروف کے پرانے پن پر یوں خندہ تھی۔ بس اتنی بات واضح تھی کہ واقعی ایلسا میں بچوں جیسی معصومیت تھی اور وہ اسی معصومیت کے طفیل ہر مقام پر کسی بھی لطف اندوز ہونے کی قوت رکھتی تھی۔

باؤ سانی اور ایلسا میں ایک اور بڑی خوبی ان کی Sharing تھی۔ وہ جو کچھ ہو رہا ہوتا اس میں بڑی بے ساختگی زندگی کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ Ideas are not for ever لیکن جو لوگ خیال کو لباس کی طرح نہیں کرتے، وہ زندگی کے کھیل کو انجوائے نہیں کر سکتے۔ لباس پہن کر بڑے قد آور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تولنا چاہیے کہ لباس کا رنگ فیشن تراش خراش کیا مجھ پر جچی کہ نہیں۔ کیا رنگ میری طبیعت کے مطابق ہے؟ ہر ماحول، اور حالات اپنے ساتھ کچھ خیالات لے کر آتے ہیں۔ اگر خیال مثبت ہو اور اس کا ٹکراؤ آپ کے مسلک یا اقدار سے ایسے Idea کو ضرور آزما کر دیکھنا چاہیے۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے..... "سیروا فی الارض" ایسا ایک مثبت خیال ہے۔ سفر میں آپ کو کئی انسان، جگہیں، کلچر اور اندازِ زیست کی بوقلمونیاں ملتی ہیں۔ آپ کسی بھی سفر پر سیکھنے کے شوق میں جائیں گے تو آپ کو پورا مکتب ملے گا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کلاس بدلتی رہتی ہے۔ آدمی ہمیشہ تختی ہی لکھتا رہتا۔ تختی سے پن، پن سے بال پوائنٹ پھر مہنگی سیاہیوں سے لکھنے والے مہنگے پن..... کبھی فقط پنسل کا سہارا۔

ڈرامے سے ہمارا تعلق پرانا ہے۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ کچھ ہیر رانجھا قسم کا کھیل ہونا چاہیے۔ صدیقہ اور جاوید بھی آئے
تھے۔ ایلسا کو ہیر جیسا لباس پہنایا۔ ہاتھ میں شیشے کی جڑی پنکھی پکڑائی۔ باؤ سانی کو رانجھا بنایا..... صدیقہ نے سُکی کا
دھارا۔ جاوید کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ لڈی ڈالنے والوں کی طرح گلے میں کیسری دوپٹہ ڈال کر مہینوال بن گیا۔
آنگن کے پچھلے کونے میں تخت پوش بچھایا گیا۔ اس پر ایلسا رانجھے کو پنکھا جھلنے لگی۔ رانجھا صاحب اتراتے
اور بانسری پر غلط سلط سر بجانے لگے۔ اس دن کی یاد بڑی خوبصورت تصویروں میں محفوظ کر لی گئی۔

یہ تصویر بھی عجیب چیز ہے؟ دراصل جس شخص نے کیمرہ ایجاد کیا' اسے ''یاد'' کو محفوظ کرنے کا خبط ہوگا
تصویر سے ہرگز رہائی نہیں پا سکتا۔ بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں دیکھنا' جوانی میں بچپن کی تصویریں دیکھ کر محظوظ
بچھڑی محبوبہ کی تصویر دیکھ کر پرانے عشق کی سولی پر لٹکنا' پرانے دشمن کی تصویر دیکھ کر واقعے کی اہمیت پر سوچنا' بوڑھے
باپ' بہن بھائی دوست سب کی تصویروں سے تعلق خاطر کی ہلکی ہلکی پھوار دل پر پڑتی رہتی ہے۔ تصویروں کا اثر
جیسا ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے فلم میڈیا میں اتنی کشش ہے۔

تصویروں سے خیال آیا کہ ہماری زندگی میں عبدالرحمٰن میاں کیمرے کی وجہ سے داخل ہوا۔ اسے تصویر
بنانے کا جنون تھا اور ہم چوری چوری اس پبلسٹی سے خوش ہوتے تھے جو ہمیں ان تصویروں سے ملتی تھی۔

عبدالرحمٰن میاں منگلا میں انجینئر تھا۔ ان دنوں منگلا ڈیم زیر تعمیر تھا اور رحمٰن میاں زمین کھودنا اور اندر
والے چشمے کو بیرون لا کر لوگوں کو پانیوں سے سیراب کرنے کا فن جانتا تھا۔ پتہ نہیں خاں صاحب کی رحمٰن سے کب
کیسے ملاقات ہوئی۔ رحمٰن عام طور پر ہمارے گھر شام کے وقت آتا۔ ایک تخت پوش باہر والے برآمدے میں پڑا
کبھی یہ بوسیدہ تخت پوش پچھلے آنگن میں چلا جاتا۔ کبھی اس کو اوپر چھت پر لے جاتے۔ کبھی یہ باہر گیٹ کے سامنے
ڈال دیا جاتا۔ اچھے دنوں میں جب یہ اصلی مالکوں کے پاس ہوگا تو اس پر موٹی سی پلاسٹک سیٹ لگی ہوگی' لیکن اب
حال کہیں ایک ٹکڑی کہیں آدھی رکھا رہتا تھا۔

رحمٰن جب بھی منگلا سے آتا اسی تخت پوش پر سویا رہتا۔ رحمٰن کا پروفیشن تو انجینئرنگ تھا' لیکن اس
فوٹوگرافی اور ادب تھی۔ تصویریں تو وہ بہت اعلیٰ درجے کی کھینچتا ہی تھا لیکن کہانی کہنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا
پہلی کہانی ''ویرانے کا پھول'' پہلی مرتبہ ''داستان گو'' میں چھپی اور اس نے قارئین سے بہت داد پائی۔ رحمٰن
شاید..... شاید بڑا نام حاصل کرتا لیکن ہر تخلیق کار کی طرح اس کے اندر تنہائی نے جو فتور مچا رکھا تھا' اس کے نتیجے میں
لے کر پہلے ثریا کے در پر پہنچا۔ ثریا اس سے اس درجہ متاثر تھی کہ اگر کوئی سواری نہ ملتی تو دودھ والے کے ریڑھے
رحمٰن سے ملنے چلی آتی' لیکن یہ حالات تب واقع ہوئے جب ہم 121۔سی میں تھے۔

ثریا کی شادی رحمٰن سے نبھ نہ سکی۔

رحمٰن کے اندر کا فنکار پتہ نہیں کیوں دم سادھ کے چپ ہو گیا اور سوسائٹی میں اس کی پہچان اس کی دوسری
بشریٰ رحمٰن بن گئی۔ جوں جوں بشریٰ پھیلتی گئی رحمٰن سکڑتا گیا۔ 2007ء میں یا تو رحمٰن تاشقند میں اپنے

کرنے میں لگا رہتا ہے یا پھر وہ اپنے گھر کے کسی پچھلے کمرے میں اپنے نفس اور ہمزاد کے ساتھ غلطاں و پیچاں مروڑ تار رہتا ہے۔

یئن میں 479۔ این کی بات کر رہی ہوں جب رحمٰن پر ابھی شوق کی ترنگ غالب تھی۔ وہ موقع بے موقع کھینچنے کا شوقین تھا۔ ایک مرتبہ عید کا دن تھا۔ رحمٰن کہیں سے آ ٹپکا۔ مجھے بھی ان دنوں لباس میں گہری دلچسپی تھی۔ میں ... سکتی تھی۔ ہر عورت کی طرح میرے دماغ میں بھی ایک خناس تھا۔ میں بھی سمجھتی تھی کہ مجھ جیسا شہر میں دوسرا ... میں نے چوڑی دار پاجامہ' گھیر والا شفون کا فراک' ٹاپ کرتا اور آبِ رواں جیسی تین گز کی اوڑھنی اوڑھی۔ رحمٰن فوٹوگرافر نہال ہو گیا۔ اسے سبجیکٹ کی تلاش تھی۔ کبھی بائیں کبھی فرنٹ کبھی بیک کبھی ہاف کبھی فل..... کڑک ... تصاویر بنا ڈالیں۔ اس ساری گہما گہمی میں خاں صاحب چپ چپ تھے۔ وہ نہ سویاں کھا رہے تھے نہ حسب ... میں پیش پیش تھے۔ میں نے موقع پا کر خاں صاحب سے پوچھا..... ''کیوں کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں..... بس ایسے ہی۔''

مجھے معلوم تھا کہ جب وہ 1۔مزنگ روڈ کو یاد کرنے لگتے ہیں تو پھر انہیں ایسی ہی چپ لگ جاتی ہے۔

ہمیشہ کی طرح تعریف کی بھوکی عورت نے خاں صاحب سے پوچھا: ''میرا فراک دیکھا آپ نے؟ بالکل ... ہے۔ صادق کہہ رہا تھا کہ اتنی باریک شفون سینا بہت ہی مشکل ہے۔''

صادق کی دکان سمن آباد مارکیٹ میں تھی اور وہ میرے کپڑے بڑی پریت سے سیتا تھا۔ بچوں کے یونیفارم مین ... کے بازار میں اسے Jolin تیار کرتا تھا۔ صادق سمن آباد چھوڑ کر چلا گیا تو پھر بھی اس کے ساتھ میرا رابطہ رہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' شفتو جی بولے۔

ان کی آواز میں رتی بھر گرم جوشی نہ تھی۔

''میں..... کیسی لگ رہی ہوں شفتو جی؟''

اب میں نے سیدھا وار.....

حملہ درست تھا' سیدھا جواب ملا۔ ''دستو قدسیہ..... فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے..... جو بھی فیصلہ تم کرنا چاہو میں ساتھ ... اگر تم امراؤ جان ادا بننا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے۔ اگر تم مردانہ وار زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو کر اپنا لوہا منوانا ... تم کو آزادی ہے کہ اپنی شناخت اپنی محنت سے حاصل کرو..... لیکن راستہ ایک ہی چننا۔ دو راستوں کا مسافر زیادہ ... نہیں کرتا۔''

''میں..... ذاتی شناخت.....؟ میں سمجھ نہیں سکی خاں صاحب۔''

''مرد عموماً اپنے اوصاف سے اور عورت اپنی ذات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ اچھا ترکھان ریشمی کرتے نہ پہنے تو جانا جاتا ہے..... قابل ڈاکٹر سفید کوٹ میں ہی بھلا لگتا ہے۔ اسے رنگ برنگے لباس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس کے رزلٹ اچھے نکلتے ہیں اس پر تعریف کے ڈونگرے برستے ہیں۔ اسے کسی کو impress کرنے کے لیے اپنی ذات ... نہیں پڑتی..... تم میں بھی بڑا پوٹینشل ہے۔ اس کی طرف توجہ دو تو تمہارے لیے شناخت کا دروازہ فوراً کھل جائے گا۔''

''میں سمجھی نہیں شفقو..... بھلا مجھ میں کون سا پوٹینشل ہے۔ میں ناچنا گانا چاہتی تھی لیکن آپ کی روایات نے اُدھر بڑھنے نہیں دیا۔''

''چلیے ہم قصوروار سہی..... یا یوں سمجھیے ہم لوگ دقیانوسی مسلمان ہیں' لیکن تم میں ایک خوبی اور بھی ہے جس طرف سے تم لاپرواہی برتتی ہو۔ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ اگر پوری توجہ دو تو دور تک اور دیر تک لکھ سکو گی۔''

''لکھتی تو ہوں خاں جی..... میر شکاری کے قلمی نام سے کتنے مضمون لکھے ہیں۔ ادارت کرتی ہوں ''داستان'' کی۔ جب کوئی افسانہ کم پڑ جاتا ہے تو جیدی کے نام سے کھکھوڈیڈی کی طرف سے حتیٰ کہ صدیقہ کے لیے بھی ایک آدھ لکھ ڈالی ہے۔''

''لکھی ہیں لکھی ہیں کہانیاں قلمی ناموں سے..... لیکن..... لیکن.....'' وہ ناک کھجانے لگے۔

''لیکن کیا.....؟ آپ گھبرائیں ناں..... لیکن کیا؟''

''ہر عورت کی طرح تم بھی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ عورت کی بدنصیبی کہہ لو وہ اپنی ذات کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ کم بخت اتنی ناقص العقل ہے کہ نہیں جانتی بڑھاپا اس کے اندر پل رہا ہے۔ جسم بھدا ہو جاتا ہے، دانت جواب دے جاتے ہیں..... بال جھڑ کر بن کر رہ جاتے ہیں اور کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پھر فیصلے بدلنے کا وقت نہیں ہوتا۔ لے دے کے بچوں کے سہارے جینا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس کی توجہ جھٹک کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ سمجھ آیا.....؟ فیصلہ کرلو..... جوں جوں وقت گزرے گا..... تمہاری شناخت بڑھے گی..... جوں جوں کام میں پختگی آئے گی دور دور پھیلے گی..... لیکن فیصلہ تم کو خود کرنا ہوگا۔''

''جی فیصلہ تو میں کر چکی ہوں ناں خاں صاحب..... میں دونوں کام کروں گی..... عورت پن بھی برقرار رکھوں گی..... اور..... ادبی شناخت بھی پیدا کروں گی۔''

''دیکھیے عورتوں کے لیے مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں مشعلِ ہدایت روشن کی ہے..... امراؤ جان ناچنے گانے والی بھی بنی رہی اور مشاعروں میں بھی آداب عرض کر کے شعروں پر تعریف پاتی رہی..... پھر اس کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ انجام کار جو بھی قسمت میں لکھا ہو تمہیں مل جائے گا لیکن فیصلہ درست ہونا چاہیے۔''

میں نے فیصلہ کیا لیکن خاں صاحب کو زبانی نہیں بتایا۔ میں جانتی تھی کہ عورت تو ویسے ہی مرد کی طرح کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ بچے' گھر' رشتہ داریاں' سوشل لائف' بازار' ان گنت بکھیڑوں میں سے جس قدر کم ہو جائے اتنا ہی آسان ہوگا۔

میں نے اپنا زیور لا کر میں بند کرا دیا۔ شادی کے لباس پیک کر کے دھر دیے اور سادہ لباس سلوا کر سفید قمیص دوپٹہ اختیار کر لیا..... ایک بار اس کے بعد بھی مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑا۔

صدیقہ کے بھائی کی شادی تھی۔

صدیقہ چودھری برکت علی کی کوٹھی میں بڑے اہتمام سے شادی کے انتظامات میں مصروف تھی۔ میں

سب بھی تیار ہو کر بروقت روانہ ہوئے۔ میں نے بنارسی ساڑھی، ہیل والی جوتی اور خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ پٹھانوں کا لباس نہیں تھا اور غالباً خاں صاحب ایسی خاتون کے شانہ بشانہ چلنا نہیں چاہتے تھے۔

میں اپنے بھانویں خوبصورتی کا ماڈل بنی چلی جا رہی تھی۔

لیکن جب ہم گراؤنڈ کے دائیں راستے پر ٹیوب ویل کے پاس پہنچے تو خاں صاحب چلتے چلتے اچانک رُک گئے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا..... ''خیر ہے شقو جی طبیعت ٹھیک ہے؟''

وہ چند لمحے چپ رہے۔ غالباً سوچ رہے تھے کہ دلآزاری کیے بغیر کیسے سچ بولا جائے۔

''ہوا کیا ہے؟''

''بات یہ ہے قدسیہ کہ..... کہ..... دیکھو تم اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو؟''

''لباس..... کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔ ہم شادی پر جا رہے ہیں۔ ایسی قیمتی ساڑھیاں ایسے موقعوں پر ہی پہنی جاتی ہیں۔''

''آپ حکم دیں آپ چاہتے کیا ہیں۔''

''حکم نہیں قدسیہ..... تم فیصلہ کرو..... ہمارے گھر میں ساڑھی کا رواج نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں..... ویسے ہی معتوب ہوں اور.....''

میں نے جرح کی، کیونکہ میں ساڑھی اتارنا نہ چاہتی تھی۔ ''خاں صاحب..... مشرقی پاکستان کا یہی لباس ہے۔ ہمیں تو ساڑھی پر فخر کرنا چاہیے۔''

''ہاں کرنا تو چاہیے لیکن ہمارے گھر والوں میں ابھی وسعت نظر نہیں ہے..... وہ کنویں کے مینڈک ہیں۔ جب سب ہی پاکستانی بن جائیں گے تو شاید.....''

وہ چپ ہو گئے۔ ان کے لیے مجھے یہ کہنا بھی کافی بوجھل ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا اور سادہ شلوار قمیض پہن کر جب پھر باہر نکلی تو خاں صاحب مسکرا رہے تھے۔

مجھے میری والدہ نے بہت خوبصورت بنارسی کشمیری کڑھائی والی، تلے کے کام سے آراستہ قریباً پچاس ساڑھیاں دی تھیں۔ میں نے ان ساڑھیوں کو احتیاط سے پیک کر کے رکھ چھوڑا۔ اب میرا ارادہ پھر کبھی ساڑھی پہننے کا نہ تھا یا یوں سمجھئے کہ میں نے یہ ہندوانہ لباس ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

اشفاق احمد چاہتے تھے کہ میرے تمام عیوب، کمزوریاں، غفلتیں، Shortcomings لوگوں کی نظروں سے چھپی رہیں اور میری خوبیوں کو ہیرے کی طرح تراش کر مجھے معاشرے میں پیش کیا جائے۔ اس معاملے میں وہ اللہ کی طرح پردہ پوشی کرنے کو مدد کی بہترین صورت تصور کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی کسی غلطی کا تمسخر اڑاتے نہیں دیکھا۔

لوگوں کے سامنے میری غلطیوں کو اس طرح پیش کرنا کہ سب کے لیے ہنسی مذاق نکل آئے، یہ حرکت ان کے لیے بڑی مذموم تھی۔ بار بار کسی نقص کا اعادہ کرتے رہنا ان کے مسلک میں ممنوع تھا۔ وہ تنہائی میں بھی انگلی اٹھا کر

مسکان دکھا دکھا کر آواز اونچی کر کے اپنے آپ کو منبر پر چڑھا کر مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ جب بھی علیحدگی میں بات
آواز مدھم، لہجہ شیریں اور مفہوم مثبت نکالنے کی کوشش کی۔ ہم میں جو ساری عمر لڑائی جھگڑا نہ ہوا تو اس کی بنیادی وجہ خاں
صاحب تھے۔ میں تو شاید کسی وقت بھڑک اٹھتی۔ تقریری مقابلہ جاری کر دیتی لیکن وہ شاید اچھی طرح جانتے تھے کہ تلوار کا
زخم تو مندمل ہو جاتا ہے لیکن زبان کا عطا کردہ زخم ایسا بیہودہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی ٹانکا نہیں لگ سکتا نہ یہ کبھی پورے طور پر
مندمل ہوتا ہے۔

آپ سے پہلے عرض کر چکی ہوں کہ جونہی امیری، فارغ البالی، بھلے دن گھر کا رستہ دیکھ لیتے ہیں، کئی تبدیلیاں
اچانک گھر کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہیں۔ غریبی میں عموماً وقت تھم جاتا ہے۔ مصیبتوں کی شکل تو نہیں بدلتی۔ صبح شام
وہی ''رنڈی رونے'' گلے پڑے رہتے ہیں، جس کے باعث غریب آدمی ڈیپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ امیری میں احوال
بدل جاتے ہیں۔ تبدیلی بہت حد تک Opportunity کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ آدمی کو جلد جلد فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔
کبھی کبھی وہ گڑبڑا کر غلط راہوں کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کئی بار نتیجہ
ڈیپریشن کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم بھی 479۔ این میں کئی تبدیلیوں کا شکار ہوئے۔ اچانک ایک دن بیٹھے بٹھائے ہی مجھے لاہور کالج فور ویمن
سے نوکری کی آفر ملی۔ میں نے کسی جگہ نوکری کی درخواست نہیں دی تھی لیکن ان دنوں ٹیچنگ سٹاف کی قلت ہر کالج میں تھی۔
لاہور کالج میں بھی اردو ڈیپارٹمنٹ نیا نیا کھلا تھا۔ ظاہر ہے اس آفر نے میری اتراہٹ میں بڑا اضافہ کیا۔ رات جب بچے
سو گئے اور گھر میں فراغت کا احساس ہوا تو میں نے وہ کاغذ نکالا اور خاں صاحب کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''یہ دیکھ لیجیے۔''

''کیا ہے؟''

''بس آپ دیکھ لیں۔''

شفو جی نے کاغذ اٹھایا۔ عینک درستگی سے لگائی۔ چند لمحے پڑھنے کے بعد بولے: ''مبارک ہو..... یہ واقعی
اعزاز ہے۔ ہمیں تو نوکریوں کے لیے خاک چھاننی پڑتی ہے۔ تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے آفر مل گئی۔ شاباش.....'' پھر وہ کاغذ
بڑی نرمی سے تہہ کرنے لگے۔

''تو پھر جوائن کر لوں..... کیا خیال ہے آپ کا؟''

وہ چند لمحے چپ رہے۔ پھر بولے..... ''دیکھ لو سوچ لو۔ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیے۔ میرے خیال کی ضرورت نہیں
ہے۔''

بچوں پر ملازموں پر رعب ڈالتے مجھ میں ایک خاص قسم کا استانی پن پیدا ہو گیا تھا۔ نانا نے ایک دن مجھے
بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''قدسیہ! بچپن میں تو تیری طبیعت بڑی نرم تھی۔ اب تجھ میں مشنری میموں جیسی ڈسپلن پیدا ہو
رہی ہے۔ نہ وہ خود آرام کرتی ہیں نہ کسی اور کو زندہ رہنے کا حق بخوشی دیا کرتی ہیں۔'' مجھے پتہ نہیں کیوں اس روز بار بار
نانا کا یہ جملہ یاد آ رہا تھا۔

"لیکن آپ مجھے کچھ تو فیصلہ کرنے میں مدد کیجیے ناں..... چلیے رائے ہی دیجیے۔"

"ہاں..... مولانا اشرف علی تھانوی سے اگر کوئی رائے مانگتا تو وہ کہتے..... بھائی کرو وہ جو تمہارا دل چاہے۔ ہاں میں تمہاری جگہ ہوتا تو یوں کرتا۔"

"ہاں تو بتایئے ناں کہ آپ کیا کرتے؟"

انہوں نے سر کھجایا اور سوال کیا۔ "تنخواہ قریباً کتنی ہوگی؟"

میں نے لجاجت سے جواب دیا۔ "غالباً ڈھائی سو روپیہ یا پونے تین سو۔"

"اچھا تو پھر حساب لگاتے ہیں۔ تمہیں روز تانگے پر کالج جانا پڑے گا۔ سالم تانگہ 75 روپے ماہوار سے کیا کم ہوگا۔ ثاقب خاں ابھی چھوٹا ہے اس کی دیکھ ریکھ کے لیے کوئی مائی رکھنا پڑے گی۔ وہ بھی پچاس ساٹھ سے کم میں نہ ملے گی۔ پھر یہ تو تم پرانے کپڑوں میں گزارا کر لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے نہیں چلیں گے اور ہاں پھر کیا پتہ شام کو فنکشن ہوں۔ تمہیں شام کو بھی کالج جانا پڑے۔"

"نانا کو مجبور کروں گی وہ گھر پر رہیں گی۔"

"جمیلہ ہے وہ کب مستقل طور پر یہاں رہ سکیں گی۔"

میں چپ ہوگئی۔ میرے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

اس روز نو کی خاں بلا وجہ اتنا رویا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگئی۔

میں نے جب لاہور کالج فور ویمن کو انکار کر دیا تو خاں صاحب منہ سے کچھ نہ بولے لیکن ان کے رویے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑے مطمئن ہیں۔ جیسے کسی بڑے قلعے کا محاصرہ توڑ دیا ہو۔

یہ 121۔سی ماڈل ٹاؤن کا واقعہ چونکہ اسی ڈھب کا ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک بار جب شہاب بھائی ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا..... "قدسیہ! یہ تمہارے پاس ہی شاکر علی میوزیم بن رہا ہے ہمیں اس کے لیے ایک عدد ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تم مان جاؤ تو یہ نوکری میں تمہیں بہ سہولت دلوا سکتا ہوں..... اچھی تنخواہ کے علاوہ کار بھی ملے گی۔ گھر کے کام کے لیے دو نوکر بھی آ جائیں گے اور سفر کے دوران سرکاری ٹکٹ بھی مل جائے گی..... سوچ کر بتانا۔"

ایک بار پھر میرے دل میں انا کا گلاب کھلا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ میں نے خاں صاحب سے پوچھا..... "آپ نے سن لیا ناں شہاب بھائی جو کہہ رہے تھے۔"

"ہاں سن لیا۔"

"پھر کیا کہتے ہیں آپ؟"

"دیکھو قدسیہ! بات میرے کہنے سننے کی نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی سے جو فیصلہ کرو گی ہم سب کو منظور ہوگا۔ ظاہر ہے اس وقت ہمیں پیسے کی تنگی نہیں ہے جس کی وجہ سے تم کو نوکری کرنا پڑے۔ گاڑی گھر پر موجود ہے۔ پھر پرسنل گاڑی اور ڈرائیور تو اسے درکار ہوتا ہے جو شخص بڑا سوشل ہو اور جسے گھر پر وحشت ہوتی ہو..... رہ گیا خانساماں تو ہماری جیونی، رمضان

سلامت رہیں۔ گھر پہلے ہی خدمت گزاروں سے بھرا پڑا ہے اور دو آدمی تابعدار بنا کر کیا ملے گا۔“

بہت سارے مسائل بدل چکے تھے لیکن میری نوکری سے ان مسئلوں میں سے کوئی بھی نہ سنورتا تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ میری شناخت ایڑی کی گرگابی مل جاتی۔ انسان کے اندر بسنے والی اس کی انا کسی طور پر مطمئن نہیں ہوتی۔ ہر دم بھوکی پیاسی اور روکھی سی کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے۔ برسوں اس شیخی خورہ کو پانی دو..... اس کی پیاس ختم نہیں ہوتی۔ عمر کے آخری حصے میں جا کر کچھ کچھ پتہ چلا ہے کہ جس راستے پر اللہ کا ہاتھ یا ساتھ نہ ہو وہ راستہ صرف انا کا سفر ہے۔ یہاں کھانے کو تھوہر اور پینے کو گرم پانی ملتا ہے۔ آپ کو فرعون کی طاقت ملے یا قارون کا خزانہ‘ نہ اپنا فائدہ ہے نہ کسی اور کا.....

بس میں نے بڑی دقت سے اپنے لیے یہ بات سوچی کہ کسی اور کا فائدہ چونکہ نہ ہوگا اس لیے یہ کام افادیت سے خالی ہے..... گھر بھر نے سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر شانتی کی ہوائیں برآمدے میں چلنے لگیں۔

شہاب صاحب 121۔ سی ماڈل ٹاؤن میں ہمارے بہت قریب آئے لیکن اس بارش کے ہلکے ہلکے چھینٹے اسلام آباد کے اسی گھر میں شروع ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ خاں صاحب کے اس وقت کے جان کار تھے جب وہ 1-مزنگ رہا کرتے تھے۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو وہ اور عفت مجھے ہیلو ہیلو کہنے والوں میں شامل ہو گئے۔

لیکن شروعات اسی گھر سے ہوئیں۔

شہاب صاحب اس وقت وفاقی حکومت کے سیکرٹری تھے۔ محکمہ غالباً تعلیم کا تھا لیکن اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ سرکٹ ہاؤس میں رہا کرتے تھے‘ لیکن شام کو جب خاں صاحب گھر پر ہوتے وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تپائی نما میز پر بے جوڑ برتنوں میں گول ڈگڈگی موڑھے پر بیٹھ کر بڑے معمولی کھانے رغبت سے کھاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دسترخوان پر مل بیٹھنے کی مہمان نوازی مسلمان ممالک میں چلی آ رہی ہے۔ یہ روایت سب سے زیادہ ڈیروں پر نظر آتی ہے۔ یہاں فائیو سٹار کا کھانا نہیں ملتا نہ ڈچ کا رواج ہے کہ اپنا اپنا ادا کیا جائے۔ بنے۔ خاں صاحب کی تواضع بھی خاص الخاص دسترخوان سے وابستہ تھی۔ وہ چٹنی روٹی‘ اچار پراٹھا کھلانے میں بھی عار محسوس نہ کرتے۔ پُرتکلف کھانوں کی ان کے نزدیک کوئی شرط نہ تھی۔ میں عموماً اہتمام کے بغیر کھانا کھلانے میں سبکی محسوس کرتی۔ میرا جی چاہتا کہ شہاب صاحب کے شایانِ شان کچھ ضرور ہو۔ خاں صاحب کہا کرتے: ”قدسیہ! اہتمام نہ کرو انتظام کر لو۔“

میں ان دونوں کے فرق کو بہت بعد میں سمجھی۔ جب بھی شہاب صاحب آتے میں آلو کی پوریاں بنانے کی کوشش کرتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس قسم کی پوریاں رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔ بچوں کی طرف کبھی ان کی توجہ نہیں گئی۔ وہ خاں صاحب سے آگے ایک قدم نہ بڑھتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اور بچوں سے فری ہونے کی کوشش نہ کی..... کوشش تو غالباً وہ ایک ہی سمت میں کرتے تھے‘ لیکن ابھی مجھ پر ان کی یہ سمت نہ کھلی تھی۔ شاید خاں صاحب اس جہت کو جانتے ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا.....

ذکر تو خاں صاحب ویسے بھی بہت کم باتوں کا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہر معاملے میں اپنی رائے سے

...دی تھی۔ جس وقت وہ طفیل نیازی کے ٹیپ لے کر گھر آئے۔ انہوں نے طفیل نیازی کا نام تک مجھے نہ
...طفیل نیازی کی گونج دار آواز سے بھر جاتا۔ ایک جادو سا فضا میں تیرنے لگتا۔

"میں نئیں جاناں کھیڑیاں دے نال" کی کوک بن کر کمروں میں تیرنے لگتی اور میں سوچتی رہتی پتہ نہیں یہ
...گانے والا کون ہے۔ پھر ایک دن ایک آدمی نانی اماں کے کمرے میں خاں صاحب کے پاس بیٹھا نظر آیا۔
...رہا ہے کہ جب کبھی بھی خاں صاحب کے پاس کوئی بیٹھا ہو میں از خود اس مجلس میں شرکت نہیں کرتی تھی' اگر خاں
...لیتے تو اور بات تھی۔

"قدسیہ..... ذرا ادھر آنا۔"

...میں اندر گئی۔ ایک بھاری بدن' ملائم سانولے چہرے اور کھرج دار آواز میں ایک شخص پینٹ قمیض میں ملبوس نانی
...کمرے میں بیٹھا تھا۔

"یہ طفیل نیازی ہے۔"

...میرے چہرے پر شناخت نہ ابھری تو خاں صاحب بولے..... "بھئی جس کے گانے سن کر تم باورچی خانہ چھوڑ

"یہ میری بیوی ہے..... قدسیہ۔"

طفیل نیازی اپنی باتوں میں مگن رہا۔

طفیل سے بات کرنا مشکل نہ تھی کیونکہ اس کے پاس ان گنت باتوں کا پٹارہ تھا۔ کبھی وہ چراغاں کے میلے کا کوئی
...کبھی مانگنے والوں کی ٹولی میں مل کر گانے بجانے کی کہانی سناتا۔ کبھی گڑوی بجانے والیوں کا ذکر درمیان میں لے
...ملاقات میں اس نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔

"خاں صاحب! میں اور میرا چھوٹا بھائی فقیریا ہمارے ساتھ طبلچی سازندے فیصل آباد کی درگاہ سے چوکی بھر کر آ
...ہمیں بس نہ ملی۔ شہر سے دور ایک اُجاڑ جگہ میں دریاں ڈال کر لیٹ گئے۔ خاں صاحب! کوئی آدھی رات گزری
...جنوں کی ایک ٹولی وہاں اتری۔"

"جنوں کی" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بی بی جن ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر اللہ کی کتاب میں آیا ہے۔ ٹھیک ہے آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ
...پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی آنکھ دیکھ سکے' لیکن ہوا بھی تو موجود ہے ناں۔ آپ مانتی ہیں ناں۔"

"بی بی قدسیہ! میں نے بھی آپ کی طرح انہیں نہیں پہچانا تھا۔ لیکن فقیریا نے میرے کان میں کہا: "دیکھو بھائی
...ان میں سے کوئی بھی آنکھ نہیں جھپکتا..... یہ دوسری مخلوق ہے ہم میں سے نہیں۔"

"اچھا تو آگے چل۔" خاں صاحب بولے۔

"ہاں تو سرکار وہ ٹولی بھی اُس رات اُسی درگاہ پر چوکی بھرنے آئی تھی جہاں ہم چوکی بھر کر آئے تھے۔ فقیریا کی
...آنکھ لگ گئی لیکن میں پتہ نہیں کیوں سو نہ سکا بلکہ چوری چوری انہیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سلطان باہو کا

کلام ایسی لہک سے گانا شروع کیا کہ وجد طاری ہوگیا۔ جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں جا بسوں اور
سوائے کوئی اور رشتہ باقی نہ رہے..... لیکن سرکار ہم لوگ..... ہم جو گانے بجانے والے' قوالی کرنے والے
لوگ ہوتے ہیں' ہمیں اپنے رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں' اپنے گھر والوں کے سوائے کسی کے
نہیں ہوتے..... میرا ارادہ میرے سوئے ہوئے بھائی' گھر بیٹھی بیوی اور بچوں نے توڑ دیا۔ کچھ اونگھتا سوتا میں اُس
غافل نہیں تھا۔ پھر وہ فجر سے پہلے اٹھے۔ اپنے ساز سنبھالے اور چلنے لگے۔ ابھی دس بارہ قدم دور ہوگئے ہوں
سارے غائب..... باجا سارنگی ڈھولک طبلہ..... سمیت نہ کوئی نشان نہ کوئی اتہ پتہ نہ کوئی یادگیری نہ کوئی نشانی.....
واقعہ ہے سرکار..... لوگ تو میلوں پر اور بھی عجیب وغریب باتیں بتاتے ہیں.....''

طفیل اپنی مہلوئی باتوں سے خاں صاحب کو رجھا رہا تھا۔ میں اس کی باتوں سے متاثر ضرور ہوئی لیکن
ایمان لانا میری تعلیم کی وجہ سے ناممکن تھا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کا ماحول اس کی ذات کو گھڑنے میں
معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم' ماحول' اس کی جبلت اور میل جول ایسے فیکٹرز ہیں جو ہر شخص کو ایک خاص
ڈالتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر مماثلت بھی رکھتا ہے اور بیّن فرق کا
دیتا ہے۔

لیکن موسم ان سب سے زیادہ انسان کی بناوٹ کو بدلنے میں مدد دیتا ہے۔ جن ملکوں میں برف باری'
شدید سردی معمول ہے وہاں لوگ گھروں میں محبوس ہوکر Introvert ہوجاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
انسان کی اصلیت کا بغور مطالعہ کرنے کا وقت بھی ملتا ہے اور کرب بھی۔ اسی تنہائی نے یورپ میں سائنس کو جنم
دھیرے دھیرے انسان کو بھی سائنس کا حصہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بیسویں صدی میں یونگ' ایڈلر اور فرائیڈ نے نفسیات کی دنیا میں ایک انقلاب کی شکل اختیار
لیکن انسانی مجبوری ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر میں محبوس ہوکر رہ جاتا ہے۔

فرائیڈ کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی تخلیقی قوت جنس تھی۔ جب اس کی آسودگی ممکن نہیں ہوتی تو
میں اس تشنگی کا علاج ڈھونڈ نکالتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی تھیوری کو تقویت دینے کے لیے بہت سارے راستے ڈھونڈ
یہ Psycho-analytical طریقہ علاج تھا۔ خوابوں کی تعبیر اور ان میں Symbols کی تلاش ایڈپس کمپلیکس
دبی اور نیوراسس اور شیزوفرینیا کے علاج کی سائنسی توجیہات نکالیں۔ کچھ عرصہ یونگ اپنے استاد فرائیڈ کے
شامل رہا اور اس کے اندازِ فکر سے مطابقت میں آمنا وصدقنا کہتا رہا۔ یہ تعلق تو قائم رہا لیکن انسان کے متعلق تشریحات
بھی خاطر خواہ اضافے ہوتے رہے۔

لیکن پھر یونگ نے انسان اور اس کی دیومالائی بیک گراؤنڈ کی طرف ایک اور نقطہ نظر سے شدید توجہ دینی شروع
کر دی۔ وہ سمجھنے لگا کہ فقط جنس ہی انسان کی واحد ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ماضی کا بھی حصہ ہے اور ان دیکھی طاقتوں کا
اور اس طرح Cosmic Consciousness کی ایجاد ہوئی۔ یونگ نے Introvert-Extrovert میں انسان کو تقسیم
کیا اور ماورائی تجربات کو بھی زندگی کا ضروری حصہ بنا دیا۔ حضرتِ انسان کی تلاش نے ایڈلر کی سمت بھی متعین کر دی۔

یدہ اسباب کو اہمیت دیتا تھا کہ انسان میں Will to power اہم ہے۔ ہر انسان رب بننے کی کوششوں میں تا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قوت اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش میں پنہاں ہے۔

فرائیڈ کی جنس سے وابستگی۔

ینگ کا Archetypes سے عشق اور ماورائی قوتوں کی رغبت۔

یڈلر کا Will to power کا فلسفہ۔

یہ تینوں اپنی اپنی سمت کے بڑے کام تھے' لیکن یہ سارا سچ نہیں تھا۔ میرا علم اتنا نہیں کہ میں ان تینوں پر آپ ضاحتیں پیش کرسکوں۔ لیکن مجھ پر خاں صاحب کی صحبت میں ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ انسان چاہے حاصل کرے اس کی تلاش کی معراج مذہب ہے۔ یہاں آپ کو منوانے سے بھی زیادہ کسی کو ماننے کی رہتی ہے۔

انسان چاہے کسی مقام پر پہنچ جائے' تشنہ لب رہے گا۔ قارون کے خزانہ' فرعون کی طاقت میں اللہ کا ہاتھ اور اس و بے کار ہے۔ انسان کے اطمینانِ قلب' صبر و شکر' ترقی و فلاح کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک در ایسا بھی تلاش اندھا اعتقاد و ایمان اُسے ماتھا ٹیکنے پر ہمیشہ رضامند رکھے۔

خاں صاحب سمجھتے تھے کہ یہ تلاش جو انسان کا مقدر ہے' سب سے زیادہ فنکاروں کا نصیب ہے۔ وہ شاید خدا کو پاتے لیکن اپنے میں وہ جوہر ڈھونڈ لیتے ہیں جو ان کی شخصیت کا بہترین اظہارِ تشکر ہوتا ہے۔

جو لوگ طفیل نیازی کی طرح رب رب کرنے والے فنکار ہوں وہ اپنی جملہ خرابیوں کے باوجود (خرابیاں تو ہم یب ہیں) شاکر اور صابر آدمی طفیل نیازی کی اونچ نیچ' مشکلات' اوگھٹ گھاٹیاں' زندگی میں بھی عام نارمل آدمی کی تی ہیں لیکن وہ کبھی اللہ کا شکوہ نہیں کرتا تھا۔

لیکن مجھ میں نہ تو خاں صاحب والی تلاش تھی۔

نہ طفیل نیازی جیسی تسلیم و رضا۔

مجھے میری تعلیم نے صرف یہ سکھایا تھا کہ اپنے زورِ بازو پر اعتماد کرو۔ جو لوگ اپنی توانائی اور تقویت کو بروئے کار تے ان کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ مجھے نہ کسی مقدر پر یقین تھا نہ ایسی قوت پر اندھا یقین ہی تھا جو انسان کو جانے کی توفیق دیتی ہے۔ میں تو کسی خودسر بچے کی طرح اپنے سینہ پر مکا مار کر کہنے کی عادت تھی۔

"میں میں آپے آپ۔ میں خود۔"

اسی جذبے کے تحت ایک روز جب طفیل نیازی ہمارے گھر آئے تو میں نے ان سے کہا۔ "طفیل بھائی! مجھے ے کا بہت شوق ہے۔ میں ایک ماسٹر صاحب سے کچھ دیر کلاسیکی موسیقی بھی سیکھ چکی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے گانا دیں..... میں اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ ازراہِ ادب چند ثانئے چپ رہے۔ پھر ہولے سے بولے۔ "ہاں بی بی! ذرا میرے ساتھ سرگم اٹھائیں۔"

ایک بار طفیل بھائی نے سارے گاما کی سرگم بڑی سادگی سے ادا کی۔ توقف کیا پھر سرگم دہرائی اور چپ ہو گئے۔

میں نے ان کے تعاقب میں گویا سُر سُر ٹھیک ہی گایا۔

پھر انہوں نے دو تین بول ایک ٹھمری کے گائے۔ میں نے نقل بہ نقل اصل اتاری۔ جہاں تک نقل کا تعلق ہے درست تھی لیکن ان کے بھانویں کچھ کسر تھی۔ وہ چپ ہو گئے۔ میرے گانے کی کوئی تعریف و توصیف نہ کی۔ میں ... ہوئی لیکن خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ''میں بی بی ہر ایک سے جھوٹا بولتا ہوں لیکن شاگرد سے ایسی دل لگی کو ... ہوں۔ تمہارے علم میں کوئی کمی نہیں..... لیکن تمہیں میرے رب نے وہ آواز نہیں دی جو اصلی گائیک کو ملتی ہے ... رہیں تو درمیانے درجے کا اثر تو پیدا کر لیں گی لیکن وہ بلندی بس میں نہیں آسکتی جو اچھی آواز کو ملتی ہے..... آپ جب ... جاتی ہیں تو آواز کانپنے لگتی ہے..... یہ بڑا نقص ہے۔''

میری شکل دیکھ کر طفیل بھائی کو ترس آ گیا..... ''آپ کسی اور فیلڈ میں کام کریں۔ کیا پتہ وہ شہرت مل جائے ... آپ کو شوق ہے۔''

اس سے پہلے میں شوقیہ کمروں میں غسل خانے میں باورچی خانے میں گایا کرتی تھی لیکن اس کے بعد یہ ... بند ہو گیا۔ خاں صاحب نے بھی ایک دو مرتبہ مجھ سے کہا: ''ہاں یار آواز تمہاری تو کانپتی ہے.....'' میری والدہ، بھائی ... اور میں پہاڑوں سے گاتے چلے آئے تھے۔ لیکن طفیل نیازی کی بات نے مجھے محتاط کر دیا۔

انسان کے ہر اچھے سے اچھے عمل کا راستہ برے عمل کی طرف نکل سکتا ہے اور اس کی بدی کا دروازہ ایک ... نیکی کی راہ پر کھل سکتا ہے۔ میری اس دلآزاری سے میرے لیے ایک بہت ہی اچھا تجربہ میری زندگی میں شامل ... نے قلم اور کاغذ تھام لیا اور اپنی دلچسپی کی سمت بدل ڈالی۔

اگر میں کانپتی آواز میں تانیں اٹھانے والی ٹھمریاں گانے والی ہوتی تو شاید ہوشیار پور کے پٹھان اندر ... بھاگ جاتے اور میں منیر نیازی کو کبھی نہ جان سکتی۔ لیکن پتہ نہیں میری تقدیر کتنی یاور اور میری عقل کتنی کوتاہ ہے کہ مجھے ... قابلِ ذکر لوگوں کی توجہ ملی۔

منیر نیازی ہمارے گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھ سے کبھی لمبی چوڑی بات نہ کی تھی۔ ایک روز آئے تو خاں ... گھر نہ تھے۔

''قدسیہ..... جانتی ہو میں کون ہوں؟''

''جی جانتی ہوں۔ میں نے آپ کی دو تین غزلیں اور نظمیں ''داستان گو'' میں چھاپی ہیں۔''

ہر ایڈیٹر کی طرح ''داستان گو'' کا ذکر کر کے میں نے اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔

''لو میری بڑی مشکل آسان ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اشفاق رسالہ نکالتا ہے۔ اب پتہ چلا واقعی اس رسالے ... تیرا بھی کچھ تعلق ہے۔ ہاں بھئی اشفاق گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اپنی پنجابی نظموں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اگر تمہارے ادارے ... ارادہ ہو تو چھاپ لو.....''

''نام کیا رکھا ہے منیر بھائی؟''

''سفر دی رات.....''

منیر نیازی نے چپکے سے نظمیں پکڑائیں۔ مجھ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہ کی اور جلدی رخصت ہو گئے لیکن پتہ
منیر بھائی کو مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ یہی اعتبار اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی مجموعہ
انتساب میرے نام کیا۔ ان کے لیے غالباً یہ ایک معمولی بات تھی لیکن میرے لیے یہ اعزاز کسی تمغۂ حسن
سے کم نہیں۔

منیر نیازی بھی پٹھان برادری کے جملہ مردوں کی طرح اظہار کے معاملے میں بڑے جھینپو تھے۔ خاں صاحب
رشتہ دار بھی تھے کہ نہیں، لیکن دونوں ہوشیار پور کے عاشق تھے، جہاں ان کے پرکھوں نے پڑاؤ ڈال کر
سکھ کا سانس لیا۔

شوالک کی پہاڑیوں سے دونوں کو گہری محبت تھی۔ دونوں کے دلوں میں بچھڑی ہوئی گلیاں، بے آباد گھر،
مٹی اڑاتے راستے، اجڑی بجڑی قبریں، گرے پڑے کتبے اور یادوں کی سنسناتی ہوائیں چلتی
ہول، ان کے اندر امید بن کر تو طلوع ہوئی لیکن یہ امید جیسے ہوا کی زد میں رکھا ہوا دیا تھا کہ نہ بجھتا تھا
طرح لو دیتا تھا۔

منیر نیازی کے خوبصورت چہرے کو میں نے کبھی کھلکھلاہٹ میں نہیں دیکھا۔ وہ چہرہ ہمیشہ تھوڑا تھوڑا ہنستا ہو لے
اپنی مسرتوں کو بھی چھپائے رکھتا گویا نظر بد سے بچا رہا ہو۔ سب سے بھلی چیز منیر نیازی کی آواز تھی..... کچھ
بیٹھی بیٹھی سی آواز..... کچھ کسی محبوبہ کے آگے عرض حال کرتے وقت رکی رکی سی، کچھ حاکم وقت سے مراعات
شرمندگی اور اصرار سے بوجھل آواز.....

منیر نیازی کے مالی حالات بھی درست نہ رہے۔ وہ ان مالی حالات کے ہاتھوں بڑے زچ ہوا کرتے تھے۔
دراز کرنے کی جسارت دل سے بری لگتی تھی اور ساتھ ہی مانگے بغیر چارہ نہ تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آخر تک
وں پر جانے کی حاجت رہی۔

وہ دبئی، امریکہ، لندن میں ہونے والے مشاعروں میں جانے کے لیے پہلے دعوت کا انتظار کیا کرتے پھر خود ہی
فون بھی کرتے اور شرمندہ بھی ہوتے۔ ہمارے ہاں عجیب بات ہے کہ مشاعروں میں شاعروں کو اکٹھا کرنے
ایسے شاعروں کا ہجوم رہتا ہے جو ہر طرح سے ان کی خوشامد کر کے اپنا راستہ بناتے ہیں۔ خوشامد چونکہ انا کو
تی ہے اس لیے نودولتیوں کی طرح ان نوشاعروں کی کھیپ سے مشاعروں کا بندوبست کرنے والوں کو بڑی
تی ہے۔

ان حالات میں منیر بھائی کو بھی خوشامدی رعایا میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ان دنوں
روں کا چکر نہ چلا تھا۔ منیر نیازی ابھی ساہیوال میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا وہ ہمارے گھر ضرور
ے ہی ایک دن وہ اپنی بیوی کو لے کر ہمارے پاس آ گئے۔

"یہ میری بیوی ہے قدسیہ..... تم سے ملنے کا اسے بہت شوق تھا....."

میرے سامنے جوان سال خوبصورت منیر نیازی کے ساتھ ایک جوانی ٹپی، مرجھائی سی میلی میلی خاتون کھڑی تھی،

جس کے چہرے پر لجاجت آمیز مسکراہٹ' معافی کے انداز میں پھیلی تھی۔ میں نے دل میں اس بے جوڑ شادی پر
لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خاں صاحب نے بھی تو خاندان سے باہر شادی کی تھی اور میں کسی طور پر ان کا مقابلہ نہ کر
پھر سجاد تھا..... اشتیاق تھا..... خالد آفتاب تھا..... جاوید طارق تھا۔

ان روایت توڑ پٹھان بچوں نے خاندان سے باہر شادی کر کے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی تھی کہ جب
کے مرد گھر سے باہر جب بھی چناؤ کرتے تھے ہمیشہ بر امال خرید کر اسے سر کا تاج بنا لیتے تھے اس لیے نہیں کہ
بے مائیگی کا علم نہیں تھا بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اپنی Commitment کا ہمیشہ پاس رہتا۔ وہ کسی غلط
فیصلہ کر بیٹھنے سے اس سزا کے سزاوار بن جاتے۔

منیر نیازی اپنے سے عمر میں بڑی خاتون کے ساتھ بڑی محبت سے دن گزارتے گزارتے بالآخر
پہنچے جب ان کی بیگم داغ مفارقت دے گئیں اور وہ ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔

منیر نیازی بھی آتے رہے اور طفیل نیازی بھی۔ ایک روز جمیلہ اختر اس وقت آئیں جب طفیل بھائی
تھے۔

جمیلہ دراز قد' خوبصورت اور مروّت والی روح تھی۔ شہر کے ایک معتبر رئیس میر صاحب کی بیگم تھیں۔ یہ
دنیا سے رخصت ہوگئے تو جمیلہ کو تین بچے دے گئے۔ ایک بیٹی امریکہ میں بیاہی گئی ہے اور دو بیٹے اچھے مقامات
جمیلہ کے لیے باعث فخر ہیں۔

ان دنوں جمیلہ کے پاس اس کی آواز قہقہے کا ویزا تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ڈائیلاگ ادا کرنے کی
اس کا قہقہہ باعث شہرت تھا۔ اسی قہقہے کی بدولت وہ طفیل نیازی سے متعارف ہوئی۔

جب سُر کے رسیا نے جمیلہ کی ہنسی سنی تو خاں صاحب سے پوچھا: ''یہ کون سُر میں ہنس رہی ہے؟''

خاں صاحب نے جمیلہ کو آواز دے کر بلایا۔ تعارف کرایا۔ ''یہ ہماری ڈرامہ وائس ہے۔ میرے ڈرامے
عموماً یہی سنٹرل کردار ادا کرتی ہے۔''

طفیل نیازی نے بڑے اشتیاق سے کہا..... ''بی بی! میرے پیچھے پیچھے ذرا سرگم گاؤ۔''

جمیلہ اختر نے بڑی سہولت سے خوفزدہ ہوئے بغیر سرگم کا تعاقب کیا۔

پھر کسی ٹھمری کا مکھڑا گایا۔ یہ بھی جمیلہ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لوک گیت کے اونچے سروں میں طفیل
کمرے میں گونج پیدا کر دی۔ جمیلہ اختر نے اس گونج کی بازگشت سنا دی۔ بڑے امتحان میں پاس ہونے کے بعد بھی
پروا تھی۔ ایک بڑے فنکار کی طرح اسے کام کر چکنے کے بعد بھی گھبراہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔

''لو بی بی اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنا شاگرد بنا سکتا ہوں۔''

مجھ پر حسد کا بم گولا گرا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جمیلہ جو میری چھوٹی سی اور خاں صاحب کی بڑی بہن
یوں اس کی پذیرائی ہوگی۔ پرستار عموماً قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ طفیل بھائی جمیلہ
استاد ہیں اور اس کے گھر جا کر اس کی تعلیم فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی طفیل بھائی کا ذکر اس سے نہ کیا۔

مجھے تو لیں حسد کی یلغار کے بعد اس کے تعاقب کا وقت بھی نہ ملا۔ جمیلہ ہمارے گھر چھوٹی بہنوں کی طرح آنے لگی سمن آباد ہی میں رہتی تھی۔ پھر وہ ایک دن اپنے ساتھ صابرہ سلطانہ اور اس کی بیوی روحی کو لے کر آ گئیں۔ یہ وہی تھیں جنہوں نے ''اُچے برج لہور دے'' میں جمیل بسمل کے ساتھ بیکو جی کا معرکتہ الآرا رول کیا تھا۔ صابرہ بہت خوش لباس اور اپنا آپ نہ منوانے والی خاتون تھیں۔ وہ بہت کم شلوار قمیض پہنتی تھیں۔ عموماً ہلکے پھلکے رنگوں کی ساڑھی زیب تن کرتیں۔ جمیلہ اختر اور وہ چند بار اکٹھی آئیں۔

پھر ہمیشہ کی طرح صابرہ اور روحی خاں صاحب کی زیادہ چہیتی بن گئیں اور جمیلہ دیکھتی رہ گئیں۔ یقیناً جمیلہ پر بھی صدمہ پڑا ہوگا لیکن اس نے کبھی منہ سے اظہار نہ کیا اور ہولے ہولے پیچھے ہٹ گئی۔

ایک خطرہ ہمیشہ دوستی میں رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص اپنا دوست اپنے کسی دوسرے دوست سے ملواتا ہے تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ جب تمہارے یہ دونوں دوست بہت قریب آ جاتے ہیں اور آپ کی نفی کر دی جاتی ہے۔ اس بات کو کیا کیا جائے انسان سہل پسند ہے۔ جب کوئی بنا بنایا رشتہ تھالی میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے جو قابل اعتماد بھی ہو تو پھر انسان اس کی تہہ میں پورا نہیں اتر سکتا اور غوطہ لگا جاتا ہے۔ ایسے ہی جمیلہ بھی ڈبکی لگا گئی۔

479۔ این میں جب یو ایس آئی ایس ریڈیو پاکستان گویا خاں صاحب کی عادت کا حصہ بن گیا۔ ایک اور نیا سلسلہ آیا اور گھر پر بڑے زور کی دستک دی۔ یہ دستک ناہید کی تھی۔ آپا فرخندہ کی بیٹی ناہید.....

میں شاید پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ اقلیت ہمیشہ مٹھی بند معاشرے میں اپنا تحفظ محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنی رسم و رواج، لباس، انداز گفتگو، زبان کے پیچھے مر مٹنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثریت کے دریا میں اپنی ناؤ بہاؤ لے جا سکتے ہیں پر چلو بھر پانی کشتی کے اندر آنے نہیں دیتے۔

ان لوگوں کی تبدیلی جب بھی آتی ہے خاندان کے کسی فرد کی انفرادی سوچ کے ہاتھوں آ سکتی ہے۔ جب خاندان سے باہر شادی کرنے کا ارادہ کر کے خاں صاحب نے پُرسکون پانیوں میں تلاطم برپا کیا تو خود ان کے اپنے اندر بھی اس کی خواہش نے احترام جرم، احساسِ کمتری اور حزن و ملال کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا کر دیے۔

اس بار ناہید نے اس تبدیلی کا شوشا چھوڑا۔ اسے حسن اتفاق یا شومئی قسمت کے باعث قدسیہ سے محبت ہو گئی تھی اور قدسیہ کی ذات میں ویسا ہی اعتماد تھا جیسا خاں صاحب نے مجھ پر کیا۔

خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ بچے اور میں سمن آباد 479۔ این کے بیرونی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر پہلے محترین سائیکالوجسٹ کی بیوی کا چھا اپنے بچے کو پرام میں دھکیلتی لے گئی تھی۔ اس وقت ہمیشہ کی طرح حیا کی مورت اور خود کو خطرہ سمجھ سکنے والی ناہید کلفا اندر آئی۔ اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑایا جو اسے اس پر بٹھا کر گلی کی طرف لے گیا۔ اثیر خاں میری گود میں سو رہا تھا۔ اس لیے وہ سائیکل Excitement میں شامل

''قدسیہ آپا۔''

''جی۔''

''قدسیہ آپا۔''

''ہاں کہو؟'' میں نے استادوں کی سی دھمکی کے ساتھ کہا۔

''قدسیہ آپا۔''

''بتاؤناں ناہید۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''آپا جی جواد..... سجاد؟ کوئی؟'' اس نے دائیں بائیں کچھ ذو معنی سا سر ہلایا۔

''اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔''

''وہ جی آپ کو پتہ ہے ابو لیبیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابو جی کے پاس چلی جائیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔''

''اتنا آسان نہیں قدسیہ آپا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔''

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید کلفا آپا فرخندہ کی بڑی بیٹی پرائم گلاس فیکٹری والوں کی بہو تھی۔ اس کے سسر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے بھائی رشید احمد خاں جن کی ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے، وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے کی اجازت دیتے۔

''لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟''

''وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں کا امتحان دے گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں، تھوڑی سی ایب نارمل ہے۔ اس کی ساس، دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں ابھی 36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھر داری کر سکتی ہے نہ بے بے جی..... پھر بتایئے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی کاٹنے جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری کون اٹھائے؟''

بچے ٹرائی سائیکل پر خوش گلی میں آ جا رہے تھے۔

''قدسیہ آپا جواب دیں ناں..... آپ 36۔ جی آ جائیں گی.....''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ناہید لیکن کیا خاں صاحب مان جائیں گے؟''

''بس ٹھیک ہے آپ مان گئیں تو وہ آپ ہی مان جائیں گے۔ اب میں خوشی سے جہلم جا سکتی ہوں۔''

اس نے جھینپتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ دبایا۔

''تم فکر نہ کرو ناہید..... آپا جی کو مزے سے جانے دو..... وہ برسوں بن باس سہہ چکی ہیں۔''

اس رات خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو تھکے ہوئے تھے۔ مارلاک اور انہوں نے مل کر ٹی وی اوا ے کے پروگرام کا زائچہ بنایا تھا۔ خواجہ سلیم بچوں کی طرح آنکھیں کھولے ساتھ ساتھ تھے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں صحن سے ملحق برآمدے میں چارپائی پر سونے کے عادی تھے۔ بچے اندر والے کمرے میں سوتے تھے۔ رات گئے میں نے خاں صاحب کا کندھا ہلا کر کہا۔

"خان صاحب آپا جی لیبیا جا رہی ہیں۔"

"کون سی آپا جی؟"

"آپا فرخندہ۔"

"اچھا تو جائیں۔ سو جاؤ اب۔"

"لیکن؟"

"لیکن کیا سو جاؤ؟"

"وہ ہم اگر..... یعنی اگر ہم 36۔ جی شفٹ کر جائیں تو پھر آپا تسلی سے جا سکتی ہیں۔ ورنہ....."

"بھائی سو جاؤ آخر صبح بھی تو ہوگی ناں۔ تب یہ رنڈی رونا کر لینا۔"

"دیکھیں ناں خاں صاحب! جواد نے دسویں کا امتحان دینا ہے۔ بلال..... بھی پڑھ رہا ہے..... نبیلہ اس کی بے حس خاں اشرف..... اور پھر ان کے نمک خوار جیونی رمضان..... ان کو..... یہ سب کیا کریں گے۔"

"قدسیہ..... ہمارے اپنے بہت مسائل ہیں۔ میں کسی اور کے پھڈے میں کیسے ٹانگ پھنسا سکتا ہوں۔ قدسیہ تمہیں کیا مرض ہے۔ تم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے Commitment کر لیتی ہو..... کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ تفکر بھی ایک چیز ہے۔ مثبت سوچ کا آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو پھر اس کے فیصلے سے نہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے نہ اس کا اپنا حرج ہوتا ہے۔"

میں نے لجاجت سے سر جھکا لیا۔

مجھ میں ایک کمال کی کم عقلی موجود ہے' جو ثابت کرتی ہے کہ میں "رج" کے ناقص العقل ہوں۔ مجھ میں ہر کام کو کرنے کا اس قدر شوق' ولولہ اور Motivation بھڑک اٹھتی ہے کہ میں کبھی نہیں سوچتی کہ کام میرے بس کا نہیں۔ اسی جذبے کے تحت جب میری شادی ہوئی' میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ مجھے روٹی پکانا نہیں آتی تھی' لیکن نہ میں نے سیکھنے کی کوشش کی نہ میری خود اعتمادی میں ہی کمی آئی۔ میں بغیر سوئمنگ سیکھے پانی میں کود جانے والی تھی۔

میں کھکھو ڈیڈی کی خصوصی طور پر شکر گزار تھی۔ انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف میرا اور خاں صاحب کا رشتہ کروایا تھا۔ وہ کھانے پینے کے شوقین تھے۔ مجھے کہنے لگے۔

"کاکی! میرے لیے روٹی پکا..... سالن میرے ڈبے میں ہے۔"

میں باورچی خانے میں گئی۔ حسن اتفاق سے گندھا ہوا آٹا موجود تھا۔ میں نے بے ڈھنگی سی روٹی بیلی۔ قریب ہی گھی کے ڈبے کا بڑا ڈبہ پڑا تھا۔ اس کو روٹی پر گھمایا اور تھوڑا سا تھپ تھپ کر کے روٹی توے پر ڈال دی۔ حسن اتفاق سے کسی فرشتے نے مدد کی۔ روٹی پھول کر کپا ہو گئی۔ میں روٹی لے کر ساتھ والے کمرے میں بھاگی۔

ڈیڈی جی خوب خوش ہوئے..... "دیکھا شتو تو کہتا ہے یہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری منوسب کچھ جانتی ہے۔"

خاں صاحب نے لحہ بھر کو میری طرف دیکھا۔ حیرانی سے روئی پر نظر ڈالی اور چپ ہو گئے۔ وہ میرے
Image سے خوش ہوا کرتے تھے۔

صدیقہ بیگم کا بیاہ جب جاوید طارق خاں سے ہوا تو اس کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی۔ وہ بھی لاڈلی بیٹی تھی
کام کاج سے فارغ رہی تھی لیکن ڈالڈا روٹی پریکٹس میں وہ بھی جلد روٹی پکانا سیکھ گئی۔ (میں نے سری پائے پکانے کیسے
یہ بھی کبھی کھکھوڈیڈی کے حوالے سے بتاؤں گی۔)

جب میں نے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھائی تو مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حروف تہجی کتنے ہیں۔
ڈی میں کون سے حرف Vowels کہلاتے ہیں' لیکن کمر بستہ ہو کر بچوں کو پڑھاتی گئی اور بخدا اچھے خاصے
ماردی۔ انہیں پڑھائی سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ وہ کلاسیں چھوڑ کر بنچ پر باہر بیٹھنے لگے۔ کالج جاتے لیکن باہر
کر آ جاتے۔ اپنے بیٹوں کے تعلیمی مشاغل کی داستان میں پھر کبھی آپ کو سناؤں گی..... اب صرف یہ بتانا مقصود
نے بغیر سوچے سمجھے 36۔ جی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح میرے وعدے کا پاس کیا
مکانی کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

خاں صاحب اس تبدیلی کے لیے ہرگز ہرگز نہ ذہنی طور پر نہ جسمانی اعتبار ہی سے تیار تھے۔ اس وقت
آئی ایس میں چودھری تھے۔ انہیں سمن آباد ڈونگی گراؤنڈ اور 479۔ این سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔

جس روز ہم سب سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن گئے۔ مجھے نئی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا لیکن
صاحب فاروقی کی دکان' درزی جمیل کا درزی خانہ' جہاں سے بچوں کے یونیفارم بنواتے تھے، سبزی والے ماجھے
سبزیوں سے لدے ٹوکرے' بچوں کا سکول' مین سڑک سے ملحق جوتوں کی دکان اور وہ راستہ جس سے وہ کئی برس
موٹر سائیکل سے آتے جاتے رہے تھے اور پھر یہی راستہ جہاں انہوں نے قدرے خوشحال ہونے کے بعد
موٹر سائیکل Lambretta خریدی تھی..... یہ راستے' دکانیں' ہم شکل گھر' ساری بستی کو دل میں بسائے 36۔
ماضی سے سبکدوش ہو کر نیا کورا صفحہ الٹنے کے عادی نہ تھے۔ ہر نئی تحریر کے ساتھ پرانی لکھت ساتھ چمٹی چلی آتی
صحبتیں پیچھے نہ رہ سکیں' اذیت دینے کے لیے ساتھ آ گئیں۔

آپا جی کے پاس جانے سے پہلے غیرت مند پٹھان بچے نے اپنی بڑی بہن سے یہ طے کر لیا کہ وہ
انہیں دو سو روپیہ کرایہ دیتے رہیں گے۔ اسی قدر ماہانہ وہ سمن آباد کے گھر کے لیے دیتے تھے۔

سامان ریڑھوں پر روانہ ہو گیا۔ خاں صاحب کی لائبریری کا سب سے زیادہ فکر تھا۔ تین ریڑھے
اور رسالوں سے لدے تھے۔ محمد علی جو "داستان گو" سے ہمارے ساتھ تھا' ان ریڑھوں کی نگرانی کے لیے سائیکل پر
نہیں کس موڑ پر اور کیسے ایک ریڑھے والا جس پر رسالے لدے تھے' محمد علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سید صاحب
کے سامنے ردی والوں کی جانے کس دکان پر سارے رسالے بیچ باچ کر چمپت ہو گیا۔

سامان کی نگرانی خاں صاحب اور ریاض محمود کر رہے تھے۔ ریاض محمود تب ریڈیو سٹیشن میں سکرپٹ ڈیپارٹمنٹ
میں تھے اور خاں صاحب کے ان چند عقیدت مندوں میں سے تھے جن کا رویہ ہمیشہ ایک سا رہا۔ وہ خاں صاحب کے

ے آتے تھے لیکن پھر بن باس لینے والے جوگی کا دل لگانے شام کو راج گڑھ روڈ سے روز آتے۔ ایسی وفاداری بشرط لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن خاں صاحب میں کوئی عجیب سی گیدڑ سنگھی تھی۔ جو ایک بار ان کے دام محبت میں آتا نہ پھر وہ کبھی رہائی چاہتا نہ اسے رہائی ہی ملتی۔

خاں صاحب سمن آباد چھوڑنا نہ چاہتے تھے، انہیں اس کی سڑکوں سے، مین بازار سے، بانڈرادری، سکول کی گراؤنڈ سے ایک خاص قسم کی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی گھر میں پہلی بار انہیں Norelco کا ٹیپ ریکارڈر ملا تھا۔ یہیں ان کے پاس ذاتی ریڈیو آ گیا تھا۔ اس ریڈیو کی بھی ایک چھوٹی سے کہانی تھی۔ خاں صاحب کو ریڈیو کی ضرورت تھی۔ اپنے پروگرام کو مانیٹر کرنے کے لیے وہ کسی کے گھر جا کر اسے سننا گوارا نہ کرتے۔ کسی دکان پر باقاعدگی سے کی فرمائش نہ کر سکتے تھے۔ اپنا ریڈیو وہ مزنگ روڈ سے چلتے وقت خالد آفتاب کو دے آئے تھے اور اسے خیال بھی کبھی انہیں آ نہیں سکتا تھا۔

پھر رب نے ان کی سن لی۔

ایک روز بھائی ابوالحسن آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا۔ جس پر میڈیم ویو بھی اس طرح آتا تھا گویا کوئی پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ بھائی ابوالحسن پولیس میں تھے اور خاں صاحب کے پنکھے سے ان سے ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ یہاں سمن آباد میں مجھے اس قدر معلوم تھا کہ ایک صاحب جو کھرج میں اور ہر پولیسیے کی طرح دیر تک اپنی بات سمجھانے میں لگا دیتے ہیں' آیا کرتے ہیں۔ کئی بار خاں صاحب کے ساتھ سے آگے نہ بڑھتے۔ کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے اور پھر اپنی جیپ میں روانہ ہو جاتے۔ بعد میں آئی جی پولیس ہو گئے۔ ان کی بیگم سعیدہ جی سے بعد میں میری دوستی ہو گئی..... لیکن ابھی سب کچھ پردۂ غیب میں تھا۔ آئی جی پولیس بھی نہ تھے۔

خاں صاحب ابھی تو اس ماحول کا حصہ تھے جسے بھول جانا خاں صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ 36۔ جی پہنچ کر باہر برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ ان کی نگاہیں سامنے والی نیم دائرہ سڑک پر ہوتیں۔ وہ یہاں سے آباد کی سڑکوں پر جا نکلتے' کبھی وہ مہم کے اس راستے پر جو وایا کتونی سے یونیورسٹی کی طرف جاتا تھا۔ کبھی 1۔ مزنگ روڈ سے کالج والی سڑک پر سائیکل لے کر چلے جاتے..... کبھی مری کی پہاڑیوں پر کھو جاتے۔ ان کے لیے ہر جگہ وقت بن باس بن جاتے جس میں یادوں کے علاوہ کچھ زندہ نہیں ہوتا۔

ہاں ایک تشفی ریاض محمود کی شکل میں موجود تھی۔

وہ شام کے وقت آ جاتا۔ تب اس کی ساعت ٹھیک تھی اور وہ بآسانی خاں صاحب کے ساتھ وقت گزار سکتا تھا۔ وہ ان کی سنتا..... اپنی دن بھر کی مصروفیات بیان کرتا۔ دونوں شعبدہ بازوں کی طرح..... بازی گروں کی مانند کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں چکا چوند پیدا کرتے رہتے۔

کبھی کبھی خاں صاحب کی گہری چپ سے پریشان ہو کر ریاض سوال کرتا۔

"خاں صاحب! کیا بات ہے آپ خوش نہیں لگتے۔"

''یہ قدسیہ کا فیصلہ ہے شاید وہ خوش ہو؟''

ریاض ویسے ہی ایک کان کا آدمی ہے۔ایک کان سے کم سننے کی وجہ سے وہ پوری انفرمیشن کئی بار مس کر جاتا
اسی لیے اس میں بچوں جیسی معصومیت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔

''وہ.....وہ آپا جی تو ہمیشہ خوش رہتی ہیں جی ان کی کیا بات ہے۔''

خاں صاحب لمحہ بھر کو ہولے سے کھنگارے۔ پھر بولے: ''خوش نصیب ہے نہ اس کو کوئی سوال ستاتا ہے
احساسِ جرم کی کبھی شکار ہوتی ہے..... کسی کو قتل کرنے کے بعد بھی وہ راضی خوش رہ سکتی ہے۔''

36-جی، ماڈل ٹاؤن

ماڈل ٹاؤن میں آمد خاں صاحب کے لیے بڑا بوجھل فیصلہ تھا۔ شاید اُن کے لیے خاص طور پر لمبی اور غم انگیز
جی سکھوں کا چھوڑا ہوا چھ کینال پر پھیلا ہوا قدرے بوسیدہ صورت بنگلہ تھا۔ اس گھر کے دو پھاٹک تھے۔ ایک
سکول کے رُخ پر تھا اور دوسرا ماڈل ٹاؤن کی لائبریری کی جانب۔ اس گھر کے سامنے ماڈل ٹاؤن کی دو رویہ

گر اس گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھتے تو سامنے ایک Oval شیپ کی Unkept لان تھی، جس میں
میں تالا ڈالنے کا رواج نہ تھا۔ دائیں جانب سے داخل ہو کر نیم دائرے سے چل کر پورچ آتی۔ اس کے
عہد کی یاد دلاتے۔

پھر تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا، جس میں پنگ پانگ کا میز دھرا تھا۔ جواد، بلال اور میرے بچے یہاں پنگ
کیا کرتے۔ املی کے درخت پر چڑھنا بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ برآمدے کے دونوں پہلوؤں پر ایک
ایک میں جواد رہتا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر ایوب کا کمرہ تھا، جو ابو جی کی تحویل میں چلا گیا لیکن خاں صاحب نے اسے
نہ کیا۔ اسی کمرے سے ملحق ایک غسل خانہ تھا، جس میں سفید ٹائلیں لگی تھیں۔
اس کے ساتھ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں خاں صاحب، بچے اور میں رہتے تھے۔ نانا آ جاتیں تو وہ بھی
کرتیں۔ اس کمرے سے جڑی ہوئی چھوٹی سی پینٹری اور باورچی خانہ تھا۔ ایل شیپ برآمدے سے گھر کے اندر
لیے ایک لمبی گیلری تھی جس میں دائیں ہاتھ پر بیڈ روم سے مشابہ بڑا سا ڈرائنگ روم اور اس کے ساتھ جڑا ہوا
تھا جس میں بلال رہتا تھا۔
جواد اور بلال کے کمروں میں ایک سانجھا دروازہ تھا۔ گیلری ایک طرف تو پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی۔
ایک شاخ ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ ایک غسل خانے کی طرف جاتی تھی، جس میں سفید ٹائلز لگی تھیں اور ٹائلٹ
Squating فلش لگا تھا۔ اس گیلری سے اوپر نیم چھتی کی سیڑھیاں کھلتی تھیں۔

اس نیم چھتی میں خاں صاحب کی ساری کتابیں، رسالے، کاپیاں تہہ در تہہ ڈھیر کردی گئیں اور تعجب کی بات ہے کہ ان کو کبھی الماریوں میں لگانے کا خاں صاحب کو خیال نہ آیا۔ کتابیں عجب کسمپرسی کی حالت میں پڑی رہتیں جس طرح ہر انسان کا ماضی اُسے پکارتا رہتا ہے، ایسے ہی وہ خاں صاحب کی منتظر رہتیں۔

عین ڈرائنگ روم کی پشت پر گیلری کے ساتھ ساتھ دو کمرے تھے۔ ایک تو ہم نے ڈائننگ روم بنالیا اور ساتھ دوسرا کمرہ جو آپا فرخندہ کا تھا، یہ خاں صاحب کی تحویل میں چلا گیا۔ باورچی خانے کا دروازہ، کھانے کے کمرے کا دروازہ اور آپا جی کے کمرے کا دروازہ سمیت گیلری کے دروازے کے ایک بڑے کشادہ برآمدے میں کھلتے تھے، جس میں سیاہ سفید پتھروں کی شطرنج بچھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کھلا صحن تھا جس میں جواد سائیکل پر بچوں کو 'ہوٹے' دیا کرتا تھا۔

برآمدے کے بائیں طرف صحن کے پار ایک کھلا باورچی خانہ اور گودام تھا۔ ہم عموماً اسی باورچی خانے میں لمبے سے میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ صحن میں باورچی خانے کے باہر ایک بڑا سا ٹاہلی کا درخت تھا جہاں جیونی کا دن تلے چولہا جلتا۔ صحن کے پچھواڑے چاروں طرف اونچی دیوار تھی اور عین باورچی خانے سے دوسری سمت غسل خانہ تھا جو جیونی، رمضان کی تحویل میں تھا۔

صحن میں ٹاہلی کے علاوہ دو درخت بیری کے بھی تھے، جن کو نہ جانے کب پھل لگتا۔ کب بیر جھڑتے۔ کون کھاتے کون توڑتا۔ اس غسل خانے کے علاوہ ایک پرانی وضع کا چھوٹا سا بغیر چھت کے نہانے کا غسل خانہ تھا، جس کے ساتھ ہی باہر کی جانب ایک دروازہ کھلتا تھا۔ اس دروازے سے نکل کر کوٹھی کی دیوار سے ملحق تین سرونٹ کوارٹر تھے، جن کے سامنے دو پیڑ آموں کے تھے۔ یہ قلمی آم نہیں تھے۔ ایک اچاری آموں کے کام آتا تھا، دوسرا کھٹا میٹھا سب کھاتے۔ سب کھاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ یہ سائیڈ کچن گارڈن سے مشابہ تھی۔

گھر کے ملازم رمضان، مالی اور جیونی ماسی اس گھر کے کرتا دھرتا ایک قسم کے مالک ہی تھے۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف ایک ہنتھی نلکا تھا، جس سے رمضان بھائی اس کچن گارڈن کو پانی دیتے۔ اثیر خاں ابھی بھائیوں کے ساتھ ڈویژنل پبلک سکول نہیں جاتے تھے۔ وہ جیونی ماسی کے بیٹے خلیل کے ساتھ یہاں ہی کھیلتے رہتے اور ہماری بے خبری کا یہ عالم کہ ہم نے کبھی نہ اثیر کی نگرانی کی نہ اُسے کبھی ٹوکا ہی کہ وہ باہر کوارٹروں کی طرف نہ کھیلے نہ کبھی یہ وہم ہی ہوا کہ وہ کیا سیکھ رہا ہے۔

میں عجب غفلت کی ماری ہوئی ماں تھی۔ مجھ پر ہندو سوچ کا گہرا اثر تھا۔ ہندو مسلمانوں کو ملیچھ اور شودر سمجھتے تھے۔ میرا اپنا تجربہ ہے ہندوؤں کے ہمسائے میں رہ کر میں نے اُن کی برہمن جاتی سے کچھ تکبر بھی حاصل کرلیا تھا۔ میں ہندوؤں کی طرح اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتی اور اپنا کہا منوانے کے چکر میں رہتی۔ وقت Disillusionment کا تھا اور راستہ اسلامی راستہ تھا لیکن میں اسلامی اخوت کا سبق سیکھی ہی نہ تھی۔

میری روح ہندو استری کی تھی۔ میں پتی دھرم اور پتی بھگتی کے مسلک پر کاربند تھی۔ میری ڈکشنری میں ابھی اسلامی شادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ تعدد ازدواج، طلاق، خلع، پسند کی شادی، برابری کا دعویٰ، منفرد حیثیت وغیرہ میرے نزدیک گالی تھی۔ میں گو آواگون کی تشریح کو بھی بخوبی نہ سمجھتی تھی لیکن میرے نزدیک ایک ہی شوہر سے جنم مرن کا ساتھ تھا۔

کے اس پہلو پر یقین رکھتے ہوئے میں پکی Monogamist تھی۔ ممتاز مفتی نے سب سے پہلے میری اس خوبی کو بھانپ کر مجھ پر مضمون لکھا تھا۔

جب تک خاں صاحب گھر رہتے، میں سائے کی طرح اُن کے پیچھے لگی رہتی۔ مجھے ہر لحظہ اُن سے بچھڑ جانے کا رہتا۔ جونہی وہ مرکزی اردو بورڈ چلے جاتے میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہو جاتی۔ بچے سکول سے لوٹتے، باورچی میں بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے۔ پھر ہم چاروں سو جاتے۔ سر پر سے بلا ٹالنے کے انداز میں مَیں اُنہیں کھانے کی میز کے گرد پڑھاتی۔ نہ مجھے اُن کی پڑھائی کا خاطر خواہ علم تھا نہ میں سائنس کے متعلق کچھ جانتی تھی۔

مجھے ان کی تربیت کی کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی۔

1965ء کی جنگ میں جب بھارت کے طیارے گھر کے اوپر سے گزرتے تو میں بچوں کے لیے کبھی خوفزدہ نہ ہوئی۔ خاں صاحب نے اُن دنوں بچوں کو ساتھ سلانا شروع کر دیا اور جب نانا میری والدہ خوفزدہ ملتان سے آئیں اور بچے کو ملتان زمینوں پر لے جانا چاہا تو خاں صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔

میرا حال اپنے لوئر مڈل کلاس کے جہلا جیسا تھا جو ہوائی جہازوں کی Straffing دیکھنے چھتوں پر چڑھ کر نظارہ کرتے تھے۔ جو آج بھی بچوں کی گردنیں کٹوا دیتے ہیں، لیکن دھاتی تاریں پتنگ بازی میں استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ اسی جہالت کے باعث میں نے اپنے بچوں میں خود اعتمادی کا وہ بیج نہ بویا، جو مثبت محنت کا ثمر ہوتا ہے۔

میں نے انہیں مسابقت، آگے بڑھنے اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوئی تربیت نہ دی۔ میں خود غافل، سست وجود اور اپنے شوہر کے بعد اپنی ذات میں مشغول رہنے والی عورت تھی۔ اسی لیے جب میرے بچوں پر ذمہ داریاں پڑیں تو وہ گھبرا گئے اور گہرے حزن کا شکار ہو گئے۔

میں جب نئے گھر 36۔ جی میں پہنچی تو یہاں کے باسی میرے لیے مکمل طور پر اجنبی تھے۔ میں نے آپ کو بور کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ اس نیت سے گھر کا نقشہ بیان کیا ہے کہ مکان کا مکین پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ محلوں میں رہنے والے اور طرح سوچتے ہیں اور جھونپڑیوں کے باسی اپنی سوچ میں کوئی اور زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں۔

آپ شاید اسے طبقاتی تفریق پر محمول کریں لیکن میرے نزدیک در و دیوار، کھڑکیاں، فرش، پردے، ہر وقت ٹپکنے والی چھت، سرکنڈوں کی اُساری ہوئی دیواریں کچھ اور قسم کی سوچ پر مائل کرتی ہیں اور جب انسان مختلف موسم، کسی جگہ، کسی ماحول میں رہتا چلا جاتا ہے تو اس کا رویہ، سوچ اور عمل میں عادت کا عنصر غالب آجاتا ہے۔

سمن آباد اشفاق صاحب کی عادت بن چکی تھی۔ سمن آباد سے بچھڑنے کے بعد دیر تک وہ راتوں کو جاگتے تھے۔ وہ اپنے پرانے ماحول سے بچھڑ کر نئے گھر میں adjust نہیں ہو رہے تھے۔

مجھے خیال آ رہا ہے کہ اشفاق صاحب جب اپنے اصلی گھر رخصت ہو گئے تو سب سے زیادہ میری نیندوں پر اثر ہوا۔ اُن کی بیماری کے دوران میں راتوں کو جاگنے اور بار بار جاگتے رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ بڑی برداشت والے اشفاق صاحب بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے تھے۔ فجر کے قریب جب مریض، چور اور نمازی جاگنے کے عادی ہوتے ہیں میری بھی آنکھ کھل جاتی۔

بستر پر کروٹیں لیتے میں نے کچھ عرصہ بعد نوٹ کیا کہ نماز سے کچھ عرصہ پہلے مسجد کی طرف سے تہجد گز
گزاروں کے ذکر کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگتیں۔ جونہی فجر سے کچھ پہلے نمازی مسجد کے راستے پر آتے۔ ک
جاتے اور بھونکنا شروع کر دیتے۔ سوئے ہوئے کتے عادت کے اس قدر عادی تھے کہ بھونکنا اُن کے شعور کا حص
دن کی دوسری نمازوں کے وقت مسجد کی طرف سے کبھی کسی کتے کی آواز نہ آتی تھی۔

لیکن جب لاشعور کسی عادت میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس عادت کا چھوٹنا محال ہے۔ میں یہ تو نہیں جانت
کا لاشعور کیا انسانوں کی طرح کام کرتا ہے، لیکن اُن کے بھونکنے کی عادت سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ گہر
ہوئے کا اچانک جاگ کر بھونکنا شعوری سطح پر تو ممکن نہیں۔

فجر کی اذان سے پہلے ایک دو ہوائی جہاز جو غالباً مغرب کی طرف عازم سفر ہوتے تھے، ہوا میں گونج چھ
ان کی آواز شیڈول کے تابع تھی لیکن مجھے لگتا جیسے یہ بے جان جہاز بھی گویا کسی عادت کے تحت عین اسی وقت اڑ
ہے۔ ہوائی جہاز، کتے، نمازی، اشفاق صاحب اور میں کسی ایک شیڈول کے عادی ہو چکے تھے اور عادت ہمیں ایک
ایک ہی سمت میں گھسیٹے پھرتی تھی۔ اشفاق صاحب ٹمن آباد کے عادی ہو چکے تھے اور اس نئی جگہ میں وہ کمفرٹیبل نہ

اشفاق صاحب کی بڑی بہن آپا فرخندہ میرے لیے بالکل نامانوس تھیں کیونکہ کبھی اُن کے ساتھ رہ
نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر ایوب احمد خاں ہمارے آنے پر موجود نہ تھے۔ وہ لیبیا جا چکے تھے۔ ان کے متعلق اتنی بات وثوق سے
ہوں کہ وہ بڑے آدمی تھے۔ وہ نہ صرف ایک بڑے ڈاکٹر تھے بلکہ کردار اور سوچ کے اعتبار سے بھی بڑے آدمی کی
فائز تھے۔

مفتی جیسے ایسے معاملوں میں بڑی دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے بڑے لوگوں کو
دور بین نظروں سے دیکھ کر خاکے لکھے تو ان خاکوں میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ ایک روز داستان سرائے میں
اوپر ریکارڈنگ روم میں بیٹھے اپنی کتاب کی کتابت دیکھ رہے تھے تو اثیر ان کے پاس چلا گیا۔ مفتی جی اور اثیر میں
تھی۔ کبھی وہ ان کے پاندان کو چھیڑتا۔ کبھی قلم دیکھنے لگتا۔ کبھی قوام کی بوتل کھول کر سونگھنے لگتا۔ مفتی جی ہولے سے
ہوں'' کہتے لیکن وہ بچوں کو جھڑکنا یا سختی سے منع کرنا گناہ سمجھتے تھے۔

''کیا لکھ رہے ہیں مفتی جی؟'' چھوٹے سے لڑکے نے سوال کیا۔

''یار کتاب لکھ رہا ہوں۔ سیب کا کام ہے سیب اُگانا۔ میں اور کوئی کام نہیں کرتا، بس کتابیں لکھتا ہوں۔''

''یہ کام تو ابو بھی کرتے ہیں۔ آپ کوئی اور کام سیکھ لیجیے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً کرکٹ۔ ہوائی جہاز چلانا۔''

اثیر کی خواہش تھی کہ وہ کرکٹر بنے اور ہوائی جہاز اڑائے۔ وہ اپنی خواہش مفتی جی کو بھی تفویض کرنا چاہتا تھ

''ناں یار۔ یہ تو جوانوں کے کام ہیں۔ میں اس عمر میں کچھ سیکھ نہیں سکتا۔ بس جو آتا ہے وہی کرتا چلا جا
بہت ہے۔''

"کیسی کتاب ہے مفتی جی؟"

"یار خاکے ہیں۔ مثلاً تمہارے باپ کا۔ شہاب صاحب کا۔ تمہاری ماں کا خاکہ۔"

"اچھا، یہ مشکل کام نہیں ہے مفتی جی؟ کیا نام رکھا ہے کتاب کا؟"

"یار ابھی نام سوچھا نہیں۔ نام رکھنا ایک اور مشکل کام ہے۔"

"بڑا آسان کام ہے۔ آپ اس کتاب کا نام "اوکھے لوگ" رکھ دیں۔"

مفتی جی اُٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔

"پالیا...... پالیا۔ اوئے یار تو نے تو میری بڑی مشکل آسان کردی۔ کیا نام ہے "اوکھے لوگ......"

ڈاکٹر ایوب احمد خاں "اوکھے آدمی" تھے۔ اوکھے آدمی کی طرح اُن کی توجہ اپنی خوبیوں، خرابیوں پر نہ تھی۔ وہ سوچے کر گزرتے۔ انہوں نے کبھی نتائج پر غور کرنے کی زحمت نہ کی۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ان کی طبیعت ... مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ جب اُنہوں نے چاہا لندن چلے گئے۔ وہاں ایف آر سی کرنے کے بجائے اسپین ... فوج میں شامل ہوگئے۔ واپس آئے 36۔جی میں منتقل ہوگئے۔ یہاں آٹھ بچوں کے مستقبل سے بے خبر لیبیا ... پھر ایک وقت آیا کہ کچھ بچے اٹھائے اور انگلستان میں ٹیم ورتھ چلے گئے۔

ٹیم ورتھ کے ہسپتال میں کام کیا۔ بڑی خوبصورت خیال آرا کتاب لکھی۔ اسرائیل کے چنگل سے مسلمانوں کو ... کے لیے بھائی ایوب اسپین کی جنگ میں شریک ہوئے۔ جا بجا خط بھیجے لیکن یہ فلسطین کے مسلمانوں اور اسرائیل کا ... تک رانجل نظر آتا ہے۔ ہر اوکھے آدمی کے اندر ایک بے قرار سیلانی روح ضرور ہوتی ہے۔ وہ اطمینان قلب اور ... میں کئی راستوں کی خاک چھانتا ہے۔ بھائی ایوب نے بھی زندگی کے اصل مطالب کی تلاش میں عمر بسر کی۔ ... پر وہ ضرور پہنچ گئے کہ مسلمانوں کی پستی کی ایک وجہ اسرائیل کی تنگ نظری اور اسلام دشمنی ہے۔ وہ کسی طور پر بھی ... کا دوست نہیں بن سکتا۔

بھائی ایوب کو علم نہ تھا کہ چھوٹے شہر میں اُن کی سوچ کے آدمی کی کھپت نہ تھی۔ جلد ہی انہوں نے ایک اور فیصلہ ... اپنی Qualifications کو بہتر کرنے کے لیے لندن سدھارے۔ ڈاکٹر ایوب واقعی ایک بڑے آدمی تھے۔ Lone W... کی طرح راہ حیات میں کچھ اپنے وجدان، کچھ اپنے تفکر کے سہارے چل رہے تھے۔ منزل کا تعین ... نے نہ کیا۔ ان کی نیت اس قدر شفاف تھی کہ غلط فیصلے کے باوجود انہیں کبھی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

انگلستان میں بیرونی حالات نے کروٹ بدلی اور انگلستان دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گیا۔ بھائی ایوب ... بیت پھڑکی اور وہ اسپین چلے گئے، جہاں وہ Fighting Force کا حصہ بن گئے۔ اس طرح چھ سال دونوں ... نے بن باس سہا۔ آپا فرخندہ جو جی جان سے ایوب بھائی کی عاشق تھیں، ماہیِ بے آب کی طرح تقریباً چھ سال ... ہیں۔

حتیٰ کہ جب قیام پاکستان کے وقت بابا جی محمد خاں مکتسر سے لاہور پہنچے تو آپا فرخندہ ساتھ تھیں۔ اسپین میں ... تجربات کی بنا پر ایوب بھائی نے ایک کتاب یہودی لابی کے خلاف لکھی جو جرمنی کے ہولوکاسٹ کی گویا پیش گوئی تھی۔

آج جو کچھ فلسطین میں اسرائیل کے ہاتھوں West Bank میں ہو رہا ہے، اس کی واضح پیش بندی کے طور پر پیش
میں یہاں کتاب کے اقتباسات طوالت کے طور پر پیش نہیں کر سکتی۔

36۔جی پہنچ کر مجھے یہاں کی کئی پہیلیاں سلجھانا پڑیں۔

میں نے ایک دو مرتبہ آپا فرخندہ کے سب سے بڑے بیٹے سجاد کے متعلق پوچھا تو پتہ نہ مل سکا کہ وہ کہاں
اس کے اوقات کیا ہیں۔ بعد ازاں تابش سے پتہ چلا کہ سجاد تو کراچی میں رہتے ہیں اور کسی کے ساتھ مل کر کام کرتے
ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں میں سجاد سب سے خوبصورت ہے۔ چھ فٹ سے کچھ تجاوز کرتا ہوا قد، چھریرا بدن، تیکھے
تیکھے نقش۔ صاحب لوگوں کی طرح گورا چٹا۔ کچھ بھائی ایوب کی رعنائی اور دلکشی، کچھ آپا فرخندہ کا کھویا کھویا سا حسن
وجاہت اور خوبصورتی پر طرہ یہ کہ اپنی خوبصورتی پر بظاہر کوئی گھمنڈ نہیں۔

وہاں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر جانے پر مجھے تابش سے پتہ چلا کہ سجاد نے پڑھائی کو خیر باد کہہ کر کراچی کے
متمول گھرانے کی دراز قد صوفیہ سے شادی کر لی ہے اور وہاں اپنے سسرال میں رہتا ہے۔ اوکھے ڈاکٹر ایوب کا بیٹا
بھی اوکھا نکلا اور روایات شکنی میں اُس نے پہل کی کیونکہ صوفیہ پٹھان بچی نہ تھی۔

بہت سالوں بعد جب میں 36۔جی میں نہیں تھی تو سجاد اپنی بیوی لے کر 36۔جی میں وارد ہوا۔ آپا اور
صوفیہ بظاہر بہت Cordial لیکن اندر ساس بہو کا رشتہ پالے ہوئے تھیں لیکن آفرین دونوں پر کہ کبھی کسی کو اندر کی
نہ لگنے دی۔

جب آپا انگلستان چلی گئیں تو سجاد اور صوفیہ ان کے ساتھ گئے۔ سجاد اور صوفیہ کو اللہ نے تین بچے دیئے
ایلمان احمد خان، الطاف احمد خان اور بیٹی عائشہ۔ میری ان بچوں سے کم کم ملاقات رہی کیونکہ جب ڈاکٹر ایوب خان
میں ٹیم ورتھ میں مقیم تھے تو سجاد اور صوفیہ لندن میں تھے اور ہم یہاں 36۔جی میں۔ سجاد بیکار تھا اور لندن کی ویلفیئر کا
وظیفہ خوار تھا۔ صوفیہ اور سجاد نے ہر چند ساتھ رہنے کی کوشش کی لیکن اوکھے سجاد میں حقیقت سے زیادہ خواب پسندی
اسے ایوب بھائی کی محنت تو نہ مل پائی، ہاں وہ ایسے ہوائی قلعے بنانے میں ماہر ہو گیا جن کی مادی تعبیر مشکل تھی۔

شادی میں طلاق کی وجوہات کو انگلی دھر کر بیان کرنا اور اعداد و شمار سے جانچنا ذرا مخدوش سا کام ہے۔
صوفیہ اور سجاد علیحدہ ہو گئے۔ جب بچے ہوں تو ملنا ملانا تو تقریبات پر ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں بھی بچوں کی شادیوں
پر اکٹھے ہوئے لیکن رجوع مستقل نہ ہو سکا۔

اب کچھ سال پرے سجاد نے ایک ہسپانوی خاتون ایما مارتینتی سے بیاہ کر لیا ہے۔ بقول سجاد ہسپانوی لوگ
خاندانی نظام کے پیروکار ہیں اور ان کی روایات مسلمانوں سے ملتی ہیں۔ سجاد کی ایک بیٹی اور لا یا خامد ہے جو پاکستان آتے
ہی جواد کے بچوں سے گھل مل جاتی ہے اور کسی قسم کی غیریت محسوس نہیں کرتی۔ سجاد حسب عادت ابھی تک ہوائی قلعے بناتا
ہے اور اُن کے ٹوٹنے پر آرام سے آگے نکل جاتا ہے۔

ناہید کا آخری بیٹا میمون اور اس کی بہو اذکا میرے پیارے ملنے والے بچے ہیں۔ ناہید نے میمون کی بیماری
کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے لیکن بالآخر اب میمون صحت مند، خوبصورت اور خوب کام کا انسان ہے، لیکن ناہید

ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا 36۔جی سے اس وقت تعلق نہ تھا جب خاں صاحب اور میں نقل مکانی کر کے یہاں

اصل ہمیں تو نبیلہ کی خاطر ناہید گھسیٹ لائی تھی۔ نبیلہ کا اصل نام تابندہ مجاہدہ تھا لیکن کوئی اس اصلی نام سے
ہے۔ وہ بنیادی طور پر تھوڑی ماؤف دماغ کا شکار تھی لیکن بڑی ہنس مکھ، محبت کرنے والی روح ہے۔ اُسے
ے بڑا شفیق شوہر محمد افضل خاں ملا، جو بھائی ایوب کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور جو وقت بچ جاتا وہ وقت
مانے رانئے'' کہہ کر اس کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتا۔

جب ہم 36۔جی میں شفٹ ہوئے یہاں ناہید اور سجاد نہ تھے۔ 36۔جی میں اس وقت نبیلہ کی ساس، اس کا
خاں اور افضل خاں بھی رہتے تھے جن کی دیکھ ریکھ میری ذمہ داری تھی۔ میرے ہوتے ہوئے تو یہی کنبہ تھا۔ بعد
کے گھر اللہ نے پانچ بچے دیئے۔ وجیہہ، عثمان، فریحہ، عمران، سلمان اور رضوان۔ اس کے علاوہ غازیہ، جواد، بلال
سے 36۔جی بھرا ہوا تھا۔

آپا فرخندہ کی چوتھی بیٹی غازیہ بڑی جی دار ہے۔ اس کی پہلی شادی گھر والوں نے زبردستی خاں صاحب کی خالہ
بیٹے انصار سے کر دی لیکن اس دُھن کی پکی نے اس بندھن کو قبول نہ کیا اور اسے چھوڑ کر نثار سے شادی کر لی۔ یہ
نے پر اُس نے ماریں بھی سہیں، مظالم کا شکار بھی ہوئی لیکن اپنے سچ کو کسی سے چھپایا نہیں اور اس کی بھاری قیمت

نثار کے ساتھ سنجوگ کے بعد غازیہ لندن شفٹ کر گئی جہاں اس کے تین بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی سمیطہ ہے جس
نے پہلے شوہر سے خلع لے کر نام بدل لیا ہے اور اب سحر ارمان کہلاتی ہے۔ جنید خاں جس کی رام کہانی یوں ہے کہ
رائل فیملی کی ایک پرنس سے لندن میں شادی کر لی لیکن نباہ نہ ہو سکا اور اب لندن میں ایک بڑے لارڈ کی سی
سر کرتے ہیں۔ جنید خاں جسے ہم سب جوجی کہتے ہیں۔ ان سے چھوٹے فیضی ہیں جن کا اصلی نام فیصل نثار ہے۔

نثار صاحب کی رام کہانی اب تک یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس لوٹ گئے ہیں اور اس طرح غازیہ کئی دکھ
چھپائے لاہور آتی جاتی ہے، لیکن منہ سے کبھی ایک لفظ شکایت کا نہیں نکالتی۔

جواد کی چھوٹی بہن جو نمبر پانچ پر آتی ہے، آپا جی کی وہ بیٹی ہے جو اس وقت 36۔جی میں موجود تھی۔

تابش بڑی بھلی سی روح ہے۔ پتہ نہیں تابش، جواد اور بلال کس وقت جیوٹی بہن کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے
ب ہو جاتے اور کہاں کہاں پڑ کر سو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے پڑھنے لکھنے میں سرگرداں رہتے۔ ہمیں اپنی
بھی ہم کسی کا کیا پتہ لیتے لیکن سردیوں میں جب پچھلے برآمدے میں دھوپ آ جاتی اور ہم وہاں بیٹھ کر کچھ غسل آفتابی
حل ہو جاتے تو تابش چائے کا ٹرے اٹھا آتی لیکن کئی بار یا تو اُس سے چائے گر جاتی یا دودھ اوندھا ہو جاتا۔

ایک روز جیوٹی نے مجھ سے کہا۔ ''مامی جی ایک دعا کر دیں۔''

''دعا، کیسی دعا؟''

''اس تابش کی شادی کسی ایسی جگہ ہو جائے جہاں آگے اسے خدمت کرنے والا بیٹ مین مل جائے۔ اسے کچھ

کام کرنا نہیں آتا۔''

''شادی سے پہلے کس کو کام آتا ہے جیونی؟''

''ناں جی یہ سیکھ بھی نہیں سکتی۔ اس کا دماغ سیکھنے والا نہیں ہے۔ کوئی فوجی، جس کا کوئی بیٹ مین ہو۔''
خاں صاحب بھی کہا کرتے، کوئی عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا بیٹی کو مل جائے تو نصیب کھل جاتا ہے۔
36۔جی سے چلی گئی اور تابش سے رابطہ ٹوٹ گیا تو پتہ چلا کہ اس نے میجر جاوید اصغر سے شادی کر لی ہے۔ میجر
ناطے اس کے ساتھ ہمیشہ ایک بیٹ مین نتھی رہا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی کہ تابش نے خوب کھانا پکانا سیکھا اور اپنے
کو اپنے سلیقے سے اپنا مداح بنا لیا۔ تابش کو اللہ نے تین بچے عطا کیے۔ انیقہ سب سے بڑی بیٹی جواب جہانزیب
(جیری) کی بیوی ہے۔ اکرام خاں شتو جی کے خالہ زاد بھائی ہیں اور اُسی انصار کے بھائی ہیں جن سے
چھٹکارا حاصل کیا تھا۔

انیقہ سے چھوٹا عمیر انجینئر ہے۔ ان سے چھوٹا حسیب (گولن) ہے جس نے ملک چھوڑنے، واپس
از سر نو پڑھائی کرنے کے بعد ایم بی اے کر لیا۔ آج کل تابش تیرپاؤ پل کے نیچے عسکری فلیٹس میں رہتی ہے
شادی کے متعلق بھی مخدوش خبریں گھوم پھر رہی ہیں۔

بلال بھی 36۔جی کا باسی تھا، لیکن اس سے کم کم ملاقات رہتی تھی۔ جواد اور بلال برآمدے کے بغلی
پڑھنے میں مشغول رہتے اور کبھی کسی مصیبت یا جھمیلے کا باعث نہ ہوئے۔ بلال نے بعد میں ناہید کی دوست
سے شادی کر لی جو پٹھان نہیں تھی اور اس طرح بلال کے ہاتھوں بھی ایک پرانی روایت ٹوٹ گئی۔ اس کی بیوی
بچہ نہ ہوا تو گھر والوں نے پکڑ دھکڑ کر کے اس کی شادی ایک پٹھان لڑکی شمع سے کر دی لیکن بلال اور فائزہ کی محبت
نہ تھی۔ وہ لندن چلے گئے اور شمع واپس اپنے گھر شیخو پورہ لوٹ گئی۔ اب خالدہ اور بلال کے گھر میں ایک بیٹا آ رہا

بلال سے چھوٹا عمر کردار خاں ہے، جس نے ایک انگریز لڑکی Jane سے شادی کر لی ہے۔ ان کے گھر
نے جنم لیا جس کا نام دایان نقش بند ہے اور وہ لندن کا شہری ہے۔

عمر سے چھوٹی مریم ہے جس سے 36۔جی میں ملاقات نہ ہو سکی اور جب ہم دونوں لندن گئے اور
ایوب بھائی کے پاس ٹھہرے تو پہلی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی۔ مریم کا پورا نام مریم شبیہ ہے اور وہ صلاح الدین
بزنس مین کی بیگم ہے۔ ان کے تین بچے سارہ فاطمہ خاں، مغیث الدین خاں اور زوحا خاں ابھی بننے کے عمل میں
اب جب میں 36۔جی میں نہیں ہوں، مریم اور صلاح الدین قریباً روز جواد کے گھر آتے ہیں۔ صلاح الدین کی
بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ عمران خاں کا رشتہ دار ہے اور زمان پارک میں عمران خاں کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔

آپ کو شاید یہ ساری تفصیل ناگوار گزری ہو لیکن اس کو بیان کرنے سے میرا ایک مقصد ہے۔ جب
اور بھانت بھانت کے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے نئے وطن پہنچے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ املاک کے ساتھ
کچھ اپنی آبائی روایات، شناختیں اور رسم و رواج بھی چھوڑ رہے ہیں۔ اللہ اسی طرح تبدیلیاں لاتا ہے۔ کبھی سیلاب

ے سے ہلا کر، کبھی چنگھاڑ سے تباہ کر کے۔ جب کوئی معاشرہ بہت جامد ہونے لگتا ہے تو اسے اللہ ہزار طریق سے بدل دیتا ہے۔

خاں صاحب کے گھرانے میں سب سے پہلی روایت شگفتی خاں صاحب نے کی۔ پھر اشتیاق نے اعجاز بٹالوی کی سے شادی کر کے پٹھان در پٹھان شادیوں کی روایت ختم کی۔ اس کے بعد جاوید طارق خاں آپا فرحت کے بیٹے نے علی کی بیٹی صدیقہ بیگم (جو بعد میں مدیرہ "ادب لطیف" بنیں) سے شادی کی اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

آپا فرخندہ اور بھائی ایوب کے گھرانے میں سجاد، غازیہ، تابش، بلال، عمر کردار خاں نے خاندان میں شادی بہت کو اتھل پتھل کر دیا۔ صرف جواد، ناہید اور مریم ہی ایسے تین بچے تھے جنھوں نے باپ دادا کی روایات کا بھا اور ذاتی خواہشات کو کبھی خاندانی فیصلوں پر حاوی نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر جواد ساجد اپنے والد ایوب احمد خاں کے قریب تر ہے۔ وہ بڑا نامور ہارٹ سرجن ہے اور .P.I.C ہسپتال ہے۔ اس نے ستارہ امتیاز اور الہلال بھی حاصل کیا ہے اور ساتھ ساتھ وہ بڑی آدرشی روح ہے۔ اپنی والدہ نے لاہور سے بیس پچیس میل دور شیخوپورہ کے پاس ایک رفاہی ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ہر اتوار کو وہ چند ٹولی لے کر یہاں چلا جاتا ہے اور قریبی دیہاتوں کے غریب دیہاتی جوق در جوق آتے ہیں اور اس سے دور ہسپتال میں ان ڈور مریض بن کر بھی رہتے ہیں۔

جواد کے ساتھ اس کی ہمت والی خوبصورت بیوی عظمیٰ بھی جاتی ہے اور ہر کام میں جواد کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ جواد ہیں جن کا ہیرو یا رول ماڈل کیپے جواد ہے۔ مریز جو آسٹریلیا میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ پنکو (ماہم نقش بندی) ڈاکٹر بن رہی ہے۔ شنڈرے (نقش بندی) جو لاہور میں میڈیسن کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سب سے چھوٹا نقش بندی جو ابھی سکول تک پہنچا ہے اور صبح اٹھنے میں حیل وحجت کرنے کا عادی ہے۔

اپنے کام میں گہری دلچسپی، آدرشوں سے لگاؤ کے علاوہ جواد اپنے نقش بندی ہونے پر بہت فخر کرتا ہے۔ اسے ہونے پر مان نہیں بلکہ وہ بھائی ایوب خاں کے آباء پر فخر کرتا ہے جو بہت بڑے صوفی فقیر تھے۔ مشرقی پنجاب میں اس مزار کی آرائش از سر نو کی گئی۔ سکھوں نے جواد کو بلایا اور بڑی عزت و احترام سے اسے گدی نشینی عطا کی۔

لیکن یہ تب کی باتیں نہیں ہیں جب میں 36۔ جی میں آئی تھی۔ یہ تو 2007ء کی داستان ہے۔ تب جواد بھی نابالغ تھا۔ ابھی اس نے دسویں جماعت پاس کرنا تھی۔

میں نے آپ کا تعارف 36۔ جی کے مکینوں سے بڑی تفصیل سے کرایا ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ بڑا اضافی لگے لیکن میں نے دانستہ کچھ وجوہات کی بنا پر اس تفصیل کو اپنایا ہے۔ حسنِ اتفاق سے آپا فرخندہ کے گھرانے میں ایسے افراد پیدا ہو گئے جو قابل ذکر ہیں جن کے متعلق معلومات جمع کرنا غالباً اتنا سہل بھی نہیں۔ ڈاکٹر حسنات احمد، ڈاکٹر عزا ایوب اپنی اپنی جگہ۔ پر اور عوامی مقبولیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔

ناہید کے بیٹے ڈاکٹر حسنات کو تو لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت انٹرنیشنل شہرت دے گئی۔ پرنس چارلس سے کے بعد ڈیانا بیگم بڑے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے دل کے دورے تو نہ پڑتے تھے لیکن احتمال غالب تھا کہ

ڈیانا کا دل متاثر ہو چکا تھا۔ اسی سلسلے میں ڈیانا ہیر سمتھ ہسپتال میں داخل ہوئی جہاں ناتی ان دنوں دل کے عارضہ
تھا اور ڈاکٹر مگدی کی شاگردی میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔
ڈیانا کے دل کا عارضہ تو جاتا رہا لیکن ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ کچھ عاشقی، ستائش اور للّن میٹی کا انداز اختیا
ڈیانا بیگم باقاعدگی سے حسنات ناتی کے گھر آنے جانے لگی۔ ڈاکٹر حسنات احمد جسے گھر والے ناتی پکارتے ہیں
اپارٹمنٹ تبدیل کرنے کے چکر میں تھا۔ ڈیانا دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر ناتی کی کتابیں، تکیے، چادریں اور
سامان اوپر سے نیچے پھینکتی جاتی۔ نیچے ناتی اسے بازو پھیلائے کیچ کرتا۔ حسنات کی زندگی میں محبت کیونکر آئی اور کیسے
زندگی الجھا کر چلی گئی۔ اس پر کئی کتابیں رقم ہو چکی ہیں۔ ڈیانا کی سائیکو تھر بسٹ کی کتاب اس سلسلے میں بڑی
مغربی میڈیا کسی مسلمان کو بخشا نہیں کرتا۔

کھیل کھیل میں، مدد مدد کے چکر میں دونوں بہت قریب آ گئے، لیکن حسنات کے منہ سے اظہار کا
نکلا۔ آپ ان پٹھان زادوں کو کمینہ یا ازحد محتاط کہہ سکتے ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ حسنات اپنے گھر والوں
خاندانی روایات کو توڑنا نہ چاہتا تھا۔ ایسے میں ڈیانا نے پہل کی۔ اس نے آپا فرخندہ کو خط لکھنا شروع کر
صاحب سے رابطہ قائم کیا۔
خاں صاحب نے ڈیانا سے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں ڈیانا اور حسنات کے تعلق کو بے نقاب کر
تھی لیکن یہ نقاب کشائی کافی نہ تھی۔ حسنات کی وجہ سے میں نے اس کے خاندان کی تفصیلات جہاں تک مجھے معلوم
آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کون جانے ڈاکٹر جواد جوان دنوں ہارٹ کے ہسپتال .P.I.C کے چیف
ایوب احمد خاں جو اپنی جگہ بے حد اہم انسان تھے، کب ان تفاصیل میں سے کونسی ٹکڑی ان بڑے لوگوں کی زندگی
حاصل کرے اور ان لوگوں کی زندگی کی جگہ سول پزل میں عین گم شدہ مقام پر اہم Clue بن جائے۔
دوسری بڑی وجہ اس تفصیل بیان کی میرے نزدیک یہ ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں، ہجرت کرنے
ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ اپنوں میں اس قدر گندھے ہوئے رہتے ہیں کہ ہر رشتہ چاہے وہ دور ہی کا کیوں نہ ہو
اہمیت کا حامل رہتا ہے اور اسے توڑنا یا گزند پہنچانا ان کو احساس جرم میں مبتلا کرتا ہے۔ حسنات نے بہت کرب
گزاری لیکن اپنے گھر والوں کا دل نہ توڑا۔ خاندانی روایات کی پاسداری کی۔ خاں صاحب برسوں تضاد کا شکار
پٹھانوں کی روایات ان کے ہاتھوں چکنا چور ہو گئیں۔ شاید جس کا رنج انہیں تاحیات رہا۔ شاید کبھی کسی مقام پر
میں یہ تفصیلات اس لحاظ سے بھی اہم ہو جائیں اور آپ اُس بات کی تہہ تک پہنچ پائیں جس تک میری رسائی نہ ہو سکی
آپا فرخندہ خاندان کی ذمہ داری کے بعد جو پہلا ذہنی حادثہ ہمیں پیش آیا وہ 1965ء کی جنگ تھی۔
نہ تھا کہ بھارت کے دل میں اس قدر پاکستان دشمنی ہے۔ وہ طاقت کا ازلی ہتھکنڈہ استعمال کر کے مسائل سے
پاکستان کی بانہہ مروڑ دینا چاہتا تھا تاکہ از خود ہم اُس کے غلام بن جائیں اور خود ہاتھ جوڑے اُس کا اکھنڈ بھارت
پورا کر دیں۔

لیکن بھارت کو نہ تب علم تھا اور نہ آج تک اُسے سمجھ آئی کہ اعمال ہمیشہ نیتوں کے ڈانڈوں پر تولے جاتے ہیں۔
دینے والے کی نیت میں کھوٹ نہ تھا۔ اسی لیے باوجودیکہ ہم نے بطور قوم اس نعمت کی حفاظت نہیں کی، لیکن اللہ
نے خیراں" رکھے گا۔
میں آپ کو بتا رہی تھی کہ 1965ء کی جنگ جاری تھی۔ لاہور کے کلچرل باسی ہوائی حملوں کو بھی کوئی کلچرل شو سمجھ
بیٹھے۔ اوپر سے جہاز گولیاں برساتے اڑتے، لاہور کے پتنگ باز جیالے کوٹھوں پر چڑھ کر نعرے لگاتے۔
ریڈیو سٹیشن ان دنوں بہت سرگرم عمل تھا۔ ساری میڈیا جنگ یہیں سے ہو رہی تھی۔ اشفاق صاحب کا
پروگرام زور و شور سے چل رہا تھا۔ میں بھی کچھ شامل باجہ رہتی تھی۔ ان دنوں سٹوڈیوز میں ملکہ ترنم نور جہاں سے
روزانہ وہ قومی ترانے باقاعدگی سے گایا کرتی تھیں۔ جس روز میری نور جہاں سے پہلی ملاقات ہوئی، وہ سٹوڈیو
میں ریکارڈ کر رہی تھیں۔
"ماہی رنگ رنگیلا ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی"
اس کے بعد "تلقین شاہ" کی ریکارڈنگ تھی۔ خاں صاحب اور میں دروازہ کھول کر اندر گئے اور چپ چاپ
بیٹھ گئے۔ سامنے سفید ساڑھی میں ملبوس برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرح اللہ کا ایک خوبصورت منظر کھڑا تھا۔
باوجود اُس کے حسن میں کہیں کمی نہ تھی۔ بالوں میں ایک سفید پھول، ہاتھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں، گلے
میں بالیاں...... نور جہاں مکمل طور پر نسوانیت کی پوری طاقت سے لیس ترغیب کی ایک تصویر تھی۔
"ماہی رنگ رنگیلا...... ہائے نی جرنیل نی کرنیل۔"
کچھ دیر بعد سازندوں کو جھڑکیاں عطا ہوئیں۔ سارنگی نواز تار ٹھیک کرنے لگا۔ طافو ہتھوڑی لے کر طبلے کی جوڑی
میں مشغول ہو گیا۔ چائے آ گئی۔
نور جہاں خاں صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
"آغا جی یہ صوفی صاحب تو غضب کے قومی ترانے لکھ رہے ہیں۔" نور جہاں نے کہا۔
"بھائی ہمارے استاد ہیں۔ وہ نہیں لکھیں گے تو اور کون لکھے گا۔"
میری نگاہوں میں کالج کا وہ زمانہ گھوم گیا جب صوفی صاحب ایم اے کی کلاس میں ہم شاگردوں سے غالب کی
غزلیں کھڑے ہو کر باری باری با آواز بلند پڑھوایا کرتے تھے۔
نور جہاں نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کاٹھ کباڑ سے لدے گودام کو دیکھ رہی ہو۔
"یہ آپ کی بیگم ہیں آغا جی۔" وہ خاں صاحب کو ہمیشہ آغا جی کہتی تھی۔
"بالکل۔ کوئی شک ہے؟"
میں نے ہمیشہ کی طرح سفید لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا اور جسم پر ایک شادی کی انگوٹھی
کے سوا کوئی زیور نہ تھا۔
"ہائے ہائے ننگی بچی...... اتنا سادہ بے رونق لباس اور بھائی! تم کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ میک اپ کرو تو

آغا جی کی جوڑی بھی سجے۔ اتنے خوبصورت آدمی کی بیوی۔''

وہ چپ ہوگئی جیسے میری دلآزاری کا خیال آ گیا ہو۔

''دیکھو بی بی، تمہارا شوہر پاکستانی تو لگتا نہیں۔ اطالوی لگے تو لگے۔ اس کے ساتھ تو......''

وہ پھر خاموش ہوگئیں۔ میں نے دل ہی دل میں جملہ مکمل کرلیا۔ ایسے خوبصورت اطالوی مرد کے ساتھ نظر بٹو بھی تو درکار ہے ورنہ اسے تو قدم قدم پر نظر لگنے کا خدشہ ہے۔ بہر کیف اپنی لاٹری نکل آنے پر میں خوش واپس آئی۔

جنگ کے یہ دن ہر پاکستانی پر بھاری تھے۔ خاں صاحب رات کو سوتے وقت انیق اور انیس کو دائیں اثیر کو سینے پر لٹا کر سوتے۔ انہیں اپنا خوف تو شاید نہ تھا لیکن سوچتے ہوں گے، ابھی 1947ء کو بھولے نہیں اور پھر؟ نہ جانے اس جنگ میں کون کس سے بچھڑ جائے۔

پھر اچانک نانا آ گئیں۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا ''شفقو! اب لاہور میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں میرے ساتھ ملتان کی زمین پر چلو گے۔ زمین ملتان سے بھی اتنی دور ہے کہ جنگ کے اثرات محسوس نہیں ہوں گے۔

''نانا جی! آپ قدسیہ اور بچوں کو لے جائیں۔ میرا جانا تو مشکل ہے۔ میں تو ''تلقین شاہ'' سے بندھا میں نے خاں صاحب کو چھوڑ کر جانا منظور نہ کیا اور نانا بچوں کو لے کر ملتان چلی گئیں، جہاں بچوں نے ٹیوب ویل ٹریکٹر پر بیٹھ کر، کھیتوں میں سے کچی سبزیاں توڑ کر ایک لمبی پکنک منائی۔

اسحٰق بھائی بھی جنگ کے دوران دو تین مرتبہ بڑے متوحش آئے اور مشورہ دیا کہ ہم واقعی گاؤں چلے لیکن خاں صاحب بڑے مؤدب طریقے سے خاموش ہوگئے۔ اسحٰق بھائی ذکیہ اور بچوں کے ساتھ ہری پور چلے گئے۔

ان ہی دنوں جب ریڈیو سٹیشن سے رابطہ گہرا ہوا۔ مجھے صابرہ سلطانہ ریڈیو سٹیشن پر ہی ملیں۔ صابرہ بہناپا ہوگیا۔ صابرہ سلطانہ میاں عابد الحق کی دوسری بیگم تھیں۔ میاں صاحب بھاری بھرکم گورے چٹے سید تھے میں بڑی برداشت تھی۔ اُن کے بیٹوں نے صابرہ آپا کی بیٹی روحی اور انہیں برداشت نہ کیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں زمینوں میں اپنا حصہ بخرہ نہ ثابت کردیں۔ اس سلسلے میں ہمیشہ کی طرح اُنہوں نے میاں صاحب کو بڑے دبا یہی شرط پیش کی کہ صابرہ آپا کبھی نرئی نہیں جائیں گی۔

میاں عابد الحق کا گاؤں کاکاخیل سوات کی سڑک پر مردان سے کوئی سولہ میل دور تھا۔ روحی کے بڑے بھائی شمس کاکاخیل کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ صابرہ سلطانہ اُن کی جائیداد ہتھیانے کے لیے دوسری بیگم حالانکہ اس معاملے میں صابرہ بڑی درویش تھیں۔ میاں عابد الحق کے آباء میں کاکاخیل ایک بڑے صوفی بزرگ ہیں۔ نوشہرہ کے قریب اُن کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر میاں صاحب کے گھرانے کے شمولیت کرتے ہیں۔

صابرہ سلطانہ بڑی گئو عورت تھیں۔ باوجودیکہ وہ بھی پٹھان والد کی بیٹی تھیں اُن میں غصہ، طیش بھڑک اٹھنا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی ساری کائنات روحی بیگم تھیں، جنہیں انہوں نے Jesus & Mary

...کو بچے میں تعلیم دلوا کر یونیورسٹی میں پہنچایا۔ اس ساری تگ ودو میں اُن کی ذاتی خواہشات راکھ ہوگئیں۔
...یہی دنوں جب آرٹسٹ لوگوں کی ریڈیو پاکستان پر گہما گہمی تھی، ایک روز خاں صاحب ''آج اور آج کا دن'' ...گئے۔ اس پروگرام میں وہ ہر روز بتایا کرتے تھے کہ آج کس بڑے آدمی کا جنم دن تھا۔ کس ملک کو آج کے روز ...کسی تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاریخ سے نوجوان سامعین کا رشتہ جوڑنے کا یہ انوکھا طریقہ بھی خاں صاحب کے ...ایک چنگاری تھی۔

...یو میں صابرہ کے ساتھ اُن کی بیٹی روحی موجود تھی۔ آپا صابرہ نے خاں صاحب سے تعارف کرایا۔

...خاں صاحب! یہ بچی ہے۔ جیسس اینڈ میری سکول میں پڑھتی ہے۔ بڑی ذہین ہے۔''

...اچھا۔ پھر تو تمہیں مبارک ہو۔ میں قدسیہ کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔''

...آپ کہاں محلہ میں ہمارا گھر ڈھونڈتے پھریں گے، ہم ہی آجائیں گے۔''

...جب صابرہ نے اپنا اتہ پتہ بتایا تو اپنی طبعی فراست کے باعث خاں صاحب چند لحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ ...ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کسی کو مشورہ دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ روم میں میری لینڈ لیڈی کہا کرتی تھی۔ ہر انسان کو ...رکھنے کا اختیار ہے۔ یہی اصلی جمہوریت ہے لیکن میری رائے ہے کہ اتنی ماڈرن تعلیم کے ساتھ اس کو کسی کھلے ...جگہ کی ضرورت ہے۔ جب اس کی سہیلیاں وزٹ کے لیے آئیں تو اُن پر کوٹھی، باغ کا اچھا تاثر ہو۔''

...خاں صاحب کو علم نہ تھا کہ وہ وقت سے بہت پہلے معیار زندگی کے حق میں ووٹ دے رہے تھے۔ مغربی ترقی ...متعلق اُن کا نظریہ مثبت تھا۔ تو یہیں کسی گھڑی کی بات دل پر اثر کر جاتی ہے۔ صابرہ آپا پر بھی خاں صاحب کی بات کا ...ہوا۔ ...ایچ بلاک میں گھر لے کر آ بیٹھیں۔ روحی اور اُن کے پاس زیتونی رنگ کی فوکسی تھی جسے میاں صاحب کا ایک ...پوتا نصیر چلایا کرتا تھا۔ مجھے اور خاں صاحب کو بالکل علم نہ ہوا کہ کب اور کس دن صابرہ آپا نے مکان بدلا۔ بس ...فوکسی میں صابرہ اور بچی آ گئیں۔ ہم دونوں کھانے کے کمرے میں 36۔جی کی گیلری میں دائیں ہاتھ بیٹھے کھانا ...کھانے والے تھے۔ آپا صابرہ ٹرے میں بڑے اعلیٰ مرغی کے تکے، کباب، شوربہ مع سرویٹ کانٹے چھری کے لے کر ...آئیں۔ ...ان کی سروس اور صفائی قابل داد تھی۔

''بڑا اچھا ہوا۔ اشفاق بھائی! آپ نے کھانا شروع نہیں کیا۔ میں آپ کے لیے مرغی کے یہ تکے بنا کر لائی ...خاں صاحب ہمیشہ کھاتے ہیں۔''

''اتنی دور سے کھانا لے کر آئی ہیں آپ۔ غضب کر دیا صابرہ۔''

''دور کہاں۔ میں تو کبھی کی ایچ بلاک میں شفٹ کر گئی ہوں۔''

''کیا؟..... کیا کہا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''لو قدسیہ جی۔ اب تو ہم ایک طرح سے آپ کے پڑوسی ہو گئے۔''

''لیکن آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''بچی کہتی تھی کسی دن surprise دیں گے۔ انکل کو surprise اچھا لگتا ہے۔''

پتہ نہیں صابرہ اس تبدیلی سے خوش تھی کہ نہیں لیکن کٹی کھلے درختوں والے ماڈل ٹاؤن میں ایک آزاد پرندے کی طرح لمبی اڑانوں کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

جنگ اور آپا صابرہ کے بعد جو نئی تبدیلی ہمارے نظامِ زندگی میں آئی، وہ خاں صاحب کی مرکزی اردو بورڈ میں تقرری تھی۔ عین 17 جون 1967ء کو خاں صاحب کو قدرت اللہ شہاب نے بیسویں گریڈ کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ شہاب صاحب ان دنوں سیکرٹری ایجوکیشن تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لندن میں انڈیا آفس کی میموریل لائبریری کا ڈائریکٹر انشا جی کو بنا دیا۔ پتہ نہیں یہ اعزاز ان اداروں کا تھا کہ انشا جی اور خاں صاحب کا لیکن ان دونوں حضرات نے خوب کام کیا۔ اتنی کتابیں خاں صاحب نے چھاپ دیں کہ آج تک اردو بورڈ ان کتابوں کی رائلٹی کھا رہا ہے۔ خاں صاحب کی پوسٹنگ 1967ء سے 2 جولائی 1989ء تک بیسویں گریڈ میں رہی۔ پھر بینظیر صاحبہ تشریف لائیں۔ تلقین شاہ کے پروگرام سے ناخوش ہو کر انہوں نے خاں صاحب کو اردو بورڈ سے معطل کر دیا۔ ساتھ ہی تلقین شاہ بھی ریڈیو سے چلا گیا۔ پھر 26 مارچ 1991ء کو دوبارہ اشفاق صاحب کو اردو بورڈ کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا اور بائیسواں گریڈ بھی۔ یہ مہربانی جناب نواز شریف نے کی تھی اور بڑی معذرت کے ساتھ کہا تھا: ”مجھے افسوس ہے اشفاق صاحب! سیاسی لوگ اپنے محسنوں کو نہیں جانتے۔ انہیں معلوم نہیں کہ آپ ایک Living Legend ہیں۔ آپ جیسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ ہمیں ان لوگوں کی قدر کرنی چاہیے جو قوم کا رول ماڈل ہیں۔ چاہے ہمارا آپ کا مسلک ایک نہ بھی ہو۔“ نواز شریف کی مہربانی سے خاں صاحب 26 مارچ 1991ء سے 12 جون 1993ء تک اردو بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل رہے اور بائیسویں گریڈ تک جا پہنچے۔ ہماری انا کے لیے یہ ترقی بڑی ہی تسلی بخش تھی اور گو ہم ایک دوسرے سے بھی اس کا ذکر نہ کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر اس جیت پر پھولے نہ سماتے تھے۔

آپا صابرہ، اردو بورڈ کے علاوہ ایک اور بھی تازہ پانی ہماری زندگی میں شامل ہوا۔ یہ ریاض محمود تھے۔ ان کا تعارف ان ہی کی زبانی سنیے۔ ان کا ذاتی مضمون ملاحظہ کیجیے۔

جب میں نے ہوش سنبھالی تو ہم لوگ احاطہ فیروز دین فلیمنگ روڈ میں رہتے تھے۔ ہمارے اور موصوف اختر شیرانی صاحب کے گھر کی دیوار مشترک تھی۔ میری والدہ ایک میز پر کھڑی ہو جاتیں اور دوسری جانب سے بیگم شیرانی بھی میز پر کھڑی ہوتیں۔ دونوں خواتین گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔ اکثر میں دیکھتا کہ بیگم اختر شیرانی رو رہی ہیں اور میری والدہ انہیں تسلی دے رہی ہیں۔ میں والدہ سے بعد میں پوچھتا کہ بیگم اختر شیرانی کیوں رو رہی تھیں تو وہ بات اِدھر اُدھر کر جاتیں۔ اختر شیرانی صاحب کا ایک بیٹا میرا ہم عمر تھا۔ ہم اکثر اُن کے گھر جاتے۔ وہاں جانے میں تین کشش تھے۔ ایک تو دوست سے ملاقات۔ دوسرے دوست کی ٹرائی سائیکل چلانے کا مزا اور تیسرے گرمی کے دنوں میں خوشبو بھرا صندل کا شربت جس کا ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

احاطہ فیروز دین میں ایک کنواں تھا جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوا کرتا تھا۔ کنوئیں کے ساتھ ہی مسجد تھی اور نمازی اسی کنوئیں کے پانی سے وضو کیا کرتے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری دنوں تک میں خواب دیکھتا رہا

کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے ڈول ڈالا۔ ڈول بھر گیا، میں پانی نکال رہا ہوں کہ ڈول بھاری ہونے کی وجہ
کنوئیں میں گر گیا ہوں۔ یہ خواب عرصے تک مجھے پریشان کرتا رہا لیکن اب کئی سالوں سے نہیں۔

میری پیدائش 2 جولائی 1936ء کی ہے۔ 1941-42ء میں جبکہ میں پانچ چھ سال کا تھا، دوسری جنگ عظیم
تھی۔ احاطہ فیروز دین میں صرف فیروز دین صاحب کے گھر میں ہی ریڈیو تھا۔ شام کو احاطے کے سب لوگ حاجی
بیٹھک میں جمع ہو جاتے اور ریڈیو پر خبریں سنا کرتے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ حاجی صاحب کی بیٹھک
اس لیے نہیں کہ مجھے خبروں میں کوئی دلچسپی تھی، بلکہ اس لیے کہ حاجی صاحب گھر آئے مہمانوں کی تواضع
فروٹ کیک سے کیا کرتے تھے۔

ان دنوں چائے سے تو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی البتہ فروٹ کیک میں بڑے شوق سے کھاتا۔ دوسرے وہاں جانے
غرض یہ تھی کہ میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو ریڈیو کے اندر بیٹھ کے خبریں پڑھا کرتا تھا۔ میری وہ خواہش تو پوری
پھر ایک دن ایسا آیا کہ میں خود ریڈیو کا حصہ بن گیا۔

میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے کسی انگریزی سکول سے تعلیم دلوائیں۔ اسی خواہش کے پیش نظر انہوں
سن روڈ کے ایک سکول میں داخل کروا دیا جس کی پرنسپل، مالک اور ٹیچر ایک بوڑھی سی یورپین لیڈی تھی۔ یہ سکول
اخبار کے ساتھ والی گلی کے آخر میں واقع تھا۔

سکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی تھی جبکہ وہاں پرنسپل صاحبہ کے خرگوش اور ان کا بیٹا دن
کرتے تھے اور ہم بچے کلاس روم میں سے انہیں دیکھا کرتے تھے۔ اچانک پرنسپل صاحبہ نے لندن واپس جانے کا
سکول بند ہو گیا اور مجھے میاں شاہ ابوالمعالی کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا، جو لاہور ہوٹل کے عقب
تھا۔ اسی سکول میں ہمیں ایک دن کھانے کے لیے لڈو دیئے گئے اور بتایا گیا کہ اتحادیوں کو دوسری جنگ عظیم میں
ہے۔

شاہ ابوالمعالی پرائمری سکول سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد میں نے وطن اسلامیہ ہائی سکول میں جو کہ
کالج سول لائنز سے ملحق تھا، پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں تحریک پاکستان زور و شور سے جاری تھی۔
ہم پانچویں جماعت کے طلبا کو علم ہوا کہ آج ایک جلوس اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرہ کرے گا۔ میں اور میرا دوست
بھی سکول سے بھاگ کر اس جلوس میں شرکت کے لیے جا پہنچے۔

ہمارے سامنے ایک شخص نے اسمبلی کی عمارت پر چڑھ کر یونین جیک کو نذرِ آتش کر دیا۔ پھر ایک بھگدڑ سی مچ
ہماری آنکھوں میں جلن ہونے لگی اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ایک بھلے مانس نے ہم بچوں کو بھگدڑ میں دیکھا تو دو
مال دیتے ہوئے کہا کہ بچو! بس اب فوراً گھر کو بھاگ جاؤ۔

1947ء کے فسادات بڑے ہولناک تھے۔ اکثر سڑکوں پر لوگوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ عمارتوں کو آگ لگا
اور ہم چھتوں پر چڑھ کر جلتی ہوئی عمارتوں سے نکلنے والا دھواں دیکھا کرتے تھے۔

میرے بڑے بھائی کی شادی فیروز پور کے ایک پٹھان خاندان میں ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لوگ

فیروز پور سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ میری بھابھی کے نام سے رحمان پورہ میں ایک کوٹھی الاٹ کروالی گئی اور ہم ستمبر 1947ء کے آخر میں رحمان پورہ منتقل ہو گئے۔

میرے والد ریلوے میں ملازم تھے لیکن بعد میں نوکری چھوڑ کر کاروبار کرنے لگے۔ ہم تین بھائی تھے، بہن نہ تھی۔ 1948ء میں میری بھابھی جن کا نام نسیمہ تھا، انتقال کر گئیں۔ اُنہیں تپ دق تھی اور اس زمانے میں اس مہلک مرض کا سوائے موت کے کوئی علاج نہ تھا۔ بھابھی کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں اکثر خواب دیکھتا کہ وہ مری نہیں ہیں بلکہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ قبر میں دبانے کے بعد وہ ہوش میں آ گئیں اور اپنے اوپر پڑی مٹی ہٹا کر کفن میں ملبوس ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہی ہیں۔ خوف سے میری آنکھ کھل جاتی۔ دل زور سے دھڑکتا اور رات کا باقی کا حصہ میں جاگ کر گزارتا۔

پڑھائی میں مَیں کچھ ایسا اچھا نہیں تھا لیکن جیسے تیسے کر کے میں نے 1953ء میں میٹرک کر لیا۔ اُنہی دنوں والد صاحب کو کاروبار میں پے در پے گھاٹوں اور کچھ کاروباری ساتھیوں کی بددیانتی کی وجہ سے کٹھن مالی مشکلات میں گھرا رہا تھا۔ میرا داخلہ ایف سی کالج میں ہو گیا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ داخلہ فیس دینے کے لیے والد صاحب کے پاس پیسے نہیں تھے۔ چنانچہ میں پڑھائی چھوڑ کر والد صاحب کے ساتھ کام کرنے لگا۔ ایم اے تک تعلیم میں نے بعد میں حاصل کی۔

میرے ننھیال والے انارکلی میں رہتے تھے جہاں ان کی بہت جائیداد تھی، لیکن نسل در نسل بٹنے اور پھر جائیداد فروخت کر کے کھلے علاقوں میں رہائش اختیار کر لینے کے باعث اب وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب انارکلی میں اپنی پڑنانی سے ملنے اپنی والدہ کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ ہم سب اُنہیں ماسی وڈی کہا کرتے تھے۔ وفات کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار سے ملحق قبرستان میں دفن ہوئیں۔

میرے سگے ماموں اور دوسرے کئی رشتے دار قیامِ پاکستان سے قبل ہی رحمان پورہ، اچھرہ، معراج بلڈنگ اور فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ کے سامنے آن بسے تھے۔ ہم لوگ فلیمنگ روڈ سے اُنہیں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بسیں، رکشے یا ویگنیں تو ہوا نہیں کرتی تھیں۔ تانگے ہی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام کرتے تھے۔ جب ہم فلیمنگ روڈ سے فیروز پور روڈ یا رحمان پورہ آتے تو سالم تانگہ بارہ آنے کا ملتا تھا۔

1960ء میں مَیں نے ریڈیو جوائن کیا اور یہیں میری ملاقات اشفاق احمد صاحب سے ہوئی۔ ''گڈریا'' پڑھ چکا تھا اور مصنف کے اندازِ بیاں کا معترف تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر اشفاق احمد صاحب کا آنا جانا اکثر رہتا۔ وہ ان دنوں ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے ایڈیٹر تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ''لیل ونہار'' چھوڑ کے ریڈیو لاہور کے ساتھ بطور سکرپٹ رائٹر وابستہ ہو گئے۔ اُن دنوں ان کے پاس بھی سکوٹر تھا اور میرے پاس بھی۔ ہم لوگ دفتر سے نکلتے۔ سڑکوں پر رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ سکوٹر چلاتے مزنگ چونگی پہنچتے۔ عثمان کی دکان سے سانچی پان خرید کر کھاتے۔ گپیں لگاتے اور شام کے سائے گہرے ہونے کے بعد وہ سمن آباد اور میں رحمان پورہ کی راہ لیتا۔

1965ء میں اشفاق صاحب سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہو گئے اور بعد میں انہوں نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا گھر بنا لیا۔ 1966ء میں میری شادی ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد میں علیحدہ رہوں گا کیونکہ میں سمجھتا تھا

...میں بہت خرابیاں اورلڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی شادی کے بعد ماڈل ٹاؤن میں ہی
...مکان میں رہنے لگا جواشفاق صاحب کے پڑوس میں تھا۔

...دن اشفاق صاحب بتانے لگے کہ میں کسی زمانے میں فلیمنگ روڈ میں رہتا تھا۔ بعد میں کچھ عرصہ اچھرہ
...معراج بلڈنگ میں رہا۔ بعد میں مزنگ روڈ، سمن آباد اور پھر ماڈل ٹاؤن۔ میں نے عرض کیا کہ فلیمنگ روڈ تو
...تھے۔ اچھرہ اڈہ کے پاس معراج بلڈنگ میں میرے ایک رشتے دار رہتے تھے۔ ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔
...میں بھی اکثر جانا ہوتا تھا اور اب ماڈل ٹاؤن میں تو آپ کا پڑوسی ہوں ہی..... اشفاق صاحب مسکراتے
...تم نے بھی میرا ''کھیڑا'' کبھی چھوڑا نہ۔

...کی عنایتیں، محبتیں اور شفقتیں ہی اب زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یادوں کے علاوہ اور کون سا اثاثہ انسان کے پاس

...''داستان گو'' کے متعلق ریاض محمود صاحب لکھتے ہیں۔

''داستان گو'' (داستان سرائے)

...اشفاق احمد مرحوم..... آج بھی اُنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ جاتا ہے۔ یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جو بھی
...آیا اسے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے لیکن اشفاق احمد ایسا تندرست، زندگی سے بھرپور، ذہین اور دوسروں کے
...انسان اس قدر جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

...اشفاق صاحب سے میری پہلی ملاقات پرانے ریڈیو سٹیشن میں ہوئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ چند روز پہلے
...اور تیز ہوا نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔ تاج الدین صاحب، اکرم بٹ صاحب، سعید مرزا صاحب اور
...بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک صاحب ہاتھ میں مونگ پھلی کا لفافہ لیے ہمارے درمیان
...۔ لفافہ کھل گیا۔ چائے آ گئی اور ہم سب مونگ پھلی کھانے، چائے پینے اور ان صاحب کی باتیں سننے میں
...گئے۔ میرے سوا سب ان سے واقف تھے اور خاں صاحب کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔

خاں صاحب ایک خوبصورت انسان تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خوش گفتاری تھی۔ بات کہنے کا
...۔ جس میں مزاح کی چاشنی، علم، مشاہدے اور تجربے کا ایسا اظہار کہ ہر سننے والے کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ
...ہیں اور وہ سنتا جائے۔

جب خاں صاحب اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے کہ جلد ہی پھر ملیں گے تو میں نے اکرم بٹ صاحب
...کہ یہ خاں صاحب کون ہیں۔ بٹ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا تم نہیں جانتے خاں
...میں نے کہا نہیں۔ میں نے تو آج پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔ بٹ صاحب کہنے لگے، یار اشفاق احمد خاں
...افسانہ نگار۔

''گڈریا والے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل وہی۔'' بٹ صاحب نے جواب دیا۔

یہ غالباً 1960ء کی بات ہے۔ اشفاق صاحب ان دنوں ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ''لیل و نہار'' کی ایڈیٹری چھوڑ کر ریڈیو پاکستان لاہور سے بہ حیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے۔ میں شعبہ ری کنسٹرکشن میں کام کرتا تھا۔ اشفاق صاحب بھی اس شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ میری نیازمندی میں اضافہ ہوا۔ ان کی محبت اور شفقت بھی بڑھتی گئی اور یہ سلسلہ ان کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے تک جاری رہا۔

اشفاق صاحب ہمیشہ نئی بات سوچتے، ریڈیو پروگراموں میں مختلف قسم کے تجربے کرتے اور لکیر کے فقیر والے رویئے کو ناپسند فرماتے۔ یوں تو انہوں نے ریڈیو کے لیے ہر نوعیت کے پروگرام پیش کیے جن میں فیچر، دستاویزی پروگرام، تقاریر اور انٹرویوز شامل ہیں لیکن ان کا اصل میدان ڈرامہ تھا۔ ریڈیو ڈرامہ نسبتاً ایک نئی چیز تھی اور اس کے لیے لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ریڈیو صرف اور صرف آواز کا میڈیم ہے، جس میں مصنف اور پروڈیوسر صرف صوتی اثرات کے ذریعے ہی ہر چیز اپنے سننے والے تک پہنچاتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن اور فلم میں آواز کے ساتھ اداکاروں کی حرکات و سکنات، میک اپ، لباس اور سیٹ مصنف کی بات کو مؤثر ترین انداز سے دیکھنے والے تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ریڈیو کے لیے لکھنا اور اسے پروڈیوس کرنا زیادہ مشکل ہے۔

لیکن جہاں ریڈیو صرف آواز تک ہی محدود ہے، وہیں اس کا ایک مضبوط پہلو بھی ہے کہ سننے والوں کا تخیل آواز کی لہروں سے موصوف ہونے والے سگنلز سے اس منظر کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا لیتا ہے، جسے وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اپنے تصور کے زور پر بنائی تصویر ہر شخص کو پسند ہوتی ہے اور یہ ریڈیو کا وہ مضبوط پہلو ہے جو اسے ٹی وی اور فلم پر سبقت دلواتا ہے۔

اشفاق صاحب کو تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں وہ مختلف قسم کے سرکے اور کریمیں بناتے جو کبھی باکمال بن جاتیں اور کبھی ناکام ہو جاتیں۔ اسی طرح وہ اپنے افسانوں، ریڈیو ڈراموں اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں مختلف تجربات کرتے رہتے۔ ریڈیو ڈرامہ عام طور پر سٹوڈیو میں صوتی اثرات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے لیکن اشفاق صاحب نے ''دس دسمبر'' کے نام سے ایک ایسا ڈرامہ لکھا جو تمام کا تمام سٹوڈیو سے باہر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ریڈیو ڈرامے میں ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس ڈرامے کے فنکاروں میں جمیلہ اختر، آفتاب احمد، ڈاکٹر انور سجاد اور اشفاق احمد شامل تھے۔

اسی طرح جب پروگرام تلقین شاہ شروع ہوا تو اس میں بھی اشفاق صاحب نے بولنے کا وہ لہجہ اختیار کیا جسے پنجابی اور اردو بولنے والے یکساں طور پر سمجھ سکتے تھے۔ یہ لہجہ پٹیالے کی بولی تھا۔ اشفاق صاحب نہ پٹیالے کے رہنے والے تھے اور نہ پٹیالے کی بولی ہی کے آشنا لیکن جس روانی سے وہ اس بولی میں بات کرتے اس کو سن کے یہ محسوس ہوتا کہ وہ پٹیالے ہی کے رہنے والے تھے۔

پٹیالے سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے اکثر حضرات ان سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ پٹیالے میں کہاں رہتے تھے۔ اشفاق صاحب کہتے ''سنام میں گھر تھا اپنا۔''

وہ صاحب کہتے ''ہم بھی سنام کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی آپ سے وہاں۔''

اشفاق صاحب کہتے ''بس اتفاق اے جو ملاقات نہ ہوئی، آپ تاں شاید چھوٹے ہوں گے اس وقت۔''
اشفاق صاحب کا مشاہدہ عمیق اور کان بہت تیز تھے۔ پٹیالوی لب و لہجے میں بات کرنے کا فن انہوں نے کرشن نگر والے ایک ڈاکٹر صاحب سے سیکھا۔ تلقین شاہ 1962ء میں شروع ہوا۔ اُس وقت اس پروگرام کا نام "تجربہ" تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اس کا نام بدل کر "تلقین شاہ" رکھ دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کو فخر ہے کہ تلقین شاہ اس کا بیالیس سال تک چلنے والا پروگرام ہے۔ غالباً دنیا کے کسی نشریاتی ادارے سے اتنے عرصے کے لیے کوئی پروگرام نہیں چلا۔ اسی بنا پر اسے گینز بک آف انفرمیشن میں دوسری جگہ ملی ہے۔
ہر چند کہ اشفاق صاحب پرنٹ میڈیا کے لیے بھی لکھتے تھے لیکن پھر ان کی زیادہ توجہ الیکٹرونک میڈیا کی طرف تھی جس کی وجہ سے ان کے بہت سے قریبی دوست جن میں ممتاز مفتی اور اے حمید بھی شامل تھے، ان سے ناخوش تھے۔ ان دوستوں کا استدلال یہ تھا کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہے جو اپنی صلاحیتوں کو الیکٹرونک میں ضائع کر رہا ہے۔ جو چیز ہوا کی لہروں سے سننے والے تک پہنچی، وہ ایک بار نشر ہونے کے بعد ختم ہو گئی جبکہ چھپی ہوئی چیز ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہے۔ اشفاق صاحب کے تقریباً سبھی ڈرامے اور فیچر تلقین شاہ آج کتابی صورت میں بھی موجود ہیں اور ان کے ٹی وی ڈرامے سی ڈی پر اور ریڈیو فیچر کے کیسٹ بھی بازار سے مل جاتے ہیں۔
میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد شاید وقت سے کوئی پچیس تیس سال پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ ان کا ذہن آنے والے دور تک دیکھ سکتا تھا، عام ذہن وہاں تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر اور ابلاغ کے ذرائع آنے کے بعد کتابوں کی اہمیت ویسی نہ رہے گی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے خود کو ٹیلی ویژن کے ساتھ عام لکھنے والوں سے بہت پہلے وابستہ کر لیا۔ ان پر تنقید کرنے والے بعد میں خود بھی الیکٹرونک میڈیا کے لیے لکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔
نومبر 1964ء میں جب پاکستان ٹیلی ویژن نے لاہور سے اپنی تجرباتی نشریات کا آغاز کیا تو اس وقت اس کے پاس اسلم اظہر، ذکا درانی مرحوم (جن کا چھانگے مانگے میں ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا) فضل کمال مرحوم اور محمد نثار حسین جیسے ذہین اور محنتی پروڈیوسر تو موجود تھے لیکن پروگراموں کے میزبان، ڈرامہ لکھنے والوں اور اداکاروں کی سخت کمی تھی۔ ٹیلی ویژن کی تجرباتی نشریات کا آغاز ہو گیا لیکن کسی ایسی اکیڈمی یا ادارے کے فقدان کے باعث جو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے والوں، فنکاروں یا میزبانوں کی تربیت کر سکے، یہ کام بھی ٹیلی ویژن پروڈیوسروں اور اشفاق احمد کے حصے میں آیا۔
انہوں نے جہاں ٹیلی ویژن کے لیے بڑے جاندار ڈرامے لکھے، وہیں انہوں نے ریڈیو، سٹیج اور باہر سے لیے گئے فنکاروں کی ایک ایسی ٹیم بنا دی جس نے اپنی محنت اور لگن سے ٹیلی ویژن ڈراموں کو عوامی مقبولیت بخشنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں جہاں اشفاق صاحب نے "ٹاہلی تھلے" "اُچے برج لاہور دے" اور "قلعہ کہانی سرائے" جیسے مقبول سلسلے وار کھیل تحریر کیے وہیں فرید احمد، ایوب خاں، قمر چوہدری، راقم الحروف، نذیر حسینی، انور سجاد، صابرہ سلطانہ، ڈاکٹر جہانگیر، جمیل بسمل اور عطیہ شرف کے ساتھ بے شمار دوسرے فنکاروں کو بھی ٹیلی ویژن ڈراموں

میں متعارف کروایا۔

ڈرامہ لکھنے کے بارے میں اشفاق صاحب بتایا کرتے تھے کہ میں جب مکالمے لکھتا ہوں تو پہلے میں خ
بولتا ہوں تاکہ اندازہ کر سکوں کہ کہیں بولنے والے کو وہ مکالمے ادا کرنے میں کوئی دشواری تو محسوس نہیں ہوگی۔
جب وہ کسی فنکار کو کوئی کردار ادا کرنے کے لیے کہتے تو فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے کردار لکھتے تاکہ اُس
کرنے والے کو مشکل نہ پڑے۔

اشفاق صاحب کے ڈراموں میں مضبوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار بھی بڑے جاندار ہوتے تھے۔
میں انسانی نفسیات سے آگاہی، گہرا مشاہدہ اور مختلف طبقوں سے میل جول ان کا مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ٹیلی وژ
تقریباً چالیس سال تک اشفاق صاحب کے زیرِ اثر رہا۔ نئے لکھنے والوں نے بھی اشفاق صاحب کے دیئے ہو
کو ہی اپنایا۔ لوگ آج بھی پوچھتے ہیں کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں ہوتے کیونکہ آج کے ٹی وی ڈرامے
اعتبار سے گراوٹ کا شکار ہیں۔

ٹی وی کے ابتدائی دور میں اشفاق صاحب ڈرامہ لکھتے تو کرداروں کے سامنے ان فنکاروں کے نام بھی
جن فنکاروں کو وہ ان کرداروں کے لیے منتخب کرتے۔ پروڈیوسر بھی اشفاق صاحب کی خواہش کے مطابق انہیں
منتخب کرتا۔ جب فنکاروں کو یہ علم ہوا کہ کاسٹنگ تو اشفاق صاحب ہی کرتے ہیں تو انہوں نے مرکزی اردو بو
لگانے شروع کر دیئے جہاں اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل تھے۔

ہمارے ملک میں فنکار تو ہوتا ہی غریب ہے اور پھر اس دور میں تو فنکار تھے بھی بہت زبوں حالی کا شک
اپنی ضرورتیں اور مجبوریاں۔ ہر ایک چاہتا کہ اسے آنے والے Episode میں ضرور کام دیا جائے۔ ظاہر
فنکاروں کو صرف ایک ڈرامے میں تو نہیں سمویا جا سکتا تھا۔ جب کوئی ایسا فنکار جسے کام نہ ملا ہوتا اشفاق صاح
اشفاق صاحب کہتے کہ یار اس بار تو تم رہ گئے، اگلی بار تمہاری باری ضرور آئے گی۔ جب وہ فنکار وعدہ لے کر
رخصت ہوتا تو اشفاق صاحب فون پر اپنے پی اے شریف صاحب سے کہتے۔ ''شریف الدین! یہ صاحب
پاس سے گزر رہے ہیں انہیں روکو اور ایک لفافہ دے دو۔''

ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں فنکار کو پینتالیس روپے کا چیک ملا کرتا تھا۔ شریف الدین صاحب
میں اس قدر رقم ہوتی کیونکہ اشفاق احمد فنکاروں کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے آگاہ تھے۔ یہ بہت بعد کی بات
داستان سرائے جا چکے تھے۔ اس دور میں اشفاق صاحب نے بہت سے باکمال سلسلہ وار کھیل لکھے جن میں ''
''حیرت کدہ''، ''ایک محبت سو افسانے''، ''توتا کہانی''، اور ڈرامے ''ننگے پاؤں''، ''من چلے کا سودا'' کے ساتھ
شمار اور ڈرامے بھی لکھے۔ ہمارے معاشرے میں پارٹی بازی کی بہت اہمیت ہے۔ سیاست دانوں اور تاجروں سے
ادیبوں تک سب گروہ بندی اور پارٹی بازی پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اشفاق احمد خاں نے کبھی کوئی گروپ بنانے یا
میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا سب سے بڑا گروپ یا پارٹی ان کی محنت تھی۔

اشفاق صاحب سکرپٹ لکھ کر گھر کے اخراجات پورے کرتے۔

یک دن میں نے دیکھا اشفاق صاحب کے بیڈروم کے ایک کونے میں ایک روسٹرم پڑا ہے۔ میں نے پوچھا
صاحب یہ روسٹرم کیسے آ گیا بیڈروم میں۔ کہنے لگے کہ آج لکھنے کا کام بہت زیادہ ہے۔ دن بھر تو مہمانوں کا تانتا
ے۔ رات کو جب کرسی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہوں تو نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ہی فیصلہ کیا کہ کھڑے ہو کر
جائے۔ آخر گھر کے اخراجات بھی تو پورے کرنے ہیں۔

شفاق صاحب کے کچھ مہربان یہ بھی کہتے ہیں کہ اشفاق احمد ایک بہت چالاک انسان تھا جس نے پاکستان کی
ے فائدہ اٹھایا یا یہ کہ حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ اُن کے نظریات میں بھی تبدیلی آ جاتی تھی۔ میرا خیال ہے
لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ جن لوگوں نے اشفاق احمد کو قریب
ہے وہ یقیناً ان باتوں سے متفق نہیں ہوں گے۔ حکومتوں کے ساتھ بدلنے والے تو کروڑوں میں کھیلتے ہیں،
گھر کے اخراجات پورے نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ایک بات کہا کرتے تھے کہ ''ٹھنڈا تتا پانی ملدا رہوے تے
دو روٹیاں ایس توں ودھ انسان دی ہور کی لوڑ اے۔''

دو دفعہ وقت کے حاکموں نے انہیں وزیر بننے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے دونوں مرتبہ انکار کر دیا۔ پہلی بار
الحق کے دور میں اور دوسری بار نواز شریف صاحب کے دورِ حکومت میں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں تو اخبارات
بھی شائع ہو گئیں کہ اشفاق صاحب بہت جلد اپنے عہدے کا حلف اٹھانے والے ہیں۔ میں نے بھی خبر پڑھی تو
صاحب کو ٹیلی فون کر کے مبارکباد دی۔ ''خاں صاحب تسی تے وزیر بن رہے جے۔''

کہنے لگے ''توں تے دوست ایں تو کیوں بد دعائیں دے رہا ہے۔''

میں نے عرض کی ''لوگ تو وزیر بننے کی تمنا کرتے ہیں۔ آپ الٹ بات کر رہے ہیں۔''

کہنے لگے ''ریاض میاں! نہ تو میں نے مال بنانا ہے اور نہ شہرت کی کوئی تمنا ہے۔ شہرت اللہ نے پہلے ہی بہت
ہے اور گزارے کے لیے ہم میاں بیوی کما ہی لیتے ہیں۔ پھر میں کیوں اپنی آزادی گنواؤں۔''

میں نے کہا ''بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن وزارت، وزارت ہی ہوتی ہے۔ اس کا اپنا چسکا ہے۔''

کہنے لگے ''میں اور تیری آپا کبھی کبھی شاہ عالمی جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا سردیوں میں سرسوں کا ساگ پکا کر
ہے۔ ہم وہ ساگ اس بڑھیا کے پاس پیڑھیوں پر بیٹھ کر مکی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ جو چسکا اس بڑھیا کے
سرسوں کے ساگ کا ہے، وہ وزارتوں یا امارتوں میں نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا ''آپ صدر صاحب کو کیسے انکار کریں گے؟''

کہنے لگے ''تیرے بچے جئیں۔ یہ ہی سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ حاکم وقت کا اصرار ہے کہ اسلام آباد چلے آؤ۔
طرف سے انکار ہے۔ دعا کرو کہ اس امتحان سے بخیر و خوبی نکل آؤں۔''

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومتِ پنجاب نے انہیں علاج کے لیے پانچ لاکھ روپے دینے کی پیشکش کی لیکن
صاحب نے شکریے کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شعیب بن عزیز سے کہنے لگے۔ ''بھائی اگر
نے چوہدری پرویز الٰہی کی رقم وصول کر لی تو میرے بیٹوں کو رنج ہوگا۔ ابھی علاج کی وہی کفالت کر رہے ہیں۔''

اشفاق صاحب کے افسانے، ڈرامے اور مضامین تو بہت شائع ہوئے لیکن کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ان
کی شاعری کا ایک مجموعہ ''کھٹیا وٹیا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک دن میں اشفاق صاحب کو ملنے ان کے گھر گیا۔
اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے ''لے بھئی ریاض محمود! تینوں ایک نظم سنایئے۔''

وہ ہمیشہ مجھے پورے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا ''کس کی نظم ہے؟''

کہنے لگے ''میری۔''

میں نے عرض کیا کہ ''یہ شاعری کب سے شروع کر دی؟''

کہنے لگے ''تینوں تے پتہ ای اے کہ میں کدی شاعری نئیں کیتی۔ پر پتہ نئیں کداں پچھلے دناں مینوں شاعری دا
بھوت چڑھ گیا تے میں کوئی تی پینتی نظماں لکھ چھڈیاں۔ اچھا گلاں بعد وچ کریں، پہلاں ایہہ نظم سن لے۔''

چھاؤنی آلے پُل توں

پہلاں لنگھیاں منڈا

فیر لنگی کڑی

فیر لنگی چٹی کار

ہیٹھوں لنگی تیز گام

بندیاں نال بھری

ایڈھا سوہنا دن سی

میں چھٹی لے لئی۔

میں نے عرض کیا ''خان صاحب! یہ تو کمال کی شاعری ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔''

کہنے لگے ''ریاض محمود! ایہہ ساریاں نظماں واوروولے وانگو اک پاسیوں آئیاں تے مینوں بھوانیاں دے کے
دُوجے پاسیوں نکل گئیاں۔ مڑ میں بڑا چارا لایا بڑی کوشش کیتی پر اک مصرعہ وی میرے نیڑے نہ ڈھکیا۔''

اشفاق صاحب کے ٹیلی ویژن ڈرامے اور ریڈیو پروگرام تلقین شاہ بھارت میں بھی اتنے شوق سے دیکھے اور
سنے جاتے تھے جتنے پاکستان میں۔ ایک بار بھارت کے معروف گلوکار ہنس راج ہنس پاکستان تشریف لائے۔ ایک تقریب
میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا ''میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔''

ہنس راج کہنے لگے ''میں آپ کو جانتا ہوں۔''

مجھے حیرت ہوئی، پوچھا ''کیسے؟''

کہنے لگا ''میں نے تو گانا سیکھا ہی لاہور ریڈیو سٹیشن کو سن کر ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ لاہور ریڈیو سے نشر ہونے
والے پروگرام ''پنجابی دربار'' میں تمہارے گانے نشر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن جب میں نے لاہور ریڈیو سننا
شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب سچ کہتے تھے۔''

میں نے کہا ''چلیے یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا کہ آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اب یہ فرمائیے کہ انٹرویو کے لیے کب

گے؟"
راج کہنے لگے "اس بار تو مشکل ہے لیکن اگلی بار آؤں گا تو ضرور انٹرویو ریکارڈ کراؤں گا۔ ابھی پروگرام
ہے۔ پھر گلوکار شوکت علی کے ہاں کھانا ہے اور صبح پانچ بجے میری واپسی ہے۔"
میں نے کہا "اگلی دفعہ جب آپ آئیں تو انٹرویو ضرور ہوگا۔"
راج کہنے لگے "ایک اور خواہش تھی جو میں ساتھ لے کر آیا تھا لیکن وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔"
"وہ کیا خواہش تھی؟" میں نے پوچھا۔
کہنے لگے۔ "لاہور میں ایک بہت بڑا بدھی جیوی رہتا ہے۔ اُن کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"
کہنے لگے "اُن کی ساری وڈیو، آڈیو کیسٹیں میرے پاس محفوظ ہیں۔"
میں نے کہا "میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔"
راج کہنے لگے "اُن سے کہیے گا کہ ایک پاگل بھارت سے آیا تھا اور آپ کے چرن چھونے کا خواہش مند
ہونے کے باعث حاضر نہ ہو سکا لیکن آؤں گا ضرور۔"
راج اپنے وعدے کے مطابق اشفاق صاحب کو ملنے تو نہ آ سکا لیکن اس نے بمبئی سے اصغر ندیم سید
ایک شال اور ایک ہزار روپیہ نذرانے کے طور پر ارسال کیا۔ اشفاق صاحب کے انتقال کے بعد ایک روز
راج سے گفتگو ہوئی تو اس نے اشفاق صاحب کی رحلت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بڑا قیمتی بندا
گیا۔"
"زاویہ" پروگرام جسے اشفاق صاحب ہر ہفتے پی ٹی وی سے پیش کرتے تھے، ساری دنیا میں بسنے والے اردو
میں انتہائی مقبول تھا۔ جب اشفاق صاحب نے یہ پروگرام ابھی شروع نہیں کیا تھا تو ایک دن اس خاکسار کو
کہا۔
"میں ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام شروع کر رہا ہوں جس میں میں چند لوگوں کے سامنے پچیس منٹ گفتگو
پھر اگر سامعین میں سے کوئی سوال پوچھنا چاہے تو اس کا جواب دوں گا۔"
میں نے عرض کی "حضور یہ پروگرام کامیاب نہیں ہوگا کیونکہ کون پچیس منٹ تک صرف ایک ہی آدمی کو سن سکتا

کہنے لگے "تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ میر باقر علی داستان گو بھی تو ساری ساری رات ہزاروں کے مجمع سے
کرتے تھا اور کوئی ایک آدمی بھی پنڈال چھوڑ کے نہ جاتا تھا۔"
جب پروگرام شروع ہوا تو میرا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اور "زاویہ" نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔
میں یہ سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک داستان گو تھا۔ انہوں نے جب رسالہ شروع کیا تو اس کا نام
گو" رکھا۔ اردو میں یہ پہلا رسالہ تھا جو ریڈرز ڈائجسٹ کے سائز پر چھپتا تھا۔ اس کا مواد، سرورق اور چھپائی نہایت

اعلیٰ درجے کی تھی۔ ادبی حلقوں میں اس رسالے نے دھوم مچادی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے محنت کر کے ایک
تو نکال دیا لیکن دونوں میاں بیوی اس کے تجارتی پہلو سے ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''داستان گو'' بند ہوگیا۔

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں گھر بنایا تو اس کا نام ''داستان سرائے'' رکھا۔

پروگرام ''زاویہ'' میں ان کی گفتگو کا انداز جس کے سب لوگ دیوانے تھے، داستان گو جیسا ہی تھا
صاحب پروگرام ''زاویہ'' کا اختتام اس جملے پر کیا کرتے تھے۔ ''اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے
تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ بات صرف کہتے ہی نہیں تھے بلکہ اس پر عمل بھی
ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ان کی پریشانیوں میں ان کی مدد کرتے لیکن انداز ایسا اپنائے رکھتے جیسے ان کا
تعلق ہی نہ ہو یا انہوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ جب کوئی خاں صاحب کے پاس اپنی کوئی پریشانی یا مشکل
آتا تو وہ اسے اس انداز سے سنتے گویا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔

اپنی پریشانی لے کر آنے والا مایوس ہو جاتا کہ لو جی میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں لیکن اشفاق
توجہ سے میری بات تک نہیں سنی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی پریشانی یا مشکل بیان کر چکتا تو
اس کی نہ رہتی۔ خاں صاحب کی ہو جاتی اور وہ اس پریشان شخص کی امداد کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ جب اس کا
تب بھی ایسے ظاہر کرتے کہ سب اتفاق سے ہوگیا۔ اس کام کے ہونے میں میری کسی کوشش کا دخل نہ تھا۔ کسی
بوجھ ڈالنا انہیں ناپسند تھا۔

ریڈیو کے ایک بڑے بہت فنکار کا انتقال ہوگیا۔ ہمارے معاشرے میں فنکار خواہ وہ کتنا ہی نامور
مشکل سے ہی گزر بسر کرتا ہے۔ اس فنکار کی موت کے بعد اس کی بیوی بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ خاں
اس فنکار سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ مرحوم فنکار ریڈیو سے بحیثیت سٹاف آرٹسٹ منسلک تھے۔ آج کل
ملازمین کی یہ کیٹگری ہی ختم کر دی ہے لیکن اُن دنوں میں سٹاف آرٹسٹ کو ایک مقررہ تنخواہ ملتی تھی۔ کوئی میڈیکل
گریجوٹی یا پنشن ادا نہ کی جاتی تھی۔

اشفاق صاحب نے کوشش کر کے اس فنکار کے گھر والوں کے لیے وظیفہ منظور کروایا۔ ہر ماہ خود بھی
امداد کرتے۔ اس فنکار کی بچیوں کی شادیوں میں بھی اشفاق صاحب اور اس خاندان کی بھرپور اعانت کی۔

ایک اور نامور ڈرامہ نگار اور صداکار جن کا بہت شہرہ تھا، انتہائی مالی پریشانیوں کا شکار تھے۔ خاں
ماہ ان کی مالی امداد فرماتے، لیکن امداد کا انداز یہ تھا کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ اتفاق سے
میری نظر اس خط پر پڑ گئی جو اُن ڈرامہ نگار صاحب نے شکریے کے طور پر اشفاق صاحب کو لکھا تھا، جس سے
حال معلوم ہوئی۔

بہت سے بچے اشفاق صاحب کے ہاں گھریلو ملازم کی حیثیت سے آئے تھے لیکن داستان سرائے میں
سلوک ایسا ہوتا گویا وہ اسی گھر کے بچے ہیں۔ وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ آپا قدسیہ
پڑھاتیں۔ پڑھائی کے سارے اخراجات ادا کرتیں۔ جب وہ پڑھ گئے تو اُن کو مختلف جگہوں پر ملازمتیں دلوائیں۔

زندگی بسر کر رہے ہیں۔

خان صاحب مہمان نواز بہت تھے۔ خود بھی خوش خوراک تھے اور دوسروں کو بھی کھلا کے خوش ہوتے تھے۔ سیخ
شن بہت پسند فرماتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ غالباً ہمارے تعلقات کی
بھی خوش خوراکی ہی تھی۔ کسی زمانے میں چونا منڈی میں خلیفہ کباب فروش کے ہاں پہنچے ہوتے اور کبھی موچی
سائیں کباہیے کے ہاں اور کبھی چھاؤنی میں ماجھے کے کبابوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بیماری کے دنوں میں
ہزاروں کوششوں کے باوجود اشفاق صاحب کچھ کھانے پر آمادہ نہ ہوتے۔

میں نے ایک دن عرض کی ''خاں صاحب! ایسے تو بہت کمزوری ہو جائے گی۔''

کہنے لگے ''میرے سامنے گوشت اور شوربا رکھ دیا جاتا ہے۔ میں اسے کیا کھاؤں۔ کوئی کباب ہوں یا تکے تو
کھانے پر آمادہ ہو جائے۔''

میں نے ان کی خواہش پر کئی جگہوں سے کباب لا کے انہیں کھلائے لیکن خاں صاحب کو پسند نہ آئے۔

ایک دن کہنے لگے ''ریاض محمود! بڑے دُکھ کی بات ہے کہ لاہور ایسا شہر ہو لیکن یہاں کوئی بھی اچھا کبابیا نہیں

جو پرانے تھے وہ یا تو کام چھوڑ گئے یا اُن کا معیار گر گیا اور جو نئے ہیں ان کا تو سرے سے کوئی معیار ہی نہیں۔

دنوں میں کبھی کبھی اشفاق صاحب اپنے نسخے کے مطابق سیخ کباب لگایا کرتے تھے۔ آپا قدسیہ سیخ پر قیمہ لگاتیں
صاحب ان کو کوئلوں پر پکاتے۔ ایسے لذیذ کباب تیار ہوتے کہ جس نے بھی کھائے پھر کھانے کی تمنا کی۔

گھر میں آٹھ مہمان آ جائیں یا دس۔ اگر کھانے کا وقت ہو گیا تو وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے تھے۔ آپا قدسیہ
ہانڈی روٹی سنبھال لیتیں۔ ایسے ایسے لذیذ کھانے تیار ہوتے کہ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

کبھی کبھی اشفاق صاحب کے ہاں مہمانوں کے درمیان کھانا پکانے کے مقابلے بھی ہوتے۔ جو سب سے لذیذ
اشفاق صاحب اپنے دستخطوں والا سو روپے کا نوٹ دیتے۔ قلفے کا ساگ گوشت پکا کے ایک بار میں نے بھی
تھا۔

خاں صاحب ایک انتہائی ذہین، پڑھے لکھے، جدید نظریات پر یقین رکھنے والے اور مغربی طرزِ زندگی سے متاثر
لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم، تہذیب اور ثقافت سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی لگاؤ انہیں
حوش پہ اکساتا رہتا۔ نور والوں کے ڈیرے میں جب ان کی ملاقات ایک بابا جی سے ہوئی تو ان کے خیالات میں
آ گئی اور بقول اشفاق صاحب ''نور والے ڈیرے کے بابا جی سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ اصل گیان، علم اور
سیدھا راستہ دکھانے کا نسخہ تو ان بابوں کے پاس ہے۔''

یہ بابے مادی ترقی کے مخالف نہیں لیکن انسانی شخصیت کو سنوارنے اور روحانی ترقی کا جو درس ان کی باتوں میں
وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ بابا جی کی باتوں اور اقوال کی جھلک اشفاق صاحب کی تحریروں میں بھی نظر آنے لگی اور
ملاقاتوں اور باتوں نے اُنہیں ''من چلے کا سودا'' ایسا سیریل لکھنے پر راغب کیا۔

دوسروں کی تکلیف، پریشانی یا دکھ کا حال ضرور سنتے اور موقع محل کی نسبت سے اُسے مشورہ بھی دیتے
دکھ یا پریشانی کا کسی سے ذکر نہ کرتے۔ اُن کے پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ پینکر یا پر گردتھ ہے۔ سرجن نے
احمد کے منجھلے صاحبزادے کو بتایا کہ یہ ملیگنینٹ ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان صرف چند ماہ کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔

انیس خاں نے پوچھا۔ ''ابو کو علم ہے۔''

سرجن نے کہا ''ہم نے تو نہیں بتایا لیکن اشفاق احمد جیسے ذہین انسان سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی۔
بات سے آگاہ ہیں۔''

اور اشفاق صاحب یقیناً سب کچھ جانتے تھے لیکن کبھی کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں کینسر ایسے موذی
شکار ہوں۔ ہمیشہ یہ ہی کہتے کہ یار لوگ تو پتے کا آپریشن کروا کے آٹھ دس دن میں بھلے چنگے ہو جاتے ہیں لیکن میر
کچھ طویل ہی ہو گیا ہے۔ جب بھی کوئی پوچھتا ''اب طبیعت کیسی ہے؟''

تو یہی کہتے ''اب پہلے سے بہتر ہوں۔ بس کمزوری ہے، اللہ نے چاہا تو یہ بھی جاتی رہے گی۔''

بات صرف اتنی تھی کہ اپنے پیاروں، عزیزوں یا دوستوں کو اس موذی مرض کا بتا کے پریشان نہیں کر
تھے۔ کبھی بلکہ آخری دن تک اپنے قریبی سے قریبی دوست سے بھی اپنے مرض کے متعلق کچھ نہ کہا۔

سات ستمبر کی صبح کو جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوئے تو رخصتی سے ذرا پہلے آپا قدسیہ کے
پریشانی کے آثار دیکھ کر کہنے لگے۔ ''قدسیہ گھبرانا یا پریشان مت ہونا۔ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔''

میں اور اشفاق صاحب صبح کے وقت وی بلاک فٹ بال گراؤنڈ ماڈل ٹاؤن میں سیر کیا کرتے تھے۔ گر
دونوں طرف پختہ سڑکیں تھیں اور لوگ پختہ سڑکوں پر ہی سیر کیا کرتے کیونکہ گراؤنڈ ایک دو جگہوں سے قدرے
اشفاق احمد اس گراؤنڈ کو اپنی محبوب گراؤنڈ کہا کرتے تھے۔

میں نے کئی دفعہ عرض کی ''خاں صاحب! یہ گراؤنڈ ناہموار ہے۔ کیوں نہ ہم بھی سڑک پر چہل قدمی کیا
لیکن خاں صاحب نہ مانے۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ خاں صاحب کی اسی محبوب گراؤنڈ میں ان کا جنازہ ہو
ہوئے اور وہیں چالیسواں۔ اشفاق صاحب بنیادی طور پر ایک پُرامید انسان تھے اور ہر معاملے کا روشن پہلو دیکھتے
لوگ جب ملکی حالات سے پریشان ہو جاتے تو ان سے پوچھتے ''خاں صاحب! اب کیا ہوگا؟''

اکثر اُن کا جواب یہ ہی ہوتا ''اس میں کوئی شک نہیں حالات بہت خراب ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ
میں سے بہتری کی کونپل پھوٹے گی۔ انشاء اللہ پاکستان کا شمار دنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہوگا۔ دولت تو
میں بہت آجائے گی لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم مادیت کی دوڑ میں پڑ کے اپنی روحانی اقدار سے منہ نہ موڑ لیں۔''

ایک دن بتانے لگے ''پرویز مشرف نے مجھے ایوانِ صدر میں بلوایا۔''

جب گفتگو شروع ہوئی تو مشرف نے کہا ''اشفاق صاحب! ملکی حالات کی بہتری کے لیے کوئی مشورہ دیں''

اشفاق صاحب کہنے لگے ''خلق خدا دکھی ہے لیکن کوئی اُس کا دکھ سننے والا نہیں ہے۔ لوگ نہ روٹی، مانگتے
کپڑا نہ مکان۔ وہ صرف ایک کندھا چاہتے ہیں جس پر سر رکھ کے وہ دو آنسو بہا سکیں۔''

کسی زمانے میں ہمارے بابے دُکھوں کی بات سنتے تھے۔ انہیں حوصلہ اور مشورہ دیتے تھے لیکن اب وہ بابے بھی ... رہے۔

سات ستمبر 2004ء کی سوگوار شام کو جب ہم ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں خاں صاحب کو سپردِ خاک کر کے ... رہے تھے تو رہ رہ کر میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ آج آخری بابا بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ کندھا بھی ہمارا ... گیا جس پر سر رکھ کے لوگ دو آنسو بہا لیا کرتے تھے۔

... کولسری گو 36۔ جی کا حصہ نہ تھے لیکن وہ اردو بورڈ سے منسلک تھے۔ میں ان سے کبھی 36۔ جی میں نہ ملی۔ ... سرائے بن گیا تو کولسری صاحب، خاں صاحب سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی داستان بعد میں رقم کروں گی۔ ... صاحب کا مضمون دیکھیے۔

اشفاق صاحب...... ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ

اشفاق صاحب کی رحلت کے بعد تین چار مواقع پر مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کو کہا گیا مگر ہمت نہ پڑی کہ ... تے ہی ہونٹ ساکت ہو جاتے اور قلم گم۔ ٹیلی ویژن کے منفرد کمپیئر نورالحسن نے اسلام آباد میں اشفاق ... کے لیے ہونے والے ریفرنس میں شرکت کی نہ صرف دعوت دی بلکہ ہوائی جہاز کی سیٹ بھی بک کروالی۔ نورالحسن کو ... اشفاق صاحب کے جنازے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا۔ سو ان کا کہنا میرے لیے بے حد اہمیت کا ... اس کے بعد لاہور ٹیلی ویژن پر منعقدہ پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں اپنے گوشۂ تنہائی میں چپ ... رہا۔ اشفاق صاحب کی یاد میں شائع ہونے والی مختلف کتب اور میگزینز میں کچھ لکھنے کو کہا گیا۔ قلم اور زبان منجمد ... ابھی تک قلم چھوڑے توڑے ہوئے ہوں، آخر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔

ایچی سن کالج کے پروفیسر عرفان علی شاد کے افسانوں کی کتاب ''دھوپ کی لکیر'' شائع ہوئی تو انہوں نے ازراہ ... مجھے بھی عطا کیا۔ پہلا افسانہ ''دھوپ کی لکیر'' بے پناہ ڈرامائی کیفیات لیے ہوئے تھا، میں نے تجویز کیا کہ ... پے بنایا جائے، وہ کہنے لگے کہ جناب اشفاق احمد بھی یہی فرما رہے تھے، ممکن ہو تو آپ ہی کوشش کریں۔ میں نے ... ش کی اور پھر ہم وہ ڈرامائی تشکیل لے کر اشفاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ اشفاق صاحب سے ... ملاقات تھی جو عرفان بھائی کے توسط سے اردو سائنس بورڈ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ انہوں نے میز کے نیچے ... ڈبہ اٹھا کر ہماری طرف بڑھایا جس میں بھنے ہوئے چنے تھے اور خود میرے لکھے ہوئے ''ڈرامے'' کو الٹ پلٹ کر ... لگے۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' انہوں نے پہلا سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ ''ساہیوال کا''۔ فرمانے لگے۔ ... میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ منیر نیازی نے آ کر دھوم مچا دی۔ انہوں نے دو تین صفحے دیکھے اور پلندہ میز پر رکھ دیا۔ کچھ ... مونڈے چنے چباتے رہے۔ پھر بولے ''بھائی تم نے تو ہالی وڈ کے لیے لکھ دیا۔ یار لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ سین ... سڑک پر فلمایا جائے تو وہ سٹوڈیو میں بانس گاڑ لیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال تمہاری کوشش اچھی

ہے۔'' پھر انہوں نے بیل بجائی یعنی ہمارا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کوشش مضحکہ خیز ہونے کی حد تک ناکام تھی مگر انہوں نے مجھے دل شکستہ نہیں ہونے دیا۔

کچھ مہینوں کے بعد مجھے اردو سائنس بورڈ میں ریسرچ آفیسر لسانیات کی نوکری مل گئی۔ وہ مسکرائے۔ ''تو تمہارے ڈرامے کا معاوضہ مل ہی گیا۔'' میں اندر ہی اندر بہت خوش تھا کہ ان کے قریب رہ کر ڈرامہ نویسی کا فن سیکھوں گا۔ تیسرے ہی روز وہ میری میز پر آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ''ڈرامے ورامے کا خبط نکال ذہن سے اور دفتر کے کام کی طرف پوری توجہ دو۔'' آگے بڑھ گئے۔ مجھے دھچکا سا لگا مگر کھلا کہ دفتری امور میں کسی قسم کی کاہلی یا عدم دلچسپی کو برداشت نہیں کر پاتے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک دن کے لیے شہر سے باہر گئے تھے۔ اگلے روز شاید کسی نے کہہ دیا کہ وہ کام آپ نے سستی کو سونپ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے طلب کیا۔ ''کل تم نے کیا کام کیا؟'' میں اس سوال پر حیران ہوا۔ میرے چہرے پر چھپ گئی، ساتھ ہی ناخوشی کی ہلکی سی لالی بھی تیر گئی۔ میں آئیں بائیں شائیں کر کے باہر اپنی میز پر اوکاڑہ سے آئے ہوئے کچھ دوست براجمان تھے اور اس کے ساتھ ہی دفتر میں چھٹی کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہو گیا۔ رہ گئے میں اور میرے مہمان۔ میں نے چوکیدار سے چائے لانے کو کہا۔ چائے آئی تو اشفاق صاحب آگئے کے ایک ہاتھ میں بسکٹ کی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ والی پلیٹ میں نمک پارے اور اکبرز میں میں شدت حیرت سے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''یار کیا کروں میں ماں بھی بہت اچھی ہوں۔'' وہ پلیٹیں دھر کے چلے گئے۔ میں اور میرے مہمان کافی دیر تک کوئی بات نہ کر سکے۔

ان دنوں دفتر اڑھائی بجے بند ہو جاتا تھا، اڑھائی بجتے ہی لوگ باگ گھروں کی راہ لیتے۔ چوکیدار گھر پاس آ جاتا اور میں دفتر کے پچھواڑے چوکیدار کے کمرے میں گھس کر سو رہتا، البتہ اشفاق صاحب اپنے کمرے میں کام کرتے رہتے، کام نمٹا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے، مطالعے سے قدرے تھک جاتے تو ٹیپ ریکارڈ آن کر کے ہیڈ فون کانوں سے لگا کر آنکھیں موند لیتے اور کوئی لیکچر سننے لگتے۔ پھر بیل بجاتے، چوکیدار بھاگا بھاگا آتا۔ پوچھتے جاگ گیا ہے۔ پٹھان چوکیدار طوطی مرجان تیزی دکھاتا۔ ''صاحب اٹھاؤں؟'' ''نہیں، جب جاگ جائے انہوں نے کبھی مجھے جگایا نہیں۔ میں اپنی مرضی سے پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتا تو مرجان بتاتا کہ صاحب یاد کر رہے تھے۔ میں ان کے کمرے میں جاتا۔ تب وہ چوکیدار سے چائے لانے کو کہتے اور کمرے میں پھیلی روشنی میں شفقت کا رنگ شامل ہو جاتا۔ وہ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ تب وہ میرے پاس نہیں بزرگ ہوتے اور میں برخوردار، نیاز مند، عزیز مگر اگلی صبح جب دفتر لگتا تو اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل ہوتے اور خاکسار محض ریسرچ آفیسر۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اشفاق صاحب دفتری معاملات میں کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے۔ ادھر کوئی غلطی ہوئی اُدھر ایک پیلے رنگ کا کاغذ میز پر آ جاتا جس پر ''ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے سلام پہنچے'' تو چھپا ہوتا، باقی باتیں ان کے قلم سے لکھی ہوتیں اور خاصی ''حوصلہ افزا'' ہوتیں۔ سو دفتری اوقات میں دفتر میں مکمل طور پر خاموشی ہوتی، ہر شخص اپنی میز پر اپنے کام میں مستغرق ہوتا۔ کبھی کوئی مہمان آ نکلتا تو ہال میں داخل ہوتے ہی گھبرا سا جاتا۔ پھر سرگوشی ہی میں احوال پوچھتا اور بھاگ نکلنے ہی میں عافیت سمجھتا۔ تاہم ایک انتظام پسند ڈائریکٹر جنرل ہونے کے باوجود انہوں

ں کو ایک خاندان بھی بنا رکھا تھا جس کی بزرگ ترین ہستی وہ خود تھے۔ انہوں نے یہ کیسے manage کر رکھا
سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔
صبح دفتر آتے تو سارے دفتر کا راؤنڈ لیتے، یہ موٹر سائیکلیں سیدھی قطار میں کیوں نہیں، میز ذرا آگے کھسک
آواز کیوں دیتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں پر نظر رکھتے تھے حتیٰ کہ اگر ڈاک کلرک کسی لفافے پر ٹکٹ چسپاں
ٹیڑھا کر بیٹھتا تو بھی پکڑا جاتا ''اسے اتارو اور ٹھیک سے چسپاں کرو۔''
روز وہ علی الصبح دفتر آ گئے۔ سیدھے چوکیدار کے کمرے میں گئے جو چائے بنا رہا تھا۔ ''ارے خان،
یو ویڈیو نہیں؟'' مرجان کھسیانا سا مسکرایا۔ وہ اگلے روز بھی علی الصبح دفتر آئے، ان کے ہاتھ میں ایک
ایک کمبل۔ چوکیدار انہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چیزیں تھما کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔
دفتر کے ملازمین تک محدود نہ تھا۔ میں ایک ایسی تنگ و تاریک گلی سے بھی واقف ہوں جس کے ایک
کے مکان میں ایک نابینا بزرگ رہتے تھے جن کی اپنی اولاد نہ تھی، ضعیف بیوی ان کی خدمت کرتی تھی،
محروم ہو گئیں۔ آمدنی کا واحد ذریعہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ ہر مہینے انہیں اتنی رقم پہنچا دیتے کہ مکان کے
کھانے پینے اور ادویات وغیرہ کا بندوبست ہو جاتا۔ وہ خود بھی ان کی خبر گیری کے لیے کبھی کبھی اس تنگ و
میں پہنچتے اور کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ چونکہ یہ بستی میری رہائش گاہ کے قریب تھی، اس لیے میں ان
تھا۔ اور بھی کئی تاریک گوشے ہوں گے جہاں ان کی مروت کا چراغ روشنی پھیلاتا تھا، مگر میں ان سے
کبھی اپنے ایسے وظائف کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔
شام کی محفل میں، میں اکثر خاموش رہتا، مگر ان کے مہربان رویے کی بنا پر آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ ایک شام یونہی
دیا کہ ''یہ جو آپ کا جملہ ہے کہ پاکستان کو کسی ان پڑھ نے نقصان نہیں پہنچایا اور جس کا یار لوگ یہ مطلب
تے ہیں کہ آپ تعلیم کے خلاف ہیں تو......'' میں ذرا سا جھجکا۔ انہوں نے چائے کی بھرپور چسکی لی تو میں نے
''تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے یہاں کے نظام تعلیم پر طنز ہے کہ وہ کیا مال پروڈیوس کر رہا ہے نہ کہ علم کی
ان کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔ فرمانے لگے ''لو ساہیوال کا پینڈو بات کو سمجھ گیا ہے اور ہمارے
یاں ہی برساتے چلے جاتے ہیں۔'' ایک بار میں نے شہاب صاحب کی مخالفت میں شائع ہونے والی کسی کتاب
اشفاق صاحب خود مان گئے ہیں شہاب نامے کے کچھ اوراق انہوں نے سپرد قلم کیے، کچھ ممتاز مفتی نے اور
ادیبوں نے۔'' ''حیرت ہے۔'' وہ کہنے لگے ''یار اچھے بھلے پروفیسر لوگ بھی طنز کو نہیں سمجھتے۔''
تاہم ایسے موقعوں پر ایک آدھ جملے ہی پر اکتفا کرتے تھے، بات بڑھاتے نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ہم عصر
بارے میں کسی مخالفانہ تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کوئی ایسا ذکر چھیڑا بھی تو انہوں نے ٹوک دیا۔ البتہ اپنے بابا فضل
باتیں خوب لطف لے لے کر بیان کرتے۔ فیصل آباد میں مقیم ایک بابا جی کا ذکر بھی کیا کرتے کہ میں ان دنوں
پہنتا اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے حجرے میں میرے لیے ایک تہبند اور کرتہ رکھا ہوا تھا،
تبدیل کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ ایک دن میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ ایک زمیندار قسم کا شخص داخل ہوا۔ لمبا کرتہ

شرل شرل کرتا تہہ بند اور سر پر بڑا سا پگڑ، مونچھیں تلوار مار کہ۔ آتے ہی باباجی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور بڑی خوشی
گویا ہوا۔ "حضرت جی بس توبہ کر لی۔ قصہ ختم۔" باباجی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔
رہا؟" اس شخص نے بات کاٹ دی۔ "قبلہ آپ نے غور نہیں فرمایا۔ مکمل توبہ قبلہ مکمل۔" باباجی نے پھر توجہ نہ دی
مخاطب ہونے لگے۔ وہ شخص پھر چہکا "حضور واقعی، آپ کو غالباً یقین نہیں آتا، یقین مانیں۔ چھوڑ دیا۔ سب
دیا۔"

باباجی بے زاری سے بولے "یہ بھی چھوڑ دو۔" اور وہ شخص ایک لحظے کے لیے پریشان ہوا، پھر کچھ
میں نے اپنی بات بڑھا دی۔ "حضور کیمیا گری کیا ہے، کیا مٹی واقعی سونا بن جاتی ہے؟" "بن سکتی ہے، کیوں
سکتی۔" باباجی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ایک منٹ۔" وہ شخص اچھلا۔ لپک کر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی
کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ "باؤ جی کوئی کاغذ قلم نکالو، نسخہ لکھ لو۔ میں اور آپ بھائی وال۔ نہ آپ نسخہ کسی کو بتا
میں۔ شاباش، شاباش کاغذ قلم......" پھر اونچی آواز میں...... "جی باباجی حضور وہ کیسے؟" اس کا منہ بے کواڑ
طرح کھلا تھا اور پلکیں جھپکنا تو جیسے اس کی فطرت میں ہی نہ تھا، سانپ کی طرح کہ اسی لیے تو وہ خزانے پہ بیٹھتا
نے فرمایا "ایسے کہ......سونے کو مٹی سمجھا جائے۔" اور اس کے ساتھ ہی زمیندار صاحب گویا پتھر کے ہو گئے۔

اشفاق صاحب اکثر بڑی پُرمعنی باتیں کرتے مگر قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کر رکھا تھا کہ وہ عام سی
اپنے ساحرانہ انداز سے انتہائی پُرلطف اور فکر انگیز بنا دیتے مگر یہ ساحری دفتری اوقات میں نہ ہوتی۔ وہاں
پوائنٹ بات کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اردو سائنس بورڈ کی مطبوعات کی فروخت سے دفتر کے لیے
بلڈنگ تعمیر کی جو بلاشبہ ایک مثال ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی وہ کافی ذہانت اور محنت سے کام لیتے
ایسی کتب شائع کرتے جو فروخت کے ریکارڈ قائم کر سکیں اور ان کی آمدنی سے کوئی ایسی کتاب شائع کرتے جو اپ
اور مواد کے اعتبار سے نام آور ہو جیسے "ریگستانی ٹڈی کا ہضمی نظام"۔

بظاہر لگتا تھا کہ انہیں کسی کا دستِ طلب دراز کرنا پسند نہیں۔ میں نے ایک بار دبا سا احتجاج کیا اور
ہوا کہ آپ کا انداز سمجھ میں نہیں آتا، کبھی آپ بن مانگے چیز دیتے ہیں، کبھی مانگے پر نہیں دیتے اور کبھی مانگے
دیتے ہیں، آدمی کیا کرے؟ انہوں نے مسکرا کر بات بدلی اور کافی دنوں کے بعد اس بات کی وضاحت کی جس کی
نے اشارہ کیا تھا۔ تب کھلا کہ ایک چیز کے دبانے اور دوسری سونپنے میں حکمت تھی۔ یار لوگ اس تقسیم پر ناخوش
کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ جو صحیح سمجھتے وہی کرتے۔ دوستوں کو بہر حال بہت بعد میں احساس ہوتا کہ
فیصلے ہی میں بھلائی تھی۔

مجھے کبھی کبھی ان کے دولت کدے مگر نہیں دولت کدے نہیں، گھر میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ گھر میں
لیے کہا کہ وہاں جو گھر پنا دیکھا، وہ اپنے گھر میں کبھی محسوس نہ کیا۔ مہمان جو بھی ہوں، جتنے بھی ہوں ان کی یوں خاطر
کی جاتی کہ وہ مہمان نہ رہتے، گھر والے ہی بن کے رہ جاتے۔ پھر ان کا دسترخوان بھی عجیب ہوتا، پرانے دیہات
لیے ہوئے۔ کبھی چپڑی روٹی پہ چٹنی، کبھی باجرے کی روٹی دہی کے ساتھ، کبھی مکئی کی روٹی پر ساگ اور لسی۔ جدید

ہوتے ہیں۔ یقیناً اس جمال میں بانو آپا کے مزاج اور سگھڑپنے کا کمال بھی شامل ہوتا۔ تاہم یہ نہیں ہوتا تھا کہ
جس جاؤ کیونکہ وہ کام، کام اور کام کو بہر حال اہمیت دیتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو انہوں نے جس قدر تخلیقی کام
بھی مکمل نہ ہو پاتا۔ کئی الماریاں تو تلقین شاہ کے مسودات سے بھری پڑی تھیں۔ ناول، افسانے، ٹیلی ویژن کے
اور تقریریں جدا۔ ان مسودات سے جو جگہ بچتی اور وہ بھی کافی تھی، اس میں فرش سے چھت تک الماریاں ہی
وہ الماریاں نہایت اہم کتب سے بھری پڑی اور یہ کتب سجانے دکھانے کے لیے نہیں ہضم کرنے کے لیے تھیں
پر قدرت حاصل تھی۔

جب وہ اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کے منصب سے سبکدوش ہو گئے تو زیادہ وقت گھر پر گزارتے
بھی ان کے معمولات میں فرق نہ آیا، صبح آٹھ بجے گھر کے پچھواڑے قائم ریکارڈنگ سٹوڈیو میں جا بیٹھتے اور
لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ان کے شہرہ آفاق ریڈیائی فیچر ''تلقین شاہ'' کی ریکارڈنگ یہیں پر ہوتی۔
ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان کی بھی آرزو ہوتی کہ میں گاہے بگاہے آجایا کروں، مگر اس کا انہوں نے
یوں کیا کہ ''تلقین شاہ'' میں میرے لیے ایک کردار تخلیق کیا۔ ماسٹر خوشی محمد کا...... ظاہر ہے کہ مجھے صداکاری
تو تھا نہیں مگر وہ ریکارڈنگ کے دوران میرا کندھا تھپتھپاتے جاتے۔ سو آہستہ آہستہ میں رواں ہو گیا۔ ''تلقین
پروگراموں میں مختلف لوگ حصہ لیتے، میں نے محسوس کیا کہ تلقین شاہ کے حوالے سے مختلف لوگوں کی پُروقار
مدد کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے صداکاروں کے نجی مسائل پہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان
کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جو بچے کام کرتے تھے، وہ اشفاق صاحب کو ابو جی کہہ کر مخاطب
اور گھر میں بھاگے پھرتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی گھر ہو۔

اشفاق صاحب اپنے غموں اور بیماریوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اکثر کسی ملازم ہی سے پتہ چلتا کہ ان کا آپریشن
وہ ہسپتال میں داخل رہے ہیں۔ آخری بار وہ آپریشن کے بعد گھر آئے تو چارپائی سے لگ کے رہ گئے۔ اس
میں بھی مطالعہ ان کا معمول رہا۔ میں گاہے بگاہے ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ بس چند منٹ کے لیے ہی بیٹھتا کہ انہیں
تنہائی راس تھی۔ ایک شام مجھے شادی کی تقریب میں شرکت کا ایک کارڈ ملا۔ دولہا دلہن کے ناموں سے میں آشنا
بارات داستان سرائے سے روانہ ہونا تھی۔ میں نے ان کے خادم خاص محمد رفیق جو یہ کارڈ لائے تھے، سے
سلسلہ ہے؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اچانک ایک خیال نے ذہن میں چھید کر دیا
یہ آخری ملاقات کا اہتمام تو نہیں!!

شادی کی شام میں ان کے یہاں پہنچا تو ہر طرف قمقمے روشن تھے، بارات تیار تھی۔ بڑی رونق تھی، دو آدمی
صاحب کو سہارا دے کر باہر لائے۔ وہ دولہا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ مٹھائی اور کوک سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ میں
چہرے کو ڈھونڈنے لگا مگر کوئی شاعر، ادیب یا صحافی بارات میں شریک نہ تھا۔ ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کا
پھر بارات ایک شادی گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ میں گیٹ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کوئی واقف ہے نہیں، کس گاڑی
ساتھ ہی بانو آپا کی آواز آئی۔ ''اسلم تم میرے ساتھ چلو گے۔'' اور پھر گاڑی میں بانو آپا نے بتایا کہ دولہا کی

والدہ خاں صاحب کی نیاز مند ہے، انہیں مالی پریشانی نہیں ہے مگر عزیز کوئی نہیں۔ انہوں نے اس پریشانی کا اظہ
صاحب سے کیا تو انہوں نے یہ سارا اہتمام کرنے کا حکم دیا۔ بانو آپا یوں مصروف اور خوش تھیں جیسے ان کے اپنے بیٹے
شادی ہو۔ تقریب کے اختتام پر پھر پریشانی کہ واپس کیسے جایا جائے۔ پلٹ کے دیکھا تو اشفاق صاحب دو آدمیوں
سہارا لے کر میری طرف آ رہے تھے، ساتھ بانو آپا تھیں۔ بانو آپا نے گاڑی منگوائی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے
ملایا۔ آخری بار اور رخصت کر دیا...... ہمیشہ کے لیے۔

چند ہی دنوں کے بعد داستان سرائے کے آس پاس سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا اور اشفاق صاحب اپنے
میں سفید چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔ پھر وہ اسی نیند میں ڈوبے، آنسوؤں سے لبریز آنکھوں والے لوگوں
کندھوں پر تیرتے ہوئے آخری آرامگاہ میں چلے گئے۔ ہزاروں لوگ تھے اور ہر طبقے کے لوگ۔ دانشور، شاعر،
صوفی، فقیر، مسکین، صداکار، گلوکار اور عام آدمی، ریڑھی والے، تانگے والے، رکشے والے۔ ان میں سے کچھ اشفاق
خاں کو، کچھ اشفاق صاحب کو، کچھ ڈائریکٹر جنرل کو، کچھ ایک بڑے صوفی کو، کچھ ایک بڑے مقرر کو، کچھ تلقین شاہ کو رخصت
کرنے آئے تھے۔ ایک شخص کے ساتھ بہت سی شخصیات رخصت ہو گئیں۔

مجھے بطور ڈائریکٹر جنرل اشفاق صاحب کے بارے میں تاثرات بیان کرنا تھے مگر میں ادھر اُدھر بھٹک گیا
آپ کے سامنے ہے نہ ان کی افسری کے سٹائل سے انصاف ہو سکا اور نہ ہی کسی اور پہلو پر ٹھیک سے بات ہو سکی۔
یہی ہے اور یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ فی الوقت میں کچھ لکھنے کا ارادہ ترک ہی کر دوں اور اس وقت کا
کروں جب میں کچھ لکھنے کے قابل ہوں۔ وہ بھی اگر ہو سکا تو......

"بابا وہ ہوتا ہے جو لینے کے نہیں دینے کے مقام پر ہو۔ یہ اس کی موٹی سی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی
ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔"

(اشفاق احمد، زاویہ، بابا

ریاض محمود کے نام

21-12-1990

عزیزم سلامت!

اس سے پہلے تم کو ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ یہ خط اس کے جواب کی یاددہانی نہیں ہے۔ یونہی
ہی لکھ رہا ہوں۔ محض اس قلم کو test کرنے کے لیے اور اس پرانے air bath کو دیکھنے کے لیے کہ اس میں کتنی جان
او کہاں تک پہنچتا ہے اور اگر پہنچ جاتا ہے تو پھٹتا تو نہیں۔ تم اس کا جواب لکھنے کی کوشش نہ کرنا اور مزے سے پستے وغیرہ کھا
افسوس کہ اس قلم کی سیاہی دوسری جانب نکل رہی ہے۔ اس لیے اب ایک اور استعمال کرتا ہوں۔ کل انکل
آئے تھے، پوچھنے لگے کہ چند مہینوں سے ریاض نظر نہیں آتا۔ میں نے منہ پکا کر کے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ ناراضگی
ہے۔ میں نے چند الفاظ فضی اور کاکے کے خلاف کہہ دیئے۔ اس نے تو برداشت کر لیے لیکن بانو آگے سے بولنے لگی
نے کبھی آپ کے بچوں پر تنقید کی ہے جو آپ ہمارے بچوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی اور انہوں

سے تھر آنا جانا ترک کر دیا۔

بکل ظفر اس وقت سے پریشان ہے اور ٹنڈ کھجا کر ہر ملاقات پر یہ کہتا ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا لیکن جب میں اسے بتاتا ہوں تو وہ تمہاری بے وقوفی پر بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس گدھے کو سوچنا چاہیے تھا کہ اتنے سالوں کی تو دشمنی بھی اور دوستی گنوا رہا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارے مکان کا پتہ پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب وہ پتہ وغیرہ جا کر خود تمہارے گھر کا پتہ معلوم کر رہا ہے اور کافی پریشان ہے۔

ابھی یہ سیاہی تو بہت تنگ کر رہی ہے، اس لیے ختم کرتا ہوں۔ ویسے تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

دعاگو

اشفاق احمد

تہران (ایران)

2-6-1991

عزیزم سلامت باشید!

ہر گاہ کہ من ارادہ کردہ بودم کہ حاضر فروش گاہ جناب عالی شدم بعد از خیال من مبدل گرد کہ من بجائے تربت اینجا آمدم کہ زائر من حضرت امام خمینی روح اللہ شدم۔ خیلے خوش قسمت ہستم کہ دی شب زیارت روضہ حضرت امام خمینی نصیب شدم...... معافی چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ دو دن کے مسلسل استعمال سے اب زبان اور قلم فارسی ہی کی طرف مائل ہے اور انہی ہواؤں سے لطف لیتے ہیں۔ ابھی کوئی ہفتہ بھر ادھر ہی قیام ہوگا اور پھر انشاء اللہ جمعہ کے روز واپسی ہے۔

جب ہم مشہد جائیں گے تو آپ کا علاقہ بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگا اور وہ جو کہتے ہیں کہ رات کے وقت جموں کی بتیاں سیالکوٹ سے نظر آتی ہیں، ایسا ہی حال تمہاری بتیوں کا ہوگا اور جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی بشرطیکہ اس میں تین شرط ایک ہی ہے کہ تربت میں روشنی کا انتظام ہو۔ بتیاں جلتی ہوں۔ لوڈ شیڈنگ کا معاملہ نہ ہو۔

اس وقت کا ایران میرے زمانے کے ایران سے بالکل مختلف ہے۔ واضح فرق بیبیوں میں نظر آیا ہے جو اب سر پر رومال باندھ کر ٹخنوں تک کا لمبا کوٹ پہن کر باہر نکلتی ہیں، خریداری کرتی ہیں، سکولوں کالجوں میں جاتی ہیں اور دفتروں میں کام کرتی ہیں لیکن وہ اس لباس سے خوش نہیں ہیں کہ ایک تو ساری شو ماری گئی۔ دوسرے وہ تڑپ جو راہ چلتوں اور ساتھ کام کرنے والوں کے دلوں میں خواہ مخواہ پیدا کر دیتی تھیں، وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔

اور جو یہ نہ ہو تو پھر زندگی بیکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں، رسالے اور گانے بجانے جو شاہ کے زمانے میں ہر چوک بازار کے ہر موڑ پر بکتے تھے اور جن کی مورتیں ہم بھی پاکستان سے آ کر بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ عمومی حالت یہ ہے کہ فی الحال لوگوں کو اور حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انقلاب کے بعد کوئی ہستی امام خمینی سے 1/4 طاقت کی بھی ہوتی یا 1/10 بلکہ 1/100 طاقت کی بھی ہوتی تو کام آگے چل سکتا تھا مگر مجھے ایسی کوئی نظر نہیں آتا۔ اس سے معاملہ رکا ہوا ہے۔ پورا انجن سٹیم سے بھرا ہوا اور کوئلوں سے بھخا ہوا سٹیشن پر کھڑا ہے ار

ڈرائیور کا پتہ نہیں کہ کدھر گیا۔ ایک امید یہ بھی بندھی ہے کہ ابھی آ جائے گا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر ہے کہ کدھر سے آئے گا۔

اچھا تم اس کالے پانی کی ابھی کتنی قید اور کاٹو گے۔ اگر تم کو مستقلاً اگست میں آنا ہو تو پھر درمیان میں کوئی چکر لگے کہ نہیں۔ پچھلی مرتبہ کا تمہارا آنا بالکل بے کار گیا۔ ایک بھی مفصل ملاقات نہ ہو سکی۔ اکیلا میں ہی نہیں اس شکوے میں انکل ظفر بھی بڑی شدت سے شریک ہیں۔ تمہاری آپا کا پرانا فلسفہ ہے کہ جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ہیں، وہ چوہا بنتے جاتے ہیں۔

شیر خواری میں ان کی اتنی فکر نہیں ہوتی جس قدر ان کے جوان ہو جانے پر ہوتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں لیکن ٹھیک نہیں ہوں کہ ایسے لمبے لمبے سفر کر سکوں اور اتنی بڑی بھیڑوں میں خود کو سہار سکوں۔ اب اندر سے ہی معاملہ ختم ہونے لگا ہے اور یہ تجربہ بھی خوب ہے۔ اپنے سارے دوستوں کو میرا اسلام مسنون پہنچا دینا اور ان سے کہنا کہ گرمی سے بچیں۔ باہر کی گرمی سے بھی اور اندر کی گرمی سے بھی بلکہ اندر کی گرمی سے زیادہ بچیں۔ یہ انا کا ایک خوفناک روپ ہے جو ترقی کی راہ میں حائل ہوتا رہتا ہے۔

ان دنوں تمہارے تربت میں کون سا پھل چل رہا ہے؟

دعائیں اور مزید دعائیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

داستان سرائے

121/C ماڈل ٹاؤن

لاہور

24-3-1991

عزیزی ریاض میاں! سلامت رہو، خوش رہو۔ کل 23 مارچ تھی مگر ہمارا یہ دن بھی روتے پیٹتے اور آنسو بہاتے گزرا۔ اشتیاق کے بڑے بیٹے صائل کی موت کی خبر تم کو مل چکی ہوگی۔ ہمارے سارے خاندان میں اور پورے علاقے میں ایک کہرام مچا ہے۔ کسی ظالم نے صائل کو اس کے گھر کے گیٹ پر چودہ گولیاں مار کر ختم کر دیا۔ اس کی بیٹی (جسے وہ سکول سے لایا تھا) یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اب تک قاتل کا یا قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اشتیاق غم کی مورت بنا، کمروں میں، صحن خانہ میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بس اس کو ہونی کہتے ہیں اور اس کے آگے کوئی تدبیر کوئی تجویز کارگر نہیں ہوتی۔

جس روز مجھے تمہارا خط ملا ہے اس سے دو دن بعد یہ سانحہ عمل میں آیا۔ ذہن ماؤف اور جسم شل ہے۔ میں نے بانو کو فون کیا تھا، وہ بھی تحیر اور غم میں ڈوبی بیٹھی ہے۔ فون پر ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اس کی صحت اب اچھی ہے۔

ممی میاں واپس اپنی Post پر چلے گئے ہیں اور انہوں نے اسلام آباد میں اپنی کرسی سنبھال لی ہے اور فراز بے یقینی ہی چلا گیا ہے اور کسی اور منصب کی تلاش میں ہے۔ میرے آرڈر بھی آ گئے ہیں لیکن ان میں سقم ہے یعنی ے ڈائریکٹر کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کو اصل حقیقت نہیں گئی۔ میں نے ابھی تک چارج نہیں لیا لیکن سیانے کہتے ہیں کہ چارج لے لو، اس کے بعد اپنے دعوے کا حکم

عجیب سی دنیا ہے اور عجیب سے حالات میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اب کوئی خاص مزا باقی نہیں رہا۔ تم یہاں ی ڈھارس بندھتی لیکن اب یہی حکم ہے کہ تم دور رہو اور یہی حکم درست ہے۔

اپنے دوستوں کو میرا اسلام دینا اور بتانا کہ اُن سب کے لیے میرے پاس ڈھیر ساری دعائیں ہیں۔

اللہ تم سب کو خوش رکھے اور آسانیاں عطا فرمائے۔

دعا گو

اشفاق احمد

2-9-1967

قدسیہ جان سلامت رہو۔

میں کل دوپہر کراچی پہنچ گیا اور خالو سرور کے جنازے میں شرکت کی۔ قبرستان گئے اور اپنے ہاتھ سے مٹی دی پس گھر پہنچے۔ یہاں دو گھڑی ماسی جی سے باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔

لاہور ایئرپورٹ پر افتخار بھائی، اقبال بھائی، شیر آغا، اذسار خاں، باجی اور گڈی موجود تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ میں آئے تھے اور یہ امر مجبوری سبھوں کے پاس فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ باجی میرے اس وتیرے پر بہت ق ہیں۔ کراچی والوں کو میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا۔ میں نے کہا ماموں کوئی ہمارے رشتہ دار نہیں تھے، میرے تھے اس لیے چلا آیا۔ سب لوگ شکر گزار اور ممنون تھے۔

شام کو جب میں اپنا اٹیچی اور تھیلا اٹھا کر چلنے لگا تو روکا گیا۔ میں نے کہا جہاں لواحقین پر اتنا بوجھ ہو وہاں میں نہیں کرتا، یہ میرا اصول ہے۔ ایک دو دوست کے پاس ٹھہروں گا۔ سب نے میرے اس اصول کو بہت سراہا تعریف کی۔ کہنے لگی اپنے کسی کام سے آئے ہو گے آپ۔ وہ کرنے جا رہے ہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ملاحظہ ئیے۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

آج مجھے اپنی میٹنگ کا تکلیف دہ کام ہے۔ سارا دن اس میں گزرے گا۔ کل اتوار کے روز صبح آٹھ بجے رسم قل میں شریک ہوں گا۔ تم سب کو بوسے! بچوں کو ساتھ پیار بھی۔

تمہارا

اشفاق

75-جی، ماڈل ٹاؤن

اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن بظاہر خاں صاحب اس بات سے پریشان تھے کہ ہم لوگ آپا جی کے گھر کا
فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ وجہ جو بھی تھی اب گھر کی تلاش ہوئی۔ 36-جی کی بغلی گلی میں مطلوبہ گھر مل گیا، لیکن یہ گھر
ضروریات کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ آپا صابرہ گھر کی مین بلڈنگ میں آدھے گھر میں
جائیں۔ گھر کے پچھلے آنگن میں بائیں ہاتھ ایک تین کمروں کا گیسٹ ہاؤس تھا۔ اس میں ریاض محمود، بانو باجی
ڈال لیا۔ بائیں ہاتھ آنگن میں کھلنے والے دروازے سے ملحقہ دو کمرے تھے۔ ایک میں جیونی کا باورچی خانہ اور
کشادہ کمرہ گھریلو کاٹھ کباڑ اور گودام کی شکل اختیار کر گیا۔

اس طرح کے بنگلے ماڈل ٹاؤن میں عام ہیں۔ گھر کے دو پھاٹک تھے۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں ایک
سے داخلے کے لیے استعمال ہوتا اور دوسری جانب سے اخراج کی صورت نکلتی۔

آپا صابرہ کی سائیڈ پر بڑے میٹھے آموں کے پیڑ تھے اور ہماری طرف املی کے دو تین درخت بڑے
سے لد جاتے۔ برآمدے کے سامنے کشادہ پورچ تھی جس میں آسانی سے دو کاریں پارک کی جا سکتی تھیں۔

ہماری سائیڈ پر ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جسے اینٹوں سے پختہ بنا دیا گیا تھا۔ اسی ڈونگی گراؤنڈ کے عین مقابل
پہلا کمرہ ڈائننگ روم بنا لیا۔ اس کے اوپر دو لمبے سے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں لا کر خاں صاحب کی کتابیں
طرح بے سروسامانی کے عالم میں ڈھیر کر دی گئیں جیسے وہ 36-جی میں گیلری کے اُوپر ڈھیر تھیں۔

برآمدے میں سے اندر ایک بڑا کمرہ ڈرائنگ روم بنا لیا گیا، جس کا مصرف کم کم تھا۔ باہر کی سڑک کی طرف کھلنے
والا کمرہ مہمان خانہ ٹھہرا، جس کا استعمال اور بھی کم تھا۔ پھر ہمارا سونے کا کمرہ تھا۔ یہ کافی کشادہ اور ہوادار تھا۔ اس کے
ہی پھر برآمدہ شروع ہو جاتا اور برآمدے اور خوابگاہ کے درمیان ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو خاں صاحب کی سٹڈی، آرام
تنہائی طلب لمحات میں گپھا تھی۔ جب کبھی اس کمرے میں داخل ہوتے، غسلخانے سے ہو کر جانا پڑتا۔

پچھلا برآمدہ کم و بیش استعمال میں آتا لیکن پچھلے آنگن میں خوب ریل پیل رہتی۔ یہاں ایک پرانا بڑ

بہت تھا۔ جس پر دو رسیاں مضبوطی سے باندھ کر ان میں آدھے ٹائر جتنے لوہے کے Rings باندھے گئے اور خاں بے تکلفی سے ٹانگیں اُٹھا کر کبھی دائیں کبھی بائیں ورزش کرنے لگے۔ ان کی ورزش کے اوقات میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ بچے ابھی چھوٹے تھے ورنہ وہ نقل میں زور آزمائی کرتے۔

ہم لوگ بہت کم آپا صابرہ کی طرف جاتے۔ وہ عام طور پر اپنا کھانا بڑے سلیقے سے ٹرے میں سجا کر ہماری طرف آتیں۔ سب ایک ہی میز پر اپنا اپنا کھانا کھاتے۔ اسی طرح روحی بیگم بھی کانٹے، چمچ اور سرویٹ سے لیس اپنا ٹرے لاتی اور پاس بیٹھ کر کھاتی۔ نہ کبھی انہیں share کرنے کا خیال آیا نہ کبھی ہم نے انہیں کچھ پاس کرنے کی جسارت ہی کی۔ ہم سیدھے سادے ہی دال چپاتی سبزی بھات کھانے والے تھے، انہیں کچھ آفر کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

آپا صابرہ اپنی چائے کی پیالی لے کر باہر والے برآمدے میں بیٹھتیں لیکن ہماری طرف سے کبھی اُدھر کوئی نہ جاتا۔ صابرہ کی والدہ بی بی جی اپنے اندر ہی رہتیں۔ اُن کا ہمارے پیٹرن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس گھر سے دو تین اہم واقعات وابستہ ہیں۔

فیض صاحب کا آنا جانا

نو سی کار کا خریدا جانا

"دھوپ سائے" فلم کی شوٹنگ

فیض صاحب ایچ بلاک کے موڑ پر رہتے تھے۔ سلیمہ اور میزو روحی کی ہم عمر تھیں، لیکن یہ ایک دوسرے کی سہیلیاں نہ جانے کیوں نہ بن سکیں۔

جب ہم 75۔جی میں آئے تو سب سے پہلی واقفیت فیض صاحب سے ہوئی۔ ان کا گھر ایچ بلاک میں ایک موڑ کاٹنے پر تھا۔ یہاں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمہ تو شاید ہماری طرف کبھی نہیں آئی لیکن میزو بڑی بے تکلفی کے ساتھ کبھی کبھی اکیلی ہی ہمارے گھر آجاتی رہی۔

پہلی بار مجھے کپڑا بیچنے والی افغان عورتوں سے پالا بھی پڑا۔ ان دنوں پھاٹک کھلے رہتے تھے۔ بلا روک ٹوک سر پر کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ دندناتی اندر آتیں۔ ان کا محاورہ تھا کہ وہ ہماری پکی ڈونگی گراؤنڈ کے کنارے گٹھڑی لا کر رکھ دیتیں۔ یہ اب خواتین کی اکثریت کا گھر تھا۔ آپا صابرہ، روحی اس کی آواز سن کر بھاگی آتیں۔ بانو باجی کو بھی خبر ہو جاتی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آنگن والی سائیڈ سے برآمد ہو جاتی۔ میزو کو بھی عموماً خبر دی جاتی۔ وہ بھی بھاگم بھاگ پہنچ جاتی۔

اب رنگوں پر تبصرہ، میٹریل کی جانچ پڑتال، قیمت پر جھگڑا جاری ہو جاتا۔ اول تو نہ جانے انہوں نے کہاں پیسے جمع کر رکھے ہوتے۔ بے دریغ خرچ کر لیا جاتا۔ کبھی کبھی میزو کے پیسے کم پڑ جاتے تو وہ خاں صاحب کی لاڈلی اُن سے ادھار لے لیتی۔

مردوں کا اس خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فیض صاحب ان سے علیحدہ مجھے اور خاں صاحب سے ملنے آتے۔ وہ کبھی گھر کے اندر داخل نہ ہوتے۔ انہیں

ہمارے کھانے کے کمرے میں بھی کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ ڈونگی گراؤنڈ کی کسی کرسی پر آرام سے بیٹھ جانے والوں کی فراغت کا انتظار کرتے۔

خاں صاحب عام طور پر اُردو بورڈ میں ہوتے یا ریڈیو سٹیشن۔ فیض صاحب بڑے صبر سے میرا انتظار کرتے جب میں اُن تک پہنچتی وہ چپ چاپ چیری کے درختوں کو اُن پر چہچہانے والے پرندوں سے ملاقات کرتے۔ شاید میں جو ازلی سنگیت موجود ہوتا ہے، اُس کے ساز اُن کے اندر بجتے۔ اُن کے چہرے پر کوئی بوریت نہ ہوتی۔

جب کبھی خاں صاحب موجود ہوتے، وہ بڑی عقیدت سے پاس بیٹھتے۔ شاید اُن ہی ملاقاتوں میں خاں صاحب نے اندازہ لگایا کہ فیض صاحب ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے انہوں نے فیض صاحب پر ''صوفی'' کے نکتہ نظر سے مضمون قلمبند فرمایا۔

ایک روز فیض صاحب میرے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا ''بھئی! ہم ایک وفد مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان لے کر جا رہے ہیں۔ لاہور سے جمیلہ ہاشمی، اسلام آباد سے خاطر غزنوی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ کے ہم سفر ابھی نامزد نہیں ہوئے۔''

میں نے سوچا کہ بڑے بڑے ادیب جا رہے ہیں۔ کچھ ادبی محفلیں ہوں گی۔ معرکے کی تقریریں ہوں گی میں 1200 میل کے فاصلے کے باوجود یک جہتی کا اعادہ کیا جائے گا۔

''اور وہاں جا کر کیا پروگرام ہے فیض صاحب؟''

''کچھ نہیں بس سندر بن دیکھیں گے۔ پہاڑوں پر جا کر کچھ لطف اُٹھائیں گے۔ موٹر بوٹ کی سیر کریں گے۔''

میں خاموش رہ گئی۔ میرا خیال تھا سلیکشن میرٹ پر ہوئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی ''آتشِ رفتہ'' نے چونکا دیا تھی۔ اس لیے ان کا حق فائق تھا لیکن ہمیشہ کی طرح دل میں حسد، لالچ اور کینے نے حملہ کر دیا۔ جب فیض صاحب آئے اور کچھ عرصہ ملتے رہے تو میں نے اسی حسد کے تحت کہا ''فیض صاحب! اگر آپ جمیلہ کو میرٹ پر لے جاتے کوئی افسوس نہ ہوتا لیکن آپ نے حق ہمسائیگی بھی ادا نہ کیا۔''

یہ بات کہیں فیض صاحب نے پلے باندھ لی اور جب دوبارہ سونار دیس جانے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے بھی لے گئے۔ اس ٹرپ کا مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ فیض صاحب کے پاس ایک ہی ہوائی جہاز ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے کا ہوا۔ سفر میں عموماً انسان اپنے ہم سفروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی بنیادی خصلت ہوتی ہے۔ وہ بار بار دکھائی شخصیت سے جھانکنے لگتی ہے۔

فیض صاحب کو کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ وہ اپنی ضرورت کو اُجاگر کرنے کے عادی نہ تھے۔ غسل خانے میں گندے تولیے پڑے مل گئے، اُن ہی سے نہا لیتے۔ میز پر پسند کی ڈش دوسروں نے کھا لی اور اُن کو ہاتھ روکنا پڑا تو خوشی سے کچھ اور کھا کر اُٹھ گئے۔ کپڑے لانڈری میں بھیجے۔ واپس آنے میں تاخیر ہوئی۔ پرانے کپڑے ہی اٹھا کر چڑھا لیے۔ جوتوں کو پالش کرنے پر اصرار نہیں۔ فرنٹ سیٹ پر معتبر بن کر بیٹھنے کی خواہش ندارد۔

فیض صاحب کی جھکی جھکی آنکھیں، نرم لہجے، ترنم بھری آواز سب مجھ پر اثر انداز ہوئی۔ ان جیسا بننے پر میں

کیا۔ میں جانتی تھی ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق سیکھتا ہے اور بسا اوقات بڑے لوگوں کی شناسائی اسے
ہوتی ہے لیکن وہ اس شخصیت سے کچھ بھی سیکھ نہیں سکتا۔
کچھ عرصہ بعد فیض صاحب 75۔جی نہ آتے۔ بس اردو بورڈ چلے جاتے۔ کبھی خاں صاحب نے ان ملاقاتوں
کے بارے میں کیا۔ بس اتنا بتاتے۔ ''فیض صاحب آج آئے تھے۔''
میں نے کبھی ان ملاقاتوں کی تفصیل نہ پوچھی۔
جب ہم 121۔سی میں منتقل ہو گئے تو فیض صاحب نے ہمیں بھلایا نہیں۔ وہ کبھی کبھی بلا تکلف چلے آتے۔
کسی بغیر دکھلاوے اور Show off کے ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ میری ان سے ملاقات کم کم ہوتی۔
جب میری کتاب ''امربیل'' چھپی تو اس کا فنکشن درپیش تھا۔ ہمارا معیارِ زندگی بڑھ چکا تھا۔ ایک روز ہم فیض
کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو میں نے بڑی جرأتِ رندانہ سے کہا: ''فیض صاحب! میری کتاب کا فنکشن ہو
آپ اس کی صدارت کر دیں گے؟''
''کر دیں گے۔'' انہوں نے سادگی سے کہا ''کارڈ بھجوا دینا۔''
اسی پر خاں صاحب کہنے لگے..... ''بھئی اتنے بڑے شاعر کو صدارت کے لیے کہتے ہوئے تمہیں خوف نہیں

ان کی بڑائی کا مجھ پر اس وقت کوئی تھور موجود نہ تھا۔
فنکشن ہوا۔ اس میں باب ہیز نے مجھ پر مضمون پڑھا۔ خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید
نے مضمون پڑھے اور وہ خوبیاں بیان کیں جو نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں۔
فیض صاحب وقت سے کچھ پہلے پہنچے۔ بڑی توجہ سے مضمون سنتے رہے۔ فنکشن کے اختتام پر اٹھے۔ روسٹرم پر
تقریر کی۔ افسوس اُن کی تقریر زبانی تھی اور تب ابھی ٹیپ ریکارڈ کا رواج نہ تھا، اس لیے وہ سنہری الفاظ ضائع

سامانوں سے زاد اور اشیاء کی فراہمی انسان کے اندر جو فرحت پیدا کرتی ہے، اس کا گہرا تعلق ہر انسان کی ذاتی
ہے۔ کئی بار ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو نہ ہماری ضرورت ہوتی ہے نہ خواہش۔ ایسی صورت میں اشیاء کا
حصول بن جاتا ہے۔
75۔جی میں تھوڑی دیر کے بعد خاں صاحب نے فوکسی کار خرید لی۔ 7262 نمبر کی یہ فوکسی گویا ہم سب کے
پیار اضافہ تھی۔ بچے تو کار پر لٹو تھے لیکن باپ کی طرح وہ جذبات کو ابھی سے چھپا جانے والے تھے۔ سکول
آتے جاتے چوری چوری اس کے پاس رُکتے، نظر بھر دیکھتے جیسے کوئی نوجوان محبوبہ کو غٹ غٹ پی جانے کے
کیا کرتا ہے۔
اس فوکسی نے ہماری زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ دن کے وقت تو خاں صاحب کام پر اور بچے
ہوتے لیکن شام کو اس پر عموماً باہر جانے کا اتفاق ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چوری چوری آپس میں اس کی باتیں بھی

کرتے، لیکن ہمیں خبر نہ لگتی۔

75۔ جی میں سب سے بڑا واقعہ ''دھوپ سائے'' فلم تھی۔ پتہ نہیں انہیں فلم بنانے کی کیونکر سوجھی۔

اندر ہی اندر سوچتے رہتے کہ پاکستان میں جاگرتی کرانا اور عوام کو پاکستان سے محبت کے لیے تیار کرنا ہر ادیب

ہے۔ اس فلم کی بنیادی تھیم بھی یہی تھی کہ یہاں منافع خوروں کے خود غرض طبقے نے دولت کمانے کے لیے

ہتھکنڈے اور راستے تلاش کر لیے ہیں۔ آفتاب احمد جعلی ادویات بناتا ہے اور اُس کے ہاتھوں کئی مریض مر جاتے

آخر میں جب انجام کار وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ رہ جاتے ہیں ''کوئی گولی کوئی

نہیں۔ یہ تو کیفرِ کردار تک پہنچنے کی پاداش میں ہے۔''

اس فلم میں قوی نے شرابی، منور توفیق نے تائب طوائف، عطیہ نے بیمار بچے کی ماں کا رول کیا تھا۔

ان ایکٹروں سے ضرور واقف ہوں گے کیونکہ اُنہوں نے اپنے عہد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

نیکی اور بدی کا جو گہرا تعلق ہے اور معاشرہ ان کے نرغے میں جس طرح آیا رہتا ہے ''دھوپ سائے''

بڑی اچھی مثال تھی۔ قوی شرابی اور منور توفیق تائب طوائف ہے جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہے۔ یہ دونوں

کے راندہ درگاہ ہیں۔ دوسری جانب آفتاب احمد جو سوسائٹی میں دولت کی وجہ سے بہت عزت دار ہے۔

اپنائیں۔ یہاں خاں صاحب نے منٹو اور مفتی جی کی طرح طوائف اور شرابی کی بڑی طرف داری کی ہے۔

اسی فلم میں جب زہرہ تائب ایک درخت تلے بیٹھی گا رہی ہے۔

''شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو''

تو کٹڑی کا ایک بزعم خود شریف آدمی خفروا اسے پوچھتا ہے ''بول ری آپا زہرہ کون ہے تو؟''

جب آپا زہرہ کی بے عزتی عروج کو پہنچتی ہے تو شرابی کہیں سے آ ٹپکتا ہے اور کہتا ہے...... ''چل

ایک شرابی ایک طوائف، ہم دونوں اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں۔''

خاں صاحب نے فیروز پور روڈ کی مین سڑک سے ہٹ کر ایک کٹڑی کرایہ پر لے رکھی تھی اور اسی

شروع کر دی تھی، لیکن اردو بورڈ کا ٹنٹا بھی ساتھ تھا۔ وہ بیچارے بڑی مشکل میں تھے۔ ایک روز میرے

اور بولے۔

''کیا کر رہی ہو قدسیہ؟''

''بس جی بچے آئے ہیں۔ کھانا تیار کر رہی ہوں۔''

''فضول جھنجھٹ چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔''

''اور جی بچے؟''

''انہیں بھی ساتھ لو...... شفٹ کا کرایہ پڑ رہا ہے۔ کیمرہ مین بڑے نخرے والا آدمی ہے۔''

میں اور بچے فوکسی میں سوار ہو گئے۔

کٹڑی کا عجب سماں تھا۔ ایک جانب بوسیدہ سے تین چار کمرے، پھر کھلا اُجاڑ آنگن اور سامنے تنور

سا تنور تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر خاں صاحب ایک اضافی ذمہ داری ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے جس طرح مجھے
ساتھ رکھا۔ اب بھی وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس وقت سلیم خواجہ اپنے
سامان سجائے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔

ہمیشہ کی طرح خواجہ جی نے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"باقی سب کچھ تمہیں خواجہ جی سمجھا دیں گے۔"

مجھے بیچ دریا کے چھوڑ کر خاں صاحب اردو بورڈ میں بیٹھ گئے۔ اس وقت "شامِ شہرِ ہول" کی شوٹنگ ہونے والی
تھی۔ پہنا کر قدیر ملک درخت کے تھڑے تک لے گئے۔

میری قوی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت ریہرسل جاری تھی۔ قوی کا چوبارہ شاہدہ کے تنور کے ساتھ ساتھ
... پر جاتا تھا۔ قوی کو اُن سیڑھیوں سے تھکا ہارا اُترنا تھا۔ گانے کا ٹیپ جاری تھا۔ منیر نیازی کے بول ساری
... رہے تھے۔ کیمرہ مین تصویر بنا رہا تھا۔ کچھ تو مجھے یہ اتھارٹی سر کو چڑھ گئی۔ پھر قوی کی سعادت مندی نے
... کردی۔ میں فرعون صفت آرڈر دینے پر مامور ہوگئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ ٹیک پوری بارہ مرتبہ Re-take ہونے کے بعد مکمل ہوئی۔ پندرہ مرتبہ اوپر نیچے کی
... نڈھال ہو کر اُترا تو واقعی وہ منیر نیازی کا ہیرو لگ رہا تھا۔

... تک قوی کے ساتھ مراسم جاری ہیں۔ قوی خاں میں جو پٹھانی لہو ہے، اس میں وہی اظہار کی کمی ہے جو
... گئے پن اور منیر کے موسموں کی جیب میں چھپا ہوا تھا۔ قوی نے ناہید سے شادی کی تو بھی اس نے ہمیں
... شادی کا ذکر اتنے دبے لفظوں میں کیا گویا کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بھاگ گیا ہو۔ قوی کی شخصیت
... اور دوسرے مردوں پر شاید فرعونیت کا پرتا ہو لیکن تمام عورتوں کو قوی کی شرم وحیا نے ہمیشہ متاثر کیا۔ نگاہیں
... کرنے والے قوی سے کبھی کسی ایکٹریس کو گلہ نہ ہوا۔

... اپنے اندر ایک خاص قسم کے نظریئے کو پالتا ہے۔ اشفاق صاحب نے ایسا ادب پیدا کیا جو پاکستان
... لیکن ایک اور بات پر وہ مُصر نظر آتے تھے۔ وہ جیو اور جینے دو کے پرچارک تھے۔ کہانی "گڈریا" سے
... تک وہ اس سلوگن کا شکار رہے۔ انہوں نے مفتی جی کی طرح ادب میں کئی کروٹیں لیں۔ بس وہ اسی مسلک
... سے لکھتے رہے لیکن ہر انسان میں توازن کی کمی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے مسلک میں بھی کبھی توازن قائم نہیں کر
... اس قدر محنت میں گم ہو جاتا ہے کہ اسے آرام، خوشی اور خاندان کی پروا نہیں رہتی۔ اسے جو راحت اور خوشی
... توازن کے باعث اسی محنت میں ملتی ہے۔ جو آدمی دولت کو بے دریغ استعمال کرنے کا عادی ہو اسے کبھی
... بچے، کفایت کا ہاتھ پکڑنے اور ضرورت بھر خرچنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سوشل آدمی اگر اس درجہ ملنسار ہو جائے
... وقت کا مصرف صرف یار باشی میں نظر آنے لگے تو اسے پھر نکما، نکھٹو اور دوسروں سے مانگنے والا بن کر گزارہ کرنا

خاں صاحب میں بھی کسی حد تک توازن کی کمی تھی۔ وہ جیو کی حد تک تو اپنے مسلک پر قائم تھے، جینے
پرواتھے۔ اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے ''جینے دو'' کا مطلب اُنہیں سے سمجھ میں آیا کہ ان کو آزادی دی جا
چاہیں کریں۔ وقت اور مداخلت ان پر ضائع نہ کریں۔ اگر جینے دو اور جیو میں توازن ہوتا تو اُنہیں بچوں سے
دلجوئی اور مشکلات کا باہمی حل مل جل کر نکالنا پڑتا۔ اپنے لیے بھی انہیں جینے دو کی کبھی سمجھ نہ آئی۔ وہ زیادہ کام
سوتے، اپنی صحت کی طرف سے بے توجہی برتتے رہے۔ زندگی کے کئی خانے ہیں لیکن ان میں پیشہ، خاندان
ان سب میں وقت کی بانٹ اور توازن نہ ہو تو کسی نہ کسی کے ساتھ ناانصافی کا انسان مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

جب ہم 75۔ جی میں تھے تو ٹیلی ویژن کی آمد نے خاں صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ اب نا
کتابوں سے نہیں ٹیلی ویژن سے اخذ کریں گے۔ نئے راستوں کی تلاش ''اُپج'' سوچ کی نئی منزلوں نے اُنہیں
اُکسایا۔

''دھوپ سائے'' ایک آرٹ فلم تھی۔ اس کی بنیادی تھیم یہی تھی۔ ''جیو اور جینے دو''۔ اس کی کہانی
میں رہنے والوں کی کہانی تھی۔ اس محلے میں رکشا ڈرائیور، ایک بیمار بچے کی ماں، ان پڑھ پھیری والا۔ ایک
نیکی اور بدی میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے پھرتی تھی۔

خاں صاحب جن دنوں ''دھوپ سائے'' کے سکرپٹ کی ذہنی تیاری میں مبتلا تھے۔ ہوائی جہاز ٹیک
سے پہلے تیل پانی چیک ہو رہا تھا۔ انجن اور پہیوں کی ہوا کو جانچا جا رہا تھا۔ خاں صاحب گومگو کے عالم میں بر
بڑے کمرے میں کچھ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے۔ وہ ہر ہر قلم کو ٹیسٹ کرتے اور دیکھنا چاہتے کہ ''دھوپ
سکرپٹ کس پن سے لکھیں گے۔ کونسی سیاہی موزوں ہے۔ کونسا کاغذ محبوبہ کی جلد جیسا ملائم جان پڑتا ہے۔
مختلف شیفر، پارکر، ڈالر، سستے قیمتی قلموں کی ٹرائی جن کاغذوں پر کی گئی میرے پاس ان کاغذوں اور
انبار ہے..... پن منتخب کرنے کے بعد کاغذوں کی باری آتی۔ کھلی لائنوں والے تنگ لائنوں والے۔ فل سکیپ
ہر قسم کی ڈائریاں غرضیکہ اشفاق احمد صاحب جب بھی لکھنے کا عمل جاری کرتے، ان کے لیے تیاری، ہشیاری اور
کا عمل ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ انہیں سٹارٹ لینے میں دقت پیش آتی۔ اپنے تخلیقی گھوڑے کو سانٹا مار کر ریس
کرنے میں مرحلہ وار تیاری کرنی پڑتی۔ جا بجا مختلف کاغذوں پر رنگ رنگ کے پنوں سے بے ربط، بار بار
کے بعد ناک کے بالوں کو دائیں ہاتھ کی اُنگشتِ شہادت سے کھینچتے ہوئے ابروؤں کے لمبے بال جڑ سے اُکھاڑ
کے دوران وہ اپنے ٹاپک، کہانی، مضمون کے متعلق سوچتے چلے جاتے۔

عام طور پر وہ قلم testing کرتے وقت ''اس کے علاوہ'' سے شروع کرتے تھے۔ کبھی کبھی قلم سے
اظہارِ خیال کر دیتے۔ ان کے برعکس مجھے کاغذ، کاپی، پن میسر آ جاتا، وقت ملنے پر میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔ مجھے
لوگوں نے لکھتے دیکھا ہوگا کیونکہ میں عموماً خاں صاحب کے دفتر جانے کے بعد بچوں کے سکول، کالج سے واپس
جو کچھ بھی دماغ میں ہوتا، کاغذوں پر اُتار لیتی۔

میرے ایگل کے پن میں سیاہی ہمیشہ شفو بھرتے۔ میری میز پر کامن پنیں، کلپ، ڈائریاں دی

میں بھی وہی ڈالتے۔ ابھی تک مجھے پن میں سیاہی بھرنا نہیں آیا۔ نہ قلم کو لکھ کر چیک کرنے کی صلاحیت ہی
تم وہی چیک کرنے کے عادی تھے۔
تم اور کاغذ کی آمادگی دیکھ چکنے کے بعد وہ تخلیقی علم کی انگیخت کے لیے تھوڑا تھوڑا کئی کتابوں سے چر چگ لیتے۔
پر آمادہ ہو جاتا، قلب اپنی بات پیش کرنے پر motivate ہو جاتا۔ ایسے میں مطالعہ رنگا رنگ ہوتا۔ فکشن وہ
تھے۔ شاعری کی کتابیں بھی، اقبال، غالب، فیض، فراز، ناصر کاظمی کی زیرِ مطالعہ رہتیں۔ میرا اُن سے یہاں
اختلاف رہتا۔ مجھے اقبال کی نسبت غالب پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ خاں صاحب سوچ سے وابستہ انسان
کرد دیر تک سوچتے رہتے۔ پچھلے بیس پچیس سال میں اُن کا مطالعہ Comparative Religions کی
ہو گیا تھا۔ وہ رنگ رنگ کی انفرمیشن، مختلف مذاہب کا اندازِ فکر سمجھتے ہوئے کبھی کبھی لکھنے سے پہلے اُن کے
لگتے۔

انیس کی کلاس

جس طرح اینق کے شاگرد مفت ٹیوشن حاصل کرنے ماڈل ٹاؤن آتے تھے۔ اسی طرح جب انیس ایم بی اے
تو داستان سرائے میں اس کے ہم جماعت، ہم درسوں کی رونق بڑھ گئی۔ انیس کے ساتھ پڑھنے والے
صاحبان سے پڑھ چکے اور اُن کے پلے کچھ نہ پڑتا تو سب سائیکلوں پر، کاروں پر، موٹر سائیکلوں پر سوار
آ جاتے۔ لان کی طرف کھلنے والے بڑے کمرے میں اب اصلی جماعت شروع ہو جاتی۔
یہاں کوئی بلیک بورڈ تھا نہ کوئی نقشہ جات، صرف غسل خانے کے ساتھ والی دیوار تھی جس پر گہرا نارنجی پینٹ
شاہد افضل تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاک اور ڈسٹر ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ہم جماعتوں کو پڑھاتا رہتا۔ اسی خیال
نے کے کمرے کی کالی میز اُن دنوں برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ تھی۔ دس بارہ لڑکے اس
بیٹھ جاتے۔
افضل پیدائشی گرو تھا۔ وہ نہ سوال جواب سے گھبراتا نہ مناظرے سے بھاگ جانے کی صورت پیدا کرتا۔ سچ تو
افضل کی محنتوں کا ثمر تھا کہ سارے لڑکے اچھے نمبروں سے ایم بی اے کر گئے۔ کلاس میں کچھ شاگرد قابلِ ذکر
ہشم، تحسین اور انیس خاں۔ طالبات میں عاصمہ، شگفتہ اور نغمہ پیش پیش تھیں۔ شگفتہ کے ذمے کلاس کے لیے
شگفتہ غریب الطبع تھی۔ درمیانی شکل اور ذہانت کے ساتھ اُس نے خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جب وہ
پر پانی ختم ہو گیا ہے تو فوراً اندر باورچی خانے میں پہنچ جاتی۔ یہاں اُن دنوں پانی فلٹر کرنے والی مشین لگی
پہنچ کر وہ پانی بھرتی، جیونی بہن سے دو چار باتیں کرتی۔
"آج کیا پکایا ہے انیس کے مہمانوں کے لیے جیونی بہن۔"
"آج تو ثابت مسر ہیں اور کڑھی۔"
پھر دوسرے دن جواب ہوتا۔ "آج شگفتہ بی بی توے والا قیمہ اور آلو گوشت۔"

یہ خاں صاحب کے ڈیرے کا ازلی Menu تھا۔ نہ جیونی بہن اس کے علاوہ کچھ پکاتی تھیں نہ کبھی ہمیں آتا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن تو گھر پر تھا لیکن اس پر وہ کھانے پکانے کی ترکیبیں نہ دکھائی جاتی تھیں۔ ابھی ہوٹلوں گھروں میں نہیں گھسے تھے۔

نغمہ اپنے نوٹس بخوشی اُدھار دے دیتی اور عاصمہ کلاس کا حسن تھی۔ جس طرح ڈریس ڈیزائنر کے خاص ماڈل کی وجہ سے مقبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح عاصمہ اپنی اداؤں، طرحداریوں کے باعث مقبول تھی۔

تحسین اُن دنوں کلاس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتا۔ شاہد افضل اپنی موٹر سائیکل کی چابی تحسین کو دیتا۔ پھر جب تک وہ اپنے گھر نہیں جاتا، چابی تحسین کے پاس رہتی۔ شاہد افضل میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ سے کچھ دور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کی ڈینگیں مارنا شاہد افضل کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس نے کبھی جماعت کو اپنے پچھلے Status سے مرعوب نہ کیا۔ خاں صاحب کی طرح پٹھان بچے نے کبھی اپنے نام کے ساتھ خان نہیں لکھا۔ وہ ہر جگہ اپنے میرٹ کا سہارا لیتا۔

اب 2007ء ہے۔ شاہد افضل امریکہ میں پی آئی اے کا C.E.O. مقرر ہے لیکن وہاں بھی وہ اپنے کام کے سر پر کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کا دیا کھاتا ہے۔ اُس کی پہلی بیوی سعدیہ اُس کی جھینپو طبیعت سے عاجز آ کر

بچگان اور اُن کے دوست

ے گھر میں آ کر ماحول کی تبدیلی' حالات کی تبدیلی' کام کے اوقات میں نیا پن پیدا ہو گیا۔ فراغت کے ملتے
نئی سوچیں لے کر کھل گئیں۔ تعلیم و تربیت کی جہت بھی نئی تبدیلی سے آشکار ہوئی۔
ہی ایک کھڑکی جب کھلی تو میں نے خاندانی نظام کے متعلق کچھ زیادہ ہی توجہ سے سوچنا شروع کر دیا۔
اور مغربی نظام میں کتنی مماثلت اور کتنا بعد ہے؟ کیا مشرقی معاشرے کی تنظیم مکمل طور پر خاندان کی مرہون
مغرب کو سیکولر سوچ اور جمہوریت نے تو خاندانی نظام کی افادیت سے منکر نہیں کر دیا؟ کیا ہمارے ملک میں
ترقی کی راہ میں مذہب اور خاندانی نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے؟ 75ء تک ایسی سوچ اور ایسے
مجھے کبھی زیادہ سوچنے پر مجبور نہ کیا تھا۔ اب بھی میں نے کسی سے مشورہ کر کے' اپنی سوچ کو مناظرے کی شکل نہ
سوچ میں فار اینڈ Against دونوں طرف سے دلائل مجھے خود دینا ہوتے تھے۔
سوچنے پر مجبور تھی کہ معاشرتی نظام میں شادی سب سے بڑا نظام ہے۔ اس ادارے کی بقا میں مستقبل کا تحفظ
ت میں محفوظ ہے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ مغربی تعلیم اور کلچر کی قدم قدم پذیرائی سے مشرقی Idealism مر رہا
نظام کو بھی دھچکے لگ رہے تھے۔ بنیادی طور پر کوئی نظام یا ادارہ آدرشوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
ہی آدرشوں کی یک جہتی جماعت' نظام اور ادارے کو مضبوطی اور استقامت بخشتی ہے۔ ان ہی آدرشوں کی
ادو جود میں آتی ہے' لیکن یہاں پھر ایک خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس قدر جڑے رہنے کے باعث مرد اور
کی عموماً آزادی بھی مجروح ہونے لگتی ہے۔ مغربی معاشرے نے فرد کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت
ے۔ وہاں ہر شخص کو یہ زعم ہو گیا ہے کہ وہ قانون کی پابندی کے بعد فرد کی سطح پر مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ کسی کی دخل
نے کو تیار نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اکیلا کافی ہے۔ شخصی آزادی کی آرزو میں مبتلا مرد اور عورت اپنے فیصلے کو
ی لیے جنس اور محبت کی جب تک ذاتی طلب رہے شادی برقرار رہتی ہے۔ جب اندر کے جذبے ٹھنڈے پڑ
ی جوان دنوں ضرورتوں کی کفالت کرتی ہے' اسے برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شخصی آزادی میں حقوق

اور فرائض کی مانگ برابر ہوتی ہے لیکن خاندانی نظام میں بات انسانی حقوق (Human Rights) کی نہیں ہوتی
اپنے حقوق چھوڑ کر بنتا ہے۔

کبھی کبھی بچوں کی معصومیت اور بے بسی کے حوالے سے ماں باپ کو مکمل طور پر اپنی آزادی، خوشی
کو تج کر مستقبل کی سنہری کنجی ملتی ہے۔ اتنا ایثار، قربانی اور انتظار آج کی عورت کے بس کا نہیں۔ راستہ کہیں
جس کا علم ہر فرد کی سمجھ اور صلاحیتوں پر ہے۔

بھلا کوئی شخص شادی کیوں کرتا ہے؟

آپ شادی سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

کچھ لوگ ابھی سوچنے کے قابل بھی نہیں ہوتے جب ان کی شادی ماں باپ کی مرضی سے کر دی
لوگ بڑی تابعداری سے ماں باپ کی خاطر، مذہب کی انگلی پکڑ کر شادی کو کامیاب بنانے میں مگن رہتے
نزدیک بچوں کو سرے چڑھانے کا عمل ہی شادی ہے۔ پرانے زمانے میں ایسی شادی ڈولی سے لحد تک ایسے
سہارے نبھ جاتی تھی۔

مغرب میں بھی پہلے یہی مسلک تھا۔ رابرٹ براؤننگ کے اشعار دیکھئے۔

Grow old along with me

The best is yet to be

The last of life for which

The first was made

Our lives are in his hand

لیکن وقت بدل چکا ہے۔

Elizabeth Barret Browning کے ساتھ تو رابرٹ کی نبھ گئی..... لیکن اب مغرب اس
چکا ہے۔

شاید آج کا مرد اس لیے شادی کرتا ہے کہ وہ عورت کی کفالت کر کے اس پر اپنی برتری ثابت کر
کفالت کرنا پیسوں کی حد تک محدود نہیں اور پہلے زمانے میں مرد اس ذمہ داری کو محسوس تک نہ کرتے تھے
فاتح قسم کے مردوں کا رویہ کرخت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف آج کی عورت شادی کے بعد مرد کی خدمت
بجائے اسے تبدیل کرنے کی موشگافیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں مفاہمت کے بجائے مسابقت
احتمال رہتا ہے۔ انسان محبت بھی کرے اور سیانا بھی ہو، ناممکن ہے۔ ایسی عورت سے محبت کرنا جو آپ کو ذلیل
کانٹوں سے شہد چاٹنا ہے، لیکن یہ خوف کی رنگ برنگی شکلیں ہیں۔

آج کا ماڈرن مرد اور عورت بھی بچوں پر بہت زور لگاتے ہیں لیکن اس کی وجہ خوف ہے خوف خدا
باپ بچے کو خدائی مہمان نہیں اپنی ذات کی پروجیکشن سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا سارا زور بچے کی تعلیم

...یت کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے۔ یہ عہد دولت' دولت کے حصول اور دولت کے بل بوتے پر اپنی حیثیت ...ے جو کچھ اس خواہش کی آگ میں جھونکا جا سکے اس سے آج کا ماڈرن انسان دریغ نہیں کرتا۔

...ی کا خوف جب معاشرے کا وائرس بن کر پھیلتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے حالات سے سرد مہری بن کر ...ت فرد کی سطح پر اور معاشرے کے مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزقِ حرام کی یا پھر خودکشی یا خودکش حملے کی شکل ...ت اختیار کر لیتا ہے۔

آج کل کے نوجوان کسی خاص آدرش کے تحت شادی نہیں کرتے۔ عموماً وہ اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ ...یہ سمجھ کر اپنا عکس ساتھی کے وجود میں دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ کچھ فقط مسابقت سے خوفزدہ' فقط اپنا ...نے کا سوچ کر شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کوئلے کی طرح ہے۔ یہ گرافائٹ ...بھی ہے اور ہیرا بھی...... دباؤ سہہ جائے تو ہیرا ہے ورنہ معمولی کوئلہ..... اسے بدی سے نیکی اور متعفن بدی کا ...یں لگتی۔ اسی لیے ہر انسان اپنی سوچ' عمل' رویے کے مطابق شادی کو فرحت بخش ٹھنڈا پانی یا کھولتا ہوا ...ہے۔

...ی کی شراکت داری میں شامل ہو کر شخصی آزادی کا خواہاں نوجوان Privacy کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ...جذبات' خیالات' حالات' اشیاء کی Sharing ختم ہوتی ہے' تو خاندان کا ثقل بگڑتا ہے۔ جہاں کہیں خاندان ...ے کے مقام پر فائز ہو کر لینے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں ادارے یا نظام یا جماعت کو مضبوط کرنے کی ...ک افراد چالاکی' خود فریبی اور انا کے چکر میں خدمت کرتے ہیں۔ وہاں آہستہ آہستہ ذاتی طاقت کا سفر شروع ...پھر مرد ہو یا عورت وہ پرورش کا فن بھول جاتا ہے اور اپنی پرورش میں لگ جاتا ہے۔ یہیں سے معاشرے ...یت میں آمریت کا بیج بویا جاتا ہے۔

...م انسان صرف اپنے حواسِ خمسہ کی روشنی میں اپنی جسمانی زندگی کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر سوچتا اور زندگی ...ے اپنی روحانی تلاش کا ادراک تک نہیں ہوتا۔ وہ خدا' اور مذہب سے وابستگی اور اس سے پیدا ہونے والی ...بے خبر ہوا کرتا ہے' اسی لیے اسے نہ شادی کی سمت، نہ اس کی ذمہ داری ہی کا کوئی احساس ہوتا ہے لیکن یہ مت ...کہیں اپنی ضروریات سے ہٹ کر بے لوث خدمت کا تصور پیدا ہوتا ہے' خطرہ وہاں بھی موجود رہتا ہے' کیونکہ ...ں خدمت کا اجر بھی مانگتے ہیں۔ یہاں پھر جماعت کی خدمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان جب اندر ہی اندر ...ت سے سبکدوش ہوتا ہے تو وہ اپنے متعلق سوچتا ہے۔ وہاں پھر Power کا تصور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ...ے چکر میں پھنس جاتا ہے۔

...ن دونوں صورتوں سے بچنے کے لیے اگر انسان کو صرف اپنا کردار' اخلاق اور اندرونی بالیدگی کے سفر کا خیال ...ے وہ اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کے چکر میں ہو تو شاید اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کسی کو مرعوب کرنے' ...اس کو ٹھیک کرنے کا جنون ہو تو شادی اور زندگی دونوں کا سفر رائیگاں جاتا ہے۔

اگر اپنے آپ کو درست کرنے کے ارادے سے انسان کو ایسے تخلیے کی ضرورت ہو جس میں بیٹھ کر وہ عرفانِ

ذات اوراس سوچ بچار کے نتیجے میں اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کے لیے وقت درکار ہوتو اس عزلت نشینی کے لیے
ذیل میں درج ہیں:

1- ملنے والے بار بار گھر آنے والے افسران سے اپنے لیے نوکری میں Extension' بیٹے کے لیے
بیٹی کی ترقی کے لیے اصرار شروع کردیں.....بھیڑ چھٹ جائے گی۔

2- امیر رشتہ داروں سے قرض کی درخواست کریں۔

3- طبقہ اناس کی نوجوان عورتوں' لڑکیوں سے پردے کی خوبیاں' شوہر کی اطاعت اور ہر طرف سے بچ
بیان کریں۔

4- بوڑھی عورتوں کو اپنی اور گھر والوں کی خدمت پر اکسائیں۔ وہ بھاگ جائیں گی۔

5- ملازمین کو ڈسپلن سکھائیں۔ ملازم حضرات اپنی مصیبتوں کو لے کر آپ کے گرد جمع نہیں ہوں گے۔

6- مہمان سے تقاضا کریں کہ وہ گھر آنے سے پہلے اطلاع ضرور دے اور کتنی دیر ٹھہرے گا اس کا تعین پہلے
کردے۔

اس ہدایت نامے پر عمل کرنے سے آپ کو وہ تنہائی نصیب ہوگی جو عرفانِ ذات کے لیے وقف کی
لیکن کچھ لوگ اس ہدایت نامے پر عمل کر کے تنہائی کے اوقات کسی اور منفی عمل کے لیے بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔

انسان کو سمجھنا ویسے ہی بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کی نیت کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے علم غیب
رہنمائی کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو انسان اپنی نیت کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اسی نیت کی بدولت بڑے کھلے
خاص گروہ لوگ جو لمبے سفر میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عزم کرتے ہیں' کبھی شوہر ہیرے کا ہار بھی بڑی
لے آتا ہے اور کبھی آپ ہی کا دوپٹہ اچھی نیت سے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی راتوں کو جاگ کر اندر
والی ماں بھی اپنے عمل کو کھوٹا کر دیتی ہے اور بعض اوقات اچھی نیت سے جاں نثار سید کرنے والی کسی کی عاقبت
موجب بن جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں یقیناً آپ نے مجھ سے زیادہ سوچا ہو گا لیکن میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسا
سائیکل کے ہب کی مانند ہے۔ ساری خوبیوں' خرابیوں کی سپوکیں اسی ہب یا ڈھرے سے جڑی ہیں۔
سپوک ہب سے اکھڑ جاتی ہے' اسی لمحے سائیکل کی رفتار متاثر ہو جاتی ہے۔ نیت کی خرابی کے باعث جو نیکی
کسی خوبی پر نازاں ہونے لگتا ہے' وہ گھاٹے کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچے نہ پہنچے' اس کی اپنی ذات
سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میں چوری چوری خاں صاحب کے اعمال اور اقوال کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کبھی ا
دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کی ازلی غیرت ان کی نیت کو قبلہ رو رکھتی۔ انہیں بارہا دیکھا' بڑی بڑی
آئیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے کسی بھانجے' بھتیجے' بھائی یا اپنے بیٹے تک کو ٹیلی فون ملا کر یہ نہیں کہا کہ مجھ پر یہ
ہے۔ میری اعانت کو آؤ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کسی اور کی چھوٹی سی تکلیف بھی پتہ چلی' فوراً کاسہ گدائی اٹھایا۔ دفتروں کے باہر بیٹھے [illegible] کروا کر لوٹے۔ لوگوں کا بھرم رکھنے کے لیے' ان کی عزتِ نفس کا تحفظ کرنے کے لیے انہوں نے سفارشیں [illegible] سے مانگا' اپنا خرچ کم کیا لیکن میری اتنی ذلت ہوئی' کبھی کسی پر احسان نہ دھرا' کسی انسان کی کمر میں مکا مار کر [illegible] نہیں کہا: "تیری وجہ سے نیت تو دور کی بات ہے، وہ تو پشتی اور موروثی غیرت مند تھے۔ ایک ہب سے ان کی [illegible] کی خوبیاں اور خرابیاں جڑی تھیں۔"

لیکن کیا کیا جائے انسان تو ہمیشہ تضاد کا شکار رہتا ہے۔ یہی ایک خوبی جوان گنت خوبیوں کا باعث ہوتی ہے' یہی خرابی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔

خاں صاحب بھی اپنے نسلی گروپ کی بنیادی خوبی "غیرت" سے آراستہ تھے۔ یوں وہ اپنی Genetics سے [illegible] نہ ہو سکے۔ شاید اسی بنیادی وصف کا ذکر قرآن میں ملتا ہے کہ تم قبیلوں میں بٹ جاؤ تاکہ یہ قبیلے تمہاری [illegible] باعث ہوں۔ ایک اور مثال سے بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ سفید فام قوتوں کی بنیادی خوبی خلق خدا کی [illegible] وہ خدمت کے جذبے کے تحت محبت کا جھنڈا اٹھا کر بڑے جوش و خروش سے رفاہی کام کرتے ہیں۔ اس موقع [illegible] انہیں پہلے بمباری کر کے کسی معاشرے کو تباہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ بڑے جوش سے کسی بستی کو تباہ کر کے پھر اس [illegible] کیمپ' سکول' ہسپتال کھولیں گے اور بے دریغ مدد کریں گے۔ اسی خدمت کا تجزیہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ [illegible] نعم البدل نہیں اور محنت کسی بھی طور خدمت کے درجے کو نہیں پہنچتی۔

خاں صاحب بھی پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے۔ اسی خوبی نے انہیں بہادر بنایا۔ آدرشوں کی مشکل زندگی کو [illegible] سکھایا لیکن اسی خوبی نے ان کے اندر گہری چپ کو جنم دیا۔ وہ اپنے غم اپنی خوشی کو اندر ہی اندر چیونگم کی طرح [illegible] لیکن کسی دوسرے پر اندر کے موسم کا حال نہ کہتے۔ ممتاز مفتی خاں صاحب کو گونگا کہتے تھے۔ مسلسل کرید کے [illegible] دوست ہار جاتے لیکن ان کے لب تک کوئی حرفِ شکایت نہ آتا۔

میں نے خاں صاحب کی اس خرابی کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتی تھی اس رازداری کے باعث ہم نفسی ان [illegible] نہیں۔ وہ غیرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ غیرت مند طبعاً اداس آدمی ہوا کرتا ہے۔ دوسروں کو آسانیاں بخشنے والا [illegible] چپ اداس آدمی تھا۔

مجھے اسی غیرت نے بہت نفع پہنچایا۔ اسی خوبی نے خاں صاحب کو میری پوری کفالت کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں [illegible] تو مجھے کبھی بجری سیمنٹ لانے کو نہیں کہا۔ آپ کو یقین تو نہیں آئے گا لیکن 121۔ سی میں جب ہم آئے تو مجھے [illegible] طرح وہ ڈیوڑھا کام کرتے تھے۔ وہ گھر تعمیر ہوا' کیسے ہوا' کیسے اس کا نقشہ پاس کرایا گیا؟ ٹھیکے دار خادم کہاں [illegible] گیا؟ روڑی چپس بجری کیسے آئی؟ سریا' شیشہ' کنڈے چھکے کون خریدنے گیا؟ میں تو آرام سے بچوں سمیت اس [illegible] وقت آئی جب گھر پینٹ پالش سے چمکتا دلہن کی طرح جگمگاتا کھڑا تھا۔

البتہ جس روز اس گھر کی بنیادیں کھودنے کا دن تھا' ایک روز صبح سویرے خاں صاحب اپنی فوکسی میں آئے۔ [illegible] سے واپسی شادی کرتے تھے۔ میں کھانے کے کمرے میں آنند سے بیٹھی لکھ رہی تھی۔

''قدسیہ.....!''

''جی آپ کہاں؟''

''جلدی چلو اماں جی کار میں بیٹھی ہیں۔''

''تو انہیں اندر لے آئیے ناں۔''

میں نے سوال نہ کیا کہ اماں جی کار میں کیوں بیٹھی ہیں۔ کار تک پہنچنے میں انہوں نے صرف ایک
کیا: ''بچے کہاں ہیں؟''

''سکول جی۔''

''اچھا۔''

اماں جی سردار بیگم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی گوراچٹا خوبصورت خوش مزاج وجود۔ بڑی خوش
میرے سلام کا جواب دیا..... فوکسی روانہ ہوگئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

جہاں اب 121۔سی ہے اس گھر کے بائیں ہاتھ سکھوں کے زمانے کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ باقی سا
حد تک اجاڑ تھا۔ کار عین اسی جگہ آ کر رکی جہاں اب داستان سرائے کا بورڈ نصب ہے۔ بادامی رنگ کی فوکسی
صاحب اترے۔ میں بھی ان کی دیکھا دیکھی اتر گئی۔ اماں جی کسی سہارے لاٹھی کے بغیر آرام سے اتر کر خاں صاحب
ساتھ ہو گئیں۔

فضا میں تازہ مٹی اور اماں جی کے عطر کی خوشبو تھی۔ شاید آپ کو خیال آئے کہ اتنے برس گزر جانے کے
میرے اصلی جذبات میرے ذہن میں دھندلا گئے ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت بھی خاں صاحب او
کے تعلق پر حسد نہیں آیا۔ میں اس وقت بھی اپنے آپ کو غاصب سمجھتی تھی۔ آج بھی میرا خیال ہے جو نوجوان بہو بیٹے
کے حقوق کو اپنے حقوق پر فائز نہیں سمجھتی وہ بڑی غلطی پر ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اجاڑ سی جگہ پر سڑک پار ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ ٹیوب ویل کا شفا
تھا جو ماڈل ٹاؤن میں پانی کی ترسیل کا کام تھا۔ برساتوں میں پانی نالے سے نکل کر آہستہ آہستہ دور تک رسنے لگتا
زمین کے دائیں طرف سر ظفر اللہ خاں کا پرانا سکھوں کے عہد کا بنا ہوا گھر تھا۔

بائیں جانب بھی سکھوں کے عہد کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ سر ظفر اللہ کی کوٹھی ہمارے آنے تک ان کی
ملکیت بن گئی..... لیکن وہ لندن میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ پاکستان آتی اور ربوہ جاتی تو ان کی طرف سے محبت
چارے کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ ایک بار وہ مجھے ربوہ بھی لے گئی جہاں میں نے کالج کے ایک بڑے فنکشن میں شمولیت کی۔

ہماری زمین پر دو تین مزدور صورت آدمی کھڑے تھے۔ پھر ایک جھگی سے محمد علی ہمارا پرانا خدمت گ
ٹھیکیدار خادم برآمد ہوئے۔ ہم وہاں پہنچے جہاں بچوں کا بیڈروم بنا۔ خادم نے آتے ہی خاں صاحب اور اماں جی کو سلا
اور اماں جی سے دعا کی استدعا کی۔ اماں جی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہم سب نے تقلید کی۔

پھر اماں جی کے ہاتھ میں گینتی پکڑا کر کہا: ''اماں جی! یہاں ٹک لگا دیجیے۔ کھدائی ہم خود کر لیں گے۔''

تندرست تھیں۔ ایک ہی ہلے میں کافی گہرا تک لگا دیا۔ لیجیے داستان سرائے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس کے بعد
کیونکر بنا۔ اس میں کیا کیا بکھیڑے تھے۔ کیا کیا اڑچنیں تھیں' مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی تھی
کا حساب کتاب رکھتا تھا اور عبدالرزاق رات کو دفتر کے بعد جھگی میں سامان کی نگرانی کے لیے ہوتا تھا۔ جس روز
خاں صاحب مجھے لے کر یہاں پہنچے۔

پھر سامنے جیسے کھل جا سم سم سن کر ایک بنا بنایا پختہ گھر پلک جھپکے وارد ہو گیا۔ خادم ٹھیکیدار برآمدے میں کھڑا تھا۔
کے فرش فیشن میں ہیں۔ کچھ وی آئی پی فرشوں کو ٹیک کی لکڑی سے وینیر کر رہے ہیں لیکن 1970ء میں
فرش انتہا تھی۔ جوں جوں وقت بدلتا ہے ایجادات نئی چکا چوند لے کر در آتی ہیں۔ فیشن بھی تبدیلی کے آشنا ہو
سنگ مرمر اور لکڑی سے آبنوسی فرش چکائے جاتے ہیں۔ آگے جانے کیا ہوگا۔

خادم کے ہاتھ میں گھر کے مین دروازے کی چابیاں تھیں۔ ہم دونوں کے آنے پر اس نے بڑے فخریہ انداز میں
کھول دیا۔ خاں صاحب کو چابی دینا چاہی۔

''مجھے کیوں چابی دے رہے ہو۔ بھائی مالکن کو دو..... یہ جانے اور اس کی چابیاں.....''

میں کچھ محجوب' کچھ دنگ' کچھ پریشان لمبے برآمدے میں چلنے لگی۔ ساتھ ساتھ خادم نے پہلے گیسٹ روم پھر
پھر بچوں کے کمروں کے تالے کھولے..... اوپر جانے والی سیڑھیاں دکھائیں۔

''بی بی جی اوپر ابھی صرف خاں صاحب کی لائبریری ہی بنی ہے۔''

''بہت ہے خادم بہت ہے۔ ہماری ضرورت کے لیے بہت ہے۔''

''پتہ نہیں جی کیا بات ہے آج محمد علی اور عبدالرزاق نہیں آئے۔''

یوں لگتا ہے کہ محمد علی وفاداری کا سمبل بن کر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے سارے گھر کا حساب کتاب لکھا اور
کی لکھی ہوئی یہ کاپی ابھی تک موجود ہے جس میں پائی پائی کا حساب ہے۔ عبدالرزاق رات کو گھر میں سویا کرتا
خوب نگرانی کرتا تھا۔

''مرید کام کر رہا ہے خاں صاحب اس سے مل کر جائیے گا۔''

اچھا.....'' لیکن انھوں نے میرے ساتھ گیراج کا چکر نہیں لگایا۔ مرید گیراج میں لکڑی کا کام کیا کرتا تھا۔ کوٹھی
کے بعد اس نے گھر کے لیے پلنگ' بنچیں' شیلف' کتابوں کی الماریاں بھی تیار کیں۔ ہم اپنے ساتھ وہ تخت
سیٹ' کھانے کی میز کرسیاں لائے جو کچھ سامان تو شیخوپورہ میں مہاجرین کا سامان نیلام ہونے کے وقت خریدا گیا
کچھ ادھر ادھر سے اکٹھا ہو گیا تھا۔

جس طرح بنا بنایا گھر مجھے ملا' اسی طرح سامان ڈھونے' اس کو فرنیچر سے سجانے' اس میں پرانے پردے ٹانگنے'
پنکھا جلانے کا سب انتظام موجود تھا۔ میں نے ان امور خانہ داری میں نہ کوئی دلچسپی لی نہ یہ سمجھا کہ مجھے کسی قسم کے
ضرورت ہے۔

اس گھر کے پہلے مکین خاں صاحب' انیق' انیس اور اثیر اور بانو قدسیہ مقرر ہوئے۔ 75۔ جی کا گھر بڑی لاتعلقی

سے چھوڑ کر ہم لوگ ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔ ابھی بچگان ڈویژن ماڈل سکول میں رمضان بھائی کے ساتھ جاتے تھے' لیکن یہاں سے سکول کا فاصلہ کافی تھا۔فوراً ہی سائیکلوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔

تینوں بچے ماسٹر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں Discussion کرتے۔

''بھئی لینا ہے تو ریلے کا سائیکل ہی لینا ہے۔''

''ابو کی ہو پر مل گئی ہے۔اب وہ نیا سائیکل لے کر نہیں دیں گے۔''

''ہم تینوں کیسے ایک ہو پر جا سکتے ہیں سکول؟''

انیق بہادر بن کر کہتا..... ''تم اثیر ڈنڈے پر لالہ کیریئر پر اور میں سائیکل چلاؤں گا۔''

''اور بستے؟''

''وہ بھی ہوں گے تمہاری گود میں۔''

یہ مباحثے ضرور ہوتے لیکن جونہی میں کمرے میں پہنچتی' وہ تینوں چپ ہو جاتے۔ یہ بات یہاں اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ میں آپ کو کچھ بچوں کی طبیعت کے متعلق اور کچھ اپنی اور خاں صاحب کی تربیت کے متعلق عرض کر سکوں۔ اسے میرے بچوں کی جبلتی کمزوری یا پیدائشی گونگا پن کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا کبھی برملا اظہار نہ کرتے۔

شاید اسی لیے ان میں مسابقت کا جذبہ کم ہے۔ ہو سکتا ہے اسی گونگے پن نے ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہونے دی کیونکہ منوانے والا عموماً لیڈر صفات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ وہ مکا دکھا کر' میز بجا کر' انگلی اٹھا کر دوسروں کی بات رد کر دیتا ہے۔ آج کے عہد کے بچے ماننے والے عہد سے نکل کر منوانے والے عہد کے نمائندہ ہیں۔ وہ ماں باپ کے علاوہ استاد کو بے وقعت اور اپنے سے عمر میں بڑے کی بے عزتی کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔

121۔سی میں آئے تو ہمارے بچے بکریاں تھے۔شاید انہیں مجھ سے محبت زیادہ تھی یا خوف کا عنصر غالب تھا۔ انہوں نے کبھی دوبدو بحث کر کے اپنی منوانے کی کوشش نہیں کی۔اپنی خواہشات کے بیان میں بھی غالباً یہی دو جذبے حائل تھے۔انہوں نے کبھی دھونس کے ساتھ کچھ نہیں مانگا۔انیق احمد صاحب جب سکول میں فٹ بال ٹیم کے کھلاڑی بنے تو انہیں فٹ بال کے جوتوں کی اشد ضرورت تھی۔ استاد کی جھڑکیوں سے عاجز آ کر بڑی لجاجت سے ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا..... ''امی وہ فٹ بال کے ٹیچر ناراض ہوتے ہیں.....''

''کیوں؟''

''جب فٹ بال کی ہٹ ٹھیک نہیں لگتی۔''

''کہاں کھیلتے ہو فٹ بال۔''

''یہ جی..... جو سکول کے سامنے گراؤنڈ ہے اس میں۔''

پہلے تو میرا جی چاہا کہ میں اسے فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں' پر وہ میرے منع کرنے سے پہلے بولا..... ''امی جی انہوں نے مجھے تھپڑ بھی مارا۔ کہتے ہیں اگر بوٹ نہ لائے تو اور ماروں گا۔''

ہمیشہ سے مار پیٹ کے خلاف ہوں۔ اس میں کچھ دخل میری خوفزدہ ذہنیت کا بھی ہے۔ خوف زدگی کئی اور
ت پیدا کرتی ہے۔ خوف بزدلی اور جھوٹ کو جنم دیتا ہے۔ سراسیمگی اور اداسی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ میں نے
میں ڈاکٹر مشتاق سے ملوں گی اور ان ٹیچر صاحبان کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی جو میرے بچوں کو مارنے

تے ہیں۔

پھر کون کون مارتا ہے تمہیں؟''

تے تو سبھی ہیں لیکن سب سے زیادہ اردو کے ٹیچر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یہ اردو کے اتنے
بچے ہے؟ خاک باپ کا نام روشن کرو گے؟''

بال کے بوٹوں کے لیے میں نے بیس روپے مارے باندھے انیق کو دے دیے۔ اس وقت یہ بہت بڑی

ے دن میں طیش میں بھری سکول پہنچی۔ ڈاکٹر مشتاق ایک بڑے ہی سلجھے ہوئے محبت سے ڈسپلن کرنے
تھے۔ ان کا کیریئر دوبئی کے ایک ماڈل سکول کو سنبھالنے میں منتج ہوا۔
نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا...... ''اگر میرے بچوں کو کسی نے ہاتھ لگایا تو میں اسی دن انہیں سکول سے اٹھا لوں
گی بعد میں...... مجھے ایسی تعلیم نہیں چاہیے......''

ے بچوں نے واقعتاً تعلیم کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے اس کی تین وجوہات نظر آتی ہیں۔ خاں صاحب مکمل
ت کرتے تھے۔ اس اعتماد کی غالباً وجہ ان کی اردو بورڈ میں مصروفیات اور پھر ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن
کی اور کام بھی ایسا تھا کہ انہیں بچوں کی طرف سے غفلت برتنا پڑی۔ وہ اپنے بچوں کو سوئمنگ سکھانے پی
ئمنگ پول پر ضرور لے جاتے۔ اگر وہ کسی گاؤں میں رہتے تو یقیناً وہ اپنے بچوں کو گھڑ سواری بھی سکھاتے لیکن
صل کر رہے ہیں اس کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔

یہ تینوں اپنے اپنے گونگے پن میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ انیق جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو
ے پیسے نہ دے سکتی جو اکثر ہوتا' وہ واپسی پر گورنمنٹ کالج سے پیدل گھر آ جاتا...... یہ ایک بہت لمبا فاصلہ
نے کبھی شکایت نہیں کی...... انیس کا ریکارڈ ہے کہ اس نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کالج میں جانے کے بعد
گی بازار لے بھی جاتی تو بھی وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا۔ آج تک اس کی یہی عادت ہے۔ وہ دوسروں کی
ت بھانپ کر انہیں پوری کرنے میں سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہے' لیکن اپنی خواہش کا کسی کو علم نہیں ہونے دیتا۔

نسیم خاں ان دونوں سے قدرے مختلف ہے۔ وہ قدرے اپنی منوانے والا بچہ ہے۔ بچپن میں اسے جگر کا
ہو گیا تھا۔ اس بیماری کا چکر لمبا تھا اور اسی کی وجہ سے ہم اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے استادوں نے ان سے رویہ سخت رکھا۔ ان میں وہ شفقت اور شاگرد نوازی نہ تھی جس کی بدولت ماسٹر
دین صاحب کی زندگی میں گڈریا بن گئے۔ پھر جب خاں صاحب دھرم پورہ میں بابا فضل شاہؒ کے ڈیرے پر
گئے تو ایک اور سمت کے مسافر بن گئے۔ اب ان کا فلسفۂ حیات بدل گیا۔ ہمارے گھر میں برآمدے ہی میں دو بورڈ

نصب تھے۔ ان پر باباجی نوروالوں کے اقوال زرّیں لگائے جاتے تھے۔ ان میں جا بجا تعلیم کے منافی اقوال تھے۔ صاحب گفتگو میں بھی عام طور پر یہ کہتے نظر آتے کہ:

''ان پڑھ انسان نے پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے۔''

انہوں نے اس بات کا غالباً اندازہ نہ لگایا کہ مغرب اپنی تمام قوت Strategy اور علم کے ساتھ بہت دوررس نتائج کی سکیموں کے ہمراہ اسلامی ریاستوں کو رومانیت' دین داری' بھائی چارہ اور اخوت کی قدروں سے دنیاوی اور مادی ترقی کا عادی بنا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بچوں کی مسابقت پر اعتبار نہ کیا۔ بچوں میں وہ خود اعتمادی پیدا نہ ہوسکی' جو مسابقت کی فضا میں جنم لینے والوں کی عادت بن جاتی ہے۔

سب سے بڑا نقص جو میرے بچوں کی تعلیم کا ہوا' وہ میرا رویہ تھا۔ مجھے کام کو جانے بغیر اس سمندر میں کودنے کی عادت ہے۔ میں پڑھانے کا فن نہیں جانتی تھی لیکن مصر تھی کہ انہیں میں ہی پڑھاؤں گی۔ مجھے سائنس نامی کسی شے کا علم نہیں تھا لیکن میں بضد تھی کہ فزکس کیمسٹری بھی میں ہی پڑھاؤں گی۔ میرے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ میں کتاب خود پڑھتی جاتی اور انہیں سناتی تھی۔

جتنی سمجھ مجھے آجاتی وہ تعلیم ناکافی تھی۔ میرے ساتھ انیق بیٹھتے۔ وہ غالباً اس لیے کتاب پر توجہ دیتے کہ ان کی سعادت مند طبیعت میں میری محبت موجزن تھی۔ اس کے بعد انیس بیٹھا کرتا۔ وہ عموماً کتاب سے کچھ نقل کرنے میں مشغول رہتا۔ اثیر خاں بہت چھوٹا تھا۔ وہ یا تو چھٹی کر لیتا یا قاعدہ کاپی دیکھ کر وقت ٹالتا رہتا۔

انیق خاں کو بھی تعلیم کا شوق کم کم تھا لیکن اس نے بھی کہیں اندر آفتاب بھائی کا مقولہ ٹانگ رکھا تھا۔ بھائی ''اپنے والد کی خاطر'' وکیل بن گئے۔ انیق بھی اپنی ماں کی خاطر پی ایچ۔ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سائیکالوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

جس روز انیق بیٹے کو گولڈ میڈل ملا۔ وہ پھولوں کے ہاروں سے لدا گھر آیا تو اس کا خیال تھا سارے افراد میری والدہ نانا کی طرح خوشی سے چیخیں ماریں گے۔ تالیاں گونجیں گی اور اسے اپنی محنت کا صلہ مل جائے گا۔

گولڈ میڈل ہاتھ میں لیے ہاروں سے لدا پھندا وہ ہمارے بیڈروم میں آیا۔ خان صاحب حسب معمول اپنی مخصوص ٹیبل کے آگے کرسی کھینچے کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

''ایکسکیوزمی ابو......'' انیق بولے۔

ابو نے نظریں کتاب سے اٹھائے بغیر آہستہ سے ''ہوں'' کہا۔

''ابو مجھے گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں ایم ایس سی میں فرسٹ آیا ہوں۔''

اب بھی انہوں نے انیق پر نظر نہ کی اور اپنے خیالوں میں مشغول لاتعلقی سے بولے ''اچھی بات ہے۔ مبارک ہو!''

میں نے اشارے سے انیق صاحب کو بلایا: ''میرے پیچھے آؤ اور یہ ہار گلے سے نہ اتارو..... ہم تمہارے

ہے ہیں۔'' سڑک پر پہنچ کر میں نے ایک رکشہ رکوایا۔ اس میں ہم دونوں سوار ہوئے اور ڈویژنل پبلک سکول پہنچے۔
حقی صاحب کے دفتر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم دونوں اندر گئے تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
''یہ آپ کا ہونہار انیق ہے سر۔ اسے ایم ایس سی میں گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں سمجھتی ہوں آپ سے زیادہ کسی کو
خوشی نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے انیق کی طرف بڑھتے ہوئے دعاؤں کی ایک قطار لگا دی۔
''آپ دیکھیں گی یہ ملک و قوم کا نام روشن کرے گا۔ اسے نوبل پرائز ملے گا۔ سکول کا نام تو روشن ہو گا ہی۔''
انیق نے اپنے ہار ان کے گلے میں ڈال دیئے۔ وہ ہاروں سمیت اس سے بغلگیر ہو گئے۔ ہم تینوں کی آنکھیں
نم ہو گئیں۔ نہ کوئی پارٹی نہ مٹھائی بانٹی گئی۔ لیکن انیق اسی محبت پر خوش ہو گیا۔ اس نے اس رول آف آنرز کو فریم میں
کسی دیوار پر نہ ٹانگا' صرف اپنے دل کی تختی پر کہیں چوری چوری آویزاں کر لیا اور بس!
سرد مہری کا ایک واقعہ اثیر خاں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ بنیادی طور پر کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ این ڈی ایف سی
کے بینکوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلے گئے۔ یہ اپنے بینک میں کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ حسن اتفاق سے این ڈی
ایف سی ٹیم سارے بینکوں سے مقابلہ جیت گئی۔ اثیر احمد خاں کو مین آف دی میچ کی ٹرافی ملی..... ایک بار وہ بھی ہاتھ میں
لے کر گھر پہنچا تو خاں صاحب تلقین شاہ لکھنے میں مصروف تھے.....
''ٹرافی ابو..... مین آف دی میچ'' لیکن ابو لکھتے رہے۔ نظر اٹھائی نہ ٹرافی دیکھی۔ نہ مین آف دی میچ پر نظر ڈالی۔
''کتابوں کی الماری کے اوپر سجا دو۔'' اثیر دل برداشتہ ٹرافی لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹرافی کو اپنے
بستر کے نیچے چھپا دیا.....
ہم اپنی Genes سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ہمارے باپ دادا ہم میں سے اچانک برآمد ہو
جاتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمارا بس نہیں چلتا۔ خوشی کے موقعوں پر اسی طرح کہیں سے بابا جی محمد خاں اشفاق
کی شخصیت کو Take over کر لیتے تھے۔
خان صاحب بتایا کرتے تھے کہ بابا جی میں ڈھکا چھپا غصہ بمقدار وافر تھا۔ کوئی انہیں خوشی کا اظہار کرتا نظر آتا تو
غصے میں آ جاتے۔ ایک روز خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں سکول سے انعام لے کر آئے۔ بابا جی
بڑے پیاں پیک کردار بے تھے۔
''یہ دیکھئے بابا جی! سکول سے مجھے فرسٹ آنے پر انعام ملا ہے۔''
بابا جی نے آنکھ اٹھا کر بھی انعام پر نظر نہ ڈالی اور بولے: ''ججو! مجھے افسوس ہے تم انعام لینے والے ہو..... کاش تم
انعام دینے والے ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی.....''

انیق پی ایچ۔ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سائیکالوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا لیکن اس کی اصلی توجہ طلسم
ہوشربا، کشف المحجوب' الف لیلیٰ جیسی کتابوں پر مرکوز ہو گئی۔ وہ انجانے میں معلوم سے زیادہ نا معلوم' شعور سے آگے لاشعور
کی ترقی سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر سونے پر سہاگہ وہ محفلیں ہوئیں جب خاں صاحب واصف علی

واصف کی محفلوں میں جانے لگے۔ تین سال انیق ہر رات اپنے ابو جی کے ساتھ رات گئے تو واصف صاحب کی ...
میں شرکت کرتا رہا۔ اس کا وہ شوق جو Para- Psychology پر منتج ہوا' ان راتوں سے ہی شروع ہوا۔

انیس کے لیے تعلیم بہت مشکل تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں کلاسوں کے بجائے باہر Oval میں بیٹھا رہتا...
گھر لوٹنے کا وقت آتا تو عموماً چپ چاپ بس لے کر گھر لوٹ آتا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سا...
کسی سے کوئی مدد مانگی نہ ہی اعانت چاہی۔ وہ بچپن سے باپ پرست تھا۔ ان کے سارے کام کر کے راحت محسوس کر...
میرے بچوں میں ایک وہی ہے جو بازار سے سودا سلف بھی لے آتا۔ ابو کے پروگرام "تلقین شاہ" کی ریکارڈنگ بھی ...
ذمہ داری تھی۔

اثیر نے سکول سے ہی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بمشکل تمام دسویں جماعت کی اور ماڈل ٹاؤن کے کا...
ہی داخلہ لے لیا، لیکن ایف اے کے امتحان سے چند مہینے پہلے اس نے کالج بھی چھوڑ دیا اور پرائیویٹ ایف اے ...
کے لیے آرٹس میں ٹیوشن رکھ لی۔

ٹیوٹر بھی وہ اپنی پسند سے گھر لے آیا۔ امجد ٹیوٹر کم تھا اور دوست زیادہ۔ ہمارے گھر ہی منتقل ہو گیا اور اثیر ...
لائبریری میں بیٹھ کر پڑھانے لگا۔ بدقسمتی سے اسے ابھی اپنے مستقبل کی فکر اثیر کی پڑھائی سے زیادہ تھی۔ اس نے ...
ہاں رہ کر Lums کے کمپیوٹر کورس کیے۔ اپنے لیے ایک مشین بنائی جو انٹرنیٹ کی کاپی تھی اور اس پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

گورنمنٹ کالج میں میرے کسی بیٹے کو میرٹ پر داخلہ نہ مل سکا' لیکن ان میں موسیقی کا شغف قدرتی تھا...
توسط سے انہیں داخلے ملے اور تینوں نے بی اے گورنمنٹ کالج سے کیا۔

طبلہ بجانے کے لیے انیق کو ایک ماسٹر رکھ کر دیا تو وہ ماسٹر بھی قریباً سارا دن گھر پر گزارنے لگا۔ انیق تو طبلہ...
سیکھتے ہی تھے لیکن اثیر بیٹے نے سن سن کر ہی اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب انیق امریکہ سدھارے تو حبیب...
محمد کے ساتھ نیویارک میں ایک سٹیج شو میں ان کی سنگت کی تھی اور انہیں خوب سراہا گیا تھا۔

بی اے میں انیق نے اثیر کی ایک طرح سے ٹیوشن اختیار کر لی اور چونکہ اس کا مضمون بھی نفسیات تھا ...
اثیر میاں کو اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بی اے کے بعد اثیر نے G.R.E کا امتحان دیا۔ پرچے خوب ہوئے اور ...
خیال تھا کہ وہ کسی فارن یونیورسٹی میں پڑھنے چلا جائے گا لیکن جی آر ای کے پرچے گم ہو گئے اور اس طرح ایک بار...
تعلیم سے متنفر ہوا۔

اگر انیق اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈاکٹر بن جاتا تو اس انسانیت پسند کا کیریئر مختلف ہوتا۔ یا اگر وہ موسیقی سے
وابستہ ہو جاتا تو شاید؟

انیس انجینئر تھا۔ اسے عمارتیں اسارنے کا شوق تھا' لیکن اس نے باپ کے فیصلے سے مارے باندھے ایم...
اے کر لیا..... برس ہا برس Frustration کا ذکر میں تفصیل سے اس لیے نہیں کر سکتی کیونکہ پھر یہ کتاب ایک دوسری قسم...
ہو جائے گی۔ مجھے تو یہاں صرف اپنی اور خاں صاحب کی غلطت کے باعث جو نتائج نکلے' ان کا ذکر کرنا ہے۔

اثیر نے بھی مارے باندھے فنانس میں ماسٹر کر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں خوش کرنے کے لیے بینکنگ...

M... میں بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرلیں، لیکن اشیر سپورٹس مین تھا، اگر وہ کرکٹ میں چلا جاتا یا فلائنگ جس کا ... اختیار کرتا، تو شاید اس میں پروفیشن کا درست چناؤ تحریک اور خوداعتمادی کا باعث بنتا۔ ہم دونوں نے ان کے ... یے تو کیے لیکن ان کی اصل مدد نہ کی۔

... کے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ بچوں کو دھونس سے اپنی مرضی کی ڈگریاں دلوار ہے ہیں لیکن کچھ ... میں انجینئروں کی ایک پوری کھیپ راستہ بدل کر کبھی ایم بی اے کرنے نکل جاتی ہے، کسی کو بزنس کلاس اپنی ... کھینچتی ہے۔ ماں باپ میں وہ وسعت قلب یا وسعت نظر نہیں ہوتی جو بچوں کے رجحان، صلاحیت اور ارادوں ... سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر بچہ اپنے خوابوں تک پہنچ سکے۔

... ے بچوں نے بظاہر دنیا جیت لی لیکن وہ اپنے اندر گپ چپ اور اداس رہتے چلے گئے۔ میں بھی ایک ایسی ... کی تربیت اور تعلیم دونوں ٹھگ بازی تھیں۔ میں صرف pamper کرنے کو خوبی سمجھتی تھی۔ میں ان کو ہوم ... کے بجائے ان کا ہوم ورک کرنے کی عادی تھی۔ یہ تینوں اپنے آبائی لوگوں کی طرح بے حد شریف اور غیرت ... نے نہ کبھی ہم سے گلہ کیا نہ کبھی دست سوال ہی دراز کر کے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔

... یں کچھ دیر توقف کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت دیجیے۔

... میں اب جو تجزیہ پیش کرنے لگی ہوں وہ علم کی بنا پر نہیں، تجربے کے طور پر میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔

... آپ کو سائیکالوجی کی کتابوں میں دانا اور دانشور لوگوں کے علم سے انسان کے متعلق محیر العقول انکشافات مل ... میرا خیال ہے کہ انسان کو یقیناً اس کی جبلت اور بچپن کا ماحول پروان چڑھانے اور شخصیت ڈھالنے میں بہت ... تے ہیں لیکن اس سے بڑی ایک اور بارش بھی ہے جو اللہ کی توفیق کی صورت میں اس پر برستی ہے، لیکن اس توفیق ... نے کا ایک ٹونا ہے۔

... میاں اپنی مرضی سے نہ کسی شخص کا فیصلہ بدلتا ہے نہ اس کی تجویز میں حارج ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ انسان اور اللہ ... حضرت آدم نے جنت سے نکلتے وقت حضرتِ انسان کی طرف سے کرلیا تھا۔ اگر فرد دعا کا سہارا لے کر اللہ سے ... ہو تو پھر اس کے ماحول، جبلت، سوچ، عمل اور رویے میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے لوگ ماں کی ... میں قدر وثوق سے آرزو کرتے ہیں۔ اپنا آپ اللہ کی رحمت کے حوالے کرنے کے بعد دنیا کو بدلنے کے ... تے ہی ہیں، انسان خود بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

... نفسیات دان، Analyst اور Psychiatrist جہاں پہنچ کر بے بس ہو جاتا ہے، دعا سے وہی مقام پل جھپکتے ... زینہ بن جاتا ہے۔ غریبی کے اپنے بکھیڑے ہیں، لیکن امیری بھی کچھ پھولوں کی سیج نہیں۔ یہاں وہاں مسائل ... ہی ہے۔ مسائل ختم نہیں ہوتے۔ انسان کو جس اطمینان قلب کی ضرورت ہے، اپنی ذات کی جس تبدیلی سے اسے ... عطا کر سکتی ہے۔ وہ سوائے اوپر والے کے اور کہیں سے نہیں مل سکتی اور اللہ بھی آرزومند ہے کہ ہم اس سے ... ے اس کے کوئی اور دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔

... حقیقی شرک سے نکل جانے والے کے لیے دونوں جہاں میں پناہ ہے۔ وہ نہ صرف اداسی، بددلی اور بدحوصلگی

سے نکل جاتا ہے‘ بلکہ صرف اللہ سے مانگنے والے اس درجہ مضبوط‘ خود کفیل اور استقامت پسند ہوتے ہیں کہ پھر انہیں سے خوف نہیں آتا اور اس کی اس تبدیلی سے کئی بدنی‘ ذہنی‘ عقلی تبدیلیاں خود بخود اس کا نصیب بن جاتی ہیں۔

لیکن یہاں پہنچ کر پھر توقف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دعا بھی کارگر نہیں ہوتی اور لوگ برس اس ریاضت کا سہارا لے کر بددل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک مرتبہ مانگی دعا قبول ہو جاتی ہے اور سارے دن جاتے ہیں۔ انسان کا علم قلیل ہے اور جتنے نفوس ہیں‘ اتنے راستے اللہ کی طرف جانے اور اطمینان پانے کے ہیں کم مجھے یہی راستہ سمجھ میں آیا ہے یعنی ہاتھ باندھ کر یقین محکم کے ساتھ اللہ کے حضور دعا مانگنے والا عموماً خالی لوٹتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خاں صاحب کا خاندان موروثی اور جبلتی طور پر گونگا ہے۔ یہ غم کا اظہار واویلا ڈال کر نہیں کرتے نہ محبت ہی کو ظاہر کرنے کے لیے تالیوں‘ قہقہوں یا چیخوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کو عموماً ایسے جیون ساتھی ملے جو جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزنگ روڈ میں آ بسے تو پہلا شدید ردعمل ذکیہ اور اماں جی میں ای بدولت پیدا ہوا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ یہ سالگرہ کچھ آج جیسی پُربہار دعوت نہ تھی منانے اور سجانے کا اہتمام کچھ کم نہ تھا۔ ہم بھی ایک معمولی سا تحفہ لے کر پہنچ گئے۔ بابا جی کے ملحق لمبے کمرے میں میز کیک پر موم بتیاں روشن تھیں۔ گھر کے دوسرے افراد باجی ضیا‘ بالو بھائی اور بچے موجود تھے۔

آفتاب بھائی اور خالد میاں بھی کچھ پریشان کچھ محجوب سے کھڑے تھے۔ اماں جی بار بار چہرہ پونچھتی تھیں اپنی ناخوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جو بھائی بھی At ease نہ تھے..... لیکن سب سے بڑی بات کہ ذ انفرمیشن کے باوجود بابا جی محمد خاں عین بروقت گھر سے نکل گئے..... اس کا ملال ذکیہ جی کو برسوں رہا لیکن میں نے ان کی حالت دیکھ کر نصیحت پکڑی کہ پھر کبھی بچوں کی سالگرہ منانے کی کوشش نہ کی۔

میری بیچاری بڑی بہو غزل کو بھی ایک تجربے سے گزرنا پڑا۔ اس نے اپنی بیٹی ارشیا کی سالگرہ بڑی منانے کی کوشش کی۔ دیگیں پکوائیں‘ بڑا سا کیک بتیوں سمیت میز پر حاضر تھا۔ کھانے اور چائے دونوں کا ا (غزالہ) غزل ایک زندہ دل ہنستے کھیلتے گھرانے کا فرد تھی۔ وہ بند مٹھی کا فلسفہ نہ جانتی تھی۔ محبت کا اظہار اور گرم کے لیے نیچرل تھی۔

جب میز سج گئی۔ بتیاں روشن ہو گئیں۔ سب تالیاں بجانے اور ہیپی برتھ ڈے گانے کے لیے میز کے گرد گئے تو انیق کو جاناں‘ جاناں کہہ کر غزل تلاش کرنے لگی..... کمروں میں لان پر سب جگہ تلاش کیا گیا..... لیکن جاناں صا انیق اس وقت لوٹے جب برتن واپس باورچی خانے میں جا رہے تھے۔

انیس بیٹا اپنی کارکردگی دکھاتے اور اس پر داد حاصل کرنے میں نہیں پڑتا تھا۔ کام بھی اس طرح کرتا کہ شرمندہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اسی کے گرد ہولے ہولے 121۔سی میں دوستوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگا‘ لیکن دوست اس گھر میں وہ بھائیوں کے ساتھ شیئر کرتا۔

ڈویژنل پبلک سکول سے اس کے ساتھ قاسم ادریس اور وسیم قاضی آنے لگے۔ یہ بچوں کی سعادت مندی ہے کہ کھیل کود اور گپ شپ کو ماں باپ کے ضروری کاموں میں مخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کبھی کبھی راتوں کو یہ باہر نکل جاتے۔ تب ہی انہوں نے روحی کی فوکسی کار چلانی سیکھی۔ جب روحی باجی ان کے کمرے میں سو جاتی تو چپکے سے نکلتے۔ کار چراتے اور باہر نکل جاتے۔ ان دنوں شہر میں امن تھا۔ گیٹ کو تالا لگانے کا رواج نہ تھا۔

سب سے پہلے انیس نے ڈرائیونگ سیکھی۔ اس کے بعد باری باری سب کا جھاکا کھلا۔ جب کبھی ثاقب شہاب ہمارے ہاں قیام کرتا تو رات کو یا تو آموں کی پیٹیوں سے آم چرائے جاتے یا باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے ان سے ملاقات ہوا جاتا۔ نبیل اشتیاق کو انڈوں کا شوق تھا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر شب بسری کرتا، خوب خوب انڈے تلے جاتے۔ گھر نہ ہوتے تو پیسے ڈچ کر کے انڈے لائے جاتے۔

میں تصدیق کرتی ہوں عموماً ماں باپ اولاد کے حق میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے متعلق بچے اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں خاں صاحب نے اپنی سی کوشش ضرور کی۔ جب انیق پروفیسر ہوئے تو فوکسی کا ڈبہ اسے دے دیا کیونکہ شوق تھا۔ اسی ڈبے پر انیق اپنے شاگرد بٹھا کر گھر لاتے۔ ان کی مفت ٹیوشن کرتے۔ گھر پر کھانا کھلاتے اور پھر انہیں پر لوڈ کر کے واپس کالج چھوڑ آتے۔ گرو چیلے کی ایک اچھی مثال انیق بیٹے نے اپنے شاگرد کو پیش کی اور ابھی تک انیق خاں کو امریکہ ہجرت کیے پندرہ سال ہو گئے ہیں، ان کے بعض شاگردان کے ساتھ رابطے کیے ہوئے ہیں۔

انیس جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر کراچی سدھارے تو ابو نے اپنی فوکسی اسے بھجوا دی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ پی آئی اے کے ملازم تھے اور انہیں سرکاری گاڑی ملی ہوئی تھی، لیکن وہ چاہتے تو فوکسی کو گھریلو استعمال میں رکھ سکتے تھے۔

کھلاڑی اثیر نے جب بی اے کے بعد ایک ''میڈاس'' (Midas) نامی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر لی تو خاں صاحب نے اس کی عزتِ نفس کو بھائیوں کے مقابلے میں قائم رکھنے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ موریس خرید کر دی اور کچھ عرصہ اثیق اس پر اپنے کام پر جانے لگا.... اس زمانے میں ایسی فراخ دلی ہمارے عزیزوں میں کسی نے بھی اولاد کے لیے نہیں کی تھی۔ خاندان میں چرچے ہوتے کہ شفو غلط مثال قائم کر رہا ہے اور اپنے بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔

بہر کیف اسی فوکسی ڈبے پر ان بچوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ جادو ئی سفر بھی کیے۔ یہ پروگرام ہم سے چھپ کر بنایا گیا۔ لیکن آخر اجازت طلب کرنے کے لیے انیق کو ابو کے سامنے پیش ہونا پڑا.... رات کے وقت خاں صاحب نے مجھ سے کہا.... ''قدسیہ ایک مشکل ہے'' میں گھبرا گئی۔

''جی؟''

''بچے فوکسی ڈبے پر خیرا گلی جانا چاہتے ہیں۔''

''تو جانے دیں.....جی'' میں نے ہمیشہ کی طرح بے سمجھی سے کہا۔

''خیر ٹھہرنے کا انتظام تو ہو جائے گا۔ وہاں اپنا چھوٹا سا بیرک نما گھر ہے..... ٹھیکیدار ان کا خیال بھی رکھے گا.....

''جی لیکن کیا؟''

''آخر بچے ہیں.....ناتجربہ کار.....بے سمجھ.....سفر چھوٹا ہو یا بڑا.....اس میں Hazards تو ہوتے ہیں
وہ رات ہم نے الگ الگ سوچنے میں کاٹی.....پھر ہمیشہ کی طرح ناشتے کے وقت ایک حل مجھے سوجھا
''خاں جی! اگر ریزی بھائی ان کے ساتھ چلے جائیں تو کیسا؟''
کچھ دیر تامل کے بعد خاں صاحب نے کہا..... ''ٹھیک ہے.....پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''
بچوں کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ خوشی سے ماموں کو منانے چلے گئے۔

ریزی میں ایک کھلنڈرے بچے کی روح بھی ہے۔ دھرمسالہ کے پہاڑوں کا عاشق' بچوں کا بچوں سے بے تکلف دوست' فوراً ریڈی سٹیڈی (Ready Steady) ہو گیا اور جادوئی سفر کی تیاریاں جن میں ہم دونوں تھے' کر لی گئیں۔ ان کے دوستوں میں قاسم ادریس' وسیم قاضی' شاہد خاں لسٹ پر تھے۔ توصیف احمد خاں کو فوراً اجازت مل گئی۔ جاوید تو ازل سے ایڈونچر زدہ ہے' تجربہ نیا ہو اس میں کیسی مشکلات کیوں نہ ہوں سے باز نہیں آتا۔

ہمارے پڑوس میں ہی ادریس صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے دوٹوک قاسم کو اجازت نہ دی۔ بچے واپس آ گیا۔ اب انیق اور انیس اس کے پاپا کے پاس پہنچے۔ انہیں بتایا کہ سارا کام ماں باپ کی آشیرباد سے ہے۔ ماموں کی ہمراہی بھی ہو گئی ہے اور وہاں خیرا گلی میں ہمارا اپنا تین کمرے کا گھر ہے۔ اس میں رہنا ہوگا۔ قاسم کو بھی اجازت مل گئی اور بچے فوکسی کے ڈبے پر روانہ ہو گئے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے غالباً سب نے برابر جوڑ کر رقم مہیا کی۔ زیادہ وقت گزاری میں چلائی۔ راستے میں اونچے اونچے گانے گائے گئے۔ جگہ جگہ رک کر کھانا اور چائے نوش جان کی گئی۔ خیرا گلی میں چابی لے کر اندر سامان اتارا۔

خاں صاحب نے کبھی منہ سے اظہار نہیں کیا لیکن مجھے علم ہے کہ انہوں نے خیرا گلی کا گھر میری خاطر لیا تھا۔ انہیں علم تھا کہ میرا پہاڑوں سے کتنا پرانا ناطہ ہے۔ جب ہم 121۔سی میں آئے تو خاں صاحب کو پتہ چلا کہ فوجیوں کی بیرکیں بک رہی ہیں۔ انہوں نے پتہ نہیں کب اور کیسے کتنے پاپڑ بیل کر پیسے اکٹھے کر کے یہ بیرک خریدی۔ یہ ساتھ ساتھ جڑی ہوئی بیرکیں تھیں جو اب فوج کے استعمال میں نہ تھیں۔ مین بازار سے اوپر کی طرف چڑھ کر آگے تھوڑا سا کھلا احاطہ تھا۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ایک سادہ سا دروازہ کھلتا تھا۔ پھر تین کمرے تھے۔ سا کمرہ۔ سامنے والے کمرے کو خاں صاحب نے مہمانوں کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد والے کمرے کو کچن بنا دیا اور اس کے ساتھ والے کمرے کو ہمارا بیڈروم قرار دیا۔

یہاں پر چارپائیاں' تیل کا چولہا' دودھ' مکھن رکھنے کے لیے ڈولی خاں صاحب نے لوڈر میں رکھی۔ ساتھ سامنے بٹھایا اور ہم راولپنڈی سے ہو کر خیرا گلی پہنچے۔ ایک بار پھر انہوں نے ٹھیکیدار محمد حسین سے چابی مانگ کر میرے سپرد کر دیں اور مجھے گھر کے اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ بچے اپنے ''جادوئی سفر'' پر اسی خیرا گلی کے گھر میں ٹھہرے۔ یہاں وہ خود ہی پکاتے رہے۔ روٹیاں حسب توفیق انیق احمد کی ذمے داری ٹھہری.....نہ پکا سکتے تو بازار

اسی جادوئی سفر کے دوران انہوں نے ایبٹ آباد' جھیل سیف الملوک اور اردگرد کی پہاڑیوں کی سیر کی۔ ان بچوں کا صحیح اندازہ آپ اس معاہدے سے کر سکتے ہیں جس پر سفر سے پہلے تمام ممبران کے دستخط کرائے گئے۔

''کنٹریکٹ جادوئی سفر''

شاید آپ اسے تضیع اوقات سمجھیں لیکن میں آپ کو صرف ایک نظریہ سمجھانے کی خاطر بار بار ایک ہی طرف متوجہ کر رہی ہوں۔ انسان اپنے Genes کا مجموعہ ہے۔ جو کچھ باپ دادا وراثت میں دے جاتے ہیں' اس کا ذکر مذہب میں بار بار آتا ہے کہ ہم تمہارے باپ دادا کے گناہوں کو وراثت میں تم تک پہنچاتے ہیں۔ نیک اعمال پر آمادہ کرنے اور برائی کا راستہ روکنے کا یہ بھی ایک طرح کا روحانی طریقہ ہے.... Genetic انجینئرنگ اسی سلسلے میں کئی قسم کے معجزے دکھا رہی ہے۔ دوسری طرف ماحول کی تربیت انسان کی شخصیت ڈھالنے میں کچھ کم کارگر ثابت نہیں ہوتی.....

ضیاء الحق

انیق احمد کے دوست ضیاء الحق ہر وقت کے ساتھ رہنے والے نہ جانے اس سفر پر اس کے ساتھ کیوں نہ گئے۔ یہ لوگ پچھلی گلی 65۔سی میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی ان کے والد اور ان کے بھائیوں کی سانجھی ملکیت تھی۔ رات کے وقت جب دوست سائیکلوں پر نکلتے اور پیسے چندا کر کے نان چھولے کھانے جاتے تو ضیاء ساتھ ہوتا۔

روحی باجی کی سبز فوکسی عموماً ہمارے گھر میں ہوتی۔ روحی تو مزے سے اندر سو رہتی لیکن یہ بچے اس کی گاڑی نکال کر ڈرائیونگ سیکھتے۔ ضیاء اور انیق اس عمل کو چوری سمجھتے تھے اور اس کرتوت میں شمولیت نہ کرتے لیکن انیس' توصیف اور ندیم وسیم نے اسی گاڑی پر ہاتھ سیدھا کیا۔

ہوتے ہواتے جب انیق پروفیسر بن گئے اور اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں بہت سر دھڑ کی بازی لگا رہا تھا تو ضیاء نے ایک اور روپ دھارا۔ ضیاء کے گھر میں ٹیولپ روز پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں ان پھولوں کا گلدستہ ہوتا اور وہ یہ گلدستہ مجھے پیش کرتا۔ پتہ نہیں اسے کس کشف سے علم ہوا کہ میں اس پھول کو بے حد پسند کرتی ہوں۔ کچھ وقت اسی طرح گزرا پھر مجھے ضیاء ہی سے علم ہوا کہ وہ ایکٹر بننے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ ٹیلی ویژن بھی جا چکا تھا لیکن ڈائریکٹر اس کی پہنچ سے باہر رہے۔

ان دنوں زین العابدین ''سدھراں'' کی تشکیل دینے میں مشغول تھے۔ میں نے زین سے التجا کی کہ وہ ضیاء کو سیریل میں ایک اہم رول عطا کریں۔ زین ازل کا مروتی فوراً رضامند ہو گیا اور اس طرح ضیاء کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

لیکن کچھ عرصہ بعد ضیاء نے ایک نیا پروگرام بنالیا۔

ایکٹری کچھ اس کے مطلب کا پروفیشن نہ بن سکی۔ ضیاء نے کینیڈا کے لیے ہجرت کی اور وہیں ایک مسلمان خاتون سے شادی کر لی۔ چھ سات بعد ضیاء اپنی بیوی اور بچہ کامران کو لے کر پاکستان لوٹا۔ ڈورتھی مجھ سے ایسے ملی جیسے واقعی میں کامران کی دادی تھی۔

ابھی خاں صاحب کی تیسری برسی کے بعد دسمبر کے مہینے میں ضیاء الحق اپنی بیٹی ''سوزاں'' کے ساتھ ہمارے
اترا۔اتنی پرانی واقفیت کے باوجود ضیاء الحق کو اچھی طرح جاننے کا موقع پہلی بار ملا۔

کینیڈا میں ضیاء کے پاس گیارہ بارہ بیکریاں تھیں جنہیں بیچ کر کئی دکانیں ویڈیو شاپ کی وائنڈ اپ کر کے
بیس سال بعد وطن اس امید پر لوٹا تھا کہ بالآخر یہیں اپنے بیوی بچوں کو سیٹل کر لے۔اتنی دیر بعد جب کوئی شخص مغرب سے
لوٹتا ہے تو اس کے پاس معاشرے کو ناپنے کے دو معیار ہوتے ہیں۔وہ یک طرفہ ہو کر سوچ نہیں سکتا اور عموماً تذبذب میں
رہتا ہے۔غالباً ضیاء بھی یہی سوچ تار خصت ہوا کہ کہاں رہنے میں اس کا گھرانہ بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔

پتہ نہیں وہ کس فیصلے پر پہنچے لیکن میں ایک سوچ میں مستحکم ہو گئی ہوں۔مغرب نے ضیاء میں بڑی خوبی پیدا کی
ہے۔پہلے بھی وہ دینے والوں میں سے تھا' فقط اس کے پاس دینے کے لیے پھول تھے۔اب جب اس کے ہاتھ میں
روپے پیسے کی ریل پیل تھی' وہ دائیں بائیں یہ نعمت بانٹنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

ہم بھی خوب لوگ ہیں۔موقع تاڑ و اور خود غرض۔غالباً اسی لیے ہماری غریبی سے نجات ہو نہیں پاتی۔

سنا ہے کہ کسی بادشاہ نے خانہ بدوشوں کے پاس پڑاؤ کیا۔ان غریب لوگوں کی بدحالی دیکھ کر شاہ نے دریا دلی
سے کام لیا۔کھلے دل سے ان پر اپنی دولت نچھاور کرتا رہا حتیٰ کہ جس صبح بادشاہ نے کوچ کا اعلان کیا' راتوں رات
غریب بستی نے بادشاہ کے خیموں پر شب خون مارا۔سارے اونٹ کھول لیے۔خدمت گاروں کو ختم کر دیا۔خیمے ساتھ لے
کر چمپت ہو گئے۔جب صبح بادشاہ کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اجاڑ نظر آیا۔حتیٰ کہ خانہ بدوش اس کے بال تک کاٹ کر
لے گئے۔بادشاہ خاک چھانتا' پاؤں پیدل اپنی منزل کو روانہ ہوا۔

ضیاء کے ساتھ بھی یہاں ہم سب نے یہی سلوک کیا۔دائیں بائیں ہر طرف سے لوٹ کھسوٹ مچی رہی۔
کیا کیجیے کہ ہم اپنی غریبی کا مداوا اسی طرح کرنے کے عادی ہیں۔

ضیاء کے تین بچے ہیں کامران' سوزاں اور ثمیرا.....سوزاں کا نام فرانسیسی اور اسلامی ہے۔وہ اسلامی طریقوں پر عمل
کرتی ہے اور اپنا دوسرا نام آسیہ کم ہی استعمال کرتی ہے۔خاموش' خوبصورت اور پڑھا کو ''سوزاں'' اس وقت
مارکیٹنگ میں بی بی اے کر چکی ہے۔یہاں اس نے انیس بیٹے کے پاس رہ کر ایک Orientation کورس بھی کیا جو اس
کی تعلیم کا حصہ ہے۔

میں سوزاں کے متعلق اس لیے تفصیل سے لکھ رہی ہوں کہ اس نے یہاں رہ کر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی
اجنبیت کا احساس نہیں دلایا۔وہ اس محبت سے مجھے ''دادی'' پکارتی رہی کہ واقعی سچ لگتا۔ہر جگہ مجھے سہارا دینے کے لیے
ہاتھ پکڑ کر چلتی۔کھانا ڈال کر دیتی' رضائی اوڑھا دیتی۔انیس اور اثیر سے کچھ ایسا ''چاچو چاچو'' کہہ کر پیار کرتی کہ گویا
سگی بھتیجی ہو۔

میں چونکہ خوشامد پسند ہوں اس لیے مجھ پر اس کی ان اداؤں کا گہرا اثر پڑا ہے۔سوچتی ہوں کہ سوزاں کو اتنی محبت
کیا' اس کی مغربی ماں سے ملی کہ اس میں ضیا کے لہو کی تاثیر ہے.....شاید کچھ کچھ دونوں طرف سے یا شاید ساری کی ساری
اس کی اپنی کوشش ہو۔

صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

تخلیقی کام کی میرے تینوں بیٹوں میں اُپج تھی۔ وہ اپنے Genes کے ہاتھوں مجبور تھے۔
اثیر احمد کی کچھ تحریریں ملاحظہ ہوں:

نظمیں

تحریر پیش از تخلیقی کام

اے اللہ ہم پر تو ہمیشہ
اپنا فضل قائم رکھیں تا کہ ہم
اس دنیا میں کامیاب ہوں
ہماری دُعا عاجزی پر ہو
نہ کہ خوف پر ہو
تو سب سے بڑا اور نہایت ہی مہربان ہے
اللہ تیرا سایہ مجھ پر
اور میرے گھر والوں پر ہمیشہ
قائم و دائم رکھ۔
آمین

....

(1)

آج میری وجہ سے بالکل نہیں
بس جو بھی ہے وہ اوپر کی ذات ہے
باقی سب ایک دم سب جھوٹ
کیا لکھوں بس دعا ہی دعا ہے
کہ سب کچھ اس کی اور میری
خوشی سے ہو جائے
کوئی ایک خیال ہی انسان کی نجات کا سبب
بن سکتا ہے

اللہ کا ذکر ہی وہ نجات ہے جو ایک خیال ہے
باقی سب مسئلے ہیں
کہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ یا اللہ
بہت دنیا کا رنگ دیکھ لیا
اب کچھ اپنا بھی رنگ
تو دکھا

---

(2)

یہ خیال کیوں، کب اور کیسے
ایک غیر اختیاری سوچ دماغ میں آئی جو
آپ کے محبوب کے خلاف تھی
آپ نے دن رات اسی سوچ میں گزار دیے
کہ یہ کیوں آئی جب کہ
یہ تو ایک بہت نورمل سا فتنہ ہے
تہہ ہے..... تہہ در تہہ

---

(3)

ڈر نغمہ جیسی چیز ہوتی ہے
اس کو ایک دفعہ میں
جسم سے نکلنا چاہیے..... ورنہ
اس کے ہاتھوں ہم پھر تنگ رہیں گے
مضبوطی اور پھر مضبوطی پھر
قوی پھر قوی پھر ایک دم قوت
اور پھر قوت..... صرف ایک اس
کو کہنا یار آج سے ختم تو ہمارا
دوست سہی لیکن ہم تمہارے نہیں
اگر ساتھ چلنا ہے تو
اس کی مان، جس نے مجھے

اور تجھے پیدا کیا
اور پھر بس ایک دم چھٹی
نہ کوئی بندہ نہ کوئی فقیر بس
سب ولی ہی ولی
ایک دفعہ بس صرف
ایک دفعہ.....ورنہ ہمیشہ
کی ناکامی ہی ناکامی

....

پتہ نہیں کب اور کیسے انیق بھی لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ نظمیں کچھ انگریزی میں تھیں، کچھ اردو
بعدازاں وہ ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف بھی جھک گئے، لیکن یہ سارے کام جزوقتی تھے۔ ان پر وہ توجہ نہ دی گئی جو
ت آرٹ کی طرف متوجہ کر دیتا۔ انہیں ٹیلی ویژن کے ڈراموں پر ایوارڈ بھی ملا لیکن ایوارڈ ہمارے گھر میں جس
ئی سے دوچار ہوتے تھے، وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔
انیق کے ڈراموں کی کتاب سنگ میل پبلشرز نے ''آب ودانہ'' کے نام سے چھاپ دی ہے لیکن نظموں کی
بھی کسی سے رجوع نہیں کیا گیا۔ یہ نظمیں آپ کی تفریح طبع کے لیے درج ذیل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تحریر جو انیس
آپ جانوروں سے محبت کے حصے میں ملاحظہ کریں گے۔
ان تحریروں، نظموں کا ذکر اس لیے کیا کہ اشفاق صاحب کے بیٹے ان کے بہن بھائی سب کی تحریروں میں
ہے اور یہ مماثلت ان کی وراثت سے Genes کی شکل میں پہنچی۔ صرف ان سب نے خاں صاحب کی طرح اس
سے فائدہ نہیں اٹھایا۔
جو بھائی نے ارشیا کے متعلق جو نظم لکھی تھی، وہ بھی Genes کے ضمن میں ایک پروف ہے۔
یہ نظم اسحاق بھائی نے انیق کی بیٹی ارشیا کی پیدائش پر لکھی۔

ارشو بابا

بابا کا ارشو بابا کا ارشو بابا
دادی کی یہ جان ہے کہاں سے آئی ہے
یہ پھولوں جیسا چہرہ پاکیزہ بھولا
یہ پریوں کی شہزادی ہے کہاں سے آئی ہے
ماموں کا یہ کھلونا ایک خواب سا سہانا
ماما کے دل کی جان ہے کہاں سے آئی ہے

بشی کو وہ بلائے شانیوں کو وہ ستائے
دونوں کی وہ جان ہے کہاں سے آئی ہے
نانا نانی سے پوچھو پڑنانی سے بھی پوچھو
اس چڑیا پر قربان کہاں سے آئی ہے

(غزل کی بہنیں بشریٰ اور شہناز)

انیق احمد کی چند انگریزی نظمیں

Aneeq ahmed

1. Me and You

I walk alone in rain,
Keeping your image warm in my heart.
Making sure of what remains and what's lost.
There you stand in the middle of the painted blue fog,
Clear and unpredictable.
Hissing winds charge and bruise
My hands are clutched to the frame ....
Frame of my mind,
Gripped ....
I see a star and a flower floating near you
Stemless, breathless.
Newness is now an illusion,
A suffering of my own
A pain I wanted to disown.

2. A weak heart have I.
A weaker throb it has.
A few things to share,

And even fewer to bare.

I have a deep seated soul,

And even deeper is its hole.

Let me predict fortune,

That God sends me.

I hope to be humble

And for no one else to see.

3. A drum to tune

The sum immune

The long felt pain

Of a song in rain,

On a picturesque plain,

You may find a lane

In this world profane

Driving lane in lane

Noki

شاید کل کی اچھی گزرے

شاید موسم اچھا ہو

شاید دھند کے پردے میں سے

چڑھتا سورج پورا ہو

شاید بے کَل کَل نہ ہووے

شاید چھوٹا رستہ ہو

شاید باغ دریچے میں اک

جانا جانا چہرہ ہو

شاید رُت رنگین ہو جائے

شاید بادل چھایا ہو
شاید میرے شور کے اندر
اک سناٹا غالب ہو
شاید سب کو وہمہ گزرے
شاید پاگل راضی ہو
شاید خود سے باتیں کرکے
اپنا خواب ہی سچا ہو

Noki

جن دنوں گھر پر نوکی اور خاں صاحب کی وجہ سے شاعری کی فضا قائم تھی۔ یہ تخلیقی اعتبار سے ایک نیا تجر
خاں صاحب میڈیا میں قدم جما چکے تھے۔ رسالے نکالنے کی حسرت نہ رہی تھی۔ کہانی کار تو وہ ازل سے تھے لیکن
فیلڈ میں نہ تو وہ اپنا لوہا منوانا چاہتے تھے نہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس ہوتی تھی۔

ان کی کہانی ''گڈریا'' نے وہ دھوم مچا رکھی تھی جو دس بارہ افسانوی مجموعے چھاپ کر بھی کسی ادیب کو
آتی۔ شاعری کے میدان میں ابھی انہوں نے قدم نہ رکھا تھا۔ پھر غالباً 1974ء میں اُن پر پنجابی کی نظمیں موسلا دھ
کی طرح برسیں۔ ''کھٹیا وٹیا'' میں ان نظموں کو یکجا کر کے سنگ میل پبلی کیشنز نے فوراً چھاپ دیا۔

انیق بیٹے کی نظمیں گو چھپ تو نہ سکیں لیکن اکٹھی ہوتی رہیں۔ اس میں بھی ہماری ہی غفلت رہی کہ ہم
کے اس کام کی طرف توجہ نہ دی۔ عموماً والدین بچوں کی کارکردگی کو کاتا اور لے دوڑی کے تحت فوراً ترقی کے زینے
دیتے ہیں لیکن ہمارے گھریلو ماحول میں اس طرح کی توجہ پنپ نہ سکی۔

یہ کام البتہ ضرور ہوا کہ میں ہمیشہ کی طرح خاں صاحب اور انیق سے متاثر ہو کر نظمیں لکھنے لگی۔ اردو او
بیشتر نظمیں تو ضائع ہو گئیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزی کی نظمیں ابھی زمانے کی دست بُرد سے بچ گئی ہیں
آپ کی خدمت میں دوہرائے دیتی ہوں۔ چونکہ یہ نقل کا کام تھا۔ اس میں اُپج اور صلاحیت نہ تھی اس لیے جلد ہی
سوکھ گیا۔

ریفری سیٹی وجا کے
کوروان تے پانڈوان نوں وردی پوا کے
یدھ کراوے
فاوُل دساوے
جت ہار تے مہر لگاوے

نکی جنی گیندنوں کسے وی نہ پچھیا!
کیہوڑے پاسے بوتا ماریا
تے کیہڑا پاسا جتیا؟

☆☆☆

اجڑے گھراگے کتا روے
تویں مکان اگے
نوٹی کرلاوے
سینہ وچ بجھی لان نوں
پانی دیندی جاوے
منجی اُوتے پے پے کے رون آ لیا
تاپ جے نہ چڑھدا؟
تے علاج کنویں ہندا

☆☆☆

گھر دا بڑا ای چا سی
کندھے کوٹھے باریاں
رنگ برنگے شیشے
باہر جان دے راہ بڑے سن
پر گھر دا ملیا نہ راہ
گھر دا بڑا چا سی

☆☆☆

کیویں اسی دکھ ہوے ایدا کی نتارنا
گھریا اسی بھل گئے تیتھوں جندوارنا
ڈبی ہوئی بیڑی نوں ربا کنج تارنا
منجواں دی کھیڈ وچ جتنا وی ہارنا
ٹٹی ہوئی منجی اوتے

☆☆☆

کب چھٹی ہوگی اس جگ سے
کب اپنے گھر کو جائیں گے

کب اپنی جان بچائیں گے
اور سب سے جان بچا کر پھر
ہم روئیں گے
ہم گائیں گے
مکھی، مچھر اور چیونٹی کا
جب بھس بدلنا جائے گا
مچھلی مینڈک اور لدھر سے
جب سارے ناتے ٹوٹیں گے
جب لمبی تان کے سوئیں گے
اور لمبی تان کے سو کر پھر
ہم روئیں گے
ہم گائیں گے
کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے گھر کو جائیں گے

☆☆☆

تتی دھرم نوں پالنا
بن چھپکا دے ریکٹ وچوں
جیوتندنوں پارنا
چلگا جت جتا کے
پہلے بھوگ اچ ہارنا
تتی دھرم نوں پالنا

☆☆☆

انت دا کھر دا بولنا
تے روح دی دینی مار
کہندے نے اوہ میراسی
پر کدی نہ لگیا یار

☆☆☆

ٹٹی ہوئی منجی اوتے بیٹھی آں سرہانے

دل بھیڑا اج میرا آوندا ئیں ٹھکانے
جدوں جدوں آوے میری جندڑی تے چھاں جی
تکاں ہتھاں پیراں نوں تے جاوے جند جان جی
مینہ کی داویلا آیا ایتھے نہ کوئی تھاں جی
کیہڑے پاسے جاواں تے میں پچھاں تیرا ناں جی
تنی ہوئی منجی اوتے

If all my life was not so

Pledged,

Pawned

Or sold not,

If I could wriggle out a complete moment of paper

Vellum,

Or clean dust

If it was possible to adorn that movement with a kiss,

Name,

Or a tear

It would be easy to leave this quagmire life like a king,

Lover

Or a saint

Bano

Last night,

A shivering moon turned from my window

To your door.

Shamefacedly knocking,

Begging for a little warmth.

Did you in all austerity

Close the door on his face too?

Poor runaway from universe!

Bano

I love small flowers,

Songs that last

Only on house

And seasonal lore.

All recess

In festive dress

Into oblivion

Never do they vie or dream

of eternity

Yet leave a place for

More flowers

More love

Shining stepping stones to walk on

Through a long journey.

Bano

A Lament

There is a tawny patch

That smears the lush green turf

It will not heal

It will not heal.

Sane tunes like an eagle

Just ready to fly

In the morning light.

Shapes into a receding triangle

In dusty eves

Closing its desert ache.

Sometimes in hoary twilight
It melts into a wooden cross
Forsaken
It will not heal
Though watered by my tears
It will not heal
This tawny patch of green
That smears the lush green heart
It will not heal
It will not heal
It will not heal

I caress your memory
Like a little girl cuddles a dead kitten
Gone for ever
Yet not buried deep
It is feckless to love:

Broken tumblers
Men in air flights
And flowers of Leningrad
Loitering on a soldier's grave.

Bano

Rolling from east
Rolling from west
Fog rolls fast into the rest
Doors and windows clench their teeth

Hoping and fearing night hide

That other side of the street

May not be lost for ever

Who is she?

Ah! Who is she?

Who came like the fog?

But stayed like the rock

Barring all view

To windows to doors

Open but blind

To the other side of the street.

Bano

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By people around

Who abound

The world at large

Like elves or archers

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By myself

Who cheats

And lures to desires anew

Life's gasoline

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By providence

Who likes to paint every door
With wash and wear sane bows to synthetic tears
It I were allowed
    To comfort love or cherish you
I would decide
Life had been on my side
As I'd bang along
Through dreary life waving to all

Bano

For you to me
To erk the dark
Not for each other
But for the late rising morn

Wither is day's celestial light
Wither is yester-morn's glory fled
Your tears flow over my cheek
Mine unknown
Follow yours into
Nothingness
We simmer in Ice droplets
Not for each other
But what has been once
Is no more
And never shall be

Bano

Let a moment come nude to me

Curved

Arched

Throbbing with light

A vision of you

A vision of you

Let the moment speak

Only of you

Stay, wink, lean then depart

Un-touched

To lie on the couch of time

Copulating with eternity

Bano

Days back I saw your spectacles

Tainted with dust of me

Last night I heard your

Bare feet

Followed by a smothered cough

Today I perceived

A patch of green

Un-tended

Not watered

Hopefully wailing

For the pigeon in the sky

Bano

خاں صاحب کا سیاسی مسلک

[illegible]ے آدمی کا نصیب یا فیصلہ یا مجبوری ہمیشہ ایک رہی ہے۔ یہ روایت مسلمانوں میں چودہ سو سال پرانی [illegible] تو دوستوں اور خاندان دونوں کو حرزِ جاں سمجھتے لیکن اُن کے وصال کے بعد دوستوں اور گھر والوں میں محبت [illegible] بیدار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شیعہ اور سُنّی کے قالبوں میں ڈھل گیا۔

[illegible]غیر میں قائداعظم کی زندگی بھی اسی ڈویژن کا شکار ہوئی۔ گھر والے کہیں رہ گئے، فرد اکیلا اپنی تلاش کا شکار ہوا [illegible]عظم نے پاکستان تعمیر کیا تو اُن کے گھر والوں میں سے کوئی اُن کے ساتھ نہ تھا۔ ویسے تو قائداعظم کی ساری [illegible] دوراہے ہیں جنھوں نے اُنہیں اہم فیصلوں پر مجبور کیا۔ انہوں نے بڑی نیک نیتی سے کانگریس جوائن [illegible] لیے شہر شہر گھومے اور اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو اکثریت اپنے صدیوں پرانے مسلک میں موجود اچھوت [illegible]ہمن جاتی کی برتری کے کمپلیکس (Complex) سے نکل نہیں پائی۔

[illegible] کا علاج بھی اُنہوں نے نیک نیتی سے تلاش کیا اور کانگریس میں ایک نامور فارمولا پیش کیا جس کے تحت [illegible] اکثریت ہو وہاں سے نیشنل اسمبلی کے لیے مسلمان نمائندہ منتخب کیا جائے اور جہاں کی آبادی ہندو جاتی پر [illegible] ہندو نمائندہ چن کر ممبر اسمبلی بنایا جائے۔ پہلے تو پنڈت نہرو مان گئے لیکن بعدازاں وہ اس وعدے سے بھی [illegible] سے ہندو لیڈرشپ کبھی مفاد سے علیحدہ ہو کر سوچ نہیں سکتی، اسی لیے وعدے کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

جب کشمیر میں شکست سے آشنا ہوئے تو بھاگ کر سکیورٹی کونسل میں جا کر دم لیا اور جنگ بندی کی شرائط قبول کر [illegible] سانس برابر ہوئے سارے وعدے وعید بھول گئے اور پھر اکھنڈ بھارت کے نعرے لگانے لگے۔

خاں صاحب کی زندگی میں پاکستان کے لیے جدوجہد میں شمولیت کے بعد اُنہیں اپنے ذاتی مسلک تج دینے [illegible]ین، بھائی بہن، دوست، چاہنے والیاں سب سے محبت تو کرتے رہے۔ اُن کے لیے جان تک دینے سے انہیں [illegible] ان محبتوں سے پہلے عملی طور پر انہیں پاکستان کے عشق نے تمام تر چوس لیا۔ اُن کی Priorities تبدیل [illegible]ں نے بھی چودہ سو سال پرانی روایت کو نبھایا اور پاکستان دوستی اور ذاتی خاندان میں پہلے مسلک کو اپنا لیا۔

جب قائداعظم نے کام کام کام کا نعرہ ہمیں دیا تو خاں صاحب نے ''کام کام کام'' کا سلوگن اپنے
حصہ بنالیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تعمیر کیے بغیر مکین کو گھر کا سکھ نہیں مل سکتا اور کام کے بغیر گھر تعمیر نہیں ہوتے۔ اللہ کے نام پر
کیا ہوا ملک اب اللہ کی حاکمیت مانے بغیر چلایا نہیں جاسکتا۔ ملک کی محبت کو پکڑ کر وطن دوستی اور جاں نثاری کے ثبوت
انہوں نے کئی پروگرام ریڈیو سے کیے، کیونکہ اُنہیں علم تھا کہ انسان پرنٹ میڈیا کے سحر سے نکل کر آہستہ آہستہ الیکٹر
میڈیا کی حوالگی میں جارہا ہے۔ ''آج اور آج کا دن'' ''گھر گھر خوشیاں لائیاں'' ''ضابطے خاں کی کارروائی'' ''جو
اور ''ہم آ گئے'' لکھ کر انہوں نے عام گھروں کی سوچ میں راہداری بنالی۔

''مانو منگولیا'' تو سات قسطوں کے بعد بند ہو گیا لیکن اس کی بدولت کئی خوبصورت آوازیں ریڈیو کو مل گ
اکرم زبیر، میمونہ سلطانہ، منور کاظمی، غیور اختر، صدف ملک کے علاوہ ریاض محمود جو اس وقت بھی مشہور آرٹس
پروگراموں کی روح رواں تھے۔

اشفاق صاحب ہی نہیں وہ تمام سرکردہ پود جنہوں نے پاکستان بنایا، پوری اہلیت، استقامت اور مستقل
سے نئے وطن کے مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر ڈنڈی مارے اپنے چمتکار دکھانے میں مشغول تھی۔
کے گھر بساؤ مسائل ان گنت تھے۔ بچھڑے ہوؤں کی جدائی، راہ میں مارے جانے والوں کی بے کسی کی داستانیں
پر کیمپوں میں ٹھنڈی آہوں، گرم آنسوؤں کی گویا ایک بوچھاڑ تھی، جو کسی وقت نہ تھمتی تھی۔

خوشی کی اس کساد بازاری میں کچھ جی دار ایسے تھے، جو بڑے عزم کے ساتھ پرانی یادوں کو ہچکیوں کے سا
بار دوہرانے اور سینہ کوبی کرنے کے بجائے راضی برضا اور صبر کے ساتھ نصیب کے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔
نزدیک دنیا میں بلاقیمت کوئی جنت حاصل کرنا ناممکن تھی۔ اس ارضِ پاک کی قیمت وہ چکا آئے تھے۔ اب نئی
آبیاری، پھول کھلائی، تراوش و زیبائش کے وہ خود ضامن تھے۔

انہوں نے گویا سمجھ لیا تھا کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے والا کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو کر پتھر کا بن جاتا ہے۔ ان پا
لوگوں نے بیلچہ کدال اُٹھایا اور مسائل کی دھرتی کو اتھل پتھل کر کے رواں کر دیا۔ ان کے دماغوں میں اقبال کے
سانسوں میں قائداعظم کا عزم اور دل میں ایک اُمت بنانے کا معجزہ گھر کر گیا۔

جتنے فرد اتنے راستے، جس قدر لوگ اتنی ہی رنگارنگی۔ زندگی کے کارزار میں کچھ خوش نصیب شہید ہو
راضی، کچھ غازی بن کر لوٹنے پر شاداں و فرحاں، کچھ اپنے نفع و نقصان کے عادی مالِ غنیمت سمیٹنے والے، کچھ مر
پر بین صورت منڈلانے والے، کچھ راضی برضا، کچھ طوعاً و کرہاً دوسروں کے ساتھ چلنے پر آمادہ..... غرضیکہ پاکست
ایک سیلاب صورت لوگوں کا ہجوم اپنی اپنی آرزوؤں کی چابک تلے دوڑ رہا تھا۔ اسی دوڑ میں گھروں کے قفل ٹو
منٹ سسٹم کی ژولیدہ سری اُبھری، نفانفسی کا آئین بھی لاگو ہو گیا۔

شہر بہ شہر گھوم پھر کر اپنے لیے ٹھکانے کی تلاش نے نئے دوست نئے دشمن سامنے لا کھڑے کیے۔ س
دھندلکے میں روشنی کی تلاش تھی لیکن چند ہی جی دار تھے جو جنگل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور کی تلاش میں نہیں
روشنی تھے۔ ایسے میں جو بے غرض انصار کی روایات پر چلے، گھر کے بوہے باریاں کھول کر مجسم مہمان نواز بن گئے۔

ایسے آدرشی راستے بھی مل گئے اور چلتے رہنے کی توفیق بھی میسر آ گئی۔

کچھ نے اپنے وجود کو کیمپوں کی نذر کر دیا۔ کچھ مخیر حضرات دیگیں پکا کر ریڑھوں پر لاد کر کیمپوں میں لاتے۔ ان تک پہنچ جاتے۔ وہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ نہیں لگا رہے تھے بلکہ ان چیزوں پر Have not کے لیے کام کر رہے تھے اپنی جیب سے بساط بھر۔

یہ پاکستان کے مسائل اور حب الوطنی کے مظاہروں کا عجب دور تھا۔

کچھ سیانے سوچ بچار کا ایندھن جلا کر برصغیر کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں گم تھے۔ اُن میں سے ایک اشفاق احمد تھے جن کا رویہ، سوچ اور عمل تینوں مثبت تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانا جان گئے تھے۔

برصغیر کی وہ مشکلات ایسی ہیں جن کی آمیزش سے یہاں کی سوانحی شناخت متاثر ہوتی رہی ہے۔ گروہ کی اہمیت اور شناخت ان ہی دو اژدہوں میں کہیں گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ برصغیر کے حملہ آوروں میں پہلے آریہ لوگ تھے جو شمال سے آئے اور جنہوں نے اپنی برتری قائم کرنے اور رکھنے کی خاطر یہاں کے مقامی کول، دراوڑ، اور دیگر جاتیوں کے کم رو، غیر متمدن، اچھوت لوگوں کو اپنے میں مدغم ہونے کی اجازت نہ دی۔ رفتہ رفتہ ان ہی آریاؤں نے ایک فلسفۂ حیات کی تشکیل دی جس کے دو ارکان سارے معاشرے اور فرد کے اندر لہو اور ارادہ بن کر موجزن ہو گئے۔

ایک تو آواگون کا فلسفہ تھا اور دوسرے معاشرے کو برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں تقسیم کرنے کی بانٹ تھی۔ اس بنیادی وجہ ایک ہی تھی۔ وہ مقامی لوگوں میں گھل مل کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ہندو مذہب میں آواگون کا نظریہ اسی بانٹ کو تقویت دینے کے لیے تھا۔ فرد کی توجہ سوسائٹی کی تفریق سے ہٹا کر اس بات پر مرکوز کر دی گئی تھی کہ بابا جیسے کرم ہوں گے ویسا ہی دوسرا جنم ہوگا۔ تم جون بدلتے پھرو گے اور کبھی کہیں کسی خوش نصیب کو اعلیٰ عمل کے باعث نروان حاصل ہو جائے گا ورنہ باقی خلق اسی چکر میں رہے گی۔

دوسروں کو اپنے سے بلاوجہ کمتر سمجھنے سے جو احساسِ جرم پیدا ہوتا اسے نیک عمل کی ترغیب سے فوراً بھسم کر دیا جاتا۔ آج بھی حکومتیں اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے کمزور عوام کو اسی طرح Side track کیا کرتی ہیں۔

آریاؤں نے اس زہر کو سوسائٹی میں بظاہر امرت رس بنا کر اس کی بیل چلا دی۔ اسے مسلمان حملہ آوروں نے تقویت عطا کی۔ شمالی علاقوں سے جو حملہ آور وقتاً فوقتاً وارد ہوئے وہ بھی احساسِ برتری کی دولت سے مالا مال تھے۔ محمد بن قاسم اسلامی رواداری، توحید پرستی، انصاف پسندی کا پرچم لے کر ساحلوں پر اترا۔ اس کی عمر ایسی تھی کہ وہ آدرش پرستی کا شکار تھا لیکن اونچ نیچ والے معاشرے میں آسانی سے انصاف قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر فرد یا گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کہ وہ کسی سے ارفع یا اعلیٰ ہے تو وہاں انصاف کا آدرش پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ شاید محمد بن قاسم بھی اس بنیادی اونچ نیچ کا شکار نہ ہوتا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔

ایسے اکثریتی معاشرے میں جہاں عمل کو تولنے والا کوئی معیار، توازن یا بنیادی اصول نہ ہو، عمل کی آڑ میں کئی Self Motivated لوگ آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ برصغیر کی مسلم اقلیت بھی ایک عرصہ سے انفعالیت کا شکار ہو چکی تھی۔ اسلام میں جو بنیادی اہمیت نیت کی ہے، وہ اسی رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے پیش کی گئی۔ ایک طرف نیت،

دوسری جانب معاشرے میں برابری اور تیسری طرف رزقِ حلال کا حصول ایسے معیاری اور مشکل اصول ہیں جنہوں نے اسلامی معاشرے میں انصاف کو روحِ رواں بننے نہیں دیا۔

اس معاملے میں مغرب والے ہم لوگوں پر سبقت لے گئے۔ وہاں گروہی شناخت اور فرد کی اہمیت Ethnic Group، ذات، نسل، قبیلے کی مرہونِ منت نہیں۔ رنگ کا مسئلہ انہیں درپیش تو ضرور ہے لیکن بظاہر ہمواری نے انصاف اور قانون کا احترام آسان کر دیا اور سچ بولنے اور حق دینے میں کچھ ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔

شمال کی جانب سے آنے والے مسلمان حملہ آور آریائی قوموں سے کچھ مختلف نہ تھے۔ انہیں بھی قدروں کی پاسداری ملحوظ نہ تھی۔ ساسانی، ایرانی، افغانی، یونانی سارے احساسِ برتری سے سرشار تھے، لیکن وہ مقامی لوگوں میں گھل مل کر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔ رنگ و نسل کا تفاخر، رسم و رواج سے وابستگی، اسلام کے نام پر سے جواز ڈھونڈ لیے گئے اور مقامی لوگوں سے شادی بیاہ، ملنا جلنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔

حملہ آور ویسے بھی فاتح کہلانے کے لیے دشوار گزار راستوں سے آئے تھے۔ وہ چاہے سکندرِ اعظم جیسا دوست یا محمود غزنوی اور نادر شاہ کے روپ میں بلا کو بن کر تہس نہس کرنے آیا تھا۔ وہ مقامی لوگوں میں ظلم کی کہانیاں چھوڑ گیا، لیکن انصاف کے لیے بلکتی رعایا کو کوئی علاج نہ پیش کر سکا۔

پنجاب کی سرزمین میں حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کبھی دور دراز سے علی ہجویری داتا گنج بخش جیسے لبیک پکارتے اس مقام پر آ نکلے جسے لاہور کہتے ہیں۔ بادشاہوں، حملہ آوروں، اونچی جاتی کے مہاپرشوں کے ستائے مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ ان ڈیروں میں پناہ گزیں ہونے لگے، جہاں مفت روٹی ملتی تھی اور دکھڑا سننے والا رحم دل بابا ملتا تھا۔

لیکن سچ کا راستہ پھر مسدود ہونے لگا۔ لوگ دنیا کے ستائے ہوئے ڈیرے پر آتے تھے، لیکن انہیں سچ کی تلاش تھی، نہ معرفتِ حق۔ صوفی کے پاس دینے کو دنیا نہ تھی۔ وہ تو خود بہت کچھ تیاگ کے، دنیا کی راحتوں سے منہ موڑ کر خواہشات کے چنگل سے نکلنے کا خواب دیکھتا آیا تھا۔

مہاتما بدھ سے لے کر ماڈرن عہد تک یہی کچھ سکھانے کے لیے کچھ اللہ کے لوگ گھروں سے نکلتے تھے۔ کچھ صوفی ایک غریب کے کاسے میں ڈال رہا تھا، اس کی حاجت مند کو ضرورت نہ تھی۔ اس طرح عوام اور پیر کے مریدین اور خلیفہ حضرات کی دروغ گوئی کا ایک انوکھا سلسلہ چل نکلا اور غریب کو پھر صرف احساسِ کمتری ملا، بد انصاف نہ مل پایا۔

سچ کو خوشامد کی خوبصورت چادر اوڑھا کر دفن کر دیا گیا۔ لمبے لمبے نسب نامے عرب کے مقتدر قبیلوں سے جانے لگے۔ شجرہ لکھنے اور پڑھنے کا رواج ہوا۔ عام آدمی ایک بار پھر اتنی شان و شوکت کے سامنے ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد جھوٹ کے شامیانے گاڑھ لیے اور ان میں استراحت کرنے لگا۔ اپنی چوری سینہ زوری کے لیے گردی، عزت کی خاطر مرمٹنے یا مار ڈالنے کا جواز اس نے مذہب اور رسم و رواج میں تلاش کر لیا۔

اس طرح مشرق میں انصاف اور قانون کا تصور باقی تو رہا لیکن اضافی شکل میں اس پر عمل مفقود تھا۔

...ت کے سوالوں میں کبھی رہے نہ تھے۔ انہیں حملہ آوروں سے بھی اتنا پالا نہ پڑا تھا۔ انہیں مختلف رنگوں سے بھی نپٹنے ...ت نہ تھی۔ گورا، گندمی، گندم گوں، پیازی، سانولا، کالا ایسے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ قدرت نے انہیں اس ...میں برابری عطا کر کے بڑی سہولت پیدا کر دی تھی۔

ان کے دو اوصاف

مغرب میں انسان کی شناخت کے لیے دو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ یا تو انسان کے آداب (M...) اس کی پہچان ہیں یا اس کا کام اور سوسائٹی کا عطا کردہ مقام اس کے Identity Card میں شمار ہوتا ہے۔ ...ں سے ایک بہت بڑی خوبی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قانون کے پابند رہتے ہیں۔ ان کے لیے بار بار آئین ...میں ہوتا اور انصاف جو اسلام کا روحِ رواں ہے، ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور ان کے معاشرے کی پہچان بن ...۔

طبقات وہاں بھی ہیں۔ وہاں بھی ناہمواری ہے۔ انسانی معاشرے میں مکمل برابری ممکن نہیں لیکن وہاں ایک ...ے دوسرے طبقے میں خروج قدرے آسان ہے اور انصاف کی شرائط پوری کرنا کارے دارد نیست۔ خاں صاحب ...ے ...ذہنیت کو سمجھنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے، بہت ساری کتابوں کی چھان بین کی۔ اُن کے کاغذات میں یہ تحریریں ملی ...ملاحظہ کیجیے۔

"ہندو دیو مالا میں ایک عجیب و غریب پرندے کا ذکر ہے جس کو والمیک اپنی رامائن میں جٹایو کے نام سے پکارتا ...ے ...بن کے بیچوں بیچ جٹایو گہری نیند سویا کرتا تھا۔ یہ پنچھی ساٹھ ہزار سال تک گِدھوں کا راجہ بن کر رہا اور ان کے ...ت ...جیون بتاتا رہا۔

ان گِدھوں کے پریوار میں جٹایو کا بڑا بھائی سمپاتی بھی رہتا تھا، جس نے اپنے چھوٹے بھائی جٹایو کا جیون ...ے لیے اسے اپنے پر نوچ کر دے دیے تھے کہ وہ دھوپ اور گرمی سے بچا رہے۔ جٹایو اپنے بڑے بھائی کے اس ...کے کارن ہر گھڑی اس کی سہائتا کرتا رہتا اور اس کی سار لیتا رہتا۔

جب سری رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بنوں میں مارے مارے پھرتے تھے تو ان کی مڈھ بھیڑ پنچھیوں کے ...جٹایو سے ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئے، پر جٹایو نے سیس نوا کر کہا، میں تمہارا متر ہوں اور تمہارے باپ شری دشرتھ کا ...تھی ہوں۔ جٹایو نے شری رام چندر جی سے کہا کہ میں تمہارے گھر پر نہ ہونے کے سمے سیتا جی کی دیکھ بھال کیا کروں ...ن کی رکھوالی کروں گا۔

جب راون سیتا جی کو اُٹھا کر لے چلا تو سیتا نے غل مچا کر جٹایو کو جگایا۔ جٹایو نے کہا "ہے راکھشش! تیرے ...کرنے سے دھرتی ڈانواں ڈول ہو جائے گی اور تیری آتما نرک کا بھتنا بن جائے گی۔ اس ابلا ناری کو چھوڑ دے۔ ...رام اپنے کرودھ سے تیرا جنم جلا دے گا۔"

پر راکھشش نہ مانا اور اس نے اپنے بھالے سے جٹایو پر حملہ بول دیا۔ جٹایو نے اپنے پنکھ مار مار کر راون کی

دھنش کو توڑ دیا اور اس کے اڑن کھٹولے کو دھرتی پر گرا دیا۔ سیتا اور راون اُڑن کھٹولے سے اس روپ میں گرے کہ
راون کی گودی میں آ گئی۔ گھڑی دو گھڑی راون جٹایو کے ساتھ لڑتا رہا اور پھر بتیا چاری راکھشش نے اُچھل کر جٹایو
دونوں پنکھ کٹار سے کاٹ دیئے۔ جٹایو دھرتی پر لوٹنے لگا۔ سیتا نے جٹایو کو اٹھا کر اپنی نرمل چھاتی سے لگا لیا، پر وہ تو
کجلائی آگ کی طرح ٹھنڈا ہو چکا تھا۔"

والمیک کی رامائن پڑھ کر اشفاق صاحب کو بڑا دکھ ہوا کہ اس نے جٹایو کے کارنامے کو تو بہت بڑھا چڑھا کر
ہے لیکن اس کے برادرِ اکبر سمپاتی کا کہیں اور تذکرہ نہیں کیا جس غریب نے اپنے پر جٹایو کو دے کر اتنی بڑی قربانی کی
جٹایو پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر راہی ملکِ عدم ہو گیا تھا۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ رامائن کا تتمہ لکھ کر سمپاتی کی
پر مزید روشنی ڈالوں کہ بعد میں اس کا کیا بنا۔

مہابھارت

گھر شردارشی مہارج جنمجے کے شرپ یگیہ سے ہو کر ایک رشیوں کی منڈلی میں پہنچتا ہے اور وہاں ان روایات
مہابھارت کے قصے اور واقعات بیان کرتا ہے جو یگیہ کے دوران میں متفرق رشیوں نے بیان کیے۔

شرپ یگیہ کی وجہ

چندر بنسی خاندان جس کے چند مشہور افراد میں کرشن جی، راجہ شانتنو (جس کے فرزند بھیشم بتامہ تھے)
بھرت (راجہ دشنت کا لڑکا) اور پانڈوؤں کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اسی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ پرکچھت تھا۔ ایک
پرکچھت سیر و شکار کی غرض سے تپوبن میں گیا۔ اچانک ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ مارا مارا پھر رہا تھا کہ ایک رشی نظر آیا۔
مون برت (چپ سادھے) رکھے مالک سے لو لگائے بیٹھا تھا۔

راجہ نے لاکھ بلایا لیکن اس کی زبان کو جنبش نہ ہوئی۔ آخر تنگ آ کر راجہ نے ایک مرا ہوا سانپ سمیک رشی کے
گلے میں ڈال دیا اور آپ رخصت ہوا۔ راستہ میں شرنگی رشی سے ملاقات ہوئی۔ اسے تمام حالات بتائے۔ اتفاق
شرنگی رشی سمیک کا بیٹا تھا۔ جھٹ سراپ دیا کہ جا تجھے آج سے سات دن کے اندر اندر تکشک ناگ ڈس لے۔

باوجودیکہ ہر طرح سے حفاظت کی گئی لیکن تکشک ایک سیب میں داخل ہو کر راجہ کے پاس پہنچا اور جونہی
نے سیب تراشا، ڈس کر چلتا بنا۔

اسی راجہ کا بیٹا جنمجے جب بڑا ہوا تو اس نے سرپ یگیہ کیا۔ تمام رشیوں منیوں کو اکٹھا کیا۔ ہون جلایا جس
زمانے بھر کے سانپ اڑ اڑ کر آتے اور بھسم ہوتے رہے۔ آخر تکشک جو راجہ اندر کے ہاں پناہ گزیں ہو چکا تھا، آیا اور
ہو گیا۔ رشی آستک کے کہنے پر راجہ نے سرپ یگیہ بند کر دیا۔

ویاس جی کی پیدائش (اٹھارہ پران اور وید تصنیف کی)

چندر بنسی راجاؤں میں ایک راجہ لہو ہو گزرا ہے۔ اس کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ لڑکا تو اُس
[illegible] رکھا اور لڑکی کو ایک ملاح کے سپرد کیا۔ لڑکی کے ذمے یہ کام تھا کہ رشیوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے
[illegible] تھی۔ بارہ برس کا سن تھا۔ جب ایک دن یاراشر جی جو ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے، اس کی معیت میں پار جانے
[illegible] چونکہ ملاحوں کی لڑکی تھی، اس لیے اس کے جسم سے مچھلی کی بساند اٹھتی تھی، جس کا اُسے بہت خیال تھا۔
[illegible] دل اُس پر آ گیا اور اسی ترنگ میں دعا دی کہ آج سے تیرے جسم سے صندل کی خوشبو آیا کرے گی اور اگر حمل ہو
[illegible] جہاں پیدا ہوگا کہ باید و شاید۔۔۔۔۔ ویاس جی پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے ہی جنگلوں کی راہ لی، جہاں ساری زندگی
[illegible] میں کاٹی۔

راجہ دشنت و شکنتلا

راجہ جنمے جے اپنے خاندان کے حالات سن رہا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ ہندوستان کا نام بھارت ورش کیونکر پڑ گیا۔ سو
[illegible] نے بیان کیا کہ شکنتلا دراصل وشوامتر رشی کی لڑکی تھی۔ رشی کا جپ تپ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مہاراج اندر کو اپنے
[illegible] کے لالے پڑ گئے۔ اس پر مینکا کو طلب کیا اور حکم صادر فرمایا کہ جا کر رنگ بھنگ کرو۔ مینکا نے کام دیو اور
[illegible]) کو ساتھ لیا کہ مدد کریں اور حکمِ حاکم بجا لائی۔ وشوامتر اور مینکا کے میل سے شکنتلا پیدا ہوئی۔ رشی مہاراج پھر جپ
[illegible] مشغول ہوئے۔ مینکا نے سورگ کی راہ لی۔ شکنتلا کو کنو رشی نے بیٹی بنا کر پال لیا۔

ایک دن راجہ دشنت جنگل میں آ نکلے۔ شکنتلا کا روپ دیکھ کر دل آ گیا۔ گندھرب وواہ کیا۔ شکنتلا نے بردان
[illegible] اگر حمل ہوا اور بچہ پیدا ہوا تو وہی تخت و تاج کا وارث ہوگا۔ دشنت نے بردان دیا اور گھر کی راہ لی۔ کنو رشی واپس
[illegible] تو دیکھا کہ شکنتلا بیاہی جا چکی ہے۔

کچھ عرصہ بعد راجہ بھرت پیدا ہوئے۔ ماں نے بچہ کو راجہ دشنت کے پاس بھیجا، جس نے پہچاننے سے اس لیے
[illegible] کہ زمانے کی طعنہ زنی سے ڈرتا تھا۔ بالآخر آکاش سے آواز آئی کہ یہی فرزند تخت و تاج کا مالک ہوگا۔ سو شکنتلا
[illegible] رانی بنایا اور یوں بھرت کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت ورش ہوا۔

بھیشم پتامہ کی پیدائش

ایک روز برہم سبھا کا اجلاس ہوا۔ اس میں مہابھک راجہ بھی آئے اور دیوتاؤں کی استریاں بھی تشریف لائیں۔
گنگا جی کا حسن و جمال افروز ایسا تھا کہ مہابھک عاشق ہو گئے۔ برہما جی برافروختہ ہوئے کہ ایسی مجلس میں یہ ایسی بدلحاظی۔
[illegible] دی کہ جاؤ زمین پر ایک جنم بھوگ کر آؤ۔ یہی راجہ شانتو کے روپ میں پیدا ہوئے۔ گنگا جی کے دل میں بھی آگ
[illegible] رہی تھی۔

مہابھک کی وجہ سے اپنے باپ برہما سے اجازت لی اور دنیا کا رخ کیا۔ راستے میں آٹھ سبو ملے کہ جنہیں دنیا
[illegible] زندگی کاٹنے کا سراپ ملا تھا۔ گنگا جی نے وعدہ کیا کہ انہیں اپنے بطن سے پیدا کر کے جلد از جلد دنیا سے رخصت کر دے

گی لیکن ایک بچہ دنیا میں باقی رہے گا۔ ایک سبو جس کا نام دیئو تھا راضی ہو گیا لیکن یہ شرط پیش کی کہ جب تک جیوں گا دنیاوی جھنجھٹ میں نہ پڑوں گا۔ یعنی شادی بیاہ نہ کروں گا۔

گنگا کی شادی شانتو سے ہوئی تو اس نے راجہ سے بر مانگا کہ جو کچھ میں کروں مجھے ٹوکنا نہیں۔ سات بار اس کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ وہ بچہ پیدا ہوتے ہی گنگا کے سپرد کر دیتی تھی۔ جب آٹھویں بار حمل ہوا تو شانتو ناراض ہو گیا کہ اس بار بچہ میرا ہوگا۔ بچہ (دیو برت) پیدا ہوا تو گنگا رخصت ہوئی کیونکہ راجہ نے اسے ٹوک دیا تھا۔ اس طرح دیو برت جس کا نام بعد کو بھیشم پتامہ ہوا اور جس نے ساری زندگی برہم چاری کی زندگی بسر کی۔

راجہ شانتو کی متسو دری سے شادی

متسو دری جس کا نام اس کی خوشبو کے باعث جوجن گندھا پڑ گیا تھا، ایک دریا پر ملاحی کرنے جاتی تھی۔ راجہ شانتو کو خوشبو کشاں کشاں کھینچے لائی۔ دیکھا تو صورت بھی بلا کی نظر آئی۔ ملاح سے لڑکی کا مدعی ہوا لیکن ملاح ٹال گیا۔ گھر پہنچا تو حالت غیر دیکھ کر بھیشم پتامہ نے وجہ پوچھی۔ جب علم ہوا کہ یوں جوجن گندھا کے لیے پریشان ہیں تو ملاح کے پاس پہنچا اور ہر ممکن شرط ماننے کو تیار ہو کھڑا ہوا۔ ملاح نے کہا کہ میری بچی کے بطن سے جو بچہ پیدا ہو وہی بادشاہ بنے۔ بھیشم پتامہ نے وعدہ کیا کہ جیتے جی شادی ہی نہ کرے گا تا کہ متسو دری کا بچہ راج گدی کا وارث ہو سکے۔ اپنے باپ کے لیے متسو دری کو لے کر روانہ ہوا۔ یاد رہے اسی متسو دری کے بطن سے ویاس جی بھی پیدا ہوئے تھے اور اسی رانی کا نام راجہ شانتو نے رانی ستوتی رکھا۔

متسونی کے بطن سے دو فرزند تولد ہوئے۔ چتر انگد اور بچتر بیرج۔ ابھی دونوں کمسن تھے کہ راجہ شانتو کا انتقال ہو گیا۔ بھیشم پتامہ نے بڑے لڑکے کو گدی پر بٹھا کر نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن بڑا لڑکا نالائق ثابت ہوا اور ایک لڑائی میں مارا گیا اور یوں بچتر بیرج راجا ہوا۔ وہ بڑا نیک چلن اور راست باز تھا۔ بھیشم کی باتیں من و عن مانتا تھا۔

جب بچتر بیرج سنِ بلوغ کو پہنچا تو ان ہی دنوں راجا کاشی نے اپنی تین راجکماریوں اینا، انبالکا اور ابنکا کا سوئمبر رچایا۔ بھیشم پتامہ بچتر بیرج کو لے کر پہنچے اور سوئمبر کے اصول جملہ امیدواروں کے گوش گزار کیے۔

1- برہم وواہ: دفتر کو آراستہ کر کے ہاتھ میں پانی دے کر کنیادان کیا جائے۔

2- اُسر وواہ: دولت کا لالچ دے کر عزیز و اقارب کو پھانس لیا جائے اور یوں لڑکی سے وواہ کیا جائے۔

3- راکھشش وواہ: زبردستی اور ظلم سے لڑکی کے والدین کو رضامند کیا جائے اور پھر لڑکی کی رضامندی کے خلاف شادی کی جائے۔

4- گندھرب وواہ: عورت اور مرد جوشِ محبت میں بیاہ کر لیں۔ افضل مانا گیا ہے۔

5- آرش وواہ: یہ افضل تو نہیں لیکن رائج ہے۔ دو گائیں خاوند سے وصول کر کے لڑکی سپرد کر دی جائے۔

6- دیو وواہ: اعلیٰ درجے کا مانا گیا ہے۔ سوئمبر اسی اصول پر ہوتے ہیں۔

7- پرجابت وواہ: افضل مانا گیا ہے۔ جہیز دے کر لائق لڑکا ڈھونڈ کر لڑکی بیاہ دی جائے۔

پشاچ وواہ: حد درجہ کا ناقص اور داخل گناہ ہے۔لڑکی کو حواس باختہ پا کر یا نشہ پلا کر اُڑا لے جانا۔

بھیشم پتامہ نے اپنے زورِ بازو سے تینوں راجکماریاں سنبھالیں اور چلتے بنے۔ راہ میں کئی ایک راجوں سے ... ہوئی لیکن سبھی ہار گئے اور بھیشم پتامہ تینوں لڑکیوں کو لے ہستناپور پہنچے۔ ابنا نے موقع پا کر گزارش کی کہ چونکہ ... منگیتر ہوں اس لیے مجھے معاف کیجیے اور اس کے پاس بھجوائیے۔

بھیشم مان گئے اور یوں بچتر بیرج کی دو رانیاں ہوئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد راجہ لاولد ہی مر گیا اور مہارانی ستوئی ... کی فکر میں ویاس جی کو بلایا کہ اب انتظام فرمایئے۔ جائز وارث کوئی نہیں اور رانیاں گھلی مرتی ہیں۔ ویاس جی ... سے کہ بن ٹھن کر میرے پاس آئیں اور نہ گھبرائیں۔ پہلے ابکا گئی۔ بیچاری ویاس جی کو دیکھ کر ایسی گھبرائی کہ ... لیں۔ اسی لیے اندھے دھراشٹر پیدا ہوئے۔ پھر ابنالکا گئی۔ دیکھتے ہی رنگ اڑ گیا۔ اس کے بطن سے پانڈو پیدا ... کے بعد ابکا لے چالاکی سے ایک خواص بھیجی۔ اس کے ہاں بُرری پیدا ہوئے۔

بچتر بیرج

دھرتراشٹر

پانڈو

(ماروی کے بطن سے)

ابکا (گندھاری کے بطن سے)

پانڈو

بُرمی

دریودھن

ابنالکا (کنتی) کے بطن سے

شکنی

جدھشٹر

دوشاسن

بھیم سن

ارجن

اور

نکل

(سو بھائی)

سہدیو

دھرتراشٹر کی بیوی گندھاری کو ایک جوگی کا بردان تھا کہ سو بیٹے کھلائے گی۔ ابھی اس کو حمل باقی تھا جب اسے خبر ... پانڈو کو خدا نے پانچ لڑکے عطا کیے تو مارے حسد کے پیٹ پیٹنے لگی۔ حمل گر گیا۔ اب اس نے جوگی کی دہائی دی کہ واہ ... دیا۔ رشی جی کا نزول ہوا۔ حکم ہوا کہ گوشت کے لوتھڑے کو سو حصوں میں تقسیم کر کے سو گھی کے مٹکوں میں بند کر دو اور ... سو کورو پیدا ہوں۔

مہارانی کنتی جب چھوٹی تھی دربار سارش نے اسے ایک منتر سکھایا کہ جب چاہو گی کسی دیوتا کو بلا سکو گی۔ جب ... پہنچی تو ایک دن اس منتر کی آزمائش کی اور سرج نارائن کو بلایا۔ وہ حاضر ہوئے تو آتے ہی عاشق ہو گئے۔ حمل ٹھہر ... بردان دیا کہ بچے کی کسی کو خبر نہ ہو گی۔ وقت معین پر کرن پیدا ہوا اور کنتی نے پانی میں ڈال کر خدا کے حوالے کیا اور ... دھراشٹر کے رہبان نے بیٹا بنا کر پرورش کی۔

راجہ پانڈو ایک دن شکار کو گئے تو ایک ہرن ہرنی کو عین جنسی فعل کے وقت مارا جس رشی کا ہرن تھا اس نے ... یا کہ تو بھی عین لطف زندگی کے وقت جان دے گا۔ راجہ پانڈو کا جی راج پاٹ سے بھر گیا۔ وہ اپنی دونوں رانیوں کو

لے کر جنگل میں رہنے لگا۔ اولاد کی اُمنگ دن پر دن بڑھی اور آخر میں یوں دیوتاؤں کو لدولدی کا داغ مٹانے کے
جائے۔

مہارانی کنتی اور سری دھرم راج (یم دوت)	راجہ جدھشٹر
کنتی اور پون جی	بھیم سین
کنتی اور راجہ اندر	ارجن
ماروی اور اسونی کمار	نکل اور سہدیو

لیکن ایک دن پانڈو ماروی کے روپ سے بہت ہی متاثر ہو گئے اور موت کی پرواہ بھی نہ کی تو عین
کے وقت جان نکل گئی۔ ماروی نے ستی ہونا قبول کیا اور کنتی پانڈوں کو لے کر ہستناپور آ گئی۔

دریودھن شروع سے ہی حاسد تھا اس لیے بھیم سین کو زہر دے دیا لیکن باسکی ناگ نے سارا زہر کھینچ
بھیم سین بخیر و عافیت واپس لوٹا۔

درونا چاریہ کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا گیا اور جب دونوں لائق ہو گئے تو ایک دن دریودھن
بھیم سین کو زہر دیا۔ اس نے بار باسک ناگ کی دختر ایل متی سے شادی کر لی۔

حسد نے رفتہ رفتہ یہ صورت پکڑی کہ اکٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور فیصلہ ہوا کہ برناوہ میں پانڈو رہیں
میں کورو۔ ادھر دریودھن نے سکیم لڑائی اور ایک لاکھ سعد کا عمدہ مکان تعمیر کروایا۔ تدبیر یہ تھی کہ سوتے میں مکان
جائے۔ حسن اتفاق سے راجہ جدھشٹر کو علم ہو گیا اور جس رات مکان جلنا تھا اس رات وہ خاموشی سے اپنی ماں کنتی
بر آ گئے اور ان کی جگہ پانچ فقیروں اور ان کی ماں بھسم ہو کر رہ گئے۔ اب دریودھن خوش ہوا۔

اب یہ پانچوں بھائی آوارہ پھرنے لگے۔ راہ میں بھیم سین پر ہڈ مہارا کشنی فریفتہ ہو گئی اور بھیم سین نے
ساتھ گندھرب دواہ کر لیا۔ اس کے بطن سے گھٹوٹ کچ پیدا ہوا۔ ان ہی دنوں میں مہاراجہ دروپد کی بہن دروپدی
ہوا۔ شرط یہ تھی کہ ایک بھڑکتی چمکتی جواہرات کی مچھلی کو ایک تیل کے کڑاہے میں دیکھ کر نشانہ لگایا جائے۔ چکر
تھا۔ مچھلی پر نظر نہ جمتی تھی۔ سب راج ہار گئے۔ ارجن جو برہمنوں کے بھیس میں تھا، اُٹھا اور شرط جیت لی۔

جب دروپدی کو لے کر کٹیا میں آئے تو ماں سے کہا کہ ایک مال لائے ہیں بہت ہی عمدہ۔ ماں نے کہا
بھائی بانٹ لو۔ دروپدی پانچوں کی بیوی ہو گئی۔ پورا ایک سال ایک بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور شرط تھی کہ اگر غلطی
دوسرا بھائی خواب گاہ میں آ جائے تو اسے بارہ برس کا بن باس۔ ارجن ایک دن ایک برہمن کی رکشا کے لیے اپنے
وغیرہ لینے اندر چلا گیا تو پھر اسے بارہ برس بن باس نصیب ہوا۔

راجہ دھرتراشٹر نے سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے۔ ہستناپور کوروں کو ملا اور اندرپرست پانڈوں کو۔

ارجن نے اپنے بارہ برس کے دوران میں باسک ناگ کی لڑکی الوپی سے گندھرب دواہ کیا۔ پھر منی
راجکماری چندانگدا اور اس کی بہن کو عقد میں لایا اور آخر میں کرشن جی کی بہن سوبھدرا سے شادی کی جس کے بطن
ابھمنیو پیدا ہوا۔

راجہ جدھشٹر کو سری کرشن نے صلاح دی کہ راج سویہ یگیہ کرو اس میں اس نے پانڈوؤں کو بھی مدعو کیا جو اس جگہ کی عظمت کو دیکھ کر ایسے جلے کہ انتقام کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ آخر جدھشٹر وغیرہ کو اپنے ہاں مدعو کیا اور جوئے میں شکنی کے فریب سے اس کا سب کچھ جیت لیا۔ حتیٰ کہ وہ پانچوں بھائی غلام اور دروپدی کنیز ہوگئی۔ اس پر بھی دریودھن کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا اس نے دروپدی کو سر دربار برہنہ کرنا چاہا لیکن جوں جوں وہ شاسن چادر کھینچتا تھا، ستر لمبا ہوتا جاتا حتیٰ کہ دربار کپڑے سے بھر گیا۔ پھر دریودھن نے ران ننگی کی اور دروپدی کو دعوت دی کہ کوروؤں میں سے کسی کی رانی بن جائے۔ اس پر بھیم سین نے وعدہ کیا کہ وہ لڑائی میں کرن کی جان لے گا اور دریودھن کی ران توڑے گا۔ جب رانی گاندھاری کو اس ظلم کا علم ہوا تو وہ دوڑی آئی اور دھرا اشٹر کو شرمندہ کیا اور جدھشٹر کو راج پاٹ دلایا۔

دریودھن کے دل میں دکھ تھا۔ اس نے دوبارہ جدھشٹر کے ساتھ جوا کھیلا اور اس بار شرط یہ رکھی کہ جو ہارے اُس کے لیے بارہ برس بن باس۔ اس کے بعد ایک سال گُپت رہنا۔ اگر اس سال کے دوران میں دوسرا فریق پہچان لے تو پھر بارہ سال کا بن باس...... جدھشٹر ہار گیا اور یوں پانڈوؤں کا بن باس شروع ہوا۔ پانڈوؤں کے ہاتھ برہمنوں کا ایک لشکر اٹھ کھڑا ہوا لیکن سورج نارائن کے بردان کے باعث جدھشٹر ان سب کی تواضع کرتا ہی رہا۔

ارجن نے بہت دن تپسیا کی تو ایک دن مہادیو جی بنفس نفیس آئے اور اسے آزمایا۔ دوران جنگ مہادیو کا جسم ارجن سے چھو گیا اور اس طرح ارجن میں یہ قوت پیدا ہوگئی کہ وہ اسی جسم سمیت بہشت جا سکتا تھا۔ دھرم راج اندر وغیرہ اسے لے گئے اور ہر قسم کا علم وفن سکھایا۔ جب شستر ودیا (علم جنگ وجدل) بہت سیکھ گیا تو اندر نے چتر سین کے پاس بھیجا کہ گندھرب ودیا (موسیقی) بھی سیکھ لو۔ اس طرح جب ارجن اپسراؤں کے ساتھ ناچ گانے کی مشق میں مشغول تھا تو اُروشی اپسرا اس پر عاشق ہوگئی لیکن ارجن نے ٹالا۔ اس پر اربسی خشمگیں ہوئی اور بد دعا دی کہ جا ایک سال ہیجڑا بن کر رہے۔ یہ سراپ اس وقت کام آیا جب ارجن کو کوروں سے چھپنے کے لیے راجا برات کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

راجہ جدھشٹر نے اس دوران میں تمام تیرتھوں کی زیارت کی اور رشیوں سے اپنے اسلاف کی کہانیاں سنیں جن میں نل دمینتی کی داستان آج کل زبان زد عام ہے۔

نل دمینتی

راجہ نل دمینتی پر عاشق تھا لیکن اس تک رسائی نہ تھی۔ ایک دن ایک ہنس قابو آ گیا۔ ہنس نے رہائی چاہی تو راجہ نے رہا کیا ایک شرط پر۔ دمینتی سے جا کر میری محبت کا چرچا کرو۔ دمینتی نے جب راج ہنس کی زبانی راجہ کا احوال سنا تو ہزار جان سے فریفتہ ہوگئی۔ دمینتی کے باپ ''بھیم سین'' (پانڈوؤں) نے سوئمبر کی ٹھہرائی۔ اس سوئمبر میں شریک ہونے کو اندر، دھرم راج، اگن اور برن دیوتا بھی جا رہے تھے۔ راہ میں راجہ اندر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ راجہ نل ہمارا ایک پیام دمینتی کے پاس لے جاؤ کہ ہم چاروں میں سے کسی کو شوہر بنانا قبول کرلے۔

راجہ نل نے الوپ انجن لگایا اور دمینتی کے حضور پہنچا لیکن وہاں تو اور ہی گل کھلا۔ دمینتی الٹے راجہ نل جی پر سوجان سے فدا ہونے لگی۔ دوسرے دن جب سوئمبر میں دمینتی نے جے مالا ڈالنے کی غرض سے راجہ نل کو ڈھونڈا تو پتہ لگا راجہ نل کی صورت کے چار اور بھی بیٹھے ہیں۔ سٹپٹائی اور دعا مانگنے لگی۔ آخر خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ چار اگن، دھرم، اندر اور برن ہیں۔

سوچا تو دیوتا کی پہچان صاف نظر آئی نہ تو سایہ تھا نہ آنکھیں جھپکتی تھیں اوران کے پاؤں تخت سے کچھ اونچے تھے۔ جب
راجہ نکل کے گلے میں جے مالا ڈال دی۔اس موقع پر دیوتاؤں نے نل کو بردان دیئے۔

1- تمہارے یگ میں تمام دیوتا اصلی صورتوں میں رونق افروز ہوں گے۔

2- عمدہ طور پر نجات ہوگی۔

اگنی دیوتا بولے

1- جب یاد کرو گے آؤں گا۔

2- مرنے کے بعد اس سے روشن جگہ ہوگے جہاں میں ہوں۔

دھرم راج بولے

1- تمہارے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز ذائقہ میں بے نظیر ہوگی۔

2- اور ہار عنایت کیا جس کی خوشبو کبھی نہیں جا سکتی۔

برن نے کہا

جب یاد کرو گے پانی مل جائے گا اور جس خالی برتن کو دیکھو گے بھرا ہوا پاؤ گے۔

کلجگ جو دمینتی کا خواہاں تھا۔ وقت پر سوئمبر میں نہ پہنچا۔ اب عرصہ کے بعد اس نے انتقام کی سوچی اور راجہ
کے بھائی پشکر کو جوئے پر اکسایا۔ نل نے تخت و تاج ہار کر دمینتی کے ساتھ جنگل کی راہ لی اور اپنے لڑکے، لڑکی کو اپنے
کے پاس کندن پور بھیج دیا۔

رانی نے بہت کہا کہ چلو میرے میکے چلو لیکن نل کو منظور نہ ہوا اور ایک رات جب اس نے موقع پایا تو دمینتی کی
آدھی چادر پھاڑ کر چلتا بنا۔ اب دمینتی روتی چلاتی بھٹکتی بھٹکاتی راجہ چندھیری کے ہاں پہنچی۔ راجہ نل جب جنگلوں میں
رہا تھا تو کرکوٹک ناگ آگ میں جل رہا تھا۔ راجہ نے اس کی جان بچائی لیکن اس نے موقع پاتے ہی کاٹ کھایا۔ جس سے
راجہ کی ہیئت کذائی ہی بدل گئی۔

اب ناگ بولا، یہ میری کینچلی لو، جب اصلی روپ میں آنا چاہو گے اسی کی بدولت آ جاؤ گے۔ دمینتی کو آخر باپ نے
ڈھونڈ نکالا اور پھر نل کی تلاش جاری ہوئی۔ راجہ نل راجہ رتوبرن کا رتھ بان ہو گیا۔ رانی نے کچھ برہمن چار دانگ بھیجے کہ
اشلوک ہر جگہ سنائیں جہاں سے ٹھیک جواب ملے وہیں نل ہوگا۔ رتوبرن کے رتھبان یعنی راجہ نل نے اشلوک پڑھے اور
جواب دیئے۔ اب دمینتی نے رتوبرن کے پاس پیام بھجوایا کہ چونکہ راجہ نل لاپتہ ہے اس لیے دوبارہ سوئمبر رچا رہی ہوں۔
ایک دن میں پہنچو۔

رتوبرن اور نل رتھ پر روانہ ہوئے تو گھوڑے ہوا ہو گئے۔ راہ میں راجہ رتوبرن نے ایک چھتنار درخت کے تمام
پتے اور پھل گن لیے۔ نل متعجب ہوا کہ اتنی تھوڑی دیر میں ایسا حساب۔ سو فیصلہ ہوا کہ نل راجہ کو رتھبانی سکھائے جس کے
عوض راجہ رتوبرن اُسے یہ فن سکھائے گا۔ جب دربار میں پہنچے تو رانی پہچان نہ سکی کہ نل کون ہے۔ سو اُس نے اپنی خواص کیشنی
کو نل کے پاس دو خالی مشکیزے دے کر بھیجا۔ جونہی نل کی نظر پڑی وہ پانی سے بھر گئے۔ پھر نل کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا

ہو گیا۔ بغیر آگ کی چنگاری کے آگ جلائی تو دمینتی کو اعتبار آ گیا کہ ہونہ ہو یہی راجہ نل ہے۔
اب اس نے اپنے بچوں کو نل کی خدمت میں بھیجا۔ راجہ انہیں دیکھ کر رونے لگا۔ سو تصدیق ہوئی کہ یہی نل ہے۔
پھول سنائے۔ اس کے بعد پھر لشکر سے جوا بازی کھیلی۔ اس بار چونکہ نل ایک بہیڑے کے درخت کو ڈھا چکا تھا۔
درخت میں رہتا تھا اور یوں نل کے تابع ہو گیا تھا) اس لیے پشکر کی کوئی پیش نہ گئی اور یوں راجہ نل نے پھر
لی۔

ایک دن جنگل میں دروپدی بیٹھی تھی کہ ایک خوبصورت کنول کا پھول اس کے پاس آ کر گرا۔ اس نے بھیم سین
کہ اگر ایسے ہی چھ اور پھول ملیں تو کیا بات ہو۔ بھیم سین روانہ ہوا تو گندھ مادن پربت میں گزر ہوا۔ یہاں
اسے پھول لینے سے روکا کیونکہ یہ باغ گندھریوں کا تھا اور وہ ہی پھولوں کے جائز حقدار تھے۔ ہنومان اور
جنگ ہوئی لیکن بھیم سین اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا اور جب اسے علم ہوا کہ یہی ہنومان ہیں تو اسے استدعا کی کہ
مختصر حال اسے بھی بتائے جائیں۔

ہنومان نے رمائن کے واقعات سنانے کے ضمن میں کہا کہ جگ مندرجہ ذیل ہیں:

دھرم کی پوری عملداری کا زمانہ۔ وید ایک ہی تھے۔ شام۔ یجر اتھروا اور رگ وید کی تخصیص نہ تھی۔

ست جگ سے کم لیکن انسان راستی پسند اور عبادت سے غافل نہ تھے۔

دھرم میں کمی ایک وید کے بدلے چار وید بنے۔

جس میں ادھرم زوروں پر ہوگا۔

جن دنوں جدھشٹر اور اس کے چاروں بھائی (ارجن بہشت میں تھا) بن باس کاٹ رہے تھے، ہری کشن بھگوان
کے ان کے پاس آئے۔ دروپدی اور ست بھاماں میں پتی برتا عورتوں کے متعلق باتیں ہوئیں اور دروپدی
عورت کی فضیلت بیان کی۔ مارکنڈے جی جو دروپدی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے راجہ جدھشٹر کو سیتاوان
کی کہانی سنائی جس میں ایک پتی برتا عورت کا اتہاس ہے۔

"اموپت" مدرولیش کا راجہ وار تھا۔ اس نے گلہ کیا اور ساوتری سے اولاد کی خواہش کی۔ جب لڑکی پیدا ہوئی
اس کا نام بھی ساوتری رکھا۔ جب بڑی تو اموپت نے اسے کلّی اختیار دیا کہ جس کے ساتھ چاہے شادی کرے۔
جب جنگل میں ساوتری کی پالکی جا رہی تھی۔ سیتاوان نظر پڑا۔ اس کا باپ اندھا تھا اور راج پاٹ کھو کر جنگل میں
ساوتری نے جب اس کے ساتھ شادی کی تمنا کی۔ نارو جی نے کہا کہ لڑکا تو اچھا ہے لیکن عمر فقط ایک سال باقی
ساوتری نے پھر اسی سے شادی کی۔ جب ایک سال گزرا تو ایک دن سیتاوان کلہاڑ لے کر پھول بیل اور لکڑیاں لینے
ساوتری بھی ساتھ ہوئی۔ کچھ دیر بعد سیتاوان اس کے زانو پر سر دھر کر سویا تو سوتا ہی رہ گیا۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے
سیتاوان کے قالب کو انگوٹھے بھر کا بنا کر جانے والا تھا۔

اب ساوتری یمراج کے ساتھ ہو لی۔ یمراج نے کہا کہ تو چونکہ پتی برتا عورت ہے سو مانگ کیا مانگتی ہے۔ فقط
کی جان نہ مانگنا۔ ساوتری نے کہا تو سُسر کی آنکھیں دے دیجیے اور اقبال کے آفتاب کو گہن سے نکال کر

چمکائیے۔ استدعا قبول ہوئی مگر اب بھی ساوتری پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ یمراج نے دیکھا تو پھر بردان دیا۔ سا
سُسر کو راج پاٹ دلوائیے اور دھرماتما بنائیے۔

یہ بھی بات یمراج نے مان لی لیکن اب بھی ساوتری ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور دھرم کی باتیں کے جا
یمراج نے کہا، اب کیا چاہیے؟ کہنے لگی کہ میرے بھائی نہیں ہے، ایسا بردان دیجیے کہ ماں کے سو بیٹے ہوں۔ یہ
منظور ہوئی لیکن پھر جب یمراج نے مڑ کر دیکھا تو ساوتری ساتھ ہولے، مانگ کیا مانگتی ہے؟ ساوتری نے کہا کہ
ہے سو طاقتور، دھرم وان اور سعادت مند لڑکوں کی ماں بنائیے یمراج نے کہا، مانا۔ اب ساوتری نے کہا، مہا
سیانے ہیں، جب ستیاوان ہی آپ کے ساتھ ہے تو میں ماں کیسے بنوں گی۔ سو ستیہ وان کی روح واپس کی گئی او
خوشی رہنے لگے۔

رام سیتا کا ذکر مارکنڈے جی کی زبانی

جب رام چندر وغیرہ بن میں تھے تو راون ایک دن سیتا جی کو اڑا لے جانے بن میں آیا۔ راون نہایت
دنیا کے تمام شہزوروں کا سرتاج تھا۔

برہما جی

پولست (بیوی گدھا) — سیوا ایمبھو (واپس بلا لیا گیا)

بے شروا + تین راکھشش لڑکیاں (راکا + ہانی + پستپو تکلا) — بے بروں

راون — کمبھ کرن — بھیکیں

برہما جی نے جہاں تمام خلقت بنائی وہاں دو فرزند بھی پیدا کیے۔ پولست رشی اور سوایمبھو۔ پولست کی بیوی
گو تھا تھا۔ اس کے بطن سے بے بروں کی پیدائش ہوئی لیکن اسے بچپن سے ہی برہما جی نے سنبھال لیا۔ اب بے
پیدائش ہوئی۔ اس نے ایسی جپ تپ کی کہ کوبیر جی نے سوچا جانے یہ عبادت کیا رنگ لائے۔ راکھششوں کی تین
جمیل لڑکیاں اس کے پاس بھیج دیں۔ (راکا۔ ہانی۔ پسپتو تکلا) وغیرہ نے ان چار بچوں کو جنم دیا۔ بھیکھن (دھرمی تھا)
راون۔ کمبھ کرن (مہیب صورت) ارو سروپ نکھا (دھرماتما لوگوں کی دشمن)

راون نے ایسی تپسیا کی کہ برہما جی اور مہادیو جی آئے اور کہا، دائمی زندگی کے علاوہ جو مانگنا ہے مانگو۔
دس مرتبہ سر کاٹ کاٹ کر چڑھایا تو بردان منظور ملا۔ جب چاہو گے دس سر ہو جائیں گے اور پھر لطف یہ کہ خوبصورتی

پھر دوسرا بردان یہ دیا کہ سوائے انسان، ریچھ اور بندروں کے کوئی تمہیں مار نہ سکے گا۔ جب راون کو یہ بردان مل گیا تو وہ اتنا منہ زور ہوا کہ دیوتا بھی اس سے پناہ مانگنے لگے۔ اب انہیں فکر ہوئی کہ آخر راون سے کیونکر نجات ملے۔ صلاح یہ ٹھہری کہ دیوتا بندر اور ریچھ بن کر دھرتی پر چلیں۔

جانکی جی کے سوئمبر میں رام چندر نے رشوکا، دھنش توڑ اور ستیا جی کو بیاہ لائے۔ جب راجہ دشرتھ بوڑھا ہوا تو رام کو راج دے کر جپ تپ میں لگے لیکن منتھرا خواص نے ایسی لگائی بجھائی کی کہ رانی کیکئی نے اپنے دو سابقہ وعدے دشرتھ کہ منوا کر چھوڑے۔ اولاً یہ کہ بھرت کو راج گدی ملے اور دوئم رام کو چودہ برس بن باس۔

راجہ دشرتھ تو رام کے بن جاتے ہی جاں بحق ہوئے۔ ادھر بھرت اور شتروگھن نانہال سے واپس آئے تو رنگ ہی بدلا تھا۔ لچھمن رام اور سیتا بن باس کو جا چکے تھے اور بھرت راجا تھا بھرت نے رام کا پیچھا کیا۔ چترکوٹ کے مقام پر ملاقات ہوئی۔ بھرت نے لوٹ جانے پر اصرار کیا۔ رام نے باپ کے وعدے کا پاس کیا۔ آخر بھرت رام چندر کی کھڑاویں لے کر چودہ برس راج کرتا رہا۔

جن دنوں رام چندر جی پنج وٹی میں مقیم تھے، ان دنوں اس علاقے پر کھر دوکھن کا راج تھا۔ سروپ نکھا اپنے بھائی کے ساتھ بن میں آئی۔ پہلے رام کو لبھایا پھر لکشمن کے سر ہوئی۔ اس نے غصے میں آ کر ناک کاٹ دی۔ کھر دوکھن کے پاس چلی گئی۔ سب راکھشش لڑنے آئے لیکن مارے گئے۔ اب سروپ نکھا راون کے پاس گئی اور اسے غیرت دلائی۔ راون نے سحر کھائے ہرن بن کر "ماریچ" کو پنج وٹی بھیجا۔ چھلاوے پر چھلاوے دکھائے۔ رام چندر سیتا جی کی فرمائش پر ڈھونڈنے کو نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آئی، دوڑو لکشمن رام کی جان پر بنی ہے۔

لچھمن گو سیتا کو تنہا چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا لیکن سیتا جی بضد ہوئیں کہ رام کی کمک کو پہنچو۔ چلتے چلتے لچھمن سیتا جی کو کٹیا میں بٹھا گیا۔ راون آیا تو سیتا جی نے کٹیا کے اندر سے پھل پھول پیش کیے لیکن راون جو برہمن کے بھیس میں تھا، کہا کہ بھکشا باہر نکل کر دی جائے۔

جب سیتا جی باہر نکلیں تو لے اڑا۔ راستے میں گدھ جٹایو نے روکا لیکن راون سے پیش نہ گئی۔ سیتا جی راستے میں زیور پھینکتی جاتی تھیں تا کہ رام چندر کو ڈھونڈنے میں سہولت ہو۔ لنکا پہنچ کر سیتا جی کو اشوک باٹکا میں رکھ کر راکھششوں کا پہرہ بٹھا دیا۔ جب رام لکشمن ڈھونڈتے ہوئے نکلے تو گدھ جٹالو نے تمام کیفیت بیان کی اور جاں بحق ہو گیا۔ پھر راہ میں ایک راکھشس ملا۔ اس نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ دور پینا سر تالاب کے پاس سگریو اور ہنومان جی ملیں گے۔ وہ سیتا جی کی حالت سے واقف ہیں۔

سگریو (بندروں کا بادشاہ) اپنے بھائی بالی کے خوف سے روپوش تھا۔ جب رام چندر جی کو آتے دیکھا، سمجھا کہ بالی کے آدمی ہیں۔ ہنومان جی کو بھیجا کہ حال معلوم کریں۔ وہ برہمن کا روپ دھار کر پہنچا۔ پتہ لیا تو رام چندر جی تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ چلیے سگریو کے پاس چلیے۔ بالی بڑا بھائی ہے سگریو چھوٹا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو مار بھگایا ہے۔ رام چندر کی مدد سے بالی کو شکست ہوئی اور سگریو پھر بادشاہ بنا۔

اب بندر چار دانگ جانکی جی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ آخر مہابیر جی لنکا میں پہنچے۔ بھکن جو رام کے
تھا، اس سے (سیتا) جانکی جی کا سراغ ملا۔ رام چندر کی انگوٹھی ان کو دی اور ڈھارس بندھائی۔ پہریداروں کو خبر ہو
کر راون کے پاس لے گئے۔ راون نے حکم دیا کہ دم میں آگ لگا کر بھسم کر دو۔ مہابیر جی نے لنکن میں آگ لگا
اشوک باٹکا اور بھبھکین کا گھر سلامت رہا۔

جب رام بھبھکین پل باندھ کر لنکا میں اترے اور پالا ان کے ساتھ پڑا تو آکاش سے برہما جی، اگنی
دشرتھ وغیرہ اترے اور جانکی جی کی پاکدامنی کی تصدیق کی۔ بھبھکین کو لنکا راج دیا۔ بھرت نے استقبال کیا اور رام
گیارہ ہزار برس حکومت کی اور ان کے بطن سے دو فرزند لو اور کش پیدا ہوئے۔

جب بارہ سال مکمل ہو گئے اور گپت رہنے کا وقت آیا تو پانچوں بھائی مندرجہ ذیل کاموں پر راجہ برات
مع دوریدہ کے نوکر ہو گئے اور نام بدل لیے۔

راجہ جدھشٹر:	قمار بازی	(کنک نام)
بھیم سین:	رسویا	(بلو)
ارجن:	ہیجڑا ناچ گانا پر مقرر	(ہرنہلد)
نکل:	اصطبل کا مالک	(گرشقک)
سہدیو:	گوشالہ میں گایوں کی دیکھ بھال	(اوشٹ یکی)
درو پدی:	سودیشنا رانی کی مشاطہ	(سرزہری)

ابھی کچھ عرصہ گزرا تھا کہ سودیشنا کا بھائی کیچک دروپدی پر فریفتہ ہو گیا۔ لاکھ دروپدی نے سمجھایا، کہ
سنائی۔ کہا کہ پانچ گندھرب میرے محافظ ہیں لیکن وہ باز نہ آیا۔ بھیم سین سے مشورہ کیا کہ اسی دن میں جہاں
ہے رات کے وقت کیچک کو دروپدی بلائے اور بھیم سین اسے قتل کر دے۔ یوں ہی کیا گیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔
بھائیوں نے صلاح کی کہ دروپدی کو زندہ جلا دینا چاہیے لیکن عین موقع پر بھیم سین کے روپ میں آیا اور سب کو
کو بچا لایا۔

جب کیچک کے مرنے کی خبر پھیلی تو دریودھن خوب خوش ہوا اور اسے خیال ہوا کہ اب راجہ برات
مانڈا ہے۔ حملہ کر دیا لیکن ارجن نے رتھ بانی کی اور وہ وہ جوہر دکھائے کہ دریودھن کا سارا لشکر نا کام پلٹا۔

اب تیرہ سال پورے ہوئے تو جدھشٹر وغیرہ نے اپنی اصلیت راجہ برات پر ظاہر کی۔ اس نے ارجن
لڑکی اوترا سے شادی کرنا چاہی۔ ارجن نے اپنے لڑکے ابھمنیو سے اس کا وواہ کر دیا۔ اب راجہ برات نے دریو
پاس ادھے راج کے سفارت بھیجی لیکن وہاں تو دریودھن بھرا بیٹھا تھا۔ ٹکا سا جواب دے دیا۔ راجہ دھرت راشٹر
دونوں جانب گھومتا پھرتا تھا لیکن صلح کی سبیل نہ بنتی تھی۔ انحراف سے راج گھر کے راجہ برات اور راجہ دریودھن
رہے تھے اور لڑائی کی ٹھن رہی تھی۔

اس سلسلے میں دریودھن اور ارجن دوارکا پہنچے۔ اس وقت مہاراج کرشن جی سو رہے تھے۔ ارجن

...سرہانے بیٹھ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ارجن سے پہلے پوچھا کہ کیوں آئے۔ اس نے کہا کہ میدانِ جنگ میں آپ کی ... کا حامی ہوں۔ پھر دریودھن سے سوال ہوا۔ اس نے کہا، آپ کی مدد کا میں بھی خواہاں ہوں، جواب ملا...... ارجن ... ساتھ رہوں گا اور دریودھن کے ساتھ میری فوج اور خزانہ لیکن میں ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

دریودھن کو سب نے سمجھایا لیکن وہ غصے کا بھوت تھا۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں فوج لے کر کُروکشیتر کے میدان میں ... ہوئے۔ ادھر پانڈو بھی پہنچے اور جنگ شروع ہوئی جس میں راون کو شکست اور پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی۔

... مشکل محاورے، الفاظ بھی خاں جی نے اپنی رہنمائی کے لیے لکھتے ہیں)

مولفہ: افق

اونٹ کی چوری نہوڑے نہوڑے ہوگئی:	چوری چھپے بڑی بات کا طے پانا (مہابھارت)
چنے کا چبانا اور شہنائی کا بجانا ممکن نہیں:	کام کا آسان نہ ہونا
وجائیں: بھنڈا کشان	پتا کا ٹیں: جھنڈا
چڑی مار کا ٹولا بھانت بھانت کا پنچھی بولا	اپنی اپنی ہانکنا
بھوت منڈنی	چوبا ہیاں ہونا: اور بھی زور آور ہونا
لکھوری	تنکیا لیا: پاس ایک پھنجی نہ رہنا
ایک ایک پولے میں کام تمام:	ایک ہی وار میں ترکی تمام
ٹوکنی:	اوکھیاں سنانا
ہوا و بڑھنا:	حوصلہ دینا
آنکھوں پر ٹھیکری رکھنا:	شرح بالائے طاق
چھچکارا:	گھوڑے ہانکنا
اشوبدیا:	اسپ دائی
اَستیتی:	ستائش
پرائے بغیچے پہ جھینگر چڑھ بیٹھنا:	ہرایا مال ہتھیانا
غرے ڈبے:	دھمکیاں
سنکلپ:	ارادہ، خیال
منکار:	ٹھوک بجا کر
دل او چھا کرنا:	دل گھٹانا
بردی مار مارنا:	بہت مارنا
اکشونی:	لاکھوں
چھتنارے:	خوب پتوں والا

اوہدے منڈے انج جوان ہوئے جیویں دودھ تے ملائی آوندی اے کھٹو کھٹ لٹھاں کھلو گئیاں۔

متھ: ماتھا

چھپن ٹکے بھنا دیئے: عنایات کیں

خوب رنگ لائی گلہری: مینڈک کو بھی زکام

سانجھے کی ہانڈی چوراہے پہ پھوٹی: مل کر کام کرنا بے عزتی کا باعث

سرتا بھرتا کرنا: حصے بخرے

کلیجے میں تھرتھری پڑ گئی: خوف

چراندے ہوئے: ناراض

بندیاں بندھ گئیں: فوجیں آراستہ ہوئیں

کہی بدی بات: پکی بات

وہ دونگڑا برسا وہ جھڑی لگی: بہت مینہ برسا

گندھرب: علم موسیقی

گھتا و ہو رہا ہے: گتھم گتھا

باہیں: سواری

دولت ڈب میں کرو: پیسہ گرہ میں باندھو

تلا نجلی: طلاق

بوان: ہوا

ایک بھنگا بھی نہ بچا: کچھ نہ بچا

سہل سا لٹکا: آسان کام

جوجن: چار کوس

سمرن: جپ تپ

ان تحریروں کا مقصد یہ ہے کہ خاں صاحب انتہائی سوچ بچار کے بعد، گہرے مطالعے سے استفادہ کر کے نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو اپنی اتہاس کا حصہ ہے۔ یہاں دیوتا زمین پر آ کر شادیاں کرتے ہیں۔ راکھشش انسانوں کے درپے ہیں۔ اُن کے دھرماتما لوگ گندھرب شادی کر کے اولاد کے مالک بن جاتے ہیں اور پھر اپنی ہوس مٹانے کے بعد اولاد کی پروا نہیں کرتے اور اپنے جپ تپ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس ہسٹری میں ایفائے وعدہ، استقامت اور حدود کی پہچان کم کم ہے۔ اسی لیے خاں صاحب ہندو کی طرف سے بہت Disillusion ہوئے لیکن اس سے بھی زیادہ کوفت انہیں پاکستان میں ساٹھ سال گزار کر ہوئی۔

... پتہ چلا کہ مسلمان بھی اونچ نیچ کا شکار ہیں۔ سید، پٹھان، جاٹ اور دیگر ذاتیں مٹھی بند مقبض ہیں اور کسی طرح ... مدغم ہونے کو تیار نہیں۔ جس اخوت، بھائی چارے، مساوات کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، اس کو بہت دھچکا لگا۔

یہ غالباً انسان کی تقدیر ہے کہ وہ آدرشوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں سکتا۔ اپنی نیت کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے۔ ... سرحدوں میں آر پار جانے پر مجبور ہے۔

ظاہر ہے پچھلے ساٹھ سال سے صورتحال ہولے ہولے بدل رہی ہے۔ بلی کا نرم و نازک بچہ آنکھیں کھول کر ... دیکھ رہا ہے۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ پر نظمیں ایک عرصہ سے اب طاق پر سجا کر علمی ادبی سطح پر خاص کر انگریزی سے خوشہ ... جاری تھی۔ "مدوجذر اسلام" کے حالی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور دوسرے حساس لوگوں نے ... کر اظہار خیال کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اصلی سمت کونسی ہے۔

لیکن ہولے ہولے ادیب کی نظروں سے نو تعمیر ملک کی منزل بھی دھندلا رہی تھی۔ کشمیر میں لہو کی ندیاں بہہ ... کوئی قابل ذکر کہانی لکھی نہیں جا سکی۔ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بڑے ادیب افسردہ ... ان کے دل میں شگاف نہ پڑتا۔ یہ مت کہیے کہ میں اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھ رہی ہوں بلکہ صرف یہ بات ... کوشش کر رہی ہوں کہ ہم لکھنے والوں نے اپنے لوگوں کے شعور کی تہذیب کرنے میں کیوں خاص مدد نہیں کی۔

ہمارے عہد کے ادیب ان پُر پیچ گلیوں کو تو سمجھتے ہیں جن میں محبوبہ کے نقش پا ملتے ہیں لیکن ہم نے اس ایک ... تمام محبتیں قربان کر دی تھیں۔ وطن پر نظمیں لکھنے والا دوم درجہ کا شاعر کہلاتا ہے۔ ماں، بھائی، دوست پر نظم لکھنے ... عظیم شاعر نہیں بن سکتا جتنا رومانی شاعر۔ ہم اختر شیرانی کی نظموں کو تو پھر یاد رکھتے ہیں حالی، حفیظ، اقبال اور ظفر علی ... بھولتے جا رہے ہیں۔

ہندو مسلک کو سمجھ کر اب ایک بار پھر خاں صاحب سوچ رہے تھے کہ اب جو افتاد مسلمانوں پر پڑی ہے، ہوسکتا ... میں ہمارا سب کچھ بہہ جائے اور وہ محبوبہ بھی نمک کی پتلی سمندر کی اتھاہ لگانے نکل جائے اور کہنے کو کچھ باقی نہ ... اسی لیے انہوں نے اپنی تحریر میں نئی سمت تلاش کی۔

پاکستان اور صرف پاکستان کی بقا کا خواب!

بیسویں صدی کی آخری دہائی مسلمانوں کے لیے بڑی اہم، فیصلہ کن اور تحیر آمیز ثابت ہوگی۔ وہ دیکھ رہے تھے ... دنیا میں صرف وہ خطے انتشار کا شکار ہیں جہاں ابھی اسلام میں دم خم ہے۔

افغانستان میں کیسی ہنڈیا پک رہی تھی۔

ایران اور عراق کس طاقت کے ہتھے چڑھ کر آپس میں گتھم گتھا ہونے والے تھے۔

کشمیر میں آزادی کی کیا کچھ قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

روس کی اسلامی ریاستوں پر کیا کچھ ہو گزرا؟

ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں وقتاً فوقتاً بظاہر ایک سیکولر سٹیٹ میں کیسے کیسے فسادات ... ہیں؟ بابری مسجد شہید کرنے کے لیے پانچ لاکھ ہندو مختلف مقامات سے کیوں اکٹھے ہوتے ہیں؟

سعودی عرب کی حفاظت کے بہانے تیسری عالمی جنگ کے لیے عین وہی دھرتی کیوں چنی جا رہی ہے
مسلمانوں کے لیے دنیا میں اہم ترین جگہ ہے۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے اور سوالات وقت سے بہت پہلے خاں صاحب کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے
لوگ ان سارے مقامات پر صورتحال کو اقتصادی مسئلہ سمجھتے، کچھ ذہین لوگوں کا خیال ہے کہ جب کوئی چیز ایجاد ہو جاتی ہے
پھر اُس کے استعمال کی وجہ بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہتھیاروں کی پروڈکشن اس قدر
بڑھ گئی ہے کہ اب ان کا اپنے انڈسٹریل ملکوں میں ذخیرہ اندوز رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی فلاحی مملکت
سے دوران ہتھیاروں کو رکھنا، استعمال کرنا اور نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔

ہتھیاروں کو ٹیسٹ کرنے کے لیے وہ چاہے سمندر اور ریگستانوں کا رخ کریں لیکن اپنے پروڈکٹ کے
استعمال کے لیے انہیں ہری بھری بستیاں درکار ہوں گی جہاں سیاہ اور براؤن جانداروں کو مکھیوں کی طرح مار کر ان کا ضمیر
ملامت نہ کرے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی مُلکتیں اپنے اندرونی انتشاروں کی وجہ سے غیر کے ہتھے چڑھ رہی ہیں
مسلمانوں کا مسلمان سے اس درجہ نفاق ہے کہ بھائی بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور مردہ گوشت کھانے سے
نہیں کرتے۔ ایسے میں جب اندرونی خلفشار نے ملکوں میں بدامنی پھیلا رکھی ہے، راجہ گدھ ہر طرف منڈلاتے نظر آتے
ہیں۔

ہم ادیب لوگ ہیں۔ چاندنی، گیت اور ساز سے محبت کرنا ہمارے خمیر میں ہے۔ ادیب لوگ دراصل
جذبات، حساس طبیعت اور اندر بہنے والی برسات کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں اور خاص طور پر برصغیر کا شاعر
سماج ہی کی بے انصافیوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس کے نزدیک آفاتِ ارضی وسماوی میں سب سے بڑا جان لیوا غم
جاناں ہے لیکن یہ خاں صاحب کا کشف کہیے، ان کی بصیرت جانیے، وہ پاکستان پر وارد ہونے والی بلاؤں سے ہی واقف
تھے بلکہ تمام عالم اسلام پر چھائے اندھیرے بادلوں کو بھانپ سکتے تھے۔ انہوں نے ذاتی مسلکوں کو طاق پر رکھ دیا تھا۔

سنا ہے کہ وہ انسان جسے ایک محبت بھی مل جائے زندگی کی لہروں پر اپنی ناؤ کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے
کرودھ، لوبھ اسے ڈگمگ ڈگمگ کرتے رہیں۔ ڈبونے کی کوشش کریں لیکن محبت کا چپو ڈوبنے نہیں دیتا۔ زندگی
پایاب ہو تو کشتی سے اتر کر وہ اسے دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ پانی اتھاہ ہو تو وہی بے لوث محبت سمت قائم رکھتی ہے اور لاکھ بھنور
آئیں کشتی کنارے لگ ہی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خاں صاحب کو پاکستان سے کچھ ایسی ہی بے لوث محبت ملی کہ ان کا
سفر نہ بے سمت رہا نہ ڈگمگایا۔ انہیں کسی اور راستے کی تلاش بھی نہ رہی۔

خاں صاحب کے پیتل کو چمکانے والی ایک ماں سردار بیگم کی شخصیت تھی۔ دوسرے وہ داؤ جی تھے جنہوں نے
خاں صاحب کی تربیت کی۔ تیسرے یہ وطن کی ان سے محبت تھی یا ان کی وطن سے رغبت جس کے باعث ان میں
کیمپ میں رفیوجی لوگوں کے درمیان کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ صبح سویرے اپنے ساتھ کھانے کی پوٹلی باندھ کر
چلتے والٹن پہنچتے اور پھر سارا دن مہاجروں کے مسائل سلجھاتے۔

ممتاز مفتی کے ہمراہ کام کرتے پھر پیدل گھر پہنچتے۔ شاید اسی پیدل سفر کے دوران ان پر کھلا ہو کہ انسان دراصل ...کے ہاتھوں روحانی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مہاجر بڑے شوق سے لاتعداد قربانیاں دے کر اس وطن پر نثار یہاں ...تھے لیکن یہاں پہنچ کر اسی دل نے دیگر خواہشات کو جنم دینا شروع کر دیا۔

اب سبھی کو چھوڑی ہوئی پراپرٹی درکار تھی۔ مال و دولت کی خواہش تھی۔ رتبہ، عزت اپنی تعریف سننے کی چاہ نے ...بھلا کر دیا تھا۔ ہم پر جو احسان قائداعظم نے کیا، وہ بھولنے لگا۔ انسان بھی عجب ہے کہ جو شخص آپ پر احسان کرتا ...دشمن ہو جاتا ہے۔ یہی روحانی گراوٹ دیکھ کر اشفاق احمد نے اپنا راستہ بدل لیا۔ ان کے افسانوں میں عجب قسم کی ...نے لگی اور وہ جب گورنمنٹ کالج میں ایم اے اردو کرنے کے لیے پہنچے تو وہ ''ایک محبت سو افسانے'' کے لکھاری ...تھے بلکہ ان کے اندر وہ دھندلی شاہراہ بھی کہیں اندر نظر آنے لگی تھی جس کے سنگ میل ابھی واضح نہ تھے۔

یہ دور پاکستان میں نو وارد لوگوں کی Insecurity کا تھا۔ مسلکوں اور آدرشوں کی خاطر قربانیاں دینا بڑا مشکل ...ہے۔ پاکستان ایک آدرشی ملک تھا۔ اس کے آدرش دنیاوی حصول سے وابستہ نہ تھے بلکہ روح کی افزائش کی تلاش میں ...تھے۔ رفتہ رفتہ مہاجر لوگ اپنے مسائل کا حل دنیاوی حصول میں تلاش کرنے کے لیے رنگ رنگ کے جرم کرنے لگے۔ ...ت منوانے کی خاطر ہر طرح کی شیخیاں ماری گئیں۔ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے نسل، رنگ، زبان نہ ...کن باتوں کا سہارا لیا گیا۔

گھروں کے تالے توڑے گئے۔ مال غنیمت ہاتھ آیا تو الاٹ منٹ کے چکروں میں لوگ ٹیڑھے ہو گئے۔ یہی ...دور تھا جب قائداعظم کا آدرش دھندلا گیا۔ ذاتی اقدار مار کھا گئیں اور لوگ مادہ پرست ہو کر بھانت بھانت کی ...لنے لگے۔

تمام مسلکوں سے گزر کر ''کام کام کام'' کی حدت سے بھی نکل کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کبھی کبھی کام بھی سمت ...نہیں رکھ سکتا۔ کام کی سمت اگر مثبت نہ ہو تو نفع کے بجائے نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔ انہوں نے خلق کے ساتھ ...میل بڑھانے کے لیے ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر یہ نتیجہ نکالا کہ پاکستان کے غریب عوام کا بالخصوص اور مسلم اُمہ کا ...عزتِ نفس کا ہے۔ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ انہیں کسی تقریب کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہوا۔ وہاں بااثر لوگوں کی ...میں پہلی بار خاں صاحب نے عزتِ نفس کا جھنڈا بلند کیا۔ انہوں نے وثوق سے کہا کہ ہماری ضرورت ہرگز ''روٹی ...مکان'' نہیں ہے۔ یہ چیزیں ہمیں ہندوستان میں بھی جیسی کیسی میسر تھیں لیکن اقلیت ہونے کے ناطے ہماری عزتِ ...نفس مجروح ہوتی تھی۔ اسی لیے یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔

خاں صاحب نے شعوری اور لاشعوری طور پر پاکستان کے لیے اس وقت جدوجہد شروع کی جب قائداعظم ...ے بغیر جیل میں قید ہونے کی بجائے انگریزوں کو آئین کی پابندی میں گھیر کر پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یہ جدوجہد شروع سے آخر تک خاں صاحب کا بنیادی مسلک رہی اور بالآخر ''عزتِ نفس'' کے مطالبے میں بدل ...گئی۔ یہی جھنڈا انہوں نے اپنے بیٹوں جیسے عمران خاں کو دے دیا۔ اسی جھنڈے کی سربلندی کے لیے آج بھی عمران سر توڑ ...کوشش کر رہا ہے اور آج 2007ء میں جب تمام جماعتیں اپنے مفاد کے لیے لڑ رہی ہیں اور بظاہر اسے خلق کی خدمت کا

نعرہ عطا کر رہی ہیں، عمران خاں اپنی نامزدگی کے کاغذات پھاڑ کر دعویٰ کر رہے ہیں۔

خاں صاحب کے کچھ کاغذات ایسے ملے ہیں جو ان کی خلق کی طرف مراجعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (خاں صاحب کی تحریر کے اقتباس)

1- 28000 روپے واپس کرنے والا تانگہ بان اور اس کی خبر اخبار میں لگانے کا قصہ۔

2- زندہ دل زندگی سے بھرپور سلطان میرپور ماسٹر کا بیٹا اور میر منٹو کا دوست اور بمبئی جا کر دادِ عیش دینے والا ناولٹ۔

3- ریاض پاڈا جو پہلے ہیجڑوں کے ساتھ ملا۔ پھر دوائیاں اور طلا بیچنے لگا۔ آخر میں تقریریں کر کے اسمبلی کا ممبر بن گیا۔

4- اصولوں کا ٹوٹنا اور قدروں کا فقدان اس کی وجہ۔ ٹیکنالوجی اور مذہب۔

5- کلچر کیا ہے اور اس کو کس طرح سے دوسرے کلچر سے الگ مانا جاتا ہے۔

6- سلیم بونگا ایٹم کے بارے میں تھیوری پیش کرتا ہے۔

7- Olga کے نام Varek کے خطوط۔ اسی طرح Malina کے نام کافکا کے خطوط!

8- ملا صبغت اللہ کی لڑکی اور اس کی کالج کی زندگی۔ اپنی سہیلی شازیہ کے ساتھ دوستی۔ اس کے کزن سے معاشقہ۔ کزن کے والدین کو یہ خبر ہونے پر کہ وہ ایک مُلّا کی لڑکی ہے اس کا مشتعل ہو کر باپ کو خفیہ طور پر قتل کرنا۔ شازیہ سلیم بونگا کی کزن ہے۔

9- مُلّا لوگوں سے سلیم بونگے کا انٹرویو۔ کمال اتاترک کی تعریف و توصیف کہ اس نے مُلّاؤں کا قلع قمع کیا۔ مُلّا اور سیاسی مُلّا میں فرق (کیا سارے مُلّا مل کر اسلام کا ضابطہ حیات چھپوا کر دے سکتے ہیں۔)

10- سیکولر اور مذہبی میں فرق۔ سیکولر قوم اور سیکولر حکومت میں فرق۔ قوم ہمیشہ Tolerant ہوگی لیکن حکومت نہیں ہوگی۔

11- پٹرول پمپ کے پاس خوشی محمد کے گیراج میں شیطان سے ملاقات۔

12- دولتانے کی صوباں جس سے برکی نے شادی کی اور وہ دیہاتی لڑکی بلجیم کے ایلومینیم سٹور کی مالک بنی۔

13- بابا احسن کا قصہ جو شرافت نوشاہی صاحب نے سنایا۔

14- ایک ڈرامہ جو سلیم بونگے نے T.V. کے لیے لکھا اور جو reject ہو گیا۔

جالندھر کا ذکر: سمندر اور دریا کا بیٹا۔ منہ جوالا مکھی پر ہے اور پاؤں ملتان میں دفن ہیں۔

بھومی چند: *Founder of Kangra*

جنم پتری: Vansavali

(نسب نامہ) طاقتور راجپوتانہ کے خاندان سے پرانے راجپوت ہیں اور کٹوچ راجپوت سب سے پرانے ہیں۔

سکندر بیاس کنارے رکا تو Ptolemy نے جالندھر کے ملک کا ذکر کیا لیکن سنسکرت کے ادب میں اس کا سراغ
البتہ تری گارتا کا ذکر موجود ہے اور راجہ سسار من کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے کانگڑے کا قلعہ تعمیر کیا۔

ہیون تسانگ نے جس جالندھر کا ذکر کیا ہے اور جو اس کا علاقہ بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے چمبہ کی ریاست
سوکیت اور ساتا دردی ریاستیں جالندھر کی ریاست میں شامل ہیں۔

سورکرافٹ جب 1820ء میں نداؤں کے علاقے میں آیا تو اس نے لکھا کہ کانگڑے کی ریاست میں تین

ہیں۔

کٹوچ چھنگار

کانگڑہ کان کی شکل سا

نگرکوٹ یا کوٹ کانگڑہ بھی دارالخلافہ کے نام ہیں۔

نگرکوٹ میں درگاہ کا مندر۔ یہ مورتی مرد کی لگتی ہے۔ سب اسے ماتا کہتے ہیں۔ مندر کی چھت اور فرش چاندی
کا بنا ہے۔ اسے ابوالفضل نے مہامایا لکھا ہے جو یہاں کی رانی تھی۔ لیکن دنیا میں بدی دیکھ کر آتم ہتھیا کر لی۔ کچھ
یا مہادیو کی شکتی بھی سمجھتے ہیں۔

جوالا مکھی: بالا گھاٹ پہاڑ کے ٹھنڈے پانیوں میں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ چندر منی کٹوچ آبائی راجہ
کانگڑے کے قلعے کا نام فرشتہ بھیم کا قلعہ لکھتا ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ قلعہ غالباً راجہ بھیم چندر نے
بنایا۔

کانگڑہ نہ صرف جالندھر کا حصہ رہا ہے بلکہ یہ علاقہ کشمیر کے راجہ شنکرورما نے بھی ختم کیا تھا۔ راجہ شنکرورما نو لاکھ
سوار تین سو ہاتھی لے کر گجرات فتح کرنے لگا۔ تری گارتا کا راجہ پرتھوی چندر پہلے ہی اپنا بیٹا یرغمال کے طور پر راجہ شنکرورما
کو دے چکا تھا لیکن جب اس نے سمندری فوج بڑھتے دیکھی تو فیصلہ نہ کر پایا اور قلعے سے اٹھ بھاگا۔

(ایسے کاغذات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خاں صاحب پر ان کے سیاسی مسلک کا گہرا اثر تھا اور اسی نے
ذاتی مسلک کو ڈھانپ لیا تھا۔)

اشفاق احمد کی بطور براڈ کاسٹر قومی خدمات

محمد جاوید پاشا

23 مارچ کی قیام پاکستان کے حوالے سے بہت اہمیت ہے۔ یہ قرارداد لاہور کا اہم دن ہے، وہ قرارداد جو قیام
پاکستان کی دستاویزی شکل میں وجود میں آنے کا باعث بنی جس نے مسلمانوں کو باقاعدہ ایک قوم کی حیثیت سے ایک ملک
حاصل کرنے کی بنیاد فراہم کی۔ قرارداد لاہور جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منظور کی گئی، میں واضح طور پر کہا گیا کہ کوئی
منصوبہ اس وقت تک قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا تاوقتیکہ وہ ایسے اصولوں پر وضع نہ کیا گیا ہو
یعنی جغرافیائی طور پر مستقل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوط میں کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

ہے۔ ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں اور انہیں کلی اختیارات حاصل ہوں۔ یہ صدیوں پرانا خواب تھا جس کی تعمیر کے لیے محمد علی جناح کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے اس کی تشکیل کے لیے منتخب کیا تھا۔ قائداعظم کی دور اندیش نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ برصغیر سے انگریزوں کے نکل جانے کے بعد مسلمان محکوم ہو جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ترک کر کے مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد شروع کر دی۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں ایک فیصلہ کن موڑ 23 مارچ 1940ء کا منٹو پارک کا جلسہ ثابت ہوا جس نے واضح طور پر پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کی مدد اور قربانی سے 14 اگست 1947ء کو مملکت خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی اس کی تعمیر اور ترقی کے لیے ملک کے بہت سے سپوتوں نے کام کیا اور اس نظریے کی حفاظت کے لیے روپے پیسے، محنت، علم اور قلم سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔ ابلاغ عامہ نے خصوصی طور پر نظریہ پاکستان اور دوقومی نظریے کی وکالت اور فروغ کا ذمہ تادم تحریر اٹھائے رکھا ہے۔ اخبارات اور دیگر نشریاتی اداروں نے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ بعض شخصیات نے اس مہم میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا نام اشفاق احمد کا ہے جو اپنی ذات میں مکمل نشریاتی ادارہ تھے۔ وہ ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، صداکار اور دانشور کی حیثیت سے نصف صدی تک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ادبی دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی تحریروں کا نمایاں موضوع اخلاقیات، وطن سے محبت اور نیکی کا پرچار رہا۔ تاہم اس کے لیے جو اسلوب اور ذرائع اور طرز تحریر اپنایا وہ نہ صرف نیا، انوکھا، دلچسپ تھا بلکہ لوگوں کے لیے بہت پرکشش بھی تھا۔ اگر کہا جائے کہ انہوں نے وعظ کو جدید شکل دی تو غلط نہ ہوگا۔ بالخصوص آخری عمر میں ان کا پروگرام ''زاویہ'' ایک جدید سکالر کی دانشورانہ گفتگو کا حسین گلدستہ تھا۔ تاہم اشفاق احمد کی بطور براڈ کاسٹر قومی خدمات سب سے زیادہ قابل تحسین ہیں۔ ریڈیو سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ریڈیو کے لیے لکھنے کا جو فن اشفاق احمد کے پاس تھا، وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ ریڈیو ڈرامہ اور فیچر پروگرام کے وہ ماہر مانے جاتے ہیں۔ ایک ''تلقین شاہ'' کی مثال دینا ہی کافی ہے۔ چالیس سال کے طویل عرصہ پر محیط یہ فیچر پروگرام ریڈیو پاکستان لاہور سے ہر ہفتے باقاعدگی سے چلتا رہا اور ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس پروگرام کو وہ نہ صرف لکھتے تھے بلکہ اس کے اصل ہیرو اور روح رواں ''تلقین شاہ'' کا کردار بھی خود ادا کرتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اسے خود پروڈیوس بھی کرتے رہے۔ ''تلقین شاہ'' نے بطور پاکستان کی آواز جو خدمات انجام دی ہیں، شاید ہی کسی اور پروگرام کے حصے میں آئی ہوں۔ یہ اشفاق احمد کی قومی خدمات کی معراج تھی۔ گو انہوں نے پاکستان کے حوالے سے لاتعداد کھیل لکھے۔ تاہم تلقین شاہ ایک شاہکار ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ''تلقین شاہ'' کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی سیاست، پالیسی، معیشت، معاشرتی ترقی، ادب، تاریخ، نظریات، اخلاقیات، عالمی مسائل، مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب، قوموں کے عروج و زوال، عالمی سیاست و معیشت، غربت، علاقائی کشمکش، پاک بھارت تعلقات، کشمیر، فلسطین، مذہب، سائنسی ترقی...... الغرض کوئی ایسا شعبہ، ایشو، شخصیات اور علاقائی، قومی اور عالمی مسئلہ نہ تھا جو اس میں ایک خوبصورت اور پرکشش ڈرامائی انداز میں discuss نہ ہوتا۔ ''تلقین شاہ'' نے پاکستان کے نظریات کو نشریاتی دفاع سے مضبوط

ہر دور میں، ہر حکومت میں، ہر حالات میں پاکستان کے داخلی علاقائی اور عالمی خلفشار کو نہایت خوبصورت طریقے
دنیا کے سامنے رکھا اور اس کی وضاحت اور وکالت کی۔ اشفاق صاحب نے تلقین شاہ کے کردار میں تمام تر
کوتاہیوں اور منفی رویوں کو اپنی ذات پر لے لیا اور اس کے ذریعے اصلاح کی راہیں بھی نکالیں۔ بالخصوص کشمیر کے
اشفاق صاحب نے ''تلقین شاہ'' میں تسلسل سے پیش کیا اور اس مسئلے کو اپنے پروگرام کے حوالے سے ہمیشہ زندہ
میں کشمیر کو ایک گلدان کے سمبل کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایک گلدان جو اس پڑوسی کی ملکیت ہے جس کو اس نے
میں زبردستی سجا رکھا ہے اور واپسی کے لیے ہر مرتبہ نت نئے حیلے بہانوں سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ پڑوسی ہاشمی
اور کشمیر کو گلدان کی شکل میں پیش کیا۔ تلقین شاہ کے معاون کرداروں میں ہدایت اللہ، زہرہ، سلیمان، رقیہ، جن
مستقل کردار تھے۔ ''تلقین شاہ'' پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشریح، حمایت اور وکالت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔
پاک بھارت جنگ 1965ء اور 1971ء میں یہ پروگرام حکومت پاکستان اور مسلمانوں کی نمائندہ آواز رہا ہے۔
فوجی جوان سرحدوں کی حفاظت میں جان کی بازی لگا رہے تھے تو تلقین شاہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت
1971ء کی جنگ میں ''تلقین شاہ'' از خود سرحدوں پر پہنچ گیا اور اس کے عنوان اور کرداروں نے ایک نیا روپ
اشفاق احمد داد و لوہار بن گئے اور پروگرام یوں شروع ہوتا ''داد و لوہار ولد شہ کا لوہار، سکنہ کوٹری لوہاراں حال مقیم پل
آپ سے مخاطب ہے۔''

''تلقین شاہ'' پاکستان بلکہ برصغیر میں سب سے طویل عرصہ تک چلنے والا ریڈیو پروگرام ہے۔ اشفاق احمد نے
فنکاری سے ادا کیا، لکھا اور پیش کیا۔ ان کی ذات براڈ کاسٹنگ کے شعبہ کی ایک جامع اور ماہر ترین مثال تھی کہ
نشریات کے ہر شعبے کو سمجھتی تھی اور اس پر مہارت رکھتی تھی۔ اشفاق صاحب نے ''تلقین شاہ'' کے ذریعے جو قومی
ایک طویل عرصہ تک کی ہے اس کی مثال شاید ہی کوئی دوسرا شخص دے سکے گا۔ ریڈیو یوں بھی از خود ملکی خدمات میں
حیثیت رکھتا ہے اور اس شعبے میں اشفاق صاحب کی حیثیت ایک رہنما کی سی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ''تلقین
پاکستان کے مختلف ایشوز پر اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا رہا ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے آجانے سے اشفاق احمد وہاں بھی بانی لکھاری کے طور پر آئے اور اپنی وفات تک
رہے۔ یہاں بھی ان کے ڈراموں کے موضوعات میں ملک سے محبت، اخلاقیات اور عالمگیر سچائی فرنٹ پر نظر آتی
پاکستان، قیام پاکستان، پیدائش قائداعظم اور دیگر اہم قومی دنوں، امور و واقعات اور معاملات پر اشفاق صاحب
مؤثر طریقے سے حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور ڈرامے پیش کیے۔ ان میں ان کا ''برگ آرزو'' اور ''ننگے
طویل دورانیے کے کھیل شاہکار حیثیت کے حامل ہوں گے۔ ''ننگے پاؤں'' میں انہوں نے دو بڑی طاقتوں امریکہ
سوویت یونین کی عالمی بالادستی اور اس کے نتیجے میں چھوٹے ملکوں میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان طاقتوں پر انحصار
دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا تھا۔ اسی طرح ''برگِ آرزو'' پاکستان کے حوالے سے ایک جذباتی کھیل تھا
سے محبت کے جذبات پیدا کرنے میں کمال مہارت سے لکھا گیا تھا۔

اشفاق صاحب کی توجہ انفرادی اور کردار سازی پر بھی گہری تھی، معاشرتی برائیوں کو اس انوکھے انداز سے پیش

کرتے کہ دیکھنے والا یوں تو ایک دلچسپ ڈرامہ دیکھ رہا ہوتا تھا مگر در پردہ وہ اپنے اندر از خود تبدیلی محسوس کرتا اور غیر
طور پر مثبت رویوں کی طرف مائل ہونا شروع ہوتا جس کی ایک مثال ''فہمیدہ کی کہانی۔ استانی راحت کی زبانی'' ہے
کھیل میں بیجا نمود و نمائش، شو بازی اور دکھاوے کو جس پُر اثر انداز میں دکھایا گیا ہے، اس کی مثال ملنا محال ہے۔

اشفاق صاحب کی زندگی کے آخری پانچ، سات سالوں نے ایک نئے اشفاق احمد کو دریافت کیا۔ یہ ایک
اشفاق احمد تھے۔ اپنے ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' میں وہ اپنی ذہانت، بصیرت اور دانشوری کی بہت اونچی منزل پر نظر آتے
ہیں۔ انسانی معاملات، انسان سے انسان کا تعلق، رویئے اور زندگی کے دیگر اہم پہلو پر ان کی سیر حاصل، پُر اثر اور دلچسپ
گفتگو ہر عمر کے لوگوں کے لیے مشعل راہ رہی ہے۔ قومی اور ذاتی اہمیت کے موضوعات کو ذاتی تجربات اور واقعات
جس پُر کشش طریقے سے سجاتے تھے، اس سے ایک کل دلگزار کھل اٹھتا تھا۔

اشفاق احمد کو ہم ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے تو خوب جانتے ہیں مگر ان کی تحریروں کے
موضوعات کو اگر دیکھیں تو اس میں زندگی کے دیگر مسائل و معاملات کے علاوہ ایک قومی رنگ بھی نظر آتا ہے جو ان کے
موضوعات میں نمایاں اور چھایا ہوا ہے۔ یوں اگر ہم ایسی شخصیات کا ذکر کریں جنہوں نے پاکستان کی بھرپور خدمت کی
تو ان میں اشفاق احمد نمایاں شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں جنہوں نے بطور لکھاری اور براڈ کاسٹر قوم کی غیر معمولی خدمت
کی ہے۔ یوم پاکستان کے موقع پر ہم ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے کردار سازی
کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

''تلقین شاہ'' کا پروگرام ریڈیو پاکستان کا منفرد پروگرام رہا۔ گنیز بک آف انفارمیشن میں اسے دنیا میں نشر
ہونے والے دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ یہ پروگرام 1965ء میں شروع ہوا۔ پھر جب 1989ء میں بے نظیر
آئیں تو دو سال کے لیے تلقین شاہ بند کر دیا تھا۔ شاید اس کی تحریک ہندوستان دوستی یا پھر کوئی اور وجہ؟ ان ہی دو سالوں کے
لیے خاں صاحب کی سروس اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر بھی معطل کر دی گئی۔ اس وقت خاں صاحب کو کل آٹھ سو روپے
ماہوار ملتے تھے لیکن یہ ماہانہ رقم ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی تھی۔

جب نواز شریف تشریف لائے اور انہیں اطلاع ملی تو انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا اور خاں صاحب کا
پروگرام ''تلقین شاہ'' بحال کر دیا۔ پھر نواز شریف نے اردو بورڈ میں بائیسویں گریڈ میں تقرری کر دی اور اس کے ساتھ
ساتھ ان کا Designation بھی ڈائریکٹر جنرل کا کر دیا۔ ان دنوں سارے صاحب لوگ اپنے رتبے کو اونچا کرنے کے
سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل بننے، کہلوانے میں سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ یقین جانیے انہوں نے اپنے نام کی تختی کے
ساتھ کبھی اپنے رتبے کا اضافہ نہ کیا بلکہ گھر والوں پر بھی اس رتبے کا رعب ڈالنے کے لیے کبھی گریڈ کا انکشاف تک نہ کیا۔

تلقین شاہ ان کے آخری ایام تک جاری رہا۔ کام کے سلسلے میں جو Passion یا جذبہ کہہ لیں، وہ تلقین شاہ کے
لیے رکھتے تھے، اس کا مقابلہ کوئی اور پروگرام نہیں کر سکتا۔ تلقین شاہ پورے 39 سال چلتا رہا۔ اب تو تلقین شاہ پروگرام

بھی چھپ چکی ہیں اور اس کے ٹیپ بازار اور میوزک کی دکانوں پر دستیاب ہیں۔ گو ان ٹیپوں کی مارکیٹ کو لیے سنگ میل پبلشرز سے کوئی اجازت نہیں لی گئی لیکن اس ضمن میں سرقہ اور چوری غالباً اب پوری دنیا کی بدلتی شامل ہے۔ اس لیے اس کے متعلق میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔

تلقین شاہ کی بنیادی تھیم ہمیشہ ایک رہی۔ اس میں خاں صاحب کی ایک ہی کوشش رہی کہ بھارت کو اس بات کا دلایا جائے کہ سکیورٹی کونسل میں کشمیر کے لیے جس رائے عامہ پر بھارت نے اتفاق کیا تھا، اس وعدے کو ایفا اس سے پہلے بھی ایک وعدہ کیا جا چکا تھا کہ جن ریاستوں میں مسلمانوں اکثریت ہوگی وہ پاکستان سے الحاق گی اور جن ریاستوں میں ہندو اکثریت ہوگی وہ پاکستان کا حصہ بنیں گے لیکن حیدر آباد دکن کی ریاست کا جو حال نے کیا، آپ کو معلوم ہی ہے۔

اسی فارمولے کے تحت پاکستان وجود میں آیا۔ ان وعدوں کو یاد دلانے کے لیے خاں صاحب نے 39 برس کیے۔ بنیادی طور پر تو یہ جذبہ پاکستان سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے بہت پہلے اس کے لیے جہد کی تھی۔ جگہ جگہ تقریریں اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے لگائے تھے۔

اس پروگرام میں انہوں نے گلدان کو کشمیر کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ ہمسائے سے ہر وقت اس گلدان کا اور جس طرح بھارت ''اکھنڈ بھارت'' کے خواب میں کشمیر کے سب وعدے بھول گیا، ایسے ہی خاں صاحب کا یہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

اس پروگرام ایک ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ خاں صاحب نے اس پروگرام میں طنز کو ہتھیار بنایا۔ اپنے آپ کو کے روپ میں پیش کیا جو ایک منفی کردار تھا اور نذیر حسینی کو تمام تر مثبت اقدار کا حامل بنا کر پیش کیا۔ نذیر حسینی کو تلقین اور بے دام غلام رہا۔ آقا اور مالک کے علاوہ اس کے منہ سے کبھی کوئی اور لفظ تخاطب کا نہ نکلا لیکن اس نے تلقین کی اقدار کو بڑی معصومیت اور سادگی کے ساتھ ماننے سے ہمیشہ انکار کیا۔

یہ دو کردار اور تھیم ہمیشہ قائم رہے۔ باقی کردار آتے جاتے رہے لیکن ان کی ساخت اور تراش خراش بھی خاں کے آورش سے جڑی رہی۔ ان میں ایک کردار (شمیم) ہمسائی کا تھا، جو تلقین شاہ سے لڑنے جھگڑنے اور اس کی دوسری خاصیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ شمیم فاطمہ صاحبہ مشہور و معروف مصنف فضل الرحمٰن کی بیگم تھیں جنھوں نے ''ادھ کھایا امرود'' جیسی معرکے کی کتاب لکھی۔ گو نقادوں نے ان افسانوں پر زیادہ توجہ نہیں دی طور پر ان افسانوں کو اردو کے سنجیدہ قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا۔

شمیم بیگم اچھی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ پروگرام کے دوران خاں صاحب کی عادت بات کو جھڑکیوں سے نوازا کرتے لیکن جونہی پروگرام ختم ہو جاتا۔ وہ ریشم کی طرح نرم ہو جاتے۔ چائے کا دور شمیم بیگم سے فرمائش کرتے فلاں چیز پکا کر لاؤ۔ شمیم یہ فرمائش پوری کرتی بلکہ فرمائشوں سے علیحدہ بھی بہت کچھ پکا لاتی۔

شمیم کے علاوہ بیگم خورشید حفیظ نے تلقین شاہ میں ایک مدت رقیہ کا رول ادا کیا۔ بیگم خورشید حفیظ مشہور زمانہ

پاکستانی حفیظ جالندھری کی بیگم تھیں جنہوں نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا تھا۔ خورشید ہماری ہمسائی بھی رہی تھیں۔
اُن سے بڑے تعلقات رہے۔ حتیٰ کہ جب ہم آخری بار عمرہ کرنے لگے تو ان کی بیٹی رضا کے ہی پاس جدہ میں ٹھہرے۔
مشہور و معروف شاعر مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدہ بھی آخری سالوں میں تلقین شاہ کی زینت بنی رہیں۔
صاحب کے جانے کے بعد میری بہت دلجوئی کی۔ اپنے ہاتھ سے پھول بوٹے کاڑھ کر میرے لیے اوڑھنے والی چا
لے کر آتی۔

ریاض محمود بہت جلد تلقین شاہ کا حصہ بن گئے۔ ان کا کردار صاحبزادہ صاحب کا تھا، جو تحیّر کا سمبل تھ
شاہ کی خوشامد اور طنز کے درمیان اصلی سچ کو تلاش کرنے میں لگے رہتے۔

آخر آخر میں اکرم زبیر بھی اس پروگرام کا حصہ بن گئے۔ اکرم زبیر سیاحت کے محکمہ میں اعلیٰ افسر
ہیں۔ لاہور میں کچھ بسیں Tourism کو پروموٹ (promote) کرنے کے لیے چلائی جاتیں۔ ان بسوں
اور بیرونی ممالک سے آنے والے سیاحت کے شائقین کو لاہور کی وہ تمام عمارتیں جو قابل ذکر ہیں اور جو امتداد
سے ماضی کی آب و تاب قائم نہیں رکھ سکیں، سیاحوں کی دلچسپی کا موجب بنیں۔ ان بسوں کا سارا چارج اکرم
ہے۔ وہی ان میں فرفر بولنے والے گائیڈ مقرر کرتے ہیں۔ راستے میں Refreshment کا انتظام ان ہی کی
ہے۔ Tourism کے ڈائریکٹر لاشاری صاحب اسلام آباد رخصت ہو گئے تو اکرم زبیر کی ذمہ داریاں اور بھی
خاں صاحب کے جانے کے بعد اکرم زبیر اور ان کی بیگم انجم ابھی تک میری Rehabilitation میں لگے ہو
انجم جب کوئی مزے دار نعمت پکاتی ہیں تو مجھے ضرور بھجواتی یا لے کر آتی ہیں۔

لمبے پروگراموں میں وقت کی تبدیلی کے باعث کاسٹ میں ردوبدل ناگزیر ہے۔ کچھ دیر کے لیے
بانو قدسیہ نے بھی اس میں شمولیت کی۔ انیق بیٹا اس میں نفسیاتی مسائل، ان کا الجھاؤ اور سلجھاؤ سمجھانے کی کوشش کر
ایک پروفیسر کا رول دیا گیا تھا، لیکن بہت جلد خاں صاحب سمجھ گئے کہ یہ ہمارے ڈھب کا کام نہیں۔

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری وجہ سے خاں صاحب کی ریکارڈنگ کے دوران جو بے تکلفی اور جھڑ کا
خاں صاحب اس سے اجتناب کرنے لگے تھے اور باقی کاسٹ خاص طور پر نذیر حسینی بندھ کر رہ گئے تھے۔ خاں صاحب
کچھ دیر کے بعد ہم سے رخصت چاہی اور ہم دونوں بڑے ادب سے تلقین شاہ کی سرحد سے نکل گئے۔

''تلقین شاہ'' کی ریکارڈنگ کے متعلق تھوڑا سا اور بتاتی چلوں۔

اولاً یہ پروگرام ریڈیو پاکستان میں ریکارڈ کیا جاتا لیکن اس میں کچھ اڑچنیں تھیں۔ کبھی سٹوڈیو وقت
ملتا۔ کبھی مل جاتا تو ریکارڈنگ انجینئر مصروف ملتے۔ کبھی کبھی کاسٹ انتظار کر کے تھک جاتی یا انہیں کچھ اور مصر
کے پیشِ نظر جانا پڑتا۔ خاں صاحب کے لیے اتنی گڑبڑ قابل قبول نہ تھی۔ اسی لیے انہیں حل تلاش کرنا پڑا۔ دا
سرائے میں سٹوڈیو بنا لیا گیا۔

داستان سرائے میں ریکارڈنگ کا پھر ایک مسئلہ پڑ گیا۔ انجینئر صاحب ریڈیو پاکستان ہی سے آتے تھے
کی مصروفیات کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ انیس ان دنوں ٹیپ ریکارڈوں میں بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ''نورالکو''

صاف تھا کہ بگڑی ہوئی مشین فوراً درست کر لیتے۔ خاں صاحب نے ریکارڈنگ کا چارج انیس کو دے دیا۔
جس طرح انیق بیٹا اور میں خاں صاحب کے ساتھ چل نہ سکے شاید انیس بھی کچھ دیر بعد پروگرام سے علیحدہ

عجب اتفاق ہے کہ بے حد خوش اسلوبی اور تواتر سے انیس ریکارڈنگ کرتے رہے۔ کئی بار وہ خاں صاحب کو
ریکارڈنگ دوبارہ کرتے لیکن خاں صاحب کی عادت تھی وہ صاحب علم و ہنر کے آگے جھک جاتے تھے۔
میں اس وقت دقت پیش آئی جب یونیورسٹی میں انیس بیٹا ایم بی اے کر رہا تھا۔ گھر پر ان کے دوست شاہد
پڑھاتے تھے۔

امتحان سر پر تھا۔ یونیورسٹی میں ایم بی اے کا کورس نیا نیا تھا لیکن انیس خاں میں کام کام اور پھر کام کی گھٹی،
کے Genes سے ملی تھی۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے بغیر تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کراتا رہا لیکن جب اس کی
میں ہوگئی تو پھر وہ بھی مجبور ہو گیا لیکن جانے سے پہلے ایک خوشگوار معجزہ ہو گیا۔
اثیر احمد خاں کو قدرتی طور پر کرکٹ، ہوائی جہاز اور مشین سے لگاؤ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کرکٹ اور پائلٹ
کھٹائی میں پڑ گیا لیکن ریکارڈنگ کا کام سنبھالتے اسے دیر نہ لگی۔ انیس کے جاتے ہی اس نے تلقین شاہ کی
پوری ذمہ داری سے سنبھال لیا لیکن جب وہ این ڈی ایف سی میں ملازم ہو گئے، انہیں بینک میں دیر سویر ہونے
بدل تلاش کیا گیا۔ رفیق محمد کو ریکارڈنگ کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ چیک وغیرہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن ریکارڈنگ
مشاق ہو گیا۔

اسی دوران تلقین شاہ کے سارے اکاؤنٹ میری تحویل میں آ گئے۔ کاسٹ کے چیک، ٹیکس ایٹ Source کی
حساب کتاب میرے ذمے تھے۔ شکر ہے مجھے عزیز الرحمٰن جیسے ٹیکس وکیل مل گئے۔ وہ خود ہی پیش ہوتے اور رسید
دے جاتے۔ اس طرح تلقین شاہ کے پروگرام بغیر کسی التوا کے چلتے رہے۔
تلقین شاہ سے گزر کر اب انہوں نے کئی اور ریڈیائی اور ٹیلی ویژن پروگرام لکھے لیکن سب میں پاکستان اور
ذاتی محبت سرایت کر گئی۔ جب وہ کفالت کے سلسلے میں روزی کمانے کے لیے سکرپٹ لکھتے تو بھی ان کی یہ
Inner Co کسی نہ کسی سطر میں تفہیم میں ظاہر ہو جاتی۔ اس کی ایک بڑی اچھی مثال پیش کرتی ہوں۔
جب اثیر احمد خاں نے اپنی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی "بوناسیرا" کے نام سے کھولی تو اس نے "روز پیٹل" کے
پروگرام تشکیل دیا۔ یہ پروگرام عورتوں کے استعمال کے لیے پیڈوں کی مارکیٹنگ تھی۔ اشفاق صاحب شاید اپنے
پروگرام نہ لکھتے نہ اثیر بیٹا ہی ایسا پروگرام پیش کرتا لیکن باپ نے بیٹے کی خاطر اور بیٹے نے حلال روزی کے حصول
پروگرام بھی تیار کیے۔ اس پروگرام کا نام "مانو منگولیا" تھا۔ یہ سٹ کام تھا اور اس کا کلوزنگ انتھم کچھ یوں تھا۔
سٹ کام کے لفظ سے بھی میڈیا آشنا نہ تھا۔

مانو منگولیا...... مانو منگولیا

سٹ کام سٹ کام

کالی قوم گوری قوم

ڈاٹ قوم ڈاٹ قوم

اسی طوران کے تمام پروگرام تھے۔ اس میں بھی کالی قوم گوری قوم کی طرف اشارہ اس بات کو ظاہر کرتا
سوچنے والے انسان تھے۔

ہر ادیب میں ایک بات بہرکیف سانجھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات تخیلات قاری کے share کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح فطرت انسان کے ساتھ اپنے اشجار، پھول، جھرنوں کی کن من، ہواؤں کا صحراؤں کی وسعت، پہاڑوں کی سربفلک اونچائیاں اور موسموں کی تبدیلیوں کو بھی شامل رکھتی ہے۔ آرٹسٹ اپنے سفر میں قاری کو ہم شریک مسافر بنا کر شامل کرتا ہے تو قاری اندر کے کمپارٹمنٹ کی کھڑکیاں کھول کر وہ مناظر دیکھتا ہے جو دورانِ سفر ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ کبھی بھیانک تعفن بھرے، تکلیف سے زیادہ عریانی کے منظر آنے پر کچھ کھڑکیاں بند کردوں۔ کچھ ادیب اس قدر سچ بولنے کے عادی ہوتے ہیں رات کے مناظر اور غسل خانوں کے دروازے کھول کر جنسی بھوک اور جسمانی غلاظت کو بھی قاری کے ساتھ share پر بضد رہتے ہیں۔ یہ مناظر لاکھ سچ سہی لیکن کسی کسی نفیس طبع حیادار قاری کے لیے بیزاری اور تعفن کا باعث بن جاتے خاں صاحب کی یہی کوشش رہی کہ اسی قدر سچ بولیں جس قدر قاری ہضم کرسکے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نے کبھی قاری کے کندھے پر بوجھ نہیں ڈالا۔

ٹیلی ویژن کے لیے جب انہوں نے ''اور ڈرامے'' تحریر کیے تو اس میں صابرہ آپا کو سیکو جی اور جمیل کو بنایا۔ یہ ہمارے بگڑے معاشرے کی قدروں کو بے نقاب کیا کرتے۔ اسی میں ریاض محمود نے بابو علم دین کا رول دو لتے بابو علم دین کی بہن بن کر سامنے آئیں۔ یہ دونوں پھر خاں صاحب کے سیاسی مسلک کی جھلکیاں دکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''تاہلی تھلے'' ''ہم آ گئے'' ''ڈھول کا پول'' اور ایسے ہی کئی پروگرام لکھے جن کے خاں صاحب کی یہی سوچ تھی۔ خود بتایئے ایسے معمار پاکستان کی خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہیں۔

ریڈیو سکرپٹ

مہندے دے گھر (پنجابی)

مسکن (اردو)

معجون مرکب (اردو)

....

....

مشورہ (اردو)

جج (پنجابی)

سیریل (دیہاتی پروگرام)

سیریل (عورتوں کا پروگرام)

1

2

3

(بادلوں سے پرے) افسانہ

دیہاتی پروگرام

پھلیاں (پنجابی)	دیہاتی پروگرام
ٹاہلی دے تھلے (پنجابی)	سیریل۔دیہاتی پروگرام
کٹھ پتلی (اردو ڈرامہ)	جنرل پروگرام
امی (اردو ڈرامہ)	جنرل پروگرام
بناہیں (اردو ڈرامہ)	جنرل پروگرام

فیچرز

مرد راہ دان	9.15 رات-25 دسمبر 1956ء
ٹاہلی دے تھلے	دیہاتی پروگرام-27 دسمبر 1956ء
حیرت کدہ	بطور ریڈیو Voice
آج اور آج کا دن	" " "
دست سہنا	" " "
ضابطہ کارروائی	" " "

● ● ● ● ● ● ●

121- سی ماڈل ٹاؤن

''ذاتی مسلک''

یقین جانیے کہ جو کچھ بیرون میں ہوتا ہے، اس پر میں نے بہت کم نگاہ ڈالی ہے۔ یوں مجھے میری زند
سے گریز، سنی سنائی، بنی بنائی، محسوس کی گئی، اندازہ لگائی گئی تحقیق سے بہت دور ہوتی ہے۔ ڈیٹا کو بنیاد بنا کر، سا
کرکے تاریخ وار حسابی شکل کے گوشوارے تیار کرکے لکھی گئی تصدیق شدہ کتابیں سائنسی طریق کار کے قریب ہوتی

عین ممکن ہے کہ میں نے کچھ واقعات غلط، کچھ حادثات بے ربط، کچھ بیانات افراط وتفریط کے ساتھ
ہوں۔ میں ابتداً معافی کی خواستگار ہوں کہ میں اشفاق احمد کو آپ کے ساتھ ساتھ سمجھنے کی کوشش میں برسرپیکا
اشفاق احمد کون تھے؟ میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کا مسلک کیا تھا؟

کیا اشفاق احمد دنیادار تھے کہ صوفی؟

نرم دل تھے کہ پتھریلی چٹان؟

کام آنے والے کہ کام لینے والے؟

ان کے اندر کا شہرِ بے مثال کیسا تھا؟

اشفاق احمد کیا احساسات کے غلام تھے؟

کیا ان پر عقلی، ذہنی، اعصابی، نفسیاتی دورے پڑتے تھے؟

کیا ایسا تو نہیں کہ نظر آنے والا اشفاق احمد اور تھا اور اندر چھپ کر سمادھی لگانے والا، مراقبہ کرنے والا
اور قسم کا چھلاوہ تھا؟

غرضیکہ سوالوں کی ایک ٹیلی فون ڈائریکٹری میرے سامنے کھلی ہے اور عجیب معاملہ ہے کہ اب نمبر ملا
فون مصروف ہوتا ہے یا گھنٹی بجنے پر answering مشین چل پڑتی ہے۔ کیا کیجیے زندگی میں بھی وہ کھل کر
سمجھانے والے نہیں تھے! بعد ازاں تو اور بھی مشکل ہے!!

میں نے کچھ تو یہ تحریر اپنی صفائی میں پیش کی ہے۔ کچھ ان لوگوں سے دست بستہ عرض کرنے کے سلسلے میں

...کوں، تاریخی زائچوں، بادشاہوں کی تزکوں سے سچ کو چھان پھٹک کرنے کی عادت ہوا کرتی ہے۔ یہ کتاب ...یب کی قیاس آرائی، تخیل آزمائی، ارادت کے سلسلے میں محاذ آرائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

میں فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے احمقوں کی طرح محبت کی پُر خار وادی میں قدم رکھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر ...یت پائی، نصیحت حاصل کی اور پھر ہولے ہولے اس نتیجے پر پہنچی کہ محبت کا دعویٰ دار ہر خود غلط انسان کی طرح ...شکار ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت صرف اپنی محبت کی عینک لگا کر بیرونی حالات کی رائے قائم کرتا رہتا ہے۔

...نی محبت کے آگے ماں باپ اور خاندان کی عزت کا کوئی بھرم قائم نہیں رکھ سکتا۔ عزت کی خاطر بھاگ جانے ...قبول کرنا ایک نقطہ نظر ہے اور جب تک سچ کے دونوں پہلو نظر کے سامنے نہ ہوں، پورا سچ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ...جس کے دونوں طرف مختلف شبیہ ہوتا ہے اور دونوں کا اپنی عزت اور محبت کا دو پلڑا ترازو ا سچ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد خاں صاحب کے متعلق کچھ تحریر کرنے کا فیصلہ میں نے اس وقت کیا جب وہ میری رائے پر اثر انداز ...لیے درمیان میں نہ رہے۔ اگر وہ حیات ہوتے اور اشارتاً بھی مجھے منع کر دیتے کہ میں ان کو مشتہر نہ کروں تو مجھے ...ن کا احترام کرنا پڑتا لیکن آج جب وہ ہمارے بیچ نہیں رہے تو ہولے ہولے دھند چھٹ رہی ہے۔ کسی فرد کی ...مجھے ایک پیمانہ ہے جس میں زندگی کو ناپنے کی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے یہ پیمانہ معیاری نہ ہو لیکن اندازے اور پڑتے ...لیے اس سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ اس فرد نے کہاں ٹھوکر کھائی، کہاں ٹکرایا، کس کھائی میں گرا، کیسے کیسے ...دلدل میں پھنس کر اپنا اور دوسروں کے زیاں کا موجب ہوا۔

...ن کے طفیل کیا سنورا کیا بگڑا۔ یہ سب مواد مستر ہا ہوتا ہے۔ چھوٹے انسان کے تجربات سے بہت کچھ عبرت ...حاصل ہو جاتا ہے۔ خاں صاحب کی زندگی تو پھر بہت سارے حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی رہتی تھی۔ ایسی ...ن سے چھپانا تا نظر ثانی مجھے اخلاقی بددیانتی لگتا ہے۔

...خاں صاحب کو میں نے تھکے تھکے، چوری چوری، ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے زندگی گزارتے دیکھا ...شخص جو اپنے خاندان کی محبت میں اس درجہ محو تھا۔ انہوں نے ایک اجنبی رابطے کی خاطر اپنے ماں باپ، بہن ...خاندان سے بے وفائی کی۔ اسے بالآخر بانو قدسیہ اور خاندان کے درمیان جب فیصلہ کرنا پڑا تو ان دیکھے کی محبت ...جن پرانی محبتوں کے زخم رستے رہے۔ ان پر کھرنڈ آ جاتا تو خاں صاحب خود ہی تنہائی میں انہیں کھرچ کر ہرا کر ...باقی ماندہ زندگی اس احساسِ جرم سے شفایاب نہ ہو سکی۔

غم کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ ہر شخص کو بقدر ضرورت غم سے شفا بھی ملتی ہے۔ خدا کسی کو بلاوجہ آزار میں مبتلا ...ہر فرد کا غم ایک کشتی کی مانند ہے جو زندگی کے بہتے دریا میں بہا دی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت، توفیق اور ...کے مطابق اس کشتی کو ڈوبنے سے بچاتا ہے۔ خوش نصیب وہ ہیں جن کی میّا انہیں ہدایت کے سفر پر چلاتی ہے۔ ...کشتی دوسرے کنارے پہنچ کر اللہ کی ہدایت کو پہنچ جاتی ہے اور وہ راضی برضا ہو کر اللہ کے فضل میں غرق ہو جاتے ہیں، ...پھر غم ستانے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔

پھر اس بجرے کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور اسے ایک ایسی تلوار بنا دیا جاتا ہے، جو دوسروں کی حفاظت، درد

اور رہائی کے کام آتی ہے۔ غم کے بجرے میں سوار دلگیر مسافر کو اپنا کوئی ذاتی غم نہیں رہتا۔ وہ اب دوسروں کے
بن کر خود اپنے غموں سے مکمل چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ بدنصیب غم غلط کرنے کے لیے تجویزیں کرتے ہیں
لیے زندگی کی رنگینیاں بازو کھول کر منتظر رہتی ہیں۔ وہ طوائف کا عشق ہو۔ شامِ غم اجالنے کے لیے پینے پلانے کا
جوئے خانے کی Excitement ان کا غم ہدایت آشنا ہو کر انسانی سطح سے اٹھنے نہیں پاتا۔ وہ غم کو بھلانے کا فن تو
ہیں لیکن ہدایت کی تلوار نہیں بن سکتے۔

خاں صاحب کی زندگی میں اپنے خاندان سے بچھڑنے کا غم تھا۔ پھر جا بجا رنگین زندگی سے بچنے کے
لیکن اُن کی کشتی کسی کی دعا سے اللہ کی ہدایت سے ہمکنار ہو گئی۔ ان کی کشتی ایک ہی کایا پلٹ میں تلوار بن گئی۔ وہ
رکشا کرنے والی، ظلم کے خلاف لہرانے والی، یتیم بیوہ، مظلوم کے لیے انصاف طلب کرنے والی تلوار بن گئے۔

میرا خیال ہے اسی کایا پلٹ میں ان کی زندگی برائی اور سبق آموزی ہے۔ شہاب صاحب کہا کرتے
صوفی اور عام آدمی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ واقعات دونوں کو ایک سے پیش آتے ہیں لیکن ردِعمل دونوں کا
ہے۔ صوفی بھی عشق کرتا ہے، ناکام ہوتا ہے۔ اسے بھی لالچ خودغرضی، حرص ستاتی ہے۔ اسے بھی قرض کی
ہے۔ بی کلاس رزق کا خیال آتا رہتا ہے۔ وہ گرتا ہے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ معافی مانگتا ہے اور تائب ہو جاتا ہے
اُس کی روح پہلے سے زیادہ تابناک ہو جاتی ہے۔

میں نے تین لوگوں کو اسی طرح گرتے، اٹھتے اور پھر ہدایت پاتے دیکھا ہے۔ مفتی جی، شہاب بھائی
صاحب..... لیکن راستہ تینوں کا مختلف تھا۔ کشتیِ غم تینوں کی مختلف ساخت اور رنگ کی تھی۔ مستول ہر ایک کا
شخصیتیں مختلف ہونے کے باعث انہوں نے زادِ راہ کا دانہ دنکا بھی اپنی مرضی سے جمع کیا۔

شہاب صاحب نبی پاک کا نام بہت کم اپنے منہ سے لیتے تھے۔ شاید یہ اُن کی عقیدت کی شدت کا
تقاضا تھا۔ میں نے کبھی انہیں لہک لہک کر اپنی وابستگی کا اظہار کرتے نہیں دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ انسانیت کا
معیار، پیمانہ انسانیت نبی پاک کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سنت پر عمل ہی انسانی کوشش کی معراج ہے۔ ایک
نے انہیں اثیر بیٹے سے کہتے سنا..... ''آج جب ہم جمعے کی نماز پڑھنے جائیں گے تو مسجد سے نکلتے وقت اپنے
میں پہلے پاؤں دھرنا۔''

اثیر نے نوبالغ لڑکے کی ترنگ کے ساتھ پوچھا..... ''وہ کیوں شہاب چچا؟''

''وہ اس لیے بیٹے کہ میں نبی پاکؐ کی ایک ہی سنت اپنا سکا ہوں۔ اصل کام اس دنیا میں سنتِ نبوی کی
ہی تو ہے..... اور آدمی یہاں کیا کرنے آیا ہے بھلا۔''

کہنے کو تو شہاب صاحب کہہ گئے۔ سننے کو تو اثیر خاں نے سن لیا لیکن اس کے بعد شہاب بھائی کچھ ایسے
ہوئے کہ پھر اس ٹاپک پر کوئی بات نہ ہو سکی۔

مفتی جی وہ دوسرے درویش تھے جنہوں نے مادہ سے روح کی طرف قلابازی کھائی۔ مفتی جی کے
شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ جنت کے مجذوب ہیں۔ وہ دنیا میں بھی مجذوبیت کے لشکارے دکھاتے ہیں

جب ترقی پسند تحریک کے شیدائی ہو رہے تھے۔ مفتی جی سگمنڈ فرائیڈ کے نکتہ نظر سے وابستہ جنسی میلان کی کھو رہے تھے۔

ترقی پسند پیٹ کی بھوک کے ستائے ہوئے لوگوں پر متوجہ تھے۔ مفتی جی جنسی بھوک کو انسانی بیچارگی کا اصل کی کہانیاں لکھ رہے تھے جن میں دبے ہوئے جنسی رجحانات کی باتیں آزادانہ در آتی تھیں۔ مفتی جی جنسی کہانیاں بڑے درد و کرب سے قلمبند کر رہے تھے۔ پھر مفتی جی کی کشتی غم کو یکدم ہدایت کا ساحل مل گیا۔ کسی لمحے میں وہ کایا کلپ کا شکار ہو گئے۔ انہیں نظر آیا کہ یہ ایک جہت ہے جس پر میں کہانی لکھتا آیا ہوں، تھی۔

ایک چیز مابعدالطبیعیات بھی ہے۔ ایک سفر روح کا بھی ہے۔ ایک انتشار وہاں بھی منتظر ہے جس کا جواب مادی میں نہیں دیا جاسکتا۔ جس کا کوئی منطقی تجرباتی Analysis نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک مدت فرائیڈ کے تتبع انسانی دکھوں کا مداوا تلاش کرتے کرتے یونگ نے بھی بڑی تھکاوٹ محسوس کی تھی۔ وہ بھی Sub-Conscious, Conscious کے پانیوں پر تیرتا Cosmic-Consciousness کی آگہی تک جا پہنچا تھا۔

مفتی جی نے جب پلٹا کھایا تو وہ بابوں کی تلاش میں نکلے۔ انہیں ''تلاش'' لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں ''علی پور کا ایلی'' کی نئی Interpretation کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے ''الکھ نگری'' تحریر کی جس میں مذہب کو بے نقاب کرنے کی جرأت کی گئی۔ یوں ممتاز مفتی کو جو تلوار ملی، وہ اپنی نوعیت کی مختلف تلوار تھی۔ وہ مابعد کا تنویر کے متلاشی ہو گئے۔

روحانیت کی اس ترشول کا تیسرا نوکدار حصہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ (اندر کی تلاش چھپانے) بابوں کے گھومتے، ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف رہے جن کی غالباً خود انہیں بھی سمجھ نہیں تھی۔ انہیں کیا اور وہ دراصل اپنے اور صرف اپنے لیے کیا چاہتے تھے؟ اس کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے بابوں کے تک چھانی۔

مجھے اور تو کچھ علم نہ ہو سکا۔ میں یہاں تک سمجھ پائی ہوں کہ انہوں نے نہ سنت رسول کی پیروی کی نہ مابعد ہی کا کرنے میں مصروف ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو خلق خدا کے حوالے کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ کو قرض دینے کی رسم ڈال لی اور میں سمجھتی ہوں اسی قرض حسنہ کو اللہ نے وہ شہرت اور قبولیت بخشی جس کا فائدہ وہ آج بھی ہیں۔ انہیں ہدایت کی کشتی مل گئی اور وہ تلوار ملی جو خلق کے آگے چلتی تھی۔

انہوں نے اپنے فرانسیسی اور اطالوی سوٹ، سیک لیدر کی جوتیاں، مہنگی خوشبوئیں ترک کر دیں۔ شلوار قمیض پہن کر اللہ کی مخلوق کا حصہ بن گئے۔ اشفاق صاحب عموماً چھوٹی بات سے بڑا نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے۔ وہ عجیب و غریب بیرونی مواد سے اندرونی ذاتی مسلک کی تراش خراش کرتے رہتے۔ ایک ایسی ہی تحریر ملاحظہ ہو۔

قسام ازل حساب کتاب کے معاملے میں کچھ اپنے جیسا ہی ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو بہت سی چیزیں

دی ہیں۔ پر ان کے استعمال کا شعور نہیں دیا۔ بہت سوں کو اس نے شعور دے رکھا ہے اور چیزیں مرحمت نہیں فرمائیں
''لپ اوور'' پہننے کے لیے بھی شعور کی ضرورت ہے لیکن میرے اکثر دوستوں کے پاس سویٹر تو ہیں پر شعور نہیں۔

وہ ''سلپ اوور'' کو بھی اسی طرح پہنتے ہیں جیسے قمیض یا بنیان پہنی جاتی ہے۔ سویٹر پہننے کے لیے ذوق جمال
او نگھنے کی حس کے لطیف ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ کو اس وقت ''سلپ اوور'' پہننے سے گریز کرنا چاہیے جب تک
آپ کو رنگوں کے خواص کا علم نہ ہو۔ گہرے اور بھڑکیلے رنگ ہمیشہ غیر سنجیدہ نہیں ہوتے اور صوفیانہ رنگ مستقل طور پر
نہیں کہلائے جاسکتے۔

اگر کوئی بوڑھا سفید ٹول کی قمیض اور لٹھے کی براق شلوار پر گہرے بسنتی رنگ کا سویٹر پہن لے تو اس کی
میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی بشرطیکہ اس کی چندیا بلور کی طرح ملائم اور شفاف ہے اور اس کے کانوں پر سیاہ رنگ کے
اُگے ہوئے ہیں۔ وہ تو بسنتی رنگ کے سویٹر میں انگریزی کے اس رسالے کی طرح دکھائی دے گا جو ملکہ وکٹوریہ کے
شائع ہوا کرتا تھا اور جس میں گھڑسواروں کے کارناموں سے متعلق کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔

اسی طرح اگر ستواں ناک اور گھنگھریالے بالوں والی کوئی نوخیز لڑکی صوفیانہ رنگ کا ''سلپ اوور'' پہن
کی دلکشی اور موہنی میں ذرہ بھر کمی بھی واقع نہ ہوسکے گی اور ہلکے بادامی رنگ کے سویٹر میں وہ ہمیشہ فرانسیسی صاحب
طرح دکھائی دیتی رہے گی۔ دیدنی! بوسیدنی! پھر پتہ نہیں لوگوں نے یہ قاعدہ کلیہ کیوں اور کیسے وضع کر
صوفیانہ رنگ سنجیدہ اور شوخ اور بھڑکیلے رنگ غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔

''سلپ اوور'' پہننے میں قوت شامہ کے غیر معمولی ہونے پر میں اس لیے زور دیتا ہوں کہ سویٹر آپ
آپ کے قریب رہنے والے جسم کے علاوہ چند ایسے غیر مرئی اجسام کی خوشبو کو بھی اپنے اندر سموئے رہتا ہے جس
آپ کو یوں نہیں ہوتا۔ رات کے وقت جب آپ اپنے بازوؤں کو علامت ضرب بنا کر سویٹر کا گھیرا ہاتھوں میں
اور اسے آہستہ آہستہ اوپر کھینچتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز کا احساس آپ کو ہوتا ہے وہ اس دوست کی جدائی
ابھی آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

جونہی سویٹر کا گھیرا آپ کی ناک کے نزدیک پہنچتا ہے۔ آپ کو اس میں سے مٹی کے ذروں کی خوشبو آ
ایک صاف ستھرے سلیپنگ روم میں ذرات کی خوشبو صحرائے کالاہاری میں ٹھنڈے چشمے کا درجہ رکھتی ہے اور جب
آپ کی ناک سے آدھا گزر چکتا ہے تو اس میں دن بھر کی دھوپ کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ خدا لگتی کہیے ایک یخ
رات میں دھوپ کی مشام طرب انگیز ہے کہ نہیں؟ جونہی اس میں سے دھوپ کی خوشبو آتی ہے آپ کا وہ دوست
آتا ہے جس سے ابھی آپ کی شناسائی نہیں ہوئی اور جونہی اس کا گریبان الٹ کر ناک کی پھننگ پر سے پھسلتا
احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے آپ سے گلے مل رہے ہیں اور آپ نے اپنے وجود کا بوسہ لے لیا ہے۔

''سلپ اوور'' پہننے کے شعور کا سب سے بڑا تقاضا یہ کہ ''پل اوور'' کبھی نہ پہنا جائے۔ پل اوور پہن کر
یہی محسوس کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے تاجر باپ کے ساتھ بازار کے بھاؤ اور مندی اور تیزی کی باتیں کر رہا ہے اور
میں ملبوس ہو کر آپ کو یوں لگتا ہے کہ آپ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے پڑے ہیں اور وہ ان میں سے سفید بال چن

تنگ اور کوتاہ ''سلپ اوور'' پہننے سے نہ پہننا بہتر! تنگ ''سلپ اوور'' پہن کر بہت ممکن ہے آپ جسمانی طور پر
بند ہو جائیں، پر روحانی طور پر آپ گھٹ کے رہ جائیں گے۔ تنگ ''سلپ اوور'' پہن کر آپ کی حالت یقیناً وہی
ت کو بغیر بتی کے سائیکل چلاتے ہوئے سپاہی کی سیٹی سن کر ہوا کرتی ہے۔ ''سلپ اوور'' پہن کر بھی اگر آپ کے
دنی ملبوس سے مستور نہ ہوئے تو اس کا استعمال بے جا ہے۔ کندھے پر سے گزرنے والی پٹی اگر زیادہ نہیں تو
ہوئی ضرور ہونی چاہیے کہ آپ کے بازو پر چیچک کے ٹیکے کا سب سے اوپر کا نشان اس کے نیچے رہے۔
جہاں تک اس کی بنتی کا تعلق ہے۔ ''سلپ اوور'' کی کوئی بناوٹ بھی پہنی جا سکتی ہے لیکن ایسی بنتی جس
سا قین اشکال ہوں، کسی طرح بھی قابل قبول نہیں لیکن اگر آپ پٹواری ہیں تو ایسی اشکال کا سویٹر بھی پہنا

سلپ اوور'' کو تہہ کر کے رکھنا یا اس کو کھونٹی پر ٹانکنا اس کا ایمان ہے۔ کرسی کی پشت پر، کرسی کے بازو پر ڈالنا
تمیزی ہے۔ اسے ہمیشہ کرسی کی سیٹ پر یا کتابوں کے اوپر رکھنا چاہیے۔ اگر آپ کو ''سلپ اوور'' کے گریبان
نے کی عادت ہے تو بہتر ہے کہ یا تو آپ سلپ اوور نہ پہنیں یا پن نہ خریدیں۔
سلپ اوور'' کے پھٹ جانے، کہنہ ہو جانے یا تنگ ہو جانے پر اسے کسی مستحق، فقیر، غریب آدمی یا اپنے
یا بیٹے کو دینے کی بجائے پتھر کے گرد لپیٹ کر دریا میں ڈال دیں۔ بیسویں صدی کے پہناووں کی دیومالا کے
رنے سے اگلے موسم پر آپ کو اس سے بڑھیا ''سلپ اوور'' ملے گا۔
یہ تمام باتیں عام ''سلپ اوور'' پہننے والوں کے لیے ہیں کیونکہ اگر آپ سرکس میں ملازم ہیں تو آپ پر کوئی

خاں صاحب نے میرے رشتہ داروں کے ساتھ مجھے ایسے مابین رکھا کہ شرم وحیا دونوں طرفین کی قائم رہے۔
دوستوں اور بہی خواہوں کے درمیان جب میں ہوتی تو وہ درمیان میں ایک ریشمی پردہ بن جاتے۔ اشفاق احمد
کے بعد مجھے کئی باتیں سمجھ میں آئی ہیں۔ اب میرے سامنے ہٹو بچو کہتا ہوا ہوشیار باادب ملاحظہ کہتا ہوا اور مجھ سے
آگے چلنے والا آدمی نہیں ہے۔ اب میں ٹھوکر کھا جاؤں، گر جاؤں، کسی کے کندھے سے ٹکرا جاؤں، اب وہ شخص
مجھ سے آگے چلتا تھا اور مجھے بچاتا جاتا تھا۔ وہ شخص اب موجود نہیں۔
آج مجھے پتہ چل گیا جب میرے گھر ٹیکس کے کاغذات آتے ہیں۔ کبھی کبھی وارنٹ یا قانونی قسم کا سمن بھی
۔ پھر میرے پاس وہ بل آ جاتے ہیں جو بجلی کے زائد بل ہوتے ہیں۔ میرے پاس وہ منی آرڈر بھی آتے ہیں جن
ہے ''اشفاق احمد''۔ مجھے معلوم نہیں منی آرڈر کیسے بھرا جاتا ہے۔ چیک بھرنے کی باریکیاں بھی میرے علم کا حصہ
مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ڈیڑھ گنا کام کرتے تھے اور میرے لیے آدھا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے ''گواہی دینے
۔ میں جاؤں گا۔ یہ کام میرے ہیں، باہر کے تمام کام میں سنبھالوں گا۔ تم بس گھر اور لکھنے پڑھنے پر توجہ دو۔''
اس حفاظت میں رہنے کے بعد، اس چادر اور چار دیواری میں رہنے کے بعد اب زندگی میرے لیے اچانک

بہت مشکل ہوگئی ہے۔ اب مجھے ان چیزوں کو دیکھنا اور ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ جن کی مجھے سمجھ تک نہیں۔ اگر غلطی سے کھڑکی کھلی رہ جائے اور اس میں سے ہلکا سا ہوا کا جھونکا آئے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ Tornado داخل ہو رہا ہے۔

آپ یقین کیجیے اشفاق احمد کا یہ طریقہ کار تھا۔ ان میں خصوصیت تھی اور اس خوبی کا ان کو بھی احساس نہیں تھا۔ وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا بنیادی مسلک موروثی اور پشتینی غیرت تھی۔

اشفاق احمد ایک غیرت مند آدمی تھے۔ وہ اپنے اور لوگوں کے درمیان بھی ایک حجاب رکھتے تھے۔ رشتہ داروں اور اپنے درمیان بھی ایک پردہ حائل رکھتے تھے۔ ایسا حجاب جو غیرت مند لوگ ہی رکھ سکتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے درمیان کبھی ایسی باتیں نہیں ہوئیں جو اندر کی قربت سے ہوتی ہیں۔

ممتاز مفتی کہا کرتے تھے ''اشفاق احمد گونگا ہے، اس نے اپنے اوپر صرف باتوں کے خول چڑھا رکھے ہیں۔ اس کی اصلی بات کو کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ سب ان کی موروثی اور پشتینی خوبی کی وجہ سے تھا۔ میں آپ سے عرض کروں، بار بار عرض کروں کہ اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ہر قوم اور فرد میں ایک خوبی ایسی ہوتی ہے، جس سے اور بہت سی خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بنیادی طور پر خوبی ایک رہتی ہے۔

بتائیے ایسے انسان کو کیا اپنی خوبی پر کبھی فخر ہوسکتا تھا؟ ان کا ذاتی مسلک غیرت اور صرف غیرت تھا اور مجھ سے شادی کر کے اس ذاتی مسلک کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی! ایسے لوگ گلی گلی کہاں، ایسے لوگ ہر عہد اور دور کی قسمت میں کہاں اور مجھ جیسی بھاگوان عورت بھی کہاں جس کی چادر اور چار دیواری اس کا شوہر ہو۔

جانوروں سے محبت

جانوروں سے محبت بھی خاں صاحب کے ذاتی مسلک کا حصہ تھا۔ جس طرح وہ غیرت اپنے موروثی مسلک سے لے کر آئے تھے۔ اسی طرح دیہاتی زندگی نے انہیں قدرتی طور پر جانوروں کی محبت عطا کی تھی۔ وہ اس محبت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔

سمن آباد کے بعد برسوں ہمارے گھر میں کسی Pet نے قدم نہ رکھا لیکن جب ہم ''داستان سرائے 121'' میں منتقل ہوئے تو یہاں ایک دن کھکھو ڈیڈی یعنی خاں صاحب کے بڑے بھائی تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ ایک چھوٹا کتا تھا، جس کا چہرہ خوفناک، جسم مضبوط، انداز بے حد مضطرب تھا۔ اس کا سارا جسم کہہ رہا تھا'' مجھے چھوڑ دو، پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔''

خاں صاحب نے بڑی محبت سے اس کے سر پر پیار دیا۔

''کھکھو بھائی اسے کیا کھلانا پلانا ہے؟'' خاں صاحب نے سوال کیا۔

''وہ تو ایسا کچھ مسئلہ نہیں۔ اسے دن میں دو بار سیر ضرور کرانا ہے۔ سیر کے بغیر یہ مر جائے گا۔''

...ارے گھر میں گیٹ سے گھستے ہی سیدھا چلتے جائیں تو آپ کو گیراج کا ایک سیاہ پھاٹک والا گیٹ نظر آئے گا۔
...کے اندر پوائنٹر کو رکھا گیا۔ اس کی صورت ایسی خطرناک تھی کہ بچوں کو میں نے اس سے بالکل پرے رکھا۔
...ان دنوں سوات کا تاجدار ملازم تھا۔ یہ نوجوان سیر کے لیے مامور کیا گیا۔
...چار دن تو خاں صاحب پوائنٹر کو سیر پر لے گئے۔ ساتھ تاجدار کو بھی ٹریننگ دی گئی کہ کیسے زنجیر ڈھیلی بھی رکھنی ...کھینچنا بھی نہیں لیکن تاجدار کا چہرہ سیر کے وقت فق ہو جاتا۔ کتا اُسے بڑی تندی سے گھسیٹتا لے جاتا اور گھسیٹتا ہی ...تا۔ اس وحشی سے ویسے بھی گھر بھر میں کسی کی دوستی نہ ہو سکی۔ شہری زندگی میں ایسے چونچلوں کے لیے کسی کے ...قت نہ تھا۔

...ڈل ٹاؤن سے ملحق ان دنوں کھیت ہی کھیت تھے اور افتخار بھائی نے یہاں ٹھیکے پر زمینیں لے رکھی تھیں۔ ایک ...لی آئے۔ مجھے گیراج میں ساتھ لے گئے۔ پوائنٹر کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ ''کاکی! یہ تو بہت مارا ہو گیا ہے۔''

''جی ڈیڈی جی۔ ڈبلا تو ہو گیا ہے۔''

''اسے سیر کون کراتا ہے؟''

میں نے کمزور تاجدار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ لڑکا لے جاتا ہے جی لیکن کتا شہ زور ہے۔ اس کے بس کی ...

''تو شفقو سیر کرانے لے جایا کرے۔'' کھکھو ڈیڈی بولے۔

''وہ تو شوق سے لے جائیں لیکن انہیں دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ شام کو وہ دیر سے آتے ہیں۔''

''اچھا کتا میں واپس لے جا رہا ہوں۔ شفقو کو بتا دینا۔ یہ نعمت تمہارے بس کی نہیں۔''

کھکھو ڈیڈی مسٹر پوائنٹر کو لے گئے۔ تاجدار کی جان میں جان آئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ دکھا کر کہا ''دیکھو آپا ...ب جب کھینچتا تھا تو ہم بھی ساتھ ہی گھسٹتا جاتا تھا۔'' اس کے خراش ہاتھ دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ میں نے کتا رکھنے ...ی اور ایک طرح کی تسکین محسوس کی لیکن جب خاں صاحب گھر لوٹے اور گیراج کی طرف جانے لگے تو مجھے ...ہوا۔

میں نے خفت سے کہا ''وہ جی کھکھو ڈیڈی آئے تھے، وہ لے گئے۔''

''مجھے تو پوچھ لینا تھا قدسیہ۔'' انہوں نے مجھے جھڑکے بغیر کہا۔

''وہ جی تاجدار کے ہاتھ بھی بالکل زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے۔ بڑا شہ زور تھا پوائنٹر۔ یہ غریب اسے کیا ...

انہوں نے اپنی براؤن آنکھوں میں تھوڑا سا دکھ بھر کر کہا ''میں سیر کے لیے کوئی اور انتظام کر دیتا۔ بڑی اچھی نسل ...تھا۔ تم نے ایسے ہی جانے دیا۔''

ساری تنبیہ شکایت بس اتنی تھی۔ اس کے بعد نہ کبھی پوائنٹر کا ذکر انہوں نے کیا اور نہ میں نے اس کی بات ہی کی ...دن جب تاجدار بیٹھا پڑھ رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپا جی آپ کا شکریہ۔ اگر وہ کتا رہتا تو مجھے سوات

جانا پڑتا اور آپ کو معلوم ہے میرا باپ فوت ہوگیا ہے۔ ماں نے اور شادی بنالیا ہے۔ ہمارا دونوں بھائی بہت پریشان ہے
ہم بھی پریشان ہو جاتا۔''

لیکن خاں صاحب بھلا جانوروں اور پرندوں کے بغیر کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ پوائنٹر کے کچھ عرصہ بعد
آ گئیں۔

گھر کی آخری دیوار کے ساتھ چھوٹا سا گودام چار فٹ چوڑا اور قریباً آٹھ فٹ لمبا تھا۔ اس میں ہر قسم کا
جاتا تھا۔ فرش دھونے والی بالٹی، فرشوں پر پھیرنے والی ٹاکیاں، گندے جھاڑن، جھاڑو۔ یکدم اس میں مرغیوں
پنجرے بن گئے اور ان میں انڈے دینے والی مرغیاں آ گئیں۔ ہم میں سے کسی کو مرغیوں سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی
انڈے گننے، پکانے، چرانے میں سبھی ماہر تھے۔

انڈوں کی زیادتی ہوئی تو اب آملیٹ، کیک، بسکٹ بڑی خوشی سے پکنے لگے۔ انڈوں کی ڈشیں
لگیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ ایسا ہوگیا کہ انڈے گم ہونے لگے۔ گودام کا دروازہ کھولتے تو کبھی انڈے ملتے کبھی
پنجرے خالی نظر آتے۔ ان کی فیڈ تلاش کر کے لانا، اسے سٹور کرنا، مرغیوں کے پاس کھڑے ہو کر ان سے باتیں
چال پوچھنا خاں صاحب کا کام تھا۔ انیس اور خاں صاحب کی جانوروں سے محبت سانجھی تھی۔ ان دونوں کو
بطخیں، مرغیاں بھلی لگتی تھیں۔

فیڈ اور بو کے باوجود انیس لالہ اور خاں صاحب اُدھر کا رخ کر ہی لیتے تھے۔ البتہ نوکی اور چری میرے
تھے۔ انہوں نے کبھی نہ مرغیوں کی پذیرائی کی نہ کبھی انڈے اُٹھا کر لائے۔ جب کبھی نبیل اشتیاق آ جاتا تو پھر
لیے انڈوں کا ہنگامہ چلتا۔ اشتیاق کے بیٹے نبی کو وحشت کی حد تک انڈوں کا شوق تھا۔ وہ اس شوق میں سب کو
اور بڑی رونق رہتی۔

انڈے پک رہے تھے۔ انڈوں پر تبصرہ، تنقید، تعریف جاری ہے لیکن اس شغل میں صرف بچے
ہوتی۔ اشتیاق کے بچے، صدیقہ جاوید کے توصیف، ثویلہ، بیا اور ہمارے بچے کبھی کبھی اگر ثابت شہاب آ جاتا تو
میلے میں شامل ہو جاتا۔ آموں کی پیٹیاں، انڈوں کا دھڑن تختہ۔ یہ آدھی رات کو رہنے والے مشغلے تھے۔ صبح
غائب۔ نہ کوئی انڈے کا چھلکا نہ کسی آم کی گٹھلی نہ ترچھے میڑھے گول چوکور بچوں کے پکائے ہوئے پراٹھے۔
ہوتی اور پتہ ہی نہ چلتا رات کیا غدر مچا ہوا تھا۔

لیکن مرغیاں اور ان کے انڈے جب چوری ہونے لگے اور فیڈ لانے کی دقت بڑھ گئی تو شہری زندگی
مشغلے کو بند کر دیا گیا۔ مرغیاں چونکہ گھر کی پالتو تھیں، اس لیے خاں صاحب نے انہیں ذبح ہونے سے بچا لیا۔
کس کے نصیب کی تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ بہر کیف پنجرے خالی ہو گئے۔ گھر سے دیہات کی خوشبو ایک بار پھر

لیکن پچھلے گودام کی قسمت پھر جاگ اٹھی۔

اس بار خاں صاحب کہیں سے بطخیں لے کر آ گئے۔

داستان سرائے کے سامنے پکی سڑک کے پار ان دنوں ایک نالا بہتا تھا۔ اگر پہاڑوں پر یہ چشمہ

ے ٹول کہتے۔اس کا پانی گہرا اور لمبی گھاس سے دونوں جانب گھرا ہوا تھا۔ابھی ہماری سڑک کے پاس اُم عمارہ
ول تک کوئی گھر نہ تھا۔بطخیں آئیں تو انیس صاحب جن کو سب لالہ کہتے تھے،ان کا گوڈ فادر بن گیا۔اس میں نہ
یہ جنتر،علم یا جادوئی بولی ہے کہ جانور اور بچے اس پائیڈ دی پائپر کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔پندرہ بیس بطخیں پچھلے
ینت بن گئیں۔آگے آگے لالہ ہاتھ میں شہتوت کی چھڑی پیچھے پیچھے قیں قیں کرتی بطخیں۔یہ ٹولہ بڑے آرام
کراس کرتا۔کبھی کسی کار کے نیچے بطخ کے کچلے جانے کا حادثہ پیش نہ آیا۔

الے کے قریب ایک چارپائی پڑی رہتی۔لالہ اور دوسرے بچے کبھی چارپائی پر کبھی نالے کے پانی میں غوطہ زن
پر پتہ نہیں وقت کا کیا اندازہ تھا یا بطخ بان اور بطخوں میں کیسے اور کیا طے تھا؟ وقتِ مقررہ پر آرام سے لالہ گھر کا رخ
بطخیں اس کے پیچھے پیچھے بڑی ریت پریت کے ساتھ چلی آتیں۔کبھی لالہ نے کسی کو شہتوت کی چھڑی نہ ماری نہ
میں بولا۔بس گھر لوٹتے وقت قیں قیں کی آواز کم ہوتی گویا سکول سے بچے لوٹ رہے ہوں۔

میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ میری تربیت اور سرشت میں جانوروں اور پرندوں کی دیکھ ریکھ پر
دیا گیا۔میں نے ایک مرتبہ ایک کوکر سپنل پہاڑوں پر پلا پایا تھا۔اس بدنصیب کو ایک رات پہاڑی چیتا برآمدے
لے گیا۔میں نے صبح عہد کیا کہ اب میں کبھی ایسا بیوپار نہ کروں گی جس میں پوچھے بغیر سامان کو اٹھائے جانے کا

اس قسم کے باوجود سن 1948ء میں جب میری والدہ لیڈی میکلیگن کالج کی پرنسپل تھیں،انہیں کسی نے ایک
بھی پلا دیا۔بدقسمتی سے اس کتے کی ساری حوالگی میرے ذمے ٹھہری۔کچھ عرصہ بعد نہ جانے کس آفتِ غیبی نے کتے کو
اور وہ ایک دن میرے پاس آیا۔بے بسی سے اپنا سر میری گود میں رکھا اور جان دے دی۔غم کے ساتھ اس روز میں
سبق سیکھا کہ زندہ جان کا بیوپار دراصل اپنا آپ مفت بیچنا ہے۔

کبھی کبھی جانور اٹھایا نہیں جاتا وہ خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔نہ کسی کو الزام دے سکتے ہیں،نہ جانور کو واپس
کوئی تدبیر کی جا سکتی ہے۔بس ان ہی دو تجربوں کے بعد میں کچھ تو طبعاً جانوروں سے محبت کرنے والی نہ تھی۔اوپر
واقعات نے دل میں اور فاصلہ ڈال دیا۔

ابھی بھی کہیں اندر خاں صاحب کے دل میں کتے کی محبت کلبلا رہی تھی۔وہ اس محبت سے مکمل طور پر فارغ نہیں
تھے۔کتوں کے بعد خاں صاحب نے بلی پالنے کا تجربہ کیا۔انیس کی زبانی ملاحظہ ہو کہ ''یوگی'' بلا ہمارے گھر کا فرد
بن گیا۔

تحریر: انیس احمد خاں

بڑے لوگوں کے گھر پیدا ہونا بھی مشکل مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص یہ توقع کرتا ہے کہ شاید اولاد بھی اسی طرح کی
میرا ادب سے کوئی خاص تعلق ہے نہ تصوف کو میں سمجھتا ہوں۔میں صرف ایک باپ کے رشتے کے حوالے سے ہی

ابو بہت مصروف زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی Activity میں پڑے رہتے تھے۔ گھر کے اندر مغربی حصے کی گلی میں بے بہا مٹکے رکھے ہوتے، جس میں وہ طرح طرح کے سرکے بناتے رہتے تھے۔ کبھی گنے کا بنا دیا، کبھی کھجوروں کا سرکہ بنا دیا، لیکن ایک بات عجیب سی ہے۔ جیسا کہ اصغر ندیم سید نے کہا کہ وہ انسان کی عزت کرتے تھے اور احترام انسانیت ان کی ہر بات کا موضوع ہوتا تھا۔ ان کی یہ بات خالی کہنے تک نہیں تھی۔

1980ء کی بات ہے۔ میں اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ یہ ان سردیوں کی بات ہے جب لاہور میں دھند کی چاندنی اتر آیا کرتی تھی اور کالج کے گیٹ بند نہیں کیے جاتے تھے بلکہ کھلے ہی رہتے تھے۔ جب میں تیار ہو کر کے کالج کے لیے نکلتا تو اکثر امی ابو صبح کی سیر پر گئے ہوتے تھے اور ہماری نانی ہی ہمیں الوداع کہتی تھی۔ ایک دن میں صبح کالج جا رہا تھا تو ابو براؤن کوٹ پہنے ہوئے امی کے ساتھ آ رہے تھے تو انہوں نے مجھے دور سے اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔

کہنے لگے "تسی کالج جارے او۔"

میں نے کہا "جی۔"

میں نے دیکھا کہ ابو کا پیلا ڈریسنگ گاؤن آگے کی طرف سے کافی پھولا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک چھوٹا سا کتا جو کافی غلیظ حالت میں تھا، وہ ان کے کوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری نانی جو میرے پیچھے ہی کھڑی تھی، کتے کو دیکھ کر کہنے لگی "اشفاقا گے مصیبتاں گھٹ نیں جیہڑا توں کتا چک لے آیا ایں۔"

(اشفاق کیا پہلے مصیبتیں کم تھیں جو تم ایک کتا اٹھا کر لے آئے ہو۔)

ابو کہنے لگے "امی یہ کتا نہیں ہے، یہ جوگی ہے۔ تھوڑی دیر کا مہمان ہے چلا جائے گا۔ یہ آپ کو زیادہ تنگ نہیں کرے گا۔ بس دس بارہ دن ہی رہے گا۔"

ابو نے خیر اس کتے کی اتنی سیوا نہیں کی۔ البتہ اماں کی ڈیوٹی ضرور بڑھ گئی۔ ظاہر ہے اسے نہلانا پڑتا تھا، وقت پر دودھ وغیرہ پلانا۔ ایک روز جب اس کتے کی حالت خراب ہو گئی تو ابو کہنے لگے، اسے کسی ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں اور ہم ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا، اشفاق صاحب اسے ٹھیک ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔

اس پر ابو کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب! اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ عزتِ نفس کا مارا ہوا ہے۔ یہ اپنے گھر سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے اس طرح کا ہو گیا ہے۔"

آپ لوگ یقین کریں کہ ٹھیک دس بارہ دن کے بعد وہ بلا جوگی تھا اور جو واقعی ابو کا لاڈلا بھی ہو گیا تھا، وہ دس دن کے بعد نہ ہمارے گھر رہا اور وہ تندرست ہو کر خود ہی چلا گیا۔ شاید وہ بلا ابو کی بات سن کر سمجھ گیا تھا اور اسے جتنا وقت دیا گیا تھا، وہ پورا ہونے پر وفاداری سے چلا گیا۔

اب نہ وہ جوگی ہے نہ جوگی کا رکھنے والا۔ بہر حال یہ زندگی کا دستور ہے۔ یہ Creative لوگ خدا کے بنائے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ یہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ خود ہی گا لیتے ہیں۔ یہ روشن آراء بیگم کے اندر سے خود بخود ہی سُر نکلتے ہیں۔ یہ سکھائے نہیں جاتے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میرے والدین دونوں ہی خدا کے چُنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ خدا میری والدہ کو صحت عطا کرے لیکن ابو کی جو کمی ہے، وہ ہر وقت رہتی ہے۔

آج بھی جب میں ان کی الماری کھولتا ہوں تو مجھے اس میں سے ابو کے بالوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ میں نے ابو کا نیلا سویٹر مانگ کر لے گیا ہوں اور اس میں اب بھی ابو کی تھوڑی تھوڑی خوشبو رہ گئی ہے، خدا کرے وہ ہمیشہ

بظاہر گھر جوگی سے خالی ہو گیا۔ مجھے کچھ فراغت مل گئی۔ میں اپنے کام یک طرف ہو کر کرنے لگی لیکن خاں اس معاملے میں مجھ سے مختلف تھے۔ وہ تلخ و شیریں کے الگ الگ خانے نہ بناتے۔ انہیں لاشعوری طور پر علم تھا کہ کھٹا میٹھا دونوں ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ مصیبت اور راحت تو بچوں عام بچوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا اخ تھو الگ الگ نہیں ہوا کرتے۔ کبھی حلق میں میٹھا اتر جاتا ہے، کبھی بوند دو بوند قطرے کہیں سے آ جاتے ہیں۔ اسی لیے اُنہیں نئے تجربات کرنے آسان تھے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کافی، جامنیں، گل گھوٹو بیر اور ساتھ ساتھ کھٹے میٹھے چوسنا آم بہت شوق سے کھاتے۔ قلمی آم، میٹھا خربوزہ، کیلے، مسمی ان کی پسند تھی۔ شرابیں جو شرابوں سے ملیں تو مزہ کس قدر بڑھتا ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی شرابی ہی کو ہوگا لیکن میٹھا کھٹا ساتھ چلیں تو اس کی گرائمر صرف خاں صاحب خوب سمجھتے تھے۔

شہری زندگی میں جانوروں کا پالنا کس طرح بوجھ بنتا ہے۔ اس کے لیے غالباً میں تیار نہ تھی لیکن میرا رویہ غیر ... مجھے لگتا کہ اتنے سارے اور کاموں کے ساتھ یہ اضافی عیاشی گھر پر نہیں کی جا سکتی لیکن اس بار خاں صاحب پر ... نہیں۔

اچانک ایک روز صبح صبح باہر نکلی تو علی کھڑا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی ٹوکری تھی اور اس ٹوکری میں کوئی چیز ہل رہی ... نہیں خاں صاحب کے پاس سحر القلوب کا کوئی تعویذ تھا یا ان کی مسکراہٹ میں ایسی کوئی موہنی تھی کہ ہر شخص ان کے ... نے کو دوڑتا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو علی بولا......

"میں خاں صاحب کے لیے سیامی بلا لایا ہوں۔ کل جب "تلقین شاہ" کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی تو ریہرسل کے وقت انہوں نے بتایا تھا کہ اُنہیں سیامی بلیاں پسند ہیں۔"

لیجیے گھوڑا گھڑ سال میں پہنچ گیا۔

سیامی بلا خاں صاحب کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ کچھ پچکارنے، ماتھے پر کھجلنے، ہاتھ چٹوانے میں دقت لگا ہو تو لگا ہو مجھے دیر نہیں لگتی۔ یہ پہلی نظر کا عشق تھا۔ شام کو بچوں سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب بولے...... "بھئی یہ ذرا سا بڑا ہوگا تو دیکھنا کتنا خوبصورت نکلے گا۔ ابھی تو چھوٹا سا روئی کا پھنبہ ہے۔"

سامبا سے انیق خاں کو محبت ہو گئی۔ وہ کالج جاتے ہوئے اور واپسی پر ضرور سامبا سے دست پنجہ کرتا لیکن سامبا کی آخری ترجیح خاں صاحب تھے۔ صبح جب وہ ناشتے کے لیے آتے تو اپنی کرسی ذرا سی میز سے پیچھے رکھتے اور جھولی

کو پیارے ساما کا انتظار کرتے۔ پھر کہیں سے سامبا صاحب یکبارگی ہلہ بول کر ان کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔

خاں صاحب گود میں براجمان سامبا سے کوئی بات نہ کرتے نہ اسے پچکارتے۔ صرف جسم کی گرمائش ایک دوسرے کی بات خوب سمجھتی تھی۔ وہ شانتی پرانتی ناشتہ کرتے رہتے۔ سامبا گود میں خرخر کرتا اپنی محبت کا اظہار کیے جاتا۔ یاد ہے ایک دن شہاب بھائی آئے اور غلطی سے خاں صاحب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد مسٹر سامبا نے چھلانگ لگائی اور شہاب بھائی کی گودی میں چڑھ گیا۔ اس وقت شہاب بھائی کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ وہ تمام تر گھبراہٹ، ناگواری سے بھاگ جانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر بڑی لجاجت سے کہا۔

''اسے اٹھا لو اشفاق۔ اٹھا لو جلدی۔''

میں نے شہاب بھائی کو کبھی اس قدر گھبرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی ناگواری ساری کی ساری اُن کے پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ خاں صاحب نے بلاّ صاحب کو اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر خرخر کرنے کی آواز آئی۔ شہاب صاحب کے ردِعمل پر کسی قسم کا تبصرہ نہ ہوا اور چائے کا دور بڑی ہمواری سے جاری ہو گیا۔

یہ صرف خاں صاحب کے ساتھ ہی ممکن تھا ورنہ کچھ اور قسم کے لوگ ہوتے تو بڑے آرام سے بحث ہو سکتا تھا کہ بلی مکروہ ہے کہ حلال ہے۔ اسے گود میں بٹھانا چاہیے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی نور والے بابا جیؒ کی محبت تھی۔ وہ بڑے عجیب انداز میں نوٹ کہہ کر ایک ایسا جملہ کہہ دیتے کہ تربیت چاہنے والے کی زندگی بدل جاتی اور عام آدمی خوشی اپنی سادہ زندگی گزارے چلا جاتا۔

بابا جیؒ فرمایا کرتے تھے...... ''بیٹا نوٹ! ہمیشہ برائی سے نفرت کرنا ہے۔ برائی کرنے والے سے نفرت نہیں ورنہ آپ میں وہ برائی پیدا ہو جائے گی اور اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔''

گھر میں سامبا کا راج تھا۔ وہ دن میں دو مرتبہ کچا قیمہ کھاتا۔ موٹا تازہ شیر ببر سا اپنی مرضی سے جب چاہے سے باہر بھاگ جاتا۔ اس کی زندگی من مانی پلاننگ پر چلتی تھی۔ نہ وہ کسی ڈسپلن کا دست نگر تھا۔ نہ کوئی قانون لاگو ہوتا۔ ایک روز جب میں سامبا کو قیمہ ڈال رہی تھی تو رمضان بھائی جو پیدائشی بزرگ ہیں، بولے ''آپا جی روز پورے بیالیس روپے کا قیمہ کھا جاتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ! اتنا قیمہ تو کسی غریب آدمی کا سارا خاندان پالنے کو کافی ہے۔''

میں چپ ہو گئی۔ رمضان بھائی وہ قناعت پسند شخص تھے جو دیگچی میں روٹی پونچھ کر گزر بسر کر لیتے تھے۔ انہوں نے کسی پھل کی رغبت ظاہر کی نہ کسی بوٹی شوربے پر ان کا دل للچایا۔ موسمی سبزیاں، پھل ان کی ڈکشنری میں موجود نہ تھے۔ اپنی خواہشات اپنے نفس کے اندر بند رکھنے پر قادر تھے۔ نیا خوبصورت لباس عید بقرعید پر پہنتے۔ پھر وہی بے رنگ دھلے ہوئے کپڑے ان کے تن پر ہوتے۔ جھاڑو ہوتا۔ لان کی گھاس ہوتی۔ سائیکل ہوتا اور بازاروں کے سودے۔

جون کے مہینے میں وہ لان میں لگے انار کے درخت تلے گھاس پر نماز پڑھتے نظر آتے۔ رمضان کا مہینہ آنے والا تھا۔ جب ایک روز شہاب صاحب نے خاں صاحب سے کہا۔ ''اشفاق یار! تم اس مہینے رمضان بھائی سے قرآن سنو۔ کچن کا دھندا چلایا کرو۔ اس سے زیادہ حلال کی پاک کمائی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔''

حلال کی کمائی کھانے والے سامبا کے قیمے پر اعتراض کر رہے تھے اور میں مجوب سی سوچ رہی تھی۔ انہیں

کو تیتر میں بھی روزی دیتا ہے۔اگر......اگر سامبا کو روز ایک کلو قیمہ کھانے کو دلوا رہا ہے تو یہ اس کی حکمت ہے۔غالباً یہ اس وقت ہوگا جب میں اپنے لیے روز یہ قیمہ بھون کر کھاؤں اور ڈنکے کی چوٹ اسے اپنا حق سمجھوں۔ میں اسے کو رمضان بھائی کی طرح سمجھ نہیں سکتی۔ وہ سارے کے سارے ایک اور طرح کے آدمی تھے۔ میں ساری کی کبھی تیتر اور کبھی بٹیر اس لیے جلد ہی میں نے اُن کی بات بھلا دی۔

کچھ لوگ مذہب، مسلک، مقولے، سب اپنے آرام، سہولت اور آسانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جونہی کسی عمل کا جواز پیش کرنا ہو ان کے پاس بڑی ٹھوس، من چاہی دلیل ہوتی ہے۔ میرا اشمار ایسے ہی مطلبی خدا پرستوں میں ہے۔ اس لیے رمضان بھائی کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

سامبا رات کے وقت غائب ہو جاتا۔ مجھے تو کچھ ایسا فرق نہ پڑتا کیونکہ ان دنوں گھروں کے دروازے رات کو بند کرنے کا رواج نہ تھا۔ سامبا صاحب صبح کے وقت گھوم پھر کر آ جاتے اور کسی کرسی صوفے پر گھوک سو رہتے۔

ایک روز جب ہم ناشتے کی میز پر تھے تو حسبِ معمول سامبا نے چھلانگ لگائی اور خاں صاحب کی گود میں ہو گیا۔ اُس کے تن پر اتنے خوبصورت بال تھے کہ پتہ نہ چلا کہ سامبا کا تو سارا پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ خاں صاحب کی جھولی لہو آلود ہو گئی۔ اس تکلیف کے باوجود سامبا نے محبت میں آ کر خر خر کرنا نہ چھوڑا۔

''اس کا کیا کریں؟ دیکھو تو سہی کیا ڈوئل لڑ کر آیا ہے کسی رقیب کے ساتھ۔'' خاں صاحب بولے۔

''آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، ٹانکے لگیں گے چھ سات ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔''

خاں صاحب خود ڈنگر ڈاکٹر محمد خاں کے بیٹے تھے اور جانتے تھے کہ جانوروں کو بھی ایسی حالت میں محبت کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے چہرے پر تھوڑا سا ملال آ گیا۔ ''لیکن ڈاکٹر تو ہے نہیں آج کل۔''

''کیا مطلب؟''

''تین دن ہوئے ڈنگر ڈاکٹر مجھے فاروقی کی دکان پر ملا تھا۔ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اب کیا کریں؟''

قیام پاکستان کے وقت ایک مہاجر کو ہمارے گھر کے سامنے کرپان لگی تھی۔ نانا اس زخمی کو گھر کے اندر لے آئی تھیں۔ انہوں نے سادہ فسٹ ایڈ کی تھی۔ کچھ دن کے بعد وہ چل کر پٹن چلا گیا تھا۔ ابھی کچھ دن ہوئے وہی آدمی مجھے انارکلی میں ملا اور کہنے لگا ''بی بی جی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میری مرہم پٹی کی تھی آپ نے، گرداسپور میں۔''

''خاں صاحب! آپ کہیں تو میں سامبا کا علاج کروں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''لیکن یہ وحشی تمہیں ہاتھ لگانے دے گا؟ دیکھو ناں ساری انتڑیاں نظر آ رہی ہیں۔''

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ خاں صاحب کی گود میں سے میرے پاس آ جائے گا لیکن باقاعدگی سے قیمہ کھلانے کی عادت اس وقت کام آئی۔ میں نے سامبا کو اٹھایا تو اس نے خاں صاحب کا ہاتھ چاٹا لیکن مزاحمت نہیں کی۔ اسے اٹھا کر غسل خانے کے کمرے میں لے گئی۔ پہلے گرم پانی میں تھوڑا سا ڈیٹول ملا کر سارے زخم کو دھویا۔ عجب بات ہے کہ میں نے اس کو میز پر رکھا۔ خون دھویا لیکن اس نے ایک بار بھی اعتراض نہ کیا۔ پھر انیق خاں نے دوائی کے پھاہے تیار کیے۔ اور اسے مورل سپورٹ جاری رکھی۔

میں نے تین چار انچ لمبے زخم پر پٹی باندھی اور تعجب اس بات پر کہ نہ وہ کسمایا، نہ غرایا نہ کسی قسم کا ڈ...
پٹی بندھ گئی تو وہ آرام سے انیق خاں کے پلنگ پر چڑھ کر سو گیا۔ اس طرح کچھ دن پٹیاں بدلنے کے بعد ایک...
سارا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ محسوس بھی نہ ہوتا کہ کسی بلے نے اپنے دانتوں سے چیر پھاڑ کی ہوگی۔ مشکل یہ آن پڑی...
ساما صاحب تندرست ہوئے اُدھر انہوں نے رات کی آوارہ گردی جاری کر دی۔ اب خاں صاحب کا چہرہ متفکر...
ایک دن پریشان باپ کی طرح صبح ناشتے کی میز پر بولے۔ ''رات یہ پھر غائب تھا۔''

''یہ راتوں کو جاگنے والا ہے۔ آوارہ گرد ہے، اسے گھر پر کیسے قید کریں؟''

''اس کا علاج شادی ہے۔''

''شادی۔''

''جب کسی کو قید کرنا ہو، اسے آوارگی سے بچانا ہو تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ انسان کی ضرورت...
ہو جائے تو وہ آوارگی سے بچ جاتا ہے۔''

شادی کا فلسفہ جانوروں پر لاگو ہوتے میں نے پہلی بار سنا۔

''آپ کا مطلب ہے.....''

''اس کے لیے بلی تلاش کریں۔ اس کی نسل کی نہ ملے تو جنگلی سہی۔ زیادہ دیر نہ کریں۔ غصہ ور...
بھولا ہے۔ پھر کسی دن چیر پھاڑ کرا کے آ جائے گا۔''

خواہشات میں عجب قسم کی کھینچ ہوتی ہے۔ اگر کبھی کسی کے لیے بے غرض و غایت معصوم اور اچھی خو...
جائے تو نہ جانے وہ کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ ابھی خاں صاحب لڑکی تلاش کرنے نکلے بھی نہ تھے کہ ایک دن...
گھر کی دیوار پر ایک سیامی بلی بیٹھی نظر آئی۔ سر ظفر اللہ خاں کی بیٹی مسز اولیس ہمارے ہمسائے میں رہتی تھیں...
ہمارے گھر کی دیوار سانجھی تھی۔

چھوٹی سی بلی اسی دیوار پر بیٹھی آنکھیں موندے دھوپ سینک رہی تھی۔ خاں صاحب نے بڑی پریت...
بڑھایا تو وہ بلا چوں و چرا اُن کے ساتھ آ گئی۔ ساما کے ساتھ کٹوری میں قیمہ ڈال کر دیا تو دونوں یوں کھانے لگے گویا...
کا ساتھ ہو۔

نہ جانے یہ آوارہ بلی تھی کہ خاں صاحب کی خواہش مجسم ہو گئی تھی لیکن بلی کا مل جانا معجزے سے کم نہ تھا...
اعتبار سے سیامی، دبلی پتلی، نیلی آنکھیں، بادامی بال اور سیاہ کان۔ کچھ حصہ کالا سیاہ بھی تھا۔ غالباً اسی کی رعایت سے...
صاحب نے اس کا نام نیرا رکھ دیا۔ اب گھر میں بڑی رونق تھی۔ ساما صاحب کی بڑی شو ہو گئی۔ جہاں جاتا پھیلا ہو...
کر چلتا۔ پہلے جگہ سونگھتا، دیکھتا اور پھر نیرا کو وہاں بیٹھنے، لیٹنے، سونے کی اجازت دیتا۔

وہ بھی ایسی کام چور، جاہل آرام طلب تھی کہ جب تک ساما اس کے قیمے کو چیک کر کے پاؤں سے ٹھوکر...
اُس کی طرف نہ بڑھاتا، مہارانی جی قیمے کو منہ نہ لگاتی۔ کالجوں سے واپسی پر بچے ان دونوں میں مشغول ہو جاتے...
اب راتوں کو آوارہ گردی کے لیے نہ نکلتا اور دونوں برآمدے میں کھیلتے کودتے ہنسی خوشی رہنے کے عادی ہو گئے۔

پھر نیرا خانم نے اٹھلا کر چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ پہروں بیٹھی اپنے ناخن چاٹتی رہتی۔ چلتی تو اتراتی ہوئی۔ ...جگہیں اب اسے پسند نہ تھیں۔ وہ اپنے آپ کو ساما سے کچھ کچھ بہتر سمجھنے لگی تھی۔ ایسے میں اُس کا قیمہ بھی بڑھا دیا ...سے ہر کمرہ میں زچہ بچہ کی جگہ تلاش کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

پھر عجب سی بات ہے کہ نیرا سارے گھر میں ڈھونڈتی رہی۔ ہر کونے کھدرے میں اس نے آنے والے سیامی ...آمدید کہنے کے لیے کنسویاں لیں۔ اوپر لائبریری سے لے کر باورچی خانے تک سب طرف ڈھنڈیا ڈالی لیکن ...ے غسل خانے کے ساتھ والے ڈریسنگ روم میں میرے کپڑوں والی الماری کو چن لیا۔

یہ الماری بیڈ روم اور ڈریسنگ روم کے درمیان کھلنے والے دروازے کے پیچھے ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ ...میں یہی ایک دروازہ ہے جس کے پیچھے کسی الماری کا پٹ بھی کھلتا ہے۔ یوں سمجھیے اگر کوئی شخص الماری کھولے ...بیڈ روم کا دروازہ کھول کر کوئی دوسرا اندر آنا چاہے تو دروازہ الماری کھولنے والے کو زور سے لگ بھی سکتا ہے۔

گھر والے تو بھی دستک دے کر اندر آتے لیکن بلی صاحبہ نے اس بے آرامی کا خیال نہ کیا اور الماری میں اس ...یے کہ شیلف میں کپڑے نکالنا بھی مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے روئی کے بادامی گلابی بچا ہے۔ شلواروں ...تے۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

عجیب سی بات ہے کہ نیرا بھی قیمہ کھلانے والے کو پہچانتی تھی اور انسانوں کی طرح احسان فراموش نہ تھی۔ میں ...کھول کر دیکھتی، قیمہ کھلاتی، جگہ صاف کرتی تو نیرا کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر کوئی اجنبی بندہ ذرا سی آہٹ بھی ...بچا کر غرانے لگتی۔

...لے ہولے بچے بڑے ہو گئے تو انہیں نیرا برآمدے میں لے آئی لیکن ساما بچوں سے بے نیاز تھا۔ نہ کبھی ...ے ان سے کھیلتے دیکھا نہ کبھی وہ ان کے ساتھ ہی چلا۔ اب یہ ببر شیر بس اتنی نگرانی کرتا کہ جدھر بچے کھیلتے اُدھر کمر ...کر بیٹھا رہتا۔ ذرا کوئی قریب سے گزرتا تو اس کے پنجے نکل آتے اور ماتھے پر غصہ آمیز شکن پڑ جاتی۔

نیرا کے بچے بڑے ہی خوبصورت، کھلنڈرے اور تماش بین قسم کے تھے۔ ذرا سا اخبار کا ٹکڑا، روئی کا گولا، ...کوئی گری پڑی چیز مل جاتی تو چاروں سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ کھیل تماشے میں مشغول ہو ...مدے میں میز پر فون پڑا رہتا۔ اس کی تار اوپر جاتی تھی۔ اس پر چڑھنا، لڑھکنا اور گر کر دوبارہ چڑھنا ان کا ...

اب ان بچوں کے دان دکشنا کی باری آئی۔ آہستہ آہستہ ان کو ہم ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگے۔ ایک بچہ چھوٹی ...گیا۔ ایک فہیم اچھی لے گیا۔ دو بچے اینق خاں نے کسی دوست کو دلوا دیے۔ نیرا کمروں میں ان کو تلاش کرتی رہی ...میں موت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اور جیتی جان کی بے وفائی برداشت کرنے کا عجب ملکہ ہوتا ہے۔

وہ بہت جلد جدائی کو زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ نیرا اور ساما نے بھی جانے والوں کی تلاش میں کچھ ...پھر راضی برضا ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد نیرا نے ایک بار پھر بچے دیے۔ ان تین بچوں کو ٹھکانے لگانے ...ہم دل میں خوش تھے کہ ایک رات نیرا جہاں سے آئی تھی جس طرح آئی تھی ویسے ہی غائب ہو گئی۔

سامبا پھر اپنی تنہائی اور آوارہ گردی کی نذر ہو گیا۔

ایک صبح سامبا کو دیکھا کہ بے طور تے پر قے کیے جا رہا تھا۔ خاں صاحب اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ واپس آئے تو سامبا کی طبیعت پہلے سے بھی خراب تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور بار بار وہ غش کی حالت میں چلا جاتا تھا۔ اسے پریم سے لٹاتے ہوئے خاں صاحب بولے۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے اس نے کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے۔''

''کون سی زہریلی چیز؟''

''کوئی مری ہوئی چھپکلی، سانپ۔ پتہ نہیں کیا۔''

جس وقت انیق خاں کالج سے لوٹا، اس نے جلدی جلدی سامبا کو کچھ ہومیو پیتھک پڑیاں چٹائیں لیکن سامبا کھانے کی ہمت بھی نہ رکھتا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور جان آفریں کے سپرد اپنی جان کر دی۔ آخری لمحہ بھی وہ شیر صفت نہ بیزار ہوا نہ بلبلایا۔ موت اسے ساتھ تو لے گئی لیکن پسپا نہ کر سکی۔

انیق خاں نے گیٹ کے ساتھ ہی جہاں بعد میں پوسٹ کے لیے لال ڈبہ لگایا گیا، عین اس کے نیچے گڑھا کھودا۔ بچوں نے اسے سفید کپڑے میں لپیٹا اور قبر میں ڈال دیا۔ کئی دن اس کی قبر پر پھول نظر آتے رہے۔ جب کوئی گھر سے نکلتا یا واپس آتا اس کا چہرہ اُدھر ضرور ہو جاتا۔

سامبا کے جانے کے بعد خاں صاحب نے بھی گویا جانور پالنے سے توبہ کر لی تھی۔ شہری زندگی میں جانور بوجھل بھی تھے اور تکلیف دہ بھی۔

کوئی بھی جانوروں کو وقت نہ دے سکتا ہے۔ کوالٹی ٹائم سے کسی جاندار کا دل نہیں بھرتا۔ سورج کی روشنی درکار ہوتی ہے۔ محبت کی مسلسل یقین دہانی کے بغیر سانس رُکنے لگتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں کتا ریوڑ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ چرواہا بھی قریب ہی دونوں کی نگرانی کرتا ہے۔ سورج کی روشنی ملتی رہتی ہے نہ کتے کی طرف سے اور نہ چرواہے کی جانب سے اقرار کیا جاتا۔

اب چونکہ زندگی نے فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ وقت اہم ہو گیا ہے۔ اس لیے کوالٹی ٹائم بھی اہم ہو گیا ہے۔ جانور کو سیر پر لے جانا اسے پیار کرنا ضروری ہے۔ سارا دن کا ترساترسایا زیادہ مانگتا ہے۔ دوسری طرف انسان کو سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اظہار ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ خوشی کے بجائے ذمہ داری کی پھانسی لگ جاتی ہے۔

صنعتی انقلاب سے پہلے ماں آنگن کی زینت تھی۔ وہیں دہی بلوئی جاتی، چارہ کاٹنے والی مشین ہوتی، روٹیاں پکتیں، بچے آنگن میں کبھی مرغیوں کے پیچھے کبھی بلیوں کے ساتھ کھیلتے۔ پلٹ پلٹ کر ماں کو دیکھ لیتے۔ شانت ہو کر پھر کھیلنے لگتے۔ ماں کی مثال دائی کی سی تھی جسے چھونے کے بعد کوئی چور نہ بنتا۔ دائی ہر وقت نگاہ میں تھی۔ گر گئے تو ماں سے لگ کر تسلی حاصل کر لی۔ بھوک لگی کٹوری میں مکھن، سالن، دہی جو میسر آیا ڈلوا کر باسی روٹی کے ساتھ کھا لیا۔ خیر سلاّ۔

کوئی Privacy نہیں، کوئی ذاتی ملکیت کا تصور نہیں۔ گرمیوں میں قطار در قطار چارپائیاں بچھی ہیں۔ بچے اکٹھے سو رہے ہیں۔ سکیورٹی اور خوشی بغیر پوچھے مانگے ملتی ہے۔

شاید خاں صاحب نے محسوس کرلیا تھا کہ ان کے پاس پالتو جانوروں کے لیے نہ وقت ہے نہ استقامت، نہ
لیکن پھر ایک واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت سردیوں کے دن تھے۔ ہم دونوں نے ایک ایک کمبل کا گاؤن سلوالیا
ے ڈریسنگ گاؤن کا رنگ کیسری مائل تھا۔ خاں صاحب کا گاؤن چوکلیٹ اور بادامی ٹکڑیوں کے تانے بانے
ے تھا۔

ہم دونوں اپنا اپنا ڈریسنگ گاؤن چڑھا کر کمر میں Tassle والی ڈوری باندھ کر سیر کو جایا کرتے۔ عجیب لطف تھا
خیال نہ آیا کہ یہ لباس موزوں نہیں۔ ابھی لباس اور کھانے میں مڈل کلاس کے لوگ آزاد تھے۔ وہ کسی کو مرعوب
کرنے اور حسد دلانے کے لیے لباس کا استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک روز ہم سیر سے لوٹے تو ہمیں باہر انیس متفکر
لیکن پھر چپ چاپ لوٹ گیا۔

ان دنوں اثیر بیٹا پانچویں جماعت میں تھا۔ اسے بخار وقتاً فوقتاً گھیر لیتا۔ یہ بخار کبھی کبھی 106 ڈگری تک پہنچ
پٹیاں سارے بدن پر رکھنی پڑتیں۔ ہماری تشویش تو ایک عرصہ پہلے 75۔جی میں ہی شروع ہوگئی تھی لیکن ابھی
نہ ہو پائی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طوسی، پارسی ڈاکٹر جن کا کلینک نکلسن روڈ پر تھا اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر اختر
بطہ کیا گیا۔

ایسی ہی ایک رات جب ہم پیاری فوکسی میں گھر لوٹ رہے تھے تو انیس اور اثیر ہمارے ساتھ تھے۔

کچھ دیر بعد انیس بولے ''ابو...... چیری کو تو پھر تیز بخار ہے۔''

''آپ کے سامنے ڈاکٹر کو دکھا کر لارہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے اس فوکسی کی خوشی نہیں ہوتی ابو۔ یہ کسی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔''

سب خاموشی سے اتر گئے لیکن مجھے علم ہے کہ انیس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔

''داستان سرائے'' میں جب اثیر پانچویں میں تھا تو کچھ ٹسٹ کروانے کے بعد بعد پتہ چلا کہ اثیر بیٹے کے جگر
Abcess ہے۔ خوف یہ تھا کہ اگر اس کا آپریشن نہ کرایا گیا تو کہیں یہ کینسر میں بدل کر لاعلاج نہ ہو جائے۔

مقررہ وقت پر ہم دونوں اثیر کو لے کر میو ہسپتال پہنچے۔ اس آپریشن کے دوران ڈیڈی جی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر
طارق افتخار نے ہماری بہت مدد کی۔ اثیر کو آپریشن سے پہلے باہر گیلری میں سسٹر نے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ میں تھوڑی
باختہ تھی۔ میں نے بے ہوش اثیر بیٹے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔

اتنے میں وارڈ قلی باہر نکلے اور اثیر خاں کو تھیٹر میں لے گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔
کے بعد (طارق) لکو نکلا، اس نے چچا سے کہا۔ ''چا چا جی! یہ کوٹ پہن لیں اور اندر چلے آئیں۔'' ہم دونوں ڈاکٹروں
پ بھر کر اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے ہمیں مبارکباد دی۔ Abcess کو سرنج سے خالی کر دیا گیا تھا۔
سے ہم خوشی خوشی فارغ ہو کر گھر آئے لیکن بخار کو ساتھ لائے۔

پتہ نہیں Abcess کے کچھ اثرات باقی تھے کہ اس کے لہو میں ایسا کوئی مادہ تھا جو ایسا مواد بناتا تھا جو اس ساری
کا باعث تھا۔ بہر کیف میں نے تو اپنی زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ جب اللہ کو انسان کی مدد کرنا مقصود ہوتی ہے تو امداد

غیبی معجزے کی شکل میں آتی ہے۔ ایک روز دن چڑھے مجھے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر احمد خاں آئے ہیں۔ یہ وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو ملتان میں سرکاری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور جنہوں نے میری والدہ کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کیا تھا۔ میں باہر گئی۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے سے نیچے کھڑے تھے۔

''اندر آجایئے ڈاکٹر صاحب۔''

''نہیں بیٹا۔ میرا کلینک کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ گھر پر کون بیمار ہے؟''

میں نے اثیر کے متعلق تفصیل سے بات کی۔

''رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھے بتا رہا ہے کہ قدسیہ کے گھر میں خیر نہیں، تم علاج کرو۔''

''کل تم اثیر کو لے کر کلینک آجانا۔ میں مشین میں اس کا تھوک لگا کر دیکھوں گا اور پھر دوائی بھی درست ہو جائے گی۔''

ہم بچے کو لے کر موہنی روڈ ڈاکٹر صاحب کے کلینک پہنچے۔ وہ گویا منتظر بیٹھے تھے۔ ہمیں ذرا انتظار نہ کرنا پڑا۔ اپنے دفتر میں لے گئے۔

میں نے ایسی کوئی ہومیو پیتھک مشین یا ٹیسٹ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اس پر گول دائرے میں دوائیوں کے نام لکھے تھے۔ مریض کا لعاب مشین پر رکھ کر اسے آن کر دیا جاتا۔ جلد ہی ایسے ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر احمد خاں نے کہا۔ ''قدسیہ بگڑا ہوا ملیریا ہے جس سے جگر متاثر ہو گیا ہے۔ چا تا دینا پڑے گا اور وہ بھی باقاعدگی سے۔''

علاج شروع ہو گیا۔ بخار ٹوٹ گیا لیکن اثیر ایک اور مشکل میں پھنس گیا۔ اس کے پرچے اچھے نہ ہوئے اور وہ پانچویں جماعت میں رہ گیا۔ اسے اپنی بیماری سے زیادہ فیل ہو جانے کا رنج تھا۔ اس کے بعد اس کا سکول تبدیل کیا گیا۔ اسے چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا لیکن پڑھائی میں کمزوری کا دھچکا اس کے ساتھ رہا۔

خاں صاحب کو ریلجس بک سوسائٹی کے سامنے کتابیں بیچنے والے نے ایک ٹوٹکا بتایا...... ''خاں صاحب کبھی کوئی آپ کے گھر میں بیمار پڑ جائے تو کچھ سرخے خرید کر کچھ دن پنجرے میں رکھ کر اڑا دیں۔ جب گھر کے کسی فرد کو سرخ پسند آجائیں تو پھر یہ سرخے آزاد کر دیں۔''

اس روز خاں صاحب نے کتابیں نہ خریدیں بلکہ سرخے خرید کر گھر آگئے۔ پرندوں سے گہرے تعلق کو ایک راستہ مل گیا۔ سرخے پالنے اور پھر ان کو راہِ فرار دکھاتے وقت سب سے زیادہ رنج اشفاق صاحب کو ہوتا۔ خاں صاحب نے اپنی ایک تحریر انیس کے بیٹے بلال کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس میں سرخوں سے متعلق ان کے جذبات کا ذکر ہے۔

خاں صاحب کی باتوں سے متاثر ہو کر ثویلہ نے بھی ایک سُرخا پال لیا لیکن اس سے بلال خاں کچھ ایسا مانوس ہو گیا کہ اسے چھوڑنے کی جرأت ماں باپ نہ کر سکے۔ اس واردات کو خاں صاحب کی تحریر میں پڑھیے۔

سُرخا

زندگی کا مزاج بھی بڑا شاہی مزاج ہے۔ آپ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ نہ ...

کے بارے میں یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دشنام ملے گی یا خلعت عطا ہوگی۔ رکنے کا عمل ہوگا یا چلنے کا۔ دکھ ہوگا یا

اصل میں زندگی اتنی بڑی ہے کہ اس کے سامنے رُخ رجحان، عمل نقل، ارادے تجویزیں اس کی ذیل میں آجاتی ہیں کی اندی ہوئی لہران سب کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ یہ واقعہ کوئی ایسا غیر معمولی نہیں اور نہ اس کا زندگی کے سے کوئی گہرا تعلق ہے لیکن چونکہ اس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے اس لیے میں یہ آپ کو سنانے پر مجبور ہوگیا

یہ بات ہے تو بلال کی لیکن اس کا پورے انسان سے تعلق ہے۔ مجھ سے، آپ سے، بلال کے والد سے، اس کی اس کے ارد گرد بسنے والے سارے انسانوں سے۔

بلال میرے منجھلے بیٹے کا بیٹا ہے اور اس نے حال ہی میں سکول جانا شروع کیا ہے۔ چونکہ سکول میں کے یہ ابتدائی ایام ہیں اور بلال ابھی تک حصول علم پر ٹھیک سے نہیں لگا۔ اس لیے ہمیں اسے طرح طرح کی ترغیبیں دے کر سکول بھیجنا پڑتا ہے۔ سب سے اچھی ترغیب اس کی والدہ کی فراہم کردہ ہے جو محراب میں پنجرے کے اندر محفوظ پیتل کے کنڈے سے لٹک رہی ہے۔ یہ ایک سُرخا ہے جو باجرے اور چھوٹے چھوٹے کوزوں کے درمیان پھدکتا رہتا ہے اور صبح سویرے بیدار گھر والوں کو اپنی چہکار بھی سناتا

بلال کا کام صبح سویرے اٹھ کر اس پنجرے میں انگلی ڈال کر لال کو ہیلو کہنا ہے۔ پھر آدھے کپڑے بدل کر اس سامنے کھڑے ہو کر سیٹی بجانا اور پھر بھاگ کر باقی کے کپڑے پہننا اور آخر میں سکول جاتے ہوئے سُرخے کو مبارکی سنا کر جانا ہے۔ واپسی پر گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کے بھاگ کے سُرخے کے پنجرے کے پاس جانا۔ تیں کرنا۔ اس کے احوال پوچھنا اور اپنا لنچ اٹھا کر اس کے پاس آ کر کھانا اور کوزوں میں چپس اور برگر کے ٹکڑے بھی شامل ہے۔ بلال جب تک گھر پر ہوتا ہے اس کا سارا وقت سُرخے کے پاس گزرتا ہے اور جب نہیں ہوتا تو یاد میں گزرتا ہے۔ جہاں جہاں اس کی ماں اسے ساتھ لے جاتی ہے اور جس جس گھر میں بلال پہنچتا ہے، وہاں مرتبہ فون کر کے اپنے سُرخے کی عافیت ضرور معلوم کرتا ہے اور فون سننے والے کو سُرخے کے بارے میں ہدایات

تا ہے۔

ایک روز جب وہ سکول سے آیا تو اس کا سُرخا اپنے پنجرے میں کمر کے بل لیٹا تھا۔ دونوں ٹانگیں آسمان کی ہوئی تھیں اور دونوں پر ادھڑے ہوئے چیتھڑوں کی طرح پنجرے کے فرش سے چپٹے تھے۔ بلال نے رو رو کر آسمان لیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو چپ کرانے کی اہل نہ تھی۔ گھر کے سب لوگ اپنی اپنی طرز کا زور لگا رہے تھے لیکن ور نہیں ہوتا تھا اور اس کی فریاد تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔

میں نے پہلے اسے اپنے ساتھ لپٹایا، پھر گود میں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ماحول کی تبدیلی سے فائدہ تے ہوئے میں نے یقین آمیز لہجے میں کہا ''دیکھو بلال! اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ سُرخا تمہارا مر گیا۔ اس کا ہم سب کو

افسوس ہے لیکن چلے جانے والے کے لیے یوں تو جان ہلکان نہیں کیا کرتے۔ اللہ نے صبر کا بھی تو حکم دیا ہے اور ہم کو حکم ہر حال میں اور ہر رنگ میں تسلیم کرنا ہے۔''

بلال غور سے میرے چہرے کو دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔''اب ہم یوں کریں گے کہ تمہارے اس سرخے کا جنازہ تیار کریں گے اور اسے دھوم دھام سے دفن کریں گے۔''

وہ میری بات اور غور سے سننے لگا تو میں نے کہا''میرے پاس ایک چھوٹا سا ریشم کا رومال ہے جس کے کونے نرگس کا پھول بنا ہوا ہے۔ ہم سُرخے کو اس ریشمی کفن میں لپیٹیں گے اور تمہاری امی سے سینٹ کا وہ خوبصورت ڈبہ لیں گے جو اس کی سنگار میز پر رکھا ہے۔ اس کو ہم سُرخے کا تابوت بنائیں گے۔ اس کے بعد گھر کے سارے لوگ اور تمہارے سارے دوست اور سارے ملازم بڑی دھوم دھام سے یہ جنازہ لے کر سامنے باغ میں جائیں گے۔ وہاں ہم نیم کے تلے اس کی قبر بنائیں گے اور سرخے کو دفن کرنے سے پہلے ہم سب مل کر اس کا مرثیہ پڑھیں گے۔ پھر تم لوگ اس کی تعریف میں تقریریں کرو گے اور ہم بگل بجا کر اس کا تابوت قبر میں اتاریں گے۔''

بلال نے کہا''دادا ابا! ہم اس کو نیم کے پیڑ تلے دفن نہیں کریں گے۔ سمبل کے درخت نیچے کریں گے۔ وہ درخت زیادہ خوبصورت ہے اور بہت بڑا ہے۔''

میں نے کہا''بالکل ٹھیک ہے، سمبل کا درخت بہتر رہے گا اور جب ہم اسے دفن کر کے گھر جائیں گے تو ساتھ ہی اس کا سوئم کریں گے۔''

بلال نے میری بات کاٹ کر کہا''سوئم اسی دن تھوڑی ہوتا ہے دادا ابا۔ وہ تو تیسرے روز ہوتا ہے۔''

میں نے کہا''ہم اس کا سوئم اسی روز اور اسی وقت کریں گے کیونکہ تمہارے دوست روز روز کیسے آئیں گے۔''

بلال نے خوش ہو کر کہا''بالکل ٹھیک ہے۔''

پھر میں نے کہا''سُرخے کے سوئم پر میں تمہارے دوستوں کے لیے آئس کریم اور پیسٹری منگواؤں گا۔''

بلال نے بات کاٹ کر کہا''اور برگر بھی دادا ابا۔''

میں نے کہا''کیوں نہیں برگر بھی۔''

بلال نے کہا''میرے لیے پائن ایپل جوس اور میرے دوستوں کے لیے مینگو جوس۔''

میں نے کہا''بالکل ٹھیک ہے۔''

''اور شام کو ہم میوزیکل چیئرز بھی کھیلیں گے۔''

میں نے کہا''بالکل ٹھیک ہے اور جب ہم سوئم سے فارغ ہو جائیں گے تو میں تم سب کو اپنے ڈبے میں ڈال کر جوائے لینڈ لے جاؤں گا۔''

بلال نے جوش میں آ کر تالی بجائی۔ صوفے سے اٹھ کر تین چار مرتبہ قالین پر ابھرا اور میرا ہاتھ کھینچنے لگا۔

میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے برآمدے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور مجھے مالی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں بھاگ کر برآمدے میں گئے تو ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پنجرے کے اندر ہمارا پیارا سُرخا خاموش کی

...عف پھنس گئے تھے۔ سائنسی اور عقلی نکتہ نظر لے کر ڈیرے پر آئے تھے۔ قلبی اور وجدانی علم نافع کی نذر ہو ...ے یہ عرصہ قول سے وابستہ سننے کے مقام پر رہے۔ پھر ماننے کی صورتحال پیدا ہوئی۔ بابا جی نوروالے فرمایا کرتے ...ں صاحب! یہ ہمارے ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے بگڑے دل کے آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے مانے ہیں۔''
...جی کی صحبت ان کے قول سے فعل تک مطابقت ایک مدت بعد ڈاکٹر فاضلی میں پیدا ہوئی۔ اسی میل جول نے ...ے چلے جانے کے بعد ''تفسیر فاضلی'' کا روپ دھار لیا۔ مجھے فقط اتنی بات اس قیام میں سمجھ میں آئی کہ کسی نہ ...ت پہلے ملتی ہے، کسب بعد میں ہاتھ لگتا ہے۔ ہر ڈاکٹر ایک مدت پڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر مریضوں تک اس کی ...ق ...ہے۔

...ر، لوہار، کسان، صنعت و حرفت کے تمام شعبے، فنونِ لطیفہ کے سارے امکانات کبھی اعلانیہ، کبھی گپ چپ، ...ی نظرِ غائر سے دیر تک زیرِ تربیت رہتے ہیں۔ پھر ان کی پریکٹس شروع ہوتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی حکمت ...ی رنگا رنگی کو مختلف طبقوں، تربیتوں اور جبلتوں سے تشکیل دیتا رہتا ہے۔ خاں صاحب کو بھی علم نہ ہو سکا ...ے ڈیرے سے ہو کر واصف علی واصف، یحییٰ رازی اور کئی دوسرے بابے انہیں زاویے کے لیے تیار کرتے ...ے مشاہدے نے کہانیوں کا سٹور ہاؤس، Anecdotes کی انتھالوجی، واقعاتی مواد Archives کی شکل ...در محفوظ تھا لیکن انہیں علم نافع بنانے کا سارا علم اور تربیت انہیں بابوں سے ہی نصیب ہوئی۔ تربیت، عادت ...نے میں ایک مدت لگتی ہے۔

...خاں صاحب کی اس وقت کی حالت کا بیان ہے جب ابتدائی دور پنڈولم کا سفر تھا۔ کبھی خاں صاحب شانت ...یب قسم کے تذبذب میں چلے جاتے جیسے وہ ہر وقت موجود اور ناموجود کے درمیان رہتے۔ کبھی انہیں شبہ ...ے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ خواب ہے۔ وہ جاگیں گے تو شعوری زندگی پھر بامعنی ہو جائے گی۔ کبھی سوچتے ...صل ہو چکے ہیں۔ ان دنوں اردو سائنس بورڈ میں بہت کام ہو رہا تھا۔ دھڑادھڑ کتابیں ترجمہ، تالیف اور ...ی تھیں۔

...کا دفتر، فائلیں، میٹنگیں، دفتر سے لانے لے جانے والی کار کے پھیرے، کار کا دروازہ کھولنے والے ...ے، پھر پورچ سے دفتر کی کرسی تک پہنچانے والے افسر کی اہمیت جگانے والے کلرک، سیکرٹری، سپرنٹنڈنٹ، ...نے والی نفری، دفتری کائنات کے چھوٹے بڑے پرزے بے وقعت نہیں تھے۔ یہ سارے ایک بڑی مشینری ...ے تھے۔

...س ساری مشغولیت میں خاں صاحب کا اپنا وجود، ان کا انداز نشست و برخاست، بھاگم دوڑ، چھوٹی چھوٹی ...ند تنگیاں، تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی تگ و دو۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ اندر کی بات بتانے کے قائل نہ تھے۔ ...ی عاجزی، ناراضگی، حیرانگی، بددلی، بے دلی انہوں نے دل کے لاکر میں بند کر رکھی تھی۔ دفتری تگ و دو اور اس ...ے کے پھیرے میرے خیال میں واضح طور پر ان کے لیے انجائنا کا اسباب پیدا کر رہے تھے۔ مجھے فکر رہنے لگی ...ے چہرے پر کسی بیماری کی چھاپ بھی واضح تھی۔

دراصل ڈیرے سے میری وابستگی عفت کی وجہ سے ہوئی۔

شہاب صاحب کا خاں صاحب سے ملنا جلنا میری شادی سے پہلے کا تھا۔ سن پچاس سے پہلے ہی شہاب 1۔مزنگ روڈ میں آیا کرتے تھے۔ وہ مفتی جی کی طرح خاں صاحب کے پاس تو نہ ٹھہرتے لیکن اس تاریخی چوبارے ان کا پھیرا ضرور ہوتا۔ یہاں جدت پسند، شتو جی نے مٹی کے مٹکے میں پیتل کی ٹونٹی فٹ کر رکھی تھی اور اسی میں پانی کرتے تھے۔

شہاب صاحب اسی ٹونٹی کو کھول کر ہاتھ دھوتے، کافی کے رسیا خاں صاحب کیولیٹر میں کافی بناتے۔ دوست مزے سے فرش پر بچھی چٹائی یا فرشی بستر پر بیٹھ جاتے اور کافی کی چسکیاں لگاتے۔ تکلفات دراصل تعلقات حجاب بن جاتے ہیں۔ جب درمیان میں یہ حجابات نہ ہوں تو کسی کی اصلیت تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں ایک دوسرے پر چڑھے پرت اتارنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ دونوں جلد سمجھ گئے کہ دونوں کے مزاج میں مماثلت ہے جس پر واضح طور پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔

خاں صاحب کو مفتی جی نیچے پہنچ کر آوازیں دیا کرتے تھے اور اپنی آمد کا ڈنکا بجا دیتے تھے۔ شہاب بھائی کبھی آواز دی نہ کسی کے ہاتھ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ کسی راہب کی طرح ہولے ہولے اوپر چڑھتے۔ اشفاق بھی نہ اٹھتے نہ سلام کا نعرہ لگاتے۔ دونوں طرف سے مدہم آوازوں میں سلام اور سلامتی کا پیغام پہنچتا۔ دونوں میں گفتگو جاری رہتی۔ پھر بلاتکلف شہاب بھائی اٹھ کر چلے جاتے۔ خاں صاحب بھی انہیں نیچے تک الوداع کہنے نہ شہاب صاحب نے کبھی ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ ان کے رویئے میں یہ دونوں باتیں پنہاں تھیں۔

1۔مزنگ روڈ کے اشفاقی چوبارے میں کوئی صوفہ کاؤچ نہیں تھا۔ پھر بھی ملنے والوں کی ریل پیل دیال سنگھ میں ان سے پڑھنے والے طالب علم، ساتھ پڑھانے والے پروفیسر جن میں جناب غلام علی خاص طور پر ہیں۔ ریڈیو سٹیشن کے آرٹسٹ، کافی ہاؤس کے ملاقاتی ادیب آتے رہتے۔

جب کوئی ملنے والا اپنی عینک، رومال یا چابیاں اوپر بھول جاتا تو نیچے پہنچ کر خاں صاحب کو آواز دیتا۔ خاں صاحب متعلقہ چیز لے کر نیچے نہ جاتے۔ کوٹھے سے چیز کو پھینک دیتے اور متعلقہ چیز مالک بڑی اچھی فیلڈنگ دیتے ہوئے کیچ کر لیتا۔

جب ہم 479۔ این شفٹ ہوئے تو ہمارے حساب سے یہ گھر کافی کھلا ڈلا تھا۔ اس میں مہمان رکھے جا سکتے تھے۔ شہاب آتے جاتے رہے لیکن طعام کے علاوہ انہوں نے کبھی قیام نہ کیا۔ اس گھر میں عفت کبھی کبھی ساتھ آتی لیکن وہ ان دنوں اپنی بڑی بہن جمیلہ اور کبھی اپنی چھوٹی بہن کشور حبیب کے پاس رہتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور حس کے بدولت انسانی مدافعت کی سرحدیں توڑنے کی عادی تھی۔

خاں صاحب کی طرح اس میں کھل جا سم سم قسم کا جادو تھا۔ وہ جلد ہی ملنے والے کو at ease کر دیتی۔ موڑھوں پر بیٹھ کر وہ ہمارے ساتھ باورچی خانے میں آلو کی پوریاں، تازہ تازہ پھلکے، سادہ سالن یوں کھاتی گویا ہو۔ جب صدر ایوب کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں شہاب صاحب کی جنرل یحییٰ خاں سے ان بن ہو گئی اور انہیں ایمبیسڈر

گیا۔ اسی لیے 75۔جی اور 36۔جی میں ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

جب 121۔سی میں ہمارا قیام ہوا تو شہاب صاحب واپس اسلام آباد آ چکے تھے۔ عموماً وہ داستان سرائے میں
تے اور کاسنی کمرے میں ہی ٹھہرتے۔ میری ان سے ملاقاتیں سرسری تھیں۔ ناشتے کی میز پر وہ شوق سے پراٹھے
تے۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ دفتر روانہ ہو جاتے۔

قدسیہ! میں اشفاق کے دفتر میں اوپر والے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھ لیتا ہوں۔ اخبار بھی توجہ سے پڑھی جاتی
در پوش اور اشفاق علی خاں سے ملاقات کا سبب بن جاتا ہے۔" کبھی کبھی عفت بھی ساتھ ہوتی لیکن ان دنوں
رے پاس نہ ٹھہرتی۔ وہ شہاب صاحب کے بڑے بھائی کی بیٹی ثریا شہاب کے گھر قیام کرتی۔

میں عفت اور شہاب صاحب کے اندرونی حالات سے واقف نہ تھی۔ عفت کب لندن میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر
کے پاس بیمار ہو کر پہنچی اور کب بیمار ہی اسلام آباد واپس آئی۔ مجھے اتنی خبر لگتی کہ عفت کے گردے جواب دے
ور ڈاکٹروں نے ٹامک ٹوئیاں مار کر کئی نتائج نکالے۔ کسی نے کہا دماغ کا کوئی Gland فنکشن نہیں کر رہا۔
کی ہڈی میں نقص نظر آیا۔

آخر آخر میں سپیشلسٹ کے ایک گروپ نے حتمی فیصلہ سنایا کہ سارا عذاب گُردوں کا ہے۔ انہوں نے کام کرنا
۔ ڈاکٹروں کے نزدیک یہ مرض لاعلاج تھا۔ ہفتے میں ایک دن اس کا Dialysis ہوتا تھا۔ اسے ہسپتال میں
۔ وہاں پانی کی بوتلیں اسی طرح لگائی جاتیں جیسے عام طور پر لہو کی بوتلیں لگتی ہیں۔ گردے دھوئے جاتے، یورک
دیا جاتا۔ ان آلائشوں کے نکل جانے کے بعد ہفتہ بھر شانتی رہتی۔ پھر وہی Dialysis وہی دھویا
ت کئی سالوں سے ڈاکٹروں کا چوہا بنی رہی جس پر تجربات کیے جاتے ہیں۔

ہر قسم کی بلڈ رپورٹ
ہر قسم کا ایکس رے
ہر طرح کی کیس ہسٹری

اور ان سب کے بعد ایک بڑا سا سوالیہ نشان..... ابہام کا دائرہ..... سائنس کی بیچارگی۔ انسان کا سائنسی علم اپنے
Precision کے باوجود کتنا محدود اور مجبور تھا۔ کچھ بھی حتمی نہ تھا۔ جو تھیوری آج جوان ہوتی..... نئے
کے ہاتھوں کچھ عرصہ بعد ٹوٹی ہوئی بیساکھی بن جاتی ہے۔ پہلے ماں کا دودھ چھڑا کر بچوں کو بوتل پر لگایا گیا۔ پھر
نے ثابت کیا کہ ماں کے دودھ میں کچھ ایسے اجزا ہوتے ہیں جن سے بچہ بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوبارہ بچے کو
سینے سے لگا کر دودھ پلانے کی تحریک جاری ہو گئی۔ انسان کیا مانے اور کہاں تک مانے؟

کیا خدا اور سائنس میں مقابلہ تھا کہ مفاہمت..... کیا یہ دونوں رقیب تھے کہ سجن؟ سائنس تو پھر نظر آتی تھی لیکن
خدا کو انسان کیسے مان لے؟

کیا ضعیف الاعتقادی جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں سے ایک نئے علم کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ جو
تے ہیں کس Frequency پر کون سی web-site پر انفرمیشن لیتے ہیں۔ اوپر والے بڑے کل کے علم میں کتنے

ان جانے جزو تھے جن تک ہماری رسائی ان ہی بابوں کے وسیلوں سے ممکن ہے یا ایسے تھے کہ بابے بھی روحانیت کے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے؟

ایک روز خاں صاحب شہاب بھائی کو ایئرپورٹ سے سیدھا ہمارے گھر لے آئے۔ عفت ہمیشہ خوش ملتی رہی تھی۔ اس بار بھی اس نے بہادری کا مظاہرہ کیا لیکن ڈیڑھ فٹ اونچے برآمدے تک وہ چڑھ نہ سکی۔ میں نے اٹھا کر برآمدے میں کھڑا کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی دس بارہ برس کی بچی کو اٹھا کر کھڑا کیا ہو۔ ان کا وزن بہت تھا۔ رنگ ہلدی مائل، ناک کا بانسہ ذرا سا ٹیڑھا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ''اے میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی قدسیہ کو باہر نکالا۔ ہم گلے ملیں لیکن اس کی جپھی میں زور نہ تھا، آواز میں ترانہ نہ گونجا تانانا توم توم بن کر کھنکتا رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس بار عفت بھی اپنے اندر گھس گئی۔

''میں اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی عفت۔ نہ جمیلہ کے پاس نہ کشور کے پاس۔ تمہاری بہنیں جائیں، مجھے پروا نہیں۔''

''اور اقبال شہاب کے پاس وہاں تو جانے دو گی ناں؟'' اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

''کبھی نہیں..... اور کہیں نہیں۔''

''عفت ہمارے پاس رہے گی قدسیہ۔ اسے بابا جی نور والوں کے پاس لے جانا ہے۔''

میں نے خاں صاحب کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے عفت کی بیماری کا سنجیدگی سے کوئی علم نہ تھا۔ صاحب نے وضاحت کی نہ خاں صاحب نے کوئی انفرمیشن فیڈ کی۔ شہاب صاحب دو چار دن کاسنی کمرے میں پھر اسلام آباد چلے گئے۔ عفت ہمارے پاس رہ گئی۔ وہ سارا دن کاسنی کمرے میں گزارتی لیکن جونہی بچے آجاتے کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی نوکی میاں کو کیمسٹری پڑھاتی، کبھی اا لے سے باتیں کرتی، کبھی چیری کو ساتھ لٹا لیتی۔

وہ میرے بیڈروم میں شاذ ہی آتی تھی۔ بس ہم دونوں برآمدے میں دھری مشین کے آس پاس باورچی میں، لان میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ اس نے کبھی اپنی بیماری کی تفصیلات، اپنی تکالیف کا کچا چٹھا بیان نہ کیا۔ اسی دوران خاں صاحب مجھے اور عفت کو بابا جی نور والے کے پاس لے گئے۔

جس روز ہمیں ڈیرے پاک پر جانا تھا خاں صاحب باورچی خانے میں تشریف لائے۔ گیارہ بجے کا دونوں بچے اپنی اپنی سائیکل پر سکول جا چکے تھے۔ گھر معمول کے مطابق پرسکون تھا۔ عفت پوری تیار خاں صاحب پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ خاں صاحب نے کہا۔ ''قدسیہ! اب کام جیونی رمضان پر چھوڑو، ہم ڈیرہ پاک جا رہے ہیں۔''

جب خاں صاحب عفت اور مجھے لے کر پہنچے تو اس وقت سدا سہاگنیں ڈیرے کے باورچی خانے کے ناچ رہی تھیں۔ یہ مرد حضرات کی ایسی ملامتی ٹولی تھی جو عورتوں کے لباس میں ملبوس بڑی بڑی نتھ ناک میں ڈالے نکالے اپنے روٹھے یار کو ناچ ناچ کر منانے میں مشغول تھیں۔ خاں صاحب کو اس وقت علم نہ تھا کہ عفت کا علاج کیسے ممکن ہوگا۔

اس کی Mechanics کیا ہوگی۔ علاج بالغذا کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح اس کے کوائف پہ...

بہت بعد میں عفت نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت سدا سہاگنوں کو ناچتے دیکھ کر ڈیرے کے علاج بالغذا سے مایوس ہو چکی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں وہ لوٹ نہ سکی اور اپنے آپ کو باباجی کے حوالے کر دیا۔

حسب معمول ڈیرے پر لوگوں کی بھیڑ سی تھی۔ چھوٹی سی پٹڑی پر لوگ آ جا رہے تھے۔ بائیں ہاتھ کچھ لوگ مٹی کے لوٹے لیے وضو کر رہے تھے۔ باباجی اپنے تخت پوش پر بیٹھے تھے۔ سہاگنوں کا طائفہ جو حضرت میاں میرؒ کے عرس پر ڈھول بجانے آیا تھا، وہاں سے باباجی کا سن کر ادھر آ نکلا۔

سب نے عورتوں جیسے رنگدار بھڑکیلے لباس پہن رکھے تھے۔ سر پر خوبصورت دوپٹے تھے۔ چہروں پر داڑھیاں تھیں۔ مردوں کے ناک بھی چھدے ہوئے تھے اور چھوٹی بڑی نتھنیاں چہرے پر سجی تھیں۔ ان کے ناچنے کے انداز میں نہ تو بناوٹ، بے حیائی یا دلنوازی نہ تھی۔ وہ مخنث طائفوں کی یاد بھی نہ دلاتے تھے جو شادی بیاہ کے موقع پر ''جیوے جیوے'' کہتے سہرے گانے کے لیے ڈفلی تاشے کے ساتھ آ جایا کرتے ہیں۔

ڈھول کا ارتعاش، سدا سہاگنوں کے گھنگھروؤں کی آواز فضا میں جادوئی ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ سدا سہاگنیں غالباً فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اپنی انا کی سوئیج کوٹ کوٹ کر چھوٹی کر رہے تھے۔ جوان توانا مرد عورت کی سی عاجزی فروتنی اور بےبسی سے یار کو منانے میں مصروف تھے۔ انھیں یہ علم بھی نہ تھا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ عفت نے بابا کے قریب ہو کر پوچھا۔ ''باباجی اس کا فائدہ؟''

خاں صاحب غالباً باباجی سے عفت کی بیماری کا ذکر کر چکے تھے۔ آہستہ سے یاددہانی کے طور پر بولے۔

''باباجی یہ ڈاکٹر عفت ہیں۔ شہاب صاحب کی بیگم صاحبہ۔''

''چلو چلو پتر...... ان کو پیچھے لے چلو۔ سب خیراں ہیں۔ بیٹا سب خیراں۔''

پہلی نظر میں ہی باباجی نے عفت کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ اتنی دیر ہالینڈ، لندن میں رہنے والی ڈاکٹر عفت اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ میرے علم میں تو ایسے لوگوں کا کہیں ذکر نہیں۔ کیا واقعی یہ سب جہالت ہے۔ کیا انسانی روح کی کوئی ایسی حالت ہے جہاں دنیاوی علم بیکار ہو جاتا ہے؟ کتاب کا علم گفت و شنید کا علم...... تجربات کا علم۔

بابا جلال ہمیں تہہ خانے والی کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہ نشیبی کمرہ کچی اینٹوں سے بنا تھا۔ اس کی چھت پر پرانے سرکنڈے اور پھوس کی چھت تھی۔ طاقچوں میں باسی ہار اور تیل سے سنے دھوئیں سے میلے دیئے تھے۔

فرش پر صف بچھی تھی اور پشت ٹیکنے والی دیوار پر سرکنڈوں کی چقیں تھیں۔ عفت کے چہرے پر تھکاوٹ تھی اور روح کی حس اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی روشن خیالی اور تعلیم کے پیش نظر بڑے شبہات میں گھری ہوئی تھی۔

آہستہ سے عفت بولی ''انسان اپنی مشکلات کے سامنے کتنا بےبس ہے؟ ہم اپنی ضروریات کے سامنے کیا کیا سمجھوتے نہیں کر لیتے۔ میں نے اپنی صحت کی خاطر وہ سائنسی نظریات بھی چھوڑ دیے جن پر میرا کلی اعتماد تھا۔ میں نے بھی تعلیم کے ناطے کیسے کیسے لات و منات پال رکھے تھے؟ کیا وہ بت جھوٹے تھے اشفاق بھائی! کہ میری ضرورت کی بے بسی تھی کہ اس کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

پھر وہ گاؤتکیے کا سہارا لے کر قریباً نیم دراز حالت میں بیٹھ گئی۔

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ کوٹھڑی میں ابابیل کی طرح چکر لگانے لگا۔

''اشفاق بھائی...... میں نے رات بابا جی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے، آپ کو پتہ نہیں کہ مجھے سمجھانا بھی آئے گا کہ نہیں۔''

''ہاں ہاں ٹرائے کرو...... میں زیادہ کو دن نہیں ہیں۔'' خاں صاحب بولے۔

''بابا جی نے میرے خواب میں فرمایا۔ مجھے...... یوں لگتا ہے کہ سارا انگلستان بالآخر ہندو ہو جائے گا۔ ہرے راما ہرے کرشنا کی صدائیں گونجیں گی۔ ہر طرف کھڑتالیں بجیں گی۔ گھنٹیوں کی صدائیں آئیں گی۔ گرجا گھر مندروں میں بدل جائیں گے۔ سفید فام لوگ بال منڈوا کر لمبی لمبی بودیاں پال کر گلے میں جنیو پہن کر قشقے کھینچے کھڑتالیں بجاتے دان دکشنا مانگتے پھریں گے۔ لندن کے گھروں میں گھر گھر گائے بندھی ہوگی۔ انگریز لڑکیاں کیسری ساڑھیاں پہنے ہاتھوں میں دیپ لیے بڑے بڑے گرجوں کی طرف جائیں گی۔ جہاں حضرت عیسیٰ کی بھی مورتی بن جائے گی۔ وہاں آرتی اتاری جائے گی۔ بھجن گائے جائیں گے۔ بس خواب تو اتنا ہے لیکن مجھ میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔''

خاں صاحب مسکرائے...... ''تبدیلی تو آتی رہتی ہے عفت۔ تبدیلی ارتقاء کا ایک ضروری عنصر ہے۔''

''تبدیلی پتہ نہیں کیوں آتی ہے اشفاق بھائی؟'' عفت ایسی فلسفیانہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی۔ پتہ نہیں یہ نشیبی کٹیا کا اثر تھا کہ سدا سہاگنوں نے سوچ کی کوئی رنگ پچکاری فضا میں چھوڑ دی تھی۔

''پتہ ہے اشفاق بھائی! عموماً تبدیلی نفرت سے جنم لیتی ہے۔ جب کسی انسان، معاشرے، کسی رہن سہن، اعتقاد سے نفرت کی جاتی ہے تو یہی نفرت ہمارا مقدر ہو جاتی ہے۔ اس نفرت کی یہ سزا ہے کہ ہم میں بڑی تبدیلی آ جاتی ہے۔ ہم جس انسان، معاشرے، مسلک سے نفرت کرتے ہیں، اسی میں ڈھل جائیں۔ نفرت کی سزا ہمیں اسی طرح ملتی ہے کہ سرتاپا ہم اس جیسے ہو جاتے ہیں جس سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ میں سوچتی رہی ہوں کہ انگریز جب شروع شروع ہندوستان میں آئے اور ہندو دھرم کے مرتکب ہوئے تھے، ان کی بت پرستی، رسم و رواج سے چڑتے تھے۔ مجھے ایک بار شہاب نے کہا تھا کہ اشرف علی تھانوی کہا کرتے تھے کسی کا مسلک چھیڑو نہیں اور اپنا مسلک چھوڑو نہیں۔ یہی Liberalism ہے۔ اللہ ہماری نفرتوں کی سزا اسی طرح دیا کرتا ہے۔ ہمیں نفرت سے محبت کرنے کی یہی سزا ملتی ہے۔ تبدیلی اسی طرح آتی ہے۔''

عفت ہم سے بات نہیں کر رہی تھی۔ وہ خود کلامی میں مشغول تھی۔ وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ڈیرے جیسی جگہ سے کیسی نفرت تھی، وہی نفرت اب محبت میں بدل رہی تھی۔

اور شاید امریکہ میں بالآخر اسلام ہی حاوی ہو جائے گا۔ شاید سفید فام فرقوں کو ان کی اس نفرت کی سزا ملتی رہے گی جو وہ مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ میں نے سوچا۔

عیسائیت جو محبت کا پرچار کرتی ہے۔ اس کے پیروکاروں نے جس قدر نفرت سیاہ فام لوگوں سے کی ہے ساری دنیا جانتی ہے...... حضرت بلالؓ ہر طرح کا ظلم و تشدد برداشت کرتے رہے ہیں۔ کیا جنگل کاٹنے والے، سڑکیں بنانے والے، امریکہ کو موسیقی سکھانے والوں سیاہ فام افریقی لوگوں سے نفرت کا بدلہ نہ لیا جائے گا؟

کیا حواس خمسہ کی لاٹھی ٹیکے بغیر، عقل کی بیساکھی چھوڑ کر اللہ کا تجربہ کیا جاسکتا ہے؟
اس وقت بابا جلال داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خمیری روٹیوں سے لدا چھابا کٹوروں میں شلغم کا شوربہ تھا۔ اس
۔۔۔ قرینے سے سب کچھ لگا دیا۔
"کھاؤ بابا جی...... بسم اللہ کرو، دیکھو حال پر کیا عطا ہو رہا ہے۔" بابا جلال نے پُرتپاک لہجے میں کہا۔
خاں صاحب نے بلا چون و چرا کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت امریکن نژاد شمس اندر آیا۔ وہ ہم سے کچھ دور بیٹھ
۔۔۔ جلال نے اس کے آگے کٹورہ اور روٹی رکھ دی اور وہ خاموشی سے کھانے لگا۔ شمس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی
۔۔۔ دراز قد پر بہت سج رہی تھی۔ اس کے پیروں میں کھڑاویں اور گلے میں گیندے کا ہار تھا۔ عفت کو پہلے ہی دن سدا
۔۔۔ کے بعد دوسرا دھچکا شمس کا لگا۔
"اس وقت تو میں شوربہ روٹی نہیں کھا سکتی پلیز، ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔" بابا جلال کے پیش نظر عفت نے انگریزی
۔۔۔ صاحب سے کہا۔
"نعمتوں میں سے کچھ اٹھا لینا چاہیے ورنہ کفران نعمت ہوتا ہے۔" خاں صاحب نے انگریزی میں عفت سے

"کھاؤ جی کھاؤ، بسم اللہ" بابا جلال نے پھر کہا۔
بابا جلال سکون بھری مسکراہٹ کے ساتھ قرینے سے چیزیں لگانے میں مصروف تھا۔
"آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اتنے سارے لوگ آتے جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت ہے۔" عفت نے
۔۔۔ سے کہا۔
"ناں بیٹا جی مصیبت نہیں۔ ہمارے بابا جی نور والے فرماتے ہیں۔ نماز کی قضا ہے پر خدمت کی کوئی قضا

ہم تینوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر شمس ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔
کھانا کھانے کے بعد لال چائے آگئی۔ کیکر کی چھال کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ کمرہ مہکنے لگا۔
بابا جلال اپنی خدمت کے دوران بابا جی نور والے کے زریں اقوال بیان کرتا رہا۔ ہماری تواضع میں طعام بھی تھا
۔۔۔ قوال بھی۔ شمس اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا...... "میں فارسی بھی سمجھ لیتا ہوں اور بول بھی لیتا ہوں لیکن اردو اور پنجابی ابھی
۔۔۔ بس کی نہیں اور صوفیائے کرام کا جو خزانہ اس دھرتی میں دفن ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔"
شمس دبلا پتلا دراز قد امریکن تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کی داستان بھی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ قونیہ میں رہا۔
۔۔۔ ین اولیاء کے مزار پر بھی حاضری دیتا رہا لیکن نور والوں کے ڈیرے پر آ کر وہ مسلمان ہو گیا۔
"میں یہاں آیا کرتا تھا۔ بابا جی بس ایک ہی بات پر زور دیتے تھے کہ میل جول رکھو۔ بابا جی کبھی قول سے مجھے
۔۔۔ یں کرتے تھے۔ وہ فرماتے بھئی مثال دیکھ کر ڈیرے کی زندگی میں رچ بس کر خود ہی کچھ تبدیلیاں آجائیں گی۔ صوفیا
۔۔۔ یں کرتے، متاثر کرتے ہیں۔ جس روز میں نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی تو بابا جی فرطِ جذبات سے مغلوب

ہو گئے۔ گویا اپنی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز ان پر تھوپا گیا ہو۔ بابا جی نے دونوں بازو اٹھا کر فرمایا، ''ناں جانی جان بھائی ناں...... یہ بڑا کام ہے...... یہ مسجد میں ہو گا...... ہم مجذوب لوگ۔ یہاں یہ کام نہیں ہوتا۔'' ڈاکٹر اشرف فاضل گیا۔ شمس کا Jenkins امریکن نام بدل کر بابا جی نے وضو کرایا اور شمس کو مسجد بھیج دیا جہاں مولوی صاحب نے اسے مشرف بہ اسلام کیا۔

شمس امریکی انگریزی بولتا بولتا چپ ہو گیا۔ جب بھی وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرتا اس کی گردن کی لوئیں سرخا سرخ ہو جاتیں۔ سبزی مائل نیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ جب بھی وہ اندر کے احساسات کی بات کرتا اس کی آنکھیں، ہونٹ، نتھنے تاثیر میں بھیگ بھیگ جاتے اور یوں لگتا کہ اس کی گفتگو دراصل اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں تشکیل پا رہی ہے۔ عفت نے ابھی تک کھانے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

''کھایئے...... شاید میں مخل ہوا ہوں۔'' شمس نے اصرار کیا۔

''جی مجھے بھوک نہیں۔'' عفت بولی۔

عفت نے پنجابی میں خاں صاحب سے کہا۔ ''کل رات اشفاق! بھائی زیرو کا بلب میرے کمرے میں جلتا تھا۔ سارے کمرے میں کاسنی روشنی پھیلی تھی۔ بابا جی کے بعد یہ شمس بھی میرے کمرے میں آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح براڈلاف میں ایک لڑکی نے اس کے سینے پر مکے مار کر کہا تھا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس پر توجہ دینی چاہیے۔ جس نبیؐ نے اتنی ازواج کا دل توڑا ہو...... جہاد بھی کیے ہوں...... اتنا سخت پروگرام دنیا کو پیش کیا ہو تم اس کو سننا چاہتے ہو۔

شمس نے بر جی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ میرے لیے اپنے سے مخالف رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اسے بھی سمجھنا ضروری ہے۔ Ideas are not for ever۔ یہ شمس کل رات میرے کمرے میں آیا تھا۔ اشفاق بھائی اس نے مجھ سے یہ ساری باتیں کی تھیں جواب یہ کر رہا ہے۔ پتہ نہیں خواب تھا کہ...... کیا۔''

خاں صاحب نے ہولے سے کہا۔ ''خواب بھی عجب شے ہے عفت۔ کبھی کبھی رویائے صادقہ بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ کچھ اور طرح کے معاملات ہیں۔ انہیں سائنسی، منطقی، تجزیاتی یا تجرباتی انداز میں سمجھا نہیں جا سکتا۔ ابھی ہمارا علم ناپختہ اور قلیل ہے۔''

یکدم شمس نے کہا ''آپ کچھ میرے متعلق بات کر رہے ہیں...... یہ زبان کا بھی عجب حجاب ہے۔''

ہمارے درمیان کئی قسم کے حجابات تھے۔ نسل، رنگ، جغرافیائی فاصلے، ثقافتی بُعد، رسم و رواج، رہن سہن لیکن ان پردوں کے باوجود شمس اپنا ہونے کا احساس دے رہا تھا۔

''کل رات میں نے آپ کا خواب دیکھا...... ہو بہو یہی باتیں...... براڈلاف کا ذکر۔''

اس نے ابرو اٹھائے...... ''واقعی میں براڈلاف سے آیا ہوں۔ میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا لیکن مجھے لگتا ہے...... لگتا ہے جیسے میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔''

''لیکن میرا خواب تو ہو بہو......''

شمس نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا..... ''جب نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس وقت حواسِ خمسہ ظاہری طور پر معطل ہو جاتے ہیں۔ جو سفلی، ناسوتی دھواں دن بھر انسان کے گرد رہتا ہے، چھٹنے لگتا ہے۔ ہر انسان مسافر ہے اور جسم کے پنجرے سے نکلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو اور انسان آزاد ہو جانے کی شدید خواہش بھی رکھتا ہو تو پردے اُٹھتے ہیں اور بسا اوقات انکشافات ہونے لگتے ہیں۔'' بڑی آسانی اور روانی سے وہ انگریزی میں سمجھاتا گیا۔

''یعنی ہر خواب انکشافات کا درجہ رکھتا ہے شمس؟'' میں نے ناسمجھوں کی طرح سوال کیا۔

''یہ آپ کی خواہش پر منحصر ہے۔ آزادی طلب روحوں کے حجابات جب اٹھ جائیں تو جن امور کو وہ خواب میں دیکھتے ہیں، جاگنے پر انہیں نہیں بھولتا اور اگر خواہش کمزور ہو تو قوت مدرکہ جاگنے پر خواب کو منتشر کر دیتی ہے۔'' شمس انگریزی میں بولا۔

''اور یہ رویائے صادقہ کیا چیز ہے اشفاق بھائی؟'' عفت نے پوچھا۔

خاں صاحب رک رک کر بولے..... ''میرے قلیل علم کے مطابق عفت رویا کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی نعمت اس خوش نصیب کو دکھائی دیتی ہے جو نفس مطمئنہ کا مالک ہو۔ اس کا خواب اسے ایسے مقامات کی سیر کرا دیتا ہے جو عقل انسانی کے بس میں بھی ممکن نہیں۔ دوسری قسم خواب کی وہ ہے جس سے نفس لوامہ کو سابقہ پڑتا ہے یعنی ایسی روح جو ابھی خواہش سے نجات نہیں پا سکی۔ اس لیے اسے ایسے خواب آتے ہیں جو دنیا سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ آنے والے واقعات کچھ Premonitions، کچھ Forebodings، کچھ پیش گوئیاں..... لیکن تیسری قسم خواب کی وہ ہے جو نفس امارہ کو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب شیطانی ترغیبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی سچے ہو جاتے ہیں لیکن ان سے انسان کی روح کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیوں کیا میں کچھ ٹھیک سمجھ پایا ہوں شمس؟''

''وِل ڈن وِل ڈن..... کچھ کچھ میں سمجھ گیا۔'' وہ بچے کی سی معصومیت سے بولا۔

شمس سرخ گردن کیے بڑے انہماک سے خاں صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

چند لمحے ہم خاموش رہے اور عفت نے چائے کے پیالے کو منہ لگا لیا۔

''اشفاق صاحب! کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان ایک وقت میں دو جگہ موجود ہوتا ہے۔ قونیہ میں ایک درویش نے مجھے بتایا کہ ہر انسان کی چھ Duplicate کاربن کاپیاں دنیا میں ایک وقت پر موجود ہوتی ہیں۔ کیا مختلف مقامات پر ایک وقت میں ہونا اسی Phenomena کا حصہ تو نہیں؟'' شمس نے بات کی۔

کچھ دیر سر میں انگلی پھیرنے کے بعد خاں صاحب بولے..... ''جو لوگ حظِ نفس کو چھوڑتے ہیں اور نعمتوں سے منہ موڑتے ہیں۔ اُن کے لیے بہت کچھ ممکن ہے۔ وہ Levitation بھی کر سکتے ہیں اور Linear travel بھی ان کے لیے مشکل نہیں۔''

عفت کی طرف دیکھ کر شمس بولا۔ ''کل رات مجھے لگا کہ میں براڈلاف میں ہوں۔ چھ سال پہلے میرے باپ نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ وہاں ادیبوں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ باپ نہ جانے کیوں بیٹوں سے اتنی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں فاکنر (Faulkner) کی طرح ایک بڑا ناول نگار بنوں۔ پتہ نہیں کیوں اولاد ماں باپ کی

آرزو پر کم و بیش کبھی پوری نہیں اتر سکتی۔''

عفت کا نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے شمس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ عفت کا چہرہ بخار میں تپا ہوا تھا۔
ہے اشفاق بھائی وہی ہے..... میں بھی کل رات اسے دیکھ چکی ہوں۔'' عفت نے اردو میں کہا۔ ایک ہی وقت
مقامات پر موجود ہونے کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یوں سمجھیے براڈلاف میرا قبلہ اول ہے۔ وہاں میں داؤد سے ملا۔ وہ افریقی سیاہ فام اتنا طاقتور تھا کہ
ملبے میں انسان کو جڑ سے اتار پھینکتا اور..... اس نے اپنی یہ طاقت ہمیشہ لوگوں کو بچانے کے لیے استعمال کی
نے اپنی ساری طاقت استعمال کر کے مجھے کہا..... شمس..... تو نیو چلے جاؤ..... یہ براڈلاف تمہارے مطلب کی جگہ نہیں ہے
یہ کہہ کر وہ یونیورسٹی سے غائب ہو گیا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا لیکن میری سمت مقرر کر گیا۔ اس نے کوئی مشورہ نہیں
بحث مباحثہ نہیں کیا لیکن باباجی کی طرح ایک نظر سے میری منزل مقرر کر دی۔ سیاہ آدمی میں کسی کو بچانے کی کتنی قوت
ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ طاقت دنیا حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

اللہ نے سفید فام اور سیاہ جلد والوں کی سعی مقرر کر دی ہے۔ سفید آدمی ہمیشہ دنیا سیدھی کرتا ہے۔ وہ
ہاتھ پکڑ کر ساری قوت مجتمع کر کے حال کو درست کرتا ہے لیکن سیاہ انسان کو اس دنیا کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ روح کو
مابعد کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ سفید قوموں میں نبی کیوں نہیں آئے؟ انہیں اللہ کی رضا
دنیا سنوارنی ہے۔ وہ اسی دنیا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جب بھی کسی سفید آدمی کو میری طرح مابعد کی تلاش ہوگی
کی آرزو ہوگی، اسے مشرق کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ پھر چاہے وہ صلیب اٹھا لے، چاہے اس کے بیٹے مارے جائیں
بیٹیاں زندہ رہیں۔ چاہے وہ جہاد میں شہید ہوں..... انتخاب اس کا اپنا ہوگا لیکن راستہ مشرق والے دکھائیں گے۔''

باہر سے اذان کی آواز آنے لگی۔ دھمال والوں کے گھنگھرو سمٹ کر چپ ہو گئے۔ ڈھول تاشے بجنے بند ہو گئے
شمس نے اپنے گلے سے گیندے کا ہار اتارا اور عفت کے گلے میں ڈال کر بولا۔ ''یہ ہار بڑی چیز ہے جی، اسے
باباجی فرماتے ہیں۔ ہر پھول کی بھی آرزو ہوتی ہے کہ وہ بالآخر محبوب کے گلے کا ہار بنے۔''

''عفت مجھے دیکھیے۔'' شمس نے عفت پر نظر ڈالی اور اس کا دل بہلانے کی غرض سے بتانے لگا کہ
میں اسے وہی برجی ملی تھی جو عفت کے خواب میں آئی تھی۔ وہیں اسرائیل کی ناٹے قد کی شاعرہ، گھانا کا جوشیلا جرنلسٹ
ہندوستان سے آیا ہوا، ٹائی سوٹ پہننے والا ہری بھوشن تھا۔ ہری بھوشن اور شمس اکٹھے ایک کمرے میں رہتے تھے
آدرشوں پر گتھم گتھا بھی ہو جاتے تھے۔'' میں ادیب تو نہیں تھا لیکن میرے سکول ماسٹر باپ کی آرزو تھی کہ میں ایک
فاکنر بن جاؤں اور نوبیل پرائز پاؤں۔ مجھے اندر سے معلوم تھا کہ فاکنر بننا کسی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں لیکن
اپنے سکول ماسٹر باپ کی آرزو کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کینسر کا مریض میرا باپ زیادہ دیر
نہیں رہے گا۔ اسی لیے میں براڈلاف چلا گیا تھا۔''

اسرائیلی برجی کا قد چار فٹ گیارہ انچ تھا۔ جب ہم دونوں براڈلاف کی خوبصورت لانوں پر گھومتے تو وہ
میرے سینے تک آتی۔ برجی نے مجھے شہد کھانا سکھایا۔ وہ ناشتے پر، دوپہر لنچ کے وقت، شام کی چائے میں، رات کے کھانے

...پھر سے اُڑانیں بھر رہا تھا اور دونوں کوزوں کے درمیان اپنے جلوے دکھا رہا تھا۔ مجھے اس کے سکتے سے نکل کر پھر ...ہو جانے پر بے انتہا خوشی ہوئی۔

میں نے خوشی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بلال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں مایوسی تھی ... پر ہلکی سی تیوری تھی۔ اس نے میری کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"دادا ابا! اسے مارو۔ اس مرغے کو حلال کر دو۔ یہ پھر سے کیوں زندہ ہو گیا ہے بھلا؟"

بابا نور والے اور دیگر

"نور والوں کا ڈیرہ"

جب خاں صاحب اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر کام کر رہے تھے، اُن کی کل تنخواہ آٹھ سو روپے کے قریب تھی لیکن ہمیں کوئی مالی پریشانی نہ تھی۔ البتہ خاں صاحب کچھ بجھے بجھے، بے زار سے، کچھ روہانسے سے نظر آتے۔ یوں لگتا گویا ان کے اندر کوئی مدھانی پھر رہی ہو لیکن کسی قسم کا مکھن اوپر نہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے کام کی زیادتی پر محمول کیا۔

خاں صاحب گلبرگ کے دفتر سے بوریا بستر اٹھا کر 299۔ اپر مال میں شفٹ کر گئے تھے۔ یہ زمین خاں صاحب نے اپنے نام سے خریدی تھی کیونکہ مالک مکان شکی قسم کا آدمی تھا اور کسی صورت حکومت کو زمین بیچنے پر اس لیے راضی نہ تھا کہ کون جانے کس وقت کسی نئے افسر کے آنے پر حکومت یہ زمین واپس کلیم کر لے۔

خاں صاحب نے بلڈنگ میں اردو بورڈ کی کتابیں بیچ کر جو دس لاکھ جمع کیا تھا، اس سے تعمیر کی تھی۔ حکومت سے کسی قسم کی اعانت لیے بغیر غالباً یہ پہلی عمارت تھی جو کسی ادارے نے بنائی تھی۔ کچھ یار دوستوں نے خاں صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ بلڈنگ تمہاری ہے اب حکومت سے کرایہ وصول کرو لیکن خاں صاحب ایسی باتوں پر ہنس دیا کرتے تھے لیکن ان دنوں تو انھیں کسی بات پر ہنسی آتی ہی نہ تھی۔

میں نے حسب عادت نہ تجسس کو راہ دی، نہ اُن کے اندر کے موسم کی کنسوئی لی۔ ان کے اندر کی چوٹ کا میں نے کوئی اندازہ نہ لگایا۔ دفتر میں حنیف رامے خاں صاحب کے نیچے کام کرتے تھے۔ حنیف رامے بھی اداسی کے دورے سے خود بھی گزرتے رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی رشید احمد چوہدری جب بھی دفتر آتے تو خاں صاحب سے ضرور ملتے۔ ایک بار باتوں باتوں میں نور والوں کے ڈیرے کا ذکر ہوا۔ اس لیے وہ خاں صاحب کو نور والوں کے ڈیرے پر لے گئے۔

ڈپریشن کی بیماری ازل سے انسان کے تعاقب میں رہی ہے لیکن انسان جب زرعی دور سے گزر رہا تھا، نیچر کے قریب تھا۔ کچی سبزیاں، فصلیں، پھل، جڑی بوٹیاں استعمال میں تھیں۔ اصطبل میں گھوڑے، گھروں پر بھینس، بکریاں، گائے، بچھڑے اس کی زندگی کو تصنع اور نمائش سے دور رکھتے تھے۔ تب بھی ڈپریشن ہوتا ضرور تھا لیکن یہ مرض موسمی زکام

مریض ہر دور کی طرح جلد صحت سے آشنا ہو جاتا۔ تب ڈپریشن کا تعلق پیدائشی معذوری کی شکل میں ابھرتا تھا۔ پاگل پن، ... اور ڈپریشن کا زیادہ تعلق ماحول اور تربیت سے نہیں تھا بلکہ کہیں وراثت میں Genetics کی کارستانی ہوا کرتی تھی۔

لیکن آج کے عہد میں ڈپریشن کی بیماری نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہی لگتی ہے کہ اب ... ترقی کو صرف مادی ترقی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ دنوں میں امیر ہونے کا خواب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کوٹھی، کار، ... کے لیے بڑھیا انگریزی سکولوں کی تعلیم (صرف پرائیویٹ سکولوں کی تعلیم ہی اصل تعلیم سمجھی جاتی ہے) ہر انسان کی ... بن چکا ہے۔

پے در پے کوشش کے باوجود جب نوجوانوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا تو نوجوان اپنے آپ کو نکھٹو اور نا اہل سمجھنے لگتا ہے۔ اس میں مسابقت کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا شعور اسے سمجھاتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیاوی زندگی کے لیے ... ہے۔ اسے بھول جاتا ہے کہ اللہ بعض کو بعض پر فوقیت دیتا ہے۔ کسی کو رزق، کسی کو حسن، کسی کو دانشوری سے نوازتا ہے ... اور حسد کے نرغے میں پھنس کر آج کا نوجوان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ حواسِ خمسہ کی عطا کردہ حالیہ نعمتوں سے کھنچنے لگتا ہے۔

وہ ایسی مسرتوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو جسم کو لذت دیتی ہے۔ روح کی بالیدگی کا تو سرے سے اسے علم ہی نہیں ہو پاتا۔ جب دونوں پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں تو ڈپریشن کا مریض موت کی خواہش کرتا۔ دنیاوی زندگی وہ حاصل نہیں کر پاتا، روح کے سفر کا علم اسے نہیں ہوتا۔ ایسے میں جو توڑ پھوڑ ہوتی ہے، وہ مکمل مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ ڈپریشن کا مریض ... کے خواب ایسے دیکھتا ہے گویا کسی محبوبہ کے خیالوں میں غرق ہو۔ آج کے عہد میں خودکش حملے اور خودکشی کے ... عموماً اسی ڈپریشن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کرائم کی دنیا اسی ڈپریشن نے آباد کر رکھی ہے۔

کچھ خوش نصیب ہر دور میں ایسے ہو گزرے ہیں جو ڈپریشن میں جانے کے بجائے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ روح کے ... دنیاوی یافت ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ دنیا کو اپنے ارادے اور اختیار سے پس پشت ڈال کر فقیری چال اختیار کر لیتے ہیں۔ نبیوں کا راستہ، مہاتما بدھ، مہاراجہ رام چندر، ابراہیم ادہم اور بڑے بڑے قطب ولی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ وہ ... لہو و لعب سمجھ کر دنیا کے لیے تگ و دو نہیں کرتے اور عجب اتفاق ہے زمانوں پر اپنی مہر لگا کر چلے جاتے ہیں۔

دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کا ڈیرہ تھا۔ بابا جیؒ اپنے بچوں سے غافل، دولت کی خواہش سے تہی، حب ... سے متنفر ایک ایسی اجتماعی زندگی گزار رہے تھے جہاں وہ نا امید لوگوں کے دیئے میں امید کا تیل ڈالتے اور اسے روشن کرتے۔

مجھے نہ ڈیرے کا علم تھا نہ رشید احمد چوہدری یا حنیف رامے کی رہبری کا۔ پھر اچانک ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے ناشتے کے وقت کہا ''قدسیہ! حنیف رامے مجھے بابا جی نور والے کے ڈیرے پر لے جاتے رہے ہیں۔ وہاں کا عجب ماحول ہے۔ ہر طبقے کا آدمی گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ سارا دن کیکر کی چھال کی گڑ والی چائے ملتی ہے۔ آپ جب جائیں آپ کے آگے کھانا لگا دیتے ہیں۔ پیالے میں سالن چھابے میں روٹیاں۔''

''کوئی لنچ ٹائم، ٹی ٹائم نہیں؟''

''نہیں بابا کے ڈیرے پر لنچ ٹائم یا ٹی ٹائم نہیں ہوتا۔ جونہی کوئی داخل ہوتا ہے۔ بابا جی کہتے ہیں لو بھی نخس طواف کرو، جانی جان آئے ہیں۔ اتنی خوشدلی سے کسی کا سواگت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا...... چلو گی دیکھنے'' خاں صاحب نے ڈرے ہوئے اشتیاق سے کہا۔

''ضرور جی ضرور''

خاں صاحب کی عادت تھی وہ ہمیشہ کسی نئے خیال، جگہ، بجن، سہیلی سے پہلے خود ملتے۔ سارے حدود اربعے سے خود واقف ہوتے۔ پھر جہاں کہیں پھسلن ہوتی وہ اس مقام کو گول کر جاتے ورنہ مجھے اس فوٹو گرافر کی طرح جو آپ کے سر پر کالا کپڑا ڈال کر کہتا ہے'' دیکھو دیکھو یہ قطب صاحب کی لاٹ ہے...... بارہ من کی دھوبن کو سلام کرو...... دیکھو دیکھو آیا......'' مجھے ایسے ہی وہ ہر تماشا دکھا دیتے۔

آپ نے بھی شاید کبھی بچپن میں یہ شعبدہ باز فوٹو گرافر دیکھا ہو جو اپنا کیمرہ، سلائیڈیں، تین ٹانگوں والے سٹینڈ پر رکھ کر کمنٹری جاری رکھتے ہوئے دنیا جہاں کے عجائبات دکھایا کرتے تھے۔ خاں صاحب میں بھی ایسے شعبدہ بازی کی صفت تھی۔ وہ ایک مرتبہ لندن سے جادو کا سامان بھی لائے تھے جس میں رنگ بدلنے والے رومال، جادو کی تاش، رنگ برنگی گیندیں شامل تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے خود Jugglery بھی کرنے کی کوشش کی لیکن گھر والے ہمیشہ کی طرح جوش و خروش کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے۔

خاں صاحب کو حیران ہونے اور حیران کرنے کی عادت تھی۔ اسی میں ان کی ساری نشوونما تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ خود تو جادوگر نہ بن سکے لیکن ایک شام انہوں نے بہت سارے ادیبوں کی دعوت کی اور مجھ سے کہا...... ''ہماری اس دعوت پر نہ ادبی باتیں ہوں گی نہ غیبت ہی چلے گی۔ ہو سکے تو آپس میں جو شہرت کی ہوس اور حسد ہے اس پر بھی نشہ چڑھا رہا ہے۔ بتاؤ کیا کریں کہ ادیب حضرات ایک دوسرے کی غیبت میں کھسر پھسر نہ کریں اور ان کا دل بھی لگا رہے۔''

میں نے کچھ سوچنا چاہا لیکن وہ سر ہلا کر بولے...... ''پالیا...... پالیا......''

جب کبھی انہیں کوئی نئی بات سوجھتی تو وہ ارشمیدس بن جاتے جو ٹب میں بیٹھا سوچتا تھا کہ کسی چیز کی Bouncy کیسے معلوم کی جائے اور ٹب میں اس پر انکشاف ہوا کہ جس قدر پانی کوئی مادی چیز displace کرتی ہے وہی اس کی Bouncy ہے۔ ارشمیدس ٹب میں سے برہنہ نکلا اور روم کی گلیوں میں چلاتا گیا...... ''پالیا...... پالیا......'' خاں صاحب اور مجھ میں بھی ''پالیا...... پالیا'' کی ایک پوری روایت موجود تھی۔ ''اس بار میں ماسٹر جگلر بلاؤں گا وہی ان ادیب بچوں کی سٹی گم کرے گا۔'' خاں صاحب جذبے سے بولے۔

اس دعوت میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، سلیم اختر، مشکور حسین یاد، سائرہ ہاشمی اور بہت سے اہم ادیبوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ چائے کے بعد ساری ادیب برادری باہر لان میں جمع ہوگئی۔ خاں صاحب نے اپنی جادوگری تو نہ دکھائی البتہ ایک پروفیشنل جادوگر کو بلوایا۔ اس نے کچھ ایسے کرتب اور شعبدے دکھائے کہ ادیبوں کو آپس میں باتیں کرنے کا وقت نہ ملا بلکہ انہیں عام انسانوں کی طرح خوش ہونے کا موقع ملا۔

ایک اور مرتبہ یوں ہوا۔ ہاجرہ مسرور تب حیات تھیں اور کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ خدیجہ نے خاں صاحب کو آمد کی اطلاع دی تو خاں صاحب بولے "بھائی بڑی خوشی کی بات ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟" خدیجہ نے پوچھا۔

"اس خوشی کے موقع پر کچھ ہو جائے۔"

"کیا ہو جائے اشفاق بھائی؟"

"کوئی دعوت، کوئی ٹی پارٹی......؟"

تو طے پایا کہ ادیبوں کو چائے پر مدعو کیا جائے۔ مجھے بلا کر خاں صاحب نے کہا "کیا تم ان حضرات کو کچھ پارٹی گیمز (Games) کھلا سکتی ہو۔ کوئی Pillow Fight، رسہ کشی، آنکھ مچولی قسم کا کھیل؟"

اس دن سب سے کامیاب کھیل وہ تھا جب سب ادیب دائرے میں بیٹھے تھے۔ ایک ادیب کو میں ایک پرچی دیتی اور ہدایت دیتی کہ اسے کھولنا نہیں اور دوسرے ادیب کو جلدی سے پکڑا دینا ہے۔ سپیکروں پر موسیقی جاری ہوگئی۔ جب موسیقی رُکتی جس ادیب کے ہاتھ میں جو پرچی نکلتی اسے کھول کر اسے پڑھنا پڑتا اور پھر جو سزا اس پر لکھی ہوتی اسے بھگتنی ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاتھ میں جب پرچی پکڑی گئی تو اس پر لکھا تھا "گانا سنایئے۔" بیچارے کھیل کی ہدایات کے پابند تھے اور درمیان میں کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے دو تین اشعار لحن کے ساتھ سنائے۔ خوب تالیاں بجیں۔

میری سٹی گم کرنے کے لیے خاں صاحب مجھے ڈیرہ پاک لے گئے۔

اس سے پہلے بابوں کا مجھے تھوڑا سا تجربہ تھا۔ یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں میری خالہ میانوالی کے گورنمنٹ سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ میانوالی میں نیازی پٹھانوں اور صوفی حضرات کا ان دنوں زور تھا۔ خالہ کا ایک جاں نثار چپڑاسی جو بنیادی طور پر حلوائی تھا، خالہ کے پاس آیا۔

"جی آپ سے ایک عرض کرنی ہے۔"

امیر محمد قریشی خاموش آدمی تھا۔ وہ کبھی ذاتی غرض لے کر ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

"کیا بات ہے قریشی؟"

"یہاں سے کچھ دور دتے والی ہے۔ وہاں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں۔ بڑے کرنی والے ہیں۔ کیا پتہ آپ کی ٹرانسفر کب لاہور ہو جائے۔ ان سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا......" باقی بات میری خالہ سمجھ گئیں اور شاہ صاحب سے ملنے کی ٹھانی۔

خالہ کے ماتحت آپا مبارک کام کرتی تھیں۔ اُن کا آبائی گھر لاہور میں کلکتہ روڈ پر حسین لاج میں تھا۔ باپ ڈاکٹر تھے اور انہیں انگریز حکمرانوں کی طرف سے خان بہادری کا تمغہ ملا تھا۔ آپا مبارک کو نوکری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ فقط شادی سے پہلے وقت کٹی کے لیے کام کر رہی تھی۔ آپا مبارک کی دو بہنیں اور ایک ڈاکٹر بھائی تھا۔

خالہ فیروزہ نے شاہ صاحب کے ایڈونچر میں آپا مبارک کو بھی شامل کر لیا لیکن اس مشغلے کو سکول کے ڈسپلن کے خلاف سمجھتے ہوئے خالہ نے یہ تجسس آگے نہ بڑھنے دیا۔ چھٹیوں میں جب خالہ حسین لاج آپا مبارک کے ساتھ گئیں تو

دتے والی کے شاہ صاحب بھی وہاں پہنچے۔

آپا مبارک، عزیز آپا اور سعید روزے کے دنوں میں ہمارے پاس دھر مسالے آتے۔ ہمیں جب بھی ... ہوتا ہم حسین لاج ٹھہرتے۔ سعید کے ساتھ میری گہری دوستی ہوگئی جواب تک قائم ہے۔ مجھے بابوں کا پہلا تجربہ ... جیسی سعید کے حسین لاج میں ہی ہوا۔ دتے والی کے بابا جی نواب کالاباغ کے بھی پیر تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک ... ہوئی تھی۔ حفیظ اللہ شاہ صاحب کی نیلی آنکھیں، تیکھے نقوش اور ارائیوں جیسی رنگت تھی۔ وہ نگاہیں نیچی رکھنے اور ... کے پلو سے چھپانے والے بزرگ تھے۔ ان میں کچھ تصرفات ضرور تھے لیکن وہ اعلانیہ کبھی ان کا اظہار نہ کرتے۔ ... کبھی بند مٹھی ہوا میں لہراتے۔ پھر اسے کھول کر ہمیں ایسے میوے پیش کر دیتے جو بے موسی ہوتے۔

حفیظ اللہ شاہ صاحب کی معیت میں ایک پٹواری صاحب بھی ہمارے گھر آیا کرتے جو سورۃ المزمل کے ... تھے اور سنا ہے کچھ جنات ان کے قبضے میں تھے۔ وہ با آواز بلند سورۃ المزمل پڑھتے۔ پھر اللہ ہو اکبر کا نعرہ لگاتے۔ ایک ... فرش پر مارنے کے انداز میں آگے کرتے اور عالم غیب سے موسی پھل سفید بچھی ہوئی چادروں کے گرنے لگتے۔ ہم ... حیرت سے انہیں دیکھتے اور فرمائشیں کرتے۔

''مچھلی تو منگوا دیں شاہ جی۔''

''کھا جو کھانے کو جی چاہتا ہے۔''

''پان...... پان'' میری منہ بولی بہن سعیدہ کہتیں۔

وہ اونچے اونچے سورۃ المزمل پڑھتے پھر مٹھی بند کر کے سفید چاندنی پر اشارہ کرتے۔ گرم گرم مچھلی ... پان، جلیبیاں، گلاب جامن فرش پر ہوتے۔ میری والدہ نے بھی ان سے سورۃ المزمل کا وظیفہ لیا تھا اور وہ تا حیات ... پڑھتی رہیں لیکن کسی قسم کی شعبدہ بازی یا تصرف ان کے ہاتھ نہ آیا۔ میں نے اپنے تجربات کا ذکر ان سے نہ کیا۔

ایک مرتبہ ہم سب کلکتہ روڈ پر حسین لاج کے اوپر والے مہمان خانے میں بیٹھے تھے۔ پٹواری صاحب ... جاری تھا۔ پھر یکدم پٹواری صاحب بولے۔ ''کوئی جا کر تار پر سے ٹیلی گرام اتار لائے۔''

میں باہر گئی، کپڑے سکھانے والی تار پر واقعی ایک تار لٹکی ہوئی ہوا میں ڈول رہی تھی۔

خاں صاحب نے پھر تصدیق کے طور پر میری سٹی گم کرنے کے انداز میں پوچھا۔

''قدسیہ ڈیرہ پاک چلوگی۔''

''ہاں جی ضرور۔''

''تم کبھی پہلے کسی ڈیرے پر گئی ہو؟''

''نہیں خاں جی...... مجھے معلوم نہیں ڈیرہ کیا ہوتا ہے۔''

''بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ بڑا آنند ملتا ہے۔ آدمی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔''

میں جی میں سوچتی رہتی۔ پتہ نہیں بابا جی نور والے کیسے ہوں گے؟ دتے والی کے حفیظ اللہ شاہ صاحب جیسے ...

نیچی جھکی ہوئی، نمی نمی مسکراہٹ...... جمال ہی جمال...... کہ پٹواری صاحب کی طرح عقل دنگ کرنے والے کسی کی طرح حیرت کے حوالے کر دینے والے۔

دھرم پورہ میں انفنٹری روڈ پر بائیں ہاتھ باباجی کا ڈیرہ تھا۔ ہم اس پٹڑی پر چل دیئے جو باباجی کے باورچی خانے کی طرف جاتی تھی۔

ہم دونوں ایسے داخل ہوئے کہ خاں صاحب دو فٹ آگے تھے اور میں کچھ خوفزدہ سی اچٹتی سی نگاہ ماحول پر ڈالتی پیچھے رہی تھی۔ بائیں ہاتھ چٹائیاں بچھی تھیں، جن پر کچھ لوگ عبادات میں مشغول تھے۔ دائیں ہاتھ کے چھدرے درختوں سے بکریاں بندھی تھیں۔ ہرا چارہ ڈالنے والے اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ ایک پکا کمرہ دائیں ہاتھ تھا، جس کا دروازہ کھلا تھا اور دائیں ہاتھ کھانے پینے کے انتظام میں محمد علی صاحب اور باباجی بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا راستہ تہہ خانے کی طرف جاتا تھا جہاں عموماً باباجی اپنے مکالمات سے تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

ڈیرے کے راستے پر سب سے پہلے بابا جلال سے ٹاکرا ہوا۔

بابا جلال دبلے پتلے سے سبز توب میں ملبوس ملے۔ وہ انسان سے زیادہ پرندہ لگتے تھے۔ غالباً باباجی ان کی کارکردگی سے زیادہ خوش نہ تھے لیکن مودی خانے کا سارا آٹا، تیل، چینی ان کی تحویل میں ہوتا اور وہ پھدکنے کے انداز میں ٹھیک ٹھاک ناپ تول میں لگے رہتے۔

ڈیرے کے پیچھے بہت آگے "علاج بالغذا" کا ہسپتال زیرِ تعمیر نظر آ رہا تھا۔ وہاں مزدور، راج، مستری بڑے انہماک اور فراغت کے ساتھ خوش دلی کے ہمراہ دیواریں اُسارنے، پلستر کرنے میں مشغول تھے۔ محمد علی صاحب اور باباجی کے پیچھے پیچھے تھے۔ سامنے چولہے جل رہے تھے، دیگچے چڑھے تھے اور باباجی کفگیر چلا رہے تھے۔ لنگر تیار ہو رہا تھا۔ باباجی فضل شاہؒ نور والے کی طرح نورانی، خوبصورت ڈاڑھی اور پلو چہرے پر لیے بغیر با پردہ چہرہ...... میں نے کبھی بابا جی کی صورت کو بڑے غور سے نہیں دیکھا...... لیکن اس امی بزرگ کے چہرے پر بڑی شائستگی، شانتی اور نمی نمی چھاؤں جیسی مسکراہٹ تھی۔

"آؤ جی آؤ جانی جان آگئے...... جانی جان آگئے۔"

باباجی کی آواز نے سواگت کیا۔

"میں جی قدسیہ کو لایا ہوں باباجی۔"

"لو جی...... ہماری بیٹی آ گئی...... سب خیراں ہو گیاں...... نیچے چل کر بیٹھو جی...... نیچے چل کر، دھی رانی آئی ہے آج تو۔"

ہمیں بابا جلال نشیبی تہہ خانہ نما کمرے میں لے گئے۔ اوپر کی سطح سے یہ کمرہ دس بارہ فٹ نیچے تھا۔ لیپ کی ہوئی دیواریں، فرش پر بچھی دریاں، چٹائیاں، عجب سماں، عجب روشنی...... ابھی ہم نیچے ہی تھے کہ بابا جلال چائے لے کر آ گئے۔

آبخورہ نما روغنی پیالوں میں گرم گرم لذیذ چائے تھی۔ یہ چائے کیکر کی چھال ابال کر اس میں وافر دودھ اور گڑ ملا کر بنائی جاتی تھی۔ میں نے اسے گھر پر بنانے کی ناکام کوشش کی لیکن اس کی لذت غالباً باباجی کی محبت سے کشید کی جاتی

تھی۔ وہ اپنے مستی پہرے میں ایسی نادر چیزیں سیکھ آئے تھے جن کی نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔

چائے پینے کے دوران مجھے خاں صاحب نے بتایا تھا کہ چودہ برس کی عمر میں بابا جی پر جذب کی کیفیت ہو گئی تھی۔ بابا جی پر غلبہ حال ہوا تو آپ آبادی سے دور جنگلوں میں نکل گئے۔ اس عالم میں یا تو بابا جی گریہ وزاری کرتے خود کو بی کرتے۔ اس حالت میں منہ سے جو کہہ دیتے پورا ہو جاتا۔ پورے بارہ سال یہی جذب و مستی کا عہد رہا۔ پھر جالندھر میں میاں خدا بخش سلسلہ قادریہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ جو کچھ مرشد نے کھلایا بابا فضل شاہ نے کھایا جو پہنایا تن کیا۔ سنا ہے چودہ سال زیرِ تربیت رہ کر چار مقامات پر تصرف ہو گیا..... پہلا قول..... دوسرا عمل، تیسرا احسن اخلاص یعنی تصوف کا بی۔ اے پاس کر لیا اور میاں خدا بخش سے لوگوں سے میل جول کی اجازت مل گئی۔

کچھ دیر بعد بابا جی تشریف لائے۔

''ناں ناں وھی رانی نے نہیں اٹھنا۔''

بابا جی نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، کھدر ہی کا تہمد اور موٹی ململ کا صافہ پہن رکھا تھا۔ چائے پر میں نے دیکھا کچھ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور بار بار پیالے کی مٹھاس پر اُڈ آتی تھیں۔ میں نے پہلے تو رومال سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن پھر ان سے چھٹکارا پانے کے لیے پیالہ پرچ میں اُوندھا رکھ دیا۔

''ناں ناں وھی رانیے۔ سیدھے کو کبھی اُلٹا نہیں کرتے۔''

یہ تربیت کا پہلا جملہ تھا۔ میں دورنگی دنیا کی باسی تھی۔ جہاں اُلٹا کرنا اپنی ذہانت اور برتری کا ثبوت تھا۔ دوسرے کے نقص بیان کرنے سے اپنی برتری ثابت کی جاتی تھی۔ مجھے یوں ڈائریکٹ انداز میں کسی نے نہ ٹوکا تھا۔ خیال تھا کہ بابا لوگ یا تو خواہشیں پوری کرتے ہیں یا پھر جپ تپ، ورد وظیفہ آپ کی حوالگی میں دے دیتے ہیں۔ اُلٹے کو سیدھا کرنے کی ترغیب کبھی نہیں دیتے۔

اس روز کے بعد عموماً میں خاں صاحب کے ساتھ ڈیرہ پاک جانے لگی لیکن میرا رویہ محتاط ہو گیا۔ ابھی عرصہ وہاں جاتے نہ گزرا تھا کہ بابا جی نے ایک روز مجھ سے ڈیرے پر کڑاہی گوشت پکوایا۔ میں گھر سے اپنی کڑاہی ساز و سامان لے کر گئی۔ جب کڑاہی تیار ہو گئی تو بابا جی نے ذرا سا چکھ کر کہا ''کھری ہے کھری..... لیں میاں صاحب..... لنگر میں بانٹ دیں۔''

اس وقت خوش ہو کر خاں صاحب نے بابا جی کو دعا دی۔ ''بیان اور بڑھ جائے گا۔ بیان اور بڑھ جائے گا۔''

نوٹ! بیان اور بڑھ جائے گا''

غالباً یہی وہ لمحہ تھا جب ''زاویہ'' پروگرام کی نیو رکھی گئی۔ ''تلقین شاہ'' کو قبولیت کا شرف عطا ہوا۔ سنا ہے کچھ روحیں جو اپنے لیے کچھ نہیں مانگتیں، ہر صورت راضی برضا رہتی ہیں۔ ان کی آرزو کو حق تعالیٰ فوراً مان لیتے ہیں اور وہ مستجاب الدعوات بن جاتے ہیں۔ منہ سے جو کچھ لوگوں کے لیے مانگتے ہیں، پورا ہوتا ہے۔

جس طرح مجھے ڈیرہ پاک لے جا کر خاں صاحب نے محوِ حیرت کیا اسی طرح ہولے ہولے بچوں کو بھی دنیا کے مختلف رنگ دکھانے کے لیے ساتھ لے جانے لگے۔ ہم شام کے وقت پی ڈبلیو آر کی کلب میں سوئمنگ کے لیے

تے تھے۔ خاں صاحب بڑے اچھے تیراک تھے اور وہ بڑے آرزومند تھے کہ بچے اس طرح تیرنا سیکھیں گویا مچھلی ہیں۔
بچہ پانی کے چھینٹے اڑاتا شپ شڑپ پاؤں چلاتا تو ان کی رومن ناک پر تھوڑی سی ناخوشگواری کے آثار پیدا ہو
تے۔ وہ کہتے چاہے بٹر فلائی سٹائل ہو چاہے فری سٹائل تیرنے کی شرط ہے شور شرابہ نہ ہو...... نہ پانی میں نہ اپنے اندر۔
پی ڈبلیو آر کی یہ کلب نہر سے کچھ ہٹ کر اندر کی طرف تھی۔ نہانے کے بعد بچوں کو بھوک لگ جاتی۔ میں گھر سے
سے بنا کر لے جاتی تھی۔ اشتیاق منزہ بھی آ جاتے۔ ہم اپنے ساتھ کبھی کبھی آپا صابرہ اور روجی کو بھی لے جاتے۔ اچھی
پکنک کا سماں بن جاتا۔

ایک روز پی ڈبلیو آر کے سوئمنگ پول کے بعد اچانک خاں صاحب بچوں کو ڈیرہ پاک لے گئے۔ ہم نے تہہ
خانے میں بیٹھ کر لنگر کیا۔ انیق، انیس اور اثیر حیرانی سے چاروں کھونٹ دیکھ رہے تھے۔ پتہ نہیں ان ناپختہ ذہنوں نے اس
کا کیا اثر لیا ہوگا؟ اتنا ضرور لگتا تھا کہ اس Exposure سے وہ خوفزدہ سے تھے۔ جب ہم گھر جانے کے لیے تہہ خانے
سے نکلے تو اچانک بابا جی کفگیر دیگچہ چھوڑ کر باہر آ گئے۔ انیق احمد خاں کی طرف دیکھ کر انہوں نے سوال کیا...... ''بیٹے کا
نام کیا ہے؟''

''انیق...... بابا جی انیق۔'' خاں صاحب نے جواب دیا۔

''نیک سے انیک...... تمہارا یہ بیٹا مغرب میں چلا جائے گا اور بہت سرفراز ہوگا...... نیک سے انیک......
نیک سے انیک......'' کہتے ہوئے وہ لنگر والے اڈے پر واپس چلے گئے اور چوکی پر بیٹھ کر کفگیر سے روغنی پیالے میں شوربہ
ڈالنے لگے۔ یوں لگتا تھا گویا انہیں علم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں؟ عجب سی بات ہے لیکن 1989ء میں انیق بیٹا امریکہ چلا
گیا اور اب 2008ء تک وہیں ہے۔

بابا جی کے ڈیرے پر جانا، وہیں لنگر کرنا، مزے اڑانا، خالی الذہن ہونا، فکر فاقے سے اپنے آپ کو آزاد کرنا میرا
وقت گزارنے کا نیا طریق تھا۔ نہ کبھی ان کے درجات کے متعلق سوچا نہ کبھی اس طرف دھیان گیا کہ ان کے کشف و
کرامات سے کچھ مجھ میں تبدیلی آ رہی ہے۔ یہ خاں صاحب کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ وہ پتہ نہیں کس تلاش میں تھے۔ انہیں بابا جی
کے قول زریں مرہم بن کر لگ رہے تھے۔ وہ ایمان کی نہج درست کرنے کے درپے تھے یا انہیں واقعی خدا کی تلاش تھی؟
اس بات کا راز کبھی مجھ پر نہ کھلا۔ اتنا مجھ پر واضح تھا کہ بابا جی چند ذومعنی با معنی اور معنی در معنی جملے بول کر اپنے کام میں
مصروف ہو جاتے اور ہمیں ڈاکٹر اشرف فاضلی کے سپرد کر دیتے جو ان کی وصیت کے مطابق قول کے بھی بادشاہ ہیں اور
ویسے بھی بادشاہ ہیں۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات جھٹپٹے کے قریب ہوئی۔ دبلے پتلے، صاف
ستھرے سفید شلوار قمیض میں ملبوس ڈاکٹر صاحب ہم سے دور کھڑے تھے۔ بابا جی نے انہیں آواز دیئے بغیر بلایا۔

''سرکار مجھے بلایا؟'' ڈاکٹر صاحب نے پاس آ کر استفسار کیا۔

''یہ ہمارے جانی جان آئے ہیں۔ انہیں اپنے حجرے میں لے جائیے۔''

ڈاکٹر صاحب بہت ذہین، نکتہ بین، بابا جی سے تھوڑی بہت Liberty لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے
ملنے لگے۔ جب پہلی بار میں ڈیرہ پاک گئی تھی ڈیرے کے راستے پر دائیں ہاتھ مجھے ایک ماڈرن قسم کا اپارٹمنٹ نظر آیا تھا،

جس کے دروازے پر براؤن پینٹ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ صاف ستھرائی، نفاست اور آرائش میں یہ حصہ ڈیرے کا حصہ
تھا۔ ہم اندر گئے، نشست گو فرشی تھی لیکن فرش پر قالین اور آرام دہ گدیاں، گاؤ تکیے دھرے تھے۔ قریب ہی پلنگ تھا جس پر
مخمل کی رضائی تھی۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں آراستہ تھیں۔

یہاں سے ایک اور Association شروع ہوگئی۔ باباجی گفتگو، تبادلہ خیال کے مجلسی آدمی نہ تھے۔
کبھی کوئی تعلیم دینے پر آمادہ ہوتے انگلی اُٹھا کر فرماتے۔ نوٹ

''عمل کو فضیلت نہیں رخ کو فضیلت ہے۔''

''ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔''

''درد سے مرد بنتا ہے درد نہ ہو تو مرد نہیں۔''

''عمل سے علم حاصل ہوتا ہے۔''

''سوال نہیں جواب بنو۔''

باباجی اپنی دانشمندی، تجربہ، فضیلت، احساسِ حق کوزے میں بند کر کے پیش کر دیتے اور پھر مصروف ہو جاتے۔
چودہ برس مستی پہرہ میں رہنے والا مجذوب بابا اپنی بولی بول کر راز جاتا۔ اسے تشریح، تعبیر، غرض وغایت سے کوئی تعلق نہ تھا۔
بس سمت درست کرتا اور باقی سب کچھ آپ کی ذات کے انتخاب کے لیے چھوڑ جاتا۔

ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے خوش گفتار تھے۔ اب ہم جب ڈیرے پاک جاتے ان کے پاس حجرے میں
لنگر کرنے لگتے۔ مزیدار چائے بار بار آتی۔ جو کچھ نہ کھا سکتے، ساتھ پیک کر دیا جاتا۔ یہاں کے کھانوں کا بھی جواب نہ
تھا۔ سارے سالن لذیذ ہوتے۔ ڈیرے پاک کی کوئی ہانڈی کبھی ایسی نہ ملی جسے بدمزہ کہہ سکیں۔ وہ موسمی سبزی ہو،
پرانی دال ہو یا یکجا کیے ہوئے کئی سالن، دیسی گھی کا تازہ بگھار گرم گرم تندوری روٹیاں اشتہا تیز کرنے والے یہ کھانے
کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ملے نہ کبھی اپنے گھر میں نصیب ہوئے۔

طوائف کے ڈیرے پر تماش بین کے لیے دو ضرورتوں کا اہتمام ہوا کرتا ہے۔ وہاں جنس اور اشتہا کو
انسانی کمزوری سمجھ کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ ڈیرے پر صرف اس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ بھوکا آدمی درست نہیں سوچ
سکتا۔ پہلے بھوکے کی بھوک مٹاؤ پھر اس سے اس کی فہم و فراست کے مطابق جانچ تول کر بات کرو یعنی جس قدر کسی میں
کیو ہے۔ بات بھی اس کی سمجھ سے بالا نہ ہونی چاہیے ورنہ قول بے اثر ہوگا اور عمل بھی تبدیل نہ ہو سکے گا۔ جو بات
پلے نہ پڑی اس پر عمل کیسا؟

ڈاکٹر صاحب خود کبھی کچھ نہ کھاتے۔ ہمیں ہی کھلائے جاتے۔ ایک روز میں نے پوچھا...... ''ڈاکٹر صاحب
جی کیا شوق سے کھاتے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''کبھی کبھی کوئی ہڈی چوس کر رکھ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں ہڈیوں کا چورا ساتھ
چاہیے۔ یہ تو کتوں کی خوراک ہے، ہڈیاں ان تک پہنچنی چاہئیں۔ ہڈیوں کو دانتوں تلے دبانے والا عموماً خود غرض ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب باریک بین ہیں۔ بال کی کھال اتارنا ان کے جینز میں ہے۔ وہ فضل شاہؒ کے نوری جال میں

۔۔۔تو سوتے وقت شہد استعمال کرتی تھی۔ اسے Honey mania تھا۔ وہ اس کی تاثیر، اس کے اجزاء، افادیت سے ۔۔۔ واقف تھی۔

یوں لگتا تھا وہ شہد آمیزی کے گُر حاصل کر کے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ شہد کے علاوہ اس نے مجھے اسلام ۔۔۔ گھونٹ ہولے ہولے پینا سکھایا۔ میں ہر مسلمان کو کرودھ کی نظر سے دیکھتا، اُس کے ہر عمل کو دیر تک پرکھتا جانچتا ۔۔۔ قائم کر لیتا تھا۔ شروع شروع میں جب میں بر.جی کی محبت میں سر کے بل نہیں گرا تھا تو وہ مجھ پر توجہ صرف کیے ۔۔۔ تھی ۔۔۔ "Jen Kius کبھی کسی ختنہ شدہ مسلمان کے بچے سے دوستی نہ کرنا۔ وہ تمہیں دغا دے گا لامحالہ ....."

"لیکن ختنے تو حضرت موسیٰ کی امت بھی کرتی ہے بر.جی۔"

"ہماری اور بات ہے ..... لیکن یہ ختنے شدہ کتے بڑے فتنے ہیں فتنے۔"

پتہ نہیں انسان کی یہ کیا کمزوری ہے۔ اپنے میں وہی بات بری نہیں لگتی، دوسرے میں عین مین وہی عیب ناقابل ۔۔۔ ہوتا ہے۔ تو آغاز محبوبہ سے چھیڑ چھاڑ میں بڑا لطف ملتا ہے۔ میں بر.جی سے کہتا ..... "بڑے افسوس کی بات ہے تم ۔۔۔ فلسطین کا جو حال کر دیا پھر بھی تمہارے دل میں ان کے خلاف بغض بھرا پڑا ہے۔"

"یہ ہماری سرزمین ہے۔"

"کیسے بھئی کیسے ..... زمین تو غالباً ساری خدا کی ہے۔"

"اس لیے کہ حضرت موسیٰ اسی ریگستان میں میرے آباؤ اجداد کو لائے تھے۔" بر.جی طرارہ بھرتی۔

"اور تم لوگوں نے یہاں آباد رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ تم من و سلویٰ کھاتے کھاتے تھک گئے تھے۔ یکدم تم نے ۔۔۔ اور مسور کی دال مانگے تھے۔ یاد ہے ....." میں نے اسے محض گرم کرنے کے لیے کہا۔

بر.جی نے میرے سینے پر دو ہتھڑ مارے اور چلا کر کہا ..... "کرچین کرچین!"

"میں نہیں میری ماں کرچین ہے اور وہ بھی رومن کیتھولک ..... میں تو کچھ بھی نہیں ..... کہو تو یہودی ہو جاؤں۔"

"یہودی ہوتے نہیں ..... یہودی پیدا ہوتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ تم یہودیوں کے لیے اتنی سخت باتیں کیوں ۔۔۔ ہو۔"

میں اب منانے کے انداز میں کہتا ..... "پیاری بر.جی! جس قوم میں بر.جی پیدا ہو جائے اس کے متعلق کوئی سخت ۔۔۔ کر سوچ سکتا ہے۔"

"چلو خوشامدی جھوٹے!"

"اگر ایک بات کہوں تو برا تو نہ مانو گی۔" میں نے کہا۔

"کہو۔"

"یہ جو اسرائیل کا خطہ ہے جس کے اردگرد تمہاری گولڈا مائیر کسی کو قدم دھرنے نہیں دیتی۔ یہ جنت تمہیں ۔۔۔ نے دلائی ہے۔"

"ناں ناں ناں۔ کوئی یہودیوں کی وجہ سے نہیں منکر ..... یہ عیسائیوں کی یہود پرستی نے نہیں اسلام دشمنی نے یہ

خطہ دلوایا ہے۔ عیسائیوں کو ہم سے محبت نہیں لیکن انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے۔ اتنی نفرت اتنی نفرت کہ وہ مسلمانوں [illegible] کرنے کے لیے یہودیوں سے محبت کرنے کو بھی برا نہیں جانتے۔ ہم تو سانجھے دشمن کی محبت میں ایک ہوئے ہیں۔"

"عیسائیوں کو یہودیوں سے نفرت......؟ توبہ کرو توبہ۔"

"تو جرمنی سے ہمیں نکالنے والے کون تھے؟"

"ہم امریکن تو نہیں تھے۔ ہمیں تو یہودیوں سے عشق ہے۔"

میں اسے منانے کی کوشش کرتا لیکن وہ چپ ہو جاتی، اندر سے اُبلتی رہتی۔ برجی میں اس قدر جوش [illegible] عزم، ایسی تیز استدلالی قوت تھی کہ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر اسی موضوع پر گتھم گتھا ہو جاتی۔

ایک روز ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ براڈلاف کی لان پر پانی کی بوندیں، برجی کے براؤن بالوں [illegible] قطرے تھے۔ ہم چوری چوری تخلیقی ادب کی کلاس سے نکل کر چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھے۔ کافی کے ساتھ سکونز پر شہد لگا کر کھاتے رہے۔ اس روز برجی نے مجھے ایک خوبصورت ماؤتھ ہارمونیکا دیا۔ میں نے اس پر [illegible] سے بجایا۔

Should old acquaintance be for God

And never brought to mind

جھپٹ کر برجی نے مجھ سے ہارمونیکا چھین لیا اور سختی سے بولی۔ "اس لیے کر دیا ہے کہ تم ابھی سے مجھے واقف کار بنالو...... اچھا شکریہ ہے۔"

ہم دونوں نے کافی ختم کر کے پھر لمبی گھاس گاہوں کا رخ کیا۔ بے مصرف ادھر اُدھر...... کبھی مشرق کی [illegible] مغرب کی جانب۔ پھر برجی نے یورپ کے پناہ گزینوں کی باتیں شروع کر دیں۔ "میری ماں برلن سے بھاگ [illegible] گئی۔ فرانس میں بھی نازیوں کا راج تھا۔ اس نے تین دن انڈر گراؤنڈ گٹر میں چھپ کر بسر کیے۔ پھر وہ ایک نازی [illegible] چڑھ گئی۔ اس نے پورا ایک ماہ میری ماں کو وحشیوں کی طرح استعمال کیا اور بعد ازاں فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ [illegible] میری ماں کا کیا قصور تھا۔ بتاؤ اس میں میرا کیا جرم ہے کہ میں یہودی ہوں۔"

میں نے اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کیے اور زہرناک گفتگو جاری رکھی۔ "برجی! تمہا[illegible] صدیوں سے اصل مسکن کی تلاش میں ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے ظلم تو سہے ہیں۔ تمہیں تو مظلوموں سے محبت ہونا چاہ[illegible]

"ہے...... ہے ہم ظلم کو کسی روپ میں برداشت نہیں کرتے۔"

"پھر ان فلسطینیوں کے متعلق کیا حکم ہے جنہیں اپنے ہی ملک میں تمہاری وجہ سے جلاوطنی نصیب [illegible] برسوں سے غاروں میں رہتے ہیں اور اسرائیل کی طرف چہرہ اٹھا کر یوں دیکھتے ہیں جیسے زمین سورج کی طرف [illegible] ہے...... ہر صبح۔"

برجی کا سر میرے سینے تک آتا تھا، اس نے بازو اٹھا کر میرے سینے پر مکّوں کی بارش کر دی۔

"تم بھی Philistine ہو...... فلسٹین...... فلسٹین۔"

جب بر جی بھڑک اٹھتی تو میرے مسام کھل جاتے۔ میرے لہو کی گردش تیز ہو جاتی۔ میں مکمل طور پر اس کا ۔۔۔ ہو جاتا۔ جوں جوں برجی بھڑکتی، مجھ میں شہوت کی زیادتی کچھ ایسی ہو جاتی کہ میرا جی چاہتا میں برجی کو پلیٹ میں ۔۔۔ کے جسم کے نازک مقامات کو چھری کانٹے سے کاٹ کاٹ کر کھا جاؤں۔

ان ہی دنوں جب برجی نے مجھے ہتھیلی پر شہد ڈال کر چاٹنا سکھایا، میں نے اسلام دشمنی کا سبق بھی ورق ورق ۔۔۔ پڑھا۔ میں نے اسی کی دوربین لگا کر ہر مسلمان کو جانچنے، پرکھنے اور دھتکارنے کا عمل سیکھ لیا۔ ایسی ہی گرید ۔۔۔ میں مجھے سوڈان کا سیاہ فام داؤد نظر پڑا۔ اس ادیب کی جلد اتنی سیاہ تھی کہ ترچھی روشنی میں اس کی جلد تھوڑی ۔۔۔ بھی نظر آنے لگتی۔ اس کا قد مجھ سے دو انچ چھوٹا تھا۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر کبھی احساس نہ ہوتا کہ وہ کس ۔۔۔ کا آدمی ہے۔

اس کی چال میں وقار، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، آواز میں مدھم آرگن کا سوز تھا۔ وہ بات سننے سے پہلے بات ۔۔۔ دیتا۔ ہر مناظرے میں آپ کو جیت جانے کے موقعے بہم پہنچاتا۔ اپنی چیزیں دوسروں میں بانٹ کر راحت ۔۔۔ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے بڑا Honored محسوس کرتا۔ بس میں ہم جماعتوں کی ٹکٹیں خرید کر بھی ۔۔۔ نہ کرتا۔ جب کبھی کسی کے ساتھ کھانا یا چائے کافی پیتا کبھی ڈچ (Dutch) کرنے پر اصرار نہ کرتا بلکہ سارا بل خود ۔۔۔ کسی کے ساتھ چلتا تو سارا راستہ چھوڑ کر ذرا سا پیچھے رہ کر ہم سفری اختیار کرتا۔ اپنے لائبریری کارڈ پر دوسروں کو ۔۔۔ کرا لینے دیتا۔ اپنے کوپن دوسروں کو مستعار دے دیتا۔ داؤد ساری کلاس سے مختلف تھا۔ شاید اسی اختلاف کے ۔۔۔ ہم سب میں نمایاں بھی تھا۔

''برجی! تم داؤد کے رنگ کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو؟''

''نہیں...... میرے کئی سیاہ فام لوگ اچھے دوست ہیں۔''

''پھر اس کی آنکھیں، بال...... وہ تم سے مختلف ہے اس لیے۔''

''نہیں۔''

''پھر اس نفرت کی وجہ کیا اس کا اخلاق ہے؟''

''خاک اچھا اخلاق ہے۔ سارا ڈرامہ ہے ڈرامہ...... وہ ساری کلاس سے اپنے احساسِ کمتری کو چھپا کر اپنے ۔۔۔ تر ثابت کرنے کی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا خاص اخلاقی طریقہ...... ہینگ اٹ۔''

''شاید یہی انسانی عمل کی معراج ہے۔ اخلاق کی جیت۔''

''بھاڑ میں جائے داؤد، اس کا اخلاق غارت ہو، برباد ہو۔''

''اتنا غصہ، اتنا غصہ...... اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی تمہیں نہیں دیکھا۔ شاید سڑک پر وہ تمہیں پہچان بھی نہ ۔۔۔'' میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

''ہاں نہیں دیکھتا۔ یہ کمبخت مسلمان یہ تعدد ازدواج کے بھوکے...... شہوت خورے۔ یہ ہر عورت کو دیکھتے ۔۔۔ ماں بیٹی بہن کسی کو نہیں چھوڑتے حرامی۔ اپنی کزن سے شادی کر لیتے ہیں۔ چوری چوری دیکھتا ہوگا مجھے۔ جانتا

ہے میں اسے قتل کردوں گی اگر اس نے سید ھا دیکھا۔''

''غالباً تمہاری خواہش ہے کہ وہ تمہیں دیکھے، جب نہیں دیکھتا تو تمہاری ہیٹی ہوتی ہے۔''

پہلی مرتبہ برجی مجھ سے سنجیدہ طور پر ناراض ہوگئی۔ اس نے کلاس میں میرے ساتھ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ براڈلاف کی خوبصورت لانوں پر ٹہلنے کے لیے ہم اکٹھے نہ نکلتے۔ مجھے معافی نامہ لکھ کر اسے منانا پڑا۔

اس واقعے کے قریباً دس روز بعد ہم سارے نوآموز ادیب رات کو دس بجے ہوسٹل کے کامن روم میں اکٹھے ہوئے۔ ہمیں برجی کی سالگرہ میں شریک ہونا تھا۔ سالگرہ میں شمولیت کے لیے سب کو اپنے اپنے کمرے سے کچھ کھانے کی چیز لے کر پہنچنا تھا۔ میں نے شراب کی دو بوتلیں پھولوں کی ٹوکری میں سجائیں اور لٹکتا مٹکتا پہنچا۔ داؤد مجھے دروازے میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے راستہ چھوڑ دیا اور بڑے سے کیک کو سنبھالتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

سارا ہنگامہ اس خوبصورت کیک کی وجہ سے ہوا۔ دو فٹ چوڑے اور چھ فٹ لمبے کیک پر ایک نخلستان بنا تھا۔ ہم سب نے اونچے اونچے ہپی برتھ ڈے ٹو یو گانا شروع کیا۔ سب سے خوبصورت آواز داؤد کی تھی۔ کسی نے برجی کو کاٹنے والی چھری پکڑائی۔ کیک پر جلنے والی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں جگمگ جگمگ جل رہی تھیں۔ برجی اپنی جگہ سے مس نہ ہوئی۔ آوازیں رُک گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھانے لگی۔

''چلو برجی اتنی تنگ نظر نہ بنو۔ کیک کاٹو۔''

''میں کسی مسلمان آدمی کا تحفہ قبول نہیں کرسکتی۔ یہ کیک داؤد لایا تھا۔''

داؤد نے آہستہ سے کیک اٹھایا اور غالباً وہ اس وقت محفل سے چلا جاتا، اگر کچھ لوگ اسے پکڑ نہ لیتے۔

''نہیں بھئی تمہیں ہم ہرگز ہرگز نہیں جانے دیں گے۔''

برجی بڑی ہر دلعزیز لڑکی تھی لیکن چار فٹ گیارہ انچ میں سارا بارود ہی بھرا تھا۔

''جانے دو جانے دو...... میں ایک کالے آدمی کی خاطر اپنی پارٹی خراب نہیں کرسکتی۔''

داؤد جو اب دروازے سے تھوڑی ہی دور تھا، یکدم رک گیا۔ جیسے فلموں کے ہیروز کا کرتے ہیں۔ پھر وہ اونچی آواز میں بولا...... ''کالا آدمی؟ کیا حضرت آدمؑ سفید تھے...... کیا حضرت موسیٰؑ کی جلد، حضرت عیسیٰؑ کا وجود سفید تھا؟ لوگوں نے انہیں اپنے جیسا بنا لیا ہے لیکن وہ صحرائی تم جیسا نہ تھا، ہم جیسا سیاہ آدمی تھا۔''

اب فضا میں قہقہے ابھرنے لگے۔

''یہ ہے مسلمانوں کی ذہنیت، یہ ہے ان کی عقل اور پھر کہتے ہیں Dark Ages میں ان کی تہذیب اور سائنس عروج پر تھی۔ یہ تو ان کا علم ہے اب۔'' برجی نے اونچی آواز میں کہا۔

کہیں سے ایک کریم رول اڑ کر داؤد کے ماتھے پر لگ کر کہیں گرا۔

''مسلمان Barbarians تو ہوتے ہی ہیں۔ آج پتہ چلا احمق بھی بلا کے ہیں۔ کیک لے آئے بے وقوف۔'' برجی کی ایک دوست بولی۔

کہیں سے ایک اور آواز آئی۔ ''بھئی تم لوگ توحید پرست کہلاتے ہو تو پھر مکہ میں جا کر حجر اسود کیوں چومتے ہیں۔ یہ بت پرستی نہیں ہے؟''

''Idolatry......بت پرستی......بت پرستی......'' کچھ کورس میں کہنے لگے۔ اب عیسائی اور یہودی اسلام دشمنی میں ہم مشرب بن گئے۔ کہیں سے ایک سینڈوچ داؤد کے سر کو چھو کر دیوار سے ٹکرائی۔

''شیم شیم اتنی شادیاں۔ عورتوں کے حقوق نہیں جانتے تم مسلمان لوگ۔''

اب جیلی کا ایک تودہ داؤد پر آ گرا۔ اس کے خوبصورت سوٹ پر جا بجا گوشت کے لوتھڑے سے چپک گئے۔ وہ چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے دھری چھوٹی سی میز پر کیک دھر دیا۔ اسے نہ نخلستان کی پروا تھی نہ اپنے اوپر گرنے والی چیزوں کی۔ وہ آسانی سے اس ذلت سے بھاگ بھی سکتا تھا لیکن نہ جانے وہ صبر کی کونسی کیل تھی جس سے وہ بندھ گیا۔

کسی کسی لمحے میں بڑا جادو ہوتا ہے۔ موقع فراہم کیا جاتا ہے آپ کی جہت سمت بدل جاتی ہے۔ میں پتہ نہیں کیسے داؤد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بر جی بھاگ کر میرے پاس آئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے سینے پر مکے مارتے ہوئے کہا۔ ''اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ جنگلز۔''

پتہ نہیں کیوں میری ساری محبت کہیں کافور ہو چکی تھی۔ میں نے بر جی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''اپنے سارے دوستوں کو لے کر باہر چلی جاؤ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔''

محفل خاموش ہو گئی۔

میں نے پلٹ کر داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کے آبنوسی چہرے پر آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے سامنے رکھے کیک کے نخلستان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''داؤد......'' میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''مجھے رحم کی ضرورت نہیں ہے دوست۔ میں ان کی ہر بات کا جواب دے سکتا ہوں لیکن میں...... طائف پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس لمحے صلح نامہ حدیبیہ کو اپنے پروارد ہوتے پہچان لیا۔ میں کوڑا پھینکنے والی مائی بر جی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ ہی کے نبی نے تو دوسرا گال پیش کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ پھر...... پھر یہ سب کیا ہے؟''

وہ چپ چاپ کیک وہیں چھوڑ کر بڑے بڑے قدم دھرتا چلا گیا۔

اس وقت بابا جی نور والے اندر آئے۔ پتہ نہیں وہ بروقت آنے کا علم کیسے جانتے تھے۔ شمس نے اپنی رام کہانی ختم کی۔ سروقد کھڑا ہو گیا اور بابا جی سے کہنے لگا۔ ''بابا جی! میرے وطن میں اتنا علم ہے، اتنا عمل ہے۔ ہم علم میں اس قدر specialize ہو چکے ہیں کہ کامن پن کا سرا کہیں اور بنتا ہے اور اس کی سوئی کہیں اور تیار ہوتی ہے۔ ہم میں Specialization کا رواج ہے۔ ہم Communication کے دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے Specialization اور Communication۔ ہم وہ تمام جنسی خیالات جو چار سال کی عمر میں ہم پر سکول سے وارد ہوئے۔ سب دوسروں سے communicate کرنا چاہتے ہیں۔ پوچھیے پوچھیے ہولی مین سے کیا افہام و تفہیم اس قدر ضروری ہے۔ کیا بر جی کی طرح

مجروح کرنے والا سچ بولنا ضروری ہے؟''

بابا جی نے فرمایا۔''پُت شمس! سچ اپنے متعلق بولا جاتا ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ کو مدت
ضرورت ہو اور آپ لوگوں کی نظر میں اپنا قد گھٹانا چاہتے ہوں۔''

خاں صاحب نے باباجی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''اور باباجی افہام و تفہیم کے لیے بولنا۔''

''یعنی مناظرہ کرنا۔ بحث مباحثے میں داخل ہونا۔''

''جی ہمیں تو Discussions کا بہت شوق ہے۔'' خاں صاحب نے اعتراف کیا۔

''جان لو صاحبو! مناظرہ جب بھی ہوتا ہے کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور شوکتِ نفس کے لیے کیا جا
ساری محفل کو ایک اُمّی نے چپ کرا دیا۔

جب ترجمہ کر کے شمس کو معنی سمجھائے گئے تو اس کی نیلی آنکھیں جیسے وجد میں بھر آئیں اور پھر ہو
کہنے لگا۔'' داؤد سچا تھا...... داؤد سچا تھا...... ایک اور بھی علم نافع ہے نبیوں کا علم...... جسے آج کا پڑھا لکھا Secular
بھولتا جا رہا ہے۔ بھولتا جا رہا ہے۔ بدنصیب۔''

باباجی گویا شمس کے سوال کا جواب دینے آئے تھے۔ ترنت ہی وہ واپس چلے گئے اور اس سے آگے کو
کی۔

شمس کی باتیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا شمس مغرب کے ایسے والدین کا بیٹا تھا جو دنیا بھر کی
کم عمری میں بچوں کو پیش کر کے زندہ رہنے کی Excitement بچوں سے چھین لیتے ہیں، جو سات برس سے
شکار ہو کر بیس برس کی عمر میں گرہست آشرم میں داخل ہو جاتے ہیں اور چند سال یہاں بسرام کر کے جنگلوں
شہروں میں، نئے کلچروں میں اپنا آپ گنوانے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کیا ہپی تحریک ایسے ہی سرچشمہ
ہاری تحریک تھی؟

یا شمس کسی ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جہاں ماں باپ بچے کو کوالٹی ٹائم دے کر بری الذمہ ہو جاتے
جہاں ماں باپ کو علم نہیں کہ دھرتی تو ہمہ وقت سورج چاہتی ہے۔ بچہ تو ہمیشہ ماں باپ کی توجہ کا طالب ہوتا ہے۔
ہو کر اپنی ذات کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسے کسی کوالٹی ٹائم سے سیر نہیں کیا جا سکتا۔

کیا شمس مہاتما بدھ کا پیروکار تھا...... سب کچھ تیاگ چکا تھا۔

کیا شمس صابئین میں سے تھا؟ ایسا پرہیزگار جو بستی بستی تلاشِ حق میں نکلا کرتے ہیں؟

ہو سکتا ہے وہ سی آئی اے یا کسی اور فارن ایجنسی کا ایجنٹ ہو جو بھیس بدل کر جیبوں میں ننھے ٹیپ ریکارڈ
کر جگہ جگہ کی رپورٹ بھیجے کرتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وطن واپسی پر شمس ہمارے لوک ریت میں ڈوبے پسماندہ ملک
کتاب لکھنے والا ہو جیسی مارگریٹ میڈ، روتھ Benedict نے لکھی۔ رسم و رواج، لوک ریت، دھرم راج کی گنجلک
مجھے بھی ہمیشہ کی طرح شمس کی اسلام قبولی پر پورا اعتماد نہ تھا۔ میں بھی سونے میں کھوٹ کی تلاش میں تھی۔

شمس خاں صاحب کے قریب بیٹھا تھا اور بڑی رازداری سے کہہ رہا تھا......'' پتہ نہیں کیوں میں آپ

...نے پر مجبور ہوں لیکن کوئی چیز مجھے اکساتی ہے کہ میں سب کچھ بتاؤں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل۔ شاید میں اپنے اوپر ...بتا ہوں۔ سنیئے اشفاق صاحب! میں ایک مرتبہ زبردست اسلام دشمنی کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ...جب نفرت کا چکر پورا مکمل ہو جاتا ہے تو پھر محبت کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنڈولم بھی ایک ہی سمت میں ...

یہ جملہ بول کر شمس خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنا سر زانو پر دھر لیا۔ اس وقت نہ جانے وہ قونیہ میں تھا کہ براڈلاف ...ستان کے کسی زاویے میں بیٹھا تھا کہ عراق کی گلیوں میں۔ ہم نے اسے واپس لانے کی کوشش نہ کی اور چپ ...گئے۔

خاں صاحب بہت آہستہ آہستہ کھانا کھاتے تھے۔ خاص کر جب ان کے سامنے والے دانت اور پچھلی داڑھیں ...وہ تیزی سے کھانا چبا نہیں سکتے تھے لیکن سمن آباد میں ہی جب ان کا وزن بڑھنے لگا اور وہ پہلی بار ڈائٹنگ کی ...ہوئے تو وہ ایک ٹفن دان خرید لائے۔ اس کے تین ڈبوں میں سبزیاں اور نچلے ڈبے میں پانی ڈالا جاتا تھا۔ پھر ...پر رکھ کر پکاتے۔ نچلے پانی میں بھاپ پیدا ہوتی اور سبزیاں اسی بھاپ میں پک جاتیں۔ پھر احتیاط سے ڈبہ ...

عموماً یہ ٹفن کیریر یا تو محمد علی کھولتا یا پھر خاں صاحب خود دھیان سے اسے نکالتے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں ...ہوں۔ میں ڈبہ کھولتے ہوئے گرم پانی اپنے پر انڈیل سکتی ہوں۔ خود گر کر ڈبے کو اپنے اوپر گرانے کی اہل ہوں۔ ...دھیان، اپنے خیال میں مگن قسم کی روح تھی کہ ٹوتھ برش پر پیسٹ لگانے کے بعد ٹیوب کو ڈھکنا لگانا بھی بھول ...کراتے' ٹیوب بند کرتے اور پھر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتے ''حرام دیئے ڈھکنا تو لگا دیا ...ٹیوب سوکھ جاتی ہے۔''

ان کے موٹاپے کا مجھے تب کم احساس تھا اور انہیں زیادہ۔ جب ان کے دانت نہیں ٹوٹے تھے لیکن تب بھی وہ ...آہستہ آہستہ چبا کر اور مزے مزے سے کھاتے تھے۔ جیسے اللہ کی نعمت کو انجوائے کر رہے ہوں۔ اس کے برعکس ...ے ایسے کھانا کھاتی ہوں جیسے کتے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ ہر نوالے کے ساتھ میرے دماغ پر ان کاموں کی ...جاتی ہے جو نپٹانے سے رہ گئے۔ خطوں کے جواب، فون کال، سفارشی خط، استری والے کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ ...تیں مجھے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کو لیمن ڈراپ کی طرح چوسنے کا فن خاں صاحب کی عادت بن گئی۔ وہ بات کرتے تو ...سن کرنے کے لیے، کھانا کھاتے تو کام و دہن کو خوش کرنے کے لیے۔ لباس پہنتے چاہے وہ کھدر کا کُرتہ ہی ...نہ ہو، بڑے اہتمام سے۔ سوچتے تو ایک ٹانگ زانو کھڑا کر کے دوسری ٹانگ کو آدھی چوکڑی کی شکل میں اس طرح ...دوسرے پاؤں کو ہاتھ سے پٹپانے کے لیے خالی رکھتے۔ انہیں اس طرح نیم دراز آسن میں دیکھ کر لگتا جیسے آنند ...سادھو کسی مٹھ میں سمادھی لگائے براجمان ہے۔

وہ ہر کام کو پورا وقت دے کر اس کا احترام کر کے اس پر پوری توجہ صرف کر کے کیا کرتے تھے۔ سرکہ ڈالنا ہو،

انگیٹھی پر کباب لگانے ہوں، جڑی بوٹیاں کوٹنی ہوں، سکرپٹ لکھنا ہو۔ وہ کبھی بھاجڑ، بھگدڑ، بم پٹاخے سے بھاگ کر
کرتے۔

یہ بات تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ اشفاق احمد صوفی تھے یا نہیں تھے لیکن میں نے کالج میں ہی بھانپ
کہ ان کے تیور مختلف ہیں۔ ان میں دو باتیں عام لوگوں جیسی نہ تھیں۔ صوفی اور عام خلق میں واضح فرق
Handling کا ہے۔ اپنی فردیت کی سطح پر صوفی بھی ان ساری برائیوں میں وقتاً فوقتاً گرفتار ہوتا ہے جس سے
دوچار رہتا ہے۔ گندا اور صاف لہو ہر خاکی کے اندر بہتا ہے۔ وہ ہر مقام پر دوئی سے نبرد آزما ہے۔ صوفی بھی اپنے
نفس میں مبتلا رہتا ہے اور کبھی کبھی ناکام بھی ہو جاتا ہے۔

اسے بھی عشق ہو جاتا ہے۔

وہ بھی جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

وہ بھی قرض لے کر مکر سکتا ہے۔

حقوق العباد سے غافل ہو سکتا ہے۔

وہ ہر مقام پر ہر وقت اسی طرح خطرے کی زد میں رہتا ہے جس طرح آپ اور میں رہتے ہیں لیکن
صوفی اپنے چھوٹے بڑے گناہوں کو ہم سے مختلف طریق سے حل کرتا ہے۔ وہ اللہ کی قائم کردہ سرحدوں کو جہادِ نفس
کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہو یا اپنے آپ کو معاف
صوفی جلد یا بدیر اللہ کو راضی کرنے کا فن جانتا ہے۔

خاں صاحب نے مجھے نسخہ تو نہیں بتایا لیکن قرائن سے لگتا ہے وہ اللہ کو منانے، راضی کرنے اور اپنا کار
کا فن جانتے تھے۔ دوسرا اہم کام خلق کی رعایت سے ہوا کرتا ہے۔ صوفی برائی کرنے والے سے اللہ کی مخلوق سمجھ کر
جاتا ہے۔ چور کی چوری کو برا فعل سمجھتا ہے لیکن چور سے نفرت نہیں کرتا بلکہ چور کو قطب بننے میں مدد دیتا ہے۔ جھوٹ
جھوٹ سے نفرت کرتا ہے، جھوٹے سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ شرابی کی اس Failing پر ناخوش ہوتا ہے، لیکن شرابی
نہیں چھوڑتا۔

خاں صاحب ہر قسم کے لوگوں سے ملتے تھے۔ جن میں سارے شرعی عیب تھے، ان سے بھی اور وہ بھی
چھپ کر عیبوں کی چھالیہ چباتے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کسی کو اس کے عیب کی وجہ سے چھوڑتے نہیں دیکھا
گوشمالی کرتے۔ نہ نکتہ چینی۔ شاید چپکے چپکے دعا کرتے رہتے ہوں۔ شاید صدقہ خیرات کرتے ہوں لیکن اعلانیہ نہیں۔
نے مجھے نسخہ تو نہیں بتایا لیکن میں نے ان کی صحبت میں کئی ایسے لوگ دیکھے جو راستہ بھولے ہوئے تھے اور پھر اپنی
اپنی خوشی سے لوٹ آئے۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ خاں صاحب صوفی تھے لیکن بدی کی Handling میں ان کا وطیرہ صوفیوں جیسا تھا۔
Wisdom کے ساتھ ساتھ یہاں کی Folk Wisdom پر بھی ایمان تھا۔ وہ ایسے محاورے اکٹھے کرتے رہتے
مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔ شاید اسی بصیرت کی تلاش انہیں بار بار نور والوں کے ڈیرے پر لے جاتی۔ کچھ محاورے

کے لیے رقم کرتی ہوں۔

1-ہونٹوں میں نیشکر بونا۔

2-بھیڑ کو بھیڑیوں کی حمایت میں جانے کی ترغیب دینا۔

3- کسی سوئی کی دو تیز نوکیں نہیں ہوتیں۔

4-وہ شیر کی طرح پنجے سکیڑ کر بیٹھا ہے۔

5-ایسی آری کی طرح جس کے دونوں طرف دندانے ہوں۔

6-مٹر کا دانہ اپنی پھلی کو بھول جاتا ہے۔

7-جونک سانپ بننا چاہتی ہے۔

8-آگ لگ جانے پر کنواں کھودنا۔

9-ایک گونگے آدمی کے خواب کی طرح۔

10-وہ چیتھڑوں کی آگ ہے۔

11-قند کا بنا ہوا تیلا۔

12-مردہ گھوڑے کو نعل بندھوانا۔

13-جو درخت پر چڑھتا ہے وہ دوگنا دیکھتا ہے۔

14-شکر میٹھی ہوتی ہے خواہ اندھیرے میں ہی ملے۔

15-درمیان سے کٹے ہوئے درخت تلے لیٹنا۔

16- کیا سینگ بیل کے لیے بہت بھاری ہیں۔

17- گدھے کے لیے کنگھی۔

18-بیوہ سے شوہر مانگنا۔

19-نہ میں شہد مانگتا ہوں اور نہ ڈنگ چاہتا ہوں۔

20-ایسا گاؤں بسانا جہاں پانی نہ ملتا ہو۔

21-جب جھاڑی ہی کھیت کھانے لگے تو پھر حفاظت کون کرے گا۔

22- کیا تم اس درخت سے پھانس لے مرو گے جسے تمہارے باپ نے لگایا تھا۔

23- تیل کا پیمانہ ہمیشہ چکنا ہوتا ہے۔

24-غصے والی عورت سے ٹپکنے والا گھر بہتر ہے۔

25-بینگن کے تخم سے کدو پیدا نہ ہوں گے۔

26-اگر کپڑا کسی خاردار جھاڑی پر پھیلا ہو تو اسے احتیاط سے اُتارنا چاہیے۔

27- تمر ہندی خشک ہو کر بھی املی ہی رہتی ہے۔

28- جو محبت کرتا ہے محنت کرتا ہے۔ (پشتو)

29- چاقو اپنے دستے کو نہیں کاٹتا۔

30- ریچھ پہاڑ میں بوعلی سینا بنا پھرتا ہے۔

نورِ والوں کے ڈیرے پر بھی خاں صاحب ایسی ہی بصیرت، ایسے ہی اقوال زریں کی تلاش کرنے جاتے تھے۔ وہاں میں اور خاں صاحب تو ڈاکٹر اشرف فاضلی سے مل چکے تھے لیکن عفت کی ملاقات چند دنوں بعد ڈاکٹر اشرف سے ہوئی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق بابا جی پیش گوئی بہت پہلے کر چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب قلم کے بھی بادشاہ ہیں اور ویسے بھی بادشاہ ہیں۔

یہ ایک اور علم تھا، اس تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس سے پہلے سدا سہاگنوں اور شمس کی ملاقاتوں نے عفت کو تذبذب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی مغربی تعلیم اور ڈاکٹری کی تعلیم کے باعث ایسے غیبی علم کے متعلق بڑے شکوک رکھتی تھی۔ اسے غالباً کسی علم پر یقین محکم باقی نہ رہا تھا۔

اس روز ہم حسب عادت دھرم پورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ریل کا پھاٹک گزرتے ہی کوئی آدھے فرلانگ تک دور خانہ بدوشوں کی جھگیاں تھیں۔ ان کے بچے اور بچوں ہی جیسے پیارے پالتو کتے کبھی کبھی ریل کی پٹڑی تک آ جایا کرتے تھے۔ دوسری طرف کائی جمے جوہڑ کے کنارے پکے نیم خستہ بغل در بغل آباد گھروں میں کلرک نما لوگوں کا بسیرا تھا۔ جوہڑ کنارے اُگنے والے نرسلوں کے باعث یہ گھر پکی سڑک سے بڑی دور دور لگتے تھے۔

لیکن خانہ بدوشوں کی نگری...... اپنی خیالی عورتوں، ننگ دھڑنگ بچوں، سلور کے برتنوں اور ڈبو کتوں کے ساتھ کافی نزدیک محسوس ہوتی ہے۔ ریل کے پھاٹک سے بازار تک کوئی آدھ فرلانگ راستہ تھا۔ بازار سے گزر کر سڑک کے دونوں جانب مڈل کلاس شرفاء کے مکانات بھی تھے۔ ان لوگوں نے مکانات کو پختہ بنانے کی کوشش میں چوکھٹے سریئے، پکے قفل، کنڈیاں زنجیروں سے یوں گھر ٹھونس رکھے تھے کہ گرمیوں میں یہ تین پانچ مرلے کے مکانات تنور بن جاتے۔

اسی گرمی کے بچاؤ کے لیے چارپائیاں باہر نکل آتیں۔ لوگوں نے نیم، دھریک اور کیکر کے درخت بھی لگا رکھے تھے۔ صرف دور ایک املتاس کا درخت اس ساری سڑک کی زینت اور باباجی کا سمبل تھا۔ جب ہم ریل کے پھاٹک پر پہنچے تو بجلی سے چلنے والی ریل ٹھکا ٹھک کھٹا کھٹ گزر رہی تھی۔

خاں صاحب نے بریک لگائی۔ گاڑی کے گزرنے کا انتظار کیا اور پیچھے مڑ کر پوچھا ''تھک تو نہیں گئیں عفت''

تھکی ہوئی غنودگی کا شکار عفت بولی...... ''نہیں اشفاق بھائی ٹھیک ہوں۔''

''بس اب پہنچے ہی سمجھو۔''

پھاٹک کھلا۔ نرسلوں سے ڈھکی آبادی میں کوئی کوئی بتی روشن ہو چکی تھی۔ ہم جلد ہی ڈیرہ پاک کے املتاس کے درخت تلے پہنچ گئے۔ اس درخت سے ڈیرے کی چوکھٹ تک ستر اسی فٹ کا فاصلہ تھا لیکن یہ راستہ مجھے طے ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ ہم چبوترے کے پاس سے گزرے تو بائیں طرف چٹائیوں پر ابھی کچھ لوگ ورد وظیفے میں مصروف

کی دوسری طرف چار پائیوں پر دنیا کے روگی، راندہ درگاہ جسم اور دل کے داغوں سے بے زار، شفا اور شفاعت کی والے مایوس صورت بیٹھے تھے۔

ڈیرے پاک پر بھی دنیا کا ہر وہ رنگ موجود تھا جو اللہ کی مخلوق کا نظام ہے۔ دنیادار، سیانے، عاشق، دیوانے، فقیر سوز، رقت سے لبریز، چور اور چوری سے بیزار چور، خیرات میں سب کچھ بانٹ ڈالنے والے، اپنی بچی کو بیچ کر بچی کا نکاح کروانے والے، راست باز دروغ گو...... ایک اللہ کا رنگ وحدت کی سفید روشنی، املتاس کے درخت ان گنت رنگوں میں بٹ گئی تھی۔ املتاس کا درخت مخلوط مستوی (Prism) تھا جس میں سے وحدت کی ایک ہو کر دوسری جانب کثرت کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ تھڑے پر چٹائیوں کے اوپر، دہلیزوں پر، چار پائیوں پر اللہ کی وحدت نے کثرت کا روپ دھار لیا تھا۔

اس دن سدا سہاگنیں تھکی ہاری روٹی کھانے میں مشغول تھیں۔ دو بھرائی خوب سرسوں کا تیل لگائے بالوں کی چسکے لے رہے تھے۔ ایک درمیانی عمر کا فربہ جسم، عیاش صورت ہڈی سے گودا نکالنے کی غرض سے اسے ہتھیلی اگر وہ سدا سہاگن نہ ہوتا تو ضرور کامیاب ٹرک ڈرائیور ہوتا۔ اس کی ناک چھدی ہوئی تھی جس میں چاندی کی سر پر ریشمی پٹکا تھا۔ جب وہ ناچتا تو اسی پٹکے کا گھونگھٹ بنا لیتا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے باباجی کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت ایک روگی کو چینی کے ساتھ روٹی کھلا رہے تھے۔ ہر نوالہ منہ میں بھی خود ڈالتے اور ہر بار مسکرا کر اسے کھانے پر آمادہ کرتے۔

''لو جی بڑی خیر ہوگئی...... یہ دو بُرکیاں اور...... بس۔''

روگی لڑکے نے بیزار ہو کر کہا...... ''باباجی یہاں رولا بہت ہے...... مجھے رولے سے قے آتی ہے۔''

''ناں پت ناں...... یہاں کوئی رولا نہیں...... رولا تو وہاں ہوتا ہے جہاں مولا نہ ہو۔ یہاں تو مولا ہی مولا

حسب عادت ہمیں بابا جلال نیچے تہہ خانے میں لے گیا۔ وہی منظر۔ فرش پر سندھی اجرک کا فرش، نیچے روئی سرکنڈوں کی چھتوں کے ساتھ ساتھ چھینٹوں کے پرنٹ کے گاؤ تکیے، دیواروں پر جا بجا عقیدت مندوں کی پاجامے، تہمدیں کھونٹیوں سے ٹنگی ہوئیں۔ سارے میں بھونے ہوئے پھول مکھانوں کی خوشبو۔ تھوڑی دیر بعد بابا ہو نکلتے ہوئے آ گئے۔

''بڑی تکلیف ہے باباجی۔'' عفت بولی۔

''بڑی خیر ہوگئی...... بیٹھو بیٹھو...... بیٹا! تکلیف سواری ہوتی ہے۔ جب تک تکلیف سواری نہ بنے یہاں تک نہیں سکتا۔''

''پتہ نہیں مجھ سے کیا خطا ہوگئی ہے باباجی! جس کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔'' عفت نے دکھ سے کہا۔

''جب تک انسان سے خطا نہ ہو، رب کی طرف سے عطا نہیں ہوتی۔ صاحبو جان لو، جتنی بڑی خطا ہوگی اتنی عطا ہونے والی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کر لے۔'' حجرے میں سے بے شک بے شک کی آوازیں

آئیں۔ اس سے پہلے مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر فاضلی اور شمس تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔

بابا جلال ہمیشہ کی طرح دستر خوان بچھانے میں مشغول تھا۔ عفت نے شمس کی طرف دیکھا۔ پھر حیرانی سے جی طرف نظر اٹھائی۔

''ٹھیک ہو جائے گی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں اشفاق صاحب۔'' باباجی مسکرا کر بولے۔

''کیوں پُت بھوک لگتی ہے۔''

''نہیں باباجی۔''

''لگے گی لگے گی انشاءاللہ۔ ہم دوائی دیں گے۔ رب اس میں شفا شامل کر دے گا۔''

باباجی پھر تھبو تھبو کر کے چلے گئے۔ کمرے میں سے سانٹا کلوز چلا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو کھلونوں میں پیک کر کے لمبی لمبی جرابوں میں گھر گھر لے جانے والا سانٹا کلوز جو ہمیشہ چمنی کے راستے، آدھی رات کو کرسمس پر آیا کرتا ہے اور ہر گھر میں رات کے اندھیرے میں پلنگ کے ساتھ جراب باندھ کر رخصت ہو جاتا ہے...... چپ چاپ مسکراتا ہوا بابا۔

بچوں کے لیے کھلونے، عورتوں کے لیے ملبوسات، سینٹ کی شیشیاں، میک اپ کا سامان۔ مردوں کے لیے اخروٹ کی لکڑی کے پائپ، گھڑیاں، شمپین کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ سانٹا کلوز نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ جب گھروں پر آہستہ آہستہ گرتی ہے اور فضا میں حمدیہ گانوں (Cardl Singing) کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے تو سانٹا کلوز آتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر۔

مغرب کا سانٹا کلوز ایک خوبصورت Ritual کی روایت تھی۔ اس نے کرسمس کے تہواروں کو انسانوں کے لیے قابلِ تقلید بنا دیا ہے۔

ڈیرے کا بابا ایک اور قسم کا سانٹا کلوز تھا، جس نے حال کی گھڑی پر ایک اور قسم کا سماں باندھ رکھا تھا۔

باباجی کے جانے کے بعد ہم اُٹھ کر شمس اور ڈاکٹر فاضلی کے پاس جا بیٹھے۔

شمس نے اگر عینک نہ پہن رکھی ہوتی تو اس کا لمبا ہوا چہرہ حضرت عیسیٰؑ کی ان شبیہوں سے ملتا جو یورپ کے آرٹسٹ بنایا کرتے ہیں۔

دراز قد سانولے ڈاکٹر فاضلی نے بڑی رواں انگریزی میں شمس سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ عفت تھوڑی دیر کے بعد غنودگی کا شکار ہو جاتی، ان باتوں کی ٹوہ میں چوکس بیٹھی تھی۔ یہ ساری مخلوق کیسی تھی؟

شمس مکمل عقیدت بنا بیٹھا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر فاضلی نفس کشی کے باوجود اپنے اندر کہیں انا کا ست رکھے نظر آتا تھا۔ وہ دونوں بے تکان انگریزی میں ''سکینۃ الاولیاء'' کی باتیں کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ مسئلہ جبر و قدر کو آسان مثالوں سے بیان کر رہے تھے۔ شمس مجسم حیرت بنا ان کی طرف باندھے، کلیجہ شق کیے حاضر خدمت تھا۔ اس وقت سارا علم نگاہوں سے کانوں سے اندر اتارنے کی گھڑی تھی۔

بالآخر شمس نے کہا۔ ''ہم مغرب والے بہت بیمار ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب! ہماری روح کو کئی قسم کے کیڑے لگ گئے ہیں۔ ہم ڈارون کی طرح صرف بگ بینگ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم یہ جان ہی نہیں سکے کہ زندگی کسی خدا نے بھی تخلیق کی ہوگی۔ ہم نے Sex کو فرائیڈ کی طرح اپنے اوپر سوار کر لیا ہے۔ اب جنس کی آرزو پوری کرنا ہی اہم ہے۔ جنس کا دبانا نفسیاتی امراض کو دعوت دینے کے برابر ہے۔''

کارل مارکس نے بھوک اور غریبی کا جو علاج کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ واحد علاج ہے۔ ہم کارل مارکس کو ماننے والے جان ہی نہیں سکتے کہ خدا رزق دیتا ہے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ اسی امتحان میں وہ انسان کو مبتلا کرتا ہے کہ کون ہے جو رزق سے حضرت عثمانؓ کی طرح آخرت خریدتا ہے اور کون نہ ہونے کے مقام پر پیٹ پر پتھر باندھ کر سوتا ہے اور شکایت نہیں کرتا۔

دراز قد ڈاکٹر نے بڑی ملائمت سے کہا۔ ''ناں صاحب ناں۔ سائنس بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے لیکن افسوس یہ ابھی دور تک نہیں جاتی۔ اوپر والے کی مرضی، ایک وقت پر وہ کس قدر علم عطا کرے۔''

شمس نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ہم بکھر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے سوچا کہ سفید فام قوموں میں کیوں نبی نہیں پیدا ہوتے؟ کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ یہ ساری عطا براؤن سیاہ قوموں پر کیوں؟ میں بتاؤں سفید لوگوں میں عاجزی کی کمی ہے۔ وہ Humble ہونا نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور کوئی نہیں جان سکتا۔ ہماری خود پسندی کا یہ عالم ہے کہ ہم اگر حضرت عیسیٰ کی تصویر بنائیں گے تو وہ گورا ہوگا۔ ہم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ شاید حضرت عیسیٰ سانولے ہوں گے۔ ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس نے تو مغربی سوچ کا بھٹہ ہی بٹھا دیا ہے۔''

''ناں جی ناں ایسا نہ کہیں۔ یہ علم بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔''

''بسم اللہ کیجیے۔'' بابا جلال نے دسترخوان لگانے کے بعد کہا۔

شمس اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے اپنے پیالوں میں شوربہ ڈال لیا اور آہستہ آہستہ کھانے لگے۔

''آپ بھی لیں اشفاق صاحب۔''

خاں صاحب نے تھوڑا سا سالن ڈال لیا اور مؤدب انداز میں کھانے لگے۔

''کھاؤ بی بی...... '' ڈاکٹر صاحب نے فاصلے سے کہا۔

''آپ کھائیے مجھے بھوک نہیں۔'' عفت بولی۔

''دو لقمے سہی، ہمارا کھانا پاک ہو جائے گا۔''

''پاک ہو جائے گا...... یہ کیا منطق ہے؟''

''بابا جی کا کہنا ہے جو آدمی اپنے کھانے میں سے کسی کو کھلاتا ہے، وہ اپنا کھانا پاک کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے صوفیائے کرام، قطب اولیاء کا یہی مسلک ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی روایت ہے جی کھانا کھلانا۔'' شمس کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

ہم سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

شمس نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں چھوٹی چھوٹی کئی قسم کی بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ ہماری

عورتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے Wilt..... Red Stocking اور Liberation کی تحریکیں چلائی ہیں۔ انہوں نے صدیوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے عوض انہیں کیا ملا۔ مرد نے ہمیشہ انہیں اپنے سے کمتر ہی سمجھا اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔''

وہ کسی خبریں پڑھنے والے کی طرح کھنک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''سینئے ڈاکٹر صاحب! مغرب نے دین سے علیحدہ ہو کر نبیوں کے علم پر Secular تعلیم کو ترجیح دے کر اپنے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں نے مشرق کے زاویے، ڈیرے، عبادت گاہوں میں رہ کر سیکھا ہے کہ عورت عارفِ دنیا ہے اور مرد عارفِ مولا ہے۔ دونوں کا سفر الگ ہے، متقابل نہیں۔ دونوں کی سعی مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لیے بنی ہے اور مرد کفالت کے لیے۔ چونکہ اسی دنیا کو بنا ہے۔ اس لیے مرد کو عارفِ دنیا کو خوش کر کے دین کا کندن اسی سونے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ عورت چونکہ اللہ کی خاطر پرورش کرتی ہے، اس لیے مختلف قسم کی مصروفیت کے باعث اسے دین عارفِ مولا کے بغیر مل نہیں سکتا۔

دونوں قدم بہ قدم متوازی چلتے ہیں لیکن مغرب میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے ہیں۔ مغرب کا مرد عورت کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ عورت جب بھی اس کا مقابلہ کرے گی، منہ کی کھائے گی۔ چونکہ وہ فطرتاً کمزور اور ناقص ہے۔ مسابقت کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ ادھر عورت پرورش میں خدا کا ساتھی بننے کے بجائے مرد کو نیچا دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ بھلا جب معاون مدمقابل بن جائیں گے تو انتشار کے علاوہ کیا ملے گا۔'' شمس بلا تکان انگریزی میں بولے جا رہا تھا۔

عفت نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور مبہوت اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

''ہمارے سکول، کالج، ہمارا تعلیمی نظام جس پر ہمیں اس درجہ فخر ہے۔ کیسے بچے بنا رہا ہے؟ ہمارے بچے کسی کو belong نہیں کرتے۔ وہ خالی گھروں میں اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہیں۔ اپنا سیریل بنا کر خود کھاتے ہیں۔ ٹی وی کھول کر ایک لاتعلق Information oriented دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون دیکھتے ہیں اور بڑے سروں والے Giants بن جاتے ہیں۔ ان کا سر اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ کسی دروازے سے نکلنا ممکن نہیں رہتا اور زندگی صرف دروازوں سے نکلنے کا نام ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے ''جانِ من! گھبرائیں نہیں۔ یہ سارا علم بھی اوپر سے عطا ہو رہا ہے۔ آپ جھگڑا نہ کریں۔ اس وقت سفید لوگوں پر اللہ کی طرف سے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ Empirical evidence سے تجربات کر کے سیکھ رہے ہیں۔ بیچارے اللہ کے سفید چوہے بنے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے نبی کو گھٹ کے پکڑے رہتے تو زیادہ خواری نہ اٹھانی پڑتی لیکن جیسی اوپر والے کی مرضی۔ جس طرح چاہے وہ جیسا رکھے۔''

جس وقت یہ دونوں بے تکان بول رہے تھے، بابا جی پھر اچانک آ گئے۔ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں اور بابا جی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ پتہ نہیں یہ ٹیلی پیتھی کا کون سا مقام تھا کہ بابا جی نے مباحثہ کو یوں ختم کر دیا۔ آپ نے بچوں کو علم کی اہمیت ضرور بتا دی ہے لیکن یہ نہیں سمجھایا کہ عقل چراغِ راہ نہیں ہے۔ صداقت چراغِ راہ ہے۔ صداقت ہمیشہ نبی سے ملتی ہے۔ وہ صداقت کا معجزہ ساتھ لاتا ہے.....''

بابا جی کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل، سونف کا عرق اور مروارید کی معجون تھی۔
”کو پُت خیر ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو بیماری ٹل جائے گی۔ جب پیاس لگے انار کا رس پینا ہے۔ چاہے دو
...لے

پھر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی بوتلیں خان صاحب کے سپرد کر دیں اور ان کے استعمال کا طریقہ ہمیں ان ہی کو
...گیا

”میں نے تو سنا ہے بابا جی موت کا وقت معین ہے۔ یہ ٹل نہیں سکتی۔“ عفت نے پوچھا۔
”ٹلتی ہے ٹلتی ہے، وہ کسی بات کا پابند تھوڑی ہے۔ وہ اپنے ولیوں کو کرامت اور اپنے نبی کو معجزہ عطا کرتا ہے۔
...ین کی برکت سے بہت کچھ ٹلتا ہے۔ زندگی کا وقفہ لمبا ہوتا ہے۔ موت کی گھڑی ٹلتی ہے۔“
”لیکن کیسے حضور؟ کیسے؟“ عفت نے سوال کیا۔
”پُت! ہمارا قصائی موت کے شکنجے میں آیا ہوا تھا۔ گھر والے اسے رو پیٹ چکے تھے۔ پھر اس کا جوان بیٹا ہاتھ
ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا...... بابا جی! حریص ہوں، حرص کی بات کرنے آیا ہوں۔ جانتا ہوں میرا باپ کافی
...چکا ہے لیکن دل اس کی موت پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا کوئی چارہ لگتا ہے تو لگا لیجیے۔ ہمارے بس سے تو بات
...بہت اللہ کا حکم ہو گیا مانگو، ہم قصائی کے گھر پہنچے۔ بڈھے قصائی کے زخرے سے موت کی آواز آ رہی تھی۔ چہرے
...چھایا تھا۔ آنکھوں کی جوت ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے رب سے دعا کی، ربا اسے بخش دے تو آخری حکم، آخری
...ے۔ تجھے کسی نے پوچھنا نہیں۔ تجھے کون سوال جواب کرے۔ ڈیرے پر تیری خلق روٹی کھاتی ہے۔ یہ قصائی اچھا
...دیتا ہے۔ ابھی اس کی ضرورت ہے۔ تیری داڑھی ہتھ لگایا...... جانے دے ہمارا مان رکھ لے۔ لو بی بی دوسرے دن
...گیا دکان پر...... ابھی تک اسی کی دوکان سے گوشت آتا ہے۔“
”جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ہر وقت نیند آتی رہتی ہے بابا جی...... کیا کروں؟“
”خیر ہو گئی پت خیر ہو گئی۔ اب ہمیشہ آرام سے سوئے گی دھی رانی۔ انار کے رس سے غفلت نہیں برتنی۔ پُت جو
...ہوا ہے اس نے موت کا ذائقہ چکھنا تو ضرور ہے۔ ہم تو مہلت مانگتے ہیں۔ وقت ٹالنے کو کہتے ہیں۔ وہ ضدی
...کی مان لیتا ہے بس۔“

کمرے میں جو بھی موجود تھا اس بات کا آرزومند تھا کہ عفت آرام سے بیٹھے، صحت مند ہو جائے۔ میں تھوڑی
سی تشکیک کا شکار تھی۔ بھلا انار کا رس، بادام روغن اور ایک معمولی سی مروارید کی معجون فیل ہوتے گردوں کا کیسے علاج ہو سکتے
ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں یہ مرید پھانسنے کا طریقہ نہ ہو۔ عین ممکن ہے خاں صاحب کی پوزیشن کا ڈیرے پر اثر ہو گیا ہو۔ اتنی
...فطری محبت سے مجھے عجیب قسم کی وحشت ہو رہی تھی۔ کیا یہ خوشامد تھی؟ کیا خیر خواہی اسی طرح مفت بھی مل سکتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ”اپنے بابا جی کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ طیب خوراک کھانا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا
کسی اور کو بھی کھلائیے۔ اگر اپنی روزی پاک کرنا چاہتے ہیں تو اپنی کمائی میں کسی اور کو بھی شریک کیجیے۔ جب اپنے گھر کے
لیے سودا خریدو تو کسی بیوہ، کسی سفید پوش، ضرورت مند کے لیے بھی اسی قدر سودا سلف بھجوا دیا کریں۔ اپنے بچوں کی تعلیم

پاک کرنی ہو تو ویسے ہی کسی یتیم، نادار کے بچے کی تعلیم مکمل کروا دی۔ اس کی کتابوں، فیس، یونیفارم کے ذمہ دار ہو گئے۔ لباس پاک کرنا ہو تو پہلے دو جوڑے سلوا کر دے دیئے۔ پھر اپنے جوڑے بنوائے۔''

''پتہ ہے ایک دھویا ایک پہن لیا۔'' ایک مرید کونے میں سے بولا۔

''ناں جانِ من ناں...... ایک خود پہن لیا، ایک کسی ایسے شخص کو دے دیا جو سلائی بھی نہیں دے سکتا۔ نئے سے اس کی عید ہو گئی۔ آپ کا جوڑا پاک ہو گیا۔''

یہ تو میں جان گئی تھی کہ ڈیرے کا قاعدہ تھا کہ جونہی کوئی حاجت مند تکلیف کی سواری پر سوار ادھر آتا اس کے مرض کی تشخیص سے پہلے دسترخوان بچھ جاتا ہے۔ اس دسترخوان پر ہر چیز کا لطف، رنگ، لذت موجود ہوتی جیسے ماں کے دودھ میں کسی آمیزش کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ کھانے بھی شیرِ مادر کی طرح محبت کی چاشنی سے بھرے ہوتے۔ کھانے کے کھانے سے پہلے ہر وقت گجراتی روغنی پیالوں میں کیکر کی چھال سے بنی گڑ کی چائے آتی۔

''آپ کے ڈیرے نے مجھے حیران کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ تواضع کا یہ معیار بیسویں صدی میں کہیں نہیں۔'' عفت بولی۔

''بی بی یہاں سب کچھ صداقت پر مبنی ہے۔ ہر قول کا فعل شاہد ہے اور ہر فعل پر کسی شاہد کی نظر ہے۔''

خاں صاحب تو ایک عرصہ سے یہاں آتے رہتے تھے۔ وہ یہاں کی Terminology سے خوب واقف تھے لیکن میرے لیے فعل، شاہد، صداقت...... اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بالکل نئے تھے اور میں نے انہیں ان معنوں میں کبھی استعمال نہ کیا تھا۔

''کیا یہاں ڈاکٹر صاحب ہر طرف خیر ہی خیر ہے؟'' عفت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں......'' ڈاکٹر صاحب نے قطعیت سے جواب دیا۔

اشفاق صاحب یوں مسکرائے جیسے جواب پہلے سے جانتے ہوں۔

''کیا مطلب؟'' عفت نے سوال کیا۔

''کبھی آپ نے مقناطیس کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے۔ اس ٹکڑے کے دو حصے ہوتے ہیں شمالی قطب، جنوبی قطب...... مقناطیس کو درمیان میں سے کاٹ کر دیکھیے اور کوشش کیجیے شمالی اور جنوبی قطب علیحدہ ہو جائیں، آپ دیکھیں گے کہ نئے دو ٹکڑوں میں پھر شمالی اور جنوبی قطب پیدا ہو جائیں گے۔ آپ مقناطیس کو کاٹنے کے عمل سے چھوٹا کرتے جائیں تو مقناطیس کے آخری مولی کیول میں بھی ایک سرا شمالی اور دوسرا جنوبی قطب ہو گا۔

انسان کا بھی یہی حال ہے بی بی۔ اسے خیر اور شر دونوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں آگ اور پانی بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ گو ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن چراغ اندھیرے کے بغیر روشن نہیں ہو سکتا نہ خوشنما ہی لگتا ہے۔ ایک بات ہے کچھ اللہ کے بزرگانِ دین اپنے شر کو اپنے نفس کو شیطان کی ترغیب کو اپنے اندر کے خیر کے تابع کر لیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی کرامت انسانی ہے۔ کتا موجود ہو لیکن زنجیر سے بندھا رہے۔ بھونکے تو ضرور صرف کاٹ نہ کھائے۔''

شمس نے اپنے کرتے سے ہاتھ پونچھ کر سوال کیا۔ ''میرے لیے کوئی راستہ؟''

''ہر تلاش کرنے والے کے لیے راہ ہوتی ہے۔''
شمس نے آہ بھر کر کہا۔ ''ہاں بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے؟''
''آرزو ہو تو راستہ خود بخود دکھائی دے جاتا ہے برادر......'' ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔
''میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔ میری ماں اوپرا سنگر تھی۔ میرا باپ سکول ماسٹر تھا۔ بچوں کو تعلیم دیتا، ڈسپلن سکھاتا، بڑے بڑے لوگوں کی مثالیں دیتا۔ ان کے علم کی خوشہ چینی کرتا۔ وہ ایک معمولی Clergyman کی طرح اندر سے سوکھا پکا تھا۔ دوسروں کو سیدھا کرتے کرتے وہ خود کبڑا ہو گیا تھا۔ گھر، باغ، غسلخانہ ہر جگہ اس کی جماعت کا کمرہ تھا لیکن میری ماں کے گلے میں ایک آزاد پرندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ باورچی خانے میں برتن اٹھاتے، سبزی کاٹنے کے وقت گانے لگتی تو میں چاہتا میں اس کی آواز کے ساتھ سُروں سے ارتعاش کے ساتھ فضاؤں میں گم ہو جاؤں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا انسان جسم کے ساتھ کائنات کا سفر کر سکتا ہے؟ کیا وہ کسی بلیک ہول میں تو ختم نہیں ہو جائے گا؟''
''آپ کے پاس شب معراج کی شہادت موجود ہے۔ ویسے تو اب لوگ Levitation کو بھی سائنس بنانے لگے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی میں اپنی تعلیم کی وجہ سے تشکیک کا شکار ہو جاتا ہوں۔ جس Data کو لیبارٹری میں نہیں لے جاسکتے اس پر کلی ایمان نہیں لایا جاسکتا، ہم جیسے لوگوں سے۔'' شمس بولا۔
میں نے دل میں ڈاکٹر صاحب کی بات سے اتفاق نہ کیا۔
''میں بھی اس ڈیرے پر تشکیک کا تیزاب لے کر آیا تھا۔ بڑے بگڑے دل کا آدمی تھا میں...... لیکن...... بابا جی کے اخلاق نے میری سٹی گم کر دی۔ میرا تیزاب شہد بن گیا۔ اخلاق ہی معیار ہے۔ اسی کی انچی ٹیپ سے فٹ بھی ناپے جاتے ہیں اور گز بھی۔ سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ اخلاق کی داب کام آتی ہے۔ معیار کامیاب آدمی نہیں۔ معیار اچھے اخلاق والا انسان ہے۔''
''آپ کون ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' عفت نے سوال کیا۔
''میں ضلع فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد پشت ہا پشت سے ہل جوتتے، فصلیں بوتے، فصلیں کاٹتے آئے ہیں۔ ان کسان لوگوں کو اللہ کی رحمت بادلوں میں نظر آتی رہی ہے۔ وہ رحمت کی تلاش میں اوپر دیکھتے آئے ہیں۔''
''عفت پوچھتی ہے ڈاکٹر صاحب! پھر سوچ کر جواب دیجیے، آپ کون ہیں؟'' شمس نے سوال کیا۔
شمس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تو آپ اتباع رسولؐ کے پیروکار ہیں۔ واقف منزل ہیں آپ؟ آپ جانتے ہیں کس راستے پر چل کر انسان معراج کو پہنچ سکتا ہے؟''
''ہاں چلتے رہنا شرط ہے۔ یہاں وہاں منزل کا تعین نہیں۔ بس اس راستے پر کبھی Pedestrian (راہ رو) بھی۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے منزل پالی۔''
شمس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ''بس ڈگمگانا نہیں۔ چلتے رہنا اپنی رہنمائی کرتے رہنا۔ اپنے آپ کو حوصلہ دے کر چلنے پر آمادہ کرتے رہنا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی مجھ سے میرے ہم شکل میرے کئی ہم وطن ادھر تلاش میں آئیں گے۔

میرے ہم وطن نہیں جانتے کہ روشنی کدھر سے آ رہی ہے۔ وہ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ جدھر وہ ہیں، اُدھر گھپ [illegible] ہے۔ مایوسی ہے۔ آنے والے ضرور سوال کریں گے پلیز انہیں جواب دینے کے لیے، ان کی رہبری کے لیے [illegible] ڈاکٹر صاحب۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔ مایوسی سے بچانا ڈاکٹر صاحب!''

شمس اور ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بغلگیر ہوکر عہد و پیمان کرنے لگیں۔ عفت نے جو نوالہ اٹھا رکھا تھا [illegible] پیالے میں ڈال دیا۔ خاں صاحب نے بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ پیالے میں نظریں گاڑ دیں۔ گویا شمس اور [illegible] صاحب کے لیگل کاغذوں پر گواہ بن کر دستخط کر رہے ہوں۔

اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھر کم سفید فام بڑا ہی تنومند آدمی داخل ہوا۔ اس کی [illegible] فلمی وِلن جیسی، جسم پر دوشالا، رئیس ابن رئیس جیسے ہاتھ پاؤں خود اعتمادی میں بھیگی ہوئی آواز میں گھڑیال سی گرج [illegible] گلے میں ایک بڑا سا گیندے کا ہار پہن رکھا تھا، جس کے پھول نوچ نوچ کر وہ اِدھر اُدھر پھینک رہا تھا۔

''فراڈ ہے بابا...... چکر ہے...... جال پھیلا رکھا ہے بابے نے...... بادام روغن کی بوتلیں بیچی جا رہی [illegible] معجونیں گھوٹ گھوٹ کر پکڑا رہا ہے سب کو...... آلو شوربے کھلا کھلا کر تباہ کر دی خلق خدا...... لُچا بدمعاش...... پوتی [illegible] کو...... جہالت سکھا دی سب کو، پاکھنڈی ہے بابا...... بیٹا خلق خدا کا فائدہ کرو...... خلوت جلوت ایک کرو...... [illegible] جلوت کیا ہوتی ہے؟...... کیا ہوتی ہے خلوت جلوت؟ خلوت جلوت...... خلوت جلوت۔''

اس نے دھمال ڈالنے والوں کی طرح خلوت جلوت کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ پھر یکدم ایک ستون [illegible] لپٹ کر وہ زار زار رونے لگا۔

عفت خوفزدہ ہو کر بولی...... ''گھر نہ چلیں اشفاق بھائی۔ مجھے...... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

ہم تینوں خاموشی سے اٹھ آئے۔ نہ کسی نے ہمیں روکا نہ کسی قسم کا اصرار کیا۔

اشفاق صاحب کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل اور معجون تھی جسے وہ بڑی احتیاط سے اٹھائے ہم [illegible] آگے چل رہے تھے۔

نوارد نے ڈیرے کا تمسخر اڑا کر ایک بار پھر عفت کے ارادے کو متزلزل کر دیا۔ اس کے چہرے سے [illegible] روشنی کم ہوگئی۔ شک اور گمان نے چھاپہ مار کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ واپسی پر خاں صاحب اوپر اپنے خلوت خانے یعنی [illegible] میں چلے گئے۔ ابھی ''تلقین شاہ'' کا سٹوڈیو انیس خاں کی تحویل میں تھا۔ وہی اس کی ریکارڈنگ کرتا، اس کا حساب [illegible] رکھتا اور تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کے دوران ''کٹ اِٹ'' مؤدب زبان میں بولتا اور ساتھ ساتھ ایم بی اے کی [illegible] کرتا۔

سٹوڈیو سے ملحق ریکارڈنگ روم، غسل خانہ اور اس کے بعد اوپر چڑھنے والی گول Spiral سیڑھیاں [illegible] منزل کا حصہ تھیں۔ یہیں سے خاں صاحب کی باہر والی لائبریری شروع ہو جاتی تھی۔ تینوں طرف الماریاں اور ایک طرف ٹیرس پر کھلنے والی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ اس لینڈنگ پر وہ میز بھی دھری تھی جس پر بیٹھ کر خاں صاحب سوچتے، لکھتے پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔

اسی لائبریری میں ایک الماری تھی جو کسی خانے سے ملحق دیوار میں جڑی تھی۔ اس میں چپ بورڈ کے تختے تھے
الماری میں ان کا مالِ غنیمت، لوگوں کے عقیدت سے بھیجے تحفے، خاں صاحب کی دل رکھنے کے ضمن میں کی ہوئی
... پڑی تھیں۔ لندن، امریکہ سے لائے گئے پن، بال پوائنٹ، مارکر، ہائی لائنر، ربڑ، سیاہی مٹانے والے آلے،
S...، ڈائریاں، نوٹ بکس، ان پر لکھے ہوئے نوٹس، کافی کے ڈبے، جن سنگ اور قسما قسم کے قہوے، لنز، چابیاں،
... کھلنے والے چھوٹے بڑے تالے، ہر سائز قماش کی قینچی، گھڑیاں، ہیلتھ چیز، نیل کٹر، فائلیں...... یہاں ایک کائنات
...

ان تمام چیزوں کو زیرِ استعمال لانے کا خاں صاحب کو شوق نہ تھا۔ یہ تو ایک Memory Box تھا۔ جب وہ
... ایک پن اُٹھا کر ایک گھڑی دیکھ کر کسی واقعہ، شخص، وقت کو حاضر کر لیتے۔ وقت اور مقام میں یوں آسانی سے سفر کرنا
... لیے آسان ہو جاتا۔ اس بازیچۂ اطفال سے گزر کر وہ اپنی کتابوں میں گم ہو جاتے۔

ان کتابوں کا سلسلہ کسی محبوبہ کی داستان تھی۔ کچھ کتابیں ان کے ساتھ مکتسر سے آئی تھیں۔ کچھ 1- مزنگ روڈ
... بھی ہو گئی تھیں۔ وہ کسی شکاری کتے کی طرح سونگھ کر کتاب تلاش کر لیتے۔ امریکہ، اطالیہ، لندن سے کتابوں کے
... چلے آتے۔ انارکلی کے فٹ پاتھیے، ان کے یار تھے۔ جونہی ہم دونوں کسی کسی اتوار کو انارکلی میں داخل ہوتے۔
... ڈیپارٹمنٹ سے ملحق دیوار کے آگے فٹ پاتھ پر کتابیں پھیلائے کباڑیئے ہمیں لبیک کہتے۔ انارکلی کے دہانے پر
... جب پرانی کتابیں سرِعام منتظر ہوتیں۔ خاں صاحب چنتے رہتے۔ وہ کتابوں کو ٹھونکتے رہتے۔ مطلب کی سیکنڈ ہینڈ
... کا ڈھیر لگ جاتا۔ وہ ہر کباڑی کے ساتھ عورتوں کے انداز میں بھاؤ تاؤ کرتے۔ یہ ان کا کباڑیئے کے ساتھ
Ra... قائم کرنے کا طریقہ تھا۔ کار پارکنگ کرنے والوں سے ضرور پوچھتے کہ کار کا کرایہ کس قدر ہے اور یہ ریٹ
... زیادہ ہے یا کم...... یہ بھی دوسرے کو گفتگو میں گھسیٹنے کا سر بندھ تھا۔

یوں کباڑیئے کے ساتھ بحث مباحثے کے بعد بغیر گنے اسے پیسے دے دیتے اور واپسی پر جو کچھ بچ رہتا کسی
... کے فٹ پاتھ پر ڈھیر فقیر کے سرہانے رکھ کر گھر لوٹ آتے۔ جتنی دیر خاں صاحب اور کباڑیوں میں نوک جھونک،
... حساب ہوتا میں کوئی ایک کتاب اٹھا کر فٹ پاتھ کنارے بیٹھ جاتی اور اچھی خاصی کتاب پڑھ لیتی۔ رفتہ رفتہ مجھے دیکھ
... چند کتابوں کے مالک مجھے کوئی کرسی لا دیا کرتے۔ میں سہولت سے پڑھتی رہتی۔ خاں صاحب پنگ پانگ کی بازی
... یں کا کھیل کھیلتے رہتے۔

واپسی پر ان کتابوں کی چھان پھٹک ہوتی۔ وہ ان پر چڑھانے کے لیے سیمنٹ کے خالی براؤن کاغذ سے بنے
... تھیلے لاتے۔ یہ تھیلے عموماً میو ہسپتال کے سامنے والے کباڑیوں سے حاصل کیے جاتے۔ گھر لا کر انہیں وزن تلے رکھ
... سیدھا کیا جاتا۔ کچھ دنوں بعد کھول کر کاغذ سیدھا کر کے انہیں کتابوں پر چڑھایا جاتا۔ کتابوں کی پشت پر موٹے مارکر
... سے لکھ کر اسے بڑے سلیقے اور ترتیب سے سجایا جاتا۔

یہ سارا Ritual خاں صاحب کے لیے کسی تہوار کی طرح دلچسپ تھا۔ انہوں نے کتابوں کو انسانوں کا روپ
... دے رکھا تھا۔ ہر کتاب کو خاکی لباس پہنا کر وہ اسے اپنی الماریوں کی رجمنٹ میں رکروٹ کر لیتے۔ ایک بار جب امجد

اسلام امجد اور فردوس ہمارے گھر آئے تو امجد نے کہا۔

''خاں صاحب...... یہ کتابوں کو کاغذ کون چڑھاتا ہے؟''

''میں اور کون؟''

''اور ان کے پشتے پر کون نام لکھتا ہے کتاب کا؟''

''بھائی میں......اور کون؟''

امجد ابھی حیران ہونے میں مشغول تھا کہ فردوس بولی۔ ''اور امجد آپ نے اپنی کتابیں گیراج میں یوں رکھی ہیں جیسے عید کے دن اوجھڑیاں پڑی ہوتی ہیں سڑکوں پر۔''

بیچاری فردوس کو علم نہ تھا کہ خاں صاحب ہر کام کا پراجیکٹ بنا لیتے ہیں۔ اسے مرغی کے انڈے کی طرح سیتے ہیں اور جب اس میں سے چوزہ نکلتا ہے...... یاد کا ہلکا زرد چوزہ...... تو پھر خاں صاحب کو عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے خواہشات کو تج کرنے والے بھکشو کو اپنے کاسے میں پڑے باسی کھانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ خواہشات کو فی الفور ترک کرنے میں جو آنند تھا۔ اس علم کو خاں صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ گھر آ کر کتابیں پڑھنا شروع نہیں کرتے تھے۔ ہر خواہش پر التواء کا ڈھکنا لگاتے۔ کتاب کی عزت افزائی میں مشغول رہ کر اسے ایک تہوار میں بدل کر وہ اپنی تربیت کرتے رہتے تھے۔ کتابوں سے نکل کر خاں صاحب کو عفت کی فکر سمیٹ لیتی۔

لیکن باباجی کا تمسخر اڑانے والا عفت کو ایک بار پھر متزلزل کر گیا تھا۔

گھر پہنچ کر خاں صاحب نے عفت کے تذبذب کو بھانپ لیا لیکن وہ اسے کسی نتیجے پر جبراً پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کا بڑا پھاٹک نما دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر خاں صاحب Spiral سیڑھیوں پر گول گول چڑھتے اپنی سٹڈی میں چلے گئے۔ میں عفت کے لیے انار کا رس نکالنے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ عفت کا سنی مہمان خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے لیے دیسی اناروں کا رس نکال کر کمرے میں گئی تو وہ پلنگ پر نیم دراز کشور سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہاں ہاں...... باباہاں۔''

اُدھر سے کشور نے غالباً کہا...... ''کہاں تھیں تم۔ میں نے تمہیں تین فون کیے ہیں۔''

''میں نے کہاں جانا ہے۔ باباجی کے علاوہ اور کہاں؟''

''ایک ڈاکٹر ہو کر تم کس جہالت میں پڑی ہو عفت؟'' کشور بولی۔

''وہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رنگ کے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے جسمانی مریض، کچھ ذہنی مریض، خدمت گزار، اڑب، چور، غنڈے، اُچکے۔''

''میں حیران ہوں لندن، ہالینڈ، فرانس کے بعد تمہیں یہی جگہ سوجھی ہے۔''

''باباجی کہا کرتے ہیں چونکہ اب جہالت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس لیے رحمت بھی انتہائی جوش پر آ گئی ہے۔''

''آخر یہ بابا ہے کون؟'' کشور نے سوال کیا۔

''سیدھے سے بزرگ ہیں۔ اُن کے مرید باباجی کو نوے سال کا بتاتے ہیں۔ بڑے خوبصورت، گورے چٹے،
...می ہے۔ کہتے ہیں اُمّی ہیں۔ مستی پہرہ گزار چکے ہیں۔'' عفت بولی۔

''مستی پہرہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟'' کشور نے پوچھا۔

''جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ بس درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے۔
...کی کیفیت رہی۔ پورے چودہ برس پھر بزرگانِ دین میں سے ایک سائیں خدا بخش کے حضور پہنچ گئے۔ برسوں
...مت کی۔ تعلیم کیے گئے اور پھرتے پھراتے اب انفنٹری روڈ پر ڈیرہ ہے۔ کہتے ہیں...... ایک لفظ پڑھنا نہیں آتا۔
...سے زائد ایک لفظ نہیں بولتے۔''

''لے یہ کیوں؟''

''کیوں اس لیے کہ فرماتے ہیں مناظرہ ہمیشہ شوکتِ نفس کے لیے ہوتا ہے۔''

''کیا پٹھی پٹھی باتیں سیکھ آئی ہے ڈیرے سے...... ہسپتال گئی تھی؟'' عفت کی چھوٹی بہن کشور نے کہا۔

''رس پی لو عفت، باباجی نے فرمایا تھا۔''

''یہ تو کھٹا ہوگا، اس کا گلا پکڑا جائے گا قدسیہ، انار کا رس مت پلاؤ۔'' کشور نے مجھ سے کہا۔

''نہیں دیسی اناروں کا رس ہے، کھٹا نہیں ہے۔''

عفت کو رس کا پینا اچھا تو نہ لگا لیکن وہ چپ رہی...... ''ہسپتال گئی تھیں؟ بول۔''

''نہیں۔''

''بلڈ ٹسٹ کروایا تھا؟''

''نہیں۔''

''ایکس رے؟''

عفت نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

''یورن ٹیسٹ؟''

''اوئے بابا نہیں نہیں نہیں۔'' عفت نے چڑ کر کشور سے کہا۔

''شہاب بھائی کو فون کرتی ہو۔ وہ بات کریں گے تیری اس نہیں نہیں کی۔''

عفت مسکرائی اور بولی...... ''وہ فون کرتے رہتے ہیں۔''

''لندن کب جاؤ گی چیک اپ کے لیے؟''

''شاید کبھی نہیں۔''

''لیکن یہ تو خطرناک ہے عفت۔ شہاب بھائی منع نہیں کرتے؟''

''انہوں نے قدسیہ کو منع کیا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں...... میں جو مرضی کروں۔''

''کیا منع کیا تھا قدسیہ؟'' مجھ سے کشور نے پوچھا۔

''شہاب صاحب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں باباجی کی بیعت نہ کروں۔ یہ زمانہ بیعت کا نہیں ہے۔''

''یہ قدسیہ بڑی وہمی ہے۔ باباجی بیعت تھوڑی کرتے ہیں۔ وہ تو وضو کراتے ہیں۔ پاک کرتے ہیں۔ جب انہوں نے مجھے وضو کرانا تھا، یہ وہاں گئی ہی نہیں کھوتے کا سر...... بڑی جاہل ہے۔'' عفت بولی۔

''لیکن بیعت کیوں نہیں کرنی قدسیہ...... کیا وجہ؟'' کشور بہت پریشان تھی۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ''شہاب بھائی کہتے ہیں بیعت کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر آدمی ماننے کا عہد کرلے تو پھر شیخ کی حکم عدولی نہیں کرسکتا۔ اگر باباجی نے تینوں سپوت ڈیرے پر رکھ لیے تو کیا میں ... کرلوں گی۔''

''ایویں...... باباجی کیوں ایسا کریں گے؟'' عفت نے کہا۔

''اگر باباجی ثاقب کا بیاہ کسی اندھی لڑکی سے کردیں تو مان جاؤ گی عفت؟'' کشور نے سوال کیا۔ ''ٹھیک ہیں شہاب بھائی۔ اب اتنا پڑھ لکھ کر تو آدمی بیعت شیت نہیں کرسکتا۔'' کشور نے بیعت کا ٹاپک بند کردیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کمرے میں دھندلکا چھا گیا تو عفت نے وہ بیڈ لیمپ روشن کردیا جس ... کا بلب روشن تھا۔ زیرو کے بلب میں یہ خاصیت ہوا کرتی ہے کہ وہ دوسرے بلبوں کے مقابلے میں تو بے حیثیت ... عطا کرتا ہے لیکن اگر آدھی رات کو اندھیرے میں روشن ہو تو اس کی نربل روشنی میں ہر چیز کی جسامت، ساخت ... بڑی ہوجاتی ہے۔

عفت کی چھوٹی بہن کشور بڑی مایوس ہوگئی تھی۔ عفت تازہ مغرب پلٹ تھی۔ میرے خیال میں ا... سے مانوس کرنے والے ان پڑھ جاہل نالائق پیروکار نہ تھے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور شمس کی روشن باتوں ... حصار میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مغربی چمک، سچائی، روشن خیالی ہی کام آئی۔ مغرب نے ہی عفت کو مشرق سے روشناس کرایا۔

چند دنوں کے بعد عفت اور میں ڈیرے پر پہنچیں تو باباجی ڈیرے پر موجود نہ تھے۔ ہم باہر ہی ... بیٹھ گئیں۔ علی محمد صاحب حسب معمول کھانا تیار کر رہے تھے۔ بابا جلال نے پہنچتے ہی لال چائے کے کٹو... دھر دیئے۔

''ابھی باباجی آجائیں گے۔ آپ چائے پئیں۔''

اس وقت شمس کہیں سے آگیا اور بے تکلفی سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ بھی ... ہے کہ باباجی جیسے بزرگ کو شہرت سفید فام شمس سے مل رہی ہے۔ ان پر ایمان کو مضبوطی بخشنے والا مغربی تھا۔ میں ... باتیں سوچنے کی عادی تھی۔

گھر پہنچ کر عفت سے اشفاق صاحب نے پوچھا۔ ''طبیعت کیسی ہے عفت؟''

''ٹھیک ہے اشفاق بھائی۔''

''اناکلی رس پیا تھا؟''

"جی۔"

"قدسیہ کو یاد دلاتی رہنا۔ دن میں کم از کم تین بار...... دیسی انار...... قندھاری نہیں۔ اس کے کئی اور بکھیڑے ہیں۔ بھول نہ جائے۔"

"نہیں جی یہ بھولتی نہیں۔"

"عرق...... معجون؟"

"جاری ہے، آپ فکر نہ کریں۔"

"عفت میں سوچ رہا تھا......"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

"میں سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں ڈیرے پر لے جانا تو چاہیے تھا لیکن وہاں کے علاج کے سپرد کرنا زیادتی نہ ہو جائے۔ بھونا اس طرح کے علاج میں بڑا Risk ہے۔"

"ہونے دیں...... مجھے رسک پسند ہے۔"

"بڑی خطا ہو جانے کا احتمال ہے۔" خاں صاحب بولے۔

"آپ نے سنا نہیں تھا اشفاق بھائی۔ بابا جی فرماتے تھے جہاں خطا ہے، وہیں عطا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی...... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو شہاب مجھے کیا کہے گا۔"

عفت کھڑی رہی۔ اس کی مزاح کی حس اس وقت ماند پڑ گئی تھی۔ نہ اس نے "اے ہے" کہا نہ مسکرائی۔ خاں صاحب جوتے اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے خاں صاحب کا دل کسی سرہنگ زادے کا دل تھا۔ چیلنج قبول کر لیتے تھے۔ نیا تجربہ ان کے توسنِ تخیل کو بھاگنے پر مجبور کرتا۔ مشکل سے مشکل امتحان میں بھی کبھی ان کا پتہ پانی نہ ہوتا۔

وہ ہر بڑے امتحان میں خم ٹھونک کر زندگی کو مات دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب خاں صاحب کے والد بابا محمد خاں فوت ہوئے تو میت گھر پر تھی۔ لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھے خاں صاحب من چلے کا سودا یا حسن شاہ لکھ رہے تھے کیونکہ دوسرے دن ریکارڈنگ تھی اور وہ کبھی ذمہ داری سے بھاگنے والے نہ تھے۔

وہ غالباً اس احساسِ جرم میں مبتلا تھے کہ عفت کو بابا جی کے حوالے کر کے وہ کہیں کوئی بڑی غلطی تو نہیں کر رہے۔ انہیں بابا جی کی دانش پر کُلی ایمان تھا۔ وہ اس خطے کی موروثی Wisdom کے دل سے قائل تھے لیکن مغربی تعلیم اور سائنس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ ہر روز سائنسی کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے ترجموں کی رسائی میں وقت صرف کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی خاموشی کی اصل وجہ یہی تضاد تھا۔ میں نے کبھی سوال تو نہ کیا لیکن اندر ہی اندر خائف سے رہتے تھے کہ کہیں عفت کا علاج غلط تو نہیں ہو رہا۔ کہیں اس طرف کا چسکا لگا کر میں شہاب سے زیادتی کا تو مرتکب نہیں ہو رہا۔

راتیں سرد ہو چکی تھیں۔ عفت کے لیے یہ سردی قیامت کی تھی۔ اس کا جسم خاطر خواہ حد تک لہو بنانے سے قاصر

تھا۔ وہ سارا دن ہیٹر چلائے کمرے میں بند رہتی۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو لان میں جا بیٹھتی۔ بچوں کی واپسی کے
ہمارے کمرے سے ملحق بچوں کے کمرے میں چلی جاتی۔ بچے اپنی سکھی سہیلی عفت سے باتیں کرتے۔ کیمسٹری
سکول کی باتیں سناتے اور ان کے سونے پر عفت پھر کاسنی کمرے میں چلی جاتی۔

ایک روز خاں صاحب ہمارے ساتھ ڈیرے نہ جا سکے۔ پتہ نہیں ان کے اندر کے احساسِ جرم نے یہ
ڈالی کہ دفتری کاموں کا الجھاؤ تھا۔ بہرکیف ہم دونوں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی ڈیرہ پاک پہنچیں۔ راستے میں
طرح میں نے اسے سمجھانے کے سلسلے میں سعی شروع کر دی۔

''عفت تھوڑی سی عقل کرو، جرمنی چلی جاؤ...... پلیز۔''

عفت نے سر جھکا کر کہا۔ ''ساری بات Faith کی ہے قدسیہ۔''

''چلو یہ دل لگی بھی جاری رکھو لیکن Dialysis سے غفلت نہ برتو۔''

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے اپنی صحت کے متعلق بات نہیں کرنا چا
شاید مرنے کا خوف نہیں تھا لیکن شہاب بھائی کا فکر تھا۔ ہو سکتا ہے چھوٹے ثاقب کے متعلق کچھ اندیشے ہوں لیکن
چہرے پر وسوسے، سوچیں، امید ناامیدی عیاں ہو رہی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی پر پچھتا رہی ہو لیکن ڈوبنے سے پہلے تنکے کا سہارا بھی
حیران کن تھا۔ ڈیرے کے متنوع لوگ، بابا جلال، ڈاکٹر اشرف فاضلی، شمس اور ان سب میں ''جلوت خلوت''
بھاری بھر کم شخص۔

''عفت سوچ لو۔ سوچ لو، آخری بار یہ سودا مہنگا نہ پڑے۔''

عفت نے املتاس کے درخت کے پاس پہنچتے ہوئے جواب دیا۔ ''ضرور یہ کم عقلی ہے، جہالت ہے
اپنی مرضی کی موت کیوں مرنے نہیں دیتیں۔ تم چاہتی ہو میں ٹیکوں سے چھلنی کسی سرجری کی میز پر لہو اور گلوکوز
ہوئی مر جاؤں۔ میرا سانس کسی آکسیجن ٹینٹ میں گھٹ کے بند ہو جائے۔ تم لوگ نہیں چاہتے کہ جب
حوریں لینے آئیں۔ نہروں اور باغوں میں میرا ٹھکانہ ہو!''

اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا۔

ہمیشہ کی طرح بابا جلال ہمیں تہہ خانے میں لے گیا۔

عجب اتفاق تھا کہ اس روز تہہ خانے میں کوئی موجود نہ تھا۔ بابا جلال چائے لے کر آ گئے۔ ہم دونوں
تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بابا جی ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل لے آ گئے۔

''لو جی بڑی خیر ہو گئی پُت...... آج تو ہم نے خود بادام روغن نکالا ہے صاف ستھرا۔''

بابا جی ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ عفت بولی۔ ''بابا جی! سارے لوگ مجھے اس علاج سے مایوس کرتے ہیں
کروں؟''

''ناں ناں پُت۔ مسلمان کو مایوس ہونے کا حکم نہیں۔ شیطان کا اور کیا کام ہے پُت۔ وہ انسان کو

۔۔۔یس کراتا ہے۔ آدمی کا معجزے پر اعتماد ختم کرتا ہے۔ ناں ناں پُت مایوسی گناہ ہے گناہ۔''

''پر بابا جی۔''

''پر...... ور کوئی نہیں پُت۔ اوپر والے پر کُلی ایمان رکھو۔ جن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے ان کے لیے ستے ۔۔۔ان کے لیے معجزے ہوتے ہیں۔''

یکدم انہوں نے تہہ خانے میں نظر دوڑائی۔ پھر حیران ہو کر بولے۔ ''اشفاق صاحب ہمارے جانی جان ۔۔۔ہیں۔''

''خاں صاحب تو آج نہیں آ سکے بابا جی۔''

بابا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ناں بیٹا ناں محرم کے بغیر کہیں نہیں آنا جانا۔ حج اور عمرے پر بھی نہیں۔ جہاں محرم ۔۔۔ہو وہاں شیطان تیسرا فریق بن بیٹھ جاتا ہے۔ پھر خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ شاباش پُت۔ واپس جاؤ۔ محرم کو ۔۔۔ساتھ لاؤ...... نہ آ سکے تو پھر سہی۔ شاباش پُت۔''

ہم آزادی پسند پُر اعتماد اپنے راستے اور فیصلے خود کرنے والی عورتیں تھیں۔ اس بات سے ہم دونوں کو ٹھیس سی ۔۔۔لگی۔ جب ہم گھر پہنچے تو عفت کی بڑی بہن جمیلہ اور کشور کو اپنے انتظار میں پایا۔ وہ تینوں لان میں کرسیاں ڈالے چپ ۔۔۔ چاپ خوش انداز میں بیٹھے تھے۔ لان ہی میں ایک چارپائی بچھی تھی جس پر عفت کا بستر لگا تھا۔ ہم نے سرد مہری سے ایک ۔۔۔کا استقبال کیا۔ عفت چپ چاپ بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ شہاب صاحب کے بھانجے اقبال شہاب کا چہرہ ایسے لگتا تھا ۔۔۔جیسے آپ کو اس بیماری کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔

''پتہ نہیں ماموں جان کو کیا ہو گیا ہے؟'' اقبال شہاب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

''کیا ہو گیا ہے شہاب کو؟'' عفت ابرو اٹھا کر بولی۔

''میں خط لکھتا ہوں۔ جواب نہیں دیتے۔ ثریا فون پر بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ آگیں باتیں شائیں کرتے ۔۔۔علاوہ تمہیں جرمنی لے کر کیوں نہیں جاتے۔ مجھے معلوم ہے وہاں تمہاری بیماری کا پکا پکا علاج ہے۔''

''پھر؟''

''وہ خود تو فیصلہ نہیں کرتے اور ہم سب کو مفت میں پریشان کر رکھا ہے۔ آخر ہمارا بھی تو تم پر حق ہے۔ خود تو ۔۔۔سے اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ کشور نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کوئی بڈھا (Quack) تمہارا علاج بالغذا کر رہا ہے اور ۔۔۔ان پڑھ ہے بابا بیچارہ۔''

عفت نے ہمت سے جواب دیا...... ''نبی بھی ان پڑھ تھے اقبال۔ کسی نبی کے پاس پی ایچ۔ڈی کی ڈگری نہ تھی ۔۔۔سارے پڑھے لکھے لوگوں سے افضل تھے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ، کیا حضرت موسیٰؑ، کیا حضرت عیسیٰؑ۔''

کشور اس وقت اقبال کی کمک کو پہنچی۔

''پلیز عفت understand۔ میں Faith-healing کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس وقت تمہاری حالت ۔۔۔نہیں کہ اتنا بڑا Risk لیا جا سکے۔ ہم تمہارے ساتھ بحث کرنے نہیں آئے عفت پلیز...... پلیز پلیز۔''

عفت نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا اور پیٹھ موڑ کر لیٹی رہی۔ وہ تینوں چپ چاپ چلے گئے۔ اتنی بات ہوئی کہ دوسرے دن اچانک شہاب بھائی آ گئے۔ میرا خیال ہے انہیں اقبال شہاب نے فون کیا ہوگا۔

جب سے عفت ہمارے پاس تھی شہاب بھائی کم کم اسلام آباد سے آتے۔ کبھی کبھی ثاقب ان کے ساتھ ان دنوں ثاقب کے ساتھ مل کر رات کو بچے بڑا اودھم مچاتے۔ سب مل جل کر کھانے پکاتے۔ سب اپنی اپنی ترکیبیں اور ہیڈ کک انیق میاں سب کی مان لیتا۔ اس ہیڈ باورچی کی ماننے کی خصلت کے باعث کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئی تک عفت کی بیماری، ڈیرہ پاک کا علاج، ہم سب بڑوں کے وسوسے کبھی ٹرانسمٹ نہ ہوئے۔ وہ رات کو سائیکلوں پر نکل جاتے۔ نہ ہمارے کالے پھاٹک کو کبھی تالا نصیب ہوا۔ نہ ماڈل ٹاؤن کے گھروں ہی میں ابھی دروازے پھاٹک بند کرنے کا رواج تھا۔

شہاب بھائی جب بھی ہمارے پاس آتے وہ بہت کم ہمارے ساتھ ڈیرہ پاک جاتے۔ انہوں نے عفت کو اس فیصلے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن اس بار جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر تشویش تھی۔ ہم نے ایسی فکر مندی ان کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ عفت ڈیرے پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اتنے برسوں بعد بھی وہ عام لوگوں کی طرح ہم سے بے تکلف نہ ہوئے تھے۔

''آیئے آیئے۔'' میں نے خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ خاں صاحب کتاب چھوڑ کر ان کے سامنے بنچ پر آ بیٹھے۔

''تم سے ایک بات کرنا تھی اشفاق۔''

خاں صاحب مکمل توجہ تھے..... ''فرمایئے، حکم دیجیے۔''

''انسان میں توازن سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ باقی رہے تو انصاف قائم رہتا ہے۔ انسان گھڑی کے پنڈولم کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر نہیں ہوتا۔ بہرحال تم خود دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہو..... مجھے عفت کے لیے تو اتنا اندیشہ نہیں ہے لیکن ڈیرہ پاک اور ہسپتالی علاج کے درمیان پنڈولم کی طرح چکر لگاتے لگاتے وہ الجھ گئی ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں ڈیرے پاک پر اس قدر اندھے اعتقاد کے باعث اس کی عاقبت برباد نہ ہو جائے۔''

ہم دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''تم جانتے ہو شرک اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بہت بڑی گستاخی ہے۔ اگر عفت یہ سمجھ رہی ہے کہ کوئی آدمی وہ کچھ کر سکتا ہے جو خدا نہیں چاہتا تو اس کی بڑی بھول ہے۔''

میں عفت کی طرفداری میں بولی۔ ''لیکن وہ اپنے پاک بندوں کی سُن تو سکتا ہے۔ عفت بھی ڈیرے پر برکت کے لیے جاتی ہے۔ باباجی کی دعا پر اسے بھروسہ ہے۔''

''یہاں ہی قدسیہ تھوڑی سی غلطی ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ وہ پاک ہے تو خدشہ ہے کہیں وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو..... نیکی کا راستہ بھی پیدل سفر کا راستہ ہے۔ آدمی چلتا رہے، چلتا رہے..... اور بس۔''

''جی وہاں خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ بابا جی بھی یہی فرماتے ہیں۔'' میں نے جھٹ علمیت بگھارنے کی

''اگر وہ یہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں عفت ان سے کسی معجزے کی توقع نہ لگا بیٹھے۔ دل حد تک تو ٹھیک ہے لیکن......''

وہ چپ اٹھ کر چلے گئے۔

ہم تینوں ڈیرے پاک جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہاب بھائی باہر نکلے اور ہمارے ساتھ ہو لیے۔ کچھ کہے کھولا......اور بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا اجازت ہے اشفاق؟''

سارا راستہ خاموشی رہی۔ ہم نے گاڑی باہر پارک کی اور اندر کی طرف چلے۔ اللہ کی وحدت کثرت میں بٹی میں پھیلی تھی۔ کچھ لوگ چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپ رہے تھے، کچھ راضی برضا ہونے کی کوشش میں اکائی کی صورت بیٹھے تھے۔ کچھ مجسم سوال اور کچھ مکمل جواب صورت تھے۔ ہم بابا جی کے پاس لنگر والی جگہ جا بیٹھے۔ معمول دیگچے چڑھے تھے۔ علی محمد صاحب ان میں مصروف تھے۔ بابا جی روغنی پیالوں میں لنگر بانٹ رہے تھے۔

گڑ والی چائے کا دور چل رہا تھا۔

''آ گئے ہمارے جانی جان...... چلو پُت نیچے چلو۔''

''آج نہیں بابا جی۔ آج ہمیں جلدی واپس جانا ہے۔ شہاب نے اسلام آباد واپس جانا ہے۔''

بابا جی چپ ہو گئے۔ ہمیں چائے کے کٹورے تازہ دم کرنے کے لیے دے دیئے۔

شہاب بھائی نہ ڈیرہ پاک دیکھ رہے تھے نہ ان کی توجہ بابا جی پر تھی۔ وہ بار بار چور نظروں سے عفت کی طرف رہے تھے۔ عفت بار بار جھوک کھا جاتی اور پھر قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو متوجہ کرتی۔ شہاب صاحب کسی محسوس کر اس کے راز معلوم کرنے والے نہ تھے۔ پورے تین سال لندن میں رہ کر عفت کے ساتھ ہسپتالوں کی میں انہوں نے کچھ ایسے سبق سیکھ لیے جن کا ذکر ان کی تحریر میں تھا نہ لبوں پر۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی عفت اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا بابا جی اجازت دیں۔''

اتنی لاتعلقی سے ہم کبھی ڈیرہ پاک نہ گئے تھے۔

پتہ نہیں عفت نے شہاب بھائی کی تشویش بھانپ لی تھی یا اسے ثاقب کی کچھ فکر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اقبال شہاب، اور جمیلہ کی وجہ سے گڑبڑا گئی ہو۔ وجہ جو بھی تھی ہمیں معلوم نہ ہوئی۔ اس بار شہاب بھائی نے کاسنی کمرہ چھوڑا تو عفت ساتھ چلی گئی۔

اس کے بعد ہمیں اس وقت پتہ چلا جب اقبال شہاب نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کچھ ماہ بعد جب بھائی ہمارے گھر آئے۔ میں نے عفت کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ پتہ نہیں کیا حجاب تھا۔

''عفت منہ سے تو کچھ نہیں کہتی......لیکن مجھے لگتا ہے وہ تمہیں یاد کرتی ہے۔''

''میں آؤں گی اسلام آباد اس سے ملنے۔''

''نہیں۔ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے جی؟''

''یہاں لاہور...... میو ہسپتال میں۔''

''تو اس کے پاس ہسپتال میں کون ہے شہاب بھائی؟''

''فوزیہ ہے۔''

''آپ مجھے کہتے شہاب بھائی میں اس کے پاس رہ لیتی۔''

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا چیز ستا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ عفت اور شہاب بھائی لندن گئے تھے تو عفت اپنی ایک غریب رشتہ دار کو ساتھ لے گئی تھی۔ عابدہ کا کام عفت کی نگہداری تھا۔ شہاب بھائی کی عدم موجودگی میں اسے ہسپتال سے لانا لے جانا پڑتا تھا۔ لیکن کر جب تھوڑی دیر کے بعد عابدہ کو ایک ایسی فرم سے کام مل گیا جو کپڑوں میں بٹن ٹانکنے کی اچھی بھلی اجرت دیتی تھی۔ فرم کی وین پر سلے سلائے کپڑے گھر آ جاتے۔

عابدہ گنتی کر کے بٹن دھاگہ، سوئی انگشتانہ پکڑ لیتی اور دن بھر بٹن ٹانکنے میں مشغول رہتی۔ صوفے کرسیاں عفت کے پلنگ پر بھی کپڑوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ہسپتال جانے میں بھی ناغے ہونے لگے۔ دوائیاں بھی عابدہ کو بھول جاتیں۔ عفت نے منہ سے تو عابدہ کو کچھ نہ کہا لیکن جب وہ لاہور لوٹی تو پھر عابدہ کو یہیں چھوڑ گئی۔

مجھے پتہ نہیں کیوں اس خوف نے گھیر لیا کہ شاید شفو جی اور مجھ سے بھی عابدہ جیسی کوئی بھول نہ ہو گئی ہو۔ اپنے کاموں میں گم، بچوں میں گھرے، عفت کو وہ توجہ نہ دے سکے ہوں جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہم نے بھی کے ساتھ عابدہ کا سا سلوک نہ کیا ہو۔

''کیا سوچ رہی ہو قدسیہ؟''

''کچھ نہیں جی۔ جب آپ جائیں گے تو میں...... ساتھ چلوں گی۔''

شام گہری ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اور میں میو ہسپتال پہنچے۔ گاڑی سے اترے تو شہاب بھائی کے پاؤں تھے۔ انہوں نے ایک ٹانگ ہلکے سے جھٹکی پھر تھوڑا سا لنگڑا کر چلے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے Intensive Care پہنچی۔ عفت آکسیجن ٹنٹ میں تھی۔ نیچے بیڈ کے ساتھ پیشاب کی تھیلی ٹنگی تھی۔ اوپر بلڈ اور غالباً شوگر کی کمی کے باعث کی شفاف تھیلی نالی کے ذریعے سے عفت تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے بغیر کسی سے پوچھے اپنا ہاتھ آکسیجن ٹنٹ میں ڈالا اور عفت کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں جیسے مجھے پہچان لیا ہو۔ ایک نرس چیل کی سی تیزی سے ہماری طرف آئی...... ''پلیز آپ ہاتھ ٹنٹ کے ڈالیں۔''

میں نے اس جھڑکی سے مرعوب ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔

”آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ ویسے بھی اس مریض کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“

ہم دونوں اپنا سامنہ لے کر واپس کار میں پہنچ گئے۔ شہاب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔ مال روڈ تک ہم دونوں نے اپنی اپنی کھڑکی کا رخ کر کے باہر بتیوں کی طرف دیکھنے میں وقت صرف کیا۔ میرے آنسو بلا تکلف گر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سسکیاں سی سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر شہاب بھائی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں غالباً پہلی بار ان کا نظم وضبط جواب دے گیا تھا۔ ان کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔

”شہاب بھائی۔ اب کیا ہوگا؟“

وہ سسکیوں سمیت بولے۔ ”دس از دی اینڈ قدسیہ۔ “This is the End.

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کسی قسم کی تسلی نہ دی۔ ہم نہ انجام کے لیے تیار تھے نہ اس انجام کے آگے ہتھیار ڈالنے کی ہمت تھی۔

شہاب بھائی مجھے چھوڑ کر اقبال شہاب کے گھر چلے گئے۔

پھر عفت اپنے اصلی گھر چلی گئی۔ اس کا جنازہ اس کے خاندان والے لے کر اسلام آباد چلے گئے۔ شاید خاں صاحب کو سارے حالات کا علم تھا لیکن مجھ سے انہوں نے کسی قسم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بابا جی نے جیسے عفت کا تعاقب کیا۔ عفت اور بابا جی نور والے دونوں ہم سے جدا ہو گئے۔ ڈیرے پر بابا جی کے بڑے بیٹے خلیفہ ہو گئے۔ اب ڈیرہ پاک پتن کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر فاضلی بھی ڈیرے سے جدا ہو گئے۔

پتہ نہیں یہ ہر بڑے آدمی کا نصیب ہے۔ اس کے جاتے ہی خاندان اور دوست دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ حالانکہ دودھ اور پانی دونوں طیب ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے میں ضم ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ محبت اور یگانگی کی بجائے حسد اور مقابلے کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں لیکن کیا کیا جائے شاید یہ وہ قیمت ہے جو ہر بڑے آدمی کو اپنی شہرت، ناموری اور بڑائی کی اپنے رب کے حضور پیش کرنے کا حکم ہے۔

خاں صاحب بھی ڈیرے پاک سے جدائی کے بعد کچھ دیر ستائے۔ ان کی تلاش کسی معمولی آدمی کی نہ تھی۔ پھر ان کا رخ سخی رازی کی طرف ہو گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ان کے ڈیرے پر جاتے رہے۔ آخر ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

”قدسیہ..... سخی رازی صاحب کا ڈیرہ لاہور سے قریباً بیس میل دور نہر سے کچھ دور ہے۔ سخی رازی صاحب سندھی ہیں۔ ان کی آواز میں جو سندھی لب ولہجہ ہے، وہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ خاص کر جب وہ پنجابی بولتے ہیں۔ اردو بولنے والے لوگ ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔ باقی تم خود چل کر دیکھ لو..... یعنی اگر جانا چاہو تو..... میں مجبور نہیں کرتا۔“

ہم دونوں نہر سے ہو کر سخی رازی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ بابا جی نور والے جیسے انتظام تو نہ تھے نہ دیسے مخلوق کی بھیڑ تھی۔ ڈیرے پر سخی رازی صاحب کی دانش رس رہی تھی۔ پیاسی زمین جیسے لوگ سیراب ہو رہے تھے۔

سائیں سخی رازی سے ہوتے ہواتے خاں صاحب واصف علی واصف صاحب تک پہنچے۔ واصف صاحب ان

کے پاس اپنی کتاب ''شب چراغ'' کا دیباچہ لکھوانے اردو بورڈ آئے تھے۔ خاں صاحب نے جلد ہی ان کی وسعت بھانپ لیا۔ پورے تین ساڑھے تین سال خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کی رات کی محفلوں میں جاتے رہے۔ یہ والٹن کی جانب ایک سکول میں منعقد ہوتی تھیں۔

خاں صاحب قریباً گیارہ بجے ساتھ والے کمرے سے انیق کو جگاتے۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلتے۔ لاک کرنے کا تب رواج نہ تھا۔ عام لوگوں کے شکوک رفع کرنے اور انہیں تشفی اور تسلی کا پھاہا لگانے کے لیے واصف صاحب اپنا بیان جاری رکھتے۔ رات کو یہ محفل ٹوٹتی اور جس طرح دبے پاؤں باپ بیٹا جایا کرتے ویسے ہی خاموشی سے آتے۔

یہ ڈیرہ ذرا اپنی نوعیت کا تھا۔ یہاں ایک سکول ٹیچر براجمان تھا۔ سارے بیان ٹیپ پر ریکارڈ کیے جاتے اور کاریکارڈر کھا جاتا۔ جب واصف صاحب کی مصروفیات ان بیانات کو تحریر میں لانے کی طرف مائل ہو گئیں تو یہ سلسلہ گیا لیکن خاں صاحب سے تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔

سید سرفراز شاہ صاحب کا تعارف ممتاز مفتی کی وجہ سے ہوا۔ مفتی جی خود تلاش کے آدمی تھے۔ ان کے زندگی کا مقصد سمجھنے کی ہوس تھی۔ انہوں نے خاں صاحب کو سرفراز صاحب کے ڈیرے کا پتہ دیا۔ شاہ صاحب اقبال ٹاؤن میں رہتے تھے۔ پیچھے رہائش تھی اور سامنے ڈرائنگ روم کو انہوں نے خلق کے بیٹھنے کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ معذور اور بوڑھوں کے لیے صوفے تھے۔ درمیان میں قالین بچھا تھا۔

اس ڈرائنگ روم کے دو حصے تھے۔ ایک بنیادی طور پر ڈائننگ روم تھا جس میں بیضوی میز کے گرد کرسیاں تھیں۔ پھر ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کے درمیان جالی کا پردہ تھا۔ سرفراز شاہ صاحب کا طریقہ واردات بالکل مختلف تھا۔ وہ شام مردوں سے ملتے اور جمعرات کی شام عورتوں کے مسائل سلجھاتے۔ ان محفلوں میں پہلے تو کچھ دیر وہ دنیاوی مسائل کے متعلق جنرل باتیں کرتے۔ پھر اندر بیضوی میز کے سرے پر جا بیٹھتے۔

ان کی خلیفہ ایک خاتون تھیں۔ وہ ہر آنے والے کو پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصول پر ایک نمبر پکڑاتی تھیں۔ کمرے سے جونہی شاہ صاحب ریٹائر ہو کر اندر جاتے۔ مسائل پوچھنے والوں کو نمبروار اندر بھیج دیا جاتا۔ گھر کے پچھلے حصے میں شاہ جی، ان کی والدہ، بیگم ساجدہ، بیٹیاں اور بیٹے رہتے تھے۔

خاں صاحب جب تک ہم لوگوں میں رہے۔ سرفراز شاہ صاحب کا رشتہ خاں صاحب سے نہیں ٹوٹا۔ جب سدھارے تو وہاں سے خاں صاحب کے نام شاہ جی کے خط آتے رہے۔ سرفراز شاہ صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے۔ بڑی فرموں میں پورے طور پر ان کا فنانس ڈیپارٹمنٹ سنبھالتے تھے لیکن کہیں ان کے اندر ایک ایسی تڑپ اور ناآسودگی ضرور تھی جو انہیں ایک ان پڑھ مرشد کے پاس لے گئی۔

یہ مرشد انارکلی کی دہانے پر مسجد کے پیچھے گلی میں رہتے تھے۔ ان ہی مرشد صاحب نے شاہ جی کی تربیت کی۔ انہیں کشف کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا اور خلق کی خدمت کی پڑیا چٹا دی۔ یہی علم شاہ جی کے اس وقت کام آیا جب انہوں نے اقبال ٹاؤن میں لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدگی میں دینا شروع کیا۔ یہاں بیضوی میز کی سرے والی کرسی پر بیٹھ

سیت سنتے۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔

تھوڑا سا لرزہ ان پر طاری ہو جاتا۔ وہ جیسے مستقبل کے پانیوں میں ڈوب کر موتی اور مونگے نکالتے۔ کبھی کبھی کوئی ہڈی اُن کے ہاتھ آ جاتی۔ عموماً دنیاداروں کو دولت، عزت، نوکری، تبدیلی، صحت کے مسائل درپیش ہوتے۔ ے ہر بابے کی طرح ہمیشہ یہی کوشش کی کہ انسان مایوسی کی طرف قدم نہ بڑھائے۔

میرے تینوں بچوں کی ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ چھوٹی عمر میں انہیں بابوں اور ڈیروں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ زیادہ تی کی وا اور کم محنت کے باعث وہ اس طرح دنیا حاصل نہ کر پائے جس کی وجہ سے ان کا دین اور دنیا دونوں گڈمڈ ہو ے۔ شروع میں تین بار خاں صاحب اثیر خاں کو شاہ جی کے ڈیرے پر ساتھ لے گئے لیکن پھر سرفراز صاحب نے اثیر میاں کو پکا دوست بنا لیا۔ شاہ صاحب کی انتہائی مہربانی کہ وہ چیری کو اپنی کار میں بٹھا کر ڈرائیو پر لے جاتے اور اس طرح دوستوں کی طرح سلجھاتے۔

یکدم شاہ جی اور خاں صاحب کا رشتہ سمرسالٹ کھا گیا۔ کہاں تو شاہ جی مرشد کے درجے پر تھے۔ اب وہ خاں صاحب کو اپنا والد سمجھنے لگے۔ یہ رشتہ کچھ ایسا گہرا اور خفیہ تھا کہ جب شاہ جی لندن سدھارے اور وہاں جوق در جوق لوگ ان سے فیض حاصل کرنے لگے تب بھی خاں صاحب اور ان میں خط و کتابت جاری رہی۔ فون پر رابطہ رہا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد یہ رشتہ کچھ دیر تو جوش و خروش سے جاری رہا لیکن جب وہ کیولری گراؤنڈ میں رہنے لگ گئے اور ان کے عقیدت مندوں کی زیادہ یورش ہوگئی تو میں اکیلی یہ رشتہ نبھا نہ سکی۔ ان کی بیگم ساجدہ نے البتہ مجھ سے رابطہ رکھا۔ بنیادی طور پر ساجدہ ایک ادیبہ ہے۔ شاہ صاحب کی خواتین مریدنیاں جس ذوق و شوق سے ان کی طرف رجوع کرتی ہیں، یہ رویہ ایک عام عورت کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن ساجدہ ادیب ہونے کے ناطے جلتی تو شاید عورت کی طرح ہو لیکن سمجھوتہ کرنے کی اس میں صلاحیت تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زندگی بہت سے رنگوں کی قوسِ قزح ہے۔ کوئی شخص اسے اپنی مرضی سے یک رنگی نہیں کر سکتا۔ سر جھکانے میں ہی عافیت ہے۔

ہر رمضان کی ستائیسویں کے دن اُن کے چاہنے والے اقبال ٹاؤن میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں روزہ کھلوایا جاتا ہے۔ دیگیں پکتی ہیں۔ بالالتزام مردانہ، زنانہ الگ رکھا جاتا ہے۔ کھانا اور پھل وافر مقدار میں کھلایا جاتا ہے۔ پہلے یہ تقریب شاہ جی کی رہائش گاہ سے ملحقہ سڑک پار کر کے گراؤنڈ میں منعقد کی جاتی تھی لیکن اب کچھ فاصلے پر ایک گھر کے اندر روزہ کھلوائی کی رسم جاری ہے۔

شاہ جی مردانے کا خیال رکھتے ہیں۔ بار بار عورتوں کی طرف آتے ہیں۔ ان کی مروت کا یہ عالم ہے کہ اتنی مصروفیت کے باوجود اگر کوئی عورت ان کی خصوصی توجہ کی طالب ہو اور کسی مسئلے کا حل چاہتی ہو تو وہ سب سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ورد جاری رہتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے انہیں سائل کا جواب پڑنا ہوتا ہے۔

اب نہ اشفاق صاحب ہیں......

نہ بابا جی......

نہ یحییٰ رازی صاحب......

نہ عفت ...... نہ شہاب بھائی ......

سنا ہے دانش کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا نہیں۔ حسین زنجانی کے جانے سے پہلے حضرت داتا علی ہجویریؒ کو لاہور کے آرڈر مل جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی پشت در پشت چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ امید قائم رکھنے والے سلامت رہیں۔

(ڈیرے پر نوجوان نے آ کر کہا، میں ترکِ دنیا کرنا چاہتا ہوں اور فقیری اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ زندگی کے بکھیڑے، یہ ساز و سامان، یہ لشٹم پشٹم میرے بس کا روگ نہیں۔ جواب دیا گیا رہبانیت زندگی کے منافی ہے۔ اس سے راہب کو فائدہ پہنچتا ہے نہ اس کے اردگرد کی دنیا کو۔ ہمارے دین اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔)

خاں صاحب کہا کرتے ...... ''ہمارے گھر کو تو چاہیے ہر وقت سجدے میں رہے۔ وہ کونسی نعمت ہے جو رب نے ہمیں دے نہیں رکھی۔ ہم اس سے اور کیا تقاضا کریں قدسیہ۔''

کبھی کبھی کہتے ''جب اللہ یوں بھر دے تو پھر آدمی کبھی اوپر کے طبقے کو نہ دیکھے ہمیشہ نیچے والوں میں رہے۔ جہاں نعمتیں کم ہیں۔ ویسے بھی بابا جی نور والے فرمایا کرتے تھے۔ ''امیر آدمی کی خدمت میں رہنا اپنی مرشدی وقت ضائع کرنا ہے۔''

چند دنوں سے میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ ہمارے یہاں کلچر پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ کلچر کی اپنی Roots کی تلاش کو دین سے مقدم گردانا جاتا ہے۔ لیکن ......

1- دین انسانیت کو آگے کی طرف لے جاتا ہے اور کلچر ماضی کی طرف۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سورۃ رحمٰن یا سورۃ یٰسین میں مجھے ایک آیت ایسی بھی نظر آئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔'' اس اعتبار سے دین کا آگے ہی آگے بڑھتے جانا ثابت ہے۔

2- جب ہم کلچر کی بات کرتے ہیں تو ساگ روٹی، بیل گاڑی کا سفر، ہاتھ کی پنکھی، پرانے کنوئیں کا منظر، میلے ٹھیلے، پنگھوڑے بھنگڑے یاد کرتے ہیں۔

3- جب ہم اپنی روٹس کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو ہم حاکم کو سجدہ کرنے، سونے کے کنگن پہننے، بیٹی پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنے اور بیوہ کو ستی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

4- حضور سائیں صاحبؒ اس سلسلے میں پیوند کا ذکر کیا کرتے تھے کہ جب پیوند لگ گیا تو زندگی ماضی سے علیحدہ ہو کر حال سے وابستہ ہوگئی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جاہلیہ کی رسوم ختم ہوگئیں۔

ڈیرہ پاک پر میری موجودگی میں حضور نے تین مرتبہ اس (پیوند) کا ذکر کیا مگر میں ہر مرتبہ ان سے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ان کے الفاظ ٹھیک سے catch نہ کر سکا۔ پھر حضور کا بیان ایسا ہوتا تھا کہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتے تھے۔ بہت سی باتوں کو ان کے سیاق میں جوڑنا پڑتا تھا۔ اس کام میں آپ ہی ہمارے موڈی تھے۔ اس لیے ہم بعد میں آپ سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ اب بھی آپ کی ویسی ہی ضرورت ہے۔

(خاں صاحب کے کاغذات)

یہ چاند، سورج کا طلوع و غروب محض وقت کے احساس کی اکائی بنا لیے گئے ہیں اور ہم وقت کو ایک خارجی شے

ہیں۔ فرض کریں کہ چاند سورج نہ ہوں تو کیا ہو۔ صرف اندھیرا، جو کہ مسلسل ہوگا تو گویا پھر ایک ہی جیسی کیفیت میں وقت گزرنے کا احساس کیسے ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کا بچپن، بڑھاپا وقت کے چلنے کا احساس دلائیں گے اگر انسان کی عمر میں تبدیلی کا یہ عنصر ختم کر دیا جائے تو پھر وقت کا احساس کیسے ہوگا۔ گویا Timelessism ایک جیسی یا ایک ہی Physical State کو کہا جائے گا۔

یہ فرق زمان و مکاں میں قید اور آزاد کرتا ہے۔

دراصل وقت ایک صدوری کیفیت ہے۔ یہ کہنا کہ کائنات ارتقاء میں ہے، غلط ہے۔ وقت صرف انسان کی کیفیت ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ کوئی چیز بھی اس اندرونی کیفیت سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء اندرونی واردات ہیں۔ ہر واردات میں نوعی سراپا کی نقلیں افراد کی شکل میں چھاپتی ہیں۔ چھپائی اندر رفتار میں ہے۔ اس رفتار کا نام ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہو جائے تو اندر لنگڑا، لولا، اندھا چھپنے لگتا ہے۔ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ جب عارف کا ذہن ایک لمحے کے لیے صدوری کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے تو بے اعتدالیاں دور ہو جاتی

ارشاد: سائیں کے پاس بیٹھا ہوں کہ ایک لنگڑا آدمی وہاں سے گزرتا ہے جو سائیں سے فریاد کرتا ہے، اسے ٹھیک کیا جائے۔ سائیں ایک نظر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ارشاد: اس واقعہ کی توجیہہ دریافت کرتا ہے تو وہ اس کو مندرجہ بالا وضاحت دیتا ہے یعنی سائیں چھپائی کی رفتار balance کر دیتا ہے۔

کسی کا دیوار یا کسی اور ٹھوس چیز سے گزر جانا۔

کائنات میں کشش ثقل ہی سب کو تھامے ہے اور اشیاء اسی ثقل کے باعث ایک دوسرے کی حرکت میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں لیکن ثقل لطیف اشیاء کے راستہ میں زیادہ رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس طرح اگر کسی کا دماغ تجلی الٰہی میں متحیر ہو جائے جو کہ نہایت لطیف ہے تو جسم ذہن کے تابع ہونے کی وجہ سے ثقل کی منزل سے آگے چلا جاتا ہے۔ اس طرح ٹھوس اشیاء میں سے انسان گزر جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ جگہوں پر ایک ساتھ نظر آنا۔

اس کی مثال فوٹو ہے۔ اس میں پہلے نیگیٹو تیار کیا جاتا ہے۔ پھر پوزیٹو بنایا جاتا ہے۔ ایک نیگیٹو سے ہم جتنی چاہیں تصویریں تیار کر سکتے ہیں۔ یہی حال روح کا ہے۔ روح ایک Negative ہے اور گوشت کا جسم اس کا پوزیٹو۔ اگر کسی شخص کے ذہن کا Lense مصفی اور طاقتور ہے تو چاہے تو وہ خود کو یعنی روح کو پوزیٹو کی شکل میں کئی جگہ ظاہر کر سکتا ہے۔ دوسری مثال ٹی وی ہے۔ اولیاء اللہ اس علم روح کی نشریات کو بیک وقت کئی سکرینوں پر متحرک کر دیتے ہیں۔

روح

پوری کائنات اور اس کے اندر تمام مظاہرات ایک سرکل میں سفر کر رہے ہیں اور ہر شے دوسری سے متعارف ہے۔ تعارف کا یہ سلسلہ خیالات پر مبنی ہے۔ کائنات کی ہر شے دوسری کو ''فکر'' کی لہروں کے ذریعے سے جانتی ہے۔

سائنس دان روشنی کو تیز ترین سمجھتے ہیں مگر تفکر کی لہریں ان فاصلوں کو حاضر ہی نہیں سمجھتی جن کو روشنی کم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمانؑ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جب انہوں نے ملکہ سبا کے آنے سے پیشتر اس کے تخت کو منگوانے کو کہا تو جن نے کہا کہ میں آپ کے دربار برخاست ہونے سے پہلے وہ لاسکتا ہوں جبکہ ایک اہل علم نے پلک جھپکنے میں وہ تخت حاضر کر دیا۔

دراصل اس آدمی کے خیال کی لہریں تخت کے اندر کام کرنے والی لہروں میں جذب ہو کر تخت کو منتقل کرنے کا ذریعہ بن گئیں۔ اس طرح حیوانات اور جمادات صرف تفکر کی لہروں سے گفتگو کرتے ہیں۔ سائنس نے کائناتی تفکر کو ... نام دیا ہے۔ تصوف میں اس کو روح کا نام دیا گیا ہے۔ مکمل موت نہ توانائی پر وارد ہوتی ہے نہ روح پر۔ روح کو جو علم ودیعت کیا گیا ہے وہی خیالات، تصورات اور احساسات بنتا ہے۔ یہ دونوں لہروں اور شعاعوں پر ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان لہروں کو پڑھنے اور ان کو حرکت دینے پر قدرت حاصل کرلے تو ہم کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں۔

دریائے وحدت

چاروں طرف آسمان کے اوپر دائرے میں نور کا دریا بہہ رہا ہے۔ یہ دنیا سے بالکل قریب ہے۔ یہ دریائے وحدت ہے، اس میں سے آواز آتی ہے..... "لوگو اٹھو۔ میں تم سے بہت قریب ہوں۔ جاگو تاکہ میں تمہاری مشکل آسان کروں۔ تم پر رحمت کروں۔"

اس میں لوحِ محفوظ کا ایک مقام ہے۔ یہاں سے اللہ کے احکامات دنیا پر نازل ہو رہے ہیں۔ یہ روشنی کی شکل میں ہیں۔ اس مقام پر دنیا کے ہر فرد کے متعلق احکامات کا ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ سے روشنی کی لہریں دھاری کی شکل میں نکل کر اس فرد کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ یہ تمام نظام آٹومیٹک ہے (کُن کُن کُن کُن ......) جہاں سے آٹومیٹک طریقے پر تحت روشنیاں (احکامات کی) ہر ہر فرد تک پہنچ جاتی ہیں۔

تجلی ذات کے نقطہ وحدانی سے 11,000 صفات الٰہیہ کی روشنیاں حکم کُن کے ذریعے نکلتی ہیں اور بارہ حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں یعنی 12 ستارے، 12 برج بن گئے اور ایک برج میں اس ستارے کے ماتحت اربوں کھربوں ستارے آگئے اور ان سب کو برج کے لیڈنگ ستارے سے روشنی تقسیم ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ایک نقطہ وحدانی کے بارہ برج ہیں۔ اس سے کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ خیال بھی کہ کیا اتنی بڑی کائنات میں محض ہماری زمین پر زندگی ہے؟ نہیں بلکہ ہزاروں عالمین اور ہیں۔ ہر عالم کا ایک جداگانہ رنگ ہے۔ جیسے ہماری زمین پر آسمانی رنگ ہے کیونکہ ہر عالم میں مختلف صفات کام کر رہی ہیں۔ اس لیے رنگ مختلف ہیں۔ زمین ہی کی طرح زندگی، درخت، باغات ہیں۔ ہر شے کی حقیقت اللہ کی نگاہ میں ایک ہے۔ روزِ ازل سے اللہ نے ہر شے کو جس قانون اور فارمولے کے تحت پیدا کیا تھا۔ اس میں ابد تک کسی ردوبدل کا اندیشہ نہیں۔ عالمین میں ہر شے کا وہی متعین فارمولا ہے جو ازل میں تھا اور وہی اس شے کی حقیقت ہے۔

درود شریف

درود شریف ایک خاص نور کی دھار ہے جو خاص تناسب رکھتی ہے۔ جب اسے پڑھا جائے تو یہ لہر فوراً ...

تک پہنچ جاتی ہے اور حضورؐ اس شخص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ درود شریف روشنی کی وہ لہر ہے جس کا کنکشن حضور سے ملتا ہے۔

اگر ڈرامے میں درود شریف پڑھاتے دکھائی دے تو اس طرح کہ لائن میں لوگوں کے ہاتھوں میں دیئے ہوں یا نظر آئیں اور جیسے جیسے وہ شخص درود شریف پڑھے۔ ایک کے بعد ایک بلندی کی طرف رہے۔ روشن ہوں اور آسمان روشنی جائے۔ (اندھیرے میں) یا مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے دکھایا جائے۔

اگر آپ نور کی فضا کائنات میں دکھائیں تو ایسے کہ ایک کالی چادر یا کاغذ پر "محمد ﷺ" رنگین کر کے لکھیں اور اس کیمرہ سے دکھائیں کہ کائنات پر محیط نظر آئے اور ہر لفظ سے روشنی کی لہریں نکل کر لوگوں تک پہنچ رہی ہوں۔ جب خدا نے بنائی تھی اس سے بہت پہلے یہ لفظ نور کی فضا میں لکھ دیئے گئے تھے۔

اگر آپ یہ دکھانا چاہیں کہ سائیں یا صاحب ارشاد کسی کو نسبت دے رہے ہیں تو نسبت عطا کرنے والے کے روشنی کی لہر دوسرے کے دل میں جذب ہو جائے گی۔

لائٹوں کے ذریعے سر کے اوپر روشنیاں ڈال سکتے ہیں۔ اگر ارشاد دائرے میں ہے، اس کے اطراف دائرے روشنیاں حرکت کرتی ہوئی دکھائیں یا کیمرے میں پتلی روشنی کی دھار جو باریک ٹارچ سے ڈالی جا سکتی ہے، جو جلتی بجھتی ہے۔ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔

کیونکہ روشنیاں باشعور ہیں۔ وہ گفتگو بھی کرتی ہیں۔ آپ ارشاد کی کسی روشنی سے گفتگو دکھا سکتے ہیں۔ روشنی بتا رہی ہو۔ آپ دل کی صفائی ایسے دکھا سکتے ہیں کہ پہلے دل کو کالا دکھائیں، پھر نور سے وہ آہستہ آہستہ سفید چمکدار ہو جائے۔

لطائف ستہ سے ہر شخص روشنی حاصل کرتا ہے جو کہ تصوف میں کام آتی ہے۔ سائیں اپنے لطائف ستہ سے کو روشنی دے سکتا ہے۔ ان مقامات سے روشنی کی دھاریں نکل کر ارشاد میں جذب ہو سکتی ہیں۔

آپ ارشاد کو یا کسی کو نور کے دریا میں دکھا سکتے ہیں۔ سفید دھوئیں میں ڈوبا ہوا دکھا دیں۔

آپ مختلف رنگوں کی روشنیاں دکھانے کے لیے اندھیرے میں مختلف رنگ کے بلب استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ نور کی بارش دکھا سکتے ہیں۔ لائٹ آبشار کی طرح گرے۔

تصوف کا طریقہ یہ ہے کہ سائیں یا مرشد اپنے دل میں ارشاد کے دل کی طرف لائٹ بھیجتا ہے۔ یہ دھاریں جمع ہو رہی ہیں تو جس پر پڑتی ہیں اس میں Charge پیدا کرتی ہیں جیسے کوئی بیمار ہے، اس کے دل پر جا کر اس کے دل میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔

آپ کسی کو ایسا خواب دیکھتا دکھائیں کہ وہ لائٹ کی دھار پر چڑھتی ہوئی آسمان پر پہنچے۔ ایک کمرہ میں داخل ہو جہاں بہت سے لوگ مشینوں پر ہوں۔ دیوار پر تصویریں ہوں۔ وہ ان سے پوچھے کہ یہ تصویریں کیوں ہیں تو وہ دکھائیں کہ کس طرح تصویر ڈال کر ہم روزانہ اس شخص کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ مومن کی تصویریں کمپیوٹر میں ڈالیں تو جلدی جلدی اس کی زندگی ٹی وی پر دکھائیں اور بتایا جائے کہ ہم انسان کے اعمال کے مختلف خانے ہیں اور ہم روزانہ اس میں اس کے

اعمال کی Marking کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اسے اصلاح کی طرف لائیں۔

خواب اور بیداری میں فرق

ہماری روح کی بناوٹ ایسی ہے کہ وہ ہر لمحہ مضطرب ہے۔ دن میں تو ہم کام کرتے ہیں مگر رات کو جب سوتے ہیں تب یہ روح اپنے لباس میں یعنی جسم مثالی کی شکل میں حرکت کرتی ہے اور تمام کام کرتی ہے مگر ہمارا جسم چونکہ سویا ہے، اس لیے اسے خواب کا نام دیا جاتا ہے۔ مادی جسم کششِ ثقل میں قید ہونے کے باعث محدود ہوتا ہے جبکہ جسم لطیف ہونے کے باعث کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

زمان ومکاں کی تھیوری کو ڈسکس کریں، جو کہ پہلے والے پیپرز میں تفصیلاً ہے۔

دراصل زمان ومکاں ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہیں۔ ایک سکے کے دو رخ ہیں اور مکانیت، زمانیت پر اس طرح سے بیل بوٹے بنے ہیں اور یہ ایک مشین پر ایک ساتھ چھپ رہے ہیں۔

واقعہ سورج

تیز رفتار سواری ہو تو وقت کم لگتا ہے۔

یہ تمام کائنات اللہ کے نور سے بنی ہے اور ہر شے میں اللہ کا نور مختلف متعین مقداروں میں کام کر رہا ہے۔ چاند ستارے سب اللہ کے نور سے روشن ہیں۔

اس کائنات میں مختلف لہریں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور تیز رفتار، تفکر کی لہریں ہیں۔ ... کائنات قائم ہے۔ اسی کے ذریعے سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تفکر کی لہر فرش سے عرش تک ایک لمحہ میں سفر ... اور یہی لہر تصرف کی قوت حاصل کر کے انسان کو عرش تک پہنچا دیتی ہے۔

زمان ومکاں Related ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آپ کو پیدل جانے میں جتنا وقت لگتا ہے۔ سائیکل رکشہ، جہاز استعمال کریں تو وقت اتنا ہی کم ہو جائے گا، فاصلہ وہی رہے گا۔

کششِ ثقل کا قانون

تخلیق کا قانون ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا وجود دو رخوں پر قائم ہے۔ اگر آدم میں حوا نہ ہوتی تو ... پیدائش ناممکن تھی۔ دوسری مثال مریمؑ سے حضرت عیسیٰؑ کی ہے۔ فرد میں ایک پرت مغلوب اور دوسرا غالب رہتا ہے۔ مغلوب ادھورا پرت اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لیے دوسرے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی سے جنس مخالف میں کشش ... کرتا ہے۔

زمان ماضی ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ زمانہ گزرتا ہے حالانکہ زمان ماضی (ریکارڈ) ہے حال اور مستقبل ماضی کے اجزاء ہیں۔ جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو گیا ہے۔ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ زمان متواتر ... اتوار، پیر......) شعوری ہے۔ دوسرا وہ جہاں زماں لاحساب ہے جیسے کہ خواب ہیں۔

اصل میں زندگی کی فلم بنائی گئی ہے اور اب لوحِ محفوظ سے سکرین پر ری پلے کی جا رہی ہے۔

جیسے سینما میں ہم فلم میں ماضی، حال، مستقبل کا سوچتے ہیں مگر اصل میں تمام فلم ماضی میں بنتی ہے۔ یہی حال ہے کہ ہم کو چلایا جا رہا ہے، سب کردار اپنا کام کر رہے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا خط اشیر کے نام

لندن

11 فروری 1983ء

پیارے بیٹے اشیر! السلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ کئی بار پڑھا۔ افسوس صرف یہ ہوا کہ یہی صورتِ حال پہلے ہی بتا دی ہوتی۔ میری مانو تو کسی عامل یا مجذوب وغیرہ کے پاس جانے، ان سے کچھ کھانے پینے یا تعویذ لینے کی ہرگز ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ارے بیٹا! اگر کسی لڑکی سے محبت ہوگئی تو کیا ہوا لیکن اس سے آگے تم نے پوری طرح نہیں لکھا کہ کیفیت کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ مجھ کو ذرا اور Confidence میں لے کر پوری طرح بتاؤ کہ مصیبت کیا ہے جسے تم شدت سے محسوس کر رہے ہو؟ اس کے بعد ہی تفصیل سے کوئی مزید مشورہ دے سکوں گا۔

یوں وساوس کی حد تک کسی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ آتے ہیں تو آنے اور گزر جانے دو۔ ان کی طرف زیادہ توجہ بھی نہ دو۔ نماز، سورہ حشر کی آخری رکوع کی آیات باقاعدگی سے پڑھتے رہو لیکن اعتدال کے ساتھ، بہت زیادہ شدت سے نہیں۔

زندگی کی مسرتوں کی اصلی کنجی اعتدال میں ہے یعنی ہر چیز میں نارمل رویہ اختیار کرنے کی۔ عبادت میں بھی، محبت میں بھی، دیگر ہر شے میں بھی۔

میں تمہارے اگلے خط کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ اس وقت تک انشاءاللہ میں آنکھ کے آپریشن سے بھی فارغ ہو چکا ہوں گا۔ اگر تم واقعی مجھے اپنے Confidence میں لینے کے قابل سمجھتے ہو تو ضرور لکھنا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ انشاءاللہ تمہاری کوئی ایسی پرابلم یا مصیبت نہ رہے گی جو حل ہو کر بہت جلد دور نہ ہو جائے۔ فی الحال کالج کی پڑھائی سمیت ہر چیز میں مقدور بھر نارمل حد تک دل لگائے رکھو۔ تمہارے لیے دل سے دعا کرتا ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔

تمہارے اگلے خط کا جواب انشاءاللہ زیادہ تفصیل سے لکھوں گا۔

نانا، اشفاق اور بانو کو سلام۔ نوقی اور کیسی کو پیار۔

تمہارا

قدرت اللہ شہاب

برکلے ایکسچینج

Berkeley Exchange

ابھی ہمیں داستان سرائے میں آئے بمشکل چار سال ہوئے تھے کہ برکلے Exchange کے تحت
میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈیرہ پاک پر آپ نے شمس سے ملاقات کر ہی رکھی ہے لیکن اب کچھ سالوں کے لیے
گھر پر گویا امریکیوں کا راج ہو گیا۔ برکلے سے شاگردوں کا تبادلہ پاکستان اور پاکستان سے ادیبوں' طالب علموں
کے قابل ذکر لوگوں کو امریکہ سے متعارف کرانے کا پلان تھا۔

خاں صاحب اس پروگرام کے تحت 1963ء میں مدعو ہو چکے تھے۔ اب میزبانی کی ہماری باری تھی۔
پاکستانی گھروں میں بطور مہمان رکھنا' انہیں اُردو پنجابی سے یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن سے شناسائی عطا کر
روپے پیسے کی پہچان عطا کرنے کی یہ ایک معمولی سی کوشش تھی۔ مجھے اس پروگرام کی تفاصیل معلوم نہیں تھیں نہ مجھے
انفرمیشن ہی لینے کی عادت تھی۔

ایک دن خاں صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے "قدسیہ! مجھے معلوم ہے تمہارے پاس کام زیادہ
میں کمٹ ہو چکا ہوں۔ تمہارے پاس کل ایک مہمان آئے گا۔"

"ٹھیک ہے آنے دیں..... بس اُسے یہ بات ضرور بتا دیں کہ میں اُسے گفتگو سے entertain نہیں کر

"ٹھیک ہے..... ویسے بھی وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین ہے۔ اپنے میں مگن رہے گا۔ کبھی کبھی میں اُسے
لے جایا کروں گا۔"

باب ہیز پہلے غالباً Y.M.C.A. میں اُترا۔ پھر خاں صاحب اُسے گھر لے آئے۔ ابھی شہاب صاحب
کا سنی کمرہ خالی تھا۔ باب کو اس میں ٹھہرا دیا گیا۔ دُبلے پتلے دراز قد مہمان سے متعارف ہونے میں دیر نہ لگی۔ اُس
کسی کھانے کے لیے اصرار نہ کیا نہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش ہی کی۔ مجھے ایک واقعہ اچھی طرح سے یاد ہے۔
روزوں کے دن تھے۔ بچے تک پابندی سے روزے رکھ رہے تھے۔ میں دوبارہ صبح اُٹھ کر باب کے

لیکن یہ ناشتہ عموماً انڈے پراٹھے تک محدود ہوتا۔ کبھی کبھار اس میں مکھن توس کا اضافہ کر دیا جاتا۔ میں ناشتے پر اُس سے پہلے بیٹھ جاتی، کبھی بچوں کو خدا حافظ کہنے گھر کے کام کاج میں مصروف ہوتی تو وہ اکیلا ہی ناشتہ کر لیتا۔

ایک دن صبح وہ برآمدے میں آیا۔ خاں صاحب اُردو بورڈ جانے والے تھے۔ باب نے اشارے سے اُنہیں روکا اور بڑی محبت سے انگریزی میں بولا..... ''اشفاق! کل سے میں آپ لوگوں کے ساتھ سحری کھاؤں گا اور رات کو روزہ افطار کروں گا۔''

''او ناں بھائی ناں۔ تم اپنا معمول جاری رکھو۔ ایسی مصیبت کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن میں ایسا کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا تمہارا عقیدہ بدل گیا ہے؟ مسلمان تو نہیں ہو گئے کہیں؟''

''جی نہیں! ابھی تک نہیں..... ابھی تک میں Eck Anker کی تعلیم پر کاربند ہوں۔''

''پھر یہ روزے کس لیے؟''

''بات یہ ہے خاں صاحب! کہ اسی کام کے لیے تو میں پاکستان آیا ہوں۔ یہاں کے رسم و رواج کو قریب سے دیکھوں، ڈوب کر دیکھوں..... اور غور سے دیکھنے کے لیے عمل میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

لو جی طے ہو گیا۔ باب نے بڑے اطمینان سے روزے رکھے اور سحری اور افطار ہم لوگوں کے ساتھ مل جل کر بڑی رغبت سے کھاتا رہا۔ عید سے کچھ دن پہلے جب بچوں کے عید کے جوڑوں کی تیاری شروع ہوئی تو خاں صاحب نے مجھ سے کہا ''باب سے پوچھ لو اُس کے لیے کیا چاہیے۔''

''جانے دیں خاں جی..... ہم اس طرح کی مہمان نوازی afford نہیں کر سکتے۔ پھر وہ نہ جانے کس مذہب کا ہے۔''

''بھائی! وہ Paul Tillich کا پیروکار ہے جس نے انسان کی روح کی تربیت کا طریقہ ایک تبتی رہیز ار گرو سے سیکھا۔ اس میں گرو کی بہت اہمیت ہے۔ مرشد کی توجہ سب کچھ ہے..... آج کل ڈارون نامی ایک امریکن پال ٹلش کا جانشین ہے اور باب اُسی کا چیلا ہے۔''

''لیکن مجھے کیا لینا ہے ڈارون سے یا ٹلش سے۔ جس راستے پر جانا نہیں اُس کا نام کیا لینا۔''

لیکن باب سے کپڑوں کے متعلق بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے دن وہ میرے پاس باورچی خانے میں آیا اور کہنے لگا..... ''بانو! کیا آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟''

''کیا باب؟''

''مجھے عید کے لیے ایک شلوار قمیض بنوا دیں گی۔ میں پیسے دے سکتا ہوں۔''

''وہ کیوں باب؟''

''میں خاں کے ساتھ عید گاہ جاؤں گا۔ سب کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔''

''مجھے اس ادا پر تعجب تو ہوا لیکن میں نے ازراہِ تفنن کہا ''اچھا تو بھلا کیا رنگ پسند کروں..... گہرا سبز بنوا دوں؟''

''گہرا سبز بھی برا نہیں..... یہ گھاس کا درختوں کا خدا کی روئیدگی کا رنگ ہے لیکن مجھے ہلکا نیلا رنگ پسند ہے
آسمان کی طرح بے گراں بے پناہ۔''

''جی.....؟ لیکن روزِ قیامت یہ گلابی ہو جائے گا.....تو گلابی میں کیا ہرج ہے باب؟''

وہ مسکرایا..... ''لیکن روزِ قیامت تو ابھی آیا نہیں۔''

باب ہیز کا جوڑا مع ٹوپی کے تیار ہو کر آ گیا۔عید کے روز سب صبح ساڑھے سات بجے عیدگاہ جانے کے
تیار ہوئے تو آہستہ سے انیق بیٹے نے خوف بھری آواز میں کہا ''مجھے عید کی نماز پڑھنا نہیں آتی۔''

ابو نے تو پتہ نہیں یہ بات سنی یا نہ سنی۔باب ہیز فوراً بولا..... ''انیق! تم کو کچھ نہیں کرنا بس مجھے دیکھتے جانا۔
میں رکوع میں جاؤں تم بھی چلے جانا..... جب میں سجدہ کروں تم بھی سجدہ کر لینا۔''

شاید خاں صاحب بھی یہ Ritual بھول چکے تھے۔اُن کے لیے بھی سہولت ہو گئی۔

ہمارے گھر میں یہ رواج ہے کہ عید کے دن میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر قرآن کریم لے کر کھڑی
ہوں۔ جونہی مرد حضرات مسجد سے لوٹتے ہیں' وہ اس قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر مجھے عید مبارک کہتے ہیں
وصول کرتے ہیں۔اس میں عمر کا التزام ضرور رکھا جاتا ہے۔یعنی سب سے پہلے گھر کا سب سے بڑا داخل ہوتا ہے
قطار میں باری باری سب آ جاتے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں ہی دو چھوٹی میزوں پر یا ٹرولی کے اُوپر سویاں' نمکین دال اور سموسیاں وغیرہ پہلے سے
جاتی ہیں۔مسجد سے واپسی پر قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر اپنی اپنی عیدی وصول کر کے سارے مرد کھانے میں
ہو جاتے ہیں۔

جس عید پر باب ہیز مسجد گیا تھا۔وہ بھی خاں صاحب کے ساتھ واپس لوٹا۔پہلے خاں جی اندر داخل ہوئے
باب۔اس کے بعد ترتیب وار تاجدار' غفار' نثار گھر کے اندر آئے۔سب نے سادہ چیزیں کشمیری چائے کے ساتھ
فرمائیں۔بچوں نے سویاں سموسیاں کھانے کے بعد شربت پیا۔اُنہیں ابھی کسی قسم کی چائے کا چسکا نہیں پڑا تھا۔
سادہ چائے۔

سردیوں کے دن تھے۔پچھلی لان میں بڑی خوشگوار گرم دُھوپ پڑتی تھی۔کبھی کبھی میں بال دھو کر
لیے باہر آ بیٹھتی۔یہیں بیٹھ کر شفقو جی اور میں مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں اور عموماً گنے چوسا کرتے تھے۔اسی
میں بچے کرکٹ کا شوق پورا کرتے۔

ایسی ہی بیٹھکوں کے دوران باب مجھ سے Sandy کی باتیں کیا کرتا۔وہ شادی کیے بغیر سینڈی کے ساتھ
تھا۔دونوں اکٹھے سفروں پر جاتے۔ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں بسیرا کرتے اور اس Living together پر
نہ والدین نہ اُس کی اپنی ذات ہی نے کبھی کوئی اعتراض کیا تھا۔

باب ہیز کو اپنے والدین سے بڑی شدید محبت تھی۔وہ بڑے لاڈ سے اُن کی باتیں کیا کرتا۔لیکن کسی
بھائی بہن کا ذکر میں نے کبھی اُس کے منہ سے نہیں سنا۔

اُن ہی دنوں میری کتاب ''امر بیل'' کی رونمائی ہوئی۔ میں شہرت' نام ونمود کی خواہشمند نے ایک روز فیض سے استدعا کی کہ وہ میرے اس فنکشن کی صدارت کر دیں۔

''ناں بھائی ہمیں تمہاری کتاب پڑھنی پڑے گی۔''

''تو پڑھ لیں کچھ ایسی بری بھی نہیں۔''

''چلو پڑھ لیں گے۔'' فیض صاحب نے ان مانے جی سے صدارت کے لیے حامی بھر لی۔

اور فنکشن کا دن آ پہنچا۔ الحمرا ہال جو اُن دنوں چھوٹا سا تھا' اس میں فنکشن ہوا۔ باب ہیز نے اپنے طور پر از خود مضمون لکھنے کی آفر دی۔

مضمون پڑھنے والے کم تھے۔ فنکشن غریبانہ تھا۔ البتہ خاں صاحب اور باب ہیز نے میری حوصلہ افزائی پُر جوش طریقے سے کی۔ باب کا مضمون پڑھ لیجئے اور پھر اپنا سا اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری میزبانی کا اُس نے کیسے صلہ دیا؟

''باوجود اس کے کہ میں بانو قدسیہ کو بہت تھوڑے عرصے سے جانتا ہوں' لیکن ان کی شخصیت ایسی ہی ہے۔ ملنے والا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ ہمیشہ سے اُنہیں جانتا ہو۔ گو اتنے تھوڑے عرصے میں کسی کے متعلق کچھ جاننا اور کسی نتیجے پر پہنچنا کرنا قریب قریب ناممکن ہے' پھر بھی میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے ایسے متاثر ہوا ہوں کہ چند باتیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب تک New Critics کی تحریک ترقی پر رہی فنکار کی شخصیت پر کچھ کہنا حرام تھا۔ لیکن اب ہم اس بات کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ فنکار اور اس کے فن کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ رقص اور رقص کرنے والا دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے لگی ہے کہ فن اپنے واضح مطلب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔

فن ایک خاص سطح پر آگاہی ہے۔ ایک قسم کا شعور عطا کرنے والا ہے اور کوئی فن محض اس لیے کامیاب نہیں ہوتا کہ وہ بڑی خوبی کے ساتھ آگاہی کی اس سطح کو بیان کر رہا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں ہے کہ وہ سطح بجائے خود ایسی ہو جو گہری بھی ہو اور ارفع اور اعلیٰ بھی۔

مشرق کو ازل سے ہی یہ بات معلوم ہے کہ روحانیت کی بنیاد ایک فنکار کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ تخلیقی قوت خود روحانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بانو قدسیہ میں روحانیت کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ روحانیت سے میری مراد کسی خاص مذہب یا رسم ورواج کی پابندی نہیں بلکہ ایسی روحانیت جو زندگی کی فراوانی سے پیدا ہوتی ہے۔ شدید طور پر وقوف کردہ زندگی اور محبت سے جنم لیتی ہے۔ بے غرضی سے اُبھرتی ہے۔

عورت کی زندگی بجائے خود اس کا فن ہے۔ بانو قدسیہ اس حقیقت کو سمجھتی ہیں' اسی لیے وہ لکھنے سے کسی قدر بدکتی ہیں لیکن ان کی وسعت نظر اور روحانیت کی فراوانی نے ہمیں نہ صرف کسی ایک زندگی کی بصیرت بخشی ہے بلکہ کئی زندگیوں میں جھانکنے کا موقعہ دیا ہے۔ اپنی کہانیوں میں اُنہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے' جو ہر ایک پر واضح ہونی چاہئے کہ ہمیں کام صرف آزادیٔ نسواں نہیں ہے' بلکہ اصل مسئلہ روح کی نجات کا ہے۔''

خاں صاحب جس طرح دستر خوان پر دال چپاتی بھی دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے ویسے ہی باباجی کو بھی دوسروں سے share کرنے میں اُنہیں راحت ملتی۔ ایک روز میں نے باب ہیز کو جینز اور ... لیے باہر والے برآمدے میں منتظر پایا۔

"کہاں کے ارادے ہیں باب؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کہاں جارہی ہیں؟"

"میں اور خاں صاحب تو باباجی نوروالے کے پاس جارہے ہیں۔"

باب نے ہولے سے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں مجھے اشفاق تیار رہنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔"

میں نے خاں صاحب کی Surprise ضائع کردی۔ ہم تینوں نے دھرم پورہ کا رُخ کیا۔ ڈیرہ پاک ... کے باورچی خانے کی سڑک کے اردگرد اللہ کی مخلوق ہمیشہ کی طرح بے ترتیب گروپوں میں بٹی تھی۔ بکریاں چ... تھیں۔ کچھ لوگ گھاس کھودنے تراشنے میں مصروف تھے۔ خاں صاحب آگے آگے تھے۔ کچھ فاصلے سے شفقت ... آواز میں کہا:

"السلام علیکم باباجی..... آج میں آپ کے لیے ولایت سے ایک مہمان لایا ہوں۔"

باباجی نے دایاں بازو اُٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ "نوروالے! بیٹا ولی ہمیشہ ولایت ہی سے آتے ہیں۔"

خاں صاحب نے یہ جملہ ترجمہ کر کے باب کو سنایا تو اُس کا چہرہ سردی کے باوجود پسینے سے بھیگ گیا۔

"آؤ پت آؤ!"

ہم نے بیٹھنے کی کوشش کی تو باباجی بولے "یہ آدمی کھرا ہے..... اسے نیچے لے جائیں..... ہم ابھی آتے ..."

ڈاکٹر فاضلی ہمیں نیچے لے گئے جہاں ہم نے ہمیشہ کی طرح سیر ہو کر لنگر کھایا۔ سرخ چائے پی ...

ملاقات یہاں ہی باباجی سے ہوئی۔

"آجاؤ آجاؤ بلکہ ضرور آجاؤ۔"

"میں آپ کو اپنی کچھ نظمیں دکھانا چاہتا تھا، بڑی چھوٹی عمر سے یہ نظمیں میرے اندر کلبلاتی ... دیکھیں گی۔"

کچھ دیر بعد اسی برکلے پروگرام کے سلسلے میں ایک لڑکی جس کا نام Cathy تھا، ہمارے پاس آ کر ٹھہری ... صاحب نے اُس کا نام "نوری" رکھ دیا۔ بھولی بھالی صورت، کھوئی کھوئی سی مورت نیچے گول سیڑھیوں کے پاس ... رہتی۔ جب کسی کو وقت ملتا وہ اُس سے باتیں کر لیتا ورنہ لاتعلقی کے ساتھ فضاؤں میں جھانکتی رہتی۔ وہ آرام سے ... کمرے میں ہی رہنے لگ پڑی۔

Cathy کے بعد برکلے طالب علموں کے Exchange پروگرام کے سلسلے میں ایک اور لڑکی ماریا ... ماڈل ٹاؤن ہی میں ایک گھر میں رہائش پذیر تھی۔ وہ ہمارے گھر آتی جاتی۔ کبھی کبھی رات بھی رہ جاتی۔ ایک

...ب ہیز ان دونوں کا نمائندہ بن کر ہمارے پاس آیا۔ خاں صاحب دُھوپ میں بیٹھے مونگ پھلیاں کھانے میں ... تھے۔

''اشفاق! اگر تمہارے لیے تکلیف نہ ہو تو فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر لے چلو۔ مارسیا وہاں پاکپتن شریف ... پر حاضری دینا چاہتی ہے..... لیکن اگر نہ جا سکو تو ہمیں ٹرین پر سوار کرا دو..... ہم خود چلے جائیں گے۔''

خاں صاحب نے فوراً ساتھ چلنے کی حامی بھر لی۔

میں دل میں سوچنے لگی کہ یہ لوگ کون ہیں۔ ان کا امریکہ کی اکثریت میں کیا مقام ہے۔ کیا مادی ترقی کے داعی ... یہ لوگ اُلٹا پہیہ چلا رہے ہیں؟ سائنسی ایجادات کے زمانے میں روح کی فلاح کے متلاشی ہیں؟

خاں صاحب نے اپنی بڑی آپا فرحت کو اطلاع دی تو انہوں نے جواباً فون پر کہا کہ مہمان ایک رات آپا کے ... ہوں گے۔ پھر دوسری صبح وہ اپنی گاڑی پر ہمیں بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر بھجوا دیں گی۔

شیڈول کے مطابق ہم منٹگمری پہنچے۔ ابھی اس کا پاکستانی نام ساہیوال نہ چلا تھا۔ صبح تیار ہو کر ہم پاکپتن شریف ... بہشتی دروازہ دیکھا۔ سب اپنے اپنے طور پر مگن ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے مارسیا کو دیکھا تو میری تعجب ... نکل گئی۔ مارسیا کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی نیلی پتلیاں غائب تھیں اور آنکھ کا صرف سفید حصہ نظر آ رہا ... کر خاں صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دونوں مزار کے باہر بیری کے درخت تلے کھڑے تھے۔ سنا ہے بابا جی فرید ... بیری تلے کھلے آسمان سے رحمتوں کے نزول کا انتظار کیا کرتے تھے۔

''خاں صاحب! وہ جی مارسیا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ کچھ بولتی نہیں۔''

لیکن خاں صاحب نے اپنی توجہ بیری پر رکھی۔ اس میں سرایت کیے ہوئے بابا جی کے معجزاتی کشف و کمال کی ... جد ہے۔ باب ہیز دیکھتے دیکھتے آگے بڑھا اور اس نے اپنی سگریٹ کی ڈبیا ایک شاخ پر لٹکا دی۔

''اشفاق! آپ ہولی مین کو کیا نذرانہ دے رہے ہیں؟''

خاں صاحب نے فوراً اندر کی پاکٹ سے اپنا پرس نکالا اور پوچھا..... ''کتنے پیسے باب؟''

باب مسکرایا..... ''یہ نذرانہ نہیں اشفاق..... کوئی اپنی خراب عادت یہاں اس کی دہلیز پر چھوڑ جاؤ تو ان کا دل خوش ... گا۔ وہ سامنے گولڈ فلیک کی خالی ڈبیا..... میں نے ہولی مین سے وعدہ کیا ہے کہ اس کے بعد میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ ... لگاؤں گا۔''

خاں صاحب غالباً اس وعدے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن وہ کسی امریکن سے بازی ہارنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ... نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالے اور جس طرح کوئی اپنی من چاہی محبوبہ کو کھڑا چھوڑ کر جاتا ہے ایسے ہی ڈبیا کے ... گنے' ڈبی کو چوما اور ایک شاخ پر لٹکا دیا۔

سگریٹ چھوڑنے کے بعد برسوں خاں صاحب ان سگریٹوں کے لیے تڑپے' تلملائے' پریشان رہے۔ اس ... کے بیس برس بعد اُنہوں نے ایک روز مجھ سے کہا ''قدسیہ! ابھی بھی مجھے یہ چھوڑی ہوئی منزل یاد آتی ہے۔ جس ... میں کوئی سگریٹ پی رہا ہو وہاں بیٹھ کر مجھے آنند ملتا ہے..... دھواں اندر جاتا ہے' خوشبو سے سابقہ پڑتا ہے تو مجھے

بڑی راحت ملتی ہے۔''

واپسی پر ٹرین کے سفر کے دوران مارسیا پر گویا کسی گم سُم مجذوب کی کیفیت طاری تھی۔ باب اُسے زبردستی جھ

سے لے کر آ گیا۔

گھر پہنچے تو مارسیا اور باب میرے پاس باورچی خانے میں آئے۔

''یہ آپ کو انفورم کرنے آئی ہے؟''

''کیا؟''

''یہ دہلی جانا چاہتی ہے۔ اسے نظام الدین اولیاءؒ نے بلایا ہے۔''

''یہ مجھے کیوں انفارم کرنا چاہتی ہے۔ باب اتم جانتے ہو میں روحانیت کے سفر کو نہیں جانتی۔''

''بات یہ ہے قدسیہ! کہ یہ سمجھتی ہے آپ اسے پاکپتن شریف لے کر گئیں، وہیں اس کا مسئلہ فیصلہ کن تہہ

پہنچا۔''

میں نے معاملہ خاں صاحب کے سامنے پیش کیا تو وہ بولے..... ''بھائی جو یہ چاہتی ہے کرے۔ جن کے گھر

ٹھہری ہوئی ہے اطلاع دے۔ میری حیثیت صرف اتنی ہے کہ جس کی جو تلاش ہو اُسے راستہ بتا دوں..... باقی چند

نے خود ہی ہے۔''

ہمارے گھر کے پچھواڑے جہاں بعد میں تاکستان لگا اور اس کے بعد کباب پارٹی کے لیے جگہ بنائی گئی

صاحب کباب بن کر سیخوں پر کباب لگاتے گویا صدیوں سے یہی پیشہ رہا ہو۔ ابھی سٹوڈیو اور سرونٹ کوارٹر کے د

خالی جگہ میں مکئی کا کھیت لگا تھا۔ جس روز وہ ہم سے رخصت ہوئیں مارسیا مجھے پچھواڑے لے گئی۔ اس وقت مجھے مط

کہ وہ مکئی کے کھیت میں کیوں جا رہی ہے۔

وہ کچھ دیر یہی کھڑی رہی۔ شاید چاہتی تھی کہ میں کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤں لیکن میں نے اسے ہی شرم

نوازی سمجھا کہ میں اُس کے ساتھ چپٹی رہوں۔

اُس نے بچوں کی سی Sheepishness کے ساتھ اُونچے اُونچے مکئی کے ٹانڈوں میں اِدھر اُدھر

کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی نکالی۔ یہ کیچڑ کی طرح میلے کپڑے تھے۔ وہ انہیں نکال کر بولی..... ''مجھے افسوس ہے

آئی تھی میں نے اپنے میلے کپڑے یہاں چھپا دیئے تھے۔''

''کاش تم مجھے یہ کپڑے دے دیتیں تو میں انہیں دُھلا دیتی۔''

وہ سر جھکائے آہستہ سے کیتھی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ وہ اس دنیا کی روح نہ تھی۔ اُس نے کسی کے ساتھ

رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔

مارسیا چلی گئی۔ باب ہیز کے جانے سے کچھ دیر پہلے ایک اور بم پھٹا۔ ہوا یہ کہ ہم سب لان میں بیٹھے تھے

باب نے خاں صاحب سے کہا ''اشفاق! مارسیا کی اطلاع آئی ہے۔''

''خیریت سے ہے؟''

"بالکل خیریت سے! اُس نے نظام الدین اولیاءؒ کے دربار پر قبولِ اسلام کر لیا ہے اور اب وہ تمہاری Sister in Faith ہے۔"

نوری نے واپسی کا ٹکٹ کٹالیا۔

بہت عرصہ بعد ماریا ہمارے گھر اچانک آ گئی اور اُس نے ہمیں اطلاع دی کہ اُس نے پشاور میں ایک فیوڈل گھرانے سے شادی کر لی ہے۔ بعد میں یہی شوہر وزیر بن گیا اور ماریا کی عزت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ دو تین بار پھر بھی اس گھر کا حصہ نہ بن سکی۔ نہ جانے اُسے زندگی بہا کر کہاں لے گئی؟ اُس کی اسلام پسندی نے اُس کے لیے کیا کیا آسانیاں پیدا کیں اور کیا کیا مشکلات کھڑی کیں؟

میں نے ایک دن از راہِ گفتگو خاں صاحب سے کہا۔

"خاں صاحب! یہ امریکن لوگ کیا بلا ہیں۔ جو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔ انہیں اتنی آزادی ان کے قانون نے دی ہے' معاشرے نے عطا کی ہے یا فیملی سسٹم ٹوٹنے سے ملی ہے؟"

"تینوں نے مل جل کر لیکن اب یہ اُن کا Way of life ہے۔ وہ آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کر سکتے ہیں ہر چیز حتیٰ کہ اپنا مذہبی عقیدہ بھی۔"

"اشفاق جی! لیکن اتنی آزادی سے بے راہ روی کا راستہ بھی تو کھلتا ہے۔ آدمی خود غرضی کی بھینٹ بھی چڑھ سکتا ہے۔"

"بالکل بالکل وہ بھی ممکن ہے اور ہوتا ہے لیکن یہی آزادی انہیں بالآخر اسلام سے بھی ہمکنار کرے گی۔ ایک تلاش میں نکلیں گے جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی' افریقہ کے جنگل' الاسکا میں تیل کی تلاش کرتے ہیں..... پھر انہیں اسلام بھی کہیں نہ کہیں اسی تلاش کے دوران مل جائے گا۔ سکون کی تلاش' اطمینان کی تلاش انہیں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا علم پکڑا دے گی۔"

میں اُن کی بات کو پورے طور پر سمجھ تو نہ پائی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں بار بار کہتا ہوں کہ اب اسلام کی ترویج اور اشاعت کہیں الاسکا کے بندے کسی یورپین کی امریکی یا چینی کی ذمہ داری ہوگی..... وہ ایک کلمہ پڑھ کر سارے کا سارا مسلمان بن جائے گا' اپنی مرضی سے۔ ہم لوگ جو پیدائشی مسلمان پیدا ہوئے ہیں اسلام کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ ہم اس کا جھنڈا اُٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہم نہ مساوات پر پریکٹس کر سکے نہ کبھی ہم نے بھائی چارے ہی کا سبق سیکھا۔ جب بنیادی اصول ہی ہم سمجھ نہیں پائے تو ہم اس کی ترویج اور اشاعت کا بوجھ کیونکر اُٹھا سکتے ہیں۔"

میں ابھی تک لباس' زبان اور رہن سہن میں اسلام کو مقید سمجھتی تھی۔ مجھے جینز اور شرٹیں پہنے ہوئے مسلمانوں پر کبھی بھر اعتبار نہ آتا تھا۔

باب ہیز ہر بات برداشت کر لیتا تھا لیکن امریکہ پر اگر کسی قسم کی تنقید کی جاتی تو وہ آپے سے باہر نکل جاتا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ وہ استدلال کی لائن چھوڑ کر اُلٹی سیدھی شیام گھاٹ پر مجبور ہو جاتا۔ اُس کی ساری فراخدلی اور

لبرل نظریات خاک میں مل جاتے۔

ایسے ہی ایک دن اُس پر منفی موڈ طاری تھا۔ میں نے احمق پن سے بھونڈوں کے کھکھر کو چھیڑ دیا تھا اور اُسے امریکہ کے معاشرتی نقائص سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اُس وقت تو وہ خار کھا کر اپنے کمرے میں غائب ہو گیا لیکن شام کو جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی وہ میرے پاس آیا اور فتح مندی کے انداز میں کہنے لگا۔

''قدسیہ! یہ بتائیے کہ اسلام کا Essence کیا ہے؟''

میں سمجھی کہ سیدھا سا جواب ہے۔ میں نے جواب دیا ''توحید۔''

''لیجئے یہ تو سبھی مذاہب سکھاتے ہیں۔ کیا یہودی دو خداؤں کو مانتے ہیں؟ کیا عیسائی توحید پرست نہیں؟ میں یہاں تک جانتا ہوں ہندو مذہب میں جہاں بتوں اور کفر کا فتویٰ آپ لگا سکتی ہیں وہاں بھی اوم کا تصور موجود ہے۔ بتائیں کہ اسلام میں وہ کون سی خوبی ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممیّز کرتی ہے؟''

''بھائی چارہ..... یہ روایت جب انصار نے مہاجرین پر سب کچھ قربان کیا یہاں تک کہ ان کو اپنی جائیداد میں بھی شریک ٹھہرا لیا۔ یہ روایت کہیں اور نہیں ہے۔''

''لیکن کون سا مذہب ہے جو Universal Brotherhood نہیں سکھاتا۔ کیا عیسائیوں میں بھائی چارہ نہیں ہے؟ کیتھولک کیا ایسے نہیں ہیں؟ ہم ایک خدا میں تین سمتوں کا تعین ضرور کرتے ہیں لیکن بھائی چارہ تو ہم میں کسی طرح کم نہیں..... اسرائیل کی طرف دیکھ لیجئے۔ کس کس دیس سے یہودی آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ وہ تن من دھن سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ چھوڑیئے آپ لوگ ایسے ہی احساسِ برتری کا شکار ہیں..... اصل میں آپ کا مذہب بھی پچھلوں کی کہانیاں ہیں اور کچھ نہیں۔''

مجھے باب کی بات برچھی کی طرح لگی۔

اس وقت دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان پر ہلکی سرخی مائل زردی غائب ہونے کو تھی۔ باہر اس جھٹپٹے کے عالم میں پرندے گھروں کو ڈار در ڈار لوٹ رہے تھے۔ میں ننھی سی احساسِ کمتری میں مبتلا لمبے شیشے والی دیوار نما کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... مجھ میں اتنا علم نہ تھا کہ میں باب سے مناظرے میں جیت جاتی۔ اور اس ہار کا مجھے دلی طور سے افسوس تھا۔

ہمارے سامنے کی لان میں سندری کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ سندری کے درخت سے سارنگی کا ساز بنتا ہے۔ اس کی لکڑی بہت قیمتی شمار کی جاتی ہے۔ ساگوان سے بھی مہنگی..... سنا ہے اس درخت کے تنے میں رات کے وقت درد کی آواز سنی جا سکتی ہے۔

میں اس کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ یکدم سارا درخت روشنیوں سے بھر گیا۔ اس کا پتہ پتہ، شاخ، تنا ان دیکھے نور سے جگمگانے لگا..... اور پتہ نہیں اس کے اندر کے سُر مجھ تک پہنچے یا مجھ پر وجدان کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے اسلام کا نچوڑ پتہ چل گیا۔ ایسا Essence جو کسی اور مذہب میں موجود نہ تھا۔ میں نے بھاگ کر فتح مندی سے باب

کھٹکھٹایا۔

"اب دروازہ کھولو..... مجھے جواب مل گیا ہے دروازہ کھولو۔"

ہاتھ میں جھاڑن لیے وہ باہر نکلا اور ابرو اُٹھا کر بولا..... "ہاں! کیا بات ہے؟"

"تم نے پوچھا تھا کہ اسلام کا وہ کون سا وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔"

"ہاں تو؟"

"اسلام نے رزقِ حلال و حرام کا تصور دنیا کو دیا ہے..... یہ تصور کسی اور مذہب میں نہیں۔ دوسرے مذاہب میں Commandments میں اوامر اور مناہی کی فہرست ہے لیکن کہیں حرام و حلال کا تصور نہیں۔"

"ہمیں رزقِ حلال کمانے کی تاکید ہے..... چوری چھپے کی آشنائی حرام..... ہم دو دو تین تین بیویاں رکھ سکتے ہیں لیکن Living together نہیں کر سکتے..... غصہ حرام ہے..... طیش میں آنا حرام ہے..... مایوسی حرام ہے۔"

وہ چپ ہو گیا..... میں خود ابھی حرام و حلال کی جزئیات سے نا آشنا تھی اسی لیے بحث بند کر دی گئی..... باب ہیز اور میرے بیچ بحث میں ایک بیج بوئی گئی۔ وہ پاکستان سے چلا گیا اور کچھ برسوں بعد اُس دن کے گیان نے "راجہ گدھ" کی صورت پیدا کی۔ یقین جانیے راجہ گدھ جسے خاں صاحب نے نہیں پڑھا اور جسے میں نے نہیں لکھا کہیں سے مجھ پر وارد ہو گئی تھی ..... ان وارداتوں کا کوئی عقلی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ایک روز بغیر دستک دیئے میں باب کے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے خیال تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور میں صفائی کے ساتھ اُس کے صاف کمرے کو مزید صاف کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ بغیر کپڑوں کے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

"سوری باب! ویری سوری۔"

"کوئی بات نہیں..... لیکن کبھی میرے کمرے میں دستک دیئے بغیر آنے کی کوشش نہ کیجیے نہ آپ نہ کوئی اور۔"

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ کیسا مہمان تھا' جو مجھے حکم دے رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا یہ سفید فام لوگوں کا احساسِ برتری ہے جو ہر وقت براؤن اور سیاہ قوموں کو عقل سکھانے میں مشغول رہتے ہیں۔

اُس نے میرا مشکوک چہرہ دیکھ کر کچھ قیافہ لگایا اور بولا..... "آپ مجھے ایک جھاڑن عطا کر دیں۔ میں اپنے کمرے میں ٹاکی بھی پھیر لوں گا اور اس کی ڈسٹنگ بھی کر لوں گا۔ بس کوئی میرے کمرے میں تشریف نہ لائے۔"

"لیکن کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں تمام کپڑے اُتار کر Levitation کی مشق کرتا ہوں۔ کبھی میں زمین سے چند گز اُوپر اُٹھ سکتا ہوں لیکن آپ یہ منظر دیکھ کر ڈر جائیں گی اس لیے میں آپ کو پہلے ہی Warn کر رہا ہوں۔"

یکدم میرا دھیان شب معراج کے عظیم معجزے کی طرف مبذول ہو گیا اور میرے دل میں باب کے لیے قدرے عزت کا مقام پیدا ہو گیا۔

"مبارک ہو باب! جو بھی تمہارا راستہ ہے کاش تمہیں اس پر چل کر سکون اور اطمینان حاصل ہو۔"

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا ''اطمینان اور سکون نہ ملے تو کوئی چلتا ہے ایسے راستے پر..... لیکن ایک شرط ہے
آدمی چلتا رہے۔ تبدیل نہ ہو۔ استقامت کے ساتھ لگن کے ساتھ آنکھیں موندھ کر۔ اندر سیڑھی اُتار کر..... باہر سے
توڑ کر اندر جوڑ کر..... Paul Tillich (پال ٹلش) اس کا پہلا گرو تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد Eck Anker
ڈارون دے رہا ہے۔''

''اچھا باب..... جو کچھ بھی ہے جس طرح بھی ہے تمہیں مبارک ہو۔''

باب ہیز واپس امریکہ چلا گیا تو اُس نے خاں صاحب کو چند رسالے اور مضمون بھیجے جن سے اس تحریک
جا سکتا ہے۔ تبت کے ایک لاما کی ایجاد کردہ تعلیم ہے جسے ریبزار (Rebrzar) کے نام سے پکارتے ہیں اور جس
امریکن مہنت پال ٹلش نے اولاً اس راستے پر چلنا سیکھا۔

کرتے کراتے اور ہوتے ہواتے باب ہیز کے جانے کا وقت آ گیا۔

سارا سامان سفید سوزوکی وین میں لادا جا چکا تھا۔ میرے پاس ثویلہ تھی۔ ہم دونوں مشورہ کر رہی تھیں
کس طرح خدا حافظ کہا جائے۔ خاں صاحب میرے پاس برآمدے میں آئے اور کہنے لگے ''قدسیہ! تم باب کو ایئرپورٹ
تک چھوڑ آؤ۔ مجھے آج دفتر میں ضروری کام ہے۔''

''ماموں آپ بھی چلیں ناں برا لگتا ہے۔'' ثویلہ بولی۔

لیکن ماموں صاحب باب ہیز سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے اور برا لگنے کو لگنے دیا۔

''کیا تم ہمارے ساتھ آ رہی ہو تویلہ.....'' باب نے ہمیشہ ثویلہ کو تویلہ کہا۔ شکر ہے ہم اسے طویلہ نہ سمجھے
کہ تویلہ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

راستے میں باب عجیب طرح سے اُداس ہو گیا جیسے کوئی گھر والوں سے بچھڑ رہا ہو۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ
سے کہا..... ''بانو آپا! مجھے معاف کرنا کبھی کبھی میں نے آپ کا بہت دل دُکھایا لیکن یقین کیجئے میری نیت ہمیشہ
میں اپنے قیام کو کبھی نہیں بھولوں گا اور آپ کی تصویر کو اپنی تمام تصویروں کے اُوپر لگاؤں گا۔''

ایئرپورٹ اُن دنوں غریبانہ اور سادہ سا تھا۔ ہم تینوں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے اور ابھی
(check in) کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ہم تینوں باہر ہی لان پر بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی دھوپ تھی۔ لیکن دھوپ میں
نہ تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گپ چپ بیٹھنے کے بعد اطلاع ملی کہ فلائٹ تین گھنٹے لیٹ ہو گئی ہے۔ ہم واپس گھر آ گئے۔

اور جب دوبارہ جانے کا وقت آیا تو ثویلہ میرے پاس آئی..... ''امی! آپ بیشک نہ جائیں۔ میں باب کو
آؤں گی۔ اُنیس آ جاتا تو اُسے ساتھ لے جاتی لیکن وہ دونوں بھائی ابھی کالج سے نہیں لوٹے۔''

باب ہیز بڑے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ لیکن یوں نہ سمجھئے کہ اُس نے ہم سے
دیا۔ وہ باقاعدگی سے نہیں لیکن وقتاً فوقتاً خط لکھتا رہا۔ سینڈی سے اُس کی شادی ہوئی۔ پھر دو بیٹیاں چھوڑ کر وہ کہیں چلی گئی۔
باب نے دوبارہ شادی کی اور میکسیکو میں Colme کے ایک میوزیم میں ڈائریکٹر لگ گیا۔

جب انیق وہاں گئے تو عجب سی بات ہے۔ انیق نے اُس سے رابطہ تو قائم کیا لیکن مغرب کی تیز رفتار زندگی

سے

یہ تحمل قائم نہ رکھ سکا۔

اینڈریوز

(Andrews)

باب ہیز کے جانے کے بعد ایک دن خاں صاحب جب اُردو بورڈ سے لوٹے تو اُن کے ساتھ کرسٹوفر
(Christo... تھا۔ موٹا نہیں لیکن مائل بہ فربہی ضرور تھا۔ چوڑا چکلا سینہ' تھوڑا سا سامنے پھیلا ہوا گول مٹول پیٹ'
بھاری ہاتھ لیکن جب بھی بولتا بات کرتا' اُس کے چہرے پر معصومیت چھا جاتی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا تو کسی
بچے کی طرح مظلوم سا نظر آتا۔ اس کے ہاتھ میں بالکل چھوٹا سا بیگ تھا۔ اُس نے پہلے ہی دن خاں صاحب سے
... "مجھے معلوم نہیں تھا کہ پاکستان میں اتنی سردی ہوتی ہے' میں اوورکوٹ نہیں لایا۔" خاں صاحب نے فوراً اپنا اوورکوٹ
... دے دیا..... "تو اب آپ کیا پہنیں گے شفو جی؟"

وہ میری کمینگی پر ہلکا سا مسکرائے اور بولے..... "میرا ڈریسنگ گاؤن موٹے کمبل کا ہے۔ ایک نہیں دو گاؤن
... پاس ہیں وہ پہن لوں گا۔ پھر سوتی جبہ نما کوٹ بھی ہے۔" میں جانتی تھی کہ وہ اوورکوٹ واپس لینے والوں میں سے
نہیں ہیں۔ اس لیے چپ ہو رہی۔ اس تال میل کے علاوہ کرس نے مجھ سے کبھی زیادہ بات چیت نہ کی۔ وہ خاں صاحب
کے ساتھ دفتر چلا جاتا۔ وہاں سے اُسے ڈرائیور ہماری فوکسی پر شہر اور لاہور کی قابل دید عمارتیں دکھانے لے جاتا۔ شالیمار
... مقبرہ جہانگیر' قلعہ' نور جہاں کا مزار' مسجد وزیر خاں اور اندرون شہر کی گلیاں بازار..... کبھی ڈرائیور دن بھر کی واردات بتا
... کبھی یہ انفرمیشن بھی نہ ملتی۔ میں نے بھی دلچسپی لینا چھوڑ دی۔

کرس جس آہستگی سے آیا تھا ایک روز اسی بے تکلفی سے ملے بغیر رخصت ہو گیا۔ نہ کوئی شکریے کا خط نہ کوئی
... می جملے نہ اشک باریاں نہ زیر لب مسکراہٹیں۔ یہ قیام میں نے کولڈ سٹوریج میں رکھ دی اور قریباً تیس سال بعد آج نکال
کر آپ کو پیش کر دی۔

ابھی کرس کو گئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک اور امریکن سا کا پیش آیا۔

یہ تب کی بات ہے جب خاں صاحب برکلے پروگرام سے وابستہ تھے۔ یوں سمجھئے کہ یہ دور ہمیں امریکن لوگوں
سے ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے آیا۔ پہلے خاں صاحب اٹلی میں تنہائی' غریبی اور تذبذب کا ایک عہد گزار چکے
تھے لیکن اُن میں ایک عجیب وصف تھا۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ اندر کیسی بھی بارشیں جل تھل کیے رکھیں۔ وہ صبر کی
برساتی اوڑھ فرائض سے وابستہ رزق کمانے کے لیے ضرور نکلتے۔ میں نے اُنہیں کبھی موڈ کے تابع زندگی بسر کرتے نہیں
دیکھا بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ ہمیشہ موڈ کو اپنے عزائم کے تابع کر لیتے۔ کبھی کبھی اُن کی زبان کھارنگی ہو جاتی' سارا منہ کڑوا ہو جاتا
لیکن وہ ڈاکٹروں کے درپے نہ ہوتے۔ انجائنا کی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹری دوائیاں پیتے' گھریلو ٹوٹکے استعمال کرتے' حکیمی
علاج آزماتے' ہومیوپیتھک پڑیاں پھانکتے اور خم ٹھونک کر کام پر کھڑے ہو جاتے۔ اُنہیں حالات نے کبھی پسپا نہ کیا۔
انہوں نے کوئی کام نہ پیسے کے لالچ میں کیا نہ شہرت اُن کے لیے قابل اعتناء چیز تھی۔ بس کام کو وہ ہرانے کے موڈ میں

رہتے۔ گویا وہ بھی کوئی پہلوان تھا جسے دھوبی پٹڑا گرا سکتا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب داستان سرائے میں امریکنوں کی آمدورفت زیادہ تھی۔ ان ہی لوگوں میں جوئی اینڈریوز تھا۔ تب 121۔سی کے سامنے کھیت تھے۔ ایک نالہ یہاں بہتا تھا جس سے کھیتوں' سڑکوں' لانوں کو سیراب کرنے کا معمول تھا۔ اسی نالے میں انیس خاں اپنی بطخیں نہلانے کے لیے لے جایا کرتے تھے اور بڑی محبت اور دُلار کے ساتھ واپس لاتے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے نالے کے پار کوئی کوٹھی ابھی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ پھاٹک بھی واجبی سا پانچ فٹیا تھا جس کے آر پار دیکھنا آسان تھا۔ ابھی قانون کو اپنی گرفت میں لینے والے بے روزگار لوگ اتنی تعداد میں نہ تھے اور اگر تھے بھی تو اُنہیں غریبی کے ساتھ رہنا کچھ مشکل نہ تھا۔ دہشت گردی' چوری چکاری' ڈاکہ زنی' دھونس' دھول دھپا سوسائٹی کا حصہ نہ تھا۔ ہم لوگ باہر پنکھا لگا کر لان میں سونے کے عادی تھے۔ کبھی دروازے بند کردیئے جاتے کبھی ان کی کنڈیاں نہ لگائی جاتیں' کبھی پھاٹک کو تالا لگا دیا جاتا کبھی ہم بھول بھی جاتے۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرخندہ اسی گیٹ کو ٹاپ کر بھی آ جاتیں اور اگر ہم باہر لان میں ہوتے تو وہاں ورنہ کوٹھے پر آ جاتیں اور ہمارے پاس ہی لیٹ جاتیں۔ یہ امن کا زمانہ تھا۔ غلطیاں تب بھی ہوا کرتی تھیں لیکن اُن کا خمیازہ اتنا نہ بھگتنا پڑتا۔ یہ خوف وسوسے تب بھی جنم لیتے لیکن ان کا قیام زیادہ دیر کے لیے نہ ہوتا۔

ایسے ہی بھلے دنوں کی ایک صبح میں اُٹھی تو گیٹ کے پار سڑک پر نالے سے متصل ایک وین کو کھڑا پایا۔ اس میں کچھ امریکی سوار تھے۔ سفری ٹولے میں سے چند اُتر کر نالے کے پانی سے نہا دھو رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ان مسافروں کی بے سروسامانی دیکھ کر میں اندر گئی۔ خاں صاحب کو بتایا کہ کچھ پردیسی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ شاید کچھ درکار ہو۔

خاں صاحب چپ چاپ باہر چلے گئے۔

ابھی بچے لان پر سو رہے تھے۔ سکول جانے کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ باورچی خانے کی زندگی بھی نہ جاگی۔ گرمیوں کی صبح تمازت سے ناآشنا ہلکی ہلکی ہوا میں ہولے ہولے آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک بڑا پھاٹک کھلا اور خاں صاحب امریکنوں کے ساتھ اندر وارد ہوئے۔

"قدسیہ! انہیں صابن تولیے دو۔ یہ آٹھ دس دنوں سے نہائے نہیں ہیں۔"

پھر خاں صاحب جوئی اور اینڈریوز کے ساتھ اُوپر والی منزل کی طرف چل دیئے جہاں خاں صاحب کی لائبریری تھی۔ میں نے پہلے بچوں کو سکول بھیجا' پھر مہمانوں کے لیے ناشتہ تیار کیا۔

جب خاں صاحب اپنے مہمانوں کو لے کر نیچے آئے تو یوں لگتا تھا کہ وہ مدتوں سے ان لوگوں کے دوست چلے آ رہے ہیں۔ میرا اُن سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب نے کہا:

"قدسیہ! یہ جوئی ہے۔ جوئی گیون (Joey Gavin) اس کے والد لندن میں ڈاکٹر ہیں۔ اسے زندگی کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا شوق ہے۔ یہ تجربات کرتی رہتی ہے۔ یہ سیر و سیاحت بھی جوئی کے لیے ایک تجربہ ہے اور یہ اینڈریوز ہے۔ یہ اپنا آپ خود سمجھا دے گا۔ اور یہ ہمارے بچوں کی نانی ہیں۔ ہم سب انہیں نانا کہتے ہیں۔"

''نہیں نہیں میں کچھ سمجھا نہیں سکتا اشفاق صاحب! میں خود سمجھنے کے لیے مشرق میں آیا ہوں۔ ہم لوگ اتنے Materialistic, Practical, Objective ہو چکے ہیں کہ ساری ٹوٹل زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس درست Instruments نہیں رہے۔''

میں نے باہر نکل کر دیکھا تو وین جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ ناشتے کے بعد چلے جائیں گے لیکن وین کو نہ دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔

''وہ آپ کی وین نظر نہیں آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چلے گئے۔ اُن کے ساتھ یہی طے تھا۔ وہ تو اس وقت واہگہ پار کر چکے ہوں گے۔'' اینڈریوز نے کہا۔

نئے مہمانوں کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب بولے ''حیران نہ ہوں قدسیہ! یہ تمہارے مہمان ہیں۔ خدائی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔''

''کتنی دیر تک خاں صاحب؟ کتنی دیر کے لیے؟''

''چلے جائیں گے بھائی چلے جائیں گے۔ بیچارے وین ہی میں سوتے تھے۔ اُسی میں ناشتہ کھانا بناتے تھے۔ وین میں چھوٹا سا باورچی خانہ، فریج سب کچھ موجود تھا..... جب وہ لوگ لینے آئیں گے تو چلے جائیں گے۔''

لیکن وین اپنا بوجھ ہمارے گھر اُتار کر پھر کبھی نہ آئی۔ شاید باقی مسافر بھارت چلے گئے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ سب .C.I.A کے مخبر نہ ہوں؟ اور اپنے طور پر ملکی کوائف حاصل کرنے کی ڈیوٹی پر نہ مامور ہوں؟ اب میں نے غور سے بڑے شک و گمان کے ساتھ اپنے مہمانوں پر نظر ڈالی۔ اینڈریوز بہت دُبلا پتلا قریباً تیس برس کا نوجوان تھا۔ جوئی نہ موٹی نہ دُبلی۔ بس درمیانے قد کی عورت تھی۔

اینڈریوز نے مجھ سے پوچھا ''کیا یہ کسی ایمبیسڈر کا گھر ہے؟'' اس تعریفی جملے نے مجھ پر خاطر خواہ وار کیا۔ انسان تعریفی اور خوشامدی جملوں کے آگے کس قدر نہتا ہو جاتا ہے۔

''ایمبیسڈر کا تو نہیں ایک درویش کا گھر ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' اینڈریوز نے ایک اور تیر چلایا۔

اور یوں داستان سرائے میں اُن کا قیام طے پا گیا۔

اب اینڈریوز اور جوئی ہمارے مہمانِ خاص تھے۔ وہ دونوں شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں رہتے تھے۔ کچھ نہیں پتے تھے کہ شطرنج کھیلتے تھے لیکن زیادہ وقت اُن کا دروازہ بند رہتا۔ ایک بات ضرور ہے کہ اُنہوں نے کبھی مجھے تنگ نہ کیا۔ جونہی چائے، کھانا تیار ہوتا ایک آواز پر آن ٹپکتے، مرچوں والے سالن، پراٹھے، اچار سب کچھ جو سامنے دھر دیا کھا لیتے۔ اُنہوں نے کبھی کسی پکیرے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ دن میں ایک آدھ بار وہ سیر سپاٹے کے لیے شہر چلے جاتے۔ شام کے کھانے کے بعد خاں صاحب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن مجھ سے اُن کی بیٹھکیں کم ہوتیں۔

یہ دونوں بالآخر یہیں رہ گئے۔ پتہ نہیں ہمسفر ساتھیوں نے دغا دی یا اِن دونوں نے اچھا ٹھکانہ مل جانے پر اُنہیں

بھگا دیا۔ بہر کیف جو بھی معاملہ تھا میرے لیے اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں اب تک امریکیوں کے سیلانی پن کو کچھ نہ کچھ سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے لیے سفر کو وسیلہ ظفر بنانے میں بڑی تگ و دو کرتے تھے۔ ایک مدت کام کی روٹین سے وابستہ رہ کر پیسے جوڑتے رہتے اور پھر اس رقم سے بریک پر چلے جاتے۔

امریکن تو اس چھٹکارے کو توانائیاں اکٹھی کرنے اور نئے تجربے سیکھنے کو ''بریک'' کا نام دیتے تھے لیکن میں چاہتی تھی کہ اسے اسلامی نقطہ نظر سے بھی سمجھا جائے اور مہمان بھی اس سفر میں سیکھنے کے عمل کو اپنے لیے وسیلہ ظفر جانیں۔ میرے لیے اس جوڑے کو رکھنا آسان تھا' لیکن کچھ دنوں کے بعد میرے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔

مجھے پتہ چلا کہ اینڈریوز لندن کے کسی کالج میں انگریزی کا پروفیسر ہے اور جوئی پوری ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے اُس کی جان کاری بہت ہے لیکن وہ ڈاکٹری کی پریکٹس نہیں کرتی۔

پروفیسر اینڈریوز اور ڈاکٹر جوئی دونوں میاں بیوی نہیں تھے اور اکٹھے رہنے کا پلان بنا چکے تھے۔ میرے لیے یہ چوری چھپے کی آشنائی تھی' جس کی میرے دین میں کوئی اجازت نہ تھی۔ اُن کے لیے یہ معمول کا فعل تھا کہ جب تک کہ ایک دوسرے کی طبیعت کو جان نہ لیا جائے' لمبی ہمسفری قبول نہیں کرنی چاہئے اور شادی کا طوق اپنے گلے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔

جوئی کا والد ایک بڑا مشہور و معروف ڈاکٹر تھا اور لندن میں ایک سنٹرل ہسپتال میں بڑی اہم پوسٹ پر تھا۔ میں حیران تھی کہ اُس نے بغیر نکاح کے جوئی کو انگلش کے پروفیسر کے ساتھ کیسے جانے دیا۔ لیکن تب مجھے یاد آیا کہ وہاں ''آزادی'' کی خاطر انسان ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے اور والدین اپنی آزادی اس طرح خریدتے ہیں کہ بچوں کو آزاد کر دیتے ہیں۔

بہر کیف یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ اب میڈیا کی بدولت مشرقی معاشروں میں بھی شادی سے پہلے together کچھ ایسے اچنبھے کی بات نہیں لیکن آج سے قریباً تیس برس پہلے ایسی بات سن کر منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ دونوں اپنے میں مگن رہتے۔ بہت کم آمیز تھے۔ باب کی طرح مناظرے اور بحثوں میں شریک نہ ہوتے۔ دن کے وقت جوئی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رکھتی۔ اینڈریوز شلوار قمیض پہن کر سر پر نمازیوں والی ٹوپی پہن کر چمپت ہو جاتا۔ ایک روز جب وہ باہر جا رہا تھا میں آک کے درخت تلے کھڑی بجلی کا بل دیکھنے میں مشغول تھی۔

ایک روز اینڈریوز باہر نکلا تو ہم دونوں ایسے ہی سرسری علیک سلیک کرنے لگے۔

''تم کہاں جا رہے ہو اینڈریوز؟'' اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بھائی! وہ تم جوئی کو پیچھے چھوڑ جاتے ہو۔ وہ کمرے سے نہیں نکلتی۔ لنچ کے لیے بھی نہیں۔''

''وہ اُس کی مرضی ہے آپا جی..... وہ grown up ہے۔ اپنے آپ کو Look after کر سکتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''تم چاہو تو میں تمہیں کوئی سینڈوچ بنا دیا کروں؟'' میں نے بڑی دریا دلی سے کہا۔ اس جملے کے ساتھ مجھے اپنی برتری کا احساس ہوا۔

''نہیں بانو آپا! مجھے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ میں روز کشمیری بابا کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میری تربیت بھی کرتے ہیں اور مجھے لنگر بھی کھلا دیتے ہیں۔''

میں نے داتا گنج بخش کا نام تو سنا تھا لیکن کشمیری بابا کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔

اینڈریوز نے مجھے بتایا کہ کشمیری بابا نکلسن روڈ کے آخری کونے پر رہتے ہیں۔ وہ زیادہ وقت ذکر فکر میں مشغول رہتے ہیں اور لوگ اُن سے اپنی مشکلات کے حل کے لیے آتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اینڈریوز کی طرح راہ سلوک' عرفان اور حق الیقین حاصل کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

کچھ مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ ان کے دوران خاں صاحب کو جوئی کے والد نے چند خط شکریے کے لکھے جن میں محبت کا اظہار تو ضرور تھا لیکن اُس کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پھر اچانک دونوں نے غالباً اکتوبر میں واپس لندن جانے کی ٹھانی۔ جس سہولت سے وہ ہمارے گھر کا فرد بنے تھے اسی آسانی سے وہ اچانک صرف خاں صاحب سے مل کر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ لندن پہنچ کر ایک دو خط اینڈریوز کے آئے لیکن نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ دونوں اکٹھے بھی ہیں کہ نہیں۔

پھر اچانک کرسمس سے کچھ دیر پہلے اینڈریوز اور جوئی بغیر اطلاع دیے ٹیکسی میں سوار گھر آ گئے۔

میں اُن کے آنے پر بڑی خوش ہوئی۔ سفید رنگت مجھے ہمیشہ مرعوب کرتی رہی ہے اور مجھے اندر ہی اندر محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کی اس خوبی کے آگے ہر قسم کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ ان دونوں میں کرسمس کے قریب تھوڑا سا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اینڈریوز میرے پاس آیا اور کہنے لگا...... ''بانو آپا! آپ کے چولہے میں بڑا اچھا oven ہے۔ کیا میں اور جوئی اس میں کرسمس کیک بنا سکتے ہیں؟''

''شوق سے مجھے صرف سودے بتا دو...... میں منگوا دوں گی۔''

''جی نہیں سودے میں خود لاؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا نہیں ہے...... صرف اجازت دینا ہے۔''

''دوپہر کے وقت جب چھوٹی بہن باورچی خانہ چھوڑ دیتی ہے ہم کیک بنا لیں گے۔''

وہ سودے خود لا رہے تھے۔ اس چیز نے مجھے اطمینان کا سانس لینے پر مجبور کیا...... یہ کمینگی ضرور تھی لیکن میں ڈرتی تھی کہ نہ جانے وہ کیا کچھ منگوا بیٹھیں اور اس پر کتنی لاگت آ جائے۔

کرسمس کی پچیس تاریخ سے چند دن پہلے اُنہوں نے قریباً چھ پونڈ کا بڑا اوٹی شکل وصورت کا کیک تیار کر لیا۔ اس میں کرنٹ اور میوے ڈالے اور اس کے اُوپر کرچ کرچ کرنے والی چینی کی پھٹکیاں سی سجائی گئی تھیں۔ جوئی نے آدھا کیک کاٹ کر اپنے والدین کو تیز رفتار ڈاک سے روانہ کر دیا۔ باقی کیک اُس نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

پچیس دسمبر کو بچوں نے قائداعظم کی سالگرہ کے سلسلے میں کوٹھے پر موم بتیاں جلائیں۔ بڑا سا سبز جھنڈا جس پر چاند تارا بنا تھا لہرایا۔ غالباً اُن دونوں نے یہ سمجھا کہ ہم کرسمس کی خوشیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ رات کو وہ دونوں بارہ بجے کے قریب کھانے کے کمرے میں آئے۔ بچوں کو چپکے سے بلایا۔ کیک پر موم بتیاں لگائیں۔ کچھ حمد وثنا (Carolls) گائے۔ کیک کاٹا کھایا اور سو گئے۔

ہمیں اُنھوں نے جگانے یا شریک ہونے کی زحمت نہ دی۔ صبح تھوڑا سا کیک مع چند موم بتیوں کے کاٹ...
پڑا تھا۔ ہم نے اسے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کھایا اور معترف ہوئے کہ واقعی اس رنگت اور مزے کا کیک بیکری...
نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں خدا نے یہ توفیق نہ دی کہ اس بات کا ذکر اُن دونوں سے کرتے۔

اب یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ وہ دونوں عیسائی تھے اور اپنے مسلک پر استقامت سے گامزن تھے...
شادی شدہ نہ تھے۔

لیکن جلد باز انسان کے یہ احمق پن کی دلیل ہے کہ کافی شواہد اور ڈیٹا جمع کیے بغیر کچھ معاملات پر حتمی فیصلہ...
دیتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی لے کر گھر آیا۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے اور اپنے...
کا تیا پانچہ کرنے میں مشغول تھے۔

"یہ مٹھائی آپ کے لیے ہے۔"

"کس خوشی میں اینڈریوز؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"میں آج کشمیری بابا کی مہربانی سے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اب میرا نام اینڈریوز سلیمان ہے..... آپ...
صرف سلیمان پکار سکتے ہیں۔"

پھر وہ پہلی بار شفو جی سے بغلگیر ہوا۔ بچے اور اُن کے دوست اس خبر کو پا کر بہت خوش تھے۔ اب مجھے...
دیتے ہوئے بھی کچھ ایسی خوشی نہ ہو رہی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید ملت کے لیے یہ کوئی گرانمایہ اضافہ نہیں۔ پھر...
نے سب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اینڈریوز کو مبارک دی اور رات کے وقت پلاؤ پکانے کا ارادہ کیا۔

میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ میں اُسے اخلاقیات اور خاص کر اسلامی اخلاقیات پر کچھ لیکچر دینا...
لیکن چونکہ میرا علم کم اور ناقص تھا اس لیے چپ رہی۔

چند دن بعد اینڈریوز اور جوئی سامان باندھے برآمدے میں موجود تھے۔ وہ واپس جانے کے لیے تیار...
تھے۔

"اینڈریوز کہاں؟"

"گھر..... لندن۔"

"لیکن میں تو تمہارے اعزاز میں ایک دعوت کرنے والا ہوں۔ مفتی جی کو بھی اطلاع دے دی ہے۔"

"مشکل یہ ہے خاں صاحب کہ جوئی اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

"پر کیوں؟"

"وہ عیسائی ہے اور میں مسلمان..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"بھائی اسلام میں صاحب کتاب کے ساتھ شادی جائز ہے۔ وہ کیوں گھبرا رہی ہے؟"

"یہ تو اسلامی فراخدلی ہے خاں صاحب! وہ عیسائی ہے اور وہ مسلمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اُسے...

ـ لے اچھے نہیں لگتے..... فیصلہ اس کا ہے۔''

کچھ ہی دن بعد کا ذکر ہے کہ میرے کمرے میں کھلنے والے غسلخانے اور ڈریسنگ روم سے ملحق باکس روم کا قفل ہو گیا۔ میں نے چابی اندر چھوڑ دی اور کڑک کر کے دروازہ کھینچ کر اندر سے تالا بند کر دیا تھا۔

چابیاں اندر چھوڑ کر دروازہ بند کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے بعد یہ غلطی میں نے کئی بار کی لیکن اس روز ـ ـی تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔ پہلے تو بڑی دیر مختلف چابیاں لگا کر تالا کھولنے کی مہم جاری تھی کہ دروازے پر دستک ـ ـں صاحب کی عدم موجودگی میں اینڈریوز کبھی میرے کمرے میں نہ آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

''کیوں سلیمان..... کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کا تالا بند ہو گیا ہے اور اس کی چابی نہیں ملتی۔''

''ہاں..... ٹھیک سنا ہے تم نے۔''

''میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

میں نے جھنجھلا کر کہا..... ''اوہ بھائی! تم کیا مدد کرو گے۔ چابی تو اُس کی اندر رہ گئی ہے۔''

اینڈریوز نے اپنے کُرتے کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں ایک نمبر نے کی شکل کی چابی نما چیز

''میں دو سال چور رہا ہوں۔ ہر قسم کا تالا کھول لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔''

میرا جی تو اُس کی مدد لینے کو نہ چاہتا تھا لیکن میں نے حامی بھر لی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ان ـ ـ سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور نئی اُلجھن کو سینے بیٹھ گئی۔

یہ نومسلم اینڈریوز کون تھا؟

بغیر شادی کے کاسنی کمرے میں جوئی کے ساتھ رہنے والے کی اصلی شناخت کیا تھی؟ سر پر دو تہوں کی پگڑی پہن ـ ـ بابا کی درگاہ پر روز جانے والا یہ شخص اچھا تھا کہ برا؟ میں اُسے کس خانے میں ڈالوں؟ مسلمان ہو جانے والا ـ ـ کون تھا کیا تھا۔

اس سوچ کا ذکر خاں صاحب سے بالکل نہ کیا کیونکہ وہ عموماً کہا کرتے تھے ہمیشہ دماغ ہی استعمال نہ کیا کرو کبھی ـ ـ کو اس کی قید سے رہا بھی کر دیا کرو.....

یہ وہ دور تھا جب خاں صاحب کے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد کا ہمارے ہاں خوب آنا جانا تھا۔ تقو کے صائل ـ ـمی میرے بچوں کے دوست تھے۔ اس کی بیوی منزہ بھی اس کے ساتھ آ جاتی' کبھی صبح کے وقت اکیلی ملنے ـ ـ۔ عموماً اپنی تمام تر خوش دلی انسان دوستی کے ساتھ کچھ پکا کر سجا کر لے آتی۔ باورچی خانہ اُس کے کھلے دل کی وجہ سے ـ ـ ہو جاتا۔ وہ گلاب جامن بناتی' کیک بیک کرنے کے طریقے سمجھاتی' کڑھائی گوشت بنانے کی ترکیب سمجھاتی' ـ ـ تھ وہ سب کو اپنی چھوٹی انگلی کے ساتھ لپیٹنے کا فن بھی جانتی تھی۔

خاں صاحب کا رابطہ خلق سے اور طرح کا تھا۔ منزہ اور طرح سے جال پھینکتی تھی۔ خاں صاحب جانتے تھے کہ

جب انسان میں زیادہ خوبیاں اکٹھی ہو جائیں تو خطرے کی گھنٹی کہیں نہ کہیں بجتی ہے۔ دولت' حسن' دانشوری یہ سب
دین تو ضرور ہے لیکن اسی دین کے باعث اللہ آزماتا بھی خوب ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ نعمتیں جھولی میں ڈالنے والا
پر ہے کہ نہیں۔ جہاں غریبی' بدشکلی' کم عملی کا ساتھ ہو وہاں بھی آزمائش ہی مطلوب ہوا کرتی ہے۔ اللہ جانچتا ہے کہ
کے مقام پر یہ شخص صابر ہے کہ نہیں۔ ہمارے عہد میں غریبی کا امتحان قدرے آسان تھا۔ ابھی غریب آدمی میں
اور حرص ایسے مہلک مرض نہ بنے تھے۔ امیری بھی نمائش' زیبائش' آرائش کی عادی نہ تھی۔ سوسائٹی کی آزمائشیں کم تھیں۔

ہنس مکھ منزہ جسے ہم شرمیلا ٹیگور کہا کرتے تھے' باریک بین' دُور اندیش' پہلے تول پھر بول والی خاتون
چاہتی کر لیتی' جسے چاہتی اپنا بنا لیتی..... غیبت پر آئے غیبت کر لی' تعریف کو دل چاہا سراہنے پر آمادہ ہو گئے تو آسمان
کے قلابے ملا دیئے۔ نہ اپنے اعمال پر نازاں نہ احساسِ جرم میں مبتلا۔ بہت جلد اُس کی اینڈریوز اور جوئی سے دوستی
وہ آتے ہی دھڑلے سے ان کی طالب ہوتی۔ وہ بھی گویا منزہ ہی کے منتظر ہوتے۔ پھر محفل جمتی' خوش گپیاں
پکوڑے کا دَور ہوتا..... گھنٹے پریوں کی طرح داستان سرائے کے اُوپر سے اُڑ جاتے۔

ایک روز بڑا متفکر چہرہ لیے منزہ میرے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی پھر بولی..... "پتہ نہیں کہ
کہنا چاہئے کہ نہیں..... لیکن آپ کو پتہ ہے میں آپ کو کچھ بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔"

"کیا ہوا؟"

"یہ جو اینڈریوز ہے ناں....."

"ہاں..... ہمارا اینڈریوز۔"

"بالکل! اور یہ جو جوئی ہے ناں۔"

"ہماری جوئی؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ دونوں شادی شدہ نہیں ہیں۔"

"اچھا پھر؟..... اب کیا کرنا ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کرنا..... کرانا کیا ہے؟ یہ مغربی لوگ ایسے ہی ہیں۔ یہ Living together کو برا نہیں سمجھتے
تجرباتی طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ پھر اگر نبھ جائے تو شادی ورنہ....."

پہلی بار میں نے گھبرا کر کہا "لیکن..... اگر بچوں کو پتہ چل گیا..... دیکھو ناں..... ثویلہ' توصیف' یہ
تمہارے بچے..... کبھی کبھی تو ڈیڈی جی کے بچے عدنان' لبنیٰ اور عائشہ بھی آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے تو کچے ذہن
پر کیا اثر پڑے گا..... پھر اسلام میں تو ویسے بھی چوری چھپے کی آشنائی نہیں کر سکتے..... منع ہے۔"

"تو یہ کون سا مسلمان ہیں کا کی..... تم پریشان مت ہو جانا۔ تمہاری عادت ہے۔ دوسروں کے مسئلے
اپنے سر پر مت اُٹھا لینا۔ ان کی اپنی اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ سیکولر لوگ ہیں۔ یہ ہماری طرح اولڈ فیشنڈ نہیں ہیں۔"

میں نے سیکولر کا لفظ پہلی بار یوں استعمال ہوتے سنا۔ ابھی میں اس لفظ کے استعمال' معنی اور بھرم سے آگاہ
ایک روز ہم بابا جی کے ڈیرے سے لوٹے تو بچے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کو چھوڑ کر

ے میں پہنچے۔ برآمدے میں منزہ اپنے گدگدے ہاتھوں کے اشاروں سے جوئی اور اینڈریوز کو کچھ سمجھانے میں مصروف تھی۔ ہم دونوں ٹیموں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ ابھی ہمیں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ منزہ نے دروازہ کھٹکھٹایا
"آ جاؤں شقو بھائی!"

"آیئے آیئے۔"

منزہ کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا اور وہ کلکاریاں مارتے بچے کی طرح معصوم لگ رہی تھی۔

"شقو بھائی! سلیمان چاہتا ہے کہ وہ جوئی سے شادی کر لے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اس طرح نہیں رہنا چاہتا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے..... لیکن جوئی تو مسلمان نہیں ہوئی۔" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ میں نے جوئی کو سمجھا دیا ہے اُسے مسلمان نہیں ہونا پڑے گا۔ تیاری پکڑو ۔۔۔ نے بڑا کرم کر دیا بڑی خیر ہو گئی پت....." یہ کہتے ہوئے خاں صاحب باہر اینڈریوز اور جوئی کے پاس چلے گئے منزہ کے پاس بیٹھ کر نکاح سے متعلقہ تیاریوں میں مگن ہو گئی۔

یہ منزہ کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔

اُس نے جوئی کو سجانے کے لیے زیور سے لے کر بانٹنے والی بڑی تیاری تک ڈھولکی بجانے والیوں کو بلانے اور میلہ منانے تک چھوٹی چھوٹی تفاصیل کے ہمراہ ایک ہنگامہ خیز شادی کا اہتمام کر لیا۔ گھر میں ہر وقت بنرا بنری کی صدائیں گونجنے لگیں ڈھولک کی تھاپ سارے محلے میں خوشیاں بکھیرنے لگی۔ ہر وقت آنے جانے والیوں کا تانتا چل نکلا۔

پھر اینڈریوز ایک روز باورچی خانے میں میرے پاس آیا۔ کہنے لگا..... "بانو آپا! میں ایک کیک بنانا چاہتا ہوں۔"

"کیک؟ کیسا کیک؟"

"وہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ شادی کے کیک کے بغیر شادی مکمل نہیں ہوتی۔ Wedding کیک میں بناؤں اگر آپ اجازت دیں گی۔" اُس نے باورچی خانے کے اوون کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں..... کیا کچھ درکار ہو گا؟"

"باقی سب کچھ میں لے آؤں گا۔ گھر پر کیا براؤن چینی ہو گی؟"

"ہاں شکر مل جائے گی۔"

"بہت اچھا۔"

منزہ نے ایک مولوی صاحب بلا کر نکاح تک پڑھوا دیا۔ عموماً بعد میں اصل بھید کھلا۔ نکاح میں مردوں کے علاوہ کوئی شریک نہ ہوا لیکن بعد ازاں کیک کاٹنے کی رسم تمام تر عورتوں کے حوالے ہو گئی۔ کوئی دس پونڈ کا کیک موم بتیوں سے سجا بیٹھک خانے کے کمرے کی سیاہ میز پر پڑا تھا۔ جوئی اور اینڈریوز نے اسے کاٹا اور بانٹا۔ پھر قریباً ایک چوتھائی کیک اینڈریوز اپنے کمرے میں لے کر جانے لگا تو میں نے پوچھا "اسے کیا کرو گے سلیمان؟"

"یہ میں ڈاکٹر گیون کے گھر بھیجوں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گے..... ہم نے کرسمس پر بھی اُنہیں کیک بھیجا تھا۔"

ابھی سلیمان اور جوئی کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ پتہ لگا وہ دونوں ہنی مون منانے لندن جا رہے

ہیں۔ خاں صاحب اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ اشتیاق منزہ بھی آ جاتے تو باتوں میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ لیکن میرے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ بچے بھی اس شادی پر بڑے خوش تھے اور جوئی کو زیادہ محبت سے جوئی آپا بلانے لگے تھے۔

پھر جوئی اور سلیمان لندن چلے گئے۔ ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک روز آیا تو جوئی اُس کے ساتھ نہ تھی۔

''یہ میری بیوی ہے۔''

میں نے بیوی پر نظر ڈالی تو سواتی چادر میں ڈھکی ڈھکائی عورت جوئی نہ تھی۔

''یہ اطالوی لڑکی ہے..... مسلمان ہوگئی ہے اور یہ ہماری بچی ہے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ سلیمان نے بھی مسلمان ہوتے ہی بیوی بدلنے کا ہی سوچا اور کوئی نیک کام اُسے نہ سوجھا۔ چھوٹی بچی سواتی لباس میں تھی۔ فراک نما کرتا نیچے دروازے والی چنٹ دار شلوار۔ سر پر سواتی ٹوپی۔ میں حیران کہ بیسوی صدی میں بغیر Pampers کے کسی بچے کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہاں شلوار میں اتنا بڑا شگاف تھا جس سے بچہ اپنی حاجات پوری کر لیتا اور گیلا بھی نہ ہوتا۔ اطالوی لڑکی نہ انگریزی جانتی تھی نہ اُردو۔ اس لیے اُسے بات کے لیے صرف خاں صاحب ہی میسر آئے۔ وہ دونوں اطالوی میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے میں اینڈریوز ان کا منہ تکا کرتے لیکن کچھ سمجھ نہ پاتے۔

کچھ دن قیام کے بعد اینڈریوز صبح بولا..... ''آج ہم واپس جا رہے ہیں۔ ٹماٹر کی فصل تیار ہوگئی ہے۔ میں نے چاچا حمید سے کہا تھا وہ خیال رکھتا ہوگا۔''

اس کے بعد سلیمان کب چلا گیا؟ میں اُس سے جوئی کے متعلق کچھ نہ پوچھ سکی' جوئی نے کیوں اُس سے قطع تعلق کیا؟ یہ سوال ہی رہے کیونکہ میں جانتی تھی کہ کسی کا ہاتھ پکڑنا بھی اپنی ضرورت کے تحت ہوتا ہے اور اس ہاتھ کو چھوڑنا بھی اپنی ہی جملہ خباثتوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی شخص نہ کبھی کسی اور کے متعلق کچھ سوچتا ہے نہ اُس کو مدنظر رکھ کر فیصلے کرتا ہے لیکن میں نے اپنی لاتعلقی کی خباثت کا اظہار نہ کیا۔

سلیمان اور اُس کی اطالوی بیوی کے جانے کے بعد میں کاسنی کمرے میں گئی تو سارا کمرہ صاف تھا۔ فرش پر پوچا پھیری ہوئی' غسلخانہ دُھلا ہوا تھا۔

اس بار سلیمان ہم سے یوں رخصت ہوا جیسے امیر رشتہ داروں کے گھر سے دیہاتی غریب رشتہ دار جاتے ہیں۔ اُس نے نہ ہمیں اپنا پتہ دیا نہ گرم جوشی سے الوداعی جملے ہی کہے۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ گھرانہ مغربی تہذیب کے نرغے میں آ گیا ہے۔ بچے انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ آپا جی اور خاں صاحب بھی اب مشرقی تہذیب کا خیال نہیں رکھتے رہے۔ پتہ نہیں سلیمان کا آدرش ٹوٹ گیا تھا یا اُس نے ایک نئے معاشرے میں آزادانہ اپنا مقام پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چھٹکارا حاصل کرنے داستان سرائے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتا ہو۔ وجہ جو بھی ہو اس کے بعد سلیمان ہمارے ماضی کی داستانِ پارینہ بن گیا۔ اُسے صدا دیتے بھی تو بیکار تھا کیونکہ ماضی کبھی ملاقات نہیں کر سکتا۔ اُسے دفن ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن میں نے اُس کا ذکر کیا تو خاں صاحب بولے..... ''جو شخص اپنے ماضی کو دفن

ہے یا مستقبل کے اندیشے میں زندہ اُس کا حال بیکار ہو جاتا ہے۔''

زندگی نے ہمیں اور مصروفیات عطا کر دیں اور ہم ان دونوں کے قیام کو بھول گئے۔ ایک دن اچانک مجھے سوات سے ایک خط ملا۔ عجیب سی بات ہے لیٹر پیڈ داستان گو کا تھا لیکن لفافے پر مہر سوات کی تھی۔ خط میں رقم تھا کہ میں نے سوات میں کچھ زمین خرید لی ہے اور یہاں کاشتکاری کرتا ہوں۔ اس زمین کے عوض میں نے اپنی لندن کی زمین ان سواتیوں سے تبدیل کر لی ہے۔ ان کو لندن میں رہنے کا شوق ہے۔ میں یہاں اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہوں۔ کئی سال میں نے بسری کی۔ نوجوانوں کو پڑھایا۔ مہذب لوگوں کو قریب سے دیکھا۔ اب میں پرندوں کی طرح معصوم لوگوں میں رہتا ہوں۔ مغربی تہذیب سے بہت دُور..... کھوتی پر اپنا سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہوں (بہت دیر تک ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا چیز ہے۔ پھر انیق بیٹے نے عقدہ حل کیا کہ خچر کو کہہ رہا ہے۔)

خاں صاحب انگریزی کی ڈکشنری پھرولنے میں مصروف تھے۔ نوکی نے خط لے کر پڑھا اور بولا:

''ابو! اینڈریوز کے پاس اب پندرہ گدھیاں ہیں جن پر وہ سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔''

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ ایک سواتی لڑکی کو لے کر آ گیا۔ یہ خوبصورت لڑکی اُردو پنجابی سے بالکل ناواقف تھی۔ پڑھی لکھی ہونا تو درکنار وہ تو اشاروں کی زبان بھی نہ سمجھتی تھی۔ یہ اینڈریوز کی تیسری بیوی تھی۔

''میں نے سوات میں اس لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا ہے..... یہ کھیتی باڑی کے ایسے گر جانتی ہے کہ مجھے وہاں کام میں مشکل نہیں رہا۔''

خاں صاحب نے حیران ہو کر کہا..... ''بھائی! تم لوگ عجیب الخلقت ہو جو چاہتے ہو کر لیتے ہو۔ اپنی زندگی سے یوں کھیل اس کے ساتھ ایسے ایسے تجربات کرنا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ وہ اطالوی بیگم کیا ہوئی؟''

''وہ مسلمان تو ضرور تھی۔ گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی چلی گئی۔ اُس کا کلچر اُسے گھسیٹ کر واپس اٹلی لے گیا۔''

ہوا یوں کہ لندن میں اینڈریوز کے پاس زمین تھی اور اس کی سواتی بیوی کا باپ لندن امیگریشن کے چکر میں تھا۔ اینڈریوز پہلے تو اپنے سسر کی زمین میں کھیتی باڑی کرتا رہا پھر جب امیگریشن کے کاغذات مکمل ہو گئے تو اینڈریوز پندرہ کھوتیوں اور سواتی زمین کا مالک ہو گیا۔ ان ہی گدھیوں پر سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔ سادی زندگی سے وابستہ ہے۔ اب تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نے زندگی کے ساتھ تجربات کرنے بند کر دیے ہیں کہ ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جانے وہ سوات میں ہے کہ کہیں جاپان' ملیشیا یا کہیں چین میں رہتا ہے۔ اُس کی سواتی بیوی ساتھ ہے کہ لندن اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ لیکن نہ تو ہمارا تجسس اس قدر تیر بہدف ہے نہ ہماری دلچسپی ہی برقرار رہی۔ رابطہ ہو تو کیسے۔ اس کی چند نظمیں رہ گئی ہیں جو کبھی کبھی اُس کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

اس خط میں ایک اور صفحے پر ایک نظم درج تھی اس کے نیچے 1975ء درج تھا۔ غالباً یہ نظم ہمارے پیڈ پر ہمارے گھر میں ہی لکھی گئی لیکن پوسٹ سوات سے ہوئی۔ لکھا تھا۔

بانو قدسیہ کے لیے ازلی شکریہ کے ساتھ!

جو حصہ آپ نے مجھے سلیمان ہونے میں ادا کیا اور دوسری مہربانیوں کے لیے (نیچے نظم تھی)

ایک مسلمان ملک میں ابھی تک میں بودھی مہاں پرشوں کی تلاش میں ہوں۔ مادہ سے بھری دنیا میں روح ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں دریا کنارے پیاسا ہوں.....سوپر مارکیٹ میں بھوکا کھڑا ہوں۔
چائے خانوں سے "چائے" کی صدا آتی ہے۔
"روٹی اور ترکاری"
مسجد سے اذان کی آواز اُٹھتی ہے "اللہ ہو اکبر"
اللہ سب پر حاوی ہے
دنیا بے معنی ہے
اللہ کہو اور ان سب کو بے کار کھیل تماشے کے لیے چھوڑ دو
میری آنکھیں برسات حجاب ہیں
محبت کی رسی پکڑ کر Illusion کے بادلوں سے گزر کر مجھے سات بلندیوں پر چڑھنا ہے
پہاڑ کی اُس سفید چوٹی پر پہنچنا ہے جہاں میرا آقا میری راہ دیکھتا ہے
وہ ہمیشہ ایک ہے
ہمیشہ تنہا ہے
میری محبت کے بغیر اداس ہے
میں اپنی منزل بھول گیا اور کھیل کود میں مصروف رہا
اے اللہ مجھے سکھا
اے نبی ﷺ مجھے یاد دلا
"اپنا کام چھوڑ اور نماز پڑھنے جا
ایک انعام تجھے آخرت میں ملے گا لیکن اطمینان قلب تجھے آج ہی نصیب ہو جائے گا"

سلیمان اینڈریوز
1975ء

اسی نظم کی پشت پر ایک اور نظم بھی درج ہے۔ یہ نظم اینڈریوز نے 1967ء میں لکھی تھی جب وہ ابھی مسلمان ہوا تھا اور اپنی پریشانی کی بندگلی سے نکلنا چاہتا تھا۔

"بند انجام"
وہ اُس شخص کو اختتام تک پہنچ چکا تھا
اُس گلی کے آخر تک

اُس پاپ سانگ کے انجام کو
اپنے خیالات کے ایسے لمبے سلسلے
جنہوں نے اُس کی زندگی کے مضافات کو
سہ پہروں تک ڈھانپ لیا تھا
اُسے اپنے کمرے سے کیوں اتنی نفرت تھی؟
اسی مسئلے کو سب سوچوں نے گھیرے میں لے لیا
پھر اُس نے سب کچھ ڈھیلا چھوڑ دیا
ہر شے کو زمین پر بکھرنے دیا
وہ فرش پر ٹھنڈا لیٹا سگریٹ پیتا رہا
دیوار پر بارش اور سورج پھسلتے رہے
اور وہ کھلی آنکھوں انہیں دیکھتا رہا
وہ تذبذب تھا.....
شاید دیر ہو چکی تھی
اور اس دیر کے اصل میں کیا معنی تھے
وہ ہر شے کے معنی کھو چکا ہے
تذبذب ہے کہ کیا کبھی کوئی چیز با معنی بھی تھی
وہ اپنے آپ کو ایک ٹھنڈا ستارہ سمجھتا ہے
جس نے اپنی مروّت میں سورج کو جنم دے رکھا ہے
وہ آرزومند ہے کہ کسی دن ہر امید ختم ہو جائے
پھر وہ پارک میں کھلی دھوپ میں اُگتا رہے گا
گھاس کے لاکھوں beds میں ایک تنکا
جیسے صبح کے وقت گھاس کاٹنے والی مشین کا بلیڈ
کاٹ کر دھر دے
وہ سبزے کے فوارے میں تیرتا رہے گا
اُسے شدید آرزو ہے کہ
یا تو اُسے پروا ہو یا وہ بے نیاز ہو جائے
وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا وہ مر رہا ہے
یا زندہ ہے

یا کیا؟

اینڈ ریوز

1967ء

اینڈ ریوز کی نظم پڑھ کر ہم دونوں دیر تک چپ رہے۔ یوں لگا جیسے ایک مدت بعد کوئی گمشدہ انگوٹھی ملی لیکن ہیرا اگر چکا تھا۔ خاں صاحب نے بالآخر بڑی جرأت سے کہا "زیادہ مت سوچو قدسیہ! بڑے سے بڑا ادیب بھی کہانی نہیں بن سکتا۔ سلیمان بھی ایک ایسی ہی کتھا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا..... بس وہ یہیں سے نکلتا ہے کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو..... جو نہیں ہو سکتا اُس کی آرزو میں اپنا آپ بھسم نہ کرو۔ آرزو کے پیچھے بھاگنے والا چاہے مجنوں ہو..... چاہے کوئی سائنس دان کوئی صوفی ہو یا شریعت کا پابند..... آرزو کے تعاقب میں رہنا درست نہیں۔ اس کے لیے شانتی کا آسن لگا کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ آخر اُس وحدہ لاشریک کی رضا کیا ہے..... کیوں ہے نہیں..... بلکہ کیا ہے..... یہی بڑا راز ہے۔"

سفر (اوسلو)

سن 1982ء میں Loriters Ilsion Oslo نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے خوبصورت شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دُھلی دُھلائی، لوگ شائستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔ یہیں جناب تھسکین سے ملاقات ہوئی جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ نارویجین زبان میں کیا تھا۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Helge Vatsend کو ہم اپنی یادوں کی پٹاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ شاعر ہے۔ اُس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوک رُوپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

Trolls ایک نوعیت کی دیومالائی مخلوق ہیں جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوک کہانیوں میں ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنائے سے انتباہ کرنا ہے۔

قریباً سال کے بعد ہیلگے ویٹ سینڈ کا خط ملا۔ اُس کی چند نظمیں بھی ملفوف تھیں جو آپ کو سنائے دیتے ہیں۔

(انگریزی ترجمہ Olav Grinde نے کیا ہے)

(1)

"چیتل"

ہر روز تکنیک (Perfect) ہوتی جاتی ہے

ہمارے لونگ روم میں اب شو ہوتا ہے

دنیا کے ریکارڈ

نیاگرا کی گھن گرج
گھاس کے blades پر کیڑے مکوڑوں کی زندگی
بے رحمی کی حد تک بے نقاب
لیکن خوبصورت رنگوں میں موجود
لیکن ایسے دن بھی آتے ہیں
جب ٹی وی کے رنگ گرے ہو جاتے ہیں
جس طرح خزاں کی بارشیں مناظر دھندلا دیتی ہیں
اور چہرے دُھندلا دیتے ہیں
لیکن جلد ہی دوسرے پروگرام ان کی جگہ آ جائیں گے
چینل کا سوئچ کل کی آزادی کا سمبل ہے
جھنڈا اور ہتھیار ہے
ہم پھر بور نہیں ہوں گے
پھر ہم سڑکوں پر اکٹھے ہو کر
بے صبری سے تبدیلی کے نعرے نہیں لگائیں گے
دنیا کی تصویر ہمارے لیے اور بھی perfect ہو جائے گی
ہماری زندگی سے حیات کا رس
لمحہ بہ لمحہ پہر در پہر چوستی ہوئی

(2)

Light Rope Art (ایک جھلکی)

شعبدہ باز اُونچا آسمان میں چڑھا
مسکراتا ہے
وہ تنی ہوئی سرکس کی رسی پر تنہا ہے
جانتا ہے کہ اگر وہ گر پڑا
تو پھر سب کچھ ختم ہے
کیونکہ سکرین پر صرف Perfection دکھائی جاتی ہے
ہم Sirens بجاتے چیختے
اُس کے گرنے کا انتظار کرتے ہیں

ریس کاریں اپنے راستوں سے گر کر اُلٹتی ہیں
ڈرائیوروں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں
سیلابی لہریں
بموں سے مسمار گھر
ہمارے عہد کی تباہیاں
آج کے نو وارد وقت

لیکن ہمیشہ وہی چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں
وہی الفاظ
اُن لوگوں کے منہ سے جو ٹیلی ویژن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں
الفاظ، تصویریں
متوازن آراء
رسی پر چلنے والا شعبدہ باز مسکراتا ہے
صرف ہم ہی شکوک کے ساتھ رہتے ہیں

(3)

The Unspeakable. Translated by Olav Grinde (ناگفتنی)

جانِ من ایک خاردار لمبے راستے پر پہنچ کر
ایک ایسے ناگفتنی مقام پر پہنچا
جہاں الفاظ کی اشد ضرورت ہو
ہم اُس متن میں
اپنی خالی جگہیں بنا لیتے ہیں
جہاں صرف خاموشی ہوا کرتی ہے
ایک ایسی چپ جسے دانش کہا جا سکتا ہے
گھنٹی کی طرح خالی
باہر اندھیرے میں گھاس کے blade جیسی
مسل ٹو کے نیچے دیئے گئے بوسہ کی مانند
ایک مکمل بات

ہمیں پرانی دانش سے بھری کہاوتیں
اپنی خاموشی پر چھائی لگتی ہیں
جو ایک بلی کی طرح
اپنے نرم پنجوں پر
دائروں میں چلتی ہے

(4)

(Silence) سناٹا
کچھ بھی تو نہیں ہوتا
دن آہستہ آہستہ گزرتے ہیں
شام کے وقت
تھکے ہارے رپورٹر کی طرح گھر لوٹتے ہیں
چیختے چلاتے آگے بڑھتے
تعاقب میں تیز تیز
منتظر
ایسے شگون کے لیے
جیسے آسمان میں بادل
ہوا میں Tension ہے
اور جسم خارش سے بھر گیا ہے
آنے والا کل
دھرتی کے سخت سینے
ہل چلانے آئے گا
ایسا ہل جو ہمارے ہل سے بھاری ہوگا
ہم منتظر رہتے ہیں
ہماری پریشانی معکوس ہو
ہماری روح میں گھس بیٹھتی ہے
ایک دن یہ خاموشی
ہمارے کان کے پردے پھاڑ دے گی

سفید موت
خاموشی کی سفید موت
برف زمین سے ڈھانپ دی جائے گی
اور اُس پر لہو ہوگا

(5)

Game (کھیل)
سکہ مشین میں ڈالا جاتا ہے
Pin Ball مشین کی ساری حرکتیں مشینی ہیں
میرے متحرک جذبات اس کے حریف ہیں
فتح مندی، دولت، آزادی
ایسے الفاظ سے میرے خواب اور اُمیدیں وابستہ ہیں
ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا
ایسا لمحہ شگاف
جب پہیے ٹھیک بیٹھ جائیں گے
جس طرح کوئی نظم اچانک دل کو ہلا دیتی ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی لہو کسی قتل سے نہیں بلکہ انسان کی آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے گوش گزار کی ہیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اکثریت ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھ کر کار ریس، سونامی کے سیلاب، زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچے سکہ ڈال کر جوا کھیلنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر، اس کی جہالت، رسم و رواج، مذہب اور اس کی سے حاصل شدہ سکون سے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ وحشت بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلی احساس نہ تھا۔

• • • ● • • •

آخری ایام

(گھر کو واپسی)

کچھ تو خاں صاحب کی بیماری نے کمر توڑ دی تھی کچھ نفسیاتی، قلبی، ذہنی طور پر میں خوف سے تتری ہوگئی تھی۔ ایک خوش الحان، راست گو ساتھی سے بچھڑنے کا برا خواب ہروقت ساتھ تھا، جسے میں مگس راں سے اُڑاتی رہتی تھی، پھر یہ خواب درماندہ پیچھا چھوڑتا تھا نہ ہونی ٹلتی ہی نظر آتی تھی۔

چھ ستمبر کی رات عجیب بے کسی سے پا پیادہ چل رہی ہے۔ خاں صاحب کی ڈوبتی نبض اتنی دھیمی تھی کہ بار بار شبہ ہوتا تھا کہ ہے بھی ہے ابھی نہیں ہے۔ سرخ و سپید چہرہ جس تکیے پر دھرا تھا اُسی کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ بازوؤں کا گوشت جھالر صفت لٹک رہا تھا۔ نہ بالوں میں آب و تاب باقی تھی نہ داڑھی میں چمک تھی۔ درد مسلسل چھاپے مار رہا تھا، لیکن اُن کی آواز میں بے صبری، ناشکیبائی یا رتی بھر شکایتی لہجہ در نہ آیا تھا۔

وہ بار بار اُٹھتے مجھے ہلاتے۔ میں اُٹھتی پاس جاتی وہ کمزور مدہم آواز میں کہتے "میں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔" میں جواب میں کچھ نہ کہہ پاتی۔ کچھ دیر میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی۔ پھر وہ بڑے تردد کے ساتھ مجھے کہتے "سو جاؤ اور اب میرے بلانے پر بھی نہ اُٹھنا۔"

اُن کی تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ اندر ہی اندر یہ دُکھ مجھے ستا رہا تھا کہ کاش وہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے روئیں، چلائیں، واویلا مچائیں۔ لیکن خاموش شیر قالین تو صاحب فراش تھا۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سُلانے کا مشغلہ اپنائے ہوئے تھے۔

رات قطرہ قطرہ گزر رہی تھی جیسے ڈرپ میں لگا خون۔

کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی آواز چہرے پر منڈلانے والی مکھی کی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ کمرے میں لگا کلاک بڑی نحوست پھیلانے کے انداز میں سیکنڈ کی سوئی بجائے جا رہا تھا۔ آج اس کی آواز گویا کوچ کا نغمہ تھا۔

کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا، جس کی روشنی پر یاس کا پیلا پن نمایاں تھا۔

کتابوں سے لدی الماریاں جامد باسی اور پرانے کاغذوں کی بوباس کمرے میں سپرے کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا تھا کہ تمام خاکستری کتابیں زرد رنگ کی ہو چکی ہیں اور اُن پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ کتابوں کے عنوانات جو خاں صاحب کی لکھائی میں کتابوں کے پشتوں پر بھتے پڑھے نہ جاتے تھے۔

اُبھرنے والی صبح بچھڑنے والی رات سے گلے مل رہی تھی۔ گویا کسی مستقل وچھوڑے سے خوفزدہ ہو کر آنسو سے بھیگ گئی ہو۔

قریباً چار بجے تھے جب انہوں نے مجھے بلایا۔

''ستو انیس خاں کو فون کر دو..... وہ آ جائے۔''

میں نے پُر امید ہونے کے انداز میں غلط جواب دیا..... ''آپ فکر نہ کریں خاں صاحب! ابھی صبح ہونے والی ہے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گا۔''

''اچھا'' انہوں نے اپنی کربل کرتی پریشانی کو برداشت کے پتھر تلے دبا لیا۔

پھر چھ بجے کے قریب انہوں نے آواز دی ''بانو..... سو گئیں؟''

میں جان بوجھ کر آنکھیں ملتی اُٹھی ''جی خاں جی!''

''یہ ذرا میری نبض دیکھنا۔''

وہ بدھا روپی چہرہ لیے لیٹے تھے۔ چہرے پر رتی بھر پریشانی نہ تھی۔ گرہ نیم باز کا قرض چکانے کے بعد اطمینان کی صورت۔

میں نے نبض محسوس کرنے کی کوشش جاری رکھی..... انہوں نے بھی اپنے ایک ہاتھ سے دوسری کلائی کو تھاما۔ دونوں چپ رہے۔

پھر میں نے ہائی نون کے ڈاکٹر عاطف کے موبائل کا نمبر ملایا اور اُٹھ کر غسلخانے میں چلی گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری آواز سے کچھ اندازے لگائیں۔

''عاطف! پلیز آپ آ جائیں۔ خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''کیا ہوا؟''

''بس جی نبض بہت آہستہ چل رہی ہے اور.....''

''آپ فوراً ڈرپ لگوائیں۔''

''اچھا جی..... آپ آ جاتے اگر تو تسلی ہو جاتی۔''

''میں ضرور آ جاتا لیکن اس وقت میں ایئرپورٹ جا رہا ہوں۔''

میں واپس کمرے میں آ گئی۔

''عاطف کو بلایا؟'' اُن کی آواز میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

''وہ ایئرپورٹ جا رہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اثیر بیٹے کو جگا لاؤں؟''

''ناں ناں..... پہلے وہ رات ایک بجے تک بیٹھا رہا ہے۔ بینکر کی نیند خراب نہیں ہونی چاہیے۔ بڑی ذمہ داری کا
ہے۔''

''انیس کو فون کروں؟''

''ناں ناں..... تم بھی سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔''

خاں صاحب نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ٹیڑھے کر لئے۔

میں ڈاکٹر عاطف گوہیر کو فون ملانے میں مصروف ہوگئی۔ سائرہ ہسپتال والے ڈاکٹر گوہیر.....
وہ غالباً موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں.....'' میں چپ ہوگئی۔

''ابھی ڈرپ لگائیں گے ٹھیک ہو جائے گی۔''

مجھے یوں لگا گویا وہ پہلے سے ہسپتال کی ایمبولینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کرنا ہے۔ کیا ہونا درکار ہے کہ ڈاکٹر گوہیر آن پہنچے۔ ہم قریباً دس منٹ میں باہر آ گئے۔ پہلے ڈاکٹر صاحب نے شفو جی کو ایمبولنس میں سوار کرنا چاہا پھر کچھ سوچ کر بولے انہیں میری کار میں بٹھا دیجیے۔

اس وقت جب ہم انہیں کرسی سے فرنٹ سیٹ پر منتقل کر رہے تھے۔ اثیر خاں بینک کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔

''میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ابو.....''

بابا جی

(از ڈاکٹر عاطف گوہیر)

صبح سات بجکر پچیس منٹ پر بانو آپا کی مخصوص سکون آمیز آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ڈاکٹر صاحب تکلیف کی معافی۔ خاں صاحب کی طبیعت چار بجے سے کچھ ٹھیک نہیں۔ ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں اور کسی کروٹ آرام نہیں۔'' میں نے پچھلے چھ ماہ کے اس کٹھن امتحان سے گزرتے ہوئے کم ہی کبھی بانو آپا کو پریشان دیکھا تھا۔ اس ہر دل پسند شفقت و ممتا کی بارعب دیوی کو' جو سفید لباس اور سفید کھلے دوپٹہ میں اپنے آپ کو لپیٹے رکھتی' جب خاں صاحب کے بارے میں زیادہ تشویش ہوتی تو وہ پنجابی کے بجائے اُردو میں اس کا اظہار کرتیں۔ اُس دن آپ کی اُردو سن کر میرا دل ایک ہارٹ بیٹ مس کر گیا۔ خیال آیا کہ اشفاق احمد صاحب جو پچھلے تقریباً چھ ماہ سے انتہائی تکلیف دہ حالت کا مقابلہ مرحلہ وار احسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ تحمل اور صوفیانہ دلیری سے سرانجام دینے لگے ہیں۔

آغا جی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے' وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں عطا فرمائے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اشفاق صاحب سے میری ملاقات صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ یادداشت کو کریدوں تو بھی بچپنے میں ریڈیو پر تلقین شاہ کا یکتا انداز اور ہردلعزیز مثبت مزاحیہ بیان اُبھرتا ہے، جسے میں بڑے شوق سے اپنے کے ساتھ بیٹھ کر سنتا تھا۔ اس زمانے میں آپ کی سبق آموز باتیں تو سمجھ میں کم آتی تھیں مگر ہلکی پھلکی خوش باش گفتگو سے ضرور لطف اندوز ہوتا تھا۔ پھر تقریباً سات سال پہلے سائرہ ٹرسٹ ہسپتال کی ایک تقریب میں آپ سے بالمشافہ ملاقات ہوئی اور آپ بہت بھلے لگے۔ اس وقت آپ بلاشک وشبہ اپنے منفرد انداز بیان اور صوفیانہ گفتگو کی وجہ سے سارے ایک جداگانہ، عالی وقابل رشک مقام بنا چکے تھے۔ آپ کی ٹکر کا کوئی استاد اور عالم جو بات کو کہانی کا رنگ دے کر انداز میں کسی بھی محفل میں نہایت طمانیت سے ذہن نشین کرا سکے اور سمجھا سکے، کم ہی کوئی نظر آتا تھا بلکہ آج بھی نظر نہیں آتا۔ آپ ترقی پسند تھے اور زمانہ شناس تھے۔ اولیاء اللہ اور علماء میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام زمانہ کی نبض پہچانتے ہیں اور حاضرین اور معتقدین کی ذہنی قابلیت کو سامنے رکھتے ہوئے بات سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر زمانے سے ناآشنا اپنے علم کی بھاری بھرکم سلوں کو دوسری کے سروں پر دھنستے ہوئے فرعونی اہرام مصر تعمیر کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔

بانو آپا سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خود چل کر اشفاق صاحب کی مزاج پرسی کر آؤں۔ پھر خیال آیا کہ بیگم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ بانو آپا کا ساتھ دے گی۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے داستان سرائے پہنچے۔ مجی خدمت گزار جواں سال ریاض ہمیں جلدی سے اشفاق صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس مجی خدمت گزار اور اس کے بھائی اعجاز کو ہمیشہ فرض شناس چابک دستی سے صاحب کی خدمت کرتے دیکھا۔ اشفاق صاحب ہمیشہ انہیں بیٹا یا پتر کہتے اور وہ انہیں ابو۔ ویسے بھی جس گھر کا ایک منچلا خدا ترس صوفی عالم ابو ہو اور جس گھر کی مالکن ایک درویش صفت عجز وانکساری کی پیکر آپا ہو تو اس سرائے کا والا ہر جمادونبات اور ذی روح کھلی بانہوں اور بے شکن جبیں سے اپنے آرام کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے آرام کا سوچے گا اور اس دنیادار فقیر کے تو انداز ہی نرالے تھے۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ آنے والے کی آؤ بھگت ایسے نہ ہو ہو جیسے وہ ہی خاص الخاص ہے۔ رنگ برنگے مشروبات، میٹھے لذیذ پکوان اور رسیلے موسمی پھلوں سے لدی پھندی ٹرالی کے ساتھ ساتھ کمرے میں آ موجود ہوتی۔ قسم قسم کی جڑی بوٹیوں سے بنے ہشاش بشاش کر دینے والے قہوے سرائے کا خاصہ ہیں۔

لبلبہ کے جاں لیوا کینسر نے اشفاق صاحب کے منہ کا ذائقہ بدل کے رکھ دیا تھا۔ ابتدائے مرض میں انہیں بھوک تو لگتی تھی مگر کھانا بمشکل نیچے اُترتا تھا۔ آخری ایام میں تو بھوک بھی مرگئی تھی اور جسم آدھا رہ گیا تھا۔ ایک روز میں شام کے وقت گیا تو نہا دھو کر صاف شفاف لباس زیب تن کیے لیٹے تھے۔ فرمانے لگے آج میں نے نہانے کے بعد اپنے کو دیکھا تو یہ تو بہت چھوٹا چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ آپ کی خوش خوراکی دیدنی تھی۔ نہایت انہماک سے دیسی مرغی کے شوربے میں گرما گرم روٹی کے لقمے ڈبو ڈبو کر آپ کو کھاتے دیکھ کر میں خوب محظوظ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کا گزارہ بمشکل دودھ اور دودھ دہی اور شربت پر تھا۔

اس انتہا درجے کی جسمانی کمزوری کے باوجود آپ کا ذہن آخری لمحے تک چاق و چوبند رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آپ کی دلچسپ، مفصل اور پُر مقصد تمہید باقی نہ رہی۔ اب آپ چند جامع اور کھرے جملوں میں بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کا حل بتا دیتے تھے۔ وصال سے آٹھ دس روز پہلے میں نے اس بوستانِ علم و ہدایت سے جب دریافت کیا کہ کیا علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی تصوف کے فلسفۂ بے خودی سے ہم آہنگ ہے۔ تو فرمایا ''بیٹا! اصل میں اقبال کی خودی وحدت الوجود ہمہ اوست والی بات ہے۔''

سلسلۂ شفا سے متعلق کئی ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھ، جوگی، عامل اور فنکار اس عالم صوفی کے درد کا کچھ مداوا کرنے پہنچے لیکن صدی سے کچھ اُوپر اُلفت و محبت کے اس مبلغ کی شگفتہ تحریر اور گفتگو کا اثر تو انہوں نے شاید بہت زیادہ نہ لیا تھا مگر وہ سر ضرور دھنتے رہے تھے۔ آپ کو اور بانو آپا کو خوب علم تھا کہ شفا ان نعمتوں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ خود بانٹتا ہے۔ یہ کبھی اُونچے اونچے دمکتے چمکتے صنعتی ہسپتالوں کے سوداگروں کے ذریعے اور کبھی کسی طبیب کی دقیانوسی بے دام دوا میں پائی جاتی ہے۔

آپ پیدائشی طالب علم تھے۔ خوب جانتے تھے کہ اصل عالم ہمیشہ طالب علم رہتا ہے۔ وصال سے تقریباً سال پہلے آپ کی ملاقات سلسلہ نقشبندیہ کے روحانی پیشوا آغا جی سے ہوئی۔ دونوں کی یہ کوشش رہتی کہ وہ دوسرے کو ہی بات کرنے دیں۔ ایک دن تو اشفاق صاحب کہہ ہی اُٹھے ''آغا جی! لوگ میری باتیں سننے آتے ہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ جب آپ تشریف لائیں تو میں چپ ہو کر آپ کی باتیں سنتا رہوں۔'' ہم وہ خوش قسمت ہیں جنہوں نے کئی بار ان سب اور نفع بخش محفلوں کے مزے لوٹے۔

تشخیص مرض اور ایک پیچیدہ اور میجر سرجری کے کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک دن آغا جی اشفاق صاحب سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود حکمت میں انسان کی بنیادی ضروریات انسان کو فری مہیا کر رکھی ہیں مثلاً آکسیجن کے لیے انسان کو کسی کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑتا۔ یہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے، جب چاہتا ہے فری مہیا کر دیتا ہے۔ یہ مہنگے داموں مہنگی درسگاہوں سے خریدی نہیں جا سکتی اور یہی حال شفا کا ہے۔ اللہ یہ نعمت بھی خود بانٹتا ہے۔ یہ جنس تجارت نہیں۔ اشفاق صاحب چونک اٹھے اور ماتھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ''یہ آکسیجن والی بات تو مجھے پتا تھی مگر یہ ہدایت اور شفا والی بات اب سمجھ میں آئی۔''

آپ منہ کا ذائقہ بحال کرنے کے واسطے جوارش کمونی اور جوارش تمر ہندی کا استعمال کرتے۔ درد کو دُور کرنے کے لیے ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی کی ملی جلی گولیاں لیتے۔ حب طلائی کا استعمال بھی خوب کیا کہ یہ مقوی قلب ہے اور آغا جی کی بھیجی ان گولیوں کی خوب حفاظت کرتے۔ یہ مسور کے دانوں سے آدھی بلکہ اس سے بھی کہیں چھوٹی گولیاں تھیں جن کی تیاری میں آٹھ ماہ سے اُوپر کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آپ انہیں شرارت سے پھدکتی بے قرار گولیاں کہہ کر یاد کرتے۔ جسمانی کمزوری آپ کو بہت زچ کیے دیتی تھی مگر میں نے آپ کو کبھی گھبرایا ہوا نہ پایا۔ تقویت حاصل کرنے کے لیے آپ باقاعدگی سے وٹامن لیتے اور کئی بار ہم انہیں طاقت و توانائی کی ڈرپ دیتے۔ آپ سب معالجین کے مشورے بغور سنتے اور پھر اپنی طبیعت، مزاج اور ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے۔ مگر جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر کاربند رہتے۔

ایک روز سائرہ ہسپتال میں اُوپر پرائیویٹ کمرے میں آپ ریگولر معائنے کے بعد پروٹین اور ... ڈرپ لگوا رہے تھے۔ فزیشن ڈاکٹر فواد صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ کی دل سے متعلقہ ادویات میں کچھ ردوبدل ... ہے۔ کہنے لگے یہ دل کی دوائیوں والا نسخہ پروفیسر ڈاکٹر زبیر صاحب ہارٹ سپیشلسٹ کا ہے۔ ان کے مشورے ... اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میں نے جلدی جلدی زبیر صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ حسب وعدہ ایک آدھ گھنٹے ... سائرہ ہسپتال پہنچ گئے۔ ساری بات سنی اور ہنس کے کہنے لگے خاں صاحب یہ نسخہ تو میں نے آپ کو چھ سات سال ... دیا تھا۔ اشفاق صاحب نے کہا "جی ہاں! لیکن ان دوائیوں سے مجھے فائدہ ہے اس لیے میں اس وقت سے ... روزانہ لے رہا ہوں۔"

اُس دن بیگم اور میں صبح آٹھ بجے سے کچھ پہلے آپ کے کمرے میں پہنچے۔ تین دیواروں پر نہایت ... سے سجی ایک جیسے خاکی کاغذ میں لپٹی ایک جیسی سیاہی اور ایک ہی قلم سے مارک شدہ کتابیں آراستہ تھیں۔ جب ... نے اپنی بیگم کو اشفاق صاحب سے ملوایا تو وہ اتنی محنت اور باریک بینی سے محفوظ شدہ اس خزانے کو دیکھ کر خاموش ... کہہ اُٹھی کہ واہ کتنے سلیقہ اور شائستگی سے یہ کام کیا گیا ہے۔ اشفاق صاحب نے اسے بتایا کہ یہ کام انہوں نے ... سے کیا ہے۔ سیمنٹ کے تھیلوں کو صاف کر کے ان سے یہ کتاب پوش بنائے ہیں اور بازار سے کافی سارے ایک ... لیے تھے کہ تحریر بھی مماثل رہے۔

اس کمرے میں سامنے میز کرسی اور آپ کا قلمدان آراستہ تھا۔ دو اطراف صوفے اور ایک جانب ... کے لیے گدا پڑا تھا۔ اشفاق صاحب کا بستر ان کتابوں کے زیر سایہ مغرب کی جانب لگا تھا' جس کی پائنتی کی طرف ... چسپاں خسرو کا ایک شعر دریائے محبت کی اُلٹی روشوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ آپ سفید کُرتا پہنے اور سفید چادر اوڑھے ... فرما رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے "عاطف میاں! رات تکلیف ذرا زیادہ ہوگئی اور تمہاری آپا کو بہت ... آپ کو پیٹ میں شدید درد تھی اور پسینے اتنے چھوٹ رہے تھے کہ آپ کے کپڑے شرابور تھے۔ آپ کا جسم ٹھنڈا ... کے کسی بھی حصہ میں کوئی بھی نبض محسوس نہ ہو رہی تھی۔ مگر آپ بقائم ہوش وحواس گفتگو کر رہے تھے۔ گرمی ... ہوئے آپ نے بانو آپا سے کہا کہ اے سی چلا دو۔ پھر چند منٹ بعد پنکھا بند کر دینے کو کہا۔ میں نے بہتر جانا ... ہسپتال شفٹ کروں۔

سائرہ ہسپتال فون کر کے میں نے ایمبولینس منگوائی اور خود درد کا ٹیکہ لینے داستان سرائے سے ... غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری بیگم سے کہا "آج ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں کیوں اتنی جلدی پڑ گئی ہے ... سے ناشتہ کر کے نہا دھو کے ہسپتال چلتے۔" پانچ آٹھ منٹ میں ایمبولینس بھی پہنچ گئی اور میں ٹیکہ بھی لے آیا۔ آپ ... بازو خود میری طرف بڑھایا اور قمیض کا بازو اُوپر کرنے لگے۔ اس اثنا میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے اثیر احمد ... میں ٹائی پکڑے کمرے میں آ گئے۔ وہ اپنے بینک جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

درد کا ٹیکہ لگنے کے بعد آپ کے دونوں محبتی خدمت گزاروں نے آپ کو ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا اور ... کے عملے کے ساتھ آپ کو اُٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایمبولینس کچھ تو ویسے ہی اُونچی تھی اور کچھ اس کی سیڑھی ...

۔ اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دشوار تھا۔ ساتھ ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا اس میں چلے
گلی سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب کو دراز کیا۔ اب وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر
طرف سے انہیں سہارا دیا۔ پھر بانو آپا نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کے پیچھے
انہیں تھام لیا۔ ہم داستان سرائے سے ماڈل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کچھ دائیں جانب کو

آخری مہینوں میں انتہائی نقاہت کے باوجود آپ نے مطالعہ کی عادت ترک نہ کی تھی۔ ''طلسم ہوشربا'' پڑھنے
تھی مگر ہلکے پھلکے رسالے پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں ''ریڈرز ڈائجسٹ'' پڑھتے میں نے انہیں کئی بار دیکھا۔
تھے کہ اس میں کہانی مختصر ہوتی ہے۔ میں ایک آدھ نشست میں پڑھ لیتا ہوں۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے
اور بین الاقوامی حالات پر گہری نگاہ رکھتے۔

جب حکومت نے ''پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگوایا گیا تو اشفاق صاحب نے اس سوچ پر سخت ناپسندیدگی اور
اظہار کیا۔ فرماتے تھے ''اس طرح تو میں نعرہ لگاؤں پہلے لاہور یا پہلے ماڈل ٹاؤن۔ یہ ایک غلط اور منفی سوچ ہے۔
میر صادق والی سوچ ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے سانجھے دشمن کے ساتھ مل کے اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں
گروہ اور دشمن بھی ایسا کہ جس کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قرآن میں فیصلہ صادر فرما دیا ہو کہ وہ تمہارا خیر خواہ اور
ہو سکتا۔''

دنیائے اسلام کے حالات دیکھ کر اشفاق صاحب دل ہی دل میں بہت کڑھتے تھے۔ عراق، فلسطین اور کشمیر و
کے دن شہید کر دیئے جانے والوں کا حساب کر کے مجھے گنواتے کہ آج اتنے مسلمان شہید ہوئے اور آج
سے ملاقات کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ہلاکت خیز اور آفت انگیز حالات سے مسلمانوں کا نکلنا صرف اسی
ہے کہ انہیں ایک عاقبت اندیش، باوقار اور پُر نور رہنما مل جائے۔ وہ ہر ملاقات میں آغا جی سے پوچھتے عالم
کب ہوگی؟ امام مہدی کا ظہور کب ہوگا؟

وصال سے ہفتہ دس دن پہلے آپ کی آغا جی سے آخری ملاقات ہوئی۔ اشفاق صاحب نے نہایت رنج و
سے پوچھا ''دیکھیں آغا جی! اب تو اسرائیل اور امریکہ شام میں بھی گھسنے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' آغا جی ہنس
نے لگے ''شام پر حملے کا تو ہمیں انتظار ہے۔ شام میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں۔ جب آنحضرت ﷺ
کے مطابق شام پر حملہ ہوگا تو یہ چالیس ابدال اکٹھے ہو کر اللہ سے فریاد کریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ
کا نجات دہندہ بھیجے گا۔'' اشفاق صاحب تسلی میں آ گئے اور سر تکیے پر رکھ کے مطمئن ہو کر لیٹ گئے۔

ہسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے آپ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پہ آپ کو
رکھا اور بانو آپا نے بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے گال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سائرہ
کی طرف مڑے تو اشفاق صاحب کا بایاں ہاتھ آپا کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپا کو گمان گزرا کہ آخری سفر
چکا۔

یہ گمان اور خیال بھی خوب ہوتے ہیں۔ اشفاق صاحب ایک بار کہنے لگے یہ خیالات بھی بڑی بے
زور شے ہیں۔ انہیں لگام دینا بڑا مشکل فعل ہے۔ میں نے ہاں میں ہاں ملائی کہ ہاں جی یہ سوچیں ہی ہمیشہ مروا تی ہیں
پوچھا کیا ہمارے خیالات اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہیں؟ ذرا تنک مزاجی سے جواب آیا ''چھوڑو جی! اس کے کنٹرول
اس کے اپنے خیالات بھی نہیں ہیں۔''

بانو آپا اور اشفاق صاحب کی جوڑی بھی کمال جوڑی تھی۔ ان کا آپس کا پیار محبت اور ادب ولحاظ
نہیں مثالی بھی تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ان میں کون طالب ہے اور کون مطلوب۔ کبھی بانو آپا انہیں ایک پل کو
سے انکاری نظر آتیں اور کبھی اشفاق صاحب کو میں یہ کہتے سنتا کہ کیا کمال کی خاتون ہے۔ اور آپا کے ناول ''راجہ
تعریف میں تو میں نے اکثر سنا کہ آپ اسے اردو ادب کا ایک نہایت ہی زوردار ناول گردانتے۔

اشفاق صاحب سناتے تھے کہ ایک بار وہ اپنے بابا جی سے بحث میں اُلجھ گئے۔ کہتے تھے کہ میں ان
سوال جواب کرتا تھا۔ بابا جی ان کو سمجھا رہے تھے کہ دنیا میں کوئی چیز ساکت نہیں۔ یہ سورج، چاند ستارے سب
محور میں گھوم رہے ہیں اور اشفاق صاحب بضد تھے کہ جدید سائنس کی رُو سے سورج ساکت ہے اور زمین اس
ہے۔ بابا جی نے آخر کہا اشفاق میاں! صرف مطلوب ساکت ہوتا ہے۔ سب طالب اس کے گرد گھومتے ہیں
صاحب کہتے تھے میں جدید دنیا کا رہنے والا پڑھا لکھا انسان تھا، جو سائنس کی ترقی سے بھی خوب واقفیت رکھتا تھا
بابا جی کی یہ دلیل جو انہوں نے قرآن اور تصوف کی روشنی میں دی تھی، قبول تو نہ کی مگر طالب اور مطلوب کی نسبت
بہت پسند آیا۔ کہتے ہیں گھر پہنچا تو ایک جدید سائنسی جریدہ کے سرورق پر درج تھا کہ سائنس نے یہ راز پالیا
ساکت نہیں اور ہر لمحہ گردش میں ہے۔

ساڑھے آٹھ سے تھوڑا اوپر ہم سائرہ ہسپتال پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بمشکل ویل چیئر پر بٹھایا
میں پہنچا دیا۔ بانو آپا ساتھ تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے آفس میں تشریف رکھیں
اشفاق صاحب کی طرف دیکھا وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور
کہا۔ پھر دوبارہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے وہ میری بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر فواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی۔ سکرین پر ایک
سندیسہ دے رہی تھی کہ طالب نے مطلوب کو پالیا ہے اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے
سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوفِ رقیباں عاشق دراز ہو۔ کوئی شکن چہرے پر نہ تھی۔
اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اٹل تجربہ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں

اور اشفاق صاحب نے تو ایک عمر اولیائے کرام کے درمیان گزاری تھی۔ مجھ سے کئی بار فرمایا
اُلجھنوں کا حل کبھی کسی صوفی اور کبھی کسی درویش بابا کے چرنوں میں بیٹھ کر ملا۔ صوفیائے کرام کے عرس
کے قصے اکثر سناتے اور وہاں سے فیض حاصل ہونے کا اعتراف کرتے۔ ایک روز فرمانے لگے ''عاطف میاں
تھیوری ہے۔ جو تھیوری کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان حاکم رہے

یں اور مسلمان ملتے ہیں، سوائے سپین کے۔ باوجودیکہ سپین پر مسلمانوں نے آٹھ صدیاں حکومت کی، آج وہاں کوئی لینے والا نہیں۔ حالانکہ علم وادب اور سائنسی ترقی کے حساب سے سپین ایک بہت ترقی یافتہ سوسائٹی تھی اور جدید دنیا یں استوار کرنے میں سپین کے مسلمانوں کی خدمات بے مثل اور دیرپا تھیں۔" میں نے کہا یہ تو سچ ہے۔ کہنے لگے ے مسلمانوں کے نام ونشان ملیامیٹ ہو جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سائنسی ترقی وتمدن میں کسی سے پیچھے تھے بلکہ یہ یں کوئی صوفی کوئی پیر کوئی ولی کوئی بابا کبھی پیدا نہ ہوا اور نہ ہی وہاں رہا بسا۔"

اشفاق صاحب معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے ضمن میں بابوں اور درویشوں کی انمول خدمات کا ذکر اکثر مجھ تے۔ وہ زمانہ شناس صوفی تھے۔ دورِ حاضر کی ضروریات سے آگاہ اور درویشی اور تصوف کی حقیقتوں سے بہرہ مند۔ تے تھے کہ اسلام دشمن عناصر نے مسلمان کو قابو کرنے کے لیے اس انسان دوست مذہب کی بنیادوں پر پچھلی کئی سے کاری ضربیں لگائی ہیں اور اس واسطے خانقاہوں اور روحانی پیشواؤں کو خصوصی طور پر نشانہ ہی نہیں بنایا بلکہ کئی تے دو غلے امام اور ڈبہ پیر کھڑے کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جعلی نبی بھی بنا کر پیش کر دیئے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔ جب انگریز اس ملک میں آئے تو 1860ء تک انہوں نے ایک کمیشن بٹھایا کہ کس طرح مسلمانوں کو قابو کیا جا سکتا ہے اور اس کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ اس کا ین طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی روحانی خانقاہوں کو نشانہ بنایا جائے۔ کہتے تھے دیکھو یہ چال اس قدر کامیاب رہی ہے کہ ں نے "خلیفہ"، "مولوی"، "پیر" اور "مرشد" جیسے پاکیزہ القاب کے معنی تک بدل کے رکھ دیئے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی گفتگو اور تحریر میں تصوف اور روحانیت کے ٹھوس اور پُر حقیقت بنیادی پیغامات اور اسباق کو آسان فہم کہانی کے ے ڈھا کر ماڈرن طریقہ پر پیش کرتے تھے۔

ذکر اور مراقبہ پر ایک روز گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے صرف مرشد ہی انسان کو ذکر منتقل کر سکتا ہے اور اس کے دل کو ذکر بنا سکتا ہے اور ہمہ تن مراقبہ کے لیے تصورِ شیخ لازمی ہے۔ میں نے فوراً پوچھا تو آپ نے "زاویہ" میں مراقبے پر پروگرام کے دوران یہ بات کیوں چھپا کر بیان کی اور مرشد کا ذکر تک نہ کیا۔ آپ سوچ میں پڑ گئے اور چند لمحوں بعد فرمانے لگے ہاں اب جب اللہ نے موقع دیا تو یہ بات بھی صاف لوگوں تک پہنچاؤں گا۔"

مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اشفاق صاحب کے وصال کی خبر بانو آپا تک پہنچا سکوں۔ میں اثیر احمد صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بینک کی کنجیاں دفتر پہنچا کر نو بجے کے قریب ہسپتال پہنچے اور انہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کو یہ خبر دی۔

نہ کوئی زلزلہ آیا اور نہ کوئی طوفان ہی اُٹھا۔ نہایت تحمل و بردباری سے وہ شفقت و ممتا اور پیار و محبت کی دیوی، جیسی اللہ سبحانہ تعالیٰ صدیوں میں کوئی ایک ہی بنا کر اس جہانِ فانی میں کریمانہ بھیجتا ہے، اپنے صاف وشفاف سفید لبادے میں سائرہ ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوئی۔ آپ نے اپنے طالب و مطلوب کی جانب ایک نگاہِ مشفقانہ ڈالی، جو بے سفید چادر میں لپٹا احساسات کے عالم غیب میں رونق افروز ہو چکا تھا۔ نہ کوئی شکوہ ہوا نہ کوئی شکایت۔ نہ زبان نے دی نہ آنکھ میں آنسو آیا۔ وہ خاموشی سے اس پاکیزہ جسد خاکی کے پاس آئیں اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے پاؤں تھام کر اسے چند لمحے تکتی رہیں۔ لبوں نے جنبش کی اور آپ نے ان قدموں کا بوسہ لیا اور پھر ان قدموں کو اپنی

آنکھوں سے لگالیا اور ساتھ پڑی ہوئی کرسی کے دامن میں اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔

خسرو دریا پریم کا اُلٹی واہ کی دھار
جو اُبھرا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار

''ناں ناں..... ڈاکٹر عاطف آ گئے ہیں تم بینک جاؤ۔ تمہارے پاس لاکر کی چابیاں ہیں تمہیں لیٹ نہیں ہونا چاہیے۔''

اشیر خاں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہر بیماری میں ہمارے ساتھ ہسپتالوں میں رہا لیکن ساتھ ہی اُس نے خاں صاحب کی بات کبھی کاٹی نہ تھی۔ اشیر کی کار اور ڈاکٹر عاطف کی کار پھاٹک سے نکلتے ہی ایک دائیں اور ایک بائیں مڑ گئیں۔

خاں صاحب راضی برضا بندے کی طرح مطمئن سیٹ سے کمر لگائے بیٹھے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر اُن کے کلے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اُن کی آواز گو دھیمی تھی لیکن نہ اُن کے حواس پراگندہ ہوئے نہ اُنہوں نے اپنے سے بچھڑنے ہی کا احساس دلایا۔

چھ ستمبر کی رات اُن کے صبر کی تصویر تھی۔ اُن کے درد کا یہ عالم تھا کہ بار بار چہرہ اس درد کا شاکی ہو جاتا میں اسی درد کے باعث خوف اور پریشانی لکھی تھی لیکن برداشت کا یہ عالم تھا کہ کسی حرکت' آواز اور اشارے سے انداز کی حالت کا اظہار نہ کیا۔

پاسپورٹ بن چکا تھا
ویزہ لگ چکا تھا
ٹکٹ' بیگیج چیک ہو چکا تھا۔

اُنہیں شاید سیٹ نمبر بھی معلوم تھا' لیکن اُنہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر اُن کا سر ڈھلک گیا۔ وہ اپنے بے جان ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپاتے رہے..... وہ اپنے گھر جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔

داستان سرائے سے سائرہ ہسپتال تک کا راستہ دُور نہ تھا۔ راستے میں درخت' پرندے' سڑک سب الوداع کہہ رہے تھے۔ جونہی کار رکی وہیل چیئر پر اُنہیں بٹھایا گیا..... میں اُن کے ساتھ تھی۔ پھر سسٹر مجھے ڈاکٹر کے حکم کے مطابق ڈاکٹر کے دفتر میں لے گئی۔

''آپ پلیز یہاں بیٹھیں..... ہم اُنہیں آکسیجن لگانے لگے ہیں۔''

اس وقت میں نے دو رکعت نفل پڑھے..... خاں صاحب کہتے تھے جب بھی کوئی لمبے سفر پر روانہ ہو تو شکرانے کے دو نفل ضرور گزارنے چاہئیں کہ اللہ میاں کا مال واپس کرتے وقت نہ جھگڑا ہو نہ تقاضا' نہ ندامت ہو نہ پچھتاوا۔ حقدار کے سپرد کرنے کے بعد کسی قسم کا ملال نہ ہونا چاہیے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنی والدہ کی رخصتی کے وقت پڑھے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنے بھائی کے جانے کے وقت پڑھے تھے۔

علیم مطلق جانتا ہے کب اور کس وقت کس کی روانگی موزوں، برحق اور پردہ پوش ہے۔
دفتر میں سسٹر طاہرہ اندر آئی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے گئی۔
وہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں موندے ہوئے لیٹے تھے۔ اُن کی ڈرپ ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ انیس اور اثیر اُن کی پٹی کھڑے تھے۔ نہ جانے کب اور کیسے ڈاکٹر صاحب نے انہیں راستوں ہی سے بلا لیا تھا۔ مجھے خاں صاحب کی حاشیہ سے چھٹی مل گئی تھی۔ اُنہوں نے مجھے برطرف کر دیا تھا اور کوئی سفارشی خط بھی لکھ کر نہیں دیا تھا کہ میں کسی اور جگہ اسامی کھلتی۔

یوں لگتا تھا واپسی کے جہاز میں وہ اس وقت اپنی سیٹ بیلٹ باندھ رہے تھے۔ لاہور کا منظر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہرے ہرے قطعوں اور بے مصرف سوئی ہوئی سڑکوں سے اُوپر جا رہا تھا۔ پچھلے منظر دُھندلا رہے تھے۔
ایئر ہوسٹس نے بڑی توجہ سے پوچھا ہوگا ''اشفاق صاحب شرابِ طہورہ کہ کوئی زمینی مشروب؟''
اشفاق صاحب نے اپنی براؤن آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی پلکیں گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ Eye cont سے گھبراتی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے متعلق خاں صاحب نے سنا تھا کہ وہ خیموں میں مستور ہیں۔ اُن کو نہ کسی جن نے ہاتھ لگایا نہ کسی انسان نے ہی۔
شاید اُنہیں اس شہر اس کے رہنے والوں سے بچھڑنے کا اتنا غم نہ تھا جس قدر گھر جانے کی خوشی تھی!

کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے گھر کو جائیں گے
کب روئیں گے اور گائیں گے
کب چین کی بنسی باجے گی
ہم اپنا گیت سنائیں گے
ہم اپنا گیت سنائیں گے
کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے در کو جائیں گے؟

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ گیلی مٹی سے بنی کی پٹڑی بمشکل تمام چھ انچ اُونچی تھی۔ کار سے نکلنے اور پٹڑی پر پاؤں دھرنے میں کچھ ایسی ناہمواری تھی یا جسم غیر متوازن ہو گیا تھا کہ ذرا سا پاؤں رپٹا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔
اسے ہی غالباً یہ تھا کال کہتے ہیں کہ ہونی اپنے حملے کے صرف بہانے ڈھونڈتی ہے۔ ذرا سی چوک ہو اور وار کر لے..... شاید اسی کے لیے بابے کہتے ہیں کہ ہونی ٹلا نہیں کرتی۔ اُسے چاہے راکھی باندھو بھلے رادھا بناؤ۔ وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی چھوٹی چوکی بھرتی ہے۔ ادھر کوئی چوکا اُدھر اُس نے اپنا وار کیا۔

ہونی کو ٹالنے والی ایک تو آیت الکرسی تیر بہدف ہوا کرتی ہے' دوسرے کسی چاہنے والے کی دُعا۔۔۔شہ صاحب کہا کرتے تھے کچھ صاحب دُعا ایسے بابرکت ہوتے ہیں کہ اُن کی خیر خواہی کی خواہش ہی کن فیکون بن جاتی ہے اِدھر انہوں نے wish کیا اُدھر willing کا معجزہ ہو گیا۔

میری والدہ بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا سارا اسلام آیت الکرسی ہے..... میں نے ساری بیوگی اسی کے سہارے کاٹی۔ اپنے بچوں کو اسی کے سپرد کر کے نوکری کی۔ دورے کیے' اکیلی ریسٹ ہاؤسز میں رہی۔ اسی کا جپ کرتی میں رات کو بارہ بارہ بجے زمینوں پر اکیلی پہنچ جاتی تھی۔ لاہور والی بس مجھے پکی سڑک پر اُتارتی۔ میں چ فاصلہ اسی آیت الکرسی کے سہارے چلتی۔ راستے میں گیدڑ' بھگیاڑ' سانپ سنپولیے' جنگلی بلے' بھولے بھٹکے مسافر کبھی راہ چلتے دیوانے راہ پر ملتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ کبھی کسی نے نہ اُن پر حملہ کیا نہ قریب آنے کی جرأت کی.....سب آیت الکرسی کی بدولت۔

غالباً اُس روز نہ تو کسی چاہنے والے نے اُن کے لیے دعا کی تھی نہ ہمارے گھر میں کوئی آیت الکرسی کا موجود تھا۔ بس خاں صاحب ذرا سے ڈولے اور پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہڈی ٹوٹنے کے بعد وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں دبائے بڑے صبر سے اندر چلے آئے۔ بس ایک بار وہ خاموشی سے آدھی رات کو اٹھے۔ زیرو کے روشن بلب کی روشنی ذرا سا لڑکھڑا کر غسلخانے کی طرف گئے۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے اُنہوں نے دیوار سے لٹکے ریک پر سے کوئی دوا نکالی جیسے کوئی سلیپنگ پل چلا.....فلش چلنے کی آواز نہ آئی۔ میں نے پڑتا لگایا کہ غالباً اُنہوں نے گولی نگلی اور ذرا سا ڈولتے ہوئے واپس آئے.....نیند کی گولی نے اثر دکھایا۔ صبح قریب تھی جب وہ گھوک سو گئے۔

خاں صاحب چپکے چپکے اپنا علاج کرنے کے عادی تھے۔ وہ کسی ڈاکٹر کو بھی اپنا پورا حال سمجھاتے ہوئے رہتے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ خاں صاحب ذاتی سطح پر بڑی Privacy کے قائل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں' ننھی منی خوشیاں' سسکنے والی خواہشیں' بار بار اُبھرنے والی نارسائیاں' پچھداڑو لٹکنے والے پراندے کی طرح لٹکنے والے غم سب کو اپنے صبر کے اخوان پوش سے ڈھانپے رکھتے۔

وہ اُن کے بھائی' بہن' بچپن کی باتیں دیہات میں گزرے ہوئے واقعات' اُن دنوں کی ملاقاتوں کا ذکر سی تفصیل کے فرق سے یوں بیان کرتے ہیں گویا بیت المال سے رقم لے رہے ہوں۔ ان واقعات کے بیان میں نہیں کوئی شرمندگی نہیں۔ ڈھکا چھپا فخر' حیرت افزا یادیں جو ایک ہی پنڈورا بکس سے نکلتی ہیں۔ یہ ایک خزانہ عامرہ ہے سے سب بھائی بہن بلاتکلف فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سب یادیں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سن لیں آپ کو لگے کہ یہ واقعہ اُسی کی میراث ہے۔

خاں صاحب جب بھی ان یادوں کا پٹارا کھولتے' قلم اور کاغذ پر کہانی کے رُوپ میں ڈرامہ کی صورت یا شکل میں وہ اپنے سننے والے' پڑھنے والے' ناظرین تک بخوبی پہنچ جاتے بلکہ ان کہانیوں سے ''گڈریا'' جیسی کہانی لیتیں' ڈرامہ ''قرۃ العین'' وجود میں آتا۔ ''زاویہ'' کی شہرت دُور دُور تک پہنچ پائی لیکن یہ دُور مارکا رتوس اور تھے۔

سرنگیں تھیں، جو اُن کے اپنے اندر پھیلی تھیں اور زمین دوز تھیں۔ ان میں سے جب کوئی سرنگ پھٹتی تو خاں صاحب
جاتے، گر پڑتے ہڈی ٹوٹ جاتی' آپریشن کرانا پڑتا۔ گھٹنے تک ٹانگ پلستر میں چلی جاتی، لیکن وہ اس اندرونی بھول
پر کسی کو نہ چلنے دیتے۔

خاں صاحب میں شادی کے بعد ایک واضح فرق آ چکا تھا۔ شادی سے پہلے جب تک میں دوری پر تھی وہ اپنی
مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لمحہ لمحہ کا' قطرہ قطرہ کا حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے روم سے جو خط لکھتے رہے وہ اس
کی دلیل ہیں کہ یہ عہد بے نقاب ہونے کا تھا۔ ہر منصوبہ' حرکت' سوچ' عمل' مجھ تک ٹیلی گرافک انداز میں ترسیل
کا عہد تھا۔

شادی کے بعد انہیں خیال تھا کہ بیوی زیادہ سچ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بیوی کو اللہ نے حسد کے خمیر اور شوہر کو بے
کے سوڈا بائی کارب سے گوندا ہے۔ وہ سچ جو محبوبہ کی انا کو تسکین دیتے ہیں' بیوی کی انا کو ٹھوکر لگا سکتے ہیں۔

عورت ہمیشہ مرد کی محبوبہ رہنے پر اصرار کرتی ہے اور شوہر کچھ اپنی جبلی کمزوری کے باعث کچھ کمانے اور کفالت
داریوں سے تھک کر کچھ عورت کے عمر ڈھلنے کے باعث عاشق کا رول اچھی طرح ادا کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ یہاں
بھول پڑ جاتے ہیں۔ اللہ نے مرد کو کھیتی میں بیج ڈالنے پر مامور کر رکھا ہے۔ وہ زمین ریتلی ہو' بنجر ہو' ہریاول سے لدی
ہوا سے آئے' پولن کی شکل میں بارآور کرے' مرد کی جبلت ہی خدا نے ایسی بنائی ہے۔

اگر مرد صرف خوبصورت عورت سے ہی ہم بستری کر سکتا تو شہر میں گنتی کی ماہ پارہ عورتیں ہی بچوں کو گود کھلاتیں۔
کو بیج بونے کے معاملے میں قدرت نے ایسا اندھا بنایا ہے کہ موٹی' ٹھگنی' بوڑھی' معذور حتیٰ کہ بسا اوقات دیوانی عورتیں
بھی مشیت کے مطابق اسی کم عقل' بے وفا' ہرجائی سے بارآور ہو جاتی ہیں۔ یہ آفرینش کی پلاننگ ہے کہ دھرتی پر مخلوق
بڑھتی رہے۔ وفا پر بے وفائی غالب آتی رہے۔ کھیتیاں ہری ہوتی رہیں اور باقی رہے نام اللہ کا۔

ادھر عورت ہمیشہ کسی ایک کی ہو رہنے اور کسی ایک کو اپنا کر رکھنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس خواب کا مرکز اُس کی
ذات رہتی ہے۔ اسی برس کی بڑھیا بھی اپنے حسن کے کرشمے بیان کرتے نہیں تھکتی۔ بڑھاپے میں بھی اُس کا یہ خواب
شرمندۂ تعبیر ہو نہ ہو وہ خواب دیکھنے سے نہیں چوکتی۔

محبوبہ اپنے عاشق کو کسی اور کے گھر کا چوکیدار نہیں بننے دیتی...... وہ نو بیاہتا بیوی سے لے کر بڈھی بیوہ تک اسی
طلب کی بنا پر حسد کی آگ میں جلتی ہے۔ اگر خواب پورا بھی ہو جائے تو بھی خواب اُس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ شاید اگر......
تھیں......؟ اُس کی جان نہیں چھوڑتے...... مرد کی جبلی منشائے ایزدی اور عورت کا یہ خواب ہر سطح' ہر ملک' ہر موسم میں مرد و زن
کے ڈرامے میں مختلف قسم کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اسی رسہ کشی سے رنگ کائنات قائم و دائم ہے اور رونق حیات ہے۔
ہی وفا کی طلب اور بے وفائی کی ضرورت سے مرد اور عورت کا باہمی اتصال اور مولی کیول بنتا ہے۔

یہ شاید میرا اندازہ ہے کہ شادی کے بعد وہ پردہ پوش ہوئے' قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ بچپن سے ہی خاں
صاحب اندر کی گپت غار میں سادھو صورت سمادھی لگا کر زندہ رہنے کے عادی تھے۔ اسی غار میں اُن کی جڑی بوٹیاں' من
کی کتابیں' جگہ جگہ سے تلاش کی ہوئی قلم دواتیں' بال پوائنٹ' ہائی لائٹر' مارکر' ڈائریاں' ان گنت قسم کے پیڈ' بادام' پستے

اخروٹ، لیمن ڈراپ، چوکلیٹ، کیلکولیٹر، فون، گھڑیاں.....وہ اپنی غار میں علی بابا کی طرح رہتے تھے۔ پرانی یادوں کو ڈراپ کی طرح چوسنا سیکھ لیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے کھل جا سم سم کہہ کر یہ سارا خزانہ ہتھیا لیا اور اُن کے چاہنے والوں میں جن کی وجہ سے یہ خزانہ جمع ہوا تھا، اپنی پراپرٹی بنالیا۔

پھر جن کے اظہارِ محبت کے سلسلے میں یہ مال اکٹھا ہوا، لوٹانے کی کوشش کی۔

عجیب سی بات ہے کہ میں کئی مہینے اُن کی یادوں کو مالِ مسروقہ سمجھ کر بانٹتی رہی اور غار خالی نہ ہوئی۔ اُن کی زندگی میں مَیں نے کبھی اُن کے تخلیے میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ کبھی کوئی اُن کا خط نہ پڑھا۔ اُن کے تحریر شدہ خطوں کو چوری سے پڑھنے کی جسارت نہ کی۔ اب وہی خط پڑے ہیں۔ ان سے کارٹن بھرے ہیں اور پڑھنے کی نوبت نہیں آرہی۔ وہ آتے جن کو کوئی ہاتھ لگاتا تو اُن کے اندر ''سی'' کی سی کیفیت پیدا ہوتی۔ الماریوں میں پڑھنے والے چھونے والے کی راہ تکتے ہیں لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس گونگے خاں صاحب کو بہت جلد پہچان لیا تھا۔ اس کی سمادھی، اس کی گپت گپھا کی Sanctity سمجھ لیا تھا اسی لیے ہم دونوں بڑے آنند سے بڑی سہولت اور شانتی سے ساتھ ساتھ رہے.....لڑنے جھگڑنے اور آگے جانے کے جتنے مواقع تھے ہم دونوں نے ضائع کر دیے اور ہر قیمت پر امن کا سفید جھنڈا لہرائے رکھا۔ اس میں سارا حسن سلوک اور نرمی کا مظاہرہ خاں صاحب کی شخصیت میں تھا۔ وہ کبھی مجھے اُبھارنے، اُکسانے، اشتعال دلانے کی کوشش نہ کرتے۔

مہاراجہ رام چندر کی طرح شانتی سروپ مہارانی سیتا کی جگہ سنگھاسن پر خالی رکھتے۔ اُن کی جگہ کوئی اور شوہر ہوتا تو وہ لوگوں کی عقیدت، محبت، پذیرائی کا الاؤ ایسے مزے مزے سے جلاتا اور میری ناسوں میں ایسی دھونی دیتا کہ میرے بدن میں آگ لگ جاتی اور میں ہنکارتی چلاتی واویلا مچاتی گھر گھر ٹیلی فون در ٹیلی فون اپنے خدشات، جلاپے کی داستان لے کر پہنچتی۔

لیکن وہ تو ہر تحفۂ اظہارِ عقیدت کا کمبل، چھوٹے سے روشن دیے کی طرح اپنی غار میں لے جاتے۔ ان کے چاہنے والے شہر سے دُور دراز ملکوں سے جو بھی نادر زمانہ بھیجتے وہ اس سوغات کو اللہ کی رحمت سمجھ کر نظروں سے چومتے پھر گپت غار میں اس پیانام کے دیے کو جلنے کے لیے رکھ دیتے۔

اُن کے پاس ان گنت پن، مارکر، بیٹریاں، کیلکولیٹر، ٹرانسسٹر، سلیٹ نہ جانے کیا کیا ساز و سامان اکٹھا تھا۔ لیکن یہ سامان وہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی غار میں خانہ کعبہ کے وہ پتھر سب سے اُونچے دھرے تھے جو حج سے لائے تھے جب صحن کعبہ سنگِ مرمر کا نہ بنا تھا اور جس پر عقیدت مند جھلا اپنے کفن آبِ زم زم سے دھو کر سوکھنے کے لیے بچھایا کرتے تھے۔

ان پتھروں کے آس پاس وہ خزانہ الماریوں میں، فرش پر، اندر الماریوں میں، درازوں میں پڑا تھا۔ علی بابا نے اس خزانے کو نہ دلخراشی کے لیے کھولا نہ فخر ذات کو متکبر کرنے کا باعث بنانے کے لیے استعمال کیا.....یہ سارے دیے اُن کی سمادھی کا حصہ تھے۔ وہ مان رکھنے، مان بڑھانے، عزتِ نفس بحال کرنے کے لیے یہ تحفے قبول کرتے تھے.....

آنکھیں مونده زندگی کو صرف ضرورت بھر استعمال کرنے پر قادر ہو کر ہر خوشی ہر غم کو لبیک کہتے ہوئے زندگی کو لیمن
کی طرح چوستے، اپنے مخصوص آسن میں بیٹھے رہتے۔
اُن کی عادت تھی جب کبھی وہ کسی کو قریب کرنا چاہتے اُسے اہمیت دے کر اپنے سے بڑا درجہ دینے کے
ہوتے تو اُس سے فرمائش کرتے..... منجھلے بیٹے انیس خاں کا فون آتا..... ''ابو! میں لندن جا رہا ہوں..... کچھ
بائی نون کے لیے دیکھنے.....کوئی چیز جو آپ کے لیے لاؤں۔''
اب خاں صاحب بڑے انہماک سے اُسے قلم، پن، سیاہی، مار کر اور جانے کیا کیا لکھواتے.....وہ بھی سعادت مند
بیٹے کی طرح ساری تفصیل لکھتا.....اب دونوں میں ان ہی چیزوں کے سلسلے میں کئی فون آتے جاتے۔ پھر ثویلہ کو بھی تاکید
کی جاتی کہ ''انیس خاں بھول جائے گا تم اسے یاد دلانا میں نے یہ چیزیں لکھوائی ہیں۔ کوئی چیز کم نہ ہو۔''
میں قریب بیٹھی ایک ماں کی طرح سوچتی کہ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ انیس بیٹے پر خواہ مخواہ اتنا بوجھ کیوں..... ہر
ماں کی طرح میں بھی صرف یہی سوچنے پر قادر تھی کہ بیٹے کو سوئی بھر تکلیف نہ ہو۔ میرا تخیل وہاں نہ پہنچ سکتا تھا جہاں پہنچ کر
ناز برداری اُٹھانے کی ٹریننگ دینا، بیٹے کو فرمائشوں سے نبٹنے اور اپنے کوہان پر کاٹھی ڈلوانے کا علم بھی آنا چاہئے۔ اور یہ علم
صرف باپ عطا کر سکتا ہے..... ماں کا بس چلے تو بیٹا ہمیشہ اُس کی گود میں بیٹھ کر دودھ پیے اور کبھی اپنے پاؤں پاؤں چلنا بھی
سیکھے..... اپاہج ہو جائے پر اُس سے بندھا رہے۔
واپسی پر اولیں فرصت میں انیس خاں اور ثویلہ تحفے لے کر وارد ہو جاتے۔ ابو اشفاق اُن کے بہت قریب
بیٹھ جاتے۔ اب ایک ایک پن نکال کر دیکھا جاتا۔ اُس کی قیمت کو عینک ٹھیک کر کے خاں صاحب پڑھتے۔ ثویلہ کہتی.....
''ممی ہم پہلے ہم سلفریج گئے وہاں تو یہ برانڈ تھا ہی نہیں..... ایک افریقی لڑکا سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کچھ سامان لگائے
بیٹھا تھا وہاں یہ موجود تھے۔ اس برانڈ کے پن انیس دیکھ ہی رہے تھے کہ دُور سے پولیس مین آ گیا..... ہم کو دیکھتے ہی
افریقی لڑکا سامان لے کر بھاگ گیا۔ یہ پن چھوڑ گیا..... اس پر کچھ خرچ نہیں آیا۔''
''نہیں نہیں..... ثویلہ! یہ وہ پن نہیں ہے۔ یہ تو ساؤتھ ہال والی دکان سے ملا تھا جب ہم اسما سے ملنے گئے تھے۔''
اب ثویلہ انیس ساؤتھ ہال کی باتیں سنانے لگتے اور خاں صاحب ایسی حیرت سے سنتے جیسے وہ کبھی ساؤتھ ہال
میں اسما سے ملنے ہی نہ گئے ہوں۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ لندن سے ساؤتھ ہال کیسے پہنچا کرتے تھے؟ وہاں ایشیائی
لوگوں کا رہنا سہنا کیسا ہے۔ زندگی کس نہج پر گزرتی ہے۔ وہ اپنے بولنے کی پٹاری بند کر کے کانوں کے مائیکرو فون کھول
دیتے..... خاں صاحب بڑی عاجزی سے گفتگو کرتے تھے لیکن اس ساری حیرت انگیز خوبی کی بنیادی وجہ اُن کے سننے کا عمل
تھا۔ وہ انتہائی توجہ کے ساتھ سنتے۔ ون ٹو ون گفتگو میں وہ مجسم کان بن جاتے۔ اپنی بولی بند کر کے، بغیر گلے لگائے ہاتھ
پکڑے بات کرنے والے کی تخت نشینی میں حاضر باش قسم کا رویہ اپنا کر مؤدب رہتے۔ سننے کے مقام پر وہ مجسم حیرت ہوتے
اور یہی حیرت اپنی گفتگو میں منتقل کر دیا کرتے۔
انیس خاں کے سامنے یوں ان بھول بیٹھے رہنے سے ایسا رابطہ بنتا جو کسی اور طور ممکن نہ ہو سکتا۔ اُس کے جانے
کے بعد سارے تحفے کئی بار آنکھوں سے عقیدت رنگ دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک دو چیزیں ہی استعمال کے لیے

رکھتے۔ باقی سب کسی الماری، دراز، ڈبے میں بند کر کے گپت غار کا حصہ بنا دی جاتیں۔ محبت سے یوں قریب آئے باپ بیٹے کی یہ یاد بھی لیمن ڈراپ بن جاتی جسے سادھی کے وقت وہ شانتی سے چوستے۔

ریاض محمود کو فون کرتے..... "مریں! ہنگلی ہانڈی نہیں پکتی تجھ سے..... خرچے سے نہ ڈر اللہ اور دے گا۔ ہفتے کے روز ہنگلی ہانڈی پکا کر لے آئیں۔"

ہفتے کے روز ریاض محمود جسے ہم سب شاہی باورچی کہا کرتے ہیں، ہنگلی ہانڈی سمیت حاضر ہو جاتے۔ گھر میں اس کی خوشبو پھیل جاتی۔ مجھے وہم ہوتا کہ ریاض محمود کو زحمت ہوئی ہوگی..... خاں صاحب کا خیال تھا کہ ہانڈی کے باعث سارے 121۔سی میں درک پا گیا ہے۔

ریاض میاں کی ہانڈی بھی کشمیری کھانوں کی طرح بڑی انوکھی ایجاد تھی۔ گولاش، کھٹے بینگن، شب کشمیری کھانے نصیر انور، کشور نصیر اور لالی جان نے ہمیں کھلائے تھے لیکن ہنگلی ہانڈی کی ایجاد ایک ایسے باورچی کی جو کھانا پکانا نہ جانتا تھا۔ اُسے جو کچھ بھی باورچی خانے میں مہیا ہوا، بازار سے دستیاب ہوا، اسے گوشت میں مسالہ دہی جو کچھ ملتا گیا، ریاض میاں ڈالتے گئے۔

بانو باجی دم بخود دیکھ منع کرنے کے انداز میں کچھ حوصلہ افزائی کے دستور پر چل کر ڈلواتی رہیں۔ گوشت کا سالن تیار ہو گیا جس کی ترکیب سوائے ریاض میاں کے کسی دوسرے کو معلوم نہ تھی۔ اسی صدری نسخے کے لگائے شاہی باورچی کا خطاب خاں صاحب سے لے کر اور اسے خلعت کے طور سینے پر سجا کر ریاض آتے رہے۔

یہی فرمائش یہی رسان سے بات سننے کا عمل رسی کا وہ مضبوط پل بن گیا جس کے نیچے سے زندگی کا کھلبلاتا پانی ٹکریں مارتا گزر رہا ہے لیکن دونوں ساتھ آتے رہے جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم ہوم اکنامکس کالج گئے..... یہاں لڑکیوں کو گھرداری کا علم سکھایا جاتا ہے۔ سے لے کر کھانے مینو اور چھوٹی رقم میں بڑے ورشن رہنے کا فن بھی عیاں کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں پُر امید چست خود اعتماد، کام کاج میں مستعدی سیکھ کر گھرداری کو بڑے منظم سائنسی طریق پر کرنا سیکھتی ہیں۔ تمام لڑکیوں کو بانٹ کر انہیں الگ الگ Homes الاٹ کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھار سارے گروپ مل کر کسی قابل ذکر شخص کو مدعو کر کے اُس پر اپنے علم و فن کا رعب گانٹھتی ہیں۔

ایسی ہی ایک تقریب میں خاں صاحب گئے۔ میں بھی ساتھ شامل باجہ تھی۔ تمام چیزیں بڑی نفاست اور خودنمائی کے انداز میں پیش کی گئی تھیں۔ ہم دونوں نے بحری قزاقوں کی طرح خوب رج کھایا اور درباری جی حضوری والوں کی طرح خوب دل کھول کر داد پیش کی۔ واپسی کے وقت طالب علم ایک دوسرے کے بازو کمر ہاتھ جوڑے ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اس چاند ہالے سے خاں صاحب نے کہا..... "کچھ سامانِ خورد و نوش بچا ہے کہ نہیں؟"

"جی بہت کچھ بچ گیا ہے۔"

"تو مرو ساتھ کچھ نہیں دینا..... میرا اسٹاف کیا کہے گا کن تھوڑدلیوں کے مہمان بن کر گئے تھے۔"

وہ ساری چوکڑیاں بھرتی رخصت ہو گئیں۔ اس وقت خاں صاحب نے جیب سے کارڈ نما کی ایک

...ت کی دو گولیوں سمیت منہ میں ڈالیں اور انہیں چوسنے لگے۔ وہ جب بھی دل رکھنے، خوش کرنے کے لیے بسیار نوشی
...تے اور اُن کا معدہ جواب دے جاتا تو وہ اسی طرح بعدازاں ہاضمے کے لیے کئی ٹوٹکے استعمال کرتے۔ دوائیوں کے
... کبھی چورن، آیورووید ک پڑیوں، ایلو پیتھک گولیوں، Effervescent الکاسلزر، اینوز سے لدی پھندی تھیں جن کو
...نے پوری نظر بھر کر کبھی نہ دیکھا..... وہ علاج معالجہ بہت شرماہٹ کے ساتھ کرتے تھے گویا سمجھتے ہوں کہ یہ عمل توکل سے
...ہے۔

ہرنیاں چوکڑی بھرتی ہوئی قہقہے لگاتی، تالیاں بجاتی غائب ہوگئیں..... خاں صاحب راضی کر کے راضی ہوئے
...نے پینے کا سامان جوزادِ راہ بنا کر لائے تھے، اُردو سائنس بورڈ میں اپنے سٹاف کے لیے اُتار کر گھر آ گئے۔

شاید 2002ء کا واقعہ ہے۔

مجھے .A.R.Y نے دس ہزار ڈالر انعام دیا تھا۔ یہ انعام لائف ٹائم کارکردگی کی وجہ سے ملا۔ اس میں میری
...کارکردگی کم اللہ کا فضل اور بھائی جمیل الدین عالی کی کوشش بمقدار وافر اور جج صاحبان کا حسن ظن زیادہ شامل تھا۔

میں نے ہولے ہولے چاروں کھونٹ مشاہدہ کر کے دھیرے دھیرے چھان پھٹک کے بعد ایک بات جانی ہے باقی
...تو شاید انسان مان ہی لے لیکن ایک بات پر اُس کا دل کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اُس کی کمائی ہوئی دولت اور چکاچوند کر دینے والی
...اللہ کے فضل، اُس کی دین، اُس کی مہربانی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ زبانی کلامی بلے، واقعی، کیا شک ہے کہے لیکن اندر ہی
...اس تصور سے منمناتا رہتا ہے کہ سارا کچھ اُس کی اپنی محنت کا ثمر ہے..... یہ پٹی اُسے نفس رٹاتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں بھی بظاہر منمنی سی حلیم الطبع، انکساری کی پوٹ بنی لیکن اندر اپنی کتابوں اور ڈراموں کی گنتی کرتی اپنی محنت پر
...کراچی پہنچی تھی۔ انسان میں یہ بھی وصف ہے کہ وہ قرآن کو بھی اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ رزق
...حلال کمانے کی جو اہمیت ہے اُسے جاگ لگا کر خوب خمیر اُٹھا کر اپنے نفس کو یہ باور کرا لیتا ہے کہ یہ جو گل و گلزار کھلا ہے اُس
...کے سینچنے، گودنے، کیاری کیاری خون پسینہ ایک کرنے سے وجود میں آیا ہے۔

خاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری چادر اور چاردیواری بنے ساتھ تھے..... وہ خطرے کے مقام پر آگے ہوتے
...انعام کے وقت آخری سیٹوں پر جا بیٹھتے۔

اسی قیام کے دوران ایک روز چلتے پھرتے عظمیٰ سے ملاقات ہوگئی۔

اس فنکشن پر جاتے وقت تو عظمیٰ گیلانی اور رمیض راجہ مجھے فلائٹ پر نہ ملے لیکن واپسی کے وقت ایئرپورٹ پر
...سے ملاقات ہوگئی۔ رسمی مبارکباد کے بعد رمیض راجہ بولا..... ''آپا جی! میں آپ کے گھر کرکٹ کھیلنے آیا کرتا تھا..... میں
...اثیر خاں کا دوست ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر اثیر کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ ایک بار جب
...میں نے فل ٹاس ہٹ کیا تو گیند آپ کے برآمدے میں لگی کھڑکیوں سے جا ٹکرایا..... وہ شیشہ میں نے توڑا تھا آپا جی..... گو
...سارا الزام اثیر خاں نے اپنے ذمے لیا۔''

''وہ ایسا ہی ہے رمیض میاں..... اچھا ہی ہوا تم نے مجھے بتایا نہیں ورنہ لمبا چوڑا لیکچر تمہیں بھی مل جاتا۔''

چند ثانیے وہ چپ رہا پھر بولا..... ''آپا جی! آپ نے اشیر کو فرسٹ کلاس کرکٹ میں کیوں نہ جانے دیا؟ کبھی تو آ گیا تھا۔ اگر وہ کرکٹر بن جاتا تو بڑا نام کماتا۔''

''بھائی! تمہیں علم نہیں خوف میرا بنیادی وصف ہے..... خوفزدہ لوگ بچوں کو کسی عمل یا سوچ کی آزادی نہیں دے سکتے..... خوف کو آپ محبت تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اپنی طرز کی Concern ہے..... میں اُسے کیونکر جانے دیتی۔ میں اُسے کیسے کھلے میدان، سخت Pitch کے حوالے کر دیتی۔ میں تو کرکٹ کی لال گیند کو بھی ماتھے میں لگنے والا سمجھتی تھی..... پھر میں اُسے اتنے بڑے امتحان میں کیسے جھونک دیتی؟ میرا خیال تھا کہ اس فیلڈ کے لوگ عورتوں سے بچ نہیں سکتے اور اس کھلی ڈلی زندگی میں پینا پلانا اُن کے لیے گناہ نہیں رہتا..... پھر تو ہی بتا جہاں اتنے خطرے ہوں اس جگہ میں اُسے کیسے جھونک دیتی۔ میری اتنی پسلی کہاں۔''

خاں صاحب نے کبھی اپنے بچوں کے کیریئر میں زیادہ مین میخ نہیں نکالی۔ شاید اُن کا یقین تھا کہ عزت، شہرت سب اللہ کی دین ہے۔ ہو سکتا ہے اُن کے پاس ایسی باتوں کی نہ اہمیت ہو نہ وقت..... اُن کے برعکس آج کل پہلے اپنے بیٹے کو اپنی سیٹ کے لیے تیار کرتا ہے اور پھر ریٹائر ہوتا ہے..... آرٹسٹ ترنت ہی اپنی اولاد کو بام عروج پر دیکھ کر پسپا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بھی باپ دادا کا پروفیشن نسلوں چلتا تھا لیکن تب Awareness نہ تھی اور اولاد کا سنہرے مستقبل دیکھنے کی عادت بھی والدین میں نہ در آئی تھی۔

لوہار کا بیٹا لوہار، سنار کا بیٹا سنار، بڑھئی کی اولاد ذرینہ قرب کی وجہ سے غیر محسوس طریقے سے سارا علم چوس لیتی جیسے کشمش پانی میں پڑے رہنے سے میٹھی تو نہیں رہتی لیکن بہت سا پانی چوس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ایک دن اسی فنکشن کے دوران عظمٰی گیلانی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اور خاں صاحب ''پاداشِ دوراں''، ''زر دبان عرفان'' کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ پھر اچانک عظمٰی نے کہا ''خاں صاحب! میں چلتی ہوں، بہو نے ایک فرمائش کر رکھی ہے اُسے پورا کرنا ہے۔''

''اچھا؟ تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ فرمائشیں پوری کر سکو۔ سنا ہے تم ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہی ہو کامیابی کے ساتھ۔''

کچھ دیر عظمٰی گیلانی بتاتی رہی کہ کیسے رضا میر کے بیٹے اُس کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہے تھے اور کیسے اب اُس کا زوال بھی شروع ہو چکا تھا۔

''آپ کو معلوم نہیں اشیر بھی تو میرے ساتھ ہوتے تھے Midas میں۔ سنا ہے اب وہ اسلامک انوسٹمنٹ میں چلے گئے ہیں۔''

''میں کچھ پوچھتا ہوں تو کچھ اور بتاتی ہے۔ جو ایکٹر اپنی لائنز یاد کر کے نہیں آتے اُنہیں عموماً فضول قصے بیان کرنا پڑتی ہیں۔''

اپنی خوبصورت آواز میں عظمٰی نے سوال کیا۔

''تو جی آپ کیا پوچھ رہے تھے خاں صاحب؟''
''عقل کی کوکون! میں پوچھتا ہوں کیا تو فرمائشیں پوری کرتی ہے لوگوں کی؟''
''لوگوں کی تو نہیں..... لیکن بہو کی فرمائش تو ضرور پوری کروں گی..... اُس نے مجھ سے نمکو مانگی ہے۔ یہاں کی بہت مشہور ہے خاں صاحب۔''
''اُس سے ڈرتی ہے ناں؟''
''ہاں جی کچھ کچھ۔''
''عجیب سی بات ہے آج کل ساس بہو سے ڈرتی ہے..... پہلے بہو کی جان جایا کرتی تھی ساس سے' لیکن اگر تو پہلے زمانے میں ہوتی تو بھی تو ہی خوفزدہ ہوا کرتی۔'' خاں صاحب بولے۔
''وہ کیوں جی؟''
''بھائی میرے ایک اچھے فنکار میں اگر خوف نہ ہو تو وہ اچھی طرح پرفورم نہیں کر سکتا..... کرٹن کال سے پہلے عام طور پر ایکٹروں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جایا کرتے ہیں۔ کیمرہ رولنگ کی آواز سن کر خوف سے ایکٹرسن ہو جاتے ہیں۔''
''سچی خاں صاحب! ''زربان عرفاں'' میں جب فاروق ضمیر مجھے کندھے پر لاد کر ساہوکار کے دروازے پر لایا تو میں نے سوچا تھا کہ بھاگ جاؤں اور پھر کبھی ٹیلی ویژن سٹیشن میں قدم نہ دھروں۔''
''اچھا یہ بتا مجھ سے کبھی ڈر لگا تجھے؟''
''ریہرسل کے وقت جان جایا کرتی تھی لیکن جب taking ہوتی اور آپ آ جاتے تو پھر حوصلہ بڑھ جاتا۔ لگتا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گرو جی کچھ بگڑنے نہیں دیں گے۔''
''اچھا تو جب بہو کے لیے نمکو خریدنے جائے میرے لیے بھی چڑوے والا نمکو لانا..... بھول نہ جائیں مریں۔''
''ویں میں بھول سکتی ہوں جی۔''
انتظار حسین' عظمیٰ گیلانی اور ہم دونوں فائیو سٹار کی چوتھی منزل میں تھے۔ عموماً نیچے اُترنے سے پہلے ایک دوسرے کو فون کر لیتے۔ کھانے پر اُترتے وقت لفٹ میں ملاقات ہو جاتی۔ ایک کا مہمان آتا تو دوسرے کو علم ہو جاتا کیونکہ ٹیلی ویژن کے حوالے سے قریباً سارے مہمان سانجھے تھے۔
اسی طرح عظمیٰ سے لفٹ میں ملاقات ہو گئی۔ وہ بازار سے نمکو کے تھیلے اُٹھائے اُوپر جا رہی تھی۔ ہم کھانے کے لیے نیچے جانے کے لیے سوار ہوئے تھے۔
''اُتریے اُتریے خاں صاحب! یا اپنے نمکو کمرے میں رکھ لیجئے۔'' چار نمبروں والی منزل پر ہم تینوں اُترے اور اس نے کئی تھیلے مجھے پکڑا دیئے۔
''یہ تو بہت زیادہ ہیں عظمیٰ اتنے سارے تھیلے۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔
''زیادہ کہاں ہیں کم ہیں..... ہاں بھئی بوری بازار سے بس اتنے ہی ملے؟'' خاں صاحب بولے۔
''عظمیٰ میرا بیگ اتنا بڑا نہیں کہ یہ سب اُس میں سما سکے۔'' میں بولی۔

"چلیئے میں لاہور پہنچ کر گھر پہنچا دوں گی۔"

خاں صاحب نے بڑے ندیدے انداز میں تھیلے پکڑے..... "ناں جی قدسیہ! اس کا کیا اعتبار۔ یہ گی
چلتے کو پکڑا دے گی..... یہ ایسی ہی ہے نعمتیں بانٹنے والی۔"

خاں صاحب نے لاہور پہنچ کر یہ نمکو ایک آدھ بار کھایا اور پھر اسے مہمانوں کی نذر کر دیا۔ رکھنے والی
یہ ضرور اسے بھی اپنی گپت گپھا کا حصہ بنا لیتے اور پھر بھول بھال جاتے۔

شمیم فاطمہ، خاں صاحب کے ساتھ تلقین شاہ میں کام کیا کرتی تھیں۔ "ادھ کھایا امرود" لکھنے والے
خاں کی بیگم اور انگریزی کے پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی والدہ تھیں۔ بڑی پاٹ دار آواز، بے لاگ لہجہ، بانکا
ڈھنگ..... جب بے دھڑک "تلقینیے" کہہ کر خاں صاحب سے مخاطب ہوتیں تو پروگرام کرارا ہو جاتا۔ پتہ نہیں کیوں
کہ جس قدر شہرت فضل الرحمٰن صاحب کو ملنا چاہیے تھی نہ ملی۔ "ادھ کھایا امرود" کا لکھنے والا گمنامی میں ہی مر گیا
فاطمہ کی آواز سارے پاکستان میں گونج اٹھی..... یہ اللہ کے بھید ہیں جن میں کسی کو دخل نہیں۔

شمیم فاطمہ پریم کی ڈوئی چلا کر خوب سارے میوے ڈال کر شیر خرما پکا کر لاتیں۔

اور خاں صاحب کہتے "شمیم! ہمارے ایک ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب ہیں۔ ان کی "تفسیر
تمہاری نظر سے گزری ہو۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ سویاں اور حلوہ بغیر میوے کے پکانے چاہئیں۔ یہ چیزیں کھانے
بن جاتی ہیں....." لیکن خاں صاحب کی بات سن کر بھی شمیم رکاوٹیں ڈالنے سے باز نہ آئیں اور خاں صاحب نے
کے ہاتھ کے پکے ہوئے شیر خرما کو پسند کیا۔

فون کی گھنٹی بجتی "میں شہزاد احمد بول رہا ہوں..... ذرا خاں صاحب سے فون ملا دیجئے۔" اب لمبا
ہو جاتا۔ دونوں آواگون سے لے کر وجودیت تک انسانی سوچ کی تکلف ڈوریوں کو سلجھاتے۔ شہزاد احمد کا اوڑھنا
ہے۔ وہ غیر نصابی فلسفے کی کئی کتابیں تخلیق کر چکے ہیں۔ خاں صاحب زندگی کو صوفی رنگ کی عینک پہن کر
تلے دیکھنے کے عادی تھے۔ جہاں ایک سفید کرن پوری قوسِ قزح بن جاتی ہے۔ نور کی وحدت کیسے کثرت
ہے۔ جلوہ ایک ہی ہے کبھی خوشبو بن کر پھیلتا ہے، کبھی رنگ بن کر نکھرتا ہے، کبھی کرنوں کی طرح ہر روپ کو
ہے۔ لیکن ساری گفتگو کے بعد پریم کہانی ادھوری رہتی۔

خاں صاحب کہتے "شہزاد یار! وہ تیرا تھوم کا اچار بس دو تین دن کا رہ گیا ہے۔ اس سے میرے
رہتا ہے..... پتہ نہیں بھائی میرے تو کیوں بھول جاتا ہے کہ میں انجائنا کا مریض ہوں۔"

میں نہ مصلحت سمجھتی تھی نہ دانائی۔ غلط وقت پر بیجا سچ بولنے میں راسخ..... جب فون بند ہو جاتا تو میں

"خاں جی! ابھی تو پوری بوتل اچار کی پڑی ہے۔"

وہ نہ مجھے سرزنش کرتے نہ میری دانائی یا سچ کو چیلنج کرتے۔ بس مسکرا کر کہتے "آنے دو..... آنے دیتے
ہیں ان کو آتے رہنا چاہئے..... اس جذبے سے رزق پاک ہوتا ہے۔"

میں اُن کی منطق کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن چپ ہو جاتی..... ایک بار اُنہوں نے میری موجودگی میں عطاء الحق قاسمی
"یار! ایک روز..... مجھے اچھی طرح سے تو نام یاد نہیں شاید دارا شکوہ تھا..... یا شاید کوئی اور شہزادہ..... یہ شہزادہ
سونے کی اشرفیوں سے ٹھنسے ہوئے لے کر میاں میر صاحبؒ کے آستانے پر پہنچا اور دست بستہ عرض کی حضور! اس
کی چوکھٹ پر ان گنت سوالی آیا کرتے ہیں۔ میری عرض ہے کہ یہ آپ خلق خدا میں تقسیم کر دیں..... اُن کا سوال بھی
رزق بھی پاک ہو جائے۔

میاں میر صاحبؒ ذرا سا لرزے۔ پھر دونوں ہاتھ بہ انداز انکار اُٹھا کر بولے ناں بابا ناں۔ میں چھوٹا سا جوہڑ
ہمت کا متحمل نہیں ہو سکتا..... یہ مال اسباب تم داتا گنج بخشؒ کے ہاں لے جاؤ وہ سمندر ہیں..... علی ہجویریؒ
سمندر کی طرح سب کچھ سمیٹ کر بھی اُجلے کا اُجلا رہتا ہے..... ہمیں ایسی خجالت سے معاف ہی رکھو۔"
"سنا ہے..... جونہی وہ شہزادہ والا تبار علی عثمان ہجویریؒ کی درگاہ پر پہنچا..... ایک ساعت بھی نہ گزری تھی کہ
لدے تو ڑے چوسے ہوئے آموں کی طرح خالی ہو گئے..... داتاؒ نے انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا نہ کوئی بات کی نہ
بس ترنت ہی تھیلیاں بانٹنے کا حکم دیا اور سب بھول گئے۔ اشرفیاں..... شہزادہ اور تھیلیاں..... ایک حکم کے ساتھ وہ
فارغ ہو گئے۔"

یہی کچھ خاں صاحب بھی کیا کرتے تھے..... اُن کے پاس فتوحات آتیں..... کھانے پینے کی اشیاء ترنت بانٹ
..... رکھنے والی چیزوں کو گپت غار کا حصہ بنا دیا جاتا اور باقی سب کو فوراً ہی بھلا دیا جاتا۔

افضال حیدر اُن کے ساتھ اُردو بورڈ میں کام کرتے تھے..... اُن کے گھر سے ساگ اور مکئی کی روٹیاں' رساول کی
کھیر آتی۔ ان دونوں چیزوں کا گھر والوں کو بہت انتظار رہتا۔ جب کبھی اقبال شہاب یا افضال حیدر کے گھر سے ساگ
خاں صاحب چسکے لے کر کھاتے اور کہتے..... "قدسیہ! کیا ایسا ساگ ہم نہیں پکا سکتے۔"
"مکئی کی روٹی تو چکلے بیلن پر میں پکا سکتی ہوں لیکن یہ..... ایسا ساگ مجھ سے نہیں پکتا۔"

میں خاں صاحب کی توجہ ساگ سے ہٹا کر اپنی مکئی کی روٹیوں کی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ مجھے ارمان ہوتا
چپاتی کی طرح چکلی مکئی کی روٹی صرف قدسیہ ہی پکا سکتی ہے..... مجھے کھانا پکانے کا علم بھی خاں صاحب نے ہی
جب میری شادی ہوئی تو مجھے ہاف بائل انڈا بھی بنانا نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے کڑوے کریلے' کچے آلو' اُلڈا اُلڈا ٹین
ہوئی روٹیاں' ٹھنڈی چائے' پی پی کر اُنہوں نے مجھے رام کر لیا۔ وہ کھانے میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ صرف
سے اجتناب کرتے اور میری انا کو اسی تعریف کی تلاش تھی۔

جب کبھی فتوحات میں کوئی اچھا مزیدار کھانا آتا' وہ پکانے والے سے محبت کا اظہار اس طرح کرتے کہ ساری
پوچھتے اور کچھ ایسے وضاحت سے سوال اُٹھاتے کہ میری تربیت ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے ایک بار شاہد کے گھر سے
بن کر آیا۔ انکل ظفر کے یہ بھانجے غیبی طور پر ہماری توجہ میں رہتے تھے۔

انکل سے روسٹ کی ترکیب پوچھی تو وہ صرف کھانے تک شمولیت کرتے تھے۔ ترکیبوں سے اُنہیں کوئی سروکار
بولے "قدسیہ آپا! آپ شاہد کی والدہ سے مل کر ترکیب پوچھ لیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے..... تم کسی دن اُس کے پاس جا کر طریقہ وزن پوچھ آؤ..... یہ آسان ہے۔"

میں شاہد کی امی کے پاس گئی..... ساری ترکیب کان اور کاپی کھول کر لکھی..... کئی مرتبہ روسٹ پکایا.....
بنا لیکن وہ لذت پیدا نہ ہو سکی جو شاہد کی والدہ کے ہاتھ سے روسٹ میں منتقل ہوتی تھی..... پتہ نہیں کیا بات ہے ہر عمل
شخص اپنا پریم رنگ' اپنی سائیکی' اپنا روحانی زور کیسے منتقل کر دیتا ہے..... عمارت ہو یا فنون لطیفہ' کھانا پکانا ہو
تربیت..... عمل کی حد تک پروسیس ایک ہوتا ہے لیکن نتیجہ کبھی ایک سا نہیں نکلتا..... تاش کے باون پتے انسانی جرثومے
چھبیس جینز اتنی رنگا رنگی پیدا کرتے ہیں کہ ارتقاء ختم ہونے میں نہیں آتا... کائنات ختم نہیں ہو سکتی۔

یہ سوال سائنس دان پوچھتا چلا جاتا ہے۔ نئے نئے جوابات بھی تشکیل کیے جاتا ہے لیکن صوفی ہاتھ اٹھا کر
"علموں بس کریں او یار....." علم رضا اور رغبت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے..... عمل راستہ چلنا سکھا دیتا ہے لیکن راستہ
پر منتج ہو اس کا تعین نہیں کر سکتا..... بس نیت کی درستی سے رضا اور رغبت کے ساتھ چلتے رہنے میں ہی راحت اور عافیت ہے۔

مجھے یاد ہے

ایک روز سمن آباد میں خاں صاحب اور میں پچھلے ویٹرے میں بیٹھے تھے کہ اماں جی آ گئیں۔ ان کے
الطاف ماموں بھی تشریف لائے۔ اماں جی ہمیشہ کی طرح شرمندہ شرمندہ ہنستی ہوئی بغیر استری کے ریشمی شلوار قمیض
تھیں۔ اب اماں جی ڈرتے ڈرتے اپنے بیٹے کے گھر بھی آنے لگی تھیں۔ باتوں باتوں میں خاں صاحب نے

"اماں جی کریلے کیسے پکتے ہیں؟"

اماں جی ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگیں..... "بس دو تین نمکین پانیوں سے دھو لیا۔ پھر تھوڑا سا بھون کر پانی
ساتھ ہی پیاز چھوڑ دیا۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"پانی چھوڑ دیا کریلوں میں؟"

ماما جی الطاف بولے "ناں بی بی ناں..... اشفاق بیٹا..... کریلوں کو بھونتے جاؤ..... ڈھکنا دو..... پھر
ڈھکنا دو..... پھر بھونو..... پانی وانی نہ ڈالنا۔ قدسیہ بیٹی! کریلے کڑوے ہو جائیں گے۔"

ماں بیٹے نے اپنی ترکیب پر نہ اصرار کیا نہ ترکیب دہرائی..... بس چپکے سے میرے گوش گزار کر دی
طرح سہرا کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے کریلے دھو دھو کر چٹے سفید کیے..... ڈرتے ڈرتے پانی ڈالا..... کھانے والے
ترکیب سے پکے کریلوں کی ہمیشہ تعریف کی لیکن وہ ذائقہ پیدا نہ ہو سکا جو اماں سردار بیگم کے کھانوں کی خاصیت تھا
کے قلب سے ڈوئی تک اور ڈوئی سے ہانڈی تک جو چیز منتقل ہوتی تھی' اُس کا عرفان مجھے نہ ہو سکا۔

ہم نئے نئے امیر ہوئے تھے۔ نو دولتیوں کی طرح ہمیں بھی نئی چیزوں کا شوق ہونے لگا تھا۔ میز پر
مہمان ورطہ حیرت میں چلا جاتا ہے اور اخبار سے لے کر ہر انسان تک تھوڑا یا زیادہ دوسرے لوگوں کو حیران کرتا
ہے۔ چائنیز کھانے نئے نئے رائج ہوئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ میں بھی چکن کارن سوپ' ہاٹ اینڈ ساور
وغیرہ پکاؤں لیکن دو چار مرتبہ کوشش بیکار گئی۔ دستر خوان کے طفیل لوگوں کو مرغوب کرنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔

غالباً وہی عورتیں بالآخر اچھی باورچنیں بن جاتی ہیں، جنہیں دستر خوانی تعریف من بھاتی ہے۔ مروّت لحاظ اور ...قی کے تحت لوگ پسندیدگی کا اظہار بھی کرنے لگے تھے لیکن اندر مجھے یقین تھا کہ ابھی ناپختہ ہے۔ پھر ایک کورس کا ...خبار میں چھپا۔ یہ کورس چینی پکوانوں کی سکھلائی کا تھا اور غالباً اس کی سپانسر حیات احمد صاحب کی بیٹی غزالہ تھیں۔ وہی حیات احمد خاں جو کلاسیکی موسیقی کی بقائے دوام کرتے کرتے اس دنیا میں کل پاکستان موسیقی کانفرنسوں کو ...گئے۔ اس گھرانے کو احمد بشیر صاحب کے خانوادے کی طرح فنون لطیفہ سے گہری وابستگی تھی۔ غزالہ تخلیقی ایچ کے ...ے اہتمام سے خلق خدا کے لیے کورس وغیرہ ترتیب دیتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے سکھانے کا بھی ایک شارٹ کورس ...کرایا تھا جسے میرے بیٹے انیق اور انیس بڑے ذوق وشوق سے اٹینڈ کرتے رہے تھے۔

چینی کھانوں تک میں ایسے سہولت سے پہنچ جاؤں گی اس کی سب سے زیادہ خوشی خاں صاحب نے منائی۔ ...ے کونگ کا چینی شیف ہمیں ماہر کرنے پر مامور ہوا..... سبزیاں کاٹنے کا فن ہم نے سیکھا ضرور لیکن جس طرح ...پکڑتے اور چھری چلاتے یہ ممکن نہ تھا۔ ترکیبیں تو تقریباً سب سمجھ میں آ گئیں لیکن سبزیاں کا شاعموماً خاں صاحب کا ...ہوتا۔ شیف صاحب کو نقل کرنا آسان تھا لیکن وہ پریکٹسیں ہاتھ آئیں نہ کبھی ویسے رزلٹ نکلے۔ البتہ تعریف ...ایک اور دروازہ کھل گیا۔

مجھے یاد ہے ایک روز شہاب بھائی اور خاں صاحب کہیں باہر گئے تھے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ انہیں ''کونج'' میں ...ے دعوت دی تھی۔ چکن کارن سوپ، ہاٹ اینڈ ساور، فرائیڈ چکن، رائس اور پران اینڈ ویجی ٹیبل مینو میں تھا۔

شہاب صاحب نے گھستے ہی کہا.... ''ہمارا چینی کھانا بہتر ہوا کرتا ہے..... ہے ناں اشفاق؟''

خاں صاحب چپ رہے۔

مجھے خوب علم تھا کہ شہاب صاحب دل رکھنے کی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی ان کی تعریف سن کر ...باغ ہو گیا۔ انسان بھی کیا گھٹیا Specie ہے۔ اس کا ہیرا من تو تا نہ کوئی وصف ہے نہ ذات..... بس اپنی تعریف سن ...خود آزادی چھوڑ کر ہتھکڑی پہننے پر رضا مند ہو جاتا ہے۔ جاگیردار اور میراثی اسی تعریف کی زنجیر سے بندھے رہتے ...گیردار اپنے غلے کا منہ کھلا رکھتا ہے اور خوشامدی میراثی کو واہ جی واہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

نہ تو مزارعے، میراثی کی ضرورت کبھی پورے طور پر پوری ہوتی ہے نہ نمبردار، جاگیردار فیوڈل لارڈ ہی کا تعریف ...بھرتا ہے۔ دونوں ٹنڈیں بھر بھر کر لاتے رہتے ہیں۔ رہٹ چلتی رہتی ہے۔ طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ سسٹم ...ٹوٹ نہیں پایا۔ شہروں میں، دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں میں یہ سسٹم چھوٹے بڑے ردّوبدل کے ساتھ جاری ہے۔

سفر در سفر

سفر لندن

تشخیص کے بعد مجھے بلڈ کینسر کا مرض بتایا گیا اور میں مستقل طور پر ہسپتال میں رہنے لگی۔ دو تین بوتلیں دن کے ...گتیں لیکن صبح بلڈ کاؤنٹ کم نکلتا۔

ان ہی دنوں جب میں ایم آئی آر اور بلڈ ٹیسٹ کے چکروں میں تھی' ایک روز جمیلہ ہاشمی چند ادیبوں کے ساتھ ہمارے گھر آ گئیں۔ خاں صاحب کی پیشی ڈرائنگ روم میں ہوئی۔

''سنو اشفاق (نہ بھائی نہ شائی) تم قدسیہ کو لندن کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں اس کا علاج ہو جائے گا۔ سائنس نے کینسر کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ Para-medical staff بھی بہتر ہے اور ڈاکٹر بھی۔''

''بھائی میری پسلی نہیں ہے۔''

''اگر تمہاری پسلی نہیں ہے تو ہم سب ادیب مل کر خرچ برداشت کر لیں گے۔''

''ضرور ضرور میں جلد جواب دوں گا۔ اس کے دو تین ٹسٹ اور ہو لینے دو۔''

خاں صاحب گو بظاہر جھوٹے ہی نظر آتے ہوں' وہ لڑنے بھڑنے' مناظرہ کرنے اور دل آزاری سے بچتے تھے۔

اب وہ اسی سوچ میں مبتلا تھے کہ کیسے اس گھر آئی بلا سے جان چھڑائیں؟

پھر پتہ نہیں کیسے B.C.C.I. کے بینک کو خبر ہوئی۔ ان دنوں برنی صاحب اس بینک کے صدر تھے صاحب وائس پریذیڈنٹ..... غالباً جاوید طارق (جیدی) نے میری مخدوش حالت دیکھ کر مشتاق احمد یوسفی صاحب کو خبر دی۔ ان دنوں جیدی M.C.B. بینک میں آفیسر تھا۔ اس نے یوسفی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پتہ نہیں کیا کہا لیکن یوسفی صاحب کا خاں صاحب کو فون آ گیا کہ آپ قدسیہ کو لے کر آئیں تو ہم سارے سفر کا خرچ برداشت کریں گے۔ چوری چوری اعانت کرنے والے یوسفی صاحب ایک لحظہ کے لیے محسن کی شکل میں سامنے نہ آئے اور انہوں نے برنی صاحب کے سر تھوپ دیا۔

ہم ڈرتے ڈرتے پہنچے۔ جب ہیتھرو ایئر پورٹ پر اُترے تو ابھی سامان نہ آیا تھا۔ خاں صاحب سامان والی بیلٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا گئے۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک قد آور مضبوط سردار جی بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید انہوں نے میری شکل سے اندازہ لگایا۔ وہ اُٹھے اور سامان باہر لے جانے والی ریڑھی اُٹھا کر لے گئے اور بیلٹ کے پاس کھڑے خاں صاحب سے کہا ''بھراجی! آپ فکر نہ کریں۔ مجھے صرف اپنا بکس اشارے سے بتا دیں میں اُتار دوں گا۔ آپ بی بی کے پاس رہیں۔''

خاں صاحب چپ رہے۔

اس سے پہلے ہمارا سوٹ کیس دو بار بیلٹ پر چکر لگا چکا تھا۔ اب سردار جی نے ترنت ہی سوٹ کیس اٹھا کر ریڑھی میں رکھ دیا۔ خاں صاحب نے ہوائی جہاز کے اندر جانے والا بیگ اور ایک آدھ اور بیگ اوپر رکھے اور ہم سردار جی کا شکریہ ادا کر کے چلتے بنے۔ حسنِ اتفاق سے سکیورٹی پر جو آفیسر تھا اُس نے سوال کیا ''آپ اشفاق صاحب ہیں؟''

''جی۔''

''''ایک محبت سو افسانے'' والے۔''

''جی۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی..... چلیے کوئی چیکنگ نہیں۔''

اب فکر یہ تھی کہ ہمیں کون لینے آئے گا اور ہم کہاں ٹھہریں گے؟

جونہی باہر پہنچے' ایک خالص انگریز Placard اٹھائے جنگلے سے باہر کھڑا نظر آیا۔ ہمیں شبہ بھی نہ ہوا کہ ہمارے [illegible] انگریز ڈرائیور بھی آ سکتا ہے۔ جنگلے سے باہر نکلے تو ڈرائیور نے فوراً سامان کی گاڑی سنبھال لی۔ ہم دونوں اپنے [illegible] معزز سمجھنے لگے۔ سڑک پار کر کے ہم پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ ڈرائیور صاحب نے سامان لوڈ کیا۔ ہمیں Crom[illegible] ہسپتال سے تھوڑی دُور ایک دومنزلہ مکان کی اُوپر والی منزل میں لے گیا۔ کسی سفید فام انسان سے پہلی بار [illegible] سوٹ کیس اور بیگ اُٹھوائے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ یوسفی صاحب آ گئے۔ ہمارے پاس سرِ دست اُن کی تواضع کے [illegible] تھا۔ میں نے فریج میں دیکھا تو چند جوس پڑے تھے۔ یہاں سے ایک جوس نکال کر یوسفی صاحب کو پیش کیا۔

اُن کے گھٹنے کے ساتھ ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اب انہوں نے اسے مجھے دے کر کہا ''اس میں کچھ بچی رسد ہے [illegible] روٹی' مکھن' چینی سب موجود ہے..... لیکن میں دوبارہ یہ مہربانی نہ کر سکوں گا۔ یہ لندن ہے۔ یہاں ساری Groc[illegible] خود لانا پڑتی ہے۔ واشنگ اور کوکنگ کرنے کے لیے کوئی ملازم نہیں ہوتا۔''

مشرق میں تو لوئر مڈل کلاس میں بھی کپڑے دھونے' برتن مانجھنے کے لیے عورت مل جاتی ہے۔

یوسفی صاحب بولے ''قریب ہی ٹیوب سٹیشن ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہیں ٹرین سے جا سکتے ہیں۔ ویسے تو [illegible] بھی قریب ہے/اب آپ کو کار بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ ''ہوم'' ہے اور اس کی مراعات سب کے لیے ایک سی [illegible]

یوسفی صاحب ہمیں مغرب کی سب سے بڑی قدر Self-reliance ہاتھ میں پکڑا کر چلے گئے۔ ہم لوگ [illegible] کے عادی ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے پر ایستادہ اور راستہ پوچھنے والے لوگ تھے۔ پھر خاں صاحب جو سفر کے [illegible] میں تاک ضرور تھے لیکن ایک بیمار عورت کے ساتھ پر کچھ اُڑے اُڑے سے لگتے تھے۔ اسی روز جاوید عبداللہ [illegible] پاس آئے۔ وہ ہمیں ٹیوب سٹیشن دکھانے لے گئے۔

ٹیوب کا کمال بھی انسانی پھرتی کا ٹیسٹ تھا۔ بس یہ منٹوں کے لیے رُکتی اور جھٹاپٹ روانہ ہو جاتی۔ ایسی تیزی [illegible] جھٹاپٹی کچھ مجھے پریشان کر گئی۔ اس ٹیوب پر دوسرے تیسرے دن سوار ہونے کا اتفاق ہوا اور ساتھ ہی دہشت گردی کا [illegible] منظر آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی ہم سٹیشن پر پہنچے ہی تھے کہ سرپھرا نوجوان بندوق لے کر کہیں سے برآمد ہوا اور دائیں [illegible] ٹھاٹھا گولیاں داغ دیں۔ بچے اور عورتیں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ جونہی ٹیوب آئی اور ہم سوار ہوئے۔ جناب [illegible] گرد بھی بندوق لے کر سیڑھیاں چڑھ آئے۔ ٹکٹ چیکر غالباً ایسے سرپھروں کا عادی تھا۔ وہ شانتی سے کھڑا رہا۔ [illegible] گرد نے بندوق تانی اور سیٹوں پر بیٹھے مسافروں کو کافی پریشان کیا۔

پہلے ہی دن جاوید عبداللہ کے علاوہ نعیم ہمیں ملنے آیا۔ آپ عمر بکری کے نام سے تو غالباً واقف ہیں۔ عمر بکری [illegible] ڈوں کا رسیا تھا۔ اس کا ذکر خاں صاحب کے ''سفر در سفر'' میں تفصیل سے موجود ہے۔ میرے بھائی ریزی اور عمر بکری [illegible] عمر پہاڑوں کے رسیا رہے۔ نعیم اُن ہی عمر بکری کے داماد تھے اور لندن میں رہتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا

''آپ مجھے اپنی رپورٹیں دے دیں۔ میں انہیں لے کر کرامویل ہسپتال ابھی پہنچا دیتا ہوں۔'' اُس نے ڈاکٹر حقی کی تحریر اور رپورٹوں کے ہمراہ ایکس رے اور بلڈ کاؤنٹ کی باقاعدہ دن وار تفصیلات ہم پہنچائیں۔

''آپ ہسپتال جانے کی کوشش نہ کریں۔ میں کل تک آپ کو ڈاکٹر سے ٹائم لے کر بتادوں گا۔''

اس کے بعد ہم Edgeware Street گئے۔ یہاں ثویلہ اور انیس موجود تھے۔ وہ کراچی سے آئے تھے۔ چونکہ انیس میاں Manager Agreements and Handling تھا۔ اس لیے اُسے پی آئی اے کا ٹکٹ اور رہائش ملی ہوئی تھی۔ ثویلہ نے ہمارے لیے بڑا عمدہ پلاؤ اور آلو گوشت تیار کر رکھا تھا۔ مزے لے لے کر کھایا۔ اس کے بعد وہ ہمیں ایک سنڈے مارکیٹ میں لے گئے۔

یہ مارکیٹ ایک پاکستانی مہاجر لگاتا تھا۔ اِدھر اُدھر سے ہر عمر اور سائز کے کپڑے خرید لاتا اور اسے بہت اچھے داموں پر بیچ دیتا۔ اب تو پاکستان میں بھی اتوار بازار، جمعہ بازار ایک عام چیز ہے لیکن تب یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ میں نے واپسی پر کچھ سوٹ تحفے میں دینے کی غرض سے خریدے۔ ثویلہ اور انیس نے مجھے خاں صاحب کو چند سوٹ خرید دیئے۔ میں جانتی تھی کہ انیس کی تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ میں اصرار کرتی رہی کہ یہ فضول خرچی ہے۔ باز آجاؤ لیکن مجھے خوف تھا کہ بارہ سو روپے کی تنخواہ میں اُس کے پاس اس اسراف کے لیے کہاں گنجائش تھی لیکن انیس بیٹے کی ماں کہتی تھیں کہ بازار میں وہ اپنے لیے آپ کو کچھ خریدنے نہیں دیتا۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا لیکن آپ کے معاملے میں کچھ دیئے بغیر نہیں رہتا۔

شام کو اردو مرکز کے کتب خانے میں خاں صاحب کی کتاب ''اُجلے پھول'' کا فنکشن تھا۔ انیس اور ثویلہ ہمیں وہاں لے کر گئے۔ لندن کے ادیبوں کا خوب کٹھ تھا۔ زیادہ تر تعریف ہوئی۔ کچھ سوال بغلی گھونسلے جیسے بھی کیے گئے جو ایسی محفلوں میں ہوتا ہی ہے۔

مشتاق یوسفی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ابھی انہوں نے ''آبِ گم'' نہ لکھی تھی اور بینکر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن اُس وقت بھی اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی حس نے بہت متاثر کیا۔

دوسرے دن صبح صبح ثویلہ اور انیس ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے ہمراہ Cromwell ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر خالد حمید سے ملاقات ہوئی۔ اتنی تیز رفتار زندگی اور مصروفیت کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک شگفتگی سی تھی۔ رپورٹیں دیکھ کر وہ شائستہ سی آواز میں بولے۔

''ہماری اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر حقی کی رپورٹیں ایک سی ہیں۔ ہم آپ کے ڈاکٹر سے اتفاق کرتے ہیں کہ آپ کو بلڈ کینسر ہے..... لیکن ایک اختلاف ہے۔''

خاں صاحب کچھ گھبرا گئے۔

''وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟''

''آپ ذرا ڈاکٹر حقی سے کہیں کہ وہ ٹائپ رائٹر بدل لیں۔ اگر انہیں پاکستان میں نیا ٹائپ رائٹر نہ ملے تو میں یہاں سے بھجوادوں گا۔''

ہم دونوں کی جان میں جان آئی۔

طے یہ پایا کہ ہم چند دن بعد پر چل ہسپتال میں ڈاکٹر شارپ سے مل لیں۔ وہی کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک نرس کو حکم دیا کہ وہ میرے بلڈ کا ایک اور سیمپل شارپ کے معائنہ کے لیے لے لیں۔

ابھی ہمیں گھر پہنچا کر انیس اور ثویلہ کو گئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ تقو آ گیا۔ اُن دنوں وہ عاشق حسین بٹالوی کا بیٹا تھا اور لندن کے گلی کوچے کھنگال رہا تھا۔ چونکہ ولایت پلا اور جوگنگ کا شوقین تھا۔ وہ کبھی رنز سٹریٹ بس لیتا نہ کبھی ٹیوب سے سفر کرتا۔

ابھی ہم حال چال معلوم کرنے کی سٹیج میں تھے کہ کرومویل ہسپتال سے فون آیا۔ اشتیاق نے فون اُٹھایا۔ کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر بولا..... ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے پتہ چلا کہ لندن کا پیرا میڈیکل سٹاف اتنا Efficient نہیں جس قدر ہم آپ لوگوں کو سمجھتے ہیں۔''

پھر کچھ دیر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا..... اس کے جواب میں تقو بولا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں تمہاری شکایت ڈاکٹر خالد حمید سے نہیں کروں گا لیکن پتہ چلا سسٹر کہ تم لوگ ہم کالے آدمیوں کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑی فرعونیت ہے' بڑا تکبر..... لاتا ہوں' لاتا ہوں ابھی۔''

فون نیچے رکھ کر اُس نے شفقو جی سے کہا..... ''تم نے سسٹر کی حرکت دیکھی۔ پہلے ہی کا کی میں بلڈ کی کمی ہے۔ اُوپر سے پکڑ کر سارا بلڈ گرا دیا۔ کہتی ہے مریض کو ہسپتال لے آؤ لیکن ڈاکٹر خالد حمید کو پتہ نہ چلے..... یہ تو لندن والوں کا حال ہے ہم کو کے پیچھے۔''

خاں صاحب کو تقو ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ ہم دونوں پیدل کرامویل ہسپتال پہنچے۔ تقو کے جانے کے بعد جاوید عبداللہ آ گئے۔ اُس کے ساتھ میں لندن شہر گھومنے پھرنے لگے۔ لندن ٹاور Westminster Abbey اور بکنگھم پیلس دیکھتے چلے گئے۔ دوسرے دن جاوید عبداللہ ہمیں Bond Street لے گئے۔ یہاں Selfridge' مارک اینڈ سپنسر' مائیکل اور Littlewood کے سٹور دیکھے۔ اُس وقت تو احساس نہ ہوا کہ مغرب مارکیٹنگ کی وبا میں مبتلا ہو چکا تھا۔ سٹوروں نے لوگوں کی خواہشات کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کو ایک اہم خوشی سمجھنے لگے تھے۔ صارف زندگی میں در آیا تھا اور لوگ ضرورت بھر اشیاء پر قانع نہ رہے تھے۔

اگلے دن ہمیں نعیم میاں ونڈسر کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ پھرتے پھرتے Eton اور Slough کا علاقہ زیر سیاحت آیا۔ واپسی پر انیس اور ثویلہ کو گھر میں موجود پایا۔ اُن کے دو بیگ اور کچھ دستی سامان ساتھ تھا۔

''ابو آپ ذرا اطلاع نہیں دیتے کہ آئندہ کیا پروگرام ہے؟ میں اور ثویلہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم اب یہیں ٹھہریں گے اور آپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں گے۔''

''تم دونوں کیوں اپنی چھٹیاں برباد کرتے ہو۔ ہم مزے میں ہیں۔ جاوید اور نعیم ہمیں خوب سیر کرا رہے ہیں۔ اب پر چل ہسپتال جانا ہو گا ہم تمہیں اطلاع دیں گے۔''

''نہیں نہیں ابو..... اب ہم آپ کو ٹرسٹ نہیں کرتے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

دوسرے دن ہم چرچل ہسپتال پہنچے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں میرا Bone marrow ٹسٹ دوبارہ
ڈاکٹر شارپ نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا ''دیکھئے ہم نے مریضہ کو admit کر لیا ہے۔ رات کو انہیں سلا دیا جائے
شوہر حیات ہے؟''

''جی یہ ابو ہیں ہمارے۔''

''پھر یہی رہ سکتے ہیں۔ آپ دونوں جائیے۔ ہسپتال میں ایک آدمی سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں
مجھے اندر لیبارٹری میں لے جاتے وقت وہ پھر ثولیہ اور انیس سے مخاطب ہوا..... ''آپ لوگ جائیں
بے ہوش کر کے ٹسٹ کریں گے.....کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

رات کے وقت مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا گیا۔ خاں صاحب کے سامنے بے ہوشی کا ٹیکہ
پھر اُنہیں جانے کا حکم ملا۔ وہ رات انہوں نے کسی کرسی پر بیٹھ کر گزاری۔

صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر شارپ اور خاں صاحب پاس کھڑے تھے۔

رات کس وقت Bone marrow ٹیسٹ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ یہی ٹسٹ جب میو ہسپتال میں ہوا
قدر تکلیف ہوئی تھی کہ الاماں۔

ڈاکٹر شارپ نے خاں صاحب سے پوچھا ''آپ واپس کیسے جائیں گے؟''

''کوئی بس لے لیں گے۔''

''آیئے۔''

ڈاکٹر شارپ نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور لے چلا۔ کافی دور جا کر بس سٹاپ ملا۔ ہمیں اتار کر
صاحب سے مخاطب ہوا ''میں آپ کو گھر پہنچا دیتا لیکن مریض ٹسٹ کے لیے آ چکا ہوگا۔ میں کسی کو انتظار کرانا
سمجھتا۔''

ایک ہی ٹسٹ کے دوران دو تجربے ہوئے۔ سسٹر نے بغیر کسی معذرت کے اشتیاق کی سی بات کا نوٹس
دوسری باریوں لہو کا کھیل لیا جیسے کسی جانور کا لہو نکال رہی ہو اور اُسی ٹسٹ کے دوران ڈاکٹر شارپ جیسا ہمدرد بھی ملا
ہر قسم کا گلہ دھو ڈالا۔ Generalities کے ساتھ Exceptions ہمیشہ رہتی ہیں۔ سائنس کے اصول بھی اس
نہیں۔ ہم افراد کے اختلاف سے نہیں اُن کے Behaviour کے عمومی رویے سے قومی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کر
اور غالباً یہاں کسی قوم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

کچھ چینی بھی نکھٹو، کام چور اور بھگوڑے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر وہاں محنت کا راج ہے۔

جاپانی لوگ شائستہ، مہذب اور دوسرے کے آگے کمر جھکا کر تعظیم کرنے کے عادی ہیں لیکن اس عمومی
کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی ضرور ہوتے ہیں، جو بدتمیز تھوتھو کرنے والے اور آپ کو ٹکے ٹنڈ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔

لندن میں اب لمبا قیام ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر شارپ کی رپورٹ ویسی ہی تھی جو ڈاکٹر حَی نے دی تھی۔

ان ہی دنوں میں ہمیں امپیریل کالج نے مدعو کیا۔ یہ بھی انٹرویو کی شکل کی ملاقات تھی۔ لندن میں مقیم

گرمجوشی سے آئے تھے لیکن یہاں وہ گرماگرمی نہ تھی جو اردو مرکز کی محفل میں تھی۔ پھر بھی ہماری انا کے لیے یہ شام بھی تسکین بخش تھی۔

اسی سفر کے دوران ہماری ملاقات ایک بڑے ایکٹر بدیع سے بھی ہوئی۔ اس نے پاکستان میں خاں صاحب کے کئی ڈراموں میں شرکت کی تھی۔ اس کے گھر ایک معرکے کی دعوت ہوئی جس میں چند مقامی ایکٹروں سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں ''سکینہ اور سنڈریلا'' کا ٹیپ بھی دیا جسے ہم نے انیس اور ثویلہ کے ہمراہ دیکھا۔ اسی قیام کے دوران ہمیں Ingman Bergman کی Autumn Sonata دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور ہم ورلڈ کلاسیک بنانے والے ایک فنکار سے پہلی بار متعارف ہوئے۔

لوگوں کی اتنی ساری محبتیں سمیٹ کر جب ہم لاہور کے ایئرپورٹ پر واپس لوٹے تو عجب طرح کی اُداسی ساتھ تھی۔ صرف ڈرائیور گاڑی لے کر موجود تھا۔

گھر کا کالا پھاٹک کھلا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور پھر لاہور کے روزمرہ کی لپیٹ میں آ گئے۔

سفر دراوڑ

پتہ نہیں کیا تحریک تھی جس کی بنا پر ہم لوگوں نے قلعہ دراوڑ کا رُخ کیا۔ اس سفر میں ہم دونوں کے ہمراہ جمیلہ ہاشمی بھی شامل تھیں۔ اس قلعے کی حیران کن بات یہ تھی کہ سارے کا سارا مٹی سے بنایا گیا تھا۔ منٹگمری کے علاقے میں ایسا پختہ اور بے مثال آپ قلعہ دیکھ کر ہم سب حیرت میں ڈوب گئے۔

اتنی ساری یادیں دُھندلا گئیں لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس قلعے کی تصویر کبھی کبھی آنکھوں میں گھومتی ہے۔

ہمیں دراوڑ کے قلعے کے علاوہ ایک اور رانی کوٹ کا قلعہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تب ہم حیدرآباد میں مقیم تھے۔ یہاں کے کچھ ادیب ہمیں رانی کوٹ کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ سارا قلعہ دیکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ہمیں ایک کتابچہ بھی عطا کر دیا گیا۔ قلعے کا حسن کچھ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی پرانی عمارات اور آثار الصنادید کے ساتھ بڑا سوتیلا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) خواجہ عبدالرشید مرحوم نے رانی کوٹ کے قلعہ پر ایک اہم مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جو 'اقبال ریویو' (1965ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس قدیم قلعہ پر یہ تحریر اہم معلومات کی حامل ہے۔

سفر اوسلو

13 اگست 1983ء کو پورے ساڑھے تین بجے صبح آدھی رات کو ہم اوسلو ہوائی ایئرپورٹ Forne Bu پر پہنچے۔ یہاں چند لوگ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں Grandvig Raguar Segard کے علاقے میں پہنچا دیا گیا' جو نتھیا گلی سے مشابہہ ہے۔ شام کو یہاں کے ادیبوں نے پاکستان کے یوم آزادی کو جشن کی صورت منانے کا پروگرام بنایا تھا اور خاں صاحب آزادی کی اس Celebration میں صدر تھے۔

شام کو ہمیں قیصر سعید' اُس کی بہن عذرا درانی' سلیم بیگ اُس کی بیگم شہناز لینے آئے۔ یہ فنکشن رائٹرز یونین نے ایک بہت عالیشان محل میں کرایا۔ اس میں مہمانِ خصوصی یہاں کی منسٹر آف جسٹس تھی۔ ہمیں آزادی کی مبارک دی اور

بڑے تپاک سے پیش آئیں۔

اب تقریب رونمائی' آزادی کے فنکشن' ہوٹلوں میں مل جل کر باہمی ستائش کے پروگرام عام سی بات ہے لیکن تب یہ معاملات اتنے روزمرہ کا معمول نہ تھے۔ خاں صاحب نے ایسی تقریر کی کہ ہال میں موجود تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر داد دی۔ ہال بھرا ہوا تھا اور سائیڈوں پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ پاکستانی تو موجود تھے ہی لیکن اس شام نارویجن بھی اتنی تعداد میں آئے کہ ہم حیران رہ گئے۔

جب میری باری آئی تو میں نے تقریر میں کہا کہ کوئی معاشرہ بھی جب تک توازن اختیار نہیں کرتا صحت مند نہیں ہو سکتی۔ آزادی اور Cooperation دونوں میں Balance نہ ہو تو انسان مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ مغرب نے اپنے معاشرے کی بنیاد آزادی بنائی ہے۔ یہاں مرد اور عورت اس قدر آزادی کے خواہاں ہیں کہ مرد اور عورت کا دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا اسی لیے شادی کا ادارہ بے کار ہو گیا ہے۔ بچے چھوٹی عمر میں خودمختار ہو کر گھر چھوڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ نرسری میں اُن کے گلے میں گھر کی چابی لٹکا دی جاتی ہے۔ جونہی بچہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر جاتا ہے' فریج سے دودھ نکالتا ہے' Cereals ڈالتا ہے اور کھا کر ہوم ورک کرنے لگتا ہے۔ بوڑھے ماں باپ کو ''بوڑھے گھروں'' میں منتقل کر دیتے ہیں اور کرسمس کے قریب اُن سے ملنے کی گنجائش بنائی جاتی ہے۔

اس طرح حاصل کی گئی آزادی سے جو تنہائی ملتی ہے اُس کا لاکھ علاج تلاش کریں انسانی روح تشنہ رہتی ہے۔ اِدھر مشرق کا معاشرہ خاندانی روایات کا پابند ہے۔ یہاں دو تین پشتیں ساتھ رہتی ہیں۔ مشکلات ہوتی ہیں لیکن یہ روگ' نفسیاتی' ذہنی اور قلبی بیماریوں کو اُس طرح فروغ نہیں دیتا جس طرح مغرب میں اس کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

فنکشن کے بعد ڈنر تھا۔ اس کھانے پر میرے دائیں ہاتھ فن تھیسن Finn Thiesen بیٹھے تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ نارویجین میں کیا تھا۔ فن تھیسن Indo i ravsk institut میں پڑھاتے تھے۔ اُن کا پتہ Boks 1035 اور وہ اوسلو کے Blindern کے علاقے میں رہتے تھے خاں صاحب اپنے ساتھ بیٹھی پروفیسر Srennby سے مصروف گفتگو رہے جو کشمیری زبان پڑھاتی تھیں۔ ان سے انہوں نے چند نارویجین حروف سیکھ لیے اور اُن کو بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔

ہادیو	Adjq	خدا حافظ
مون	morn	السلام علیکم
تھک	thant	شکریہ

ساتھ ساتھ انہوں نے لڑکیوں کے پرانے اور نئے نام معلوم کیے۔ فیملی نام اور لڑکوں کے نام یاد کیے۔

لڑکیوں کے پرانے نام		لڑکیوں کے نئے نام	
ہیو	Eva	آنے	Anne
انگم بورگ	Ingborag	مونا	Mona
ہلیما	Helma	لیو	Liv

سگرید	Sigrid	تھورل	Toeil
لڑکوں کے نام		**فیملی نام**	
اولاد	Olav	ہانس	Hansen
کھنوت	Knut	اولسن	Olsen
پھیر	*Per*	پیٹرسن	*Petersen*
ہانس	Hans	Berg	Berg
		رود	Rud

لڑکیوں کے کام	لڑکوں کے کام
1-صفائی	1-ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ
2-نرسری میں زبان کی تعلیم	2-فیکٹری
3-فیکٹری	3-صفائی
4-دوکانوں پر کام	4-ڈرائیونگ'وکل ٹرانسپورٹ
	5-بزنس

خاں صاحب اپنے سفر کو سونا بنانے میں مشغول تھے۔ میں ہمیشہ کی طرح حیرت میں تھی۔ تحسین نے اپنا تخلص جوڑ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اسلام قبول نہ کیا لیکن قرآن پاک کا ترجمہ نارو یجین میں کیا۔ یہ ناروے میں ہونے والا پہلا ترجمہ تھا۔ تحسین کئی آیتوں کو زبانی سنا سکتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح اس شخص نے اتنا کام کیا۔ ساتھ ہی میں خاں صاحب کی تفصیل پسندی پر بھی حیران ہوئی۔ انہوں نے اس کے ساتھ آٹھ دنوں کی ڈائری تیار کی جو آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

خاں صاحب کی تحریر سے اقتباس

ایک خوبصورت گھر میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے اپنا ہوائی سفر یاد آ گیا۔ پچھلے دنوں دنیا میں ہوائی زندگی کے سو سال پورے ہونے پر بڑے فنکشن ہوئے۔ سواری کے جہازوں اور فوجی جہازوں کا ڈسپلے ہوا اور ہم نے اخباروں میں ٹی وی پر ایسے ایسے جہاز دیکھے جو پہلے نظر سے نہیں گزرے تھے..... میرے ساتھ ہوائی جہاز کا رشتہ بڑا پرانا ہے مگر اتنی پرانی دوستی کے باوصف ہم میں گہری مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے دوسرے ہی مہینے میں ریفیوجی کیمپ میں ہیڈ کلرکی کے عہدے پر فائز تھا.....

گرمیوں کی چھٹیوں میں روم سے میڈرڈ گیا۔ میں تو سپین پہنچ گیا مگر میرا سوٹ کیس کہیں اور چلا گیا۔ کمپنی والوں نے کہا آپ کا بیگ آپ کے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔ میں ہوٹل کا نام لکھوا کر ہوٹل آ گیا۔ سارا دن تین کپڑوں میں گزارا۔ رات کو زیر جامہ میں سو گیا۔ اگلا دن پھر ایسے ہی۔

کپڑے دھونا..... قرطبہ کا سفر لاری میں صبح منہ اندھیرے چل کر سہ پہر قرطبہ پہنچا۔ وہاں تین دن قیام میں

کپڑے نہیں دھوئے۔ مسجد میں دو وقت آنا ہوتا لیکن کپڑے دھونے کی ضرورت نہ تھی کہ وہاں جماعت ہی نہ ہوتی تھی۔
سامان نہ ہونے کی بدولت آزادی۔ بھلا ہوا میری گھگری ٹوٹی۔
واپسی سفر: ہینگر والے سے کہا اس کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔
روم میں گھر پہنچ کر دیکھا میرا سوٹ کیس پہلے سے موجود تھا۔ میں پھر چیزوں میں اور سامان میں گھر گیا۔

سفر (اوسلو)

سن 1983ء میں Writers' Union نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے اس شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں ڈھلی دھلائی 'لوگ شائستہ' سفید اور نرم طبیعت تھے۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Nelga Uafsenl کو ہم اپنی پٹاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ اور اُس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوک روپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ٹرولز ایک قسم کی روحیں ہیں جو انسانوں کی مشکل میں امدادِ غیبی کے طور پر اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔ مشابہت پریوں سے ہے اور وہ کسی Fairy God Mothers کی طرح انسان کو دکھائی پڑتی ہیں۔ ہر خطے نے روحانی امداد کی تجسیم کرنے کا خواب ضرور دیکھا ہے.... تاریخ گواہ ہے کہ جغرافیائی تقسیم کے باوجود اس خواب میں عجیب قسم کی مماثلت ہے۔

Trolls ایک نوعیت کی دیو مالائی مخلوق ہیں۔ جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوک کہانیوں میں ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنارے سے انتباہ کرنا ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی قتل سے نہیں بلکہ انسان کے آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے پسند کیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم ٹی وی کے آگے بیٹھ کر کار ریس' سونامی کے سیلاب' زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچوں نے سکہ ڈال کر کھیلنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر' اس کی جہالت' رسم و رواج' مذہب اور اس کی وجہ سے سکون کے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ ہمیں بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلّی احساس نہ تھا۔

1985ء میں جب ہم انگلینڈ سے لوٹے تو اُن دنوں میری صحت کا معاملہ اتنا گڑبڑ تھا کہ خاں صاحب نے

سرج لائٹ موڑنے کی زحمت نہ کی۔ وہ انجائنا کے مریض تھے۔ شکاگو میں اُن کے کئی ٹسٹ اُن کے بھتیجے ڈاکٹر طارق نے کروائے تھے جن میں ایک ٹسٹ یہ بھی تھا جس میں ایک دوڑتے پہیے پر تیز تیز چل کر اپنے دل کو تھکانے اور اس ورہمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ سن پچاسی سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ ابھی میرے بلڈ کینسر کا شروع نہ ہوا تھا۔

غالباً یہ 1987ء کے شروع میں ہوا۔ ڈاکٹر زبیر اپنی خاموشی' سنجیدگی اور خوفِ خدا کے باعث Misunderstood کے بہت مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ خاں صاحب کے بھانجے ڈاکٹر جواد ساجد کے اصرار پر ہم ڈاکٹر زبیر کے پاس ہسپتال پہنچے۔ ہمیشہ کی طرح خاں صاحب نے نہ تو بچوں کو بتایا نہ اپنے کسی بھائی بہن ہی کو اطلاع دی۔ لیکن ہمیشہ کی شیر خاں کو جانے کیسے علم ہو گیا۔ وہ انجو پلاسٹی کے دوران ہمارے ساتھ تھا۔

مفتی جی کا گونگا مجھ سے بھی نہ بولا۔ بڑے بھرپور ڈرامے تحریر کرنے والے نے اپنی زندگی میں کسی ڈرامے کو در دیا۔ وہ جذباتی اظہارِ محبت سے کتراتے تھے۔ انہیں نہ آنسو اچھے لگتے تھے نہ بھرائی آواز میں رُکی رُکی باتیں.....وہ بابوں کے عاشق تھے جو ٹانگ amputate کروا لیتے ہیں لیکن ذکر سے زیادہ Anesthesia استعمال نہیں تے۔

ڈاکٹر زبیر نے انجو پلاسٹی تجویز کی۔ Anesthesia کے لیے ڈاکٹر طارق بن افتخار کا نام تجویز ہوا تو بولے ش! میں بھی صبر اور نماز کی معاونت اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن میں بڑا بابا نہیں ہوں۔ وہ تو پورے ہوش میں ٹانگ کٹوا لیتے ہیں لیکن اُف نہیں کرتے۔''

ڈاکٹر زبیر نے بڑی مشکل سے اپنی خاموشی کا قفل توڑا اور بولے ''آپ کتنے بڑے بابا ہیں؟''

خاں صاحب اپنی تنگی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''آپ کو پتہ ہے پٹھان' مغل اور راجپوت عموماً بابے نہیں تے۔ ان کی انا کا خول ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ میں بابا ہوں نہیں صرف بننا چاہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سرکاری لیول شتاق ڈے نہ منایا جائے بلکہ میرا عرس ہوا کرے میرے بعد۔ داتا گنج بخش کی طرح.....اتنا بڑا نہیں.....چھوٹا سا وہاں دھمال پڑے قوالی ہو.....لوگ اندر باہر نہال ہوں نثار ہوں.....خوش آئیں خوش جائیں.....''

ڈاکٹر زبیر باتوں کے عادی نہیں۔ ماتھے پر تکدر کے آثار پیدا کر کے بولے.....''آپ کا کیا خیال ہے یہ نہیں؟.....شرک نہیں؟''

خاں صاحب آہستہ سے مسکرائے' پھر بولے ''ڈاکٹر صاحب! جہالت ایک قسم کی سادگی کا نام ہے۔ غریب تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ غربت کے باعث زندگی کے Exposure تک نہیں پہنچ پاتے۔ سفر اُن کے بس کی بات پھر وہ تحفظ کہاں سے حاصل کریں۔ مینڈک سے تالاب کے بند پانیوں کی لذت بھی آپ چھین لینا چاہتے ہیں۔ منڈی کے کوٹھے کی تو اجازت دیتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کی جنسی آسودگی Stress اور Frustration کم ہوتی ہے آپ روحانی آسودگی حاصل کرنے نہیں دیتے۔

کیا ساری ذمہ داری' بوجھ اور تکالیف کو کسی بابے کی چوکھٹ پر پھینک آنے سے جو اطمینان ملتا ہے وہ قابل

تقلید نہیں۔ بابا امید کا جو دِیا جلاتا ہے..... جس اگربتی کا مشام انگیز دھواں چھوڑتا ہے کیا وہ قابل نفرین ہے۔ مجھ
نے اُن لوگوں کے چہرے دیکھے جو کسی مزار سے باہر نکلتے ہیں۔ جھولیوں میں، ہاتھوں میں، باسی پھول مکھانے
تمام مصیبتوں کے باوجود چہرے پر اُمید کی کرن..... حوصلے کی چمک..... چکروں میں پھنسے ہوئے نادار انسان کے
کیا یہ کم آسودگی ہے؟"

اب ڈاکٹر صاحب نے سنجیدہ سا پکا سامنہ بنا کر کہا..... "اور وہ جو شرک ہے..... اللہ کی ذات کے ساتھ
ملانے کا گناہ..... وہ جو دھاگے باندھتے ہیں۔ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کی آس
بابے سے۔ وہ سارا تو شرک ہے..... ہے ناں....."

"لیکن ڈاکٹر صاحب..... پھر انجو پلاسٹی ختم..... اب میں چلتا ہوں۔"

ڈاکٹر زبیر حیران ہو کر بولے "ہیں، ہیں وہ کیوں؟"

"میں بھی شرک کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ حالانکہ یہ
مجھے سب کچھ اللہ پر چھوڑنا چاہیے۔"

"لیکن اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہیے اشفاق صاحب!"

"غریب لوگ بھی صرف گھٹنا باندھتے ہیں۔ کچھ واقعی بابے کو خدا سمجھتے ہیں اور حاجت روائی کے
ہیں..... لیکن یہ اُن کی مایوسی کی آخری سٹیج ہوتی ہے..... وکیل اور ڈاکٹر رب کے نعم البدل ہیں۔ ان کی طرف
کرے ہی کرے۔ ایسے ہی بابا ایک رُخ سے سائل کا حل ہیں۔ رہا شرک کا معاملہ تو یہ ربّ اور بندے کے درمیان
ہے۔ ہمیں..... اس کی فکر نہ ہونی چاہیے..... ہاں جی تو کون سا Anesthesia تجویز کرتے ہیں آپ؟"

خاں صاحب جانتے تھے کہ گفتگو اس سے آگے ڈاکٹر صاحب کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گی۔

پتہ نہیں خاں صاحب بابے تھے یا نہیں تھے۔ وہ کشف و کرامات کے متعلق کچھ علم بھی رکھتے تھے کہ
نے اُنہیں نمازوں کی پابندی اور وظائف میں بھی زیادہ گھرے ہوئے نہیں دیکھا..... ہاں خلق میں رلے ملے
دل نوازی، دلداری اور مہمان داری میں وہ خوب ماہر تھے۔

اگر آپ کبھی کسی ڈیرے پر گئے ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بابے ہمیشہ میل جول پر اصرار کرتے ہیں
قائم رہیں۔ میل جول میں کمی نہ آئے تو کبوتر کبوتروں کی ہمرکابی میں پلے گا۔ کوے اپنے جیسے کوے تلاش کر لیں
زانی جوئے باز کو اپنے مطلب کی صحبت مل جائے گی۔ نیکو کاروں کی ہمراہی میں گناہ تو سرزد ہوتے رہتے ہیں
گھڑی دُور نہیں ہوتی۔ انسان نیک عمل کے بعد اتراتا تو رہتا ہے لیکن اس شیخی پر احساسِ جرم بھی جلد یا بدیر ہونے لگتا

خاں صاحب بھی میل جول پر اصرار کیا کرتے تھے۔ اُن میں ایک خاص خوبی یہ بھی دیکھی کہ جو اُن سے
جس کو اُن کی ذرا سی قربت نصیب ہوئی، جو کوئی اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوا وہ یہی احساس لے کر اُٹھا کہ گویا
صاحب کو جانتا ہے۔ وہی اُن کے قریب تر ہے اور اُسی کی راہ خاں صاحب دیکھا کرتے ہیں۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جو بھی اُن کی یاد میں شریک ہونے کے لیے آیا اُس نے ایسی کہانی

زیادہ قریب کوئی تھا ہی نہیں، جیسے وہ مقربِ خاص اُنہیں جانتا تھا باقی سب تو محض حاشیہ آرائی کیا کرتے تھے۔ جس
وہ گلاس بھر سیر ہوئے، جنہیں تواتر سے نصیب ہوا وہ جل تھل کی کیفیت میں یوں آئے، جو اُن کے ساتھ شریک
اُنہوں نے بارش میں بھیگنے کا سا احساس پایا۔

''زاویہ'' دیکھ کر تو یوں احساس ہوا کرتا ہے جیسے وہ غیب میں بیٹھے ناظرین کا دل موہ لینے میں ثانی نہیں رکھتے
وہ لوگ جو منہ درمنہ فقط ایک بار ملے، اُنہیں بھی یہی اعتراف کرنا تھا کہ وہی خاں صاحب کے قریب تھے.....

دوسری خوبیوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن میل جول کی افادیت اور لنگر کھلانے پر اُن کا اصرار ہوا کرتا تھا۔

غالباً بابے جانتے ہیں کہ انسان دو ضرورتوں کے آگے نہتا ہے جنسی آسودگی اور پیٹ کی بھوک..... ان دو
کو پورا کرنے والا احسان کرتا ہے اور بآسانی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ جنسی آسودگی کے معاملے میں تو بابے شرع کی
تے ہیں، لیکن کھلانے کے بارے میں اُن کی فراخ دلی کا کوئی جواب نہیں.....

اہتمام کے بجائے انتظام کے قائل ہوتے ہیں۔ جو کچھ گھر پر موجود ہے اس میں ٹرولی سجائے، اسراف کرتے
آرائش کے ساتھ کھلانے پلانے کی شرط نہیں۔ اگر گرم روٹی اور اچار مہیا ہو جائے تو یہی لنگر ہے اور بھوکے کو
ہے..... امیر کے لیے دال چپاتی اور غریب کے لیے مرغی گوشت لنگر کی اعلیٰ قسم ہے کہ دونوں کے دسترخوان پر یہ
ہوتیں۔

ڈاکٹر زبیر کے ساتھ جس صبح انجیو پلاسٹی کا مرحلہ تھا اُس دن میں نے دیکھا خاں صاحب قدرے متفکر تھے۔ ایتق
میں تھے۔ خاں صاحب، اثیر اور میں ہمیشہ کی طرح میو ہسپتال پہنچے۔ اثیر ابو کے ساتھ تھیٹر کے اندر چلا گیا۔
کر تھیٹر ہی میں اوٹ کر کے بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر زبیر ہمیشہ کی طرح مجھے نادیدنی منظر سے بچانا چاہتے تھے اس
اندر تھیٹر کی ٹیبل کے پاس نہ لے گئے۔

میں نے ہمیشہ کی طرح واقعے سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور ایک مرتبہ بھی اُس سکرین پر نظر نہ ڈالی جس
پیٹ آپریشن کا منظر چلا آ رہا تھا۔ میں ہمیشہ سے چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ آنکھیں کھول کر اور بہادری
ہوں لیکن جونہی معاملہ میرے بس کا نہیں رہتا میں اس سے ایسی چشم پوشی کرتی ہوں گویا طوطا چشم ہوں.....

غرضیکہ آپریشن ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ سقم کی بدولت لہو رس رس کر ٹانگ میں اُترنے لگا اور ساری ٹانگ لہولہان نظر آنے لگی۔
جب اُنہیں بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر زبیر بہت متفکر تھے، وہ نہ تو فکر مند ہوئے نہ کسی کو پریشان کیا۔
اونچا کر کے پڑے رہتے۔ وقت کا انتظار کرتے اور شاید دل ہی دل میں لہو کے رُک جانے کی راہ دیکھتے۔ انسان
طرح صبر کو ڈھال کی طرح استعمال کرتا ہے اور کیسے واویلا مچائے بغیر مشکل کا وقت گزار سکتا ہے یہ اُن ہی کی ترکیب
سمجھ میں آیا ورنہ منہ پر ایک دانہ نکل آنے پر میں نے لڑکیوں کو روتے دیکھا ہے۔

آخری دنوں میں جب اُن کا وزن لبلبے کے کینسر سے گھٹ رہا تھا وہ عجیب قسم کی بے بسی میں مبتلا تھے۔ مجھے علم تھا

کہ وہ جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت مدافعت رکھتے ہیں۔ کچھ اور فکر تھی جس کا اظہار وہ کرنا نہ چاہتے کی پرائیویسی میں دھکم دھکا بغیر دستک دیئے داخل ہونے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ آنکھ کے کونے میں جمع شدہ آنسو پینے کی کوشش کرتے' لیکن اندرونی کرب اتنا تھا کہ آتے اور کانوں کی جانب رِسنے لگتے۔ ہم نے اُن کے سامنے کبھی کینسر کا ذکر نہ کیا تھا لیکن غالباً وہ ہم سب کے بھانپ چکے تھے اور بھلے ہی جانتے تھے کہ جس رسولی کا ڈاکٹر بلال نے سرسری ذکر کیا تھا' Malignant ہو گی۔

رات کے پچھلے پہر قریباً ساڑھے تین کے لگ بھگ میں جوس کا گلاس لے کر اُن کے پاس بیٹھی تھی۔ انگلیاں ٹھنڈی یخ تھیں۔ میری تسلی کی خاطر وہ مچلے بن کر سو رہے تھے۔

''یہ پی لیں؟''

''کیا؟'' بڑی عمدہ ایکٹنگ کے ساتھ خاں صاحب نے آنکھیں کھولیں۔

''جوس..... بڑا اچھا ہے۔ مزے دار۔''

''ضرور ہو گا۔''

''پی لیں۔''

''تم پی لو..... میرا جی نہیں چاہتا۔''

''Ensure لاؤں؟''

''ناں رہنے دو۔''

اُن کی آواز نحیف تھی۔

''سنو قدسیہ! ایک بات کرنا تھی تم سے' پتہ نہیں تمہیں سمجھ بھی آئے گی کہ نہیں..... میرے دل پر بوجھ

''آپ کوشش کر دیکھیں شاید.....''

''ویسے تو تم بہت ذہین ہو لیکن یہ تمہاری فیلڈ نہیں۔ عارف دنیا کو ایسی باتوں پر وقت بھی چاہئے۔''

اس وقت چپ رہنا ہی بہتر تھا ورنہ گفتگو کے بہاؤ میں پھڈا لگ جاتا۔

چند لمحے پنکھے کی آواز آتی رہی

''جب کئی دن قبض رہے تو آدمی کتنے علاج کرتا ہے۔ ترپھلا' اسپغول..... معجونیں استعمال کرتا ہے۔ آرام نہ آئے تو لالہ Duphalac بھیج دیتا ہے۔ فروٹ سالٹ الکا سلسر لیتا ہے..... کھانے پینے کو طاقت استعمال کرنے کے بعد باقی پھوک کو جسم اپنے اندر پناہ نہیں دیتا۔ فضلہ ریح کے لیے جسم سٹور ہاؤس بننا نہیں چاہتا صحت کی جس قدر input ضروری ہے ویسے ہی اس کی output کے بغیر آدمی بے چین ہو جاتا ہے۔ سمجھ رہی ہو نہیں کرتے ڈاکٹر لوگ پیٹ' انتڑیاں صاف کرنے کے لیے، خاص کر آپریشن سے پہلے تو انیما تک بدبدی

''جی..... لیکن کیا؟''

''ہم سمجھتے نہیں روح میں جو غلاظت جمع ہو جاتی ہے..... وہ وہ وہ.....'' اچانک وہ چپ ہو گئے۔ اُن پر نقاہت

''بُرے اعمال کے بعد تو یہ روح کو دھو دیتی ہے..... نماز بھی تو غلاظت نکالنے کا طریقہ ہے۔ روزہ صدقات،

''روحانی قبض کا علاج اتنا آسان نہیں قدسیہ بیگم..... برے اعمال کے بعد جو احساسِ جرم انسان پر غالب آتا
کام کی چیز ہے..... اسی احساسِ جرم کے باعث بسا اوقات ایک ہی جست میں انسان چور سے قطب بن جاتا
کے آنسو روح کی غلاظت دھو ڈالتے ہیں..... لیکن میں بد اعمال کے متعلق نہیں سوچ رہا۔ میں..... میں اُس
فرحت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا جو تن آسانی سے اچانک اللہ کے فضل سے مل جاتی ہے۔
میں تو سوچتا رہتا ہوں جو لوگ نیک عمل کرتے رہتے ہیں، جن کی ساری سوچ خدمتِ خلق میں گزرتی ہے، جن
سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ذرد تہہ جام تو وہاں بھی اکٹھا ہو جاتا ہوگا..... قبض سے تو وہ نیک لوگ بھی خالی نہ ہوں گے۔''
''لیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نیک عمل ہی کر رہا ہے اُسے قبض کا کیا خدشہ؟''
وہ ہلکا سا مسکرائے۔ اپنی نئی سی دلنشیں مسکراہٹ۔
''زندگی جامد نہیں جانِ من..... اگر نیک اعمال کرنے والا نیک آدمی ایک ہی سطح پر رہ گیا تو اُس کے درجات
ہوں گے۔ وہ ارتقاء کی منزلیں کیسے طے کرے گا؟ وہ تو قبض کی حالت میں مر جائے گا۔''
یہ بات میرے لیے سمجھنا مشکل تھی کیونکہ میں اندر سے متفق نہ تھی۔
''نیک عمل کرنے والے کے اندر ہولے ہولے تکبر کی غلاظت جمع ہوتی ہے قدسیہ..... نماز روزے کا پابند،
کا شیدائی..... اپنے آپ کو بچا بچا کر چلنے والا..... دوسروں کے ساتھ اپنا مقابلہ کر کے احساسِ برتری میں جانے
نفس ہولے ہولے غلاظت جمع کرنے لگتا ہے۔ اُس کی انا میں خود پرستی کے کیڑے چلنے لگتے ہیں۔ اگر نیک بندے
رحمت نہ ہو تو پھر یہ نفس ہی ابلیس کا ساتھی بن جاتا ہے اور تکبر جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے اور غالباً شرک
ہی جنم لیتا ہے، وہ اس کے خمیر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے سارا کھایا پیا لہو میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ
ستائی، من مانی قلب کو سیاہ کرنے لگتا ہے..... احساسِ جرم اُس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا..... پھر یہ روحانی قبض کیسے
..... تم نے فرانسس اناطولی کی تھائیس پڑھی ہے؟''
''جی جوانی میں کبھی پڑھی تھی۔''
''بس دُعا کرو مجھے اُس روحانی جلاب کی ضرورت نہ پڑے۔ میں کسی تھائیس کا محتاج نہ ہو جاؤں؟''
میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا کے لیے اپنے پر رحم کریں..... اپنے آپ کو دوہری تکلیف میں مبتلا نہ

کریں۔ یہ جسمانی کرب کافی جان لیوا ہے۔''

''تم بڑی خوش نصیب ہو قدسیہ! اللہ نے تمہیں سپاٹ راستوں کا مسافر بنایا ہے۔ تم بڑی سادگی سے زندگی بسر کر لیتی ہو..... میرے لیے..... میرے لیے دُعا کرو..... میں نیک ہوں اور نیک اعمال میرا پیچھا نہیں چھوڑتے

''آپ ورگو (virgo) ہیں ناں..... ہر ورگو کی عادت ہوتی ہے تفصیل میں جانا..... باریک سے باریک چھوٹی تفصیل کو مانجھتے رہنا۔ پلیز تفصیل میں جانا چھوڑ دیں۔''

''بس تم دُعا کر دو۔''

''کر دی۔''

''ایسے نہیں حاجی امداداللہ کی دعا پڑھ کر..... سب کچھ اُوپر والے کا فضل ہے۔ بداعمال تو روح مجروح کرتے ہیں۔ یہ اُلو کی پٹھی نیکی بھی فضل کے بغیر کچھ نہیں..... اپنا قد بڑھانے' شیخی مارنے' سج کھبے لوگوں کو دکھانے اپنی مثالیں پیش کرنے کے لیے جو نیک اعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی انسان کا بھٹہ بٹھا دیتے ہیں۔ تباہ کر دیتے ہیں۔''

''آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر آپ شرمندہ ہوں۔''

''نیک بی بی نیک مرد میں علم' انکساری' عاجزی نہیں رہتی۔ وہ خلق سے اپنے آپ کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں فرشتہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے پَر ابلیس جیسے ہونے لگتے ہیں..... لیکن تم نہیں سمجھو گی..... تمہاری روح مطمئن ہے..... تم صرف دُعا کرو۔''

''جی کر دوں گی۔''

''ایسے نہیں حاجی امداداللہ مکی کا کن فیکون پڑھ کر..... پوری توجہ کے ساتھ۔''

''ضرور جی۔''

آج کے تمام قابلِ ذکر ادیب ساٹھ سے اُوپر ہو چکے ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر انسان اگر ماضی میں جھانکے تو سوائے یادوں کے کچھ نہیں ملتا۔ اگر مستقبل کی طرف نگاہ اُٹھائے تو فنا کے سوائے کچھ یقینی نہیں۔ ہمارے ادیب ایک ایسے مقام پر ہیں' جہاں جوانی کا احساس تو رہتا ہے لیکن ولولے' جوش' Motivation کچھ کر گزرنے کی امنگ نہیں رہتی۔

آج کا ادب وہ لوگ تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے disillusion ہو چکے۔ سچ پوچھیے تو فکشن بدحواسی اور دلگیری کی فضا میں پلتا ہے۔ افسانے' ناول خوف اور فکر سے لبریز ہیں۔ جب ادیب ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ سانپ ایک بار کینچلی سے نکل جانے کے بعد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یادیں پچھتاوے کا رُوپ دھار لیتی ہیں۔ مستقبل کی طرف نگاہ اُٹھانے پر فنا یقینی ہے۔ باقی سب باید..... راضی برضا ہوا نہیں جاتا۔ رجائیت کو زندگی چاٹ جاتی ہے۔ اس بے یقینی میں ادیب ایسا فکشن لکھنے پر مجبور ہے جس میں خوف' مکر اور زیاں کا احساس خمیر کی طرح رچا بسا ہے۔

لیکن اشفاق احمد نے ہمیشہ ایک اُمید کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ بھی ساٹھ سے اُوپر ہو گئے۔ اُن کے قوائے مضمحل ہونے پر حکیموں' ڈاکٹروں' پیروں کی دُعاؤں کا آسرا لیا۔ لیکن ضرورتِ بشری تک اُن کی رجائیت کی جان بچانے والی کشتی اللہ کی محبت تھی۔ وہ اس محبت کے ساتھ ہمیشہ Motivated رہے۔ اس تحریک نے انہیں کبھی شیطان کا دوست نہ بننے دیا جو ہمیشہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کا درس دیا کرتا ہے۔ اُنہوں نے کبھی ماضی کو Nostalgia کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ کبھی موت کو فنا کا راستہ نہ سمجھا بلکہ یہ جانا آگے چلیں گے دم لے کر۔

پتہ نہیں اللہ کا نظام کیا ہے؟ ہم اپنے قلیل علم کی دُوربین لگا کر لاکھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم پر حجاب در حجاب فہمی کی ایسی دُھند چھائی رہتی ہے کہ آر پار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دعائیں کہیں مانگی جاتی ہیں مقبول کہیں اور ہو جاتی ہیں۔ دعائیں عراق میں مانگی جاتی ہیں' افغانستان کا آسمان دعاؤں سے اٹ جاتا ہے لیکن اندھا دُھند وہ امریکہ میں اور بش کے گھر پر برس جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اللہ ساری مخلوق کو واحد سمجھتا ہے اور جو فردِ واحد کے ساتھ بیت جاتی ہے وہ ساری انسانیت کا مقدر ہے۔

دعائیں افتخار عارف مانگتا ہے کہ کسی ایسے شخص کا ساتھ ملے جو مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔ میں تو اُس سے بہت بولوں لیکن وہ ہمیشہ سچ کا دامن تھامے رہے۔ ساری وحشتیں جو لکھنے والے کا مقدر ہوا کرتی ہیں' اُن کو برداشت کرنے کا عادی ہو..... ایسی دُعائیں افتخار سے گریاں مجھ تک پوری ثمر تا کے ساتھ پوری ہو گئیں۔ خاں صاحب میرے لیے ایسا محل بنے رہے جس پر زندگی کا ہر وار سہہ جانے کی صلاحیت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد کو زندگی سے بہت پیار تھا یا نہیں۔ وہ قوسِ قزح کے سات رنگوں کی طرح تھے۔ میں جانے Periscope تھی کہ مجھ سے گزر کر تمام رنگ یک رنگ ہو جاتے۔ خاں صاحب کے ہوتے ہوئے میں نے کبھی کسی رشتہ دار' مددگار کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ کبھی کبھی تو مجازی خدا کے ہوتے ہوئے اصلی خدا بھی یاد نہیں آیا اور شاید اسی چیز کے باعث مجھ سے یہ نعمت چھن گئی۔

اشفاق احمد میں بغیر قریب ہوئے دوسرے کو قربت کا احساس دلانے کی بڑی خوبی تھی۔ وہ جس کسی کے ساتھ ہوتے اُسے اسی وہم میں مبتلا کر دیتے کہ بس مجھ سے ہی اُن کا رابطہ ہے باقی سب تو اضافی تھے۔ لیکن ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ اُن کی مخلوق نوازی' بندہ پروری' غمگساری جو وہ اپنے ملنے والوں سے برتتے تھے اُس کا ردِعمل اُن کے بچوں پر عجب تھا۔

ایک واقعہ یاد آیا۔ برکلے پروگرام کے تحت خاں صاحب امریکہ گئے۔ ابھی اثیر خاں بمشکل پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا اور پہلا لفظ جو اُس نے بولنا سیکھا وہ ''بتی'' تھا۔ جب بھی دروازے پر کوئی دستک دیتا یا اُسے کسی چیز کی تلاش ہوتی وہ ''بتی بتی'' کہتا بھاگتا آتا۔ خاں صاحب کو بچے چھوڑ کر برکلے جانے کا بڑا رنج تھا لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار نہ کیا۔ اشفاق احمد نے اس بھاگتے ''بتی بتی'' کہتے اثیر کو ریکارڈ کر کے اس کا ٹیپ محفوظ کر لیا۔

اشفاق احمد اندر کا موسم بتانے سے قاصر تھے۔ وہ بتی کی طرح چپ چپ گھلتے رہتے۔ غم کو لیمن ڈراپ کی طرح چوستے رہتے۔ کڑوی کافی' کریلے کی بھجیا' ان سب کو اس کے Bitter Sweet ذائقہ کی وجہ سے وہ بہت پسند کرتے تھے۔

پھر ایک اور واقعہ ہو گیا۔

میرے منجھلے بیٹے انیس خاں نے ایک کبوتر کا پَر مجھے پکڑا کر کہا..... ''امی! یہ میری طرف سے ابو کو تحفہ'' خط میں ملنا تھا کہ خاں صاحب نے نگری نگری پھرنا بند کر دیا۔ رنگ برنگی کلاس جس میں جیکولین کینیڈی بھی شامل تھی کلاس کو خاں صاحب نے ان گنت کہانیاں سنا کر اپنا عاشق کر رکھا تھا' ان سب کو چھوڑ چھاڑ وہ گھر لوٹ آئے۔ پیچھے شاید ایسے لوٹنے کی لذت سے آشنا تھی۔

خاں صاحب بھی جہاں گئے کیسے ہی گم کیوں نہ ہوئے ہمیشہ لوٹ آئے۔ لیکن اظہار کی کمی نے انہیں کبھی باپ کی محبت سے آشنا نہ ہونے دیا۔ لوگوں نے ہمیشہ اُن پر ایسا قبضہ جمایا کہ بچوں کو علم نہ ہو سکا کہ وہ شفقت میں کتنی حدت ہے۔ جو لوگ کم وقت کے لیے ملتے تھے' جن کو اپنا وزن خاں صاحب پر منتقل کرنا ہوتا' انہیں کو اپنے Catharsis کے لیے استعمال کرنا ہوتا۔ وہ اتنا وقت ہی نہ چھوڑتے کہ بچے اُن کے قریب آ سکتے۔ یہ بڑے آدمیوں کا المیہ ہے۔

خاں صاحب کی تپائی پر بیماری کے دنوں میں یہ ورق پڑے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پڑھ بھی لیتے تھے۔

اشفاق احمد

از نور الحسن

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ اُن کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے۔ چھوٹے سے تھے تو اُنہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے' اس کی کاپیاں بناتے اور مکتب کے جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب اُنہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اُردو کے دوران ہی اُن کی ''ایک محبت سو افسانے'' آ گئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی لکھنا شروع کر دیا جو پورے 39 برس آن ایئر گیا لیکن اُن کی تخلیقی قوتیں ''تلقین شاہ'' کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔

پہلے خاں صاحب نے ریڈیو پر ڈرامے لکھے پھر جونہی ٹیلی ویژن 1964ء میں ہماری زندگی کا حصہ بنا تو اُنہوں نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمپیئرنگ بھی اُن ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی موسیقی سے گہری دلچسپی نے ''نکھار'' جیسے پروگرام دیے۔

''زاویہ'' سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی شخصیت مختلف طبقوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے جس قدر اُن کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سمجھتے تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں..... اور وہ بھی ''اُجلے پھول'' اور ''ایک محبت سو افسانے'' جیسے افسانے'' سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جنہیں ''تلقین شاہ'' سے عشق تھا وہ اُنہیں کسی اور رُوپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔

''زاویہ'' دُور دُور پھیلا اور الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند کا تابع ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔ لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین' ناظرین کی محبت ہے۔ محبت ایک جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی' کمی بیشی' اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو اسی لیے خدا کا سب سے بڑا رُوپ کہا جاتا ہے۔

محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی محبت کا منظر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ اُنہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں عیب ڈھونڈ کر کسی اور کا قد چھوٹا کر کے' کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے تھے۔

یقیناً اُن میں حب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے۔ ... میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو پنکھی جھل کر دہکانا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

پچھلے سال 4 ستمبر 2007ء کو برسی کے موقع پر پی ٹی وی والوں نے انٹرویو لیے۔ فرحان مشتاق پروڈیوسر تھے۔ ... بھی تھے اور افسردہ صورت بھی۔ سارے ہی آہیں بھرتے بہ چشم نم سٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ فرحان مشتاق نے انٹرویو کے شروع میں کہا.....

تین مرتبہ ایسے ہوا تھا

میرا دل اُن کو دیکھ کے زور سے دھڑکا تھا۔

پہلی مرتبہ اُس وقت تھا' جب لاہور ایئرپورٹ پر بوئنگ 737 کسی وجہ سے بڑے ایپرن کے بجائے جمبو Boy پر کھڑا تھا۔ پرانے ایئرپورٹ پر جہاں حاجی کیمپ کی سفید رنگ کی چھوٹی سی عمارت تھی' اُس کے بالکل سامنے ایک لمبا ٹاور تھا۔ اس ٹاور سے نکلنے والی زرد روشنی ہمیشہ مجھے ایک عجیب اُداسی بھرے رومانس سے بھر دیتی ہے۔ اسی ٹاور کے ذرا پرے طرف بوئنگ 737 آ کے رُکا تھا۔ سیڑھی والی گاڑی جہاز سے لگ چکی تھی۔ میں جب تک جہاز کے تینوں پہیوں میں ٹیک لگا کر سیڑھی تک پہنچا مسافر اُترنا شروع ہو چکے تھے۔ پھر اچانک وہ نظر آ گئے۔

میرا دل زور سے دھڑکا

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ

جہاز کے دروازے کو چھوڑتے ہوئے بالکل ہولے سے اُن دونوں نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ میں جو نیچے زمین پر سیڑھی سے ذرا پیچھے مبہوت کھڑا تھا' دو قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اشفاق صاحب نے بانو قدسیہ کی کلائی اس طرح تھامی ہوئی

تھی بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے کس کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بانو قدسیہ آپا نے سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھ
دھیرے دھیرے نیچے اُتر رہے تھے۔ زرد روشنی اور جہاز کے نیم تاریک بیک گراؤنڈ میں وہ دونوں اس وقار سے
تھے جس طرح کسی سلطنت کا درویش بادشاہ خاتونِ اوّل کے ساتھ اُترتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اِدھر شہنشاہ سیڑھی سے
اُترے اُدھر میں پروٹوکول آفیسر کی طرح کڑکتا ہوا سلیوٹ کروں۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اشفاق صاحب
ساتھ میرے قریب سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں سٹوڈیو میں تھا۔ سنٹرل پروڈکشن یونٹ لاہور کی ڈپٹی
انجم بھٹی نے مجھے کہا میرے کمرے میں اشفاق صاحب بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹوڈیو میں لے آؤ۔

یہ دوسری مرتبہ تھا کہ میرا دل زور سے دھڑکا تھا۔

میں انتہائی خوشی خوشی قدرے اضطرابی حالت میں کمرے میں پہنچا۔ ایک بوڑھا شخص کرسی پر ٹیک
بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں جیسے کسی سوچ میں تھیں۔ میں نے کہا ''سر! ریکارڈنگ کے لیے چلیں؟'' میں نے اشفاق
کے سنگ سنگ 45 یا 50 سیکنڈ کی مسافت طے کی۔ کتنے سوال، کتنی کتابیں، کتنے الفاظ تھے جو میں پوچھ سکتا تھا
اُن کا مزاج بھی نہ پوچھ سکا۔

مجھے پروگرام منیجر طارق احمد صاحب نے بلایا اور ایک چھوٹی سی فہرست ہاتھ میں تھما دی کہ یہ انٹرویو کر

میرا دل زور سے دھڑکا

یہ تیسری مرتبہ تھا

فہرست کے سب سے اُوپر لکھا تھا۔ بانو آپا

میں نے جو کچھ اس انٹرویو کے دوران کہا، حاضر خدمت ہے۔

میں نے خاں صاحب کے ساتھ زندگی کا ایک لمبا وقفہ گزارا۔ اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے
کیا۔ بارہا یوں ہوا کہ مجھے اُن کے عمل، سوچ اور رویہ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات میں گورنمنٹ کالج میں
جب ہمیں اکٹھے ایم اے اُردو کرنے کا اتفاق ہوا۔ خاں صاحب کی نیت ہر مقام پر بے داغ رہتی۔

کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدات، تخیل، احساس کے باوصف اُس کی سمجھ نہیں آ سکتی
کی سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو انسان کے کونے کھدرے ایسے رہ جاتے ہیں جن میں کئی خوبیاں اور خرابیاں چھپ جاتی
انسان کا پتھر اور دھات کے زمانے سے اب تک یوں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے رازوں کی بدولت ہے۔
ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے اعمال کو تولنے جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی
بدنیتی پر معمول ہوتی ہے اور کبھی کبھی رابن ہڈ جیسے لٹیرے بدی کے سر پر کامیابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

اشفاق صاحب نے اُردو بورڈ میں سروس کی۔ یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا برا بھلا کہا ہوگا لیکن یقین ہے
ڈسپلن کے تحت، مارے باندھے کیا ہوگا۔ کبھی کسی کی اے سی آر خراب نہ کی ہوگی۔ اُن کے جانے کے بعد مجھے پتہ چ

...کی مالی اعانت وہ کرتے رہے لیکن کبھی مجھے بھی نہ بتایا۔

اُنہوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام کیے۔ یقیناً یہاں بھی آویزش کے سلسلے ہوں گے خاص کر ''تلقین ... کی ریکارڈنگ کے دوران کاسٹ زیرِ عتاب آتی ہو گی لیکن بعدازاں اُن ہی کاسٹ کے بندوں کے ساتھ بیٹھ کر ... پیتے' خوش گپیاں جاری ہو جاتیں۔ اگر اُن کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو اُن کے جانے کے بعد اُن کے ساتھ کام کرنے ... نہیں اس طرح یاد نہ کرتے جیسے اب کرتے ہیں۔

گھر پر اُن کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ اُن کی زندگی میں پھر اُنہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ ... بھی پڑ جاتی۔ سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سبزی والا ملازمین جس طرح یہ لوگ اُنہیں ... تے اور روتے ہیں اس کی مثال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اور اس کی یہی وجہ ہے کہ اُن کی نیت آئینے کی طرح صاف تھی اسی لیے وہ تادیر کسی انسان سے ناراض نہیں رہ ... رشتے ٹوٹ جانے پر حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی نیت ... ڈول نہ ہوتی۔ شاید اسی لیے وہ کبھی منافقت کے شکار نہ ہوئے۔ غلطی سرزد ہو جاتی۔ بڑی شرمساری سے اعتراف ... اچھائی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی نیت کی بدولت نہ اُن کی تحریر میں کبھی ... آیا نہ ہی زندگی میں۔

مجھے اُن کے برعکس دیہات سدھار کا اتنا شوق ہے دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا لپکا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک ... سارے جہان کو مشورے دیئے جاتی ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے کہ جہاں اُنہوں نے مجھے لکھنے ... اتنی تعلیم دی وہاں مجھے بابوں کی یہ تربیت دیتے کہ جہادِ نفس کیسے کرتے ہیں؟ اور ہر گرم و سرد میں اپنی نیت کے ... کو سیدھا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

● ● ● ● ● ● ●

لوگ لوگ

محمد یحییٰ خاں

محمد یحییٰ خاں کالے کپڑوں میں ملبوس گلے میں موٹے منکوں کی مالائیں سجائے، لمبی لمبی زلفوں اور
چھپائے ایک عجوبہ روزگار شخصیت ہیں۔ ان کے اندر اور باہر واضح طور پر دو راستے ہیں۔ پتہ نہیں یحییٰ خاں
ہے۔ اگر وہ درویش ہے تو دوسرا ادیب کون ہے جو اس وقت پاکستان کے جملہ ادیبوں میں اپنے منفرد سٹائل کی
چوٹی پر ہے۔ اس کے ادب کا رجحان منٹو کی طرح ایسے لوگوں کو رفعت بخشتا ہے جو سوسائٹی میں عزت کے تاج
کی کہانیاں، مشاہدے سے زیادہ تخیل کی مرہون منت ہیں۔ یحییٰ خاں نے نگر نگر، دیس دیس ہر مسلک کے لوگ
سے دیکھا اور اپنے مشاہدے سے وہ ادب تخلیق کیا جو قاری کے لیے ہوشربا ہے۔

یحییٰ خاں کا بہت پہلے سے اشفاق صاحب سے ملنا ملانا تھا۔ وہ خاں صاحب کے پیروں پر سجدے
برا لگتا کیونکہ میرا خیال ہے سجدہ فقط اللہ کے لیے ہے لیکن خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے۔ وہ یہ
گناہی بوجھ بڑے شوق سے اٹھاتے۔

وجدان و حقیقت، سنی سنائی اور دن بیتی یحییٰ خاں کی کہانیاں ہر سمت کی کہانیاں ہیں۔ مجھے سب سے
ان کی کتاب ''پیار رنگ کالا'' کی معرفت ہوا۔ یحییٰ خاں نے فرمائش کی کہ میں اس کتاب پر کوئی رواں تبصرہ لکھ
پڑھنے کے بعد میرے چھکے چھوٹ گئے۔ اے کلاس ادب پر کوئی بی کلاس لکھاری کیسے لکھے اور کیا لکھے۔

اشفاق صاحب کے جانے کے بعد بہت سے لوگ میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں
اور ان کے بیٹے بھی ہوتے۔ بہت جلد مصیبتوں کے مارے لوگوں نے یہیں ڈرائنگ روم میں یحییٰ خاں کے گرد ایک
عقیدت بنا لیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو سر پر دوپٹہ لینے پر مجبور کرتے۔ نئے عہد کی عورت اس پابندی سے
حاصل کر چکی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خود مختار تھی، نہ چھوٹی آستین کی قمیض ہی اسے کاٹتی تھی۔ نہ کھلے

...ے کا لباس۔

دوسری بات جو میرے لیے نا قابل برداشت تھی وہ میں نے یحییٰ خاں کو بتا دی۔ وہ مجھے سجدہ کرتے تھے، اسی ...میں نے انہیں داستان سرائے آنے سے منع کر دیا۔ اب وہ کم کم آتے ہیں۔ پوٹلی کھول کر ملازمین کو ڈھیر سارے پیسے ...ے ہیں۔ مٹھائیوں کے ڈبے بانٹتے ہیں اور راضی برضا چلے جاتے ہیں۔

بابا محمد یحییٰ خاں ولد محمد عمر خاں، سیالکوٹ (موری دروازہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی شہر میں چوتھی ...ت (نامکمل) تک تعلیم حاصل کی۔ دو شادیاں کیں۔ ایک ناکام اور دوسری کامیاب۔ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے ...پ ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مثلاً من مندر۔ من مسجد۔ شب دیدہ۔ موم کی مورت۔ گل شبو۔ آہ آہو۔ پیا رنگ کالا۔

مرزا ادیب

مرزا ادیب بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اشفاق احمد مجھ سے بہت جونیئر ادیب ہے، ...ں سے کیا ملتا پھروں۔ وہ ہمارے گھر آتے تو ان کے آنے جانے کا پتہ نہ چلتا۔ ایک دو مرتبہ مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مرزا ادیب منشی پریم چند کی کیٹگری کے ادیب ہیں اور ان کو ماڈرن تنقید کی ترازو پر تولا نہیں جا سکتا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی مرزا جی نے مجھ سے رابطہ رکھا لیکن احترام کے باعث میں اس میں بے تکلفی پیدا نہ کر سکی۔ یہ بھی عجب طور ہے کہ احترام بھی ایک بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے اور رابطہ مضبوط نہیں ہونے پاتا اور احترام نہ ہو تو بھی رابطہ کھل کھلا کر، دروپدی کی ساڑھی بن جاتا ہے جسے لپیٹنا ہر بندے کے بس کا نہیں۔ بس یہاں وہاں ہر جگہ توازن کی ضرورت رہتی ہے جو رشتے ناطوں میں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوطی پیدا کرتا چلا جائے۔ مجھے مرزا ادیب کی خود نوشت تحریر بعنوان "مٹی کا دیا" بہت پسند ہے کیونکہ اس میں انہوں نے خود انتہائی دلچسپ اور خوبصورت انداز میں اپنے حالاتِ زندگی بیان کر دیے ہیں۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی تبسم 4 اگست 1899ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ والد کا نام صوفی غلام رسول اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا۔ صوفی تبسم کا نام غلام مصطفیٰ رکھا گیا۔ صوفی تبسم نے جو عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارا وہ 23 برسوں پر محیط ہے۔ 1931ء سے 1954ء تک وہ اس کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بنائی جس کے تحت شیکسپیئر کے کئی ڈرامے ترجمہ کر کے

سٹیج بھی کروائے۔ ڈرامیٹک کلب کے تحت سٹیج کرائے گئے ڈراموں میں ''ساون رین داسفنہ'' اور ''خطرناک لوگ''
طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیکسپیئر کے ڈرامے Mid-Summer Night Dream کا پنجابی ترجمہ ''ساون رین داسفنہ'' کے
سے کیا۔ Such men are dangerous کا اردو ترجمہ ''خطرناک لوگ'' کے نام سے کر کے صفدر میر اور رفیع
ڈائریکشن دلوائی۔ یہ ڈرامے اس قدر مقبول ہوئے کہ ہر سال سٹیج کیے جاتے۔ ایک خصوصیت ان ڈراموں کی یہ بھی
صوفی صاحب نے بطور ایکٹر بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

''دلی کی آخری شمع'' کے عنوان سے مشہور تمثیل میں برصغیر کے نامور شعراء کے نام اور کلام کو نئی نسل
روشناس کرایا گیا۔ یہ وہ بڑا اور کامیاب کارنامہ تھا جس کی یادگار تصاویر آج بھی گورنمنٹ کالج کے ہال میں زندہ
ہیں۔ بلاشبہ گورنمنٹ کالج کا یہ علمی وادبی عروج کا زمانہ تھا۔ یہ دور ڈی جی سوندھی کا تھا جو پطرس بخاری سے پہلے گورنمنٹ
کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ صوفی تبسم نے تعلیم بالغاں کے لیے ایک جریدہ ''دوست'' کے نام سے نکالا جو اپنی کی
میں خاصا کامیاب رہا۔

گورنمنٹ کالج میں ادیب فاضل کی شام کی کلاسیں بھی صوفی صاحب نے ہی شروع کرائیں۔ صوفی صاحب
ریڈیو پاکستان کے مشیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ریڈیو کے لیے دن رات تیزی اور مستعدی سے کام کیا۔ وہ ''علامہ کا
ایک شعر'' پروگرام میں علامہ اقبال کے فارسی کے کلام کا ترجمہ پیش کرتے۔ یہ پروگرام بے حد مقبول تھا اور لوگ خاص
یہ پروگرام صبح آٹھ بجے ریڈیو پر سنا کرتے تھے۔

انہوں نے ریڈیو فیچر اور سکرپٹ بھی لکھے۔ اس کے علاوہ وہ ناٹک لکھا کرتے تھے۔ ان کی فن میں مہارت
سے ظاہر ہے کہ وہ چند لمحوں میں بڑے بڑے مشکل موضوعات کو کاغذ پر اتارتے اور اگلے چند لمحوں میں وہ الفاظ ہوا میں
گردش کر رہے ہوتے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ انہوں نے
پررہ کر بہت سی ایسی نظمیں تحریر کیں جن کو اس وقت کے مشہور گلوکاروں نے گایا، جن میں ریڈیو کے بچوں کے پروگرام کی
کمپیئر ''شمیم آپا'' سرفہرست ہیں۔ صوفی تبسم کی نظمیں ''عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے'' ''گھنٹی بجاؤ، اس کو جگاؤ''
ریڈیو پاکستان کی لائبریری کا ایک لازوال سرمایہ ہے۔ ان کی نظموں کو نذیر بیگم، خورشید بیگم اور بہت سے فنکاروں نے
بچوں کا پروگرام جو ہر اتوار کو نشر ہوتا، بچے صوفی صاحب کی نظموں کا انتظار کرتے۔ ''یہ گاؤں ہمارا یہ گاؤں ہمارا'' خورشید
نے بہت خوبصورت گایا، جو آج بھی بچے شوق سے سنتے ہیں۔

''پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار، ایک چوہا باہر رہ گیا پیچھے باقی رہ گئے چار'' یہ نظم بھی بچوں کے
پروگرام کے لیے ہی ریکارڈ ہوئی اور ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

صوفی تبسم صاحب کی غزلیں

1- وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

2- یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب

3- کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں

4- داغ دل کے فروزاں کرو دوستو

نذیر بیگم نے بھی صوفی تبسم کے بہت سے پنجابی گیت گائے اور بے حد مقبول ہوئے۔ غلام علی کی وجہ شہرت بھی صاحب کی غزل ہے جو انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا ترجمہ کیا تھا۔ آج بھی مقبول ہے۔

"میرے شوق دا نئیں اعتبار تینوں، آجا ویکھ میرا انتظار آجا"

نسیم بیگم نے صوفی تبسم کی غزل بھی گائی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی

دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

پاک بھارت 1965ء کی جنگ کے موقع پر صوفی تبسم کے جو نغمے ریڈیو سے نشر ہوئے، وہ پوری قوم کے ت کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جنگی ترانے ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری شاعری کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

تو لبھدی پھریں بزار کڑے

چچا غلام علی

روم جانے سے پہلے اشفاق صاحب دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے تھے۔ سید عابد علی عابد کالج کے پرنسپل تھے۔ میں کم اور محبت سے راہ لگانے پر زیادہ اصرار کرتے تھے۔ بڑی بے تکلفی سے سٹاف روم میں آ کر بیٹھ جاتے۔ مسائل تک زیر بحث آتے۔ طالب علموں کے کردار، ان کی محنت اور جانفشانی کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے راستے کیے جاتے۔

سٹاف روم میں اشفاق صاحب اور ڈاکٹر غلام علی (جو بھی ڈاکٹر نہیں تھے) کی موجودگی اس میلے کی روح رواں اشفاق صاحب اپنی گفتگو، مزاح آفرینی، مل جل کر کھانے پینے کی روایت سے محبت کا الاؤ جلائے رکھتے۔ پروفیسر اپنی خاموشی اور ذات کے حوالے سے پوری انجمن تھے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ اردو کے ادیب پروفیسر صاحب دیال کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایسا نستعلیق انگریزی لہجہ کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

دراز قد پروفیسر غلام علی اپنے طالب علموں کو کالج کے بعد دیر تک پڑھاتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ باغ جناح میں اپنی کلاس لے کر چلے جاتے اور وہیں طالب علموں کو انگریزی لٹریچر سے متعارف کراتے۔ باغ جناح کی چاٹ خاں صاحب کو پروفیسر غلام علی سے ہی لگی تھی۔

خاں صاحب روم سے واپسی پر جب اردو بورڈ میں ملازم تھے تو بھائی غلام علی ان کے پاس بڑی باقاعدگی سے

آیا کرتے تھے۔ ہم داستان سرائے میں منتقل ہو چکے تھے۔ عفت اپنی بیماری کے دوران ہمارے پاس قیام پذیر تھی۔
غلام علی ان کی طبیعت پوچھنے آتے لیکن انہوں نے کبھی اندر آ کر عفت سے طبیعت نہ پوچھی بلکہ باہر سے ہی بیمار پُرسی کر
چلے جاتے۔

ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بابا فضل شاہؒ کے ڈیرے پر جاتے لیکن کبھی گفتگو یا سوال جواب میں شامل
ہوتے۔ وہ اپنے تذبذب اپنے مسائل اپنے تک محدود رکھتے۔ بس کچھ ہاتھ باندھے سر جھکائے جیسے دعا کے عالم
کر کھڑے رہتے۔ جب عفت بہت بیمار ہو کر میو ہسپتال پہنچی، Dialysis کے باوجود اس کی صحت مخدوش تھی۔
بھی بھائی غلام علی آتے اور نیچے نرسوں اور لواحقین سے طبیعت پوچھ کر روانہ ہو جاتے۔

عفت ان کی بیمار پرسی کے انداز سے بہت متاثر تھی۔ ہمیشہ مجھ سے کہتی "قدسیہ! کس قدر Decent
ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے کچھ کروں لیکن میں ایک انگریزی کے پروفیسر کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

پتہ نہیں یہ عفت کی خیرسگالی تھی کہ اس کی دعائیں بھائی غلام علی مکہ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ ان کی
اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ گئیں۔

جب خاں صاحب پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو بھائی غلام علی نے ٹکٹ بھیجا اور انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ جب
یونیورسٹی چلے جاتے تو خاں صاحب سیزی اور مُنّی کے ساتھ پیچھے جاتے۔ ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ان کا
ہو گیا۔ خاں صاحب نے کئی عمرے کیے۔

ایک بار جب شہاب صاحب ساتھ تھے۔ صرف اس بار ہم ان کے پاس نہیں ٹھہرے۔ شہاب صاحب
کہ حاضری کے دوران کم سے کم انسانی رشتوں میں Involve ہونا چاہیے۔ عموماً ٹکٹ بھی وہی ادا کرتے تھے۔
آخری بار کے جب میں اور خاں صاحب مکہ پہنچے تو غلام علی بھائی Edinburgh میں پی ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔

جب پہلی مرتبہ میں اور خاں صاحب عمرہ کرنے گئے تو مجھے سیزی کی محبت کا پتہ چلا۔ وہ میرے ساتھ
طرح رہتی۔ دور سے اشارے کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتی۔ ذکیہ کا معمول تھا کہ وہ ہمارے کھانے پکانے
جاتی۔ مُنّی کبھی ساتھ چلتی کبھی پیچھے رہ جاتی لیکن سیزی نے کبھی ناغہ نہ کیا۔

مجھے اچھی طرح وہ منظر یاد ہے جب ہم خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ یکدم کالی گھٹا کہیں سے اٹھی۔ ہر طرف
ہو گیا۔ لمحوں میں موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ خاں صاحب اٹھے اور نیچے حطیم کی طرف چل دیے۔ یہاں خانہ کعبہ
سے پانی کے نکاس کے لیے ایک بڑا پرنالہ ہے۔ بارش کا پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ مجھے اور سیزی کو چھوڑ کر خاں صاحب
نیچے کی طرف اترتے جا رہے تھے۔ پھر وہ پرنالے کی سیدھ میں کھڑے ہو کر اللہ کی رحمت میں خوب نہائے۔ مجھے لگا جیسے
کے گناہ ان سے جھڑ رہے ہوں۔ ایسے ہی جب ہندو لوگ گنگا اشنان کے لیے جاتے ہیں، تو انہیں احساس ہوتا ہے
جون ملی ہے اور وہ نوزائیدہ بچے کی طرح پوتر ہو گئے ہیں۔

خاں صاحب لوٹے تو ان کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ براؤن آنکھوں میں ایک چمک اور چہرے پر
شانت سی مسکراہٹ تھی۔

''احرام نچوڑ لیں چچا۔'' سیزی نے کہا۔
''نہیں بیٹا...... ایسا پانی کب ملتا ہے، خود ہی سوکھ جائے گا۔''
''پھر گھر چلیں۔''
اب اس کا اصرار بڑھ گیا تو خاں صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔
جس بار ہمارے ساتھ شہاب بھائی عمرہ کرنے لگے۔ شہاب صاحب کہنے لگے۔ ''اشفاق! تم اور قدسیہ میرے ہوٹل میں رہو۔ بھائی غلام علی کو اس بار زحمت نہ دو۔''
''لیکن شہاب بہت خرچ ہوگا۔''
''نہیں بھائی میں ڈبل بیڈ والا کمرہ لوں گا۔ میں اور تم ڈبل بیڈ پر سوئیں گے اور قدسیہ کے لیے ایک ایکسٹرا بیڈ لگوا لیں گے۔''
اس عمرہ کے دوران مجھے پتہ چلا کہ شہاب بھائی سونے کا تو بہانہ کرتے تھے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر وہ چپکے سے اٹھتے اور خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ہم سے تو فجر کی نماز بھی پکڑی نہ جاتی تھی لیکن جب وہ غالباً اشراق پڑھ کر لوٹتے تو کبھی غلطی سے بھی ہماری اس غفلت کی طرف اشارہ نہ کیا۔ کسی شریعتی معلم کی طرح ہمیں احساس نہ دلایا کہ ہم کیسی سعادت کھو رہے ہیں۔
غالباً شہاب صاحب کا مسلک یہ تھا کہ خود اللہ انسان کو فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو پھر انسان کو اس فیصلے پر حاوی ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی مثال سے اگر بات کسی تک پہنچ سکتی ہے تو خیر ورنہ اجتناب ہی بہتر ہے۔
جس بار ہم اپنی ٹکٹ خود خرید کر عمرہ کرنے گئے۔ غالباً یہ ہمارا آخری سفر تھا۔ جدہ ایئرپورٹ پر ہمیں جنگی (نعیم میں مشتاق صاحب کے کزن ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہی ہمیں مکہ میں ایک ایسے ہوٹل میں چھوڑ گیا جو خانہ کعبہ سے بہت قریب تھا۔
اس بار بھائی غلام علی مکہ میں موجود نہ تھے۔ وہ اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے لیے لندن جا چکے تھے۔ نہ سیزی کی چہک تھی نہ منّی کی خاموش شمولیت۔ نہ واپسی پر ذکیہ غلام علی ہی کے پکے کھانے اور اس کی خدمتوں سے حظ اٹھانے کا موقع تھا۔ ہوٹل کی دوسری منزل میں ایک کمرہ، غسل خانہ اور چھوٹی سی بیٹھک نما جگہ تھی جو نیچے جانے کا راستہ بھی تھا۔
ہم جب حاضری دے کر واپس لوٹتے تو راستے میں چھوٹا سا بازار ملتا جس میں ایک پاکستانی بی کلاس ہوٹل تھا۔
پہلی ہی رات جب ہم عشا کی نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے لوٹے تو اس ہوٹل پر رکے۔ خاں صاحب نے کچھ سالن مانگا۔
''اور روٹی......'' خوانچہ فروش نے سوال کیا۔
''ایک روٹی......'' خاں صاحب بے دھیانی سے بولے۔
دکاندار نے میری طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔ ''اور اس کے لیے؟''
''ہاں دو روٹیاں۔''
غالباً اس وقت خاں صاحب مکمل طور پر غائب تھے۔ انہیں میرا خیال تک نہ تھا۔

''لو......اور اس کو بھولنا نہیں۔''

ہم دونوں کھانا لے کر ہوٹل میں پہنچے۔

اسی قیام کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ اور بھی ہوا۔

رات کے وقت تک خاں صاحب صفا اور مروہ کے مقام پر ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر بھاگ کر سعی دے رہے ہوتے اور میں اس کھلے دریچے میں شانتی سے بیٹھی خانہ کعبہ کے کالے غلاف کو تک رہی ہوتی کیونکہ میری سعی بی بی ہاجرہ کر چکی تھیں اور تمام عورتوں کو اس بھاگنے سے چھٹی دلا چکی تھیں۔ مرد ہانپتے کانپتے کچھ بوڑھے Wheel Chair پر بھاگم بھاگ آ جا رہے تھے۔ پچھتانے کے مارے مردوں کے چہروں پر ناخوشگوار احساسات واضح عیاں تھے۔

پھر میں نے دیکھا ایک گورا چٹا نوجوان (جو غالباً لبنان یا جنوبی ترکی کا تھا) نیچے والی قطار سے اُٹھا۔ ایک کاغذی گلاس اٹھایا اور اس میں زمزم کا پانی انڈیلا۔ زمزم کا یہ پانی اور ایسے گلاس جا بجا خانہ کعبہ میں پڑے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہاں ایک ہی گلاس ہوا کرتا تھا۔ گویا حکم تھا کہ امتِ محمدیؐ میں کوئی اونچ نیچ، چھوت چھات، تفرقے کی گنجائش نہیں۔ سب مثل یک قالب اور ہزار جان ہیں۔

جب سے مغرب نے مسلمان ممالک میں اپنی ہائیجین کا تصور رائج کر دیا، ہم اسلامی صفات اور طہارت کو بھولتے جا رہے ہیں اور اسی لیے ہم بھول چکے ہیں کہ اصل صفائی اور طہارت اندرون کی ہوتی ہے۔ بیرون صرف ہے جس سے مراد ایک نظام کی تخلیق ہے جس سے موتیوں کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام لیا جاتا ہے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ایک نوجوان بظاہر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ میری طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف اٹھایا اور مجھے پیپر گلاس میں زمزم کا پانی بڑی محبت اور احترام سے پیش کیا۔ پانی کا گلاس دے کر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میری نگاہوں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا۔

مجھے آج تک اللہ کی اس رحمت کی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی لگتا ہے اس گلاس کی وجہ سے میرے سارے دکھ سہل ہوئے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ یہ گلاس اس بات کا مظہر تھا کہ میرا عمرہ قبول ہو گیا۔ کبھی خوش فہمی ہوتی کہ میرے گناہ معاف کر کے مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح رحمت کا چشمہ دیا گیا۔

جب خاں صاحب لوٹے تو میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر بولے ''قدسیہ! یہ گلاس کہاں سے آیا۔ زمزم تو کافی نیچے پڑے ہیں۔''

میں نے واقعہ بیان کیا۔

''دیکھو اس گلاس کا دھیان رکھنا۔ ایسے واقعات عام طور پر نہیں ہوتے اور یہاں جو بھی پیش آتا ہے اس کے لیے شکر گزاری شرط ہے۔ تم اس کے معنی سمجھو نہ سمجھو احترام ضروری ہے۔''

اب میرے لیے یہ واقعہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ واپسی پر ایک مدت میرے پاس یہ یادگاری گلاس محفوظ رہا۔

ذکیہ غلام علی لاہور کالج فار ویمن میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ بھائی غلام علی ایڈنبرا میں پی ایچ۔ڈی مکمل کر رہے ... دونوں چھاؤنی والے پل سے ذرا سا اترائی میں اردو بورڈ کا خوبصورت دفتر تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک پر کچھ آگے ذکیہ ... خرید لی، لیکن اسے گھر بنانے کا شعور نہ تھا۔ خاں صاحب نے اس کے گھر کا نقشہ اپنی نگرانی میں بنوایا۔ اسی ٹھیکیدار ... نے داستان سرائے اور اردو بورڈ کی عمارتیں بنائی تھیں۔ ذکیہ کا گھر بھی تعمیر کرایا۔ اس گھر کا نام بھی ''ادب سرائے'' ... اس کی تعمیر بھی خاں صاحب کی زیر نگرانی ہوئی۔

شاید یہ ان مہمان نوازیوں کا ردعمل تھا جو بھائی غلام علی نے ہر عمرے کے دوران انہیں دکھائی تھیں یا شاید وہ دوستی ... جز و سمجھتے تھے کہ دوست کے کام آنا ہی سب سے بڑی دوستی ہے۔ بہرکیف اس گھر کی تعمیر کے دوران دونوں ... ذکیہ خاں صاحب کے بہت قریب آ گئیں۔

... نے ادبی دنیا میں بہت نام کمایا۔ کچھ عرصہ اردو بورڈ میں نوکری بھی کی اور اب اپنی بچی کے ہمراہ وہ ''ادب ... میں ہی رہتی ہے۔

زہیرہ ... علی کے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی کہانیوں نے باپ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ سیزی ... کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتی ہے اور وہ بھی ادب سرائے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

دونوں دوست ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی سانجھی خوبی یہ تھی کہ دونوں ''رول ماڈل'' تھے۔ ... بات وضاحت طلب ہے۔ ہمارے پاس ''رول ماڈل'' کے تین تصور موجود ہیں۔ ایک تصور مغرب کی سفید فام ... سے درآمد کیا گیا ہے۔ ایک رول ماڈل مشرق میں چین سے مستعار لیا گیا ہے اور تیسرا تصور رول ماڈل نبیؐ کی ... کردہ ہے۔

مغرب کے لوگ صرف کام کو اہمیت دیتے ہیں اور کام کرنے والے کی عزتِ نفس کا معیار اس کی کام کرنے کی ... کے تناسب سے ہے۔ اس کے بعد سارا معاشرہ بری الذمہ ٹھہرتا ہے۔ چین کا رول ماڈل باقاعدہ معاشرہ کا سند یافتہ فرد ہوتا ہے جیسے ماؤزے تنگ کے معیار پر پرکھ کر ساری قوم سر پر چڑھا لیتی ہے لیکن اس Workaholic ... اخلاق یا ذاتی خوبیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ ذاتی زندگی میں جھوٹا، فریبی، دغاباز، کیسی ہی کجی کا مظہر کیوں نہ ... میں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نبیؐ نے جس رول ماڈل کا تصور دیا ہے، وہ نرالا ہے۔ یہاں کردار، اخلاق اور دین داری رول ماڈل بننے کے لیے ... حق ہیں۔ اچھا انسان کامیاب اور کام کرنے والے انسان سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے۔ معاشرے کو ان کی مثال ... سامنے رکھنی چاہیے اور آنے والی نسلوں پر اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک میرا علم ہے خاں صاحب اور ان کے دوست بھائی غلام علی واقعی رول ماڈل تھے۔ ان کی اچھائی کے ... میں ان کی محنت چھپی تھی اور محنت بھی وہ اس لیے کرتے تھے کہ یہی وصف عبودیت ہے اور یہی حکم ہے کہ رزقِ حلال ... محنت سے کماؤ۔

قرۃ العین حیدر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عینی کراچی میں انفرمیشن کی ایک بڑی افسر تھی۔ پھر یکدم پتہ چلا کہ کسی ہم
نے ''آگ کا دریا'' پڑھ کر یہ رپورٹ حکومت کو دی کہ عینی تو پاکستان دشمن ہے۔ اس کی ساری وفاداریاں ہندوؤں کے
ہیں اور ایسا افسر پاکستان کے دوقومی نظریئے کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ لیجیے صاحب قرۃ العین حیدر دلبرداشتہ ہو کر ہند
سدھاریں۔ اکھنڈ بھارت کے پجاریوں کو ٹرپ کا پتہ ہاتھ آ گیا۔ دلّی میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ وہی دن تھے جب فہمیدہ ریاض بھی پاکستان بدر کر دی گئی تھی۔ اچھی بھلی وطن دوست کا ناس کر دیا۔ ایک
گزر گیا۔ پھر خاں صاحب سے ملنے اچانک یہ دونوں آ پہنچیں اور اتفاق ملاحظہ ہو دونوں ایک ہی دن ایک ہی وقت
روزِ قیامت ہو اور حساب کا وقت آ گیا ہو، ہمارے ہاں آئیں۔ خاں صاحب تو سوائے اپنے کسی کا حساب لینے وا
نہیں۔ دونوں سے بڑی محبت سے ملے۔

وہ شام بڑی سلونی مٹھلونی تھی۔ خاں صاحب کے ایک طرف عینی اور دوسری جانب فہمیدہ بیٹھی ہوئی تھی
سے پہلے میں نے قرۃ العین حیدر کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ عجوب نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔

''اشفاق یہ تمہاری بیوی بھی لکھتی ہے۔''

''آپ کو پتہ نہیں۔ انہوں نے ''راجہ گدھ'' لکھی ہے۔'' فہمیدہ بولی۔

''ارے بھئی میری نظر سے تو نہیں گزری۔''

''کتاب لا کر دو قدسیہ۔'' خاں صاحب نے نرمی سے آرڈر کیا۔

میں بھاگ کر ''راجہ گدھ'' لے آئی اور عاجزی سے عینی کو پیش کی جس طرح نئے لکھنے والے اپنی کتاب
بڑے لکھنے والوں کی خدمت میں حاضر کیا کرتے ہیں۔

عینی نے کتاب رکھ لی۔ کافی دیر کے بعد ایک روز مجھے خاں صاحب نے بتایا۔

''بھئی تم بہت Lucky ہو۔ عینی نے تمہاری کتاب پڑھ بھی لی ہے اور اسے پسند بھی کیا ہے۔ یہ بہت
ہے۔ ''آگ کا دریا'' لکھنے والی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ''راجہ گدھ'' پڑھے۔''

نیلے رنگ کی پھولدار ساڑھی، چہرے پر خوبصورت چشمہ، پیروں پر کیونکس کے پرانے نشان،
بغیر ہیل کے جوتی عینی کا وجود آج بھی بڑی صفائی سے میرے سامنے جھلملاتا ہے۔ عینی اور خاں صاحب فون پر گ
رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے لیکن میں اس بے تکلفی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

مفتی جی

مفتی جی کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کے جانے سے کس کا نقصان ہوا...... خاں صا

میرا؟...... کہ میرے بچوں کا؟ ہم سب الگ الگ عجب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں مہمانوں، رشتہ داروں، گھر کے ساتھ شیئر ضرور کرتے تھے لیکن دعویٰ ملکیت اپنی اندر کی جیب میں صرف اپنے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ ہم نے مفتی کو بھی اس کا دعویدار نہیں سمجھا۔

1947ء میں جب مفتی جی بٹالہ شہر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہوں نے سب سے پہلے والٹن کے رفیوجی کیمپ میں ملازمت کی۔ اس وقت لوگ اپنے خاندانوں سے بچھڑ کر اس کیمپ میں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اس کیمپ میں بچھڑے ہوئے لوگوں کی کھوج، ان کے ٹھکانے اور دکھ سکھ میں شریک ہونے اور کرنے کے لیے اپنوں کی تلاش تھی۔ مفتی جی یہاں پر افسر رابطہ لگ گئے۔ ان کے ہاتھ میں مائیکروفون رہتا۔ وہ پکار پکار کر لوگوں کے نام پتے پکارتے رہتے۔ ان کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ خاں صاحب بھی کلرک بھرتی ہو کر والٹن کیمپ جا پہنچے۔ نئے ملک میں نئے چہروں کے ساتھ یہ ایک نیا سفر تھا۔

پرانی یادیں اندر والی جیب میں دل کے ساتھ محفوظ کر کے پیٹی کس کے مفتی جی اور خاں صاحب کام کر رہے تھے۔ مفتی جی مجھے تو گورداسپور سے جانتے تھے، جہاں میری خالہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں اور مفتی جی اپنی بہن مفتی کو داخل کروانے کے لیے لائے تھے۔ میری ان کی واقفیت سرسری تھی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد نارمل زندگی کی اتھل پتھل ہو گئیں اور پرانے رابطوں کو مضبوط کرنے کے لیے وقت نہ ملا۔ لیکن اشفاق صاحب سے تو پہلی بار مفتی جی کیمپ میں ہی ملے۔

مفتی جی چہرہ شناس تو تھے ہی، جوہری کی سی نظر سے پتھر اور جوہر میں حد فاصل قائم کر لیتے۔ کچھ ہی دنوں کے اندر خاں صاحب کی ادب نوازی کا مفتی جی نے مکمل جائزہ لے لیا۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا...... ''بھائی! کچھ مائیکروفون پکڑنا بھی آتا ہے۔''

حیران ہو کر خاں صاحب نے پوچھا۔ ''جی...... کیا؟''

''بھائی کبھی ریڈیو وغیرہ سنتے ہو؟''

''جی میرے پاس اپنا ریڈیو ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ اناؤنسمنٹ کرو گے؟''

''جی کر لوں گا۔''

یہ وہ پہلی چاٹ یا چسکا تھا جو خاں صاحب کے منہ کو لگا۔ جس الیکٹرانک میڈیا کے آخر میں مفتی جی خلاف ہو گئے، اس کا لپکا بھی مفتی جی نے ہی لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ خاں کے ادبی کیریئر کو الیکٹرانک میڈیا کی سستی شہرت کھا گئی۔ فائدہ یا نقصان، ان دونوں نے ایک دوسرے پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ڈرامے کی طرف خاں صاحب مفتی جی کو ورغلا لے گئے لیکن ایک بات جو مفتی میں بڑی قابل ذکر نظر آتی ہے، وہ یہ کہ مفتی جی نے کبھی قلم کاغذ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

لکھنا لکھانا خاں صاحب نے بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کیا لیکن ان کی توجہ زیادہ ''تلقین شاہ'' اور ٹیلی ویژن کی طرف ہو گئی۔ مفتی جی ڈرامے سے منسلک رہے لیکن ڈھیلے ڈھالے۔ انہوں نے کبھی ہمہ وقت اپنی ساری

توجہ ادھر مبذول نہیں کی۔

ان دنوں جب خاں صاحب مزنگ روڈ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے، ان دنوں پاکستان میں مفتی جی کا قیام کرشن نگر میں سانده روڈ پر تھا۔ ان کے گھر کا نام Lovely Lodge تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ جہاں بھی رہیں ان کے گھر کا یہی نام ہو۔ 1950ء تک وہ یہیں سانده میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب پاکستان نے تراڑکھیل میں ایک آزاد ریڈیو سٹیشن کھولا تو مفتی اس کے موڈھی تھے۔ یہ ریڈیو سٹیشن بھارت کے پروپیگنڈہ کا جواب در جواب تھا۔ یہاں سے مفتی جی، یوسف ظفر اور خاں صاحب سکرپٹ تحریر کرتے جو اسی وقت تاج محمد صاحب، محمد حسین صداکار ہوا کے دوش پر بکھیر دیتے۔

1951ء میں مفتی جی پنڈی آ گئے۔ ان کا گھر B-365 میں سینٹ میری کالج کے پاس تھا۔ اس تمام عرصے کے دوران ان کا رابطہ خاں صاحب سے رہا اور میں ان کے دائرہ اثر سے دور رہی۔ پھر 1958ء میں وہ مشہور واقعہ ہوا جب وہ Deputation پر تھے۔ مفتی جی نے ایک اختلاف کی بنا پر اپنے افسر اعلیٰ کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ اس بے جا حرکت کے نتیجے میں انہیں suspend کر دیا گیا مگر شہاب بھائی کی مدد آڑے آئی۔ انہیں کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے دو مرتبہ رہائش بدلی۔ پہلے وہ منگھوپیر کے قریب ناظم آباد میں پاک کالونی میں رہے، پھر بندر روڈ پر پلازہ سینما کے قریب کرائے کا مکان لے کر آباد ہو گئے۔

اس وقت ان کے پاس آپا اقبال اور ان کے بھائی رفیق بھی رہتے تھے۔ جب مفتی جی کراچی میں مقیم تھے تو ہم شہاب بھائی کے مہمان ٹھہرے۔ ہمارے ساتھ بچے اور تبت کے بستر تھے۔ بچے اور بستر باتھ آئی لینڈ میں چھوڑ کر ہم مفتی جی کے پاس پہنچے۔ مفتی جی نے ہمیں بچوں کے بغیر دیکھ کر کہا..... "وہ بچے کہاں ہیں؟"

"وہ مفتی جی..... وہ سو رہے تھے۔ ان کو ہم عفت کے چارج میں دے کر آئے ہیں۔"

"ہاں بھئی جب بڑے آدمی سواگت کرنے کو ملیں تو پھر مفتی کہاں یاد رہتا ہے؟"

"یہ بات نہیں مفتی جی۔ اسی نے ٹرین کے ٹکٹ بھیجے تھے۔ میں کیا کرتا؟"

"یہ بھی مجھے ہی دھونس دی جا رہی ہے کہ شہاب ہماری دوستی afford کر سکتا ہے اور آپ جیسے غریب کرایہ نہیں دے سکتا۔"

اتنے میں آپا اقبال آ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "اشفو کھانا کھالو۔"

"ناں ناں..... ناں تم دال بھجیا کھلا دو گی۔ وہاں پتہ نہیں کیا ضیافت ان کا انتظار کر رہی ہو گی..... جانے دو۔"

ہم کچھ دیر سہمے سے بیٹھے رہے۔ پھر مجرموں کی طرح اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ مفتی جی نے ہمیں رخصت کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

1964ء میں ہی مفتی جی O.S.D. بنا دیئے گئے۔ یہ بھی شہاب صاحب کے توسط سے ہوا۔ وہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں کمرشل مارکیٹ کے قریب منتقل ہو گئے۔ ایک ہی سال گزرا تھا کہ انہیں حیدری چوک سید پور روڈ پر مکان الاٹ کر دیا گیا اور وہ صدر کے Speech Writer بنا دیئے گئے۔ 1969ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور ممکنی حسن

شروع ہو گیا۔

1978ء تک انہوں نے دو گھر اور بدلے۔ یہ دور اُن کی ملازمتوں کے لیے اہم نہیں ہے بلکہ اس دوستی اور عقیدت مندی کا مظہر ہے جو مفتی جی کو شہاب بھائی سے ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اس وقت ثاقب سمیت اپنی بہن محمودہ اور بہنوئی کے پاس رہتے تھے۔

شہاب کے بہنوئی امین صاحب بہت اچھی سرکاری نوکری پر تھے اور وہ بلو پچل اور ثاقب کو بڑی توجہ سے رکھتے تھے۔ یہاں مفتی جی ہر روز دو پان لے کر پہنچتے۔ کبھی یہ پان باہر ہی دے جاتے۔ کبھی شہاب صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی تو ان کے ہاتھ میں تھما دیتے لیکن انہوں نے کبھی اندر بیٹھ کر شہاب صاحب سے گپ شپ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

امین بھائی ان سے گھل مل گئے۔ 1978ء میں گھر بنایا۔ یہ گھر ایک برساتی نالے کے پہلو میں ہے اور سٹریٹ نمبر 32 پر واقع ہے۔ بقول مفتی جی انہوں نے اس گھر کی تعمیر میں چھچی انگلی برابر زور نہیں لگایا۔ روڑا، اینٹ، بجری سب امین صاحب کا دردِ سر۔ بنیادوں سے چھتوں تک ایک ایک سٹیج پر امین بھائی حاضر۔ دروازے لگے۔ پینٹ ہوئے۔ مفتی جی پیش خدمت۔

غرض یہ کہ یہاں بھی مفتی جی کو ان کے توکل کی جزا ملی۔ شہاب بھائی کی Wishing Well رنگ لائی۔ شہاب بھائی کا ایک یہ بھی فلسفہ تھا کہ اگر آپ کسی شخص کے لیے اچھے واقعات کی فقط آرزو ہی پال لیں تو عجب معجزانہ طریق سے یہ آرزو دعا میں بدل جاتی ہے اور جس کے لیے آپ بہتری کی خواہش پالتے ہیں اس کے ساتھ خوشگوار واقعات ہونے لگتے ہیں۔

میں مفتی جی پر عقیل روبی اور ابدال بیلا جیسی کتاب تو نہیں لکھ سکتی۔ میں تو فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح شہاب کے ساتھ ان کا تعلق بیج سے پھلتا پھولتا ایک تناور درخت میں بدل گیا اور داستان سرائے کے در و دیوار کیسے ان کی محبت کے شاہد بن گئے۔

داستان سرائے میں مفتی جی کبھی شہاب بھائی کے کمرے میں نہ ٹھہرے۔ یا تو برآمدے میں اپنا بیگ، پان، کتب کو کے لوازمات رکھ کر ایک بازار سجا لیتے یا پھر اندر ڈرائنگ روم میں اس آخری دیوار کے ساتھ چارپائی لگا لیتے جس کے ساتھ غسل خانہ ہے۔

میں ان سے جھگڑتی ''مفتی جی یہ کیا مذاق ہے۔ آپ پبلک کے لانگے میں کیسے آرام کر سکتے ہیں؟ اندر کمرہ خالی ہے۔ آپ اس میں رہیں آرام سے۔ جب چاہیں جب دل کرے لکھیں، جب جی چاہے کھانا منگوا لیں۔''

وہ تھوڑا سا ہنستے اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر بولتے..... ''ناں بھئی ناں میں پلید آدمی۔ میرا شہاب کے کمرے سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو اندر جھاتی مار کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔''

میں نے جب پھر کوئی دلیل دینا چاہی تو وہ بولے۔ ''کاکی! میں سلسل البول کا مریض ہوں۔ پیشاب بغیر نوٹس کے آ جاتا ہے۔ سارے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ غسل خانے کا دروازہ ساتھ ہے۔ کھولا اور اندر۔''

میں پھر بھی مُصر ہوئی تو ان کا جواب آیا۔ ''کا کی! میرے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ میں تو کبھی بھی برآمدے کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ ملاقاتی بلا جھجک آ جاتا ہے۔ احمد بشیر، پروین عاطف، مودی، نیلم ...... عقیل ابدال بیلا، اسلام بی بی۔ اب کس کس کو گنواؤں...... میں تیری محبت کو سمجھتا ہوں لیکن اتنا تو سمجھ پاگل کہ تیری محبت مجھے تکلیف دے گی۔''

میں چونکہ اپنی تکلیف وہ محبت کا کچھ کچھ ادراک رکھتی تھی، اس لیے دلیل کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

جب مفتی جی آخر آخر میں بہت بیمار ہوئے تو ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے لجاجت سے کہا ''قدسیہ مفتی جی بہت بیمار ہیں۔ شفایاب ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔''

''یہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے؟''

''پیشاب کی تھیلی ساتھ لٹکائے رکھتے ہیں۔ اوپر سے مسلسل کھانسی بھی ہے اگر......''

وہ چپ ہو گئے۔ پھر کچھ لمحوں بعد بولے ...... ''قدسیہ! جیسا دودھ کا کاڑھا تم مجھے پلایا کرتی تھیں اگر تم ویسا ہی پلا سکو تو؟''

بات ابھی بھی واضح نہیں تھی۔

''لیکن خاں صاحب! اس کا کاڑھا بنانے میں تو قریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے۔''

''لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''میں مفتی جی کو بلا کر یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اوپر سارا دن تخت پوش پر رہیں گے۔ رات کو میرے کمرے میں انہیں منتقل کر دیا کریں گے۔ میں ایک طرح سے ان سے وعدہ بھی کر چکا ہوں۔''

معاملہ طے ہو گیا۔

مفتی جی آ گئے۔ دودھ میں چھوہارے ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکایا جاتا کہ دودھ ایک تہائی رہ جاتا۔ اس میں چھوہارے ملا کر دن میں دو تین مرتبہ مفتی جی کو پلایا جاتا۔ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے کاڑھے نے مفتی جی کو پہلے کھانسی کے دورے کم ہوئے۔ آہستہ آہستہ کھانسی، بخار، بلغم سب غائب ...... سب سے آخر میں وہ ہلکا ہلکا بخار جو مدت سے ان کی جان توڑ رہا تھا، ختم ہو گیا۔

مفتی جی کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ ٹیڑھے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں سیدھے سبھاؤ چلنے لگے۔ مفتی جی نے واپسی کا پروگرام بنا لیا اور ہم دونوں کے اصرار کے باوجود وہ اسلام آباد چلے گئے۔ مفتی جی جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے تھے تو ان کے ارادے کو متزلزل کرنا مشکل تھا۔

عقیل روبی اور ابدال بیلا نے مفتی جی پر بہت خوبصورت، انوکھی اور جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے عقیدت مندوں نے اپنی محبت کے پھول ان کے چرنوں میں چڑھائے ہیں لیکن عکسی مفتی نے اس محبت میں اور ہی قسم کی بات کی ہے۔ اس کا مضمون پڑھیے اور عکسی کے لگاؤ کا خود ہی اندازہ لگایئے۔

ممتاز مفتی کی یادیں

از عکسی مفتی

ہمیں چھوڑ جانے سے چند روز قبل ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگے۔

"یار عکسی! تیرے لوک ورثہ دا کیہ فائدہ! یار، یاد رکھنا جب میں مر جاؤں تو دو شہنائیوں والے اور ایک ڈھول لے لینا اور گھر کے باہر خوب شادیانے بجانا۔ خوشی منانا۔ وعدہ کرو یار۔ ایسا ہی کرو گے۔"

والد سے کیا ہوا وعدہ تو میں نہ نبھا سکا۔

لیکن آج اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں ممتاز مفتی کا سوگ نہیں منانا چاہیے بلکہ انہیں celebrate کرنا چاہیے۔

So let us celebrate MUMTAZ MUFTEE

He was a gift to all us from ALLAH

مجھے یہ زعم تھا کہ ممتاز مفتی کے نام رفقاء کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں اور پھر ان میں سے بیشتر تو میرے بھی دوست ہیں لیکن یہ زعم ان کی وفات پر پاش پاش ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے اُمڈ پڑے۔ اچھے بھلے عمر رسیدہ بزرگ دھاڑیں مار مار رو رہے تھے۔ کچھ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔

"باپو باپو۔ میں یتیم ہو گیا۔"

میں حیرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کیونکر یتیم ہو گیا؟ میں سوچتا رہا۔

میرا خیال تھا لوگ آئیں گے، مجھے سہارا دیں گے، گلے لگائیں گے۔ دلاسہ دیں گے۔ غم بانٹیں گے۔ الٹا مجھے ان سب کا دکھ بانٹنا پڑ گیا۔ اور تو اور وہ مولوی حضرات جنہوں نے "لبیک" کے چھپنے پر مفتی جی کے خلاف فتوے جاری کیے۔ یہ کون ہے جو بیت المکرم کو "کالا کوٹھا" کہتا ہے۔ اس کی یہ جسارت کہ حج کا تمسخر اڑائے کہ "کوٹھے والا مجھے آنکھیں مارتا ہے۔"

ان ہی میں سے ایک مولانا ممتاز مفتی کے قلم کو اسلام کی تلوار سے تشبیہ دینے لگا۔

میں حیرت سے سنتا رہا۔

اسی موقع پر جیب کترے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جیب کتروں کا ایک پورا گروہ جنازے کے دوران ممتاز مفتی کے مداحوں کو لوٹتا رہا۔ بہت سوں کی جیبیں کٹ گئیں۔

ایک صاحب جن کی جیب کٹ چکی تھی، فرمانے لگے: "کیا مذاق ہے۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے بھی ہاتھ دکھا گئے۔" پاس ہی کھڑا احمد بشیر بولا: "نہیں صاحب۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے سب کو کچھ دے گئے۔ جیب نہیں اپنا دل ٹٹولیں

اور کہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

ممتاز مفتی جیب کتروں کو بھی کچھ دے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی کو بچپن سے اپنے گھر کے ماحول سے سخت نفرت تھی۔ جب ان کے والد مفتی محمد حسین نے دوسری شادی کر لی تو ممتاز مفتی کی والدہ صغراں بی بی کی حیثیت گھر میں نوکرانی کے برابر رہ گئی۔

اپنے والد کے خلاف شدید غم وغصہ تھا۔

گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

کتنے ہی برس، کئی سال بیت گئے۔ والد مفتی محمد حسین نوے برس کو پہنچے لیکن ممتاز مفتی نہ ان سے ملے نہ کبھی

وہ ایسے ہی اگر کبھی کسی سے روٹھ جاتے تو برسوں بات نہ کرتے۔ بہت غصے والے تھے۔

بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے۔

ایف اے اور بی اے میں انگریزی امتحان میں ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ کہتے تھے تعلیم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا

لیکن 1935ء میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔

سکول میں انگریزی پڑھانے لگے۔

Recession کا دور تھا۔ چالیس روپے تنخواہ پائی۔

باپ انسپکٹر آف سکولز تھا۔ کسی نے یوں ہی چھیڑ دیا۔ مفتی سفارشی ہے۔ باپ نے کہلوا بھیجا۔ گھر واپس آ جاؤ

بس اسی دن سکول سے استعفیٰ دے دیا۔ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ شہر ہی چھوڑ دیا۔

ممتاز مفتی باغی تھے۔ والد، گھر بار، رشتہ دار، عزیز و اقارب سب کو چھوڑ چکے تھے۔ کسی رشتہ دار کی جرأت نہ تھی کہ

ممتاز مفتی کو ملے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس قدر باپ سے نفرت تھی، اسی قدر مجھ سے پیار تھا۔ کہتے، دیکھو

تمہارا کوئی تایا ہے نہ پھوپھا۔ نہ ماما ہے نہ چاچا۔ بس ایک میں ہوں تمہارا ابا۔ میں ہی تمہارا دوست اور میرے سب دوست

بھی تمہارے دوست ہیں۔ والد سے نفرت اب پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے کہا کبھی، چپ اور اسمارائیں جیسا ادب تخلیق کیا۔ وہ نفسیاتی افسانے جسے لوگ ''گندی

کہانیاں'' بھی کہتے ہیں، دراصل ممتاز مفتی کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ معاشرے کی گھٹن، رسم و رواج کی

پابندیاں اور گرامر و زبان کی قیود کے خلاف۔ ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کا یہ اہم دور تھا۔

وہ صرف جنسی حوالے سے فرائیڈین نہ تھے بلکہ Hatred father جو فرائیڈ کے فلسفے کا اہم ستون ہے

پورا پورا لاگو ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت میں تضاد ہی تضاد تھا۔

غصیل اور باغی ہونے کے باوجود ممتاز مفتی شرمیلے تھے، ڈرے ڈرے، سہمے سہمے، خوف زدہ، احساسِ

کمتری کے شکار۔

کبھی کسی بڑے افسر سے نہ ملتے۔

دفتر میں چپڑاسیوں اور کلرکوں کو دوست رکھتے۔ انہیں یار کہتے۔ انہیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔
افسر سے خوف یا پھر شدید غصہ رکھتے۔
ایک افسر کو گھونسہ مارنے پر کئی سال معطل رہے۔
پیشاب کی حاجت ہو تو کبھی Officers' Toilet نہ جاتے۔ Staff Toilet تلاش کرتے ہمیشہ یا باہر کسی جھاڑی میں بیٹھنا گوارا کر لیتے۔

1950ء کے لگ بھگ ممتاز مفتی میں تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نویس تھے اور ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر کام کرتے تھے۔ ممتاز صدیقی، مسعود قریشی، اشفاق احمد، یوسف ظفر، باقی صدیقی، محمد حسین ان کے ہم عصر دوست تھے۔

فطرت تو نہ بدلی۔ وہی شدت، وہی غصہ، طبیعت کا تضاد اور احساس پن تو ویسا ہی رہا لیکن رخ بدل گیا۔
نہ جانے کسی بابے کی دعا تھی یا کسی بزرگ کی نگاہ یا خود قدرت اللہ شہاب کا چمتکار۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تبدیلی آئی ضرور۔

ممتاز مفتی کی تلاش ذات نے رخ تبدیل کر لیا۔ شخصیت کی صفات تو نہ بدلیں البتہ ارتقاء نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ ایک نیا راستہ اپنا لیا۔ پھر ممتاز مفتی بابوں اور خانقاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ عقیدت کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔
لیکن اس سفر میں ہر موڑ پر قدرت اللہ شہاب سے ان کے گہرے مراسم یا خط و کتابت رہی۔ آہستہ آہستہ ممتاز مفتی کی شدت مجذوبانہ رنگ اختیار کرتی گئی۔ ممتاز مفتی مجذوب ہو گئے۔
شکر ہے خدا کا کہ پورے پورے مجذوب نہ ہوئے لیکن کسی درجہ ایسے ہی جیسے نارنجی میں کچھ کچھ مالٹے کا ذائقہ ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی میں بھی ایک مجذوب تھا۔
اسی دور میں ممتاز مفتی نے ''لبیک'' اور ''الکھ نگری'' جیسا ادب تخلیق کیا۔ خانہ کعبہ کو کالا کوٹھا یا اللہ کو کوٹھے والے سے تشبیہ دینا کسی مجذوب کی تحریر تو ہو سکتی ہے، ہوش مند ادیب کی نہیں اور کسی مجذوب ہی کو یہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایسی گستاخانہ باتیں لکھے اور صاف بچ نکلے۔
آپ اور میں پورے ہوش میں ایسی تحریر نہیں لکھ سکتے۔
پھر ایک دن اچانک قدرت اللہ شہاب چل بسے۔ ممتاز مفتی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ عقیدت کے وہ تانے بانے جو ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کی ذات کے گرد بُن رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بے محل وقوع بے جہت ہو گئے۔ وہ امید کی کرن، پاکستان کا عروج جس کا ممتاز مفتی کو یقین تھا کہ وہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی ہی میں حقیقت بن جائے گی، بکھر کر رہ گئی۔ ممتاز مفتی کا مدار چھن گیا۔
قدرت اللہ شہاب کے مرنے کے چند ہی سال بعد ممتاز مفتی کا محبوب بیٹا عکسی مفتی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ عکسی نے دوسری شادی کر لی۔ ممتاز مفتی کو دوسری شادی سے سخت چڑ تھی۔ اس نے اپنے والد کو کبھی معاف نہ کیا تھا۔ بیٹا دوسری شادی

کرتے ہی گھر چھوڑ گیا تو ممتاز مفتی بالکل تنہا رہ گیا۔ تن تنہا۔ اس کی نفرت بے معنی ہو کر رہ گئی۔

اس کی موج در موج محبت اور عقیدت کا نہ کوئی ساحل رہا نہ کنارا۔

وہ اکیلا تن تنہا Old man & the Sea کی طرح چپو مار مار کر اپنی کشتی ٹھیلتا رہا۔ اس میں زندگی کی اُمنگ اب بھی باقی تھی۔

آخری سانس تک ممتاز مفتی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ علی پور کا ایلی تھا۔ ہار ماننا اس کا شیوہ نہ تھا لیکن اب مفتی دھیما پڑ چکا تھا۔ مجذوبیت رنگ بدل کر فقیری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک بوسیدہ بستر پر پڑا رہتا یا پھر رنگین ٹکڑیوں والی رلی پر بیٹھ کر کچھ لکھتا رہتا۔ کچھ سوچتا رہتا۔

لوگ یوں ہی کھچے چلے آتے۔ لوگوں کی سیوا اس کا مسلک بن چکا تھا۔ ایک گھنے درخت کی طرح اس کا سایہ دور دور پھیل چکا تھا لیکن اس کی تلاش ختم نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کی آرزو جوان تھی۔ اس کی جستجو میں چمک تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا نہ تھا۔ اس کا سفر جاری تھا۔

"قلم میں لامکاں کی آرزو رکھنا
نوے یا سو سال، آخر ٹوٹ جاتی ہے
گئے ممتاز مفتی جی
ازل سے تا ابد پھیلی
کہانی رو پڑی ہے۔"

ممتاز مفتی کی زندگی دراصل ایک طویل تلاش ہے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام بھی "تلاش" ہے۔ 1905ء سے لے کر 1945ء تک جو کچھ ان پر بیتا اس کا نام "ایلی" رکھا۔ یہ پہلا حصہ ممتاز مفتی کی عالم شہادت کی روئیداد ہے۔ "علی پور کا ایلی" تلاشِ ذات کا ناول ہے۔

1950ء سے 1990ء تک کی آپ بیتی کو "الکھ نگری" کا نام دیا۔ یہ دوسرا حصہ ممتاز مفتی کا عالم الغیب کا سفر ہے۔ "لبیک" اور "الکھ نگری" دراصل تلاشِ خدا کی روئیداد ہے۔ دونوں ہی ممتاز مفتی کی تلاش ہیں۔ وہ مشاہدات جن میں سے ممتاز مفتی گزرا اور جن کی بدولت مفتی "ممتاز" ہو گیا اور دونوں تصانیف میں بلاشبہ بہت تضاد ہے۔

"علی پور کے ایلی" کے دھواں دھار اندھیرے آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ ایلی کے اندھیرے اور "الکھ نگری" کے چمکیلے خواب ایک دوسرے سے جس قدر مختلف ہیں، اسی قدر ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کی اہم کڑیاں ہیں۔ یہ ایک ہی عمل کے دو Aspects ہیں، دو رخ ہیں۔

اس عمل کے دوران کئی شخصیات، کردار، روحانی بابے، بزرگ، عامل پروفیسر حتیٰ کہ خود قدرت اللہ شہاب سنگِ میل تو ضرور ہیں منزل نہیں۔ ممتاز مفتی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، جاری ہے۔

ممتاز مفتی کی تلاش جاری ہے۔

ان کی وفات کے بعد ایک لڑکی نے فیصل آباد سے مجھے خط لکھا۔ لکھتی ہیں:

''ممتاز مفتی کبھی مر نہیں سکتے۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے اندر زندہ ہیں۔ اپنے جذبے کی پوری سچائی کے ساتھ اپنی خوبصورت عقیدت کے ساتھ۔ ان کی تلاش بھی ان کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ ان کو خدا ملا یا نہیں، یہ تو وہ جانتے ہیں گے یا شاید آپ؟ مگر میری تمنا تھی کہ کاش خدا کہیں میرے پاس ہوتا تو میں انہیں دے دیتی۔''

اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں گارڈن کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک روز کالج کے چند طالب علم میرے گھر آئے اور ممتاز مفتی سے کہنے لگے۔ ''اچھا تو آپ عکسی مفتی کے باپ ہیں۔''

یہ سن کر میرے والد کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اسی شام اپنے ایک دوست سے کہنے لگے۔

''یار! آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے تو وہم وگمان میں نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ لوگ ممتاز مفتی کو بیٹے کے حوالے سے پہچانیں گے۔''

بس مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ''والد صاحب! اب پتہ چلا جو دل کو لگی۔ آخر میرا حوصلہ دیکھیں پچھلے کئی برس سے آپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ کالج میں پروفیسر ہوں، شعبہ نفسیات کا سربراہ ہوں، کئی قسم کے پاکھنڈ کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں ممتاز مفتی کا بیٹا۔''

بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا ''سر! پچھلے 38 برس میں نے زندگی آپ کی طرز پر گزاری ہے۔ اب میں اپنے طور پر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔''

ممتاز مفتی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہنے لگے۔ ''جاؤ عکسی اجازت ہے۔''

اسی دن میرا اور ممتاز مفتی کا راستہ الگ ہو گیا۔ اب میں 52 برس کا ہوں۔ کئی سال گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ممتاز مفتی کا بیٹا ہوں۔ ممتاز مفتی ہی میری پہچان ہے۔ ممتاز مفتی ہی میرا ورثہ ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی اعزاز نہیں۔

کچھ تو لوگوں نے مفتی جی کو جانا پہچانا اور پھر آپ تک پہنچایا۔ کچھ حسن اتفاق سے مفتی جی نے عرفان ذات میں ڈوب کر اپنا اتہ پتہ اور سراغ لگایا۔ اس سلسلے میں مفتی جی نے جو مضمون لکھا، وہ بھی پیش خدمت ہے۔

ایک ذاتی خاکہ

اس وقت اپنا یہ عالم ہے کہ اعضاء بے رحمی کے محکمے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں 86 سال سے ہم دن رات ٹک ٹک کر رہے ہیں، نہ کبھی جمعے کی چھٹی ملی ہے نہ عید شب برات کی۔ اب بس کرو بہت ہو لیا، ہم پر ظلم بند کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہے کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں آپ کو ٹاٹا کر کے رخصت ہو جاؤں۔ جناب والا! میری تحریر اور شخصیت کے متعلق چند خوش فہمیاں چل نکلی تھیں۔ سوچا رخصت ہونے سے پہلے احوال واقعی قلم بند کر جاؤں۔ حال ہی میں مَیں نے اپنی تحریر اور شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ عنوان ہے چھوٹا۔

ممتاز مفتی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سیانے کہتے ہیں، دو جگہوں سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔

دور سے!

بہت قریب سے!

چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے مضمون سند نہیں ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے بلکہ معذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے بن گیا۔ تالی بج گئی۔ یوں زندگی بھر لکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اسے اردو زبان نہیں آتی۔ اس کی تحریر کی Roots اردو ادب میں نہیں ہیں۔ اس نے کبھی شعوری طور پر ادب کے لیے نہیں لکھا۔ اس نے اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ادب کی خدمت ہی کی ہے۔ الٹا اہلِ ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے۔ اسے ادیب کا مرتبہ بخشا، اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

اس کے گھر میں کسی کو ادب سے خصوصاً اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بیٹے میں بڑی صلاحیت تھی لیکن اس نے کہا میں خود! میں خود! جیسے جان دار ضدی بچے کہا کرتے ہیں مطلب تھا، میں اپنا راستہ خود تلاش کروں گا۔ بنے ہوئے راستے پر چلنا گوارا نہیں۔ یہ تو بیٹے کا باپ سے تعلق ہے۔ بیوی کہتی ہے، کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اب بھی توبہ کر لے۔

دوست کہتے ہیں، تجھے تو سچ کے زعم میں خود کو سر بازار رسوا کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ نہ نہ نہ ہمیں دور ہی رکھنا، خبردار ہمارا تذکرہ نہ کرنا۔

مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔

اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو جان بوجھ کر التزاماً الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں تیرتے رہتے ہیں۔

دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں۔ لگ جائے تو ڈوب جاتے ہیں۔ مفتی دوسری قسم کا ہے۔ اگر آپ مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد دروازہ کھولیں مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روز گارڈن کی سیر کر کے آیا ہے۔

دروازہ بجے تو مفتی کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کوئی آ گیا، ظاہر ہے جو ڈرتا ہو کہ کوئی آ نہ جائے تو مہمان نوازی کیسے کرے گا۔

مفتی نے کسی مہمان کو کبھی ٹھنڈا یا گرم نہیں پوچھا۔ جب مہمان چلا جاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ اوہ ٹھنڈا گرم تو پوچھا ہی نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ انگریزی میں ایک مثال ہے جس کا پنجابی میں ترجمہ یوں ہوگا۔ ''ٹریا نہ جائے تے پچھے کھوڈیاں دا'' لوگ انتظار کرتے ہیں کہ کب مہمان آئے اور وہ کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان جائے اور وہ کھانا کھائے۔ مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے، دھول اڑاتا ہے، سدھ بدھ رہنے نہیں دیتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ ایک خنجر ہے جو انسان اپنے ہی دل میں بھونک دیتا ہے۔ دوسرے معنی پر خود کو سزا دینے کا نام ہے، خود کو چاٹی میں ڈال کر بلو ہنے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود، مان لینے کے باوجود وہ آج تک خود کو چاٹی میں ڈال کر بلو ہنے پر مجبور ہے۔ صاحبو! ہائے کیا چیز بے بسی ہوتی ہے۔ عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا رویہ کھٹا میٹھا ہے جسے انگریزی میں Love-hate relationship کہتے ہیں۔ مفتی میں ریڈار قسم کا ایک ریسیور لگا ہوا ہے۔ قرب و جوار میں کوئی عورت آ جائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر وہ بانکی نار ہو تو ٹماٹوں ٹماٹوں کرتا ہے۔

مفتی کو ہر راہ چلتی عورت سے عشق ہے۔ بلالحاظ جسم، خدوخال اور سٹیٹس۔ گورے رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آ جائے تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ ''لو ہیٹ ریلیشن شپ'' اس لیے پیدا ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ بڑی حسین اور بارعب خاتون تھی۔

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے سے محبت تھی۔ اس کیفیت سے محبت تھی، محبوب سے نہیں۔ محبوب کی حیثیت تو ضمنی تھی۔

اس کے نزدیک محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ خدوخال اہم نہیں، رنگ گورا ہو، عمر رسیدہ ہو کہ مٹیار ہو، جسم بھرا بھرا ہو، سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہر جائیت کی واضح دھونس ہو۔

مفتی کسی نیک یا وفا شعار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں، کہتا ہے محبت ایک فن ہے، یہ آج کل کی کھٹی مٹھی لڑکیاں کیا جانیں کہ محبت کیا چیز ہے۔ مفتی کے نزدیک محبت میں ممتا کا ہونا ضروری ہے۔ ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ ہر جائیت کی دھونس ہو تو سبحان اللہ۔

اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے کہ طوائف تن کے تقاضے سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔ صرف من کی بھوکی ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوفزدہ رہتا ہے۔ سمجھتا رہا تھا کہ اس نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے اور اس کا من بھاتا شغل یہ ہے کہ لوگوں کو اس بھٹی میں جلائے۔

پڑھ لکھ گیا تو اللہ سے منکر ہو گیا اور مذہب پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جیسے آج کے ہر پڑھے لکھے کا وطیرہ ہے۔ پھر پتہ نہیں ایک بزرگ نے کیا کیا اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ اسے اللہ سے گہری عقیدت پیدا ہو گئی۔ اللہ سے یارانہ لگ گیا۔ پھر اس پر حیرت طاری ہو گئی کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔ قدم قدم پر کرم نوازیاں کیوں کرتا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے۔ عقیدت کی بھرمار ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر یہ شکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے، اس لیے مظلوم ہے۔

1990ء میں دفعتاً مفتی کی نگاہ سے پردہ ہٹ گیا اور اسے حقیقت کی پہلی جھلک نظر آئی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو کہتا ہے، دیکھو سمجھو، غور کرو، عقل کو کام میں لاؤ۔ حقیقت پسند بنو۔ علم بدنصیب ہے۔ جب حق تمی اللہ سے منکر تھا، اب عقل نہیں رہی تو اللہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ممتاز مفتی شدت کا مارا ہوا ہے۔ اس کی شدت کا قوام

کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔

کہتے ہیں ایک عالم حکیم کی دکان پر گیا۔ کہنے لگا آپ کے پاس شیرا ہے۔ حکیم بولا، جناب شیرا تو ہے۔ یہ گاڑھا نہیں۔

مفتی کی شدت شین والی نہیں ش وئے والی ہے۔ زندگی بھر اس کے دوستوں کو اس کی شدت کے ... پڑے۔ شہاب نے کہا، مفتی کی دوستی پھوڑے جیسی ہے، جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ اشفاق احمد بولا نہیں ... سی سی کرتا رہا۔ احمد بشیر ہنستا تا اور قہقہے لگا تا رہا چونکہ وہ خود شدت سے لت پت ہے۔ بانو نے کئی بار کچھ کہنے ... کھولا، لیکن ممتاز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پروین کے لیے شدت کے کولہو میں پسنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ ...

''مفتی میں صرف شدت ہی نہ تھی، وہ شدت کو اک وصف سمجھتا رہا، اسی پر ناز کرتا رہا'' سمجھتا رہا کہ جس میں شدت ... میں خلوص ہے، ٹھنڈے میٹھے کرداروں سے الرجک رہا۔ اکاسی سال کا ہوا تو اس نے پہلی مرتبہ جانا کہ شدت ... عیب ہے اور زندگی ٹھنڈے میٹھے لوگوں کے دم سے ہری بھری ہے۔

مفتی نے اس حقیقت کو جان لیا سچے دل سے مان لیا کہ شدت ایک عیب ہے ایک رکاوٹ ہے لیکن ... اپنا نہ سکا۔ چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔

صاحبو! کسی چیز کو جان لینا سچے دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک ... رہے۔ کاش کہ وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

دوستو! سچی بات یہ ہے کہ میں نے ممتاز مفتی جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ اونہوں! خوش قسمت ... ایک لکی ڈیول ہے۔

اس نے بڑی Rich بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اللہ نے اسے بہت کچھ اور بن مانگے دیا ہے۔ ... اللہ نے اسے کئی ایک لعنتوں سے بچائے رکھا۔ امارت سے بچائے رکھا، اقتدار سے بچائے رکھا، عہدے سے بچا... ذاتی اہمیت کے احساس سے بچائے رکھا۔

بلّی ماراں دلّی کے بزرگ حاجی رفیع الدین نے 1930ء میں سچ کہا تھا۔ کہنے لگے، جوانی میں دھو... بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی لیکن بعد میں آپ کو بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔ واقعی مفتی کو زندگی میں بڑے اچھے ... ملے۔

اگر آج اللہ میاں ممتاز مفتی کے روبرو آ کھڑے ہوں اور کہیں...... ''مانگ کیا مانگتا ہے'' تو سوچ میں پڑ جا... گا، کیا مانگوں۔ جسے زندگی بھر بن مانگے ملا ہو، وہ بھلا کیا مانگے۔ اب تو وہ تکمیل کی خوشی میں سرمست پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے کہ کب گاڑی آئے اور کب وہ آپ کو ''ٹاٹا'' کہہ کر رخصت ہو جائے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ''مرد ابریشم'' لکھی تو سچ کے داعی مفتی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر ... کا اظہار کیا۔ کہنے لگے ''قدسیہ...... تو نے بڑی جھُوٹی سی کتاب لکھی ہے۔''

''کیا مطلب مفتی جی؟''

''تو نے شہاب کی شخصیت، اس کی بڑائی کو بے نقاب کرنے کے بجائے اپنے بچوں کا قصیدہ لکھا ہے۔ بچوں کو Build کرنے کی کوشش میں لگی رہی ہے۔''

''اس لیے مفتی جی! کہ میں سنی سنائی کا بندہ ہوں۔ میں نے مفتی جی، شہاب بھائی کو خاں صاحب کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میں شہاب صاحب کے ناخن کاٹنے والا نائی ہوں جسے عام زبان میں خلیفہ کہتے ہیں۔ بچوں کی واقفیت بھی ان سے زیادہ تھی۔ خاص کر اثیر خاں کی...... اگر......''

لیکن مفتی جی نے سننے سے انکار کر دیا۔ جو وہ سچ سمجھ بیٹھتے اسی پر اڑے رہتے۔ اب جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو میرا نظریہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ مفتی جی! اگر شاعر محبوبہ کی تعریف کے قلابے ملائیں تو حق بجانب، بڑا شاعر اور اگر وہی شاعر وطن کی محبت کے گن گائے، نعت یا مرثیہ کہے، ماں کی محبت، اولاد کی فریفتگی میں رطب اللسان ہو تو ادب میں کمتر جگہ پائے۔ یہ تو ایک طرح سے فرائیڈ کو درست ثابت کرنے کی کوشش ہوئی۔

اب کیا کروں میرے پاس تو اب صرف وہ خط رہ گیا جو انہوں نے خاں صاحب کے پرنٹ میڈیا سے اُکھڑ کر Visual میڈیا میں گھس جانے پر لکھا۔

داستان گو اور اشفاق احمد

گذشتہ چند ایک سال سے داستان گو نے اودھم مچا رکھا ہے۔ وہ جگہ جگہ مجمع لگائے کھڑا ہے۔ ٹی وی پر، ریڈیو پر، ادبی جریدوں اور محفلوں میں، ثقافتی اور سماجی ''گٹ ٹو گیدرز'' میں، شہروں میں، قصبوں میں، دیہات میں ان دور افتادہ مقامات پر جہاں ٹرانسسٹر کی رسائی ہے۔

عوام ریڈیو پر بڑے اہتمام سے اس کے پروگراموں کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کی پھلجھڑیوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کی ''ہم اُلٹے'' ''بات اُلٹی'' پر حیران ہوتے ہیں۔ جوان اثر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دانشور کچھ عرصے کے لیے بھول جاتے ہیں کہ ان کا کام محظوظ اور متاثر ہونا نہیں بلکہ مین میخ نکالنا ہے۔ نقاد گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کوئی انہیں مسکراتے ہوئے دیکھ نہ لے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ باتوں کے جال بُن کر مجمع لگانے والا، مجمع میں رنگینی کی رو دوڑانے والا، ہنسنے ہنسانے والا داستان گو در حقیقت گونگا ہے، ازلی گونگا۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے دو بنیادی عناصر دکھ اور چپ سے فرار کی سعی پیہم ہے۔ اس فطری جبر و قہر کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ایک ردعمل، ایسا ردعمل جس کے تحت پودے کشش ثقل کی زنجیروں کے خلاف احتجاجاً پھوٹتے ہیں۔ اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں، ابھرتے ہیں۔

داستان گو کی تمام تر زندگی اس عمل اور ردعمل کا ایک پیہم چکر ہے۔ ایک عظیم بھنور جس میں وہ ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے۔ ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے۔ پھر ڈوب جاتا ہے۔ مجمع صرف اس کے ابھرنے کا تماشہ کرتا ہے۔ اس کی مد کے

چھینٹوں سے شرابور ہوتا ہے۔ اس کے ڈوبنے کی کیفیت کو کوئی نہیں جانتا۔ اس کے جذر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس نے اپنی زبان سے اس کشمکش کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو آرا سا اس کے دل میں چلتا ہے، اس کا اظہار کون کرے خود تو ازلی گونگا ہے۔

اگر آپ اس کی شخصیت کی اس بنیادی حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس وقت اسے دیکھئے جب اکیلے میں بیٹھا ہو۔ جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا اسے دیکھے جانے کے امکانات موجود ہیں۔ اسے ذرا بھی شک پڑ گیا تو اس کے اندر کی طوائف ہشیار ہو جائے گی۔

اشفاق احمد میں ایک بڑی حساس اور دلوں کو مسخر کرنے کی شوقین طوائف موجود ہے جو صرف اس لیے حسن اور رنگینی سے شرابور ہو کر قابل تماشا بن جاتی ہے جب اس میں یہ احساس جاگتا ہے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ احساس کے بغیر وہ ایک لاش ہے، ایک خلا ایک لا۔ اس لحاظ سے اشفاق احمد ایک تماش بین عورت ہے۔

اکیلے میں اس کے چہرے کے خطوط نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ پیشانی کی سلوٹیں رینگ رینگ کر See-Saw کا پتہ دیتی ہیں جو اس کے دل میں رواں دواں ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرتا ہے۔ چپ دکھ، چپ دکھ گھڑی چلتی ہے۔ آنکھیں اندھے کنوئیں بن کر دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور ایک عظیم اکتاہٹ اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔

یہ دکھ اور چپ اس میں کب پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن مجھے اس کا علم ہے کہ بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر میں کوئی ایسا دریچہ نہیں کھلتا جس سے دکھ یا چپ اندر داخل ہو سکتے۔ اس کی زندگی میں چپ کا کوئی جواز موجود نہیں۔

وہ کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائی بہنوں کا ایک کے سوا سب سے چھوٹا بھائی ہونے کی پرابلم بچہ بننے کے امکانات سے صاف بچ گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی سے کئی سال بڑا ہونے کی وجہ سے باپ کی لاشریک محبت کے مزے لوٹتا رہا جس میں ماں باپ کے علاوہ بڑے بھائی بہن بھی شامل تھے۔

اشفاق کی شخصیت میں دکھ اور چپ کا وجود میرے لیے ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق سا کامیاب آدمی نہیں دیکھا۔ اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ روایت کی فصیل دیواریں اس کے اردگرد حلقہ کرنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔

احتجاجاً وہ گھر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ بے سہارا بے وسیلہ بے مددگار اور ایک ناممکن العمل کاروبار یعنی سکرپٹ رائٹنگ (Script Writing) کی مدد سے گھر کا چولہا جلائے رکھا۔ اس نے اپنے ذوق کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور نہ صرف کامیابی ہی نہیں بلکہ شہرت حاصل کی۔

بے شک اشفاق نے جدوجہد کی، محنت و مشقت کی لیکن آپ جانتے ہیں کہ جدوجہد اور محنت و مشقت کامیابی کے ضامن نہیں ہوتے۔ جہاں تک اشفاق کا تعلق ہے کامیابی اس کے پیچھے پیچھے یوں چلتی ہے جیسے پالتو کتیا ہو۔ اس سے مجھے شک پڑتا ہے۔ مجھے گمان ہے کہ اشفاق کے کندھے پر کوئی ہاتھ ہے اور اشفاق کی زندگی اس ہاتھوں کی بخشش ہے

ہے۔اشفاق Para-Psychology کو صرف اس لیے نہیں مانتا کہ وہ اس ہاتھ کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کی شخصیت کی بیشتر کمزوریاں اسی کامیابی کی وجہ سے ہیں۔اس لیے ہیں کہ وہ ناکامی سے واقف نہیں۔وہ جدوجہد سے ناواقف ہے۔کون نہیں جانتا کہ اگر کامیابی ہم رکاب ہو جائے تو جدوجہد نہیں رہتی۔اگر زندگی میں دکھ اور چپ نہ ہوتے، بے وجہ دکھ اور چپ، بے نام دکھ اور چپ۔اللہ واسطے کے دکھ اور چپ تو اشفاق کامیاب طوائف بن کر رہ جاتا جو آنکھیں مٹکاتی ہے۔دلوں کو لبھاتی ہے۔نگاہیں خیرہ کر کے دولت کے ڈھیر لگا لیتی ہے لیکن دل کی دھڑکنیں نہ محسوس کرتی ہے نہ پیدا کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دکھ اور چپ اشفاق کے لیے قدرت کا ایک عطیہ ہیں جن کی وجہ سے کامیابی کے باوجود اشفاق آج فنکار ہے۔

1947ء میں جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو بنیادی طور پر وہ یہی کچھ تھا جو آج ہے۔دکھ اور چپ کے تار و پود سے بنا ٹاٹ کا ٹکڑا جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔آج بھی وہی ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔البتہ اس کا ٹاٹ پن کچھ اور بڑھ گیا ہے اور سنہری پھول پتیوں میں طوائف کی چمکیلی پسواج کچھ اور نمایاں ہوگئی ہے۔ٹاٹ اور پتی کا تضاد کچھ اور واضح ہوگیا ہے۔

ان دنوں میں مہاجر کیمپ میں مہاجروں کا حوصلہ بندھانے کے لیے مقرر کی حیثیت سے نوکر تھا۔یہ اور بات ہے کہ حوصلہ بندھانے کی بجائے میرا اپنا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں ڈوبتے ہوئے دم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک چٹی سفید، شگفتگی اور تازگی سے بھرپور کشمیرن میرے روبرو کھڑی ہوئی۔

آنکھیں چمکا کر بولی۔"آپ ممتاز مفتی ہیں؟"

میں نے کہا۔"جی۔"

کہنے لگی۔"ہم نے آپ کی "آپا" پڑھی ہے۔"

میں نے کہا۔"جی بہت اچھا کیا آپ نے۔"

بولی۔"میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں، کبھی آیئے اُدھر۔"

میں نے کہا۔"جی اچھا۔"

بولی"میرا نام اشفاق احمد ہے۔"

اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے سرخ کمخواب پر سنہرے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔شاید آج بھی ان لوگوں کی نظر میں جو اسے سرسری طور پر جانتے ہیں، اشفاق احمد سرخ کمخواب پر سنہری پھل بوٹے ہی ہو۔جیسے وہ پہلی نظر میں مجھے دکھائی دیا تھا۔

پھر اشفاق اور میں ملنے لگے۔

جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ توں توں کمخواب جوگیا ٹاٹ میں بدلتا گیا لیکن سنہری پھل پتیوں کے
میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

پھر جلد ہی مجھے اشفاق کے بھید کا پتہ چل گیا۔ اس ایک جسم میں دو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ جوگیا ٹاٹ
احمد تھا۔ سنہرے پھول بوٹے داستان گو تھا۔ مجھے اشفاق احمد سے محبت ہوگئی اور میں داستان گو سے کھلنے لگا۔ اس لیے
کہ داستان گو میں سے طوائف جھانک رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ طوائف میری طوائف سے کہیں زیادہ بھڑکیلی تھی
نفی کر دیتی تھی۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری دانست میں ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں مستور
میں اُدھ کھلی کسی میں نمایاں کسی میں ننگی مثلاً ابوالاثر حفیظ میں بالکل ننگی ہے اور طفیل میں بالکل مستور ہے۔ شہاب
کبھار لبِ بام آتی ہے اور اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ بہر حال آج بھی اشفاق احمد میرا
دوست ہے لیکن داستان گو سے مجھے چڑ ہے۔

ان دنوں اشفاق اور میں روزانہ اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ان دنوں زوبی کے تھے
تھا۔ زوبی ایک ابھرتا ہوا آرٹسٹ تھا، سنا ہے آج کل وہ کراچی کا رئیس ہے۔

زوبی ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کم گو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی۔ ذہین تھا لیکن خدوخال ایسے تھے
منظرِ عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اتنے ڈھیر کہ جمود کا شبہ
کی سب سے بڑی خصوصیت ایک پُراسرار خصوصیت تھی جو غور و خوض کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور میرے
ایک مستقل چیلنج بنی ہوئی تھی۔

زوبی کی درمیانہ سی شکل و صورت، عام سی چال ڈھال اور عام سی بات چیت کے باوجود لڑکیاں، محترم
بیگمات سپردگی کے مفرد اور واحد جذبے سے سرشار، دور دور سے اپنے خرچ پر اوپن ایئر تھیٹر میں آتیں اور کسی
ملاقات کے بغیر دیوتا کی بھینٹ چڑھ کر خوشی خوشی واپس چلی جاتیں اور دیوتا مہاراج یوں نروان زدہ بیٹھے رہتے
بات ہی نہ ہو۔ جیسے بھینٹ لینا ان کا پیدائشی حق ہو۔

اشفاق کے لیے یہ سب لانگ شاٹ تھے۔ داستان گو کے لیے صرف رنگین تفصیلات تھیں جو وہ اپنے
بھرتا رہتا تھا۔ اشفاق اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں جو اپنے کو جنسیات کا طالب علم
کتابی مسائل میں بڑی دسترس رکھتا تھا، میرے لیے اوپن ایئر تھیٹر میں ہر نئی بھینٹ کی آمد ایک تھپڑ کی حیثیت
چونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کس اصول کے تحت ہو رہا ہے، اس عمل میں سبب کیا ہے، نتیجہ کیا ہے۔

چٹاخ...... میرے علمی زعم کے منہ پر تھپڑ پڑتا۔ داستان گو میری بےبسی پر بغلیں بجاتا۔ پٹاخ
پڑتا۔ اشفاق میرے قریب آ بیٹھتا اور اپنا جوگیا ٹاٹ میرے گرد لپیٹ دیتا جیسے حقائق کی دیدہ دلیری کے خلاف مجھے
رہا ہو۔ دیدہ دلیر دیوتا حیرت سے ہماری طرف دیکھتا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کیا ہے۔

پھر ماحول کی گھٹن دور کرنے کے لیے داستان گو میدانِ عمل میں آ جاتا اور سنہری باتوں کے غبارے

جاذب توجہ کلوز اپ۔ دل نشین تفصیلات، نقلیں، Mimics، قصے، کہانیاں، لوک کتھائیں حتیٰ کہ اوپن ایئر تھیٹر بن جاتا جس میں قہقہے گونجتے، تالیں بجتیں اور دیوتا بھینٹ کا قصہ پس پشت پڑ جاتا۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لق و دق جزیرے میں رہتا تھا، جو رابنسن کروسو کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران ۔۔۔ احمد کا یہ جزیرہ ایک وسیع و عریض رستے بستے گھر کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ نچلی منزل میں میلہ لگا رہتا۔ ۔۔۔ چلتے، ہنڈول جھولتے۔ شور شرابا گونجتا۔ اوپر منزل میں ہوحق اور عظیم خلا کے تلے دبا ہوا سہا ہوا اشفاق احمد۔

اشفاق احمد کی کشادہ نیم چھتی میں چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہ کتابوں کے انبار ۔۔۔ نے سے دل میں ایک بے نام عجز کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نیم چھتی میں اکیلا اشفاق بیٹھا رہتا تھا۔ ۔۔۔ وہاں دم گھٹتا تھا، لہٰذا اس نے وہاں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔

اس جزیرے میں آنے جانے کے بعد میں نے جانا کہ اشفاق صرف چپ اور دکھ ہی نہیں بلکہ وہ ازلی اکیلا ۔۔۔ تنہا۔ وہ بذات خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کشتی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی وحدت

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انباروں تلے ڈھیروں جوگیا ٹاٹوں میں لپٹا ہوا پڑا رہتا۔ پتہ نہیں اس بوجھل تنہائی ۔۔۔ یا ٹاٹ کے ڈھیر کی وجہ سے یا جوگیا رنگ کی وجہ سے، اس میں ایک عظیم اکتاہٹ بیدار ہو جاتی۔ ایک وحشت سی ۔۔۔ کر وہ سنہرے پھول بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی طوائف جاگتی، چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر ۔۔۔ پر روغنی تبسم آ جاتا اور وہ نیم چھتی کی سیڑھیاں اتر کر چٹکیاں بجاتا ہوا لاہور کی بھیڑ میں جا داخل ہوتا۔

۔۔۔ اوپن ایئر تھیٹر یا کسی اور مقام پر جا پہنچتا۔ ڈگڈگی بجاتا، گھنگھرو چھنکاتا، مجمع لگاتا۔ تھیلے سے رنگین داستانیں ۔۔۔ گنگناتا، آنکھیں چمکاتا، قہقہے لگاتا۔ خود ناچتا مجمع کو نچاتا ...... لیکن داستان گو کا یہ دور زیادہ دیر نہیں چلتا تھا۔ اس ۔۔۔ ویران جزیرہ، وہی ہوحق، وہی جوگیا ٹاٹ، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی۔

اشفاق کی یہ دو شخصیتی زندگی سٹیونسن کے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی طرح نہیں تھی۔ چونکہ اشفاق کی شخصیت ۔۔۔ ہائیڈ کا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ داستان گو طوائف کا شر صرف مجمع لگانے اور اپنے سنہرے پھول بوٹوں کی ۔۔۔ نے تک محدود ہے۔ یہ فن برائے فن شغل کسی مطلب یا مقصد سے بے نیاز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی اس تصنیف میں سٹیونسن نے خیر اور شر کا سہارا لے کر انسانی شخصیت کے گوناگوں تضاد ۔۔۔ سے جان چھڑانے کا اہتمام کیا ہے۔

اشفاق احمد میں چھپے ہوئے دونوں افراد ڈاکٹر جیکل تھے۔ ایک مٹی کی ہنڈیا کے مصداق تھا جس میں دکھ، چپ ۔۔۔ کے کیچوے رینگ رہے تھے۔ دوسرا نقش و نگار سے سجا ہوا چاندی کا سرپوش تھا جو ہنڈیا اور کیچوؤں کو چھپانے کے ۔۔۔ ڈیکوریشن پیس کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس عورت کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پیر ان دھلا منہ اور ۔۔۔ ۔۔۔ لیے دھوپ میں بیٹھی ''ہونسیاں پانے'' میں مصروف رہتی ہے اور شام کو سنگار کر کے پسواج پہن کے طوائف بن

جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ طوائف لینے دینے اور بکنے بکانے سے بے نیاز تھی۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت کا تضاد کا آرا کیوں چلاتی ہے۔ بنیادی طور پر اپاج بنا کر پھر اسے انگیخت کیوں دیتی ہے۔ ازلی طور پر گونگا بنا کر پھر اسے باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر کیوں اکساتی ہے۔ کسی نہ کسی کر پھر دکھ کے بادلوں کو ٹکرا کر بجلی کے قمقمے کیوں جلاتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے مگر وہ یقیناً ایسا کرتی ہے۔

اس زمانے میں اس ویران جزیرے میں تنہائی، دکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار رہی تھی۔

اشفاق احمد درحقیقت اشفاق احمد خاں ہے، وہ ذات کا پٹھان ہے لیکن اس کی شخصیت میں پٹھان کی نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ تبدیلی آب وہوا ہو۔ اس کی تنہائی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اس رہتے چاروں طرف سے یوں پٹھانوں میں گھرا ہوا تھا جیسے کوئی شودر براہمنوں میں گھرا ہوا ہو۔

اپنی مٹی میں پٹھان چند ایک واضح اور نمایاں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جو پٹھانیت کی شاہد ہوتی ہے۔ آب وہوا بدل دیئے جائیں تو پٹھان میں نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ نئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ تخلیقی ولو ہیں جو پٹھانیت کی دیگر مثبت خصوصیات کو دبا دیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پٹھان ان پٹھانوں کو نہیں مانتے جو تبد ہوا کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔

اشفاق احمد وہ پٹھان ہے جسے پٹھان پٹھان نہیں مانتے اور وہ خود بھی اپنی طبعی ناپٹھانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

تبدیلی آب وہوا کی وجہ سے یا جانے کیوں اشفاق احمد میں کئی ایک ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے تھے۔ شخصیت میں ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ایک جٹا دھاری سادھو رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک صوفی خودنمائی سے بھر طوائف، پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا تلقین شاہ، سن کر جذب کر لینے والا کان۔ ایک صف میں کھڑا ہونے والا محمود، چھوت چھات کا متوالا کشمیری پنڈت۔ مشینوں سے کھیلنے والا ایک پرزوں کو ذی روح جاننے والا ایک بدھ پجاری۔ مدہم محبت سے سرشار مگر نہ دھڑکنے والا ایک دل پیسے پیسے پر والا ایک بنیا، لٹیا لنڈھانے والا ایک غنی۔ دے کر کبھی نہ بھولنے والی ایک معمر عورت اور نہ جانے کیا کیا۔ صلاحیت نہیں کہ ایک رنگا رنگ ہفت رُخی شخصیت کا احاطہ کرسکوں۔

دورِ حاضر کے جانے پہچانے شخصیت نگار محمد طفیل کی طرح میں الفاظ میں شخصیت کی تعمیر نہیں کرسکتا۔ تجزیے کی قینچی سے کاٹ پیٹ کر کے شخصیت کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کرسکتا ہوں۔ محمد طفیل انسانی شخصیت کے (Jig Saw) ٹکڑوں کو بڑی محبت بڑے صبروتحمل سے جوڑتا ہے۔ مجھ میں محمد طفیل سا صبر نہیں، تحمل نہیں۔ مٹھاس رنگین بیانی نہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد طفیل نے آج تک اشفاق احمد کی شخصیت پیش کرنے سے بخل کیوں فرمایا ہے۔ منہ بند حاضر ور ہے لیکن وہ بخیل نہیں۔ شاید اس کی وجہ اشفاق خود ہو جو کسی کشتی کو اپنے کنارے لگنے نہیں دیتا۔ یہ وجہ سنہرے پسواج والی طوائف ہو جو چاروں طرف گھوم پھر کر اشفاق احمد کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی پھرتی ہے۔

...بات یقینی ہے کہ مولانا محمد طفیل کا اسلام ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلا، اس لیے وہ ابھی گھنگھرو کی آواز کے ... نہیں ہو پائے جبھی تو وہ اپنی طوائف کو سات پردوں میں ملفوف رکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انہوں نے خان منزل کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ ... وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جب یہ گلیور گھر پر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ جب وہ ... سے باہر ہوتا تو گھر میں دھما چوکڑی مچ جاتی لیکن ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتیں کہ عجز و ادب اور احترام کا کون سا ... ایجاد کیا جائے جس کی مدد سے ظلِ الٰہی کو ڈھب پر لایا جا سکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا، لہٰذا اس ... میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔ چونکہ ازلی گونگا تھا اس لیے متکلم احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اشفاق احمد کی دبکی تہوں ... احتجاج کا ایک طوفان اکٹھا ہوتا رہا۔ اسی عرصہ دراز سے دبے ہوئے طوفان کی وجہ سے اشفاق احمد آج بھی کسی گلیور کی ... تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کسی لحاظ سے کسی پہلو سے اپنے کو بالشتیا سمجھنے یا ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ... فنکارانہ عظمت کا خود تذکرہ نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق احمد کے چہرے ... پھلجھڑیاں چلنی شروع ہو جائیں گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو ابھریں گے۔ آنکھوں میں زنگی مکان کی چمک ظاہر ہو گی۔ ... دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ اسے کاٹے گا نہیں لیکن آپ کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ ... احمد کی شخصیت کے بنیادی سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ انا خاموشی کے گھونگھٹ میں چھپے رہنے ... کچھ زیادہ ہی طوطا چشم ہے۔ ہاں وہ فنکارانہ عجز سے کورا ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا، وہ مصوری تھا۔ اس کا مصوری کی ... نہ ہونا غالباً زوبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔

ویسے تو میں نے اشفاق کے بنائے ہوئے کئی ایک مکمل اور ادھورے عمل دیکھے تھے لیکن دو عمل مجھے خصوصی طور پر ... شاید اس لیے کہ وہ دونوں میرے مضمون یعنی جنس سے متعلق تھے۔

اشفاق کے پہلے عمل کا نام دی کال بل (The Call Bell) تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا ... دبانے سے محترمہ احترام کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے باہر آنے والی ... حقیقت ایک جن ہو جسے نسائی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔ عمل کی عظمت یہ تھی کہ تصویر میں ایک نظر میں محترمہ دکھائی ... دوسری نظر میں جن۔

دوسری تصویر کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو The Phallic Woman ہوتا۔ یہ تصویر بھی عورت ہی کی تھی جو اپنے ... کندھوں کی مٹکی علانیہ منظر عام پر کندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی اور صرف اٹھائے ہی نہیں پھرتی تھی بلکہ اسے چھلکاتی ... تصویر کی خوبی یہ تھی کہ ایک نگاہ میں وہ ننگی نظر آتی تھی اور دوسری نگاہ میں معصومیت میں ملفوف جیسے جانتے نہیں۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے جنس کے موضوع کو عمل نگاری میں کیوں اپنایا اور اگر اپنایا تھا تو اسے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک ... قطعی طور پر یقینی ہے کہ اشفاق احمد اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دونوں کو جنس صرف اسی صورت میں

گوارا ہے جب وہ جذبے کے سینڈوچ میں چھپا ہوا ہو۔

میری دانست میں جنس کے اس لحاظ سے مردوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبے کا دریچہ کھولنے کے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہیں۔ دوسرے وہ جن میں جنس کی وجہ سے جذبے کا در کھل جاتا ہے اور تیسرے وہ جن میں جذبے کی وجہ سے جنس کی کھڑکی نیم وا ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد ازلی طور پر تیسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ حسین اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بُن کر اپنی طرف متوجہ کرے تا کہ وہ اثر سے بھیگ جائیں۔ متوجہ اور متاثر کر لیتا تو پھر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتے۔ ''اب کیا ہوگا۔'' ''اب کیا ہوگا'' کے متعلق اس کا ذہن بے خبر نہ تھا لیکن دل تیار نہ تھا، لہٰذا ''اب کیا ہوگا'' کے خوف سے وہ بھاگ لیتا۔ الٹے پاؤں بھاگ لیتا۔

دراصل اشفاق کی خواہش یہ تھی کہ لڑکی اس کی داستانوں کے جال میں پھنسے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اس قدر بھیگ جائے کہ اس میں حرکت کی طاقت نہ رہے۔ دور کھڑی رہ کر بات کرے۔ محفوظ فاصلہ قائم رکھے تا کہ ''اب کیا ہوگا'' کا خطرہ پیدا نہ ہو۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ نسائی نفسیات کے مطابق فاصلے محفوظ نہیں ہوتے قرب محفوظ ہوتا ہے، لہٰذا وہ حفاظت کے لیے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق احمد کے لیے پیچھے ہٹنا محفوظ تھا، لہٰذا بار بار پیچھے ہٹا۔ الٹے پاؤں بھاگا، ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ بارہا اس نے خطرے کے مقام پر باتوں کے جال بُننے سے توبہ کی لیکن باتوں کے جال بننے کی عادت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی، لہٰذا بارہا توبہ ٹوٹی۔ بارہا وہ الٹے پاؤں بھاگا اور ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ جب گورنمنٹ کالج کے میدان میں وہ محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اس کی آنکھ میں دودھاری نگاہ تھی۔ اندر سے قدیم تھی، اوپر سے جدید لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اندر پرانا مشرقی رنگ تھا اوپر ڈسٹمپر تھا یعنی دروپدی کے سونے پر گیشیا کا ملمع چڑھا ہوا تھا۔ وہ محترمہ متاثر کرنے کی بجائے متاثر کی چتر کاری سے واقف تھی اور متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت سے واقف تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے جو پیچھے ہٹنے والے کو پہچان لیتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر اسے پیچھے ہٹنے کی ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

وہ محترمہ اشفاق احمد کی باتوں کے جال میں پھنس گئی۔ تاثر سے بھیگ گئی اور پھر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹے...... اشفاق احمد کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا، وہ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اب کیا ہوگا کے خوف سے بے نیاز ہو کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے لگا اور آگے۔ اشفاق کے لیے یہ ایک نیا اور انجانا مشاہدہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا ڈر نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں الماری میں بند کر دیا اور ان کی جگہ قلم کو کیوں اپنایا۔ مجھے اس کا علم نہیں حالانکہ عمل معانی اور تکنیک کے لحاظ سے کامیاب تھے۔ اصولی طور پر تو اشفاق کو موسیقار ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کے

...ستارہ نہ بننے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے انسانی کردار کے گونا گوں روپ سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ اس لیے خالی آواز زیرو ...ے نہ کر سکا۔

قلم اٹھاتے ہی تفصیلات نے اسے چاروں طرف سے آ گھیرا۔ وہ تفصیلات جن کے بل بوتے پر داستان گو مجمع ...کرتا داستان گو نے اپنے تھیلے سے کلوز اپ کے رول کے رول نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اشفاق احمد نے ان بھڑ کیلی تفصیلات کو اپنے میں چھان لیا۔ بے نام دکھ اور چپ کی چاشنی کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ پیدا ہو گیا اور اشفاق احمد افسانہ ...س بن گیا۔ اگرچہ اس کا سہرا اس گونگے اکیلے دکھ کے پٹارے اشفاق احمد کے سر پر تھا لیکن تفصیلات تو داستان گو کی تھیں، ...استان گو نے لپک کر اپنے سر پر لگا لیا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا، کر دکھانے کا نہیں۔ آج کل اسے کچھ کرنے کا شوق بھی تھا ...کر کا بھی چونکہ وہ شو بزنس میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ ایک مزدور ہے، وہ کدال چلا ...سکتا ہے۔ بیج بو سکتا ہے، فصل اگا سکتا ہے۔ اسے یہ تمنا ہے کہ فصل کو دیکھ کر لوگ واہ واہ کہتے کہ کیسے اچھے بوٹے ہیں لیکن فصل ...ٹ نہیں سکتا۔ وہ اپنے فن کی گڈول (Good Will) پیدا کرنے کا متمنی ہے لیکن اس گڈول کو کیش کرانے کا اہل نہیں۔

ادبی دنیا میں ابھی مقام پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ اشفاق احمد کو دنیاوی مصائب نے آ گھیرا۔ ان مصائب کی تمام تر ...یک فرائی ڈے تھی۔ جزیرے کے رابنسن کروسو نے اس فرائی ڈے کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل اس ویران اور تنہائی زدہ ...یرے کا ایمان تھا، لہٰذا جزیرے نے اشفاق احمد کو اگل دیا اور وہ دنیاوی مصائب کے طوفان زدہ پانیوں میں ڈبکیاں ...نے لگا۔

اب رابنسن کروسو اور فرائی ڈے کو کسی چھت تلے سر چھپانا تھا، چولہا جلانے کا اہتمام کرنا تھا۔ دو وقت کی روٹی ...یدا کرنا تھا، لہٰذا اشفاق احمد سکرپٹ رائٹر بن گیا۔ خوش قسمتی سے یہ فرائی ڈے وہ محترمہ تھی جو پیچھے ہٹنے والے کو آگے بڑھنے ...حتی دے سکتی تھی جو بہتر نصف کا بوجھ بننے کے بجائے شوہر کا ساتھ دے سکتی تھی، لہٰذا دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے ...کانوں پر اٹکائے، ہاتھوں میں کاغذ کی سلپیں تھامیں اور لاہور کے گلی بازار میں پھیری لگانے لگے۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ ...والو۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ لکھوالو۔

عرصہ دراز تک اشفاق احمد کے گھر میں تمام حساب کتاب سکرپٹوں کا ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ۔ ...چی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، لین دین ایک سکرپٹ، علاج معالجہ آدھا سکرپٹ۔ آج بھی اشفاق کی بیگم سے پوچھو ...یہ ساڑھی کتنے میں لی تھی تو وہ جواب دے گی، اچھی طرح سے یاد نہیں شاید ایک سکرپٹ لگا تھا یا ڈیڑھ۔

بانو قدسیہ کی آمد کے بعد اشفاق احمد کے گھر میں دکھ کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ دنیاوی دکھ نہ تھے چونکہ اشفاق احمد ...میابی پر کامیابی حاصل کیے جا رہا تھا۔ یہ دکھ ازدواجی بھی نہیں تھے۔ چونکہ اشفاق کو بانو سے محبت تھی اور بانو صرف اشفاق ...ے جیتی تھی۔ دکھ کے ان ڈھیروں کی وجہ صرف یہ تھی کہ بانو اشفاق کے دکھ کو بانٹنے پر مصر تھی لیکن یہ نقطہ وضاحت طلب ...۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک لحاظ سے بانو کا اشفاق سے تعلق کچھ ایسا ہے جیسے حبیب کا تعلق اپنے بڑے بھائی ...ت اللہ سے ہے۔

میرے دوست قدرت اللہ شہاب جو دکھتے نہیں لیکن دیکھتے ہیں۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ بولے انہوں نے میرے تحفظ کا ایک انوکھا انتظام کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا؟ بولے میرے حصے کے سارے دکھ میرے چھوٹے بھائی حبیب کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں اور حبیب کی ساری خوشیاں مجھے منتقل کر دی جاتی ہیں۔ میں نے کہا، مطلب کیا ہوا؟ کہنے لگا کانٹا مجھ کو چبھتا ہے۔ درد حبیب کو ہوتا ہے۔ قہقہہ حبیب لگاتا ہے، خوشی مجھے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی صرف باچھیں دُکھنے لگتی ہیں۔ میں نے کہا سچ، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ بولے ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، میں نہیں مانتا۔

کچھ عرصہ بعد قدرت اللہ شہاب کی آسامی کے متعلق راولپنڈی میں شدید گڑبڑ ہو گئی۔ حبیب کراچی میں تھا۔ اسے اس گڑبڑ کا علم نہ تھا۔ شام کو حبیب کا فون آیا۔ کہنے لگا وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ بولا میرا دل کہتا ہے کہ ہے۔ میں نے کہا، تیرا دل تو دیوانہ ہے۔ بولا وہ تو ہے لیکن بکار خویش ہشیار ہے۔ میں نے کہا فضول باتیں۔ بولا میں پنڈی آ جاؤں؟ میں نے کہا، ضرورت بھی ہو۔ بولا تمہیں یقین ہے کوئی گڑبڑ نہیں۔ میں نے کہا بالکل۔ اگر میری بات پر یقین نہ ہو تو شہاب سے پوچھ لو۔ شہاب نے فون پر آ کر کہا، یہاں بالکل خیریت ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آرام سے سو جاؤ۔

اگلے روز صبح سویرے حبیب نائٹ کوچ سے پنڈی آ پہنچا۔ کہنے لگا تمہاری تسلیوں کے باوجود مجھے چین نہ تھا۔ دل کہتا تھا ضرور یہاں گڑبڑ ہے اور قدرت تکلیف میں ہے۔ اس لیے میں کرایہ ادھار لے کر چلا آیا۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کانٹا کسی کو چبھے اور درد کسی اور کو ہو۔

اگر کانٹا اشفاق کو صرف چبھتا اور دکھ صرف بانو کو ہوتا، اشفاق کو نہیں یا دکھ اشفاق کو ہوتا اور بانو اسے بانٹ لیتی تو ایک بات ہوتی لیکن اشفاق کا دکھ کانٹوں سے بے نیاز ہے۔ اسے اس بات پر دکھ ہے کہ اسے کوئی دکھ نہیں۔ اس کی کوئی وجہ ہے۔ بے مقصد ہے، ازلی ہے، ازلی دکھ کو کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ وہ ایک کنوئیں کی طرح ہے۔ بانو چاہے ڈول بھر بھر کر نکالتی چلی جائے کنواں جوں کا توں بھرا کا بھرا رہے گا۔ بانو اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ دکھ بانٹنے کے لیے وہ ڈول نکالتی رہتی ہے۔ اشفاق اپنی اصلیت کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کا کنواں بھرا کا بھرا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر میں بے مقصد بے معنی دکھ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بے معنی ہو تو دکھ کی دھار اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

کئی ایک برس اشفاق اور بانو دن کے وقت لاہور کے بازاروں میں سکرپٹ لکھوا لو کی پھیری لگاتے رہے اور رات کو قلم کے پھاوڑے چلاتے رہے۔ آج وہ پھیری نہیں لگاتے لیکن قلم کا پھاوڑا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چلاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ منشیوں کا گھر ہے۔ وہ تو فارغ البال میز بانوں کا گھر ہے۔ یہ آج کی بات نہیں اس زمانے میں بھی وہ فارغ البال میز بانوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلائے رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اشفاق اور بانو دونوں کے سکرپٹوں سے کبھی مشقت کے پسینے کی بو نہیں آئی۔

اسی زمانے میں داستان گو کو شرارت سوجھی۔ اس نے اشفاق احمد میں چھپے ہوئے اس ٹھگنے بالشتیے کو تخلیق کیا جسے اشفاق کے بچپنے میں کسی گلیور نے تخلیق کیا تھا اور جو جذبہ انتقام سے اندر ہی اندر اب تک سلگ رہا تھا۔

دراصل اشفاق کو غصہ نہیں آتا۔ وہ بھڑک کر جلنے کی لذت سے محروم ہے۔ وہ چڑتا ہے، بل کھاتا ہے، سلگتا ہے یہ سلگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ آپ کوئی بات کہہ دیں تو وہ چپ ہو جائے گا، جواب نہیں دے گا۔ اس کے اندر چڑ چڑ دانے بھنتے رہیں گے۔ کئی بار یہ چڑ اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ اس کا گھر بھٹیارن کی کڑھائی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہاں تو داستان گو نے اس نھگنے کی چڑ کو جگا دیا۔ اشفاق کے روبرو ایک گلیور آ کھڑا ہوا۔ ایک ایسا گلیور جو دوسروں کو تلقین کرنے کا متوالا تھا۔ اشفاق نے قلم سنبھالا اور دوسروں کو تلقین کرنے والوں کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت تلقین شاہ صاحب عالم وجود میں آ گئے۔

تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہے، ایک روایتی گلیور۔ لوگوں نے تلقین شاہ کو سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی کھوہوں سے چھپے ہوئے بالشتیے نے سر نکالا اور لوگوں کو تلقین کرنے والے اس گلیور پر تالیاں بجانے لگا جس نے اسے تخلیق کیا تھا۔ ہم سب میں ایک نہ ایک بالشتیا موجود ہے جس کا وجود کسی نا کسی تلقین شاہ کا مرہونِ منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ گئے۔ دلوں میں تنے ہوئے پیچ و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دبے ہوئے غصے تمسخر کی صورت میں نکلنے لگے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چورا ہے میں پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہی نہیں۔ وہ ایک سائیکی ایٹرسٹ (Psychiatrist) بھی ہے۔ ایک عظیم ڈاکٹر جس نے کبڑوں کو سیدھا کر دیا۔ بالشتیوں کو قد و قامت عطا کیے، گونگوں کو زبان بخشی۔ دلوں میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھول دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بتوں کو توڑ دیا۔

لوگوں نے فرطِ محبت سے اس بت شکن کو آنکھوں پر بٹھا لیا اور اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ عوام آنکھوں پر بٹھا لیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آ گرتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ شہرت کا مفہوم کیا ہے۔

ریڈیو کے پروگرام میں ایک رات تلقین شاہ نے ہدایت اللہ سے کہا کہ وہ کہیں سے مالٹوں کے چھلکے اکٹھے کر کے شاہ صاحب کے مکان کے دروازے پر ڈھیر کر دے تاکہ محلے والے سمجھیں کہ شاہ صاحب کے گھر میں پھل اس کثرت سے کھائے جاتے ہیں تاکہ محلے میں ان کی ساکھ پیدا ہو۔

اگلی صبح اشفاق احمد کے مکان کے صدر دروازے پر مالٹے کے چھلکوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق کے شیدائیوں نے رات کے اندھیرے میں مالٹے کے اتنے سارے چھلکے کہاں کہاں سے چن کر اکٹھے کیے تھے۔

اشفاق احمد کے مالک مکان نے جان بوجھ کر واٹر ٹیکس ادا نہ کیا تاکہ نل کٹ جائے اور اشفاق احمد مکان خالی کر دے تاکہ مکان زیادہ کرائے پر لگ سکے۔ نل کاٹنے کے لیے دو لائن مین آ گئے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ میاں جلد بازی سے کام نہ لو۔ کچھ مہلت دو لیکن وہ نہ مانے۔ جب دلیل سے کام نہ چلا تو ہم نے ان کی منتیں کیں۔ پھر بھی وہ نہ مانے۔ اس اثنا میں اشفاق آ گیا۔ اس نے صورت حالات کا جائزہ لیا اور معاملہ بھانپ لیا۔ پھر وہ لائن مینوں سے تلقین شاہی زبان میں بولا۔ ہاں کاٹ دو۔ اس نل کو فوراً کاٹ دو۔ جو نہ کاٹا گیا تو یہ خدشہ لگا رہے گا کہ کسی روز ہم چلو بھر پانی میں ڈوب

مریں۔ شاہ کی آواز سن کر لائن مینوں کے ہاتھ رک گئے۔ بولے شاہ جی...... آپ؟ تلقین شاہ بولا، ہاں ہاں بھئی یہ ہی تو ہے۔ لائن مینوں نے جھک کر تلقین شاہ کو فرشی سلام کیا اور کہنے لگے، شاہ جی معاف کرنا ہمیں پتہ نہ تھا۔ چاہے واٹر ٹیکس ادا نہ ہو، پر شاہ جی کا نل نہیں کٹے گا، کبھی نہیں۔

ٹیکس والوں نے اشفاق کو دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ٹیکس کم ادا کیا گیا ہے۔ حساب کتاب پیش کیا جائے۔ دفتر میں حاضر ہو کر اشفاق نے دیا گڑا۔ تلقین شاہ حاضر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکھانے اور نیا ٹیکس ادا کرنے کے بجائے ادا شدہ ٹیکس میں چھوٹ کے فارم بھر کر اشفاق گھر آ گیا۔

تلقین شاہ کی آمد نے اشفاق احمد کی زندگی کو سوتے جاگتے کا قصہ بنا دیا۔ اشفاق احمد، ابوالحسن تھا۔ الہی تھا۔ ابوالحسن کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ظل الہی کو دیکھ کر لوگ ادب، احترام اور محبت سے سر جھکا لیتے تھے۔

پہلے پہل اشفاق احمد کو بہت غصہ آتا تھا۔ بھٹیارن کی کڑاہی میں چڑ چڑ دانے بھنتے۔ وہ کہتا یار! گردی ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پیش کرنے والے آرٹسٹ پر لوگ ہیں۔ وہ تو شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا آرٹسٹ خود اشفاق احمد تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو یا تو اشفاق احمد گلا گھونٹ دیتا اور یا آپ خودکشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں وہ کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ کا حصہ دار ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام لکھنے والے کا حصہ ہے۔ آپ اس سے کہیں یار تمہارے فلاں ٹی وی کھیل میں فلاں شخص نے بہت عمدہ رول کیا۔ اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب دے گا، ہاں یار اچھا خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا، آیا تو بالکل ہی کچا نکلا۔ اس پر بڑی محنت کرنی پڑی، خیر نبھا گیا۔

کریڈٹ بانٹنے میں اشفاق احمد ایک بنیا ہے۔ ایسا بنیا جو لیتے وقت دو اور دو پانچ گنتا ہے اور دیتے وقت دو تین لیکن نہیں یہ مثال ٹھیک نہیں بیٹھتی چونکہ یہ بنیا دینے کا سرے سے قائل ہی نہیں۔

تلقین شاہ کی تخلیق میں اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ اس نے کبھی اس پند و نصیحت کے جال بننے والے شیدائی پر پھبتی نہیں کسی۔ اسے من نہ کردم شا حذر بکند کا طعنہ نہیں دیا۔ دوسروں کو کبڑا بنانے کی سعی پیہم پر کبھی غصے کا اظہار کیا۔ الٹا وہ شاہ صاحب کی عظمت کو اجاگر کرتا رہتا ہے اور اس حد تک اجاگر کر دیتا ہے کہ شاہ صاحب کا باطن منظر عام پر آ جاتا ہے۔ یہی اشفاق احمد کے فن کا کمال ہے۔

تلقین شاہ میں اشفاق احمد نے اپنے بچپن کا کردار بھی پیش کیا ہے۔ جب وہ حقیقی شاہ صاحب کے ہدایت اللہ تھا۔

بنیادی طور پر اشفاق احمد آج بھی وہی ہدایت اللہ ہے۔ اگر وہ بظاہر ایسا نہیں دکھتا تو اس کی وجہ صرف شہرت کی وہ شہ نشین ہے جس پر وہ آلتی پالتی مارے داستان گو بن کر بیٹھا رہتا ہے۔

اشفاق احمد میں تحمل ہے، رواداری ہے، عجز ہے، مٹھاس ہے اور مدہم محبت کا بے پناہ "نگ" ہے میں گرمائش کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا محبت کرنے والا غیر تلقین شاہی باپ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے

...ین گئے ہیں۔ وہ ایک پیارا دوست ہے۔ بظاہر زم لیکن بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ایسا جی حضور یہ ماتحت ہے جو کام اپنی ...ی سے کرتا ہے لیکن اپنی مسلسل جی حضوری سے افسر کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے کہ کام اس کی مرضی کے عین ...ق کیا جا رہا ہے۔

اشفاق احمد ایک آئیڈیل خاوند ہے۔ اس کے باوجود اگر بانو کو اس سے کوئی شکایت ہے تو یہ بانو کا اپنا قصور ہے ...س کی تمام تر ذمہ داری خود بانو پر عائد ہوتی ہے۔ بانو کا قصور یہ ہے کہ وہ خالی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک فنکار بھی ہے اور ...نکار ہی نہیں بلکہ ایک بڑی فنکار ہے۔ داستان گو کسی بڑے فن کار کو لفٹ دینے کا عادی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ...فاق احمد نے آج تک ادبی ریڈیائی یا ٹی وی کے انٹرویوں کے علاوہ بانو کو بحیثیت فنکار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر آپ بانو کی ...ی کے متعلق اشفاق سے بات کریں تو یقیناً وہ کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے اس مقام پر ...یں۔ پھر بھی اتنی ناشکر گزار ہے کہ میرے فقرے تک چرا لیتی ہے۔

اشفاق کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بانو میں دو بڑے عیب ہیں۔ ایک تو وہ بڑی فنکار ہے اور دوسرے وہ محبت ...ے اور اس کی محبت کا شیرا اتنا گاڑھا ہے کہ اشفاق ہر وقت یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے کوئی بھینس راب کے چھپڑ میں پھنسی ...

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیے جب وہ کچھا بنیان پہنے دھوپ میں بیٹھا کچھ کھا پی رہا ...س وقت اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں تو پڑے دیکھیں۔ اس وقت کا ...ھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے مینڈک جوہڑ میں آ پہنچا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل ...ید ہوتی ہے۔ اس کی خوشی سمیٹے نہیں سمٹتی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا ہوتا ہے اور دوسری طرف ممتا ہی ...

اشفاق احمد بلا کا خوش خور ہے۔ صرف اچھی چیز کھاتا ہے لیکن چیز اچھی ہو تو بہت کھاتا ہے اور اس اشتیاق سے ...تا ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ پٹھان ہے۔

اشفاق احمد کو مشینوں سے محبت ہے۔ وہ انہیں ذی روح سمجھتا ہے اور مہاتما بدھ کی طرح ان کا احترام کرتا ہے۔ ...ٹور کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً چیختا چلاتا ہے۔ ''ظالمو تم اس ننھی سی جان کا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا ...پسٹن اپنی نازک سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑ کھڑے کو دھکیل کر چلاتا ہے۔ اس ننھی جان کا کچھ ...خیال رکھا کرو۔'' اشفاق کے گھر میں طرح طرح کی مشینیں اور قسم قسم کے گیجٹ پڑے ہیں۔ چاہے اس کی جیب میں ...چنے کے لیے نہ ہو۔ پھر بھی کباڑیے کی دکان پر نیا گیجٹ دیکھ کر وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ چاہے اس کے لیے ...ے ہاتھ کی رہن رکھنی پڑے۔

گھر میں اشفاق احمد کی سب چیزیں کھلی پڑی رہتی ہیں جنہیں بچے آزادانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ماسوا اس کی ...شینوں اور گیجٹوں کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ فارغ وقت میں اشفاق احمد ان مشینوں کو باہر نکالتا ہے۔ بڑے پیار ...ے صاف کرتا ہے۔ تیل لگاتا ہے۔ گریس لگاتا ہے یعنی در پردہ اپنے ان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ کھیلنے کے بعد وہ مقفل کر

دی جاتی ہیں۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ وہ آپ کا شوفر بن جانا گوارا کرے گا لیکن اپنی موٹر آپ کے
نہیں دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان کے باوجود اتنے میل ملاپ کے باوجود
احمد اندر سے رابنسن کروسو ہے جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی بالائی نیم چھتی میں رہا کرتا ہے۔

اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں مگر وہ سوشل بھی نہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہے۔
بیٹھا وہ یوں نروان زدہ ہے جیسے دلدل کے کنارے دھوپ میں مگرمچھ پڑا ہو۔ اس وقت اگر ملازم آ کر کے
صاحب ملنے آئے ہیں تو پیشانی پر تلوار سی تیوری پڑ جاتی ہے۔ باہر ڈرائنگ روم میں جانا پڑ جائے تو اس کا چہرہ
کہتا ہے ''مارے گئے۔'' یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک خون معاف ہو تو وہ فلاں صاحب کو جیتا نہ چھوڑے۔ یہ
ہے کہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایسے بڑے اخلاق سے ملے گا' جیسے صبح سے انہی کے انتظار میں بیٹھا ہو اور پھر
کے بعد ڈرائنگ روم سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ قہقہے گونجیں گے لیکن یقین جانیے یہ شور اور ہنگا
پھڑ کن کیسا کے مصداق ہو گا۔

اشفاق احمد کی سب سے بڑی عشرت یہ ہے کہ وہ کچھا اور بنیان میں اکیلا پڑا رہے۔ یوں پڑا رہے جیسے
دلدل میں پڑا رہتا ہے۔ سوشل زندگی سے اجتناب کی وجہ سے وہ آج تک اپنا امیج نہیں بنا سکا۔ اس میں
اہلیت نہیں مگر حسرت ضرور ہے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا ہے مفتی جی بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے
زندگی بسر کروں گا اور اپنا امیج بناؤں گا۔ نہیں نہیں مذاق نہیں کر رہا۔ قدسیہ اور میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے ایک مہینہ
روز شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے۔ آج ان کے ہاں کل ان کے ہاں اور پھر اس تمہید کے بعد ہم ڈریس اپ
باہر لان میں کرسیاں ڈال کر سوشل وزٹر کا انتظار کیا کریں گے۔ ہر مہینے چار ایک دعوتیں دیا کریں گے۔ کبھی گھر
میں۔ میں آج کل سوشل آداب پر ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔ قدسیہ انٹرنیشنل کھانے پکانا سیکھ رہی ہے۔

ایک بار اشفاق نے اپنے اس سوشل پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ تین دن
اشفاق شام کے وقت سوشل وزٹ کرتے، پھر پتہ نہیں کیا ہوا چوتھے روز وہ اپنے صحن میں حسب دستور مگر مچھ
تھا اور سامنے بانو ممتا کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا وہ تمہارا سوشل پروگرام کیا ہوا۔ کہنے لگے جو سکھ چھجو کے چوبارے میں ہے، نہ بلخ
میں ہے۔

سوشل اور ادبی امیج پیدا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اشفاق احمد ازلی طور پر ایک کامی ہے۔ ایک
جسے مزدوری کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو وہ مزدوری کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتا
بنانا ایک الگ فن ہے جسے فنون لطیفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جدید فن ہے جو حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے
خاصا رائج ہوتا جا رہا ہے۔ اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کام کریں یا نہ کریں۔ نہ کریں تو بہتر ہے
فنکار کہلائیں گے۔ چاروں طرف آپ کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس جگہ بیٹھیں وہ نشستِ صدر بن جائے۔

اشفاق اور بانو کے اس طبعی غیر سوشل رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا کام کرنے کے باوجود کسی سرکاری یا نیم سرکاری [illegible] پروگرام یا مجوزہ تحریک یا تنظیم میں کبھی ان کا نام نظر نہیں آئے گا۔ چونکہ ان کا کوئی امیج نہیں، نہ ان میں امیج بنانے کی صلاحیت ہی ہے۔

اشفاق احمد کا گھر میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے اشفاق کے گھر سے محبت ہے۔ مجھے اس دکھی کمرے سے مجھے محبت ہے جو اس خوب صورت وسیع و عریض مکان میں یوں پڑا رہتا ہے جیسے وہ مشرقی پاکستان کا ایک طوفان زدہ علاقہ ہو۔ مجھے اس فرائی ٹوے سے محبت ہے جسے دنیا میں اشفاق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جو ہر وقت یا تو مگر مچھ کے اپنے پچپاتے تازہ کوٹ چڑھاتی رہتی ہے یا ممتا کے ڈھیر لگانے میں کھوئی رہتی ہے۔ مجھے ان تین جنوں سے محبت ہے جو کسی گھمبیر کے سائے تلے پرورش پانے کی لذت سے محروم ہیں۔ اشفاق احمد کے گھر کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے اشفاق کا گھر میری واحد پناہ گاہ ہے جیسے بھنگ پینے والے کے لیے فقیر کا تکیہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چاروں طرف اشفاق ہی اشفاق ہوتا ہے۔ داستان گو کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگرچہ داستان گو نے اشفاق کے نئے گھر پر داستان سرائے کی تختی لگا رکھی ہے لیکن داستان گو ڈرائنگ روم سے ورے نہیں آسکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ منشی خانہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ گھر دو منشیوں کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ گھر قرض پر بنا ہے اور اس قرض کو صرف سکرپٹوں کی مدد سے اتارا جا سکتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے دونوں منشی دن رات قلم کا پھاوڑا چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں داستان گو کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں اس کی تخلیقی قوتوں کو مانتا ہوں۔ میں اس کے سنہرے پھول چوں کی سجاوٹ کو پسند کرتا ہوں۔ میں اس کے مجمع لگانے کی عادت کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا لیکن میں ایک دانشور ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔

عبدالرحمٰن چغتائی

عبدالرحمٰن چغتائی سے تعارف ہمیں بابا جی کی زبانی ہوا۔ وہ عموماً ان کا ذکر کرتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر مغربی آدمی کی طرح نئے کلچر، موسم اور شہر میں گھومتا پھرتا تحیر کا شکار ہے۔

ایک دن اس کی اصرار بھری گفتگو کے دوران خاں صاحب نے پوچھا۔

''بھئی چغتائی...... چغتائی۔ وہ ہے کون؟''

''اشفاق صاحب...... جس کشمیری بابے کے پاس میں جاتا ہوں، ان کے پڑوس میں ہی عبدالرحمٰن چغتائی رہتے ہیں۔ اوپر سٹوڈیو ہے، ہر طرف پن ڈرائنگز بکھری ہوئی ہیں۔ اس کے گھوڑے اور عورت کے سمبل نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ آپ کبھی موہنی روڈ نہیں گئے ان کا سٹوڈیو دیکھنے؟''

''تو کیا وہ رنگوں کا استعمال نہیں کرتا؟''

''کرتا ہے کرتا ہے...... لیکن پھر رنگ بھی خود ہی بناتا ہے۔ بنے بنائے رنگ اسے پسند نہیں آتے۔''

''کمال ہے۔''

''کیا آپ میوزیم نہیں گئے۔ وہاں تو آپ نے ان کا کام دیکھا ہی ہوگا؟''

اب اسے کون بتائے، اپنے وطن میں کون میوزیم دیکھتا ہے۔ کس کو فکر ہوتی ہے کہ قومی ورثے کی حفاظت کرے۔ کس آدمی کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ پرانی عمارتوں کے قصے ہسٹری، اہمیت جتا کر بچوں کو قومی ... کا احساس دلائے۔ یہ سارے کام زندہ قومیں کرتی ہیں، جن کے لیے روزی کمانا ہمہ وقت مصروفیت نہیں، جو اپنے مستقبل سے غافل نہیں ہوتے۔

بہرکیف میں نے تو پروانہ کی لیکن خاں صاحب پتہ نہیں چغتائی صاحب کے سٹوڈیو میں کتنی بار گئے اور کس ... متاثر ہو کر آئے۔ ایک روز میں باورچی خانے میں رعب ڈالنے میں مصروف تھی کہ مجھے آ کر کہنے لگے۔

''جیونی یہ سب سنبھال لے گی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔''

سارے راستے انہوں نے مجھے ایک بار بھی نہ بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔

دوسری منزل پر چغتائی صاحب کا سٹوڈیو تمام تخلیق کاروں کی طرح بے ترتیب تھا لیکن جسے میں بے ترتیب ... رہی تھی اسی میں چغتائی صاحب کی ترتیب پوشیدہ تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ابھی چند تصویریں دیکھ پائے تھے کہ بڑی خوشبودار گلابی گلابی کشمیری چائے آ گئی۔

چند تصویریں چغتائی صاحب نے علیحدہ رکھ لیں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو وہ تصاویر مجھے دے ... چغتائی صاحب بولے۔

''بھابھی صاحب! یہ آپ کے لیے ہیں۔ میرا ناچیز حقیر تحفہ قبول کیجیے۔''

میں ہکا بکا تصویریں اٹھانے لگی تو ''ناں ناں'' کر کے انہوں نے روک دیا اور چھوٹے سے کہا کہ وہ مجھے ... کار میں تصویریں رکھ دے۔ اس کے بعد میں تو تصویروں سمیت چغتائی صاحب کو بھول گئی لیکن انہوں نے مجھے بڑے محبت بھرے خط ''بھابھی صاحب'' کے القاب سے شروع کر کے لکھے۔

یہ میں اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ عبدالرحمن چغتائی کے ساتھ اس تعلق سے فائدہ اٹھاؤں اور اتنے بڑے ... کریڈٹ کارڈ آپ کو دکھا کر آپ سے عزت کی پونجی وصول کروں۔

چغتائی صاحب کے جانے کے بعد یکدم کہیں سے عبدالرحیم چغتائی منظر پر آ دھمکے۔ انہوں نے ایک ... ملاقات تو خاں صاحب سے تکلفاً کی، پھر تصویروں کے لیے اصرار شروع کر دیا۔

''اگر آپ کے پاس ان کے کچھ ذاتی خط ہوں تو وہ بھی دے دیجیے۔ میوزیم میں ان کی ضرورت ہوگی۔''

دو تین تصویریں شاید ہمارے پاس کہیں ادھر اُدھر پڑی رہ گئیں لیکن زیادہ تصویریں اور خط چغتائی کے بھائی ... ملکیت سمجھ کر واپس لے گئے۔ شاید ہر بڑے آدمی کے بعد یوں ہی اُس کی ذات کو سمیٹا جاتا ہے۔

انشا جی

خاں صاحب نے اپنے مضمون ''رینی ڈے'' میں لکھا ہے کہ شہاب بھائی کی ایک گپت پائپ لائن ایسی تھی جس سے وہ لوگوں کی خفیہ مدد کر کے اپنی عاقبت سنوارا کرتے تھے۔ وہ کسی بڈھی مائی کی طرح اپنی جیب کی پوٹلیاں چوری چوری کرتے اور کسی پر اپنا راز افشانہ کرتے۔

ہم جب سمن آباد میں تھے اور ''داستان گو'' ایک مہنگی عیاشی تھی، انہوں نے خاں صاحب کو ساتھ لیا اور کراچی کے اشتہاروں کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اس طرح اشتہار مانگتے پھرنا اُن کی شہرت کو بٹہ لگا سکتا ہے۔ جب اشتہار ملنے میں ناکامی ہوئی تو شہاب صاحب نے خاں صاحب کے لیے نوکری کا بندوبست کیا اور انہیں اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر بنا دیا۔

شہاب صاحب کی دوسری نیکی جو ہمارے دیکھنے میں آئی، وہ انشا جی کو نوکری میں ایڈجسٹ کرنے میں مشغول ہوگئے۔ یہی انشا جی تھے جنہوں نے ہمارے لیے بڑا خوبصورت یہ مصرعہ چھوڑا

''انشا جی اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا''

اس مصرعے سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ انشا جی کہیں اداسی، ناامیدی یا فکر مندی کا شکار تھے۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا ان کے چہرے پر بشاشت ہی دیکھی۔ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں مہمان ٹھہرنے سے کتراتے تھے لیکن انشا جی نے کبھی اس کمرے میں ٹھہرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ وہ جب بھی آتے کمرے سے باورچی خانے تک چکر پھیریاں لگاتے رہتے۔

''کیا پکایا ہے بانو؟''

''جی سرسوں کا ساگ، مکی کی روٹی اور تازہ مکھن۔''

دوسرے چکر تک انہیں Menu بھول جاتا اور وہ پھر پوچھتے۔ اگلے دن پھر وہی سوال۔

''اور آج۔''

''آج تو گاجر آلو کی بھجیا ہے۔''

''بہت اچھے......'' وہ انفرمیشن لے کر لوٹ جاتے۔

انہوں نے کبھی کسی کھانے کی از خود فرمائش نہ کی۔

ہم عہد رفتہ کے لوگ ہیں۔ ہماری طرز معاشرت، اقدار اور ذاتی تجربات سے اخذ کی ہوئی دانش آج کے دور میں لاگو نہیں ہوتی لیکن آج کی نوجوان نسل دور دراز کے بھولے بھٹکے معاشروں کا مطالعہ انٹرنیٹ پر کرنے کی عادی ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والوں کی بود و باش، میکسیکو، کیوبا اور Inca کے رسم و رواج پر معلومات حاصل کرنا ان کی ہابی ہے۔ اسی تجسس پر تکیہ کر کے اس نئی پود سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔

لمبے تجربے سے میں نے یہ بات اخذ کی ہے کہ جس شخص نے مثبت شیشوں کی عینک اپنے چہرے پر سجائی اس کا:

رویہ، سوچ اور عمل مثبت ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہے بیاباں سے گزرے، چاہے خارزار سے، ناداری، مفلسی بیماری میں رہے یا بے وفائی اور بے توجہی کے تھپیڑے کھائے۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور دل میں طمانیت رہتی ہے۔

جس شخص کے چہرے پر منفی شیشوں کی دھندلی عینک چڑھی رہے اس کا رویہ، سوچ اور عمل ہمیشہ منفی رہتے ہیں۔ بھلے ہی محلوں میں رہے، کوٹھیوں کے مالک ہو، لمبی کاروں سے اترنے بیٹھنے والا ہو۔ اسے بے اطمینانی، مایوسی اور تفکر نہیں چھوڑتے۔

شہاب صاحب اور ان کے قریبی دوستوں میں ابن انشا واحد ایسے شخص تھے جن کے چہرے پر سے یہ عینک نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ان کی زندگی آسان تھی لیکن ان کے مثبت رویے، سوچ اور فکر نے انہیں کبھی ناامیدی کے حوالے نہیں کیا۔ ہمیشہ شانت، مسرور اور پرامن نظر آئے۔

یہ اسلام آباد کا واقعہ ہے۔

شہاب صاحب اپنی بہن محمودہ اور ان کے میاں امین بھائی کے گھر میں رہتے تھے۔ عفت کے جانے کے بعد ثاقب کی تنہائی کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے یہیں بسرام کر لیا تھا، تاکہ ثاقب تنہائی کا شکار نہ ہو اور بھرے گھر میں بڑھے۔

شہاب صاحب، مفتی جی، اشفاق صاحب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ابن انشا کرسی کھینچ کر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے تھے۔ میں اور محمودہ جی اضافی Also Rau قسم کے تماشائی سب خاں صاحب کا ڈرامہ چانگڑہ دیکھ رہے تھے۔ انشا کچھ پریشان تھے۔ محمودہ جی بار بار دوپٹے سے منہ پونچھ رہی تھیں۔ جب ڈرامہ آخری چند سینوں پر پہنچا تو انشا جی اٹھ کھڑے ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ''یہ اشفاق بہت ظالم آدمی ہے۔ اس نے بچہ مار دینا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ میں جب ڈرامہ ختم ہو جائے گا تو آ جاؤں گا۔''

محمودہ جی بولیں۔ ''بخار اتر گیا۔ آئیں انشا جی لال لوبیا کھائیں۔ آپ کا پسندیدہ کھانا۔''

انشا جی نے سکھ کا سانس لیا اور خاں صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ایک مرتبہ ہم کراچی گئے۔ ہم انشا جی کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ وہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ہم سامنے والی سیدھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کراچی کے متعلق سرسری گپ شپ ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد خاں صاحب نے کہا۔ ''انشا جی! دو سو روپے دے دو...... درکار ہیں۔''

مجھے کبھی علم نہ ہوتا کہ خاں صاحب کے بٹوے میں کتنے پیسے ہیں۔ اس لیے مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ گھر سے پہلے انہوں نے خاطر خواہ انتظام کیوں نہ کیا؟ انشا جی نے خاں صاحب کی بات کا رتی بھر نوٹس نہ لیا اور موسم سے لے کر منگھو پیر تک ہر رنگ کی بات جاری رہی۔ مجھے ان کی بے پرواہی پر ذرا سا ملال ہوا۔ پھر اچانک انہوں نے بڑی رازداری سے اپنا دراز کھولا۔ کچھ ہلکا سا تلاش کیا اور بڑی ہی رازداری سے ایک لفافہ خاں صاحب کو پکڑا دیا۔

اس لفافے پر لکھا تھا ''More?''

انشا جی کا یہی طریقہ تھا، وہ مانگنے والے کو رازداری سے عطا کرتے، اسے مانگنے کی خجالت سے بچاتے تھے۔

...جو مانگا جاتا اس سے سوا دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مانگنے والا عموماً ضرورت سے کم مانگتا ہے۔ ایک مرتبہ انشا جی ہمارے گھر پر مقیم تھے کہ ایک سائلہ آئی۔ اس نے ہزار روپے مانگے۔ انشا جی نے اسے دو ہزار پکڑا دیئے۔ خاں صاحب بولے۔ "یار انشا! اس نے ہزار مانگا تھا، تم نے دو ہزار کیوں دیئے؟"

کہنے لگے "خود ہی تو کہا کرتا ہے کہ دھرم پورے والے بابا سائیں فضل شاہ کا فرمان ہے دل کھول کر دو...... تم نے وتے میں سے ہی دینا ہے، کون سا پلے سے جاتا ہے۔"

میں بھی "وتے میں سے دینا" کا فلسفہ سنتی رہی تھی لیکن انشا جی کی طرح عمل تک نہ پہنچ پائی تھی۔

آخری مرتبہ جب وہ ہمارے پاس لندن جانے سے پہلے آئے تو ان کا چہرہ سبزی مائل زرد تھا۔ وہ بڑی تکلیف میں تھے لیکن ہمیشہ کی طرح چہرے پر طمانیت اور سکون تھا۔

ویسے تو شہاب صاحب، مفتی جی اور خاں صاحب کی عینکوں کے شیشے بھی مثبت تھے لیکن کبھی کبھی وہ یہ عینکیں اتار کر مابعد اور نامعلوم کی تلاش میں چل نکلتے تھے۔ انشا جی کو کبھی تلاش نے تنگ نہیں کیا...... کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی مثبت شیشوں کی عینک اتاری ہی نہیں۔ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے۔ پھر وہ اور کیا تلاش کرتے؟

ان کا زرد رنگ اور پیلے ہاتھ دیکھ کر میں نے خاں صاحب سے پوچھا۔

"انشا جی کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا۔ ہے انشا کو؟"

"دیکھتے نہیں ان کا رنگ ہلدی سا ہے۔ بیمار ہیں کیا؟"

مجھے اب معلوم ہوا کہ انشا جی کینسر کے مریض تھے۔ غالباً خاں صاحب کو اس وقت صحیح حالت معلوم تھی لیکن خاں صاحب کی ستر پوشی کے مختلف اصول تھے۔ وہ کسی شخص کی ناداری، بیماری، ذلت اور بیکاری کو اپنے تک محدود رکھتے۔ ان کا غالباً یہ خیال تھا کہ لوگ ایسے حالات جان کر محض گفتگو کا موضوع بنا دیتے ہیں اور اسے غیبت کی ایک گھناؤنی شکل عطا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایسی انفریشن کو افواہ کی شکل نہیں دینی چاہیے بلکہ اوپر والے ستر پوش کی طرح چشم پوشی کرنے میں ہی بہتری ہے۔

شہاب بھائی نے انشا جی کے لیے لندن میں نوکری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہاں وہ ایک بڑے میوزیم (انڈیا آفس لائبریری) کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میوزیم میں پاکستان کی نادر کتابیں، اہم ادیبوں کا کام اور سیاسی لیڈروں اور خاص کر ہمارے کلچرل Heritage کا خزانہ جمع تھا۔ انشا جی اپنی مثبت عینکیں لگائے اپنے کام میں مگن تھے۔

آخری بار ہم انشا جی کے پاس لندن پہنچے۔

انہوں نے ہمیں لائبریری میں مدعو کیا۔ کچھ انگریزی اور پاکستانی سکالر وہاں جمع تھے۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح اپنے مسلک کے عین مطابق دو قومی نظریہ پر تقریر کی اور پاکستانی کلچر کا تشخص بھارت کے رسم و رواج سے مختلف سمت میں دکھا کر پیش کیا۔ انشا جی بہت خوش ہوئے اور بعد میں بولے۔ "یار تو ادیب کی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہ نیا ملک ہے۔ اس کی Ideology کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کاش! ہم سب شاعری میں علامہ اقبال کا پرچم اٹھا کر چلیں۔"

''ہاں وہ تو ہے لیکن سب ادیبوں میں وہ اپج اور Genius نہیں ہے۔''

انشاجی نے پُرامید لہجے میں کہا۔''یار تو ذہین آدمی ہے۔ کچھ اس سلسلے میں ہمت کرناں۔کوئی تحریک۔کوئی سنگت تشکیل دے ناں۔ یہ تنکے تنکے بکھرا جھاڑو اکٹھا کرناں۔''

''کروں تو...... لیکن وہ سمجھیں گے اشفاق چودھراہٹ چاہتا ہے۔ لیڈری کا شوق ہے اسے۔ میری برادری تو میری نہیں مانے گی کبھی بھی۔''

''لے لے ناں یہ الزام، پھر کیا ہوا۔ جب تیری نیت صاف ہے تو پھر الزام کی فکر کیسی؟''

''بھائی انشاجی! ادیبوں کا بڑا مسئلہ اُن کی انا ہے۔ ان کی کمر میں لوہے کی لٹھ پڑی ہے۔ وہ کب جھکتے ہیں کسی کے آگے؟''

جب انشاجی باتیں کررہے تھے تو میں نے نوٹس لیا کہ اُن کے ہاتھ، خاص کر اندر کی ہتھیلی انڈے کی زردی کی طرح پیلی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں اِدھر اُدھر گھمائیں تو آنکھوں کی سفیدی حیرت انگیز حد تک بے رنگ نظر آئی۔ گاڑی میں پہنچ کر میں نے خاں صاحب سے ایک بار پھر اپنی تشویش کا ذکر کیا۔

''انشاجی کی طبیعت تو مجھے ٹھیک نہیں لگتی خاں صاحب۔''

''تمہیں تو ہر وقت ایسے ہی وہم ہوجاتے ہیں۔ ٹٹو جیسا دندناتا پھرتا ہے۔ واہ کیا کام ہے کیا خزانہ کتابوں کا اکٹھا کرلیا۔ پتہ نہیں ہم اس خزانے سے کچھ اٹھا سکیں گے یا نہیں لیکن یہاں کے سکالر اس کا مطالعہ کرکے کوئی بڑی ریسرچ پاکستان پر کریں گے۔''

''لیکن جی ان کی صحت۔''

''تم پیلے ہاتھوں کا مرثیہ گارہی ہو۔ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔''

خاں صاحب کے سفید رنگ کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے مسٹرڈ کی طرح پیلے ہورہے تھے۔

میں نے ابھی تک ان کے ہاتھوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کام کی زیادتی اور آرام کی کمی کے باعث وہ یوں زردی مائل ہوتے جارہے ہیں۔ میری بے فکری کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ میں نے انشاجی کی بیماری تو بھانپ لی لیکن مجھے لحظہ بھر کے لیے شبہ نہ ہوا کہ خاں صاحب بھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انشاجی کراچی لوٹ آئے۔ ڈاکٹروں نے ان کا اصلی مرض تشخیص کرلیا تھا۔ انشاجی تو ہمارے پاس نہ آئے لیکن ان کا رابطہ اور بھی باقاعدہ ہوگیا۔ انہیں فکر تھی کہ ان کی کتابوں کی اشاعت ان کے بعد کون کرے گا۔ وہ کسی پبلشر سے معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر گھر کا بھی مسئلہ تھا۔

ان مسائل کو سلجھانے میں خاں صاحب ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ زیادہ فکریں ساتھ ہی لے گئے۔ یوں ایک شریف النفس، شرمیلا اور غیرت مند ادیب کا انجام آپہنچا۔ اوپر والا کیوں چاہتا ہے، کب چاہتا ہے اور کیسے چاہتا ہے اس کا بھید کبھی کسی انسان کو کُلّی طور پر نہیں ہوسکا۔ انسان کا علم ہمیشہ سے قلیل ہی رہا ہے اور رہے گا۔ جتنا برتن اتنا پانی۔ برتن میں موسلادھار بارش ساری تو سما نہیں سکتی البتہ مقدور بھر پانی ضرور اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

انشا جی کے کوچ کرنے کے بعد سمجھ آئی۔

''انشا جی چلو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا''

ہوسکتا ہے ان کا دل کبھی بھی اطمینان یا خوشی سے ہمکنار نہ رہا ہو لیکن ان کی مثبت عینکوں نے ان کے چہرے پر بھی بے اطمینانی کا منظر پیش نہیں کیا۔

انتظار حسین

یہ A.R.Y. فنکشن کا ذکر ہے۔ مجھے اس فنکشن پر دس لاکھ کا انعام ملا تھا اور اسی قدر رقم انتظار حسین صاحب کو ملی تھی۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ ایک روز میں اور خاں صاحب باہر نکلے تو انتظار صاحب بھی باہر ہی آ رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے عالیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس درجے بیمار ہے۔ جب ہم باہر میں نکلے تو انتظار بھائی نے مجھے کہا ''شکریہ! یوں پبلک میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لانا مجھے کچھ معیوب سا لگا لیکن آپ نے بہت مہربانی کی جو عالیہ کو سنبھال لیا۔''

انہوں نے میرے کردار کی تعریف ضرور کی لیکن میری تسلی نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے میرے ادبی کام کے حق ایک لفظ نہ کہا۔ جب عالیہ دنیا سے رخصت ہوئی تو بڑی مروت سے ہمیں اس کے متعلق اطلاع دینے خود تشریف لائے۔

''کل قبرستان میں ہی اس کے قل ہیں۔ چند لوگوں کو اطلاع دی ہے، آپ دونوں ضرور آئیے۔'' ہم دونوں قبرستان پہنچے۔ چند لوگ موجود تھے۔ تازہ قبر پر تھوڑے سے پھول چڑھائے۔ ایک اچھی روح کو رخصت کیا اور سوچتے آئے کہ انتظار بھائی بھی کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ان کے گھر میں اللہ نے بچے کا چراغ نہ جلایا لیکن وہ نہ اللہ کے شاکی ہوئے نہ بیوی کو بچے کی خاطر چھوڑ کر دوسری شادی کے مرتکب ہوئے۔

انتظار حسین، خاں صاحب کے داؤ جی کو ان کے ادب کی معراج سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کا جو ادب خاں صاحب نے پیش کیا، اس کے وہ قائل نہ تھے۔ میں انتظار حسین کو ایک بڑا لکھاری سمجھتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میرا ان کا مسلک ایک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انتظار حسین پاکستان کی نعمت ملنے کے بعد بھی ابھی Nostalgia کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں پتھر کے بن جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے منکر ہونے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ نہ سمجھیے میں انتظار حسین کی تخلیقی ہنرمندی، ان کی زبان و بیان کی ثنا خواں نہیں۔ مشکل صرف اتنی ہے کہ میں ہی تنگ نظر ہوں۔ مجھ میں واقعی وسعت قلب کی کمی ہے جو انسان کو لبرل ہونا سکھاتی ہے۔

انتظار بھائی اب بھی میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے ہیں۔ خاموشی سے میرے زخم پر پھاہا رکھتے ہیں۔ ڈیرہ گھنٹہ بھر یہاں سے تھوڑا سا کھا پی لیتے ہیں لیکن آج تک ہم دونوں میں تخلیقی عمل پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

بھٹو

لوگوں میں جو نیک نیتی پیدائشی ہوتی ہے، اسی کے طفیل خاں صاحب سے سکھ برادری کے کچھ لوگ ملنے آتے تھے۔ یہ لوگ ہجرت کرنے والے تھے اور خاں صاحب ان کا مان آدر اسی طرح کرتے تھے گویا انصار کی نقل کر رہے ہیں۔ جب تک خاں صاحب زندہ رہے، میری ان سے ملاقات رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ یہ سکھ حضرات I.S.O. کے رکن تھے۔ ان میں ایک لمبے تڑنگے لمبی داڑھی والے سردار سرغنہ تھے۔ خاں صاحب انہیں ''بھٹو'' کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا ڈرائیور بڑی ہی پیاری شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اندر تو لیکن سردار حضرات اسے اپنے جتھے کا حصہ سمجھتے تھے۔

خاں صاحب کا بچپن، بلوغت کا زمانہ مکتسر میں کٹا۔ یہ سکھوں کی بستی تھی۔ یہاں کے رسم و رواج اٹھنا بیٹھنا سب میں سکھی پنتھ کی جھلک تھی۔ گو بابا جی ایسے میل جول پر ''بھوں بھوں'' کرتے لیکن روک نہ سکتے تھے۔ کچھ عرصہ رہتے ہوئے جب بابا جی کا خوف کم ہوا تو ان کی ڈسپنسری پر سکھ سردار بڑی بے تکلفی سے آنے لگے۔ اس علاقے میں زمینیں سکھوں کی تھیں۔ ان بڑے سرداروں کی گھر والیاں سروں پر احتیاط سے دوپٹہ اوڑھتیں اور مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے دوہے گرنتھ کی زینت تھے۔ اس لیے سکھوں کے دل میں درگاہوں کا بڑا احترام تھا۔

خاں صاحب اپنی پرورش میں سے سکھوں کے کلچر کو منہا نہ کر سکے تھے۔ جب بھی سردار یہاں آ جاتے تو ٹھیٹھ کی پنجابی سننے والی ہوتی۔ اندر آ کر خاں صاحب کہتے ''قدسیہ! کھانے میں گوشت نہ ہو، صرف مچھلی رکھ سکتی ہو۔''

کبھی کبھی امریکہ میں رہنے والے ڈاکٹر پرت پال بھی خاں صاحب سے ملنے آتے۔ دبلے پتلے درمیانی داڑھی والے شائستہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں مغربی Manner اور مشرقی حیا ہوتی۔ وہ کبھی عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ ان کی گھر والی بھی ڈاکٹر تھیں۔ وہ ایک مدت سے وہیں آباد تھے لیکن اب ان دونوں نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ کاشتکاری کا آبائی پیشہ اختیار کر کے زمینیں خرید لی تھیں جس پر بادام کاشت کرتے تھے۔ جب بھی ساتھ آتے تو ساتھ خاں صاحب کے لیے باداموں کا تحفہ ضرور ہوتا۔

امریکی باداموں میں یہ خاصیت تھی کہ ان میں سے ایک بھی کڑوا نہ نکلتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی انہوں نے پچھلی روایت قائم رکھی۔ میرے لیے بادام ضرور لاتے۔

جب خاں صاحب نے اردو بورڈ چھوڑا تو انہوں نے بھٹو سے کہا..... ''اب سرکاری گاڑی کے مزے ختم ہوئے۔ تم پرانی گاڑیوں کا کاروبار بھی کرتے ہو۔ ایک پرانی سوزوکی مجھے کہیں سے لا کر دو لیکن ایک شرط ہے، گاڑی زیادہ پرانی نہ ہو۔''

کچھ ہی دن نہیں گزرے تھے کہ بھٹو ایک گہرے سبز رنگ کی فوکسی لے آئے جو شاید آٹھ دس ہزار میل چلی تھی۔ اب بھٹو نے اس کی قیمت وصول کرنے سے انکار کیا۔ خاں صاحب نے گاڑی نہ رکھنے پر اصرار کیا۔ بڑی مشکل سے بھٹو نے اس کی قیمت وصول کی جو غالباً ایک لاکھ چالیس ہزار تھی۔ ان قیمتوں کو پیش نظر رکھیں تو Inflation کی سمجھ آنے لگتی ہے۔

ان جنگی ساتھیوں کے ساتھ عموماً ریاض محمود ایک لازمی جزو بن جاتے۔ وہ بڑے خاموش تماشائی تھے۔ بولتے کم سنتے زیادہ تھے۔ بھو کی گھر والی اور ان کے تین بچے لندن میں رہتے تھے۔ جب بھی وہ بچوں کو چھٹیوں میں بھو سے ملنے آتی، بڑی گہما گہمی ہوتی۔ بانو باجی اور ریاض محمود ان کی دعوتیں کرتے۔ ہمارے ہاں بھی ایک دو مرتبہ اکٹھے ہونے کا موقع ہو جاتا۔

پھر ہولے ہولے بھو بھی ہماری دعوت کرنے لگے۔ خاں صاحب کے آخری ایام میں بھو کی گھر والی نے ایک بڑی پُر تکلف دعوت کی۔ میز پر رنگ رنگ کی سبزیاں، دالیں تو تھیں ہی لیکن مرغ اور گوشت کے بھی سالن موجود تھے۔ ان کی میزبانی کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بازار سے گوشت اور مرغی منگوا کر دعوت کو مہمان کے حوالے سے سجایا تھا۔

یہ ملاقات گفتگو کے اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلا تو گفتگو نے بڑا پلٹا کھایا۔

بھو بولے..... ”خاں صاحب اسکھوں نے قیامِ پاکستان کے وقت بڑا ظلم کیا۔ جتھوں پر حملے کیے۔ ٹرینوں کو لوٹا۔ ہندوؤں میں اتنی جان نہیں تھی کہ مسلمانوں کو چھیڑ سکتے لیکن ہمیں ماسٹر تارا سنگھ نے پھنسا دیا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جب ہندو کو ضرورت پڑتی ہے، وہ دوست بن جاتا ہے۔ وعدے کرتا ہے اور جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو وعدے سے مکر جاتا ہے۔“

”جان دے سکھا جان دے تجھے کیا بھول گیا کہ جب جہانگیر کے عہد میں بابا تیغ بہادر کو پکڑ کر دربار میں لائے تو جہانگیر تخت سے اتر کر اسے ملا اور حکم دیا کہ گورو بہادر کو عزت کے ساتھ امرتسر لوٹا دیا جائے لیکن جہانگیر کے برہمن وزیر نے گورو بہادر کا سر کاٹ کر امرتسر بھیجا۔“

بھو نے لمبی آہ بھری اور گویا ہوا..... ”ایک ظلم دوسرے ظلم کی وجہ بن جائے۔ خاں صاحب یہ تو کور لوگوں کی بات ہے۔“

خاں صاحب نے سر ہلا کر آہستہ آہستہ کہا۔ ”بھائی میرے سوہنا۔ جب پشاور میں تحریک چلی تو سکھوں کا قلعہ اور ان کا دبدبہ سارے پشاور میں تھا۔ سید اسماعیل شہید نے اس قدر زبردست جنگ کی کہ سکھوں کا قلعہ سکھوں کے لیے ہی توالہ باغ بن گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سکھ کھیت رہے۔ پھر جنگجو قومیں تو ایسی آزمائشوں سے گزرتی ہیں۔“

اب بھی بھو قائل نہ ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیر تھی۔

”سنو بھائی میری بات سنو۔ سکھ اور مسلمان توام بھائی ہیں۔ برصغیر میں یہ دونوں اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی خرابی یہ ہے کہ دونوں مارشل ریس ہونے کے باعث تیز مزاج ہیں۔ سارا دن یہ جڑواں بھائی لڑتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک دوسرے کی جان لیے بغیر نہ رہیں گے لیکن جب رات پڑتی ہے بھائی ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں۔ اکیلے کسی کو بھی نیند نہیں آتی۔ بستر پر جب تک ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسا کر، بانہوں میں ایک دوسرے کو قید نہ کر لیں سو کوئی بھی نہیں سکتا۔ یار بھو! بھول جا ان سطحی باتوں کو..... اس محبت پر توجہ رکھ جو اندر ہی اندر Undercurrent کی طرح ان میں چلتی ہے۔“

خاموشی سے سننے والے ریاض محمود نے ان باتوں اور اپنے ذاتی مطالعے سے اتنا اثاثہ جمع کر لیا کہ ریڈیو

پاکستان سے "پنجابی دربار" چلا رہے ہیں اور اسی سلسلے میں انہیں Pride of Performance بھی مل چکا ہے۔
خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی بھٹو میرے پاس آتے رہے، ہر بار ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ میری معاونت کریں لیکن مجھے علم ہے کہ میں اتنی بُری نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ پکڑ سکوں۔ مجھے مانگنے سے بھی ڈر لگتا ہے خدا سے بھی۔ خاں صاحب کے خیالات سکھی بھائی چارے کے متعلق کیا ہیں، یہ ان کی تحریر سے دیکھیے۔

وسریاں یاداں

ساڈے پنڈ دا تیلی چاچا حشمت بڑا نیک تے ایماندار بندا سی۔ جدوں وی تارے میرے، تو ریکے یا سروں دا تیل پیڑنا اُوہناں نوں دھیان نال گوہ کر کے اڈو اڈ پیپیاں وچ پاناتے اوسے حساب نال من تولے لینے۔ اوہنے کدے نخالص نوں خالص کر کے رول نہیں سی ماریا تے ناں ای ٹولن لگے، دھڑا کرن لگے، کسے نوں ٹھونگا ماریا سی۔

چاچا حشمت ہور تے چارے بنیوں ٹھیک ٹھاک سی پر قبیل دار ہون پاروں اوکھا ای رہندا سی۔ اک آپ گھروالی، چھی بچے اک بڈی ماں اتوں ایمانداری، بس مرکھپ کے ای ویلا ٹپاندا سی نہ کدے ہوکا بھر کے کسے نوں نہ کسے دی شکایت کیتی نہ اپنے بارے کدے رب نوں کوئی رائے دتی، ہیر بہت سوہنی پڑھدا اتے کوڈی بہت چنگی کھیڈدا سہاگا چکن وچ وی پنڈ وچ دوجے نمبر تے سی۔

اک واری مور کہ بخار چڑھیا۔ چاچی پہلاں اوہنوں حکیم صاحب دی دوا پاندی رئی پھیر درشن ویدے دی چاٹ جئی بنا کے دتی۔ پر چاچے دے بخار دا چکر اونویں ای نویں رہیا تے اوسے طراں گھمن گھیری پاندا گیا۔ جدوں ضلع دے وڈے ہسپتال لجان دا ارادہ کر کے گڈے تے پایا تے اگے ساک ادھر راہ وچوں ای موڑ لیائے جو چاچا چپ کر کے اڑیا، مسافری وچ ای گزر گیا تے اوہدے ایانیاں دے سر تے ہتھ رکھن آلا کوئی نہ رہیا۔

مولوی صاحب نے ساڈی بستی دے سارے مسلمان گھراں وچ آپ جا کے اطلاع دتی بئی پرسوں چاچا حشمت تیلی دا تیجا اے سارے بھرا میت وچ کٹھے ہون تے جان والے لئی دعا کرن تے اوہدی روح نوں ثواب پہنچانا بنداسی۔ ہر ایک دی اوہنے خدمت کیتی اے ساتوں وی چاہی دا اے کہ اسیں وی دعا بخش کے اوہدیاں مہربانیاں دا بدلہ لائیے۔

میرا کھیال اے ہئی چاچے حشمت دے تیجے تے اسیں کوئی پچی تیہہ بندے میت وچ ہونواں گے۔ کجھ بندے ساڈی پتی توں باہر دے وی سی جیہڑے چاچے حشمت تیلی نوں کلام بخشن آئے سی تے اک پاسے بیٹھے شریف پڑھ رہے سی...... گٹکاں، تسبیاں، مکالین مگروں مولوی صاحب نے دعا منگائی تے اسیں جتیاں پا کے مسیتوں باہر نکلے تو بوہے اگے بھائی جسا سنگھ دا چھوٹا کاکا، پرانی پتھروچ لے کے اپنے گڈے اگے بلداں نوں ٹھٹھی کر کے تھوڑا کچا جیا ہو کے تے نویں پا کے میرے ابا جی نوں کہن لگا، تایا جی! بابو نے آپ آنا سی پر اُوہنوں تاپ چڑھیا ہے۔

ڈھلا مٹھا جیہا اے۔ میرے ہتھ اوہنیں سینھیا بھیجیا اے بئی مسیتے جا کے ساریاں نوں دس دئیں میں وی دعا تے اپڑنا سی پر کابے ہتھوں رہ گیا ایں۔ بڑا چارا ماریا پر میرے کولوں ٹریا نئیں گیا۔ ہن بلبیر سیاں دے ہتھ بائی حشمت لئی دعا بھیج رہا ہاں مینوں اپنے نال شامل شریک ای سمجھنا۔

بلبیر سیان نے گڈے توں ترپال لاہ کے آکھیا ''باپو نے تیجے لئی آہ دعا بھیجی اے تے نالے سنیہا دتا اے بئی جدوں ٹکڑا ہو گیا چاچے حشمت دے چالیے تے پھیر وی دعا بھجوان دا پربندھ کراں گا۔

گڈے وچ دو بوریاں کنک سی، اک مائی چولاں دی، دیہہ چٹی سیر شکر سی تے اک پیپا گھئیو دا، دو رر جائیاں، اک تھان چھینٹ دا۔

کاکے بلبیر سیاں نے اک واری پھیر کچے جئے ہو کے آکھیا۔''او جی باپو کہندا اسی بئی اپڑ تاں میں اج وی جانا سی پر میرے کولوں چنگی طراں ٹریا نہیں جاندا، پیر چھوٹے جئے بین ڈیہہ پئے سن۔''

بائیسکل

ٹرنج حساب کریئے تے کئی سال پہلے دیاں گلاں ایں پر جے سن وی پوچھو کھوں کے ورتے چھولیے تے کل دی گل ورس دی اے۔ اوہی دھپاں، اوہی پیلی رشنائی، اوہیو تائے لابھ سیاں دا نوہری تے اوہیو ادھید اپریت سمان بوتا جیوجانائی بابو نال شرڈلا کے گڈی تو پہلے اگلا ٹیشن لنگھ جائے۔ جیڑھی گل میرے ابے نے نئیں سی منی ہندی اوہ اسیں تائے توں دس کے پوری کروالیندے، جیڑھی شے میری ماں نے لیان توں انکاری ہو جانا اوہ اسیں تائی نوں دس کے پکوالیندے۔ چھنے بھر کے گھر لے آنے آپ وی کھانی تے گھر دیاں نوں وی کھوانی۔ میری ماں نے کہنا ''بی بی تو منڈیاں نوں وگاڑ دئیں گی۔ ہو گے ای کسے دے آکھے نئیں لگدے توں ایناں نوں ہور وگاڑ دینا ایں۔''

تائی کر پو نے ہس کے کہنا۔''بھابھی توں چتانہ کریا کر، تے ہتے وہماں وچ نہ پیا کر۔ ایناں دے آہی تاں کھان پین دے تے موجاں مارن دے سے ایں۔ پھیر ایناں نے جولے ہیٹھاں سر دے کے ویلا کڈھنا اے۔ اودوں ایناں نے کدھرآ کے کہنا اے تائی ساگ پکا دے، تائی کڑاں بنا دے، تائی پوڑے تل دے، ایناں نوں ٹھکیا نہ کر، جو آکھن سن لیا کر، اپنے اپنے کم کار تے ہو گئے تے فیر ایناں نے کتھے ملنا اے۔

میں دسویں دا امتحان دتا تے اپنے ابے کول اوہناں دی ڈسپنسری تے آکے کہیا'' بابا مینوں بائیسکل لے دے ہن میں وڈا ہو گیا ایں۔'' تایا لابھ سیاں کول ای اک موڑھے تے بیٹھا، کھنڈے جئے چاقو نال پیراں دے نونہہ پیا کٹ دا سی۔ ہتھ روک کے کہن لگا۔'' اوئے ملا، بائیسکل نوں پھائے دینا ایں۔ بابے نوں آکھ گھوڑا لے کے دے وے۔ سواری کریں تے سانوں وی سوہنا لگیں تے سارے جگ نوں وی بھانویں، سیکل وی کوئی سواری اے۔ دفع کر، مار کاٹھ، ایدے نالوں تے بندا پیدل ای چنگا۔''

میں کہیا'' تایا مینوں بائیسکل ای چنگی لگدی اے تے میں بائیسکل ای لینی اے۔''

میرے ابے نے پکا جیا منہ کر کے آکھیا۔''بی اے وچ داخلہ لویں گا تے سائیکل ملے گی ایدوں پہلاں نئیں۔

تیرے وڈے بھرانوں وی بی اے وچ لے کے دتّی سی تے تینوں وی اوہدوں ای ملے گی۔'' میں کش بولے بغیر جواب [illegible]
بناں رون ہاکا جیا ہو کے ڈسپنسری باہر آ گیا۔ تے ماں کول آ کے اُچی اُچی رون لگ گیا۔

اگلے دن میں سویرے سویرے اپنے ہرن دے سنگاں نوں تیل لا رہیا سی جو مینوں گلی دی نکر تے تایا لابھ [illegible]
آوندا دسیا۔ اوہ کج کبا کبا تے ٹیڈھا ٹیڈھا مڑدا پیا سی تے اوہنوں سمجھ نئیں آوندی سی ہئی کھبے ہو کے ٹراں کہ سجے پاسے [illegible]
ہو کے پینڈا کراں۔ کش گابر جیا سی۔ اوہدے ہتھ وچ اک نویں سیکل سی جیدے ڈنڈیاں تے کھاکی کاغت وہلیٹ [illegible]
سی۔ تایا اوہنوں کدے ہنڈل تو پھڑ کے کھچدا سی کدے گدی تو پھڑ کے دھکدا سی۔ سیکل ٹیڈھی ہو ہو جاندی سے تے [illegible]
چوڑے دا ہوئی جاندا سی۔ میں بھج کے، اگے ودھ کے اک ہتھ ہینڈل نوں پالیا تے دوجی بانہہ وہلیٹ کے تاے نوں [illegible]
لئی۔ اوہنے میرے سر تے دھپا مار کے کہیا: '' لے پھڑ اینوں، رون نہ لگ جایا کر ایڈی چھیتی تے مرا بھرانوں تنگ [illegible]
کر کے توں ساریاں چیزاں لا کچھوں بلا لیں؟''

پھیر پتہ نہیں کی ہویا۔ کس نے منتر پڑھیا تے کس نے جادو کر دتا۔ تایا ساتھوں تے اسیں تائے توں دو [illegible]
ساڈے سنھ وچ کوئی ہور آ کے پھس گیا۔ کسے نے ساڈے اعتبار دی ڈور توڑ کے سانوں اک دوجے توں پرا کر [illegible]
اسیں ایدھر آ ئے ایں اور ایسا ویلا سی جدوں تائے تے تائی ہندے ہوئے وی اسیں اک دوجے نوں مل نہیں سکے۔ [illegible]
دی گنڈھ میری سیکل وہ اوتھے ای رہ گئی۔ جیڑھی نہ میرے کول رئی نہ میرے تائے دے گھر گئی۔ کوئی ہور ای اوہنوں [illegible]
لکیا۔ کوئی تیجا ای سانوں دوناں نوں لٹ کے لے گیا..... سانوں پتہ نئیں چلن دتا تے اسیں دونویں لٹے گئے۔

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب سے دور دور کی ملاقات رہتی تھی۔ عموماً وہ منصورہ کی تحویل میں ہوا کرتے اور ان تک رسائی [illegible]
کے طفیل ہوتی۔ وہ بھی ان کی حفاظت کسی نرس کی سی مستعدی سے کرتی۔ نہ اسے اپنی فکر ہوتی نہ اپنے گھر والوں کی۔ [illegible]
ہوتا تو دوائیاں پلا دیتی۔ کبھی کبھی کلائی پکڑ کر نبض جانچ لیتی۔ منصورہ میں ایک شکر گزار روح ہے۔

جس طرح قاسمی صاحب نے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی زندگیاں بنائیں، ویسے ہی وہ منصورہ کو [illegible]
سے منسلک کر کے اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں لگے تھے۔ خاں صاحب اور میں بڑے شوق سے اس محفل میں [illegible]

پھر مشکور حسین یاد نے ہمیں شام کے کھانے پر بلایا۔ یہ ادیبوں کا کٹھ تھا۔ کھانا Caterers سے آیا تھا۔ کھانے
کے بعد سب فرشی نشست میں بیٹھ گئے۔ سب ادیبوں کی خواہش تھی کہ قاسمی صاحب اور دوسرے موجود حضرات [illegible]
سنائیں۔ پھر قاسمی صاحب کچھ اٹھتے بیٹھتے میرے پاس پہنچے۔

''قدسیہ میرے کچھ کام آؤ گی۔''

ہم دونوں کچھ حیران سے ہو گئے۔

''کیوں نہیں کیوں نہیں، اس کی کیا مجال کہ انکار کرے۔'' خاں صاحب تپاک سے بولے۔

''وہ دیکھتی ہو......شہزاد احمد کے دائیں ہاتھ۔''

''جی ایک لڑکی ہے۔''

''بھائی لڑکی نہیں میری بیٹی ہے ناہید قاسمی۔ میں اس کا گنہگار ہوں۔ سب کے لیے مجھے وقت ملا لیکن میں اس کی صلاحیتوں کو ابھار نہیں سکا۔ اچھی بھلی شاعرہ ہے لیکن میں اسے مشاعروں میں ساتھ نہیں لے جا سکا۔ اب بھی مشکورا سے ...وتی لے آیا ہے ورنہ میں تو شاید اسے کبھی ساتھ نہ لاتا۔''

''شاعری کے علاوہ کیا کرتی ہے ناہید؟''

''پی ایچ۔ڈی کر رہی ہے۔''

اس کے بعد میں نے ناہید کے قریب ہونے کی کوشش ضرور کی لیکن ایسے کام جس تواتر اور پیہم لگن کے ساتھ کیے جاتے ہیں، مجھ میں اس کی اہلیت نہ تھی۔ لوگوں کو ان کی من چاہی منزلوں تک پہنچانے کا فن قاسمی صاحب اور خاں صاحب ہی جانتے تھے۔ نقل تادیر اصل کی طرح نہیں چل سکتی۔

''فنون'' اور منصورہ کی وساطت سے مجھے قاسمی صاحب ملتے رہے۔ پھر خاں صاحب کے جانے کے بعد تیسرے دن ہمارے گھر پر بہت سے رشتہ داروں اور ادیبوں کی بھیڑ تھی۔ سب چپ چپ کھوئے کھوئے سے تھے جیسے راستہ بھول گئے ہوں یا رہبر گم ہو گیا ہو جو انہیں راستہ دکھائے۔

مولوی صاحب اور ان کے شاگرد اونچے اونچے سپارے پڑھنے میں مشغول تھے۔ گفتگو اول تو تھی ہی نہیں اور ...تھی بھی تو کھسر پھسر کے انداز میں...... پھر کسی نے مجھے پیغام دیا ''آپ کو قاسمی صاحب بلا رہے ہیں۔''

قاسمی صاحب کے ساتھ والی کرسی خالی تھی۔ میں چپ چاپ اس پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ قاسمی صاحب کچھ نہ بولے۔ پھر گویا ہوئے۔

''قدسیہ! مجھے تمہارے شوہر کا بڑا سہارا تھا۔ آج میرا بازو ٹوٹ گیا۔ میں اور کیا کہوں جس کا بازو جاتا رہے، وہ کیسے بے سہارا ہو جاتا ہے۔''

دونوں جانب خاموشی طاری ہو گئی۔

پتہ نہیں اس دار الفنا میں انسان کیسے کیسے سیکھتا ہے، کبھی گنوا کر کبھی لٹا کر کبھی حاصل کر کے......اور جانیے یہ سیکھا ...سے یاد بھی رہتا ہے کہ نہیں؟

احمد بشیر

ممتاز مفتی ہماری زندگی میں بہت سے لوگ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک احمد بشیر بھی تھے۔ گھنگریالے بال، سانولا رنگ، بھرا بھرا سا جسم، ان کا رشتہ خاں صاحب سے رشک اور حسد سے ملا جلا تھا۔ وہ خود جس ہر دلعزیزی کے متمنی تھے، وہ خاں صاحب کے گھر کی لونڈی تھی۔ بھائی احمد بشیر اس طرح الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ نہیں تھے اور شہرت اب

الیکٹرانک میڈیا کی مرہونِ منت ہو چکی تھی۔

لیکن اللہ میاں ہر مقام پر تلافی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ جب تادیر کوئی شخص اندر ہی اندر کسی خواہش پر مرتا ہے، اس کے لیے مرا جاتا ہے۔ اس کے پورے ہونے کی آرزو، اس کے اندر دم نہیں توڑتی تو اشک شوئی کے طور پر کہیں سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

احمد بشیر کے چار بچے تھے جو ابھی پروان چڑھ رہے تھے اور ان کی شخصیتیں ابھی نکھری نہ تھیں۔ ان چار بچوں میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا امریکہ چلا گیا اور وہیں سیٹل ہو گیا، لیکن بیٹیوں نے احمد بشیر کے نام کو روشن کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ سب سے بڑی نیلم احمد بشیر دنیائے ادب سے وابستہ ہو گئی، لیکن ناروے سے پہلے وہ امریکہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ افسوس خدمتیں کرنے، ہاتھ پاؤں جوڑنے کے باوجود اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بچے وہیں باپ کے پاس رہ گئے اور نیلم خالی ہاتھ پاکستان آ گئی۔ احمد بشیر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیلم نے اب دنیائے ادب میں اپنا مقام تلاش کر لیا ہے اور بھائی احمد بشیر کی تلافی ہو گئی۔

دوسری بیٹی بشریٰ نے الیکٹرانک میڈیا پر دھاوا بول دیا اور وہ مارا ماری کی کہ بڑے بڑے نام ماند پڑ گئے۔ پروڈیوسر اقبال انصاری کو تو اس شہرت کا تھوڑا فائدہ ہوا لیکن احمد بشیر کی شان دوبالا ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہن کی شادی ایک کرنل سے ہوئی لیکن ازدواجی زندگی قسمت میں نہ تھی۔ باپ کے پاس لوٹ آئی اور اب ٹیلی ویژن سے وابستہ ہے۔ پروڈیوسر کا کام کرتی ہے۔ ایک اور بہن سنبل بھی ٹیلی ویژن پر گاتی ہے اور ان دنوں بچوں کے پروگرام "وک" میں شرکت کرتی ہے۔

اصل میں احمد بشیر بھائی کی جان ان کی بیگم مودی میں ہے۔ انہوں نے جب "نیلا پربت" فلم بنائی تو اس کے لیے شہاب صاحب سے چار لاکھ روپیہ لیا۔ شہاب صاحب پیسہ دیتے وقت تو ذرا بھی متذبذب نہ ہوئے لیکن ایک دن یونہی سرسری انداز میں انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ "یار یہ "نیلا پربت" مجھے چلتی نظر نہیں آتی۔ اس کا موضوع ہی ایسا ہے۔"

احمد بشیر کو مودی سے بہتر کوئی سنگر نظر نہ آئی اور مودی بیگم نے کسی پروفیشنل عورت کی طرح یہ گانے گائے۔ گانے تو فلاپ نہ ہوئے اور کئی بار الیکٹرانک میڈیا پر سنے گئے لیکن یہ فلم دور نزدیک کہیں بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔

آذر زوبی

آذر زوبی سے خاں صاحب کی دوستی میری شادی سے بہت پہلے کی تھی۔ وہ ان کے ان معدودے چند دوستوں میں سے تھے جو اٹلی جانے سے پہلے خاں صاحب کے پاس 1- مزنگ روڈ آیا کرتے تھے۔ فرش پر خاں صاحب کے ساتھ سوتے۔ اماں جی کھانا بھجواتیں تو صبر شکر سے کھا لیتے۔

زوبی بھائی میں مصور کی ازلی بیکلی تھی۔ وہ اپنے راستے کا تعین چاہتے تھے لیکن یہ تعین کسی استقامت کے ساتھ

ان کے اندر نہیں ہوتا تھا۔ جن دنوں خاں صاحب تراڑکھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام کر رہے تھے، ان دنوں زوبی صاحب نے اوپن ایئر تھیٹر میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ اس وقت اوپن ایئر تھیٹر میں سٹیج کے پیچھے تین کمرے اور غسل خانہ ایک سیٹ کے طور پر موجود تھے۔ ان ہی میں زوبی صاحب نے بسیرا کر لیا اور وہ اپنا ایزل برش پینٹ لگا کر تصویریں بنانے لگے۔

وہ غالباً تجریدی آرٹ کے پہلے مصور تھے۔ ان کی معروف پن ڈرائنگ میں آپ کو ایک مرد کی آنکھ رکھنے والا گھوڑا اور ایک نیم خوابیدہ حسینہ کا سمبل نظر آتا ہے۔ یہاں زوبی صاحب سے ملنے ادب دوست، آرٹسٹ آنے لگے۔ پتہ نہیں لارنس گارڈن میں کچھ ایسی کشش ہے کہ پہاڑی کا اثر ہے، شاید اوپن ایئر تھیٹر میں رومانیت کی رو چلتی ہے کہ کافور کے چھتنار کے درخت کا اثر..... شاید بابا ترت مراد کے اردگرد ایسی Frequency موجود ہے کہ انسان کشاں کشاں اُدھر کھنچا چلا جاتا ہے۔

اس جگہ آرٹسٹ تو کم بنے لیکن ادیبوں کی ایک منڈلی تیار ہوگئی۔ ممتاز مفتی، یوسف ظفر مع اشفاق احمد صاحب۔ جب بھی آتے گفتگو کا زعفران کھل اُٹھتا۔ کبھی کبھی جیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر بھی جا نکلتیں لیکن نثار عزیز باقاعدگی سے آنے لگیں۔ نثار میں ایک بڑی ادیبہ کے جراثیم موجود تھے۔ وہ سب کی توجہ سمیٹ لیتیں۔

اشفاق احمد اور نثار میں خصوصی تعلق پیدا ہو گیا کیونکہ دونوں پٹھان تھے اور اظہار کے بغیر محبت کا اظہار کرنا جانتے تھے۔ اس تعلق کی پاسبانی ابھی تک نثار کرتی ہیں۔

جب 24۔ ایس کینال پارک میں خاں صاحب آنے لگے تو ایک دن وہ آذر زوبی کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ کالا پھاٹک کھول کر اندر آئے تو میں کیکر کے درخت تلے بیٹھی تھی۔

''یہ میرا دوست آذر زوبی ہے۔ میں اسے تمہیں ملانے لایا ہوں۔ افسوس اپنے آنے کی تمہیں پہلے سے اطلاع نہ دے سکا۔''

ترنت میں نے لالو کو بازار بھیجا اور دہی، برفی اور نمک پارے منگوا لیے۔ سارا وقت دونوں دوست اپنی باتیں کرتے رہے اور زوبی صاحب نے بھی مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کیے۔

1950ء میں ابھی ہمارے امتحان نہ ہو پائے تھے کہ زوبی بھائی روم چلے گئے۔ وہاں Radio Italiana کے اردو پروگرام لکھتے۔ ان کو براڈکاسٹ کرتے اور خطوں کے جواب دیتے۔ اطالیانہ کے کرتا دھرتا ان سے خوش تھے۔ صرف مشکل یہ تھی کہ زوبی بھائی کا کنٹریکٹ فقط دو سال کا تھا اور شرائط کے مطابق اس معاہدہ میں توسیع ممکن نہ تھی۔

زوبی بھائی نے خاں صاحب کو لکھا کہ تمہارے لیے یہ گولڈن چانس ہے۔ تم یہ پروگرام بہ سہولت کر سکتے ہو۔ پھر تمہارے پاس ایم اے کی ڈگری بھی ہے۔ تم ISMEO میں اردو پڑھا سکو گے۔ ابھی ابھی یہاں اطالوی طالب علموں کو اردو پڑھانے کا سیکشن کھلا ہے۔ یہ نادر موقع ہے، فائدہ اٹھاؤ۔ میرا گھر Catore-16 موجود ہے۔ تم کو وہ مل جائے گا۔

خاں صاحب بھی چھوٹے چھوٹے سفروں سے چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے اُکتا چکے تھے۔ انہوں نے اسے امدادِ غیبی سمجھا اور لمبی اڈاری کے لیے تیار ہو گئے۔ جوائن کرنے سے پہلے جب وہ کراچی پہنچے تو زوبی واپس آ چکے تھے۔

آخری مرتبہ جو لمبا خط مجھے خاں صاحب نے ساحلِ سمندر سے لکھا، زوبی صاحب کے گھر سے لکھا۔

بہت سال بعد زوبی صاحب واپس آ گئے اور انہوں نے ایک آرٹ سکول کراچی میں بنا لیا۔ اس میں وہ طالب علموں کو آرٹ کے رموز سکھایا کرتے۔ ان کی گھریلو سی قصوری بیوی کراچی جانے کے خواب دیکھتی رہی لیکن آرٹ سکول میں ایک طالب علم صغریٰ بی بی پہلے ان کی منظورِ نظر بنی، پھر بیوی ہو گئیں۔ صغریٰ مجھے اور خاں صاحب کو ملنے آتی رہتی تھی۔ ہم بھی ایک بار زوبی بھائی کے School of Decor میں گئے۔ خاں صاحب چیف گیسٹ اور تقریب انعامات تقسیم کرنے کی تھی۔

لیکن کسی کو کیا پتہ کہ مستقبل ہمارے لیے کیا چھپائے رکھتا ہے۔ صغریٰ کی کچھ اَن بَن زوبی بھائی کے ساتھ رہنے لگی۔ زوبی بھائی گھر چھوڑ کر سکول میں منتقل ہو گئے۔ صغریٰ گھر میں اکیلی رہنے لگی۔ قضائے کار ایک دن صغریٰ اپنے گھر کے فرش پر مردہ پائی گئی۔ آناً فاناً اس کے گھر والوں نے پولیس کا در کھٹکھٹایا۔ پتہ چلا کہ موت طبعی نہ تھی بلکہ اسے ہاتھوں کے میں کس کر کسی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

الزام زوبی صاحب کے سر تھوپ دیا گیا۔ زوبی صاحب اپنی بے گناہی ثابت کرنے والے نہ تھے، خاموش رہے اور دھر لیے گئے۔ خاموشی سے جیل بھگتی۔ معتوب ٹھہرے۔ خاں صاحب جب تک حیات رہے، زوبی صاحب ہمارے پاس آتے رہے۔ اب وہ قصور بھی جانے لگے تھے لیکن دونوں نے صغریٰ بھابی کا نام کبھی نہیں لیا۔ سکول آف ڈیکور زوبی صاحب کے جیل جانے پر بند ہو گیا۔ واپسی پر ان کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ وہ قرآنی تعلیمات، نظریہ پاکستان اور اقبال کے نظریات سے متاثر ہو کر تصویریں بنانے لگے۔

زوبی انتقال کر چکے ہیں۔ اس کا ذکر ضروری ہے۔

اقبال کی Interpretation جس طرح آذر زوبی صاحب نے کی ہے، اس کی نقل کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ اب وہ جس مقام پر پہنچ چکے ہیں، اس کا حوالہ ساتھ ملفوف ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے مضمون سے کیجیے۔

اقبال...... آذر زوبی کی نظر میں

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

28 اگست 1922ء کو پنجاب کے مردم خیز قصبہ قصور کے ایک غریب گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام عنایت اللہ رکھا۔ کھیتی باڑی کرنے والوں کے ماحول میں یہ واحد بچہ تھا جو نہ کدال پکڑتا نہ کھرپی ہاتھ میں لیتا۔ وہ تو بس لکڑی کے کوئلے یا سفید کھریا مٹی سے دیواروں پر لکیریں بناتا رہتا۔ ماں باپ، رشتہ دار اور محلے والے اس کی حرکتوں سے نالاں رہے مگر عنایت اللہ اپنے کام میں مگن تھا۔ کسی طرح اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گھر سے بھاگ کر لاہور آ گیا تاکہ ڈرائنگ اور پینٹنگ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکے۔

نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل سے ملاقات کے لیے وہ تین دن تک چکر لگاتا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر چوتھے روز زبردستی پرنسپل کے کمرے میں گھس گیا۔ پرنسپل گپتا نے میلے کچیلے شلوار کرتے میں ایک دیہاتی لڑکے کو دیکھا

ے سرخ ہوگیا اور چپڑاسی کو بلا کر کہنے لگا۔

"Throw this boy out."

قبل اس کے کہ کان پکڑ کر کمرے سے نکالا جاتا، عنایت اللہ نے جھٹ بغل میں دبی اپنی تصویریں میز پر پھیلا دیں۔ پرنسپل گپتا نے انہیں دیکھا اور ایک دم نرم پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ دو روپے نکالو اور یہ فارم بھر دو۔ عنایت نے دس آنے نکال کر میز پر رکھ دیئے اور یہ کہا:

''سر جی! بس یہی ہے۔ قصور سے ایک روپیہ لے کر چلا تھا۔ چھ آنے کرائے اور کھانے پینے میں خرچ ہو گئے۔''

ہندو پرنسپل گپتا نے اپنی جیب سے دو روپے ادا کر دیئے۔ داخلے کے لیے امتحان ہوا۔ قصور کا یہ الہڑ دیہاتی لڑکا پاس ہو گیا اور اسے داخلہ مل گیا۔ 1943ء میں اس نے آرٹ میں ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ بعد ازاں مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اٹلی کے دارالحکومت روم پہنچا اور 1954ء تک وہاں قیام کیا۔ پھر اس کو پر لگ گئے اور وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ اس قصوری لڑکے عنایت کو اس کے جگری دوست مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد نے آذر زوبی کا بانکا سا نام دیا اور وہ اسی نام سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوا۔

کلام اقبال کی تزئین کرنے والے مصوروں میں قصور کے یہ آرٹسٹ آذر زوبی بھی شامل ہیں۔ ان کا اپنا رنگ اور نشان ہے۔ وہ محض مصور، خطاط اور مجسمہ سازی ہی نہیں، ادب آشنا بھی ہیں۔ شعر و نغمہ کی ماہیت پر انہیں جو عبور حاصل ہے۔ اس کی نمایاں مثال ''شعور'' جیسا ان کا منفرد رسالہ ہے کہ جب نکلا تو اردو داں طبقے کی آنکھوں کو خیرہ کر گیا اور جب بند ہوا تو دنیائے ادب سُونی ہو گئی۔

ادب شناسی کا یہی فطری جذبہ تھا جس نے کلام اقبال کی آفاقیت کا احساس دل آذر میں جاگزیں کیا۔ انہوں نے اپنے انفرادی رنگ میں شاعرِ مشرق کے افکار کی تشریح کی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے خاکے منفرد انداز سے مفکر پاکستان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ زوبی کے خطوط میں بڑی ہمہ گیری، بڑا تنوع اور بڑی پہنائی ہے۔ ان کی ہر تصویر اقبال کے فکر و فن اور انداز و اسلوب کی غماز ہے۔

آذر زوبی نے کلامِ اقبال کی پہنائی میں غوطہ زن ہو کر معنی و مفہوم کے جو موتی نکالے اور انہیں جس فنکارانہ چابک دستی سے خطوط اور دائرے میں پرویا ہے، وہ ان کے عظیم مصور ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی نمایاں مثال علامہ کی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ'' کی تزئین ہے۔

جیسا کہ اقبالیات کے قاری کو علم ہے، نظم ''شکوہ'' اردو شاعری میں انفرادی مقام کی حامل ہے۔ اس میں خدا سے خطاب کا ایک نیا اور انوکھا انداز ہے۔ اس میں حمد و ثنا کی مشرقی روایت سے انحراف کر کے ایسا طرزِ تکلم اختیار کیا گیا ہے جس میں گھن گرج ہے، زور ہے، توانائی ہے، بے باکی ہے، انا ہے، احساسِ خودداری ہے، بندے کی شناخت ہے، جذبہ تشخص کا اظہار ہے، رنج و ملال کی ترجمانی ہے، شکوہ و شکایت ہے اور نظر انداز کیے جانے کا صدمہ و غم ہے۔ یہ وہ تاریخی نوعیت کی نظم ہے جو علامہ نے اپریل 1909ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں سنائی تھی۔ اسلامیہ کالج، لاہور کے ریواز ہال میں موجود سارا مجمع اقبال کی سحر انگیز آواز اور کلام کی اثر آفرینی سے سراپا مسحور تھا۔ جب تمبر

1924ء میں ''بانگِ درا'' شائع ہوئی تو نظم ''شکوہ'' پورے برصغیر کے مسلمانوں کی آواز بن گئی۔ اس لیے کہ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''اس میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے، اس میں الہام ربانی کی شان نظر آتی ہے۔''

ایسی الہامی نظم کے مفہوم کو موئے قلم سے ظاہر کرنا آذر زوبی کے کمال کی دلیل ہے۔ ان کی وسیع النظری اور فنکارانہ صلاحیت نے ہر بند کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر تصویر اپنی آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ مثلاً نظم کا پہلا بند ہے۔

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محوِ غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

مفہوم یہ ہے کہ میں کب تک خاموش بیٹھا اپنی بربادی کا تماشا دیکھوں۔ کب تک اپنے حسین مستقبل سے غافل رہوں۔ جب مجھے قوتِ گویائی حاصل ہے تو کیوں نہ اللہ سے شکوہ کروں اور روداد غم سناؤں۔

مذکورہ بند اور اس کے معنی و مطلب کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم آذر زوبی کے بنائے ہوئے اسکیچ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ اشعار میں پنہاں اقبال کے جذبات، تفکرات، مشاہدات اور خیالات زوبی کے نقش میں اس طرح حلول کر گئے ہیں کہ ہر خط، ہر لکیر اور ہر دائرہ نغمہ و لے کی اثر آفرینی، عورت کے پس منظر میں تیرہ اور درندہ صفت دنیا کا ہیولا۔ یہ سب کچھ وہی عنصر ظاہر کر رہا ہے جو اقبال کے ذہن میں جا گزیں ہے۔ زوبی نے خط کے سہارے اسی عنصر کو زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

غرض ''شکوہ'' پر مبنی ہر اسکیچ زوبی کی ذہنی بالیدگی، تاریخی شعور، سخن فہمی، وسیع النظری اور فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت ہے۔ ان کی اس کوشش نے اقبال شناسی کے فن کو فروغ دیا ہے اور عوام الناس کو شاعرِ مشرق کے آفاقی کلام سے قریب تر کر دیا ہے۔ یہ ان کا اردو ادب پر، اقبالیات پر اور اسلامی تاریخ پر بہت بڑا احسان ہے۔

الطاف فاطمہ

پتہ نہیں الطاف فاطمہ خاں صاحب کو کب کا جانتی تھی۔ غالباً جب وہ اسلامیہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھیں تب سے خاں صاحب سے ملنا ملانا ٹھہرا۔

الطاف فاطمہ کالج کے سامنے مین سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پتہ نہیں نشاط فاطمہ

ساتھ مقیم تھی کہ کہیں اس کا گھر بھی پاس ہی تھا۔ دونوں بہنیں لکھتی تھیں، لیکن الطاف فاطمہ کی کلا ہولے ہولے جگ رہی تھی۔ نور خاں صاحب الطاف فاطمہ سے بہت متاثر تھے کیونکہ ایک تو اس کا گھر علمی، ادبی، مذہبی روایات کا حامل تھا۔ پھر رفیق حسین اس کے سگے ماموں تھے۔ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی ادبی شناخت تھی کیونکہ رفیق حسین کی کتاب ''گوری ہوتی'' کے افسانے ہم بار بار پڑھتے تھے۔

الطاف فاطمہ کبھی کبھی پیدل ''داستان گو'' کے دفتر میں آ جاتی، کبھی نشاط ان کے ہمراہ ہوتی۔ یہ ملاقاتیں ادبی نوعیت کی ہوا کرتیں۔ ''داستان گو'' میں اس کی دو تین کہانیاں بھی چھپی تھیں۔ مجھے ان مہاجروں سے گہری ہمدردی ہے، جو پاکستان اس امید پر آئے تھے کہ ہم سب ایک ہیں اور مسلمان کی اصل شناخت اسلام ہے، لیکن یہاں پہنچ کر سب کو اپنی اپنی رسم ورواج، رہن سہن کا خوف چمٹ گیا اور اسی خوف نے بھانت بھانت کے اختلافات کو جنم دیا۔

پتہ نہیں الطاف فاطمہ کہاں کھو گئیں۔ اس کا شائستہ لب ولہجہ، نشست و برخاست کبھی یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کسی رُت میں اچانک اسے میرے گھر کا راستہ مل جائے۔

محسن احسان+شفقت

محسن احسان اور شفقت اسلام آباد میں رہتے تھے۔ میں اس جوڑے کا تصور علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتی۔ جب بھی لاہور آتے، ہم سے ضرور ملتے اور ہم جب اسلام آباد پہنچتے تو ان کو ضرور خبر کر دیتے۔

ایسے ہی ایک موقع پر ایک روز ہم ایوبیہ پارک دیکھنے گئے۔ خاں صاحب اور محسن احسان مزے سے ایک بنچ پر بیٹھ کر سیاسی اور ادبی گفتگو کرتے رہے لیکن میں اور شفقت اندر گھومنے پھرنے چلی گئیں۔

اس روز شفقت میری چھوٹی بہنوں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے بے ضرر رازوں کو بے نقاب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ شفقت سے ملنا بڑی پرائیویٹ ملاقات تھی۔ ہم خوب ہنسے، لڑکیوں کی طرح شرمائے لجائے...... اس ملاقات کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ اسی لیے آپ کو وہ تصویریں دکھانا چاہتی ہوں جو میرے لیے اعزاز کا باعث ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد

ڈاکٹر انور سجاد ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر طرح فٹ آتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا کی طرف نظر ڈالیں تو وہ ایکٹروں میں بھی قابل ذکر، لکھنے والوں کی فہرست دیکھیں تو بھی سر فہرست۔ ان کی کام کی رفتار کچھ ایسی تخلیقی قوتوں کی تخلیقی سے بھری ہے کہ دو بیویوں کے باوجود ان کی رفتار سست نہیں پڑی۔

پہلی بیوی کے ساتھ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے جو کچھ بھی تنازع تھا، اسے انور کے بہت قریبی جان کاروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فنکاروں کی ایک مشکل عام آدمیوں سے ذرا مختلف ہے۔ جب ایکٹر کسی فنکار کے ساتھ بار بار عشقیہ

ڈائیلاگ بولنے کی سچائی میں دور تک دھنس جاتا ہے تو اس کا باہر کا حال اندر کی کیفیت سے مل جاتا ہے۔ یہاں
نبھانے کے وعدے ہو جاتے ہیں اور ہیرو اور ہیروئن کو علم تک نہیں ہو پاتا۔ جب زیب اور انور سجاد دیر تک اور دور تک
کھیل میں اتر گئے تو شادی ناگزیر تھی۔

اب انور کی بچیاں بڑی بڑی ہیں۔ وہ کبھی کبھی انہیں مجھ سے ملانے آتا ہے۔ ''جیوسوپر'' کا سنبھالنے والا ہے۔
میڈیا سے اتنی پرانی وابستگی نے اس میں اس شعبے سے متعلقہ لوگوں سے خاص رابطے قائم کرنے کا سلیقہ دے رکھا ہے۔

انور خاور

''جیوسوپر'' کا ایک دفتر لاہور میں ہے جسے انور خاور سنبھالتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب انور خاور شدہ شاعر کی حیثیت میں ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میں اس کی شاعری کی
بھی معترف تھی اور آج بھی اس کے اشعار مجھے متاثر کرتے ہیں۔ اس کے تخلیقی عمل کی اسے ویسی شہرت نہ ملی جس کا
دار تھا لیکن یہی مشکل ہے یہاں شہرت آپ کے کام اور محنت کے حوالے سے نہیں ملتی بلکہ اوپر والے کی مرضی ہے جس قدر
وہ چاہے جس قدر وہ توفیق عطا فرمائے، عطا ہو جاتی ہے لیکن انور شاید اس کی قابلیت کا میری طرح قائل ہے۔
لاہور کی برانچ اس نے انور خاور کے سپرد کر دی ہے۔

دونوں طرف کا کام آرام، شانتی سے چل رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اڑچنیں، خرابیاں، نالائقیاں دونوں طرف سے
سرزد ہوتی ہوں گی لیکن یہ تو ہر کام کے اندر ہمیشہ چھپی ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے کام آگے بڑھتا ہے۔

مجھے انور خاور سے چھوٹے بھائیوں کا سا پیار ہے۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اسی طرح معاف کرتی
ہوں جس طرح میں اپنی بڑی بڑی غلطیوں کو درگزر کر جاتی ہوں۔ اس نے میرے کئی ڈراموں میں معرکے کا رول کیا
ہے اور میرا خیال ہے اسی کی وجہ سے یہ ڈرامے مقبول بھی ہوئے ہیں۔

واجدہ تبسم

ہم 121۔ سی میں آچکے تھے جب خاں صاحب اور واجدہ تبسم کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ ایک
دن وہ کھانے کی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان دھرے چپ چپ بیٹھے کبھی کبھی دو سطریں لکھ لیتے، پھر رک جاتے۔
جھاڑن سے کرسیاں صاف کرنے میں مشغول تھی۔ میں نے بھی رک کر پوچھا...... ''خاں جی مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ تو کچھ نہیں، بس خط لکھ رہا تھا۔''

''اچھا...... کسے؟''

''واجدہ تبسم کو۔ بہت بڑی افسانہ نویس ہے۔''

میں اس نام سے قطعی ناواقف تھی۔
"کبھی وقت ملے تو اس کے افسانے پڑھو۔"
مجھے واجدہ تبسم کو جاننے، پڑھنے اور اپنی رائے قائم کرنے میں بہت وقت لگا۔ وہ حیدرآباد میں رہتی تھی اور ... اس تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ خط بھی لکھے اور جب وہ ہندوستانی لکھنے والوں کے ساتھ پاکستان آئی تو وہ بڑی ... سے مجھے ملنے بھی آئی۔ آپ واجدہ کی کہانی خود اس کی زبانی سننے کے لیے اُس کی تحریر بعنوان "میری کہانی" کا ... کیجیے۔

پروین عاطف

پروین عاطف کو آج اردو داں طبقہ بہت بڑی لکھاری کے طور پر جانتا ہے۔ احمد بشیر، ان کی بیٹی نیلم احمد بشیر نے ... میں اپنا مقام بنا رکھا ہے۔ احمد بشیر کا گھرانہ تخلیقی نیرنگیوں کا حامل ہے۔ نیلم کی دونوں بہنوں نے ٹیلی ویژن پر دھوم ... ہے۔ بشریٰ انصاری کامیڈین کوئین ہے اور دوسروں کی نقل اتارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی لیکن میں اس وقت ... طور پر احمد بشیر کی چھوٹی بہن پروین عاطف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مفتی جی داستان سرائے کا حصہ بنے اور ان کا پلنگ ڈرائنگ روم میں لگایا جاتا ... میں مفتی جی سے ملنے لوگ چلے آتے تھے۔ مجھے عموماً آنے والوں کی خبر نہ ہوتی۔ پھر اچانک ایک دن مجھے مفتی ... نے بتایا۔

"قدسیہ ایک بُری خبر ہے۔"

"مفتی جی! کبھی اچھی خبر بھی دے دیا کریں۔ بری خبروں کے لیے تو سارا شہر بھرا ہے۔"

"کیا کیا جائے اس وقت تو یہی حاضر حال ہے۔ تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔"

مفتی جی نے مجھے بتایا کہ پروین عاطف نے کچھ زہر وغیرہ پھانک لیا ہے اور اس وقت ہسپتال میں داخل ہے۔ ... تھی کہ پروین عاطف کے شوہر بریگیڈیئر عاطف نے ایک من چاہی عورت سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور پروین عاطف کی ... محبت کے عوض اسے ٹھکرا کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔

بریگیڈیئر عاطف ہاکی کے کرتا دھرتا اور چیف تھے۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کا زیادہ وقت ہاکی کے ساتھ ... اور وہ گھریلو تعلق درست نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ انہوں نے کوشش نہیں کی۔ انہوں نے پروین عاطف کو ساتھ ... پروان چڑھانے کے لیے پہلی بار پروین عاطف کو عورتوں کی ہاکی ٹیم کا چیف بنایا لیکن اس توجہ کے باوجود وہ ایک ... رابطے کی تازگی کا شکار ہو گئے۔

میں ایک بات سوچتی ہوں کہ محبت ایک ایسا وصف ہے کہ اگر اس کی خوبی کو فقط اس کی خاطر نہ اپنایا جائے اور اس ... پر ایمان نہ ہو کہ مجھے جو محبت کرنے کا شرف عطا ہوا ہے وہ بذاتِ خود میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے تو بڑے مسئلے

اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ محبت کے بدلے محبت کی توقع سے پروین عاطف کی طرح خودکش ہونے کی مشکل پڑ سکتی ہے۔
پروین عاطف اپنے شوہر کی پرستار اس کے قدموں میں زندگی بسر کرتی آئی ہے۔ عاطف اس کے لیے پانی، گرمی سردی کے بچاؤ کی صورت تھا لیکن اندر ہی اندر کہیں وہ اس توقع پر بھی جی رہی تھی کہ اس آرتی کے بدلے مورتی بھی اسے کچھ عطا کرے گی۔

جب مجھے مفتی جی نے پروین کے متعلق اطلاع دی کہ وہ ہسپتال میں ہے تو میں گویا اسی موقع کی تلاش میں تھی فوراً پروین کی کمک کو پہنچی۔ مجھے اپنے آپ کو اچھا اور بہتر ثابت کرنے کے لیے ایک موقع دستیاب ہوا۔ میں نے پروین کو لے لیا۔ مفتی جی مثبت آدمی تھے۔ انہوں نے پروین کو لکھنے پر راغب کیا اور ہر ملاقات پر ''لکھ لکھ لکھ'' کی رٹ لگا دی۔
مجھے ہرگز اس کے لکھنے لکھانے سے غرض نہ تھی۔ میں اسے اپنا بغل بچہ بنا کر ساتھ رکھتی۔ اس کے زخموں کو ہرا رکھنے کی کوشش کرتی۔ اسے ہرگز نہ بھولنے دیتی۔ نہ خود بھولتی کہ اس کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی۔ پروین کو میری جو تسلی کی عادت پڑی کہ وہ ہر صورت مجھ تک پہنچتی۔

ایک دن کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دودھ والے ریڑھے پر پروین عاطف سوار ہے۔ ریڑھا ہمارے گھر کے آگے رکا۔ پروین اندر آئی۔ حسن اتفاق سے میں باہر کھڑی تھی ورنہ وہ مجھے کبھی نہ بتاتی۔
''ریڑھے پر..... کیسے کیوں؟''
وہ ہمیشہ کی طرح لجاجت سے بولی..... ''گلبرگ تک تو رکشہ پر آ گئی تھی بانو جی، لیکن آج رکشہ ٹیکسی ہڑتال ہے۔ کوئی ادھر آنے کو مائل نہ ہوتا تھا۔ میں بڑی دیر کھڑی رہی۔ پھر یہ جون جوگا ریڑھے والا مل گیا۔ یہ ادھر ہی کو آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آ گئی۔''
''لیکن پروین اگر کوئی دیکھ لیتا..... تو۔''
''تو پھر کیا بانو جی۔ کہہ لے اسے جو کہنا ہے۔''
میں اس کی جرأت پر حیران ہوئی۔ شاید میں ایسا قدم کسی کی خاطر نہ اٹھا سکتی۔ یہیں سے میرے دل میں اس کے لیے جذبۂ ترحم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کے آگے ایک کمتری کا احساس بن کر بھی ابھرا۔ محبت میں اپنے تحفظ کی نہ پروا کرنے والا احمد بشیر کا سارا گھرانہ ایک سا ہے۔ یہ لوگ رتی بھر محتاط نہیں۔ شیشہ توڑ بھی ہیں اور شیشہ گر بھی۔ محبت سے اپنا آپ جوڑنے میں بھی ماہر ہیں اور اسی محبت کا پتھر مار کر اپنے آپ کو کرچی کرچی بھی کر دیتے ہیں۔
پروین اور میری دوستی میں اس کے بچے بہت معاون ثابت ہوئے۔ بچے ایک ایسی ہتھکڑی ہیں جو طرح طرح کے سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ظل عاطف ایک نعم البدل جو عاطف کی جگہ قدرت نے پروین کو عطا کیا ہے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم لندن سے حاصل کی اور پاکستان لوٹا لیکن پی آر کی کمی کے باعث وہ ایبٹ آباد چلا گیا جہاں اس نے ایک انگلش میڈیم سکول کھول لیا۔ اس کی خوبصورت بیوی فریحہ قدم قدم اس کے ساتھ چلتی ہے۔ ایک مرتبہ خاں صاحب اور میں ایبٹ آباد اس کے سالانہ فنکشن پر بھی گئے اور یہاں ہی فریحہ نے ہمارے دل جیت لیے۔
کچھ عرصہ بعد سکول بند ہو گیا اور ظل عاطف ماڈل ٹاؤن میں لا کالج کا پرنسپل بن گیا۔ یہاں فریحہ بھی

ے جاتے تھے۔ پروین ظل، فریحہ اوران کے بچوں میں کھوگئی۔ ظل عاطف کی کوشش کے باوجود وہ اس کالج کا پرنسپل
کا اوراب وہ فیصل آباد شفٹ کر گیا ہے جہاں پروین عاطف اس کے ساتھ رہتی ہے۔ نیا شہر نئی زندگی...... لیکن اب
پروین کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ اس کا اندازِ بیان، مشاہدہ، تخیل انمول ہے۔ کاش! کسی دن وہ ہمت اور استقامت سے
ے کر ایک ناول بھی لکھ ڈالے۔ اپنے حالاتِ زندگی کتاب میں منتقل کر دے۔ کسی سفرنامے میں رکنے اور قیام کرنے
خوشیاں اور غم بھی بے نقاب کرے۔

شکوہ عاطف پروین کا دوسرا سپوت ہے۔ باپ کی طرح، بھائی کی مانند اونچا لمبا خوبصورت وجیہہ نوجوان ہے۔
تے پروین سے علیحدہ ایک شناخت ہمارے گھر میں قائم کر لی ہے کیونکہ وہ بڑی جاندار نظمیں لکھتا ہے۔ پہلے وہ انیق
کے قریب ہوا پھر میرے دل میں جگہ بنالی۔ آرٹس کونسل میں ایک فنکشن ہوا جس میں انگریزی نظموں کا مظاہرہ کیا گیا۔
طف، انیق احمد خاں نے اپنی اپنی نظمیں پیش کیں اور یہ نظمیں بہت سراہی گئیں۔

اب شکوہ امریکہ میں ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر بزنس کرتا ہے اور بیوی مریم بینک میں ملازم ہے۔
کے دل پر ایک کاری زخم یہ بھی لگا ہے کہ شکوہ عاطف نے والدہ سے رابطہ توڑ رکھا ہے۔ مجھے تو خط لکھ سکتا ہے لیکن
فون تک نہیں کر سکتا۔ یہی زندگی ہے اور یہی اس کے رنگ ہیں۔

ڈاکٹر گل عاطف میرے لیے ایک تحفہ ہے جو پروین عاطف نے مجھے دیا ہے۔ گل نے ثاقب شہاب کے ساتھ
یم بی کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ وہ ایک کامیاب زندگی کے تمام کوائف سے آراستہ ہے لیکن ماں باپ کی علیحدگی نے
ے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ وہ نہ جانے کن کن عارضوں سے گزرتی ہے اور کیسی بھاگی بھاگی میرے پاس آتی ہے۔ اشیر احمد کی
ہمشیر یدنی ہے اور اسی کوشش سے بالآخر اس نے آب پارہ میں اپنا کلینک کھول لیا ہے۔

لیکن ٹوٹے گھروں کے بچے جذباتی طور پر بہت ثابت و سالم شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو ایک گھر، ایک شخص
ایک راستہ سمجھنے والوں کو زندگی سمجھنے میں ایک خاص قسم کی سہولت میسر آ جاتی ہے۔ یہ صدری نسخہ گل جیسے بچوں کے پاس نہیں ہوتا۔
شان عاطف میں بھی خود اعتمادی کی کمی باقی بچوں سے کم نہیں۔ وہ گلبرگ میں اپنے شوہر کے ہمراہ اسی بے اعتمادی
کے ہمراہ رہتی ہے۔ وہ بھی پروین کی طرح میرے پاس آتی رہتی ہے اور میں اسے چٹکی بھر دعا اور دوا دیا کرتی ہوں۔

پروین کا بھلا ہو اس نے مجھے اپنے بچوں سے ملا کر مجھ پر بڑا کرم کیا۔ میرے گھر میں محبت کے پروانے بھیجے۔
احمد بشیر کا ذکر بھی یہاں بے جا نہ ہوگا۔ نیلم امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان آ بسی ہے۔ اس کے شوہر نے اس کے بچے
"سنبھ" لیے ہیں اور نئی بیوی کے ہمراہ آنند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

نیلم کے پاس اب اپنی ذات کی جھاڑ پونچھ باقی رہ گئی ہے اور سبحان اللہ کیا خم ٹھونک کر وہ ادب کے میدان میں
معرکہ آرائی کرنے نکلی ہے۔ اس نے امریکہ، اس کی تہذیبی ثقافتی زندگی پر حیران کن کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر
دے کر خود ترسی کا شکار بھی ہو سکتی ہے لیکن اس نے پروین کی مثال سے کچھ سیکھا۔

سلامت رہو پروین اور سلامت رہے احمد بشیر کا گھرانہ!

سلیم اختر، وزیر آغا، انور سدید

میں طبعاً ڈرپوک ہوں۔ خوف میری شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اس لیے مجھے تنقید نگاروں سے
ہے۔ جس تحریر کو ہم ہیرا من طوطا سمجھ کر سنبھالتے رہتے ہیں، تنقید نگاروں کے ہاتھوں ان کے پرجڑے اکھاڑے
احتمال ہوتا ہے۔ مجھ پر تنقید نگاروں نے ہمیشہ مہربانی کی۔ مجھ سے محبت اور میرے کام کو پس پشت رکھا۔

ابھی ''راجہ گدھ'' مسودے کی شکل میں ہی تھا کہ سراج منیر مجھ سے مسودہ لے کر چلے گئے اور جب
رونمائی فیض صاحب کی صدارت میں ہوئی تو سب سے لمبا مضمون، حوصلہ افزا مضمون اسی نے لکھا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر، خاں صاحب کے ہوتے ہوئے بھی اور ان کے بعد بھی مجھ سے بڑی محبت
ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ادیبوں کی ہو، وہ ضرور موجود ہوتے ہیں۔ میری طبیعت کا پوچھتے
ہیں۔ میری بیماری کا سن کو ملول ہوتے ہیں۔ اب تو ان کی تخلیقی پروازیں بھی خوب تیزی پکڑ گئی ہیں لیکن ان کی
بدلی۔ نہ اس کا ماڈل نہ اس کی رفتار ہی اور یہی بات ان کی وفاداری میں ہے..... زندہ باد سلیم اختر!

وزیر آغا بڑے مشفق ہیں۔ ذرا مشکل پسند ہیں۔ اپنی نظموں اور نثر میں مشکل پسندی کی روایات
ہیں لیکن سٹائل کی مشکل پسندی کے باوجود طبیعت بڑی آسانیاں عطا کرنے والی ہے۔ ایسا تضاد بڑا خوش آ
کرے تادیر یہی فضا قائم رہے۔

انور سدید سے میری ملاقات کم کم ہوتی ہے لیکن ان کی مختصر ملاقاتیں بڑی جان بخش ہوتی ہیں۔ ان
ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ ہم دونوں 1928ء میں پیدا ہوئے۔ ہم دونوں کا برج ''قوس'' ہے۔ عین ممکن
برج کے اثرات ہم دونوں پر ایک سے مرتب ہوتے ہیں۔

بشریٰ رحمٰن

عبدالرحمٰن میاں ان دنوں سے ہمارے ساتھ ہیں جب ہم موڑھوں پر بیٹھا کرتے۔ لمبے شوربے
روٹیاں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ رحمٰن میاں لکھنے کے شوقین اور ان کی کہانی ''ویرانے کا پھول
گو'' میں چھپی تھی۔ وہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ بزنس، افسانہ نویس اور اپنی محبوبہ ثریا، جو اسے دودھ والوں کے
سوار ہو کر ملتان روڈ سے 121۔سی ماڈل ٹاؤن ملنے آیا کرتی تھی۔ ثریا کا جذبہ دیکھ کر میں حیران رہ جاتی۔ ان
چلتی تھی نہ رکشہ ٹیکسی ملتا تھا۔ پھر ثریا کسی نرم دل گوالے کے ریڑھے کو روکتی۔ ریڑھے پر سوار ہو کر داستان سرائے
عبدالرحمٰن میاں شاید شروع سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے ثریا کے جذبوں کا ٹیسٹ نکالتے
کافی دیر تک اس کے پرچے لیے۔ شادی میں ہم دونوں کو شریک ہونے کی دعوت نہ ملی جس کا بچوں کا بہت افسوس تھا
رحمٰن میاں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہا کرتا تھا، یکدم ثریا کے ساتھ غائب ہو گیا۔ آدمی تو منچلا تھا۔

...کو اچنبھے کی بات نہ تھی۔ پھر خبر ملی کہ رحمٰن میاں نے ثریا کو طلاق دے دی ہے اور بہاولپور میں ایک بشریٰ سے شادی کر
...ہے۔ بشریٰ ایک بہو کی حیثیت سے داستان سرائے میں آئی۔ اس کے طور طریقے دولہنوں جیسے نہ تھے۔ جلد ہی پتہ چلا کہ
...میں ادب قدرِ مشترک ہے اور بشریٰ رحمٰن کی تحریر سے متاثر ہو کر اس کی شریک حیات بنی۔

جس گھر میں عکسی مفتی نے لوک ورثے کا دفتر بنایا تھا، جب عکسی اسلام آباد چلا گیا اور یہ گھر جو ہمارے بالکل
...ہے، خالی رہ گیا تو رحمٰن اور بشریٰ اس میں رہنے لگے۔ رحمٰن پہلے بھی تنہائی پسند اور Anti-social تھا۔ اب بشریٰ
...کی شخصیت کے سامنے اس نے گھر کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو مقفل کر لیا۔ شاید بشریٰ کو بھی دنوں دن اس کی
...نہیں ہوتی تھی۔

ایک Introvert دوسرا Extrovert۔ وہ تین بیٹوں کے ماں باپ تو بن گئے لیکن اصلی جیون ساتھی نہ بن
...رحمٰن نے داستان سرائے آنا چھوڑ دیا اور باوجودیکہ اس کا گھر ایک چوراہے سے دور نہ تھا، ہمیں بھی توفیق نہ ہوئی کہ
...سے ملنے جاتے۔

اب وہ لکھنا لکھانا بھول چکا ہے۔ اس کی بزنس پھیل گئی اور اس نے اپنے بیٹوں کو قازقستان میں بزنس کھول دیا
...ہے۔ وہ وہاں تیل نکالنے کی مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ رحمٰن بنیادی طور پر انجینئر تھا اور وہ بھی ذہین انجینئر۔ اسے اپنی اصلی فیلڈ مل
...گئی — یا شاید؟

بشریٰ کی اڑانیں اپنے طور پر بہت اونچی ہیں۔ وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے اردو ادب میں مقام پیدا کر چکی ہے۔
...جانے آگے کیا ہو؟ بشریٰ بزنس کرنے لگے اور رحمٰن ویرانے میں پھول اُگانے نکل پڑے......

منیر نیازی + احمد فراز

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم 479۔ این میں نئے نئے آئے تھے۔ غریبی سے نجات اور اس کے ساتھ
...نسبتاً فراغت اور امید روز افزوں تھی۔ دماغ اپنی برتری پر نازاں بھی تھا اور مغرور بھی۔ یہ وہ عہد تھا جب ''داستان گو''
...ہماری ساری توجہ کا مرکز تھا۔ ''داستان گو'' سے ہمیں بڑی امید بھی وابستہ تھی۔ ہم اس کی بچوں کی طرح پرورش کر
...رہے تھے۔

اُن دنوں میرے گھر میں منیر نیازی کا پھیرا ٹورا رہتا۔ منیر نیازی کی نظم ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں'' ''داستان گو'' میں
...چھپی اور ہولے ہولے ان کی نظمیں ''داستان گو'' کی زینت بننے لگیں۔ منیر نیازی میں دو خوبیاں ان دنوں خوب واضح
...تھیں۔ وہ پشاوری پٹھانوں کی طرح بہت خوبصورت تھے اور اپنے متعلق اتنے ہی گو نگے تھے جس قدر اشفاق احمد...... ان
...کے ساتھ ملاقاتیں رہنے لگیں کیونکہ وہ ''داستان گو'' میں لکھنے کے متمنی تھے اور ہماری اتھارٹی کو مانتے تھے۔ ان کے متعلق
...مزید کریدنے کے بعد پتہ چلا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے مشرقی پنجاب میں ضلع ہوشیار پور میں رہتے تھے جہاں سے کوہِ شوالک کی
...چوٹیاں دھند میں کبھی نیلے آسمان میں نکھری نکھری صاف نظر آتی تھیں۔ منیر نیازی تب بھی کہا کرتے تھے کہ انہیں ان

پہاڑوں میں جذب رہنے کی وجہ سے شاعری ورثے میں ملی۔

خاں صاحب ''یوایس آئی ایس'' کے دفتر بھی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ مجھے ''داستان گو'' رسالے کی ایڈیٹر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایک روز منیر بھائی کے ساتھ ایک شرمیلا نوجوان بھی آ گیا۔ کھوج لگانے پر پتہ چلا کہ تو پٹھان زادہ ہے۔ شاعر بھی ہے اور قبول صورت بھی..... تب فراز احمد نہ Legend تھا نہ اس کی حیثیت دیو مالائی تھی۔ بہت زیادہ نہ تھی بلکہ یوں سمجھیے چپ غالب تھی۔

ملاقات کراتے ہوئے منیر بھائی بولے۔

''یہ احمد فراز ہے۔ بڑا اچھا شاعر ہے۔ اس کی کچھ نظمیں اگر ''داستان گو'' میں چھپ جائیں تو تمہاری مہربانی۔'' میں کچھ ہچکچائی تو منیر بھائی بولے..... ''قدسیہ! یقین کرو اپنے وقت پر یہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ پھر تم افسوس کرو گی۔''

میرے لیے یہ اعزاز بہت ہے کہ ان دونوں کو اول اول چھاپنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔

یہاں سے تین غیرت مند پٹھانوں کی گپت کہانی شروع ہوتی ہے۔

منیر نیازی جس نے اپنی شاعری سے باذوق قارئین کی دنیا میں طوفان برپا کر دیا۔

احمد فراز جو منیر نیازی سے ہرگز کسی صورت بھی کمتر نہ تھے۔

اور اشفاق احمد جن کا تخلیقی سفر مختلف چکر کاٹتا ہوا خلق سے وابستگی پر منتج ہوا اور بڑی شہرت کو پہنچا۔

میں زیادہ کچھ تحریر نہیں کر سکتی۔ منیر نیازی 2007ء اور احمد فراز 2008ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مسعود کھدر پوش

قدرت اللہ شہاب زیادہ مجلسی آدمی نہ تھے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کے علاوہ جب بھی لاہور آتے کھدر پوش سے ضرور ملتے۔ شملہ پہاڑی کے قریب جب بھی وہ آفیسرز میس میں ٹھہرتے تو مسعود کھدر پوش کو بلا لیتے۔ آپ جانتے ہیں وہ اثیر بیٹے کو اپنا ڈرائیور بناتے اور یہ بات ہم سب کے لیے سعادت کا باعث ہوتی۔ لان میں ایک بڑا گھنا درخت تھا۔ اس کے نیچے شہاب صاحب اور اثیر مونگ پھلیاں اور مالٹے کھاتے تھے۔ پھر مسعود کھدر پوش کو بھی بلا لیتے اور یہیں ملتے۔

کبھی کبھی وہ داستان سرائے میں بھی مسعود کھدر پوش کے ساتھ بیٹھے نظر آتے۔ ان ملاقاتوں میں خاں صاحب کم کم نظر آتے کیونکہ یہ اردو بورڈ کا وقت تھا۔ عین ممکن ہے مسعود کھدر پوش اردو بورڈ میں جا کر خاں صاحب کو مل لیتے ہوں۔ آپس میں نظریاتی اختلافات پر گفتگو ہوتی۔

مسعود کھدر پوش اس بات کے حامی تھے کہ ہمیں ابھی برآمد درآمد کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ پاکستان نیا ملک ہے۔ اس کی اقدار کی جڑیں مضبوط نہیں۔ جب بیرونی تجارتی وفد پاکستان آئیں گے تو صرف پیسے

...یس ہوگا۔ رسم ورواج، زبان، کلچر کئی قسم کی نئی چیزیں چکا چوند پیدا کرنے کے لیے ہمراہ ہوں گی۔
وہ اس خیال کے داعی تھے کہ ابھی جو کچھ مقامی طور پر بن رہا ہے، اسے ہی استعمال میں لائیں۔ اگر ہم کھدر بنا ...یں تو کھدر ہی سب کا پہناوا ہونا چاہیے۔ اس سے کچھ فائدے ضرور ہوں گے۔ ایک تو سوسائٹی فیشن اور بناوٹ سے ...ے گی۔ دوسرے طبقاتی فرق مٹانے میں یہ پالیسی معاون ثابت ہوگی اور تیسرے سب سے بڑا فائدہ وقت کی بچت کا ...لوگ اس وقت کو بچا کر ملکی تعمیر کے مثبت کاموں میں صرف کریں گے۔
اب ان کے خواب اور تحریک کس حد تک سوسائٹی پر اثر انداز ہوئی، اس کا اندازہ آپ لوگ مجھ سے بہتر کر سکتے ...ہے۔

خواجہ جی

وائس آف امریکہ پروگرام کی وساطت سے دوایسے "ہیرامن طوطے" خاں صاحب کو مل گئے جنہوں نے بہت ...ے آپ کو خاں صاحب کی زندگی میں گوندھ لیا۔
سلیم خواجہ بر کلے کے پروگرام کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے خاں صاحب کی فلم "دھوپ سائے" ریکارڈ کی۔ ...توجہ سے ہر سین کے ریکارڈ کرنے سے پہلے ڈائیلاگ مانیٹر (Monitor) کرتے۔ لیول بتاتے۔ انیس کو طبعاً ...کا لپکا ہے۔ وہ خواجہ جی کے پاس گھسا رہتا۔ یہاں سے ہی اس نے ریکارڈنگ کا اولین سلیقہ سیکھا۔
چلتے چلتے ہوتے ہواتے کئی مشکلات اپنے آپ پر سہہ کر خواجہ جی گہرے ڈپریشن کا شکار ہوگئے۔ ناز و نعم میں ...ے خواجہ جی، مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنی اس شناخت کو عام زندگی میں استعمال نہ کیا۔
خاں صاحب کے جانے کے بعد خواجہ جی نے زندگی کے الٹ پھیر کے ہاتھوں اپنا موروثی گھر بیچ کر عسکری ...میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ وہ مجھے ملنے آئے تو ان کی ڈاکٹر بیوی ناہید ساتھ تھیں۔
"یہ بہت اداس اور پریشان رہتے ہیں بھابھی! خاں صاحب بھی نہیں جن کے پاس آکر کچھ دل ہلکا کریں۔ ...کی بات کسی سے کرتے نہیں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔"
میرے پاس وقت ہوتا تو میں سمجھاتی۔ ویسے بھی میں نے رکنا، ٹھہرنا اور سوچنا تو سیکھا ہی نہیں۔ پتہ مجھے اس ...ت لگا جب خواجہ جی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میری سرد مہری کے پیش نظر نہ انہوں نے مجھے جنازے کی اطلاع دی نہ ...سویں یا سوئم پر بلایا۔ میں نے کبھی احسان کا بدلہ احسان سے نہیں چکایا۔ جب مشکل پڑی مدد کی، ضرورت ہوئی تو فوراً ...بجا کر بلا لیا۔ وقت نکل گیا مصیبت ٹل گئی پھر نہ وقت تھا نہ فرصت۔
لیکن خواجہ جی شریف روح ہیں۔ مجھے یقین ہے انہوں نے میری غفلتوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے، وہ ...تھ پکڑ کر اب بھی کہہ رہے ہیں۔ "آپ میری بیوی کے انتقال پر بھی رسماً جا نہیں سکیں۔ آپ کے کام بہت پھیلے ہوئے ...اس کے ساتھ ساتھ ملنا ملانا وسیع ہے۔ لیکن آپ کی نیت اچھی ہے۔"

اپنے طور پر یہ معافی نامہ حاصل کر کے نہ تو اب کبھی مجھے احساسِ جرم ہوا نہ کسی پچھتاوے کا احساس..... میں نے رفتہ رفتہ اپنی کمزوریوں کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے۔ مشفق خواجہ ساری زندگی ہمارے لکھے پڑھنے سے متاثر نہ ہو سکے۔ اب جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو ان کے لیے بھی یہی احساس دل میں جاگزیں ہے کہ وہ بھی خواجہ جی کے بھائی تھے۔ انہیں بھی تو صرف محبت درکار ہوگی جو بوجوہ ہم دونوں ادا نہ کر سکے۔ یہ قرض بھی واجب الادا ہے۔

احمد علی

بھائی احمد علی اونچے لمبے پٹھان آدمی۔ ان سے بھی وائس آف امریکہ کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر ملاتے رہے۔ جب ہم داستان سرائے میں آ گئے تو بھائی احمد علی نے سب سے پہلے سیخ کباب بنا کر ہم سب کو کھلائے۔ پٹیالے کے پٹھان اردو بولتے تھے اور ساری ترکیب بھی اردو میں سکھاتے تھے۔

کبابوں کی انگیٹھی، قیمہ، مسالہ، کبابوں میں پڑنے والی بالائی، نان اپنے ساتھ لاتے۔ کھانے والوں میں ریاض محمود، خاں صاحب اور جو بھی مہمان حاضر ہوتے سب چسکے لے لے کر کھاتے رہتے۔

پورے کباب یے، کبھی بجلی کا پنکھا ٹھیک کرتے، کبھی سلاخیں الٹاتے پلٹاتے، کبھی ویسے ہی شور مچاتے لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد ان کی کباب پارٹیاں اور گہما گہمی ختم ہو گئی۔ اب وہ مجھے ملنے ضرور آتے ہیں لیکن اس محبت بھری ملاقات میں تو اتر نہ رہا۔ پھر انہوں نے لاہور کالج کے سامنے APWA کا سامان رکھ کر Sale Point بنا لیا اور اپوا کی ساخت کردہ چیزیں بیچنے لگے۔

مشقت بڑھ گئی۔ کام برکت کا بھی باعث ہوتا ہے لیکن جب یہ تعلقات کا وقت بھی ہڑپ کرنے لگے تو اس کے منفی اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر Workaholic کو اس مقام پر ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ انسان کے کردار کی بہت بڑی خوبی توازن ہے۔ جو کام بھی توازن سے نکل کر شدت اختیار کرتا ہے، اس سے چاہے وہ نیکی ہی کیوں نہ ہو، نقصان کا خطرہ زیادہ ہے۔

ذوالفقار احمد تابش

خاں صاحب کا تعلق تابش سے اردو سائنس بورڈ سے شروع ہوا۔ تابش اردو بورڈ میں حنیف رامے اور محمد اکرام چغتائی کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ گھنگھریالے بال، درمیانہ قد، ناک پر عینک اور چہرے پر ملائمت ہمہ وقت رہتی تھی۔ تابش عجیب طور روحانیت اور عقیدت میں توازن رکھنے کے قائل تھا۔ اسی لیے اس کی کبھی خاں صاحب سے نہ ہوئی۔ اپنے خیالات میں پختہ ہونے کے باوجود کبھی مناظرے کی نوبت نہ آئی۔

جب خاں صاحب ریٹائر ہوئے اور ہم 121۔سی میں آ گئے تو تابش ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ یہ عقیدت محبت کے رشتے تھے۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ کبھی تابش کو جاننے کا مجھے بھی موقع ملے گا۔

لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد تابش اچانک پرسنل زندگی سمیت میرے قریب ہو گیا۔ وہ اور مریم میرے پاس آ جاتے، باتیں کرتے، اپنی زندگی کے بکھیڑے بیان کرتے۔ زندگی میں جو تبدیلی اچانک آ گئی تھی اس سے نبرد آزما ہونے کے متعلق اپنی تشویش ظاہر کرتے۔ بچے چھوٹے تھے۔ ریٹائر ہونے پر پیسوں کی قلت تھی۔ کام کہیں ملتا نہ تھا۔ تابش بہت ملول اور پریشان رہتا تھا۔

اب کچھ عرصہ ہوا تابش میرے پاس کم ہی آتے ہیں۔ مجھ سے نہ ان کو محبت ملتی ہے نہ اعانت۔ جو چشمہ خشک ہو جائے اس پر ہولے ہولے لوگ پانی بھرنے نہیں آتے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میرے ماتھے پر تیوری، زبان میں تلخی، رویئے میں روکھا پن آ گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بچھڑتے جا رہے ہیں۔

یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ جو آدمی کبڑا ہو، وزن اٹھا کر کانپتا ہو، اس پر وزن کیا لادنا؟

اصغر ندیم سید

ملتان ایک زرخیز خطہ ہے۔ ہر اعتبار سے یہاں روئیدگی کی ریت زیادہ ہے اور اس نے پاکستان کو زرعی طور پر اور ذہین لوگوں کے اعتبار سے بڑا اعتباری بنایا ہے لیکن لاہور شہر میں ایک بڑے شہر کا تکبر اپنے سوائے کسی کو ماننے پر مشکل سے رضامند ہوتا ہے۔

ایک شخص جو ملتان سے آتا تھا اور خاموشی سے خاں صاحب کے درشن کر کے چلا جاتا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ حیران رکھا۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

''خاں صاحب! یہ اونچا لمبا، مسکراتے چہرے والا کون ہے جو اتنے حلم اور انکساری سے ملنے آتا ہے؟''

''ہے ایک۔''

''پھر بھی؟''

''ہے ایک اصغر ندیم سید۔''

ہولے ہولے مجھے پتہ چلا کہ اصغر ندیم سید نے ملتان میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن کے لیے کچھ ڈرامے لکھ رکھے تھے وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹیلی ویژن سٹیشن کا دروازہ اس پر کھل جائے اور وہ میڈیا میں اپنا مقام خود بنائے۔ خاں صاحب اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اور یوں ٹیلی ویژن سٹیشن کو ایک بہت بڑا ڈرامہ نگار مل گیا جو راستہ دکھانے والوں سے بھی ہنرمندی میں آگے

اجمل نیازی

اجمل نیازی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ قومی لباس شلوار قمیض اور جیکٹ پہنتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک خاص قسم کا پٹکہ یا چادر قبائلی علاقوں کی یاد دلاتی ہے۔ شاید اس طرح کوئی اور چادر سر پر باندھے تو مضحکہ خیز لگے لیکن اجمل کی خوبصورتی سے اس میں بھی ایک طرحداری پیدا ہو جاتی ہے۔

اجمل نیازی میں منیر نیازی کی طرح اپنے نیازی ہونے پر بہت فخر ہے۔ وہ ہر چیز بھول سکتے ہیں۔ یہ نہیں بھولتے کہ وہ نیازی ہیں اور ان کی اصل شناخت اس کے منبع کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں سے دریا پھوٹا تھا۔ شاید ہی کسی نے اجمل نیازی کو پینٹ قمیض پہنے دیکھا ہو۔ وہ بڑی سے بڑی محفل میں اونچے سے اونچے مقام پر، امریکی، یورپین اور انگریز مندوبین کے درمیان بھی اپنی قومی اور قبیلے کی شناخت قائم رکھتے ہیں۔ یہ کوا کبھی ہنس کی چال نہیں چلتا اور شاید اسی لیے اپنی نظر میں اور دوسروں کے ہاتھوں عزتِ نفس پر حملہ نہیں ہونے دیتا۔

بڑے سال اُدھر کی بات ہے کہ ایک روز اجمل ہمارے گھر آئے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ اس کی گھر والی بھی ساتھ تھیں۔ ماحول گھریلو تھا جس میں ادب، سیاست اور اقدار کی باتیں سرے سے غائب تھیں۔ غیر رسمی ملاقات کے بعد یہ تینوں رخصت ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد اجمل نیازی اکیلا آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا، لیکن شرمیلے پن کے باعث اصلی پریشانی کی طرف نہیں آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے اجمل۔ تم آج خلاف توقع گول مول باتیں کر رہے ہو؟ نہ ٹھیک سے سنتے ہو نہ صحیح جواب دیتے ہو۔''

''اچھا ہے بانو آپا۔ آپ نے پوچھ لیا ورنہ شاید میں بتائے بغیر ہی چلا جاتا۔''
ایسا موقع ہاتھ آئے تو میں ون اپ ہو کر شیر ہو جاتی ہوں۔
''ہاں ہاں بتاؤ بلا تکلف بتاؤ۔ کیا بات ہے؟''
''میرے ساتھ تقدیس آئی تھی ناں۔''
شرمائی لجائی سفیدی سی گھڑی۔
''اچھا اچھا تمہاری بیٹی۔''
''جی جی...... اسے ہارٹ پرابلم ہے۔ مجھے اس کا آپریشن کرانا ہے۔'' اجمل بولا۔
میں حیران رہ گئی۔ میں سمجھتی تھی ہارٹ پرابلم بوڑھوں کی جاگیر ہے اور ایسے پھول سے بچوں کو تو بس زکام، کھانسی، ملیریا بخار ہی ہوا کرتا ہے۔
''گھبراؤ نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔''
اب مزید گھبرا کر اجمل بولے ''وہ جی میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر جواد اس کا آپریشن کرتے۔ میں .P.I.C گیا

...ین وہ مل نہیں سکے۔ مصروف ڈاکٹر ہیں۔ ان تک رسائی مشکل ہے۔"

"بھائی! خاں صاحب کا بھانجا ہے جواد۔ میں اسے فوراً کہہ دوں گی۔ تقدیس چنگی بھلی ہٹی کٹی ہو جائے گی۔ تم ...کر نہ کرو بس اللہ پر بھروسہ کرو۔"

اپنے آپ کو اوپر اٹھانے اور بڑا سمجھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے جواد سے بات کی۔ معاملہ طے پا گیا۔ تقدیس واقعی ہٹی کٹی ہو کر گھر چلی گئی اور اجمل ہمارے اور قریب آ گیا۔ اس مدد کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اجمل نیازی پہلے تو شاید ...یری اس لیے عزت کرتا تھا کہ میں خاں صاحب کی بیوہ تھی لیکن اب مجھے اس کی عقیدت حاصل ہو گئی۔

ایک فون
ایک سفارش
اور اتنا بڑا اصلہ
یہ زندگی کچھ کم حیرت انگیز تو نہیں۔

☆☆☆

ایک گھر کے دو راستے

اجمل نیازی

یہ کم کم ہوا ہے کہ میاں بیوی دونوں کسی میدان میں نامور ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنا اپنا مقام بنایا ہو۔ ایک ...رے کے لیے مثال بن گئے ہوں۔ ایک دوسرے کی مثال بن گئے ہوں بلکہ شال اور ڈھال بن گئے ہوں۔ شال بانو ...قدسیہ کے سر پر اور ڈھال اشفاق احمد کے ہاتھ میں۔ یہ تو ہوا کہ خاوند یا بیوی کی وجہ سے دوسرے کو ملازمت مل گئی اور ترقی کے ...مواقع، تمغے بن گئے۔ یہ بھی ہوا کہ دو لکھنے والوں نے شادی کر لی مگر آگے چل کر راستے بدل گئے۔ کوئی ایک بہت پیچھے رہ گیا یا ...کوئی آگے نکل گیا۔ بیویوں میں تو اکثر لکھنا چھوڑ گئیں۔ کچھ نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا۔ چند ایک نے بے چاروں کو کہیں کا ...نہ چھوڑا۔ بہت کم ایسے جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے بھی ہیں۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک سدا بہار مثالی جوڑا ہے۔ سنا ہے یہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بھارت میں ...ایک آئیڈیل بیوی سے مل کر میں نے کہا تمہارے لیے پتّی کا لفظ کس قدر شاندار ہے۔ "رب نے کرایا ساڈا پتناں تے میل ...ہے۔" پتن زمین پر ہوتے ہیں۔ اب تو بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہر کہیں واٹر ورکس اسکیمیں پہنچ گئی ہیں۔ جب بہت سوچنے ...والوں کی اسکیمیں شروع ہوتی ہیں تو محسوس کرنے والوں کی اقلیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ترقی یافتگی میں وارفتگی اندر رہنی ...چاہیے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نظریہ فن اسی لہر کے گرد گھومتا ہے۔

مغرب میں ازدواجی زندگی کا جو حشر ہوا، وہ ہم اپنے ہاں برپا کر لینے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔ ...اس میاں بیوی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گھروں میں طبلہ بجتا ہے یا طبل بجتا ہے۔ مغربی موسیقی کی کیفیت ہنگامے ...میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اب ان گھروں میں مار پیٹ کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ مغرب میں شوہر اپنی بیویوں کو اکثر

زدوکوب کرتے ہیں۔ مشرق میں کبھی پہلے یہ وارداتیں عام تھیں۔ جو کام چھوڑ دیتے ہیں وہ شروع کر دیتے ہیں۔ جو کام [illegible] کے ہاں رک جاتے ہیں ہم انہیں نئے سرے سے اپنا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیروی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

میں آزادیِ نسواں کی مکمل حمایت کرتا ہوں مگر اس سے پہلے آزادیِ انسان کا مطالبہ کرتا ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے الجھا رہی ہیں اور میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ ان [illegible] پر علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہاں یہ احساس میرے لیے بڑی انوکھی مسرت کا باعث ہے کہ دو آدمیوں کے لیے ایک مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے۔ عورت اور مرد مل کر جو اکائی بنتی ہے، اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مقابلے کے جنون نے ہم سے یہ لطف بھی چھین لیا ہے۔ جب عورت اور مرد اپنے اپنے مقام کو جان لیتے ہیں تو صاحبِ مقام بن جاتے ہیں۔ قدیم چینی فلسفہ تاؤمت (تاؤازم) کے حوالے سے ایک دائرہ دو قوسوں سے بنتا ہے۔ ایک فاعلی اور دوسری انفعالی [illegible] ہے۔ دونوں کی وحدت اور یکتائی سے دائرہ وجود میں آتا ہے۔ دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ قوسیں وہی رہتی ہیں۔ [illegible] قوس میں ایک نقطہ فاعلی قوس کا کہیں ہوتا ہے۔ یہی حالت دوسری طرف ہوتی ہے۔ ایک بڑا دائرہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے بنایا ہے۔ اشفاق احمد میں بانو قدسیہ، بانو قدسیہ میں اشفاق احمد رہتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ''اوکھے لوگ'' میں دونوں کے الگ الگ خاکہ لکھا ہے۔ شاید ایک خاکہ دوبارہ لکھ دیا ہے۔ بانو کے خاکے میں اشفاق، اشفاق کے خاکے میں بانو [illegible] زیادہ ہے۔ بڑی تحریر ہے۔ یہ اوکھے لوگ بڑے سوکھے لوگ ہیں۔ وہ دونوں مختلف ہستیاں ہیں مگر ایک زندگی انہوں نے بسر کی ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی بسر کی ہے۔ اس زندگی کا عنوان اشفاق احمد ہے اور خلاصہ بانو قدسیہ ہے۔ اشفاق احمد مزاجاً کاہل آدمی ہیں۔ جی رہے ہیں جیسے لیٹے ہوئے دھوپ سینک رہے ہیں۔ انہیں تب خبر ہوتی ہے کہ دھوپ لگ [illegible] تھی جب بانو سورج اور ان کے درمیان آ کھڑی ہوتی ہے۔ بانو کی چھتری بھی ان کے لیے سیک کو مزیدار بنا دیتی ہے۔ ایک سچی ازدواجی زندگی کا منظر ہے۔ اسے بانو نے منظر نامہ بنا دیا ہے۔

ادب میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا مرتبہ اُنیس بیس کا ہے۔ بانو کہتی ہیں کہ بیس اشفاق احمد ہیں۔ [illegible] کرانتیس بنتے ہیں۔ دونوں نے فن و ادب کا کوئی میڈیا چھوڑا نہیں۔ ڈرامہ، افسانہ، ناول، سکرپٹ، سفرنامہ، فلم [illegible] بہت کام۔ اب وہ الگ سے بھی کوئی کام کرتے ہیں تو لگتا نہیں۔ وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں۔ دونوں کو پانا مشکل ہے۔ الگ الگ کر کے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ وہ دونوں مس انڈرسٹڈ مخلوق ہیں۔ ان پر نگاہِ غلط انداز ڈال کر دیکھ لیجیے۔ سارے اندازے غلط ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر اور کمتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی [illegible] ان دونوں کے اندر ایک ایک شاعر بھی ہے۔ ابھی انہوں نے نجانے کیا کیا چھپایا ہوا ہے۔ جو کچھ مل کر چھپا رکھا ہے [illegible] نے، کسی کو نہیں مل سکتا۔

بانو پُراسرار لگتی ہیں۔ اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔ دونوں صوفی ہیں۔ ملامتی صوفی۔ دونوں کا عمل [illegible] ہے۔ ردِعمل ایک سا۔ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ ردِعمل چھپایا جا سکتا ہے۔ ایک بے نام سانجھ ان کے درمیان قائم ہے۔ [illegible] دوسرے کو مانتے ہیں، جانتے نہیں۔ جاننا ضروری نہیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔ ظاہر مختلف باطن مشترک۔ ایک [illegible] ان کے پاس جس میں سے بیک وقت اپنی پسند کی غذا نکال لیتے ہیں۔

دونوں اپنے وقت کے مصلوب کردار ہیں۔ بانو اشفاق کی صلیب پر لٹک گئی ہے۔ انہیں تو یہ صلیب دکھائی بھی ...یں دی۔ ''راجہ گدھ'' کو چھوڑ کر تقریباً تمام تخلیقات میں بانو کا انداز ''تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نہیں دسنا'' ...ہے۔ وہ روتی ہے اور سامنے بھی نہیں بیٹھتی۔ ایسے میں اپنے آپ سے بھی دور کہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی مشکلوں کا ...یس چلنے دیا اشفاق احمد کو۔ اپنے آپ کو محدود کر کے لامحدود ہونے کی کوشش کی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ حدود اس دائرے سے ...یں جاتیں جو اشفاق احمد کے گرد بن گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گھریلو عورت عظیم ادیبہ بن گئی ہے۔ بانو کو بڑی عزت ...ہے۔ انہوں نے سر کی چادر کو کاغذ بنایا اور چاردیواری میں شش جہات تلاش کر لیا ہے۔ وہ سامنے سے بہت مست ہیں مگر ...پنے اندر بہت ایکٹو ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ظہور اور اخفا میں فرق مٹ جائے۔ اشفاق احمد نے نئے علام کو اپنے اندر گم ...کیا ہے۔ اس گمشدگی کو بینڈوا اور ان پڑھ بابوں کی کٹیاؤں میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ دانش جب تکمیل اور تازگی کی طرف ...لوٹتی ہے تو لوک دانش میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ لاعلمی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے تو ...ہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟

میں نے کہا ''معلوم نہیں۔''

وہ اور خوش ہوئے۔

اصل بات معلوم سے نامعلوم، نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کے دوران ملتی ہے۔ ہونی ہو کے رہتی ہے اور یہ ...ہونی میں موجود ہوتی ہے۔ اشفاق احمد لوگوں کو حیران کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اس ہنر سے ...ے پریشان ہیں۔

ایک بات میں اشفاق احمد کو بانو پر برتری حاصل ہے۔ بانو ان کی ہر طرح کی برتری کو دل سے مانتی ہے۔ ...اشفاق احمد کو اس صورتحال نے خاصا سازگار کیا ہے۔ اشفاق احمد گفتگو کے بادشاہ ہیں۔ موقع کے مطابق ان جیسی بات ...ت کا ملکہ کم کسی کو ملا ہوگا۔ اس ضمن میں بھی ان کی ''ملکہ'' کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ بانو ان کے سامنے بولتی نہیں۔ بولتی ...ہے جیسے تھکے ہارے گھر آئے ہوئے کے لیے دروازہ کھولتی ہیں۔ پھر ان کی خدمت کی فراوانیاں سارے ماحول میں ...ے خوشبو گھولتی ہیں۔

اشفاق احمد تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کھڑے اشفاق احمد جو باتیں کر رہے ہیں، کوئی نہیں کر ...کر نہیں سکتا یا کرنا چاہتا نہیں۔ وہ ان چیزوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب ان کی حمایت ...لوم ہوتا ہے۔ سائنسی ترقی کے خلاف، ترقی کے خلاف، علم کے خلاف، کتاب کے خلاف، سب سے پہلے یہاں ...ہوں نے کیسٹ کے ذریعے مطالعے کی بات چھیڑی۔ اس وقت سب سے زیادہ ان کی مخالفت انتظار حسین نے کی۔ ...اس طرح کی پہلی کیسٹ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے تیار کی گئی۔ کتاب ...تھا اور اس کا اردو ترجمہ انتظار حسین نے کیا۔

یہ اتفاق ہے۔ ایسے اتفاقات اشفاق احمد کی زندگی میں بہت ہیں۔ ان کی فراست کی فطرت نے کئی بار حمایت ...بانو جی نے ہمیشہ اشفاق احمد سے اتفاق ہی کیا ہے۔ اس لیے گھر سے باہر اشفاق احمد بہت اختلافی گفتگو سن کر بھی

طیش میں نہیں آتے۔ جب راولپنڈی میں ایک تقریب کے دوران نوجوانوں نے اپنے جملوں کو حملوں کے برابر
اشفاق احمد نے سٹیج پر آ کر سیدھے سیدھے اعتراف سے بات شروع کی اور وہ ساری باتیں جو نوجوانوں کے اعتر
سے بھری ہوئی تھیں، خود انہی کے کندھوں پر رکھ دیں اور وہ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر اپ
گھروں کو چلے گئے۔ ایسے واقعے اشفاق احمد کی زندگی میں کافی ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر جب تلقین شاہ کا پیکر پیش
کرتے ہیں تو بھی ہمیں برے نہیں لگتے۔ یہی باتیں کوئی اور کرے تو ہم اس سے لڑ پڑیں۔ ہر شخص کے اندر ایک
ہوتا ہے۔ ہم اسے چھپاتے رہتے ہیں۔ سامنے آنے پر منافق کے دشمن بن جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد نے بندے کے اندر سے نکال کر اس بندے کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ہم زاد بھی ہوتا ہے
تسخیر نہیں ہوتا ہر کسی کا۔ اشفاق احمد نے اپنا ہم زاد تسخیر کر لیا ہے۔ ہم تو اپنے ہم زاد کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے۔
ہوتے رہتے ہیں اس سے۔ اشفاق احمد کی مدد سے ہم بلیک میل ہونے سے تو بچ سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اشفاق احمد کو غصہ نہیں آتا۔ اگر کسی آدمی کے ہر عمل کا جواب محبت بھرے ردِعمل سے رنگا جائے
انگیز حد تک سوہنی سرشت لہو میں جاگ اٹھتی ہے ورنہ اشفاق احمد بھی خاں ہیں۔ پٹھان کا رویہ گھروں میں بھی حا
ہے اور بلاشرکتِ غیرے ہوتا ہے۔ حاکم کو حلیم کرنے والی بڑی ہستی عورت ہے۔ مقابلہ تو حاکم کو ظالم بناتا ہے۔
یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں عورت مرد کے برابر آ کر بھی مظلوم ہی پھرتی ہے۔

یہ بحث میرا موضوع نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورتوں اور لڑکیوں کو بانو جی سے ملنا چاہیے۔ شاید
اندر ایک مکمل عورت کی روح سرایت کر جائے۔ وہ اشفاق احمد کو بہت بڑا سمجھتی ہیں۔ اپنا مرشد کہتی ہیں:

''بانو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک پٹھان مرد کو ایک بہت بڑا انسان بنانے پر اپنا آپ نچھاور کر دیا۔

بڑا انسان تو اشفاق احمد کے اندر تھا۔ دنیا میں بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ہوتا ہے بڑا آدمی۔
باہر کا رستہ مشکل سے ملتا ہے۔ دروازہ ملتا ہے تو کھلتا نہیں۔ عورت دیواروں میں بھی دروازہ کرنا جانتی ہے۔

میرے نانا مظفر خاں بڑے سخت گیر پٹھان تھے۔ انہوں نے بھی ایک اعوان لڑکی سے محبت کی۔
کر کے لے آئے اور شادی کر لی۔ محبوبہ تو مغویہ ہوتی ہی ہے۔ کسی کو اغوا کیا نہیں جا سکتا۔ یہ ڈاکہ ہوتا ہے۔ عورت
ہے۔ اسی لمحے میں جب محبت کی کرن اس کا لباس بن جاتی ہے۔ یہ مخلوق منکوحہ ہو جائے تو اس کی حقیقت بالکل
ہے۔ بابا مظفر خاں نے بظاہر کوئی حسنِ سلوک نہ کیا نانی اماں سے مگر کبھی نانی کے لبوں پر حرفِ شکایت نہ چمکا۔ ان
اس وقت کھلی جب وہ مر گئیں۔ نانا کی شخصیت کا جلال ایک ملال میں بھیگ گیا۔

ایک دن وہ دیوار کے سائے میں اداس کھڑے تھے۔ میں نے ان سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے

''بیٹا! میں یتیم ہو گیا ہوں۔''

زوجہ، زوجہ محترمہ بلکہ زوجہ والدہ ماجدہ کے رتبے پر جا پہنچی۔

محمد حسن عسکری نے کہیں ایک تمثیل بیان کی ہے کہ مرد بھول بھلیوں میں رازوں کے سراغ میں داخل
عورت ہاتھ میں اون کا ایک گولا لے کر ایک سرا اسے پکڑا دیتی ہے۔ کہیں سے کہاں تک گھومنے بھٹکنے کے بعد بھی

...تا۔ اسے پیچھے کا رستہ نہیں بھولتا۔ اُون کے دھاگے کی رہبری میں واپس آ جاتا ہے۔ اپنی عورت کے پاس جو اون کا گولہ ...یے اس کی منتظر ہوتی ہے۔ کارہائے نمایاں مرد کے ہیں۔ عورت بظاہر بے عملی کی تصویر ہے۔ عورت کا یہ عمل بے کار نہ ہو تو ...د کی واپسی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے بھٹکنے نہ دینے کا رستہ ہے وہ۔

اشفاق احمد کی بھیدوں کی خاطر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر تھک ہار کر اپنا سفر کھو بیٹھتا مگر بانو ان کے لیے ...اجعت کی نشانی ہر وقت فراہم رکھتی ہے۔ وہ کہیں چلے جائیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ آغاز میں بانو ہو گی۔ اس امید نے ...س انجام سے بچائے رکھا ہے۔

ایسی کئی تمثیلیں دھرتی کے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ عورت اور دھرتی ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ دھرتی ...نے سینے پر چلنے والوں کو صرف تحمل کا تختہ ہی نہیں دیتی، طاقت کا توازن بھی دیتی ہے۔

دھرتی کا سینہ تخلیق کا منبع ہے۔ دھرتی کسی سے روٹھتی نہیں۔ کسی کو روٹھنے دیتی بھی نہیں۔ ہم اسی کی کوکھ سے نکلتے ...یں اور پھر اسی کی کوکھ میں کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنوں کو سفر پر جانے دیتی ہے اور مراجعت کی طلب ان کے دل میں ...ندہ رکھتی ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیا، نی چرخے دی گھوک سُن کے

مجھے لگتا ہے کہ چاند پر بھی بانو جی ہی بیٹھی چرخہ کاتتی ہیں اور اشفاق احمد سورج کو تسخیر کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ ...رج کو تسخیر کرنے کا مطلب اسے چاند بنانا ہو۔ بانو منتظر رہتی ہیں۔ دھاگے کا گولہ ہاتھ میں ہے اور چرخے کی گھوکر۔

چرخے کی گھوکر آج بھی ان کے دل میں گونجتی ہے۔

قاضی جاوید

قاضی جاوید نے مجھے اصل میں اکادمی ادبیات اور افتخار عارف سے متعارف کرایا۔ وہ اکادمی ادبیات کی لاہور ...چ کا ڈائریکٹر ہے۔ ادیبوں سے اس رسالے کے لیے ان کی نگارشات مانگنا، ان کے بائیو ڈیٹا، ایڈریس اور فون نمبر جمع ...نا اور وقت بے وقت خیر سگالی کی ملاقاتیں اس کے ذمے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس سے رابطہ تھا ہی لیکن اچانک اس سے ...قات بھی باقاعدگی سے ہونے لگی۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جب اثیر بیٹے نے میرا چارج سنبھال لیا تو اس کی ڈیوٹی بڑھ گئی۔ اس نے ...ں سے کچھ اظہار نہ کیا اور چپ چاپ اپنا بستر میرے پلنگ کے ساتھ جوڑ کر رات کو میری نگرانی کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ...رہ دیا کہ میری بیماریوں کے پیش نظر میرے لیے سیر بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے شام کو سیر کرانا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ ...ح سے شام گئے، گھر آیا کرتا تھا۔

اس لیے ہم دونوں صبح سات بجے جوگر پہن کر چاک وچوبند نواز شریف پارک جاتے۔ یہ جوگر میرے لیے اثیر ...ے۔ پہلی مرتبہ مجھے خود پہنائے کیونکہ مجھے تسمے باندھنا نہیں آتا تھا۔ پہلی مرتبہ جوگر پہن کر سیر کا تجربہ بالکل نیا تھا اور ایک

طرح سے یہ معیارِ زندگی بہتر کرنے کی تمہید بھی تھی۔

پارک کے اندر جانے کے صرف دس روپے فی کس لگتے تھے۔ اندر سیر کرنے کے دو راستے تھے۔ ایک تو پارک کے اندر کا راستہ تھا جس پر عام سیر کرنے والے خراماں خراماں جاتے اور دوسرا جوگنگ کرنے والوں کے لیے پارک کے گرد میں گولائی میں چلتا۔ پورے ڈھائی کلومیٹر کی مسافت تھی۔ شروع میں تو اثیر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عام اندر والے راستے پر ٹھہر ٹھہر کر سیر کراتے رہے۔ پھر جب میں رواں ہوگئی تو انہوں نے جوگنگ شروع کر دی۔۔ جوگنگ ٹریک پر نکل جاتے۔ میں اندر والے راستے پر رواں ہو جاتی۔

آخر میں باہر والے احاطے میں ایک بنچ پر جو بھی پہلے پہنچتا، بیٹھ کر دوسرے کا انتظار کرتا۔

اسی سیر کے دوران مجھے ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر، نئے لکھنے والے ادیب اور ایکٹر بھی ملا کرتے۔ یہاں میری ملاقات قاضی جاوید اور مستنصر حسین تارڑ سے ہوئی۔ ایک درمیانے قد اور درمیانے جسم کا شخص دور کرسیوں پر بیٹھا تھا۔ وہ بھاگ کر سیر والی سڑک پر آ گیا۔ ہم نے خوشدلی سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر وہ کرسیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اثیر سے پوچھا۔

''بھائی یہ کون تھا؟''

''پتہ نہیں امی کوئی ابو کا جاننے والا ہی ہوگا۔''

کچھ ملاقاتوں میں باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ محترم قاضی جاوید ہیں۔ اس کے بعد یہ رابطہ مستقل ہوگیا۔ ایک روز ہم سیر کر کے باہر لوٹ رہے تھے تو ہم نے دیکھا جاوید پیدل جا رہے ہیں۔ اثیر بھاگ کر پاس پہنچا۔

''آپ کس طرح جائیں گے؟''

''بس لے لوں گا۔''

''لیکن آپ ہمارے ساتھ چلیے ناں۔ ابو کی گاڑی ہے۔''

پھر ہم انہیں گھر پہنچانے گئے۔ جب ہم انہیں گھر اتار کر واپس آئے تو اثیر بولے۔

''امی! یہ بہت دیانتدار شخص ہے۔ اس دور میں جب فنانس پر گاڑیاں مل رہی ہیں، سیکنڈ ہینڈ کاروں سے شہر پڑا ہے۔ یہ اپنی سفید پوشی نبھائے چلے جا رہے ہیں۔''

پھر سیر چھوٹ گئی۔ مجھ میں سیر کی ہمت نہ رہی۔

لیکن قاضی جاوید سے رابطہ قائم رہا۔ اس سے ادیبوں کے فون نمبر ایڈریس تو ملتے ہی تھے لیکن افتخار عارف کو جاننے میں بھی وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

محمد طفیل + جاوید طفیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ''نقوش'' رسالہ نہ تواتر سے چھپتا تھا نہ اسے پڑھنے والا ایسی لگن سے پڑھتے تھے

...ایک سنجیدہ قاری کو بڑی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ دور غزل اور غزل کی معرفت نظم تک پہنچنے کا عہد تھا لیکن تب بھی طفیل ...حب ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ شیشوں والی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر خاں صاحب سے باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ وہ ...ک بار خاں صاحب کو اکساتے کہ ''داستان گو'' ایک بار پھر شروع کیجیے۔ اب نئے رسالوں کی مانگ ہے۔

خاں صاحب کہتے ''تمہیں داستان گو پسند ہے؟''

''جی بہت۔''

''اس میں کیا بات اچھی لگتی ہے طفیل؟''

سوچ میں پڑ کر طفیل کہتے ''اس کا انوکھا پن، اس میں کئی ایسے مضمون ہوتے ہیں جو کسی اور رسالے میں نہیں ہے۔ مثلاً جانوروں کے متعلق۔''

''اچھا طفیل ایک کام کرو۔ تم اس رسالے کو چھاپ لو۔ میری پوری اجازت ہے۔ کہو گے تو تحریری اجازت نامہ ...لکھ دوں گا۔''

''ناں خاں جی ناں۔ میں ''نقوش'' کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ''داستان گو'' کیسے چلاؤں گا..... یہ کام تو آپ ہی کو ...چاہیے۔''

خاں صاحب چلے گئے۔ طفیل رخصت ہو گئے لیکن جاوید طفیل نے اب بھی والد کی روایت جاری رکھی۔ وہ مجھے ...تے ہیں۔ عموماً ان کے ساتھ ''نقوش'' کا تحفہ ہوتا ہے۔ پھر میری خیر خیریت پوچھتے ہیں۔ کہانی کے لیے اصرار کرتے ...ی عقیدت سے رخصت چاہتے ہیں۔

ایسے ہی چاہنے والے قلم میں روشنائی بھر کر قلم و کاغذ نکالنے پر اکسایا کرتے ہیں۔

محمد طفیل کا انتقال 5 جولائی 1986ء کو ہوا۔

بپسی سدھوا

بپسی سدھوا میرے لیے شروع میں ایک نام تھا۔ ایک چھوٹا سا بادل جو افق پر کہیں معلق تھا۔ پھر ہولے ہولے ...تر کبھی بدلی میں منتقل ہوا۔ دیکھتے دیکھتے یہ گھٹا ٹوپ بادل بن گیا جو ابھی برسا کہ برسا اور پھر اس نے سارے لاہور ...ھوں تان لی۔ سورج کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ بپسی سدھوا بھی آئیوری مرچنٹ کی طرح اپنے کام سے پہچانی ...گئی حتیٰ کہ Beloved City کے سرورق پر کتاب کا نام چھوٹا رہ گیا اور بپسی سدھوا کا نام کتاب کی ضمانت بن گیا۔

لیکن شروع میں بپسی صرف ایک غیر معروف نام تھا جو کبھی کبھی خاں صاحب استعمال کیا کرتے۔ ایک دن وہ ...پاس The Crow Eaters لے کر آئے اور کہنے لگے، یہ کتاب پڑھو۔ پارسی کمیونٹی پر اس سے بہتر کوئی ادب ...ے نہیں گزرا۔ کتاب غلام علی اینڈ سنز کی چھپی ہوئی تھی، کاغذ معمولی تھا اور ابھی اس کا سرورق بھی غالباً نہ چھپا تھا۔ ...میں نے بڑی بدمعاملگی سے شروع کی لیکن جلد ہی میں نے اسے پوری توجہ، انہماک اور جی جان سے پڑھنا شروع

کردیا۔ اسی طرح جب ''آتشِ رفتہ'' ''داستان گو'' میں چھپنے کے لیے آئی تھی، یہ کتاب مجھے حیران کرگئی تھی۔

یہ تب کا واقعہ ہے جب خاں صاحب اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر تھے۔ ہم سمن آباد سے نقل مکانی کر کے ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان دنوں اردو بورڈ کا دفتر گلبرگ میں مین مارکیٹ سے ملحق اور مین سڑک پر تھا۔ اس کی مالکہ بائی جی مسز بھنڈارا تھیں۔ خاں صاحب جلد ہی بائی جی کے چہیتے بن گئے اور ان ہی کی وساطت سے بپسی سدھوا کے نام سے متعارف ہوئے۔ پھر دو چار ملاقاتوں کے بعد خاں صاحب نے بپسی کو اس بات پر اکسانا شروع کردیا کہ کتاب کو مغرب میں کسی معروف ادارے سے چھپنا چاہیے جو اسے مغربی دنیا سے متعارف کرائے۔ جب خاں صاحب بپسی کو اکساتے تو بائی جی عموماً ڈانٹ کے لہجے میں کہتیں ''او وہ اشفاق بابا تو کاہے کو اس کو غلط راستے پر ڈالتا ہے۔ چار کہانیاں میرے تیرے سے سن کر لکھ لی ہیں تو اس کو اتنا Importance نہ دے۔''

لیکن خاں صاحب اشتعال دلاتے رہے، ان کا خیال تھا کہ یہ کتاب ضرور تہلکہ ساز ہوگی۔ Beloved City جس پری زاد کے نام منسوب ہے، اس کی سالگرہ تھی۔ ان دنوں بائی جی مسز بھنڈارا حسین روڈ والی کوٹھی میں تھیں۔ ہم دونوں بپسی کی بیٹی پری زاد کی سالگرہ والے دن بروقت پہنچے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی پرانی تعمیر شدہ کوٹھی میں سالگرہ کا سادہ سا اہتمام تھا۔ مہمان کم تھے اور کوئی طمطراق، کسی قسم کا Show off معیارِ زندگی کا رعب نہ تھا، جا دو جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس قدر امیر ہیں کہ قیامِ پاکستان بننے کے بعد جب پہلی بار بجٹ میں خسارہ پڑا تو بھنڈارا نے وزیرِ خزانہ کو قرض دیا اور ایک طرح سے آئی ایم ایف کا کردار ادا کیا۔

چائے جاری تھی جب باہر کسی آئس کریم والے نے اونچی آواز میں آوازہ لگایا۔ پری زاد بائی جی کے پاس آئی اور بولی ''مجھے دس روپے دے دو۔''

بپسی نے اشارے سے منع کیا لیکن پری زاد ٹلی نہیں۔ پھر دس روپے مانگے۔

بائی جی نے پیار سے پوچھا ''دس روپے کاہے کو چاہیے؟''

''آئس کریم کھانی ہے۔''

خاں صاحب بائی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً دس روپے کا نوٹ پری زاد کو دینا چاہا لیکن بائی جی نے روک دیا۔ پھر بائی جی نے کمال پیار سے پری زاد سے کہا ''تم کو کل آئس کریم ملے گا۔ جب ہمارا پری زاد سکول سے آئے گا آئس کریم فریج میں ہوگا۔'' یہ اس گھرانے کی تربیت تھی جو فضول خرچی نہیں سکھاتے تھے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ کیوں بپسی کی شخصیت، اس کی گفتگو، اس کے اندازِ تحریر میں نہ مبالغہ، نہ نمائشی پہلو، نہ تصنع کی زبان تھی، نہ زیبائشی انداز...... بہت برسوں بعد The Bride' Ice Candyman Cometh, Crow Eaters تینوں کتابیں باہر چھپ چکی تھیں۔ بپسی امریکہ میں Creative Writing بطور مضمون کے پڑھا رہی تھی۔ امریکہ سے ایک بار جب بپسی لاہور آئی اور خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو اسے دکھ تھا کہ فارن میڈیا ابھی بھی پاکستان کو وہ مقام نہیں دیتا جو اسے دینا چاہیے۔ خاں صاحب اور بپسی دونوں اپنے محبوب موضوع پر دیر تک باتیں کرتے رہے اور وہ موضوع پاکستان تھا۔ دونوں جی جان سے اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اب ''محبوب شہر'' (Beloved City

گر کے بپسی نے پاکستان سے اپنی محبت کا ایک بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے۔

لاہور داتا کی نگری ہے۔ یہ ایک خوبصورت نہر سے آراستہ ہے۔ مغلیہ عمارتوں سے سجا ہوا، تعلیمی اداروں کی بستی ہے۔ میلے ٹھیلوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ باغوں اور بہاروں والا ہے۔ کلچرل سٹی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں، فنکاروں کی بستی ہے۔ کھانے پینے کے رسیا لوگوں نے اس کی فوڈ سٹریٹس جاندار کر رکھی ہیں۔ پتنگ بازوں نے اس کے آسمان رنگین کر رکھے ہیں۔

یہی لاہور یونس ادیب کی قلم سے ہو گزرا ہے۔ ''تحقیقات چشتی'' کا حصہ بن گیا ہے، لیکن یہ بات مجھے اچنبھے میں ڈالتی ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی بپسی اسے بھولی نہیں جبکہ اس کے کئی شہریوں کو اس کی شناخت بھی یاد نہیں۔ یہی اس کا محبوب شہر بھی ہے اور اس کی کتاب دیکھ کر لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہو جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی دیکھا۔ وطن کی یادیں زندہ رکھنے والی بپسی سدھوا سلامت رہو، خوش رہو۔ لاہور کے عاشقوں کی طرف سے شکریہ...... سلام اور دعائیں۔

مینو بھنڈارا

بائی جی نے ہمیں دو بڑے خوبصورت تعلق عطا کیے، بپسی سدھوا اور مینو بھنڈارا۔ مینو، خاں صاحب کو کبھی کبھی لاہور ملنے آتے تھے لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔

جب میرے بیٹے اثیر احمد خاں نے ''بونا میرا ایڈورٹائزنگ کمپنی'' بند کر دی تو بیکاری، نکھٹو پن کا بھوت سر پر منڈلانے لگا۔ اللہ بے عزتی اور ذلت سے کسی کو آشنا نہ کرے۔ قرض، بیکاری، گھریلو ناچاقی عموماً ایسی ذلت کا ضامن بن جاتی ہیں۔ انسان کی عزت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ دوسرے مشوروں کی آڑ میں احسان جتاتے ہوئے اور آپ کے نقائص محبت سے بیان کرتے کرتے ذلت کا گھونسہ مار جاتے ہیں۔ اثیر پر بھی کچھ ایسا ہی وقت تھا۔

پچھلے عہد حکومت میں چند اس وقت منسٹر تھے۔ میں ان سے پہلے چند اور صاحب ثروت و حیثیت لوگوں کو نوکری کے لیے کہہ چکی تھی لیکن بے سود۔ پھر میں نے مینو بھنڈارا سے کہا تو انہوں نے بڑی جلدی اثیر کو Islamic Bank میں نوکری دلوا دی۔

جب بائی جی حیات تھیں، تب کی بات ہے جونہی انہیں پتہ چلتا کہ کوئی پارسی گھرانہ مالی مشکلات میں مبتلا ہے وہ ایک سیل تیار کرتیں۔ سب گھروں میں اطلاع دی جاتی کہ وہ اپنے پرانے کپڑے، جوتے جو سامان استعمال میں نہیں، بائی جی کے گھر عنایت کر دیں۔ اب اس بیکار سامان کو ڈبوں میں پیک کیا جاتا۔ بائی جی بڑے خوبصورت ڈبے اپنے ہاتھ سے تیار کرتیں۔ ان پر گفٹ پیپر چڑھاتیں۔ پھر ان میں سامان کو قرینے سے لگاتیں۔ سیل ہوتی۔ سامان ہاتھوں ہاتھ بک جاتا اور جو رقم جمع ہوتی وہ اسی ضرورت مند خاندان کو رات کے اندھیرے میں پہنچا دی جاتی۔

مینو بھنڈارا سے مل کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خوبی ان میں اور بائی جی میں سانجھی تھی۔ عموماً ہر اقلیت

کے پاس بھی اخلاق کی برتری اسے اکثریت کے مقابلے میں سربلند کرتی ہے۔ کسی اور خوبی اور وصف سے اکثریت لوہا نہ مانتی۔ اللہ مینو بھنڈارا کو سلامت رکھے اور رفاہی کاموں کی اور توفیق دے۔ آمین

افضل توصیف

''کڑوا سچ'' کالم لکھنے والی افضل توصیف ایک ایسی ڈرپوک روح ہے جو سچ بول کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتی ہے اور دل میں سوچتی رہتی ہے کہ کہیں اس سچ کی مجھے اور میرے گھر والوں کو بھاری قیمت ادا نہ کرنا پڑے۔ ''مجاہد ادب'' کے حوالے سے اس نے بڑا نام کمایا ہے۔ اسے ملکی اندوہناک حالات، سیاست کی اونچ نیچ، معاشرتی خرابیوں کا تیکھا علم ہے۔ وہ ان سب کے لیے کچھ عمل بھی کرنا چاہتی ہے اور جب عمل کے میدان میں اترنے کے لیے اپنے وسائل کم پاتی ہے تو قلم اٹھا کر کم از کم احتجاج اور جہاد شروع کر دیتی ہے۔

ایک لمبا عرصہ وہ میرے پاس آتی رہی۔ اس کے اپنے گھریلو حالات بھی ناساز گار تھے۔ اس لیے وہ خان صاحب کے چلے جانے کے بعد میری مجبوریوں کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ لکھنے لکھانے سے ہم دونوں وابستہ تھیں مجھے تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے کبھی حسد کی لپیٹ محسوس نہیں کی اور سچ اور کھلے دل سے ایک دوسرے کے فن کی داد دی۔

افضل توصیف زیادہ ترقی کی خواہاں بھی نہیں۔ جب سرکاری دوروں پر ادیب بھی نمک برابر ساتھ جاتے تھے افضل نے کبھی کسی سے سفارش کی نہ اس خواہش ہی کا اظہار کیا کہ وہ بھی اور کچھ نہیں تو دوسرے ممالک کی سیر کرنا چاہتی ہے۔

اس دور میں ایسے ملکی حالات میں اتنا سیدھا راستہ پکڑنا اور استقامت سے اس پر چلتے رہنا بڑی ہمت کی بات ہے۔

آفرین افضل توصیف آفرین......

مستنصر حسین تارڑ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ انیس اپنا گھر رائیونڈ میں بنا رہا تھا۔ انیق امریکہ میں تھا۔ اثیر اظہار کے معاملے میں باپ کی مانند ہے۔ زبانی کلامی تشفی نہیں دے سکتا لیکن پھر بھی محسوس کیا کہ مجھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

وہ بینک جانے سے پہلے مجھے نواز شریف پارک میں لے جاتا۔ کار کا کرایہ ادا کر کے انٹری فیس دے کر ہم دونوں باغ کے وسط میں ہوتے ہوئے دائرے کی شکل میں چلتے رہتے۔ اسی سیر کے دوران ایک دن میں نے دیکھا ایک شخص بھاگم بھاگ ہماری طرف آیا۔

''میں مستنصر حسین تارڑ ہوں آپا۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی میں جانتی ہوں۔"

وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے گا۔

قریباً سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب میرے بچھے، پروڈیوسرز، تفریحی ملنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تو اشیر کے لیے میرے ساتھ چلنا مشکل ہوگیا۔ اب وہ باہر کے جوگنگ ٹریک پر اکیلا نکل جاتا اور مجھے اپنا پینڈا اکیلا کرنے دیتا۔

ہم میں سے جو بھی پہلے آجاتا، وہ باہر والی بنچ پر آ کر انتظار کرتا۔

مستنصر ان یادوں میں سرفہرست ہے۔ میں اس سے پہلے اس کے سفرنامے اور "بہاؤ" جیسے خوبصورت ناول سے آشنا تھی۔ یہ ناول مجھے حیران کر گیا۔ ایک نئی زبان، کلچر اور بہتی ہوئی آبادی کی خوابناک داستان کسی اور ادیب کے بس کی بات نہیں۔ پاکستان میں کسی ایسے ناول سے شناسا نہیں تھی جو تخیل کے زور پر اس پرانی تہذیب میں روح پھونک دے۔ وہ زبان بھی اختراع کرے جو غالباً اس عہد میں بولی جاتی تھی۔

مستنصر خیال کے پیچھے بھاگنے والا ادیب ہے۔ وہ خیال کے بگولے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ایسے راستوں پر، مقامات سے ہو گزرتا ہے جن کے متعلق ہم اپنے تصور میں بھی رنگ نہیں بھر سکتے۔ سفرنامے اس کی بے چین روح کی پیداوار ہیں۔ ان میں وہ شیخیاں نہیں مارتا، گدگدی نہیں کرتا، کسی حسینہ کا سہارا نہیں لیتا۔ اسے "ماچو مین" بننے کا کوئی شوق نہیں۔ پھر بھی پڑھنے والا اس کی کتاب چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کا سفر سحر سے کم نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستنصر خیال سے حقیقت کی طرف لے آتا ہے۔ اس کی ترغیب خواب سے شروع ہوتی ہے اور پھر پہاڑوں میں ریگستانوں میں پہنچا دیتا ہے جو مکمل حقیقت ہے راستے، راستے میں ملنے والے مناظر ہر چیز چھوئی، دیکھی اور احساسات کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے۔

مستنصر کا نام ہی بلانا مشکل نہیں، اس کے سفرنامے اور سٹائل، اس کے نام کی طرح ناقابل تقلید ہیں۔

سیر بالکل بند ہوگئی۔

لیکن یہاں کی ملاقاتیں گھر میں منتقل ہوگئیں۔ مستنصر اپنی بیگم کے ساتھ کبھی کبھی اور عموماً اکیلے ہی مجھے ملنے آتے رہے اور یوں اس گلدستے میں اضافہ ہوا جو داستان سرائے کے کمرہ نمبر زاویہ میں سجا رہتا ہے۔

باقی آپ ٹیلی ویژن پر ان سے کافی واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایک انوکھا پروگرام کرتے ہیں جو شادی آن لائن قسم کا ہے، جس میں شادی کے آرزومند مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیوں کو باہمی رابطے کی صورت دکھاتے ہیں۔ اس ثواب کے کام میں وہ میرج بیورو کا کام کرتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ چارج کچھ نہیں کرتے۔ یہ پھر مستنصر کے خیال کی مہربانی ہے۔ اس کا یقین ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور اس طرح پیسہ وصول کر کے انسان بڑے اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

کشور ناہید

کشور ناہید کو اپنی زندگی کے سفر کو سیدھا کرنے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ اسی مشقت بھری زندگی میں کسی

مقام پر وہ بہادر عورت بن گئی۔ اب اس کا ذاتی غم، ناکامی اور ''واحسرتا'' قسم کی مایوسی نے عمومی رنگ بنالیا۔ وہ اپنے غم کے لبادہ اتار کر کالا لباس پہن کر عورت کی مظلومیت کی داعی بن گئی۔ اس کا خیال، اس کی تحریکوں میں ابھرنے لگا۔ وہ ایک ہے کو بھی یہ سننے کو تیار نہ تھی کہ ''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا''۔ وہ یہ ماننے کو راضی نہیں کہ مرد کی زندگی جو عورت اور بچے کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی ہے، اسے بیرون گھر کچھ ذلتوں کا سامنا رہتا ہوگا۔ افسروں کی زیادتی، ماتحتوں کے موڈ، کام کی اڑچن، مرد کی عزتِ نفس پر پے در پے حملے کرتی ہیں۔

اب کشور عورتوں کو اس بات پر اکساتی ہے۔ اٹھو اور میری دنیا کی عورتوں کو جگادو۔ وہ بھی باہر نکلیں اور اپنے کا رزق کمائیں۔ گھر کی پرورش، بچوں کی رہنمائی، شوہر کی دلجوئی کو خدا حافظ کہیں۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کی علمبردار ہے۔ اب شادی وہی تھپیڑے کھائے گی جو مغرب کے معاشرے میں اس کا نصیب ہے۔ شادی کا مستقبل، مشرق میں بھی مشکوک ہو چکا ہے۔ اب یہاں بھی خاندانی نظام مشکوک ہے اور بچے جو ہر نسل کا مستقبل ہیں، ماں باپ کی طرف دیکھتے رہ گئے ہیں اور پوچھتے ہیں آخر وہ کس کی اولاد ہیں۔ انہیں اتنا لاوارث کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب کشور لمبی اڑانوں پر نہیں نکلی تھی۔ وہ خاں صاحب کی چہیتی تھی اور ''کھلا پروگرام کے ہر Episode میں ان کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرتی حیا اور بیٹی کا سا ادب چھایا ہوتا لیکن پھر یوسف کامران اللہ کو پیارا ہوگیا۔ چادر اور چار دیواری کا تصور ختم ہوگیا۔ اب کشور عورت سے انسان بن گئی۔ اس کے گھر میں شام کو رنگ رلیوں کی محفل ہوتی اور کشور آزادی پسند لوگوں کی میزبانی کرتی۔

کشور دل کی اچھی لیکن زبان کی آری چلانے سے باز نہیں آتی۔ دعا ہے کہ اسے اپنے رویے میں ''توازن'' کی خوبی مل جائے۔ وہ اپنے بچوں، ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کے لیے مثبت رویہ، سوچ اور عمل رکھے۔ اس سے خود اس کی ذات کو بہت سکون اور اطمینان ملے گا اور وہ اللہ کے شکر گزاروں میں شامل ہو جائے گی۔ یہ نسخہ بھی آزما دیکھو کشور...... ایک مطمئن ماں سے بڑی وراثت اولاد کے لیے کچھ نہیں......

افتخار عارف

افتخار عارف اپنی عینک کو اس طور استعمال کرتے ہیں، جیسے چونچال لڑکیاں اپنے دوپٹے کو اداؤں میں ہیں۔ افتخار عینک چہرے سے کم کم اتارتے ہیں لیکن اپنی انگشتِ شہادت سے کبھی انگوٹھے سے اسے ناک پر جماتے ہیں۔ ہجرت کر کے جو لوگ بھی پاکستان میں آئے ہیں، ان کی مشکلات مقامی لوگوں کی سمجھ میں پورے طور پر نہیں آ سکیں۔ زبان، رسم و رواج، رہن سہن میں تو واضح طور پر فرق ہوتے ہی ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ Acceptance کا ہے۔ مہاجر بہت زیادہ خوشدلی سے آگے بڑھ بڑھ کر آپ سے دوستی کرنا چاہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔ اس پر مفروضے کا لیبل لگ جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں توازن قائم رکھنا اور اصلی میرٹ کی وساطت سے مقام پیدا کرنا کاردارد ہے۔

شاید اردو ادب میں مقام پیدا کرنا خاصی کٹھن منزل ہوتی اگر اس کے پاس شاعری کا ہتھیار نہ ہوتا۔ اس کی شاعری میں وہ سادگی، تیکھا پن اور دل میں اتر جانے والی خاصیت ہے جو اس کی آدھی لڑائی لڑتی ہے۔ جو لوگ بظاہر افتخار کے قائل نظر نہیں بھی آتے، وہ بھی اس کے اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے۔

میں افتخار سے خاں صاحب کے جانے کے بعد ملی۔ خراجِ تحسین کا پروگرام تھا۔ وہ میرے سامنے والی قطار میں بیٹھا تھا۔ دو تین بار اٹھ کر آیا اور لفظی اظہار کے بغیر اظہارِ ہمدردی کر گیا۔ خاں صاحب سے اس طرح پیار کرنے والوں کی فہرست میں افتخار ایک قابلِ ذکر شخصیت ہے۔ اب باقاعدگی سے ''ادبیات'' ملتا ہے۔ افسانوں کے لیے اظہار اور عقیدت کو چھپا کر نہیں اعلانیہ پیش کر دیتا ہے۔

شکریہ اور پھر شکریہ......

امجد اسلام امجد + عطاء الحق قاسمی

امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایسے جڑواں ادیب ہیں جن کا تصور علیحدہ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

خاں صاحب کی ان دونوں سے محبت مجھے تھوڑا سا حسد عطا کیا کرتی تھی۔

امجد جب بھی کوئی نئی نظم یا غزل لکھتا فوراً داستان سرائے پہنچا کرتا۔ عطاء آتا تو اپنے کالم، نظمیں ساتھ ضرور لاتا۔ ایک روز جب عطاء گھر پہنچا تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ خاں صاحب نے مجھے کھانا لانے کے لیے کہا۔ اس روز سرسوں کا ساگ پکا تھا اور میں مکئی کی روٹی بنا رہی تھی۔ تازہ مکھن اور روٹی لے کر میں اندر پہنچی تو عطا نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''یہ روٹی آپ نے پکائی ہے بانو آپا؟''

''بالکل کوئی شک ہو تو اندر آ کر دیکھ لو۔''

اس نے حیران ہو کر سر دائیں بائیں ہلایا۔ ''پڑھی لکھی عورت اور اس قدر مہارت! تعجب، حیرانی!''

تعریف نشانے پر لگی۔ میرے دل میں عطاء نے گھر کر لیا۔ ان دنوں ''معاصر'' رسالے کے دونوں کرتا دھرتا امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی رسالے سے قریب قریب ریٹائر ہی ہو چکے تھے اور عطاء کا بیٹا عمر قاسمی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ شاید عطاء نے گھر پر میری تعریف کی ہو کیونکہ اسی واقعے کے بعد عمر نے ''راجہ گدھ'' پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا اور مجھے اپنے احسان کے Lasso میں گھیر لیا۔

خاں صاحب بابوں کی طرح سمجھتے تھے کہ دسترخوان دوستی اور اظہارِ یگانگت کے لیے ایک آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ ایک مرتبہ جب امجد اسلام امجد اپنی بیوی فردوس کے ہمراہ آئے تو فردوس کچھ پکوان پکا کر لائی لیکن انڈے ادرک کی ڈش نے میلہ لوٹ لیا۔

''بھئی ادرک انڈے قدسیہ کو پکانا سکھا دو فردوس۔''

فردوس نے بڑی لگن اور محنت سے مجھے ترکیب سمجھائی لیکن وہ لطف پیدا نہ ہو سکا جو فردوس کے پکیار ے میں تھا۔ غالباً یہی ہاتھ کا فرق ہے جو کسی ہوٹل کی مشہوری کا باعث بن جاتا ہے۔

امجد ہمیں ایک مرتبہ اصرار کے ساتھ چائنیز کھانا کھلانے لے گیا۔ جس محبت سے اس نے کھانے کا آرڈر کیا وہ کھانا بھلائے نہیں بھولتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ باقاعدگی کے ساتھ میری خیریت معلوم کرنے آیا کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے وہ میری ساری تنہائی کو کسی طرح اپنے اندر جذب کر کے لے جانا چاہتا ہے لیکن جاتے وقت اس کے کندھے کچھ ایسے سکڑے ہوئے خمیدہ ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے مشن میں فیل ہو گیا ہو۔

بیشتر ادیبوں کی طرح عطاء اور امجد نے روزی کمانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ ایم اے او کالج میں پڑھایا۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی۔ ان دنوں امجد اسلام امجد Children Complex کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وہ پتہ نہیں میرے لیے کیسے وقت نکال لیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنی بیگم کو بھی دو تین بار میرے پاس لائے ہیں۔ خاموش خاموش، پروفیسرنی کم گو بھی ہیں اور عطاء میں گم بھی ہیں۔ اس جوڑی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے جینے کا فن سیکھ لیا ہے اور ان کو اب گھر سے باہر رابطوں کی ضرورت نہیں۔

''معاصر'' رسالے کے لیے امجد اور عطاء نے بڑی محنت کی۔ رسالہ مستقل مزاجی اور استقامت کے بغیر نکالنا بھی مشکل ہے اور ان دونوں کی سانجھی کوشش سے یہ رسالہ اردو کے رسالوں میں ''سرکڈواں'' نظر آتا ہے۔

سیما پیروز، یاسمین حمید، رخشندہ نوید

یہ تینوں نہ تو دوست ہیں اور نہ غالباً ایک دوسرے کو جانتی ہی ہیں لیکن میرے ذہن کی سکرین پر یہ تینوں چہرے عموماً ڈزالو (Desolve) کر کے کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک کے بعد دوسرے چھپے کی طرح تین رنگوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

سیما پیروز عموماً جب مجھ سے ملنے آتی تو قاضی پیروز بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ قاضی بھی اچھی بھلی کہانیاں لکھتے تھے لیکن شاید سیما کے پیٹروبکس کے آگے ان کا دیا نہ جل سکا یا پھر روزی کمانے اور گھریلو اخراجات پورے کرنے کی تگ و دو نے انہیں اس فیلڈ میں دور تک چلنے نہ دیا۔

آج مسابقت کے عہد میں ویسے بھی اچھے بھلے ادیب یونہی روندے جاتے ہیں اور کچھ بانصیب ادیبوں کے کندھوں پر سوار بالا ہی بالا ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، جن کی اُن کو بھی امید نہیں ہوتی۔ سیما کے نصیب یاور رہے اور کافی فاصلہ طے کر گئی۔ میرا خیال ہے جہاں تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہاں تک وہ پہنچ نہ پائی۔ پتہ نہیں پی آر کی کمی تھی کہ محنت کی۔ بہر کیف ترقی کا سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے حتمی طور پر کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا۔

یاسمین میرے پاس آئی تو وہ مجھے نہ تو استانی لگی نہ شاعرہ۔ میرا خیال ہوا کہ وہ ٹی وی سے وابستہ ہے اور کسی

کے سلسلہ میں آئی ہے لیکن جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو بھید کھلا کہ موصوفہ ایک بڑی حساس شاعرہ ہیں اوران کا پروفیشن تعلیم وتدریس سے ہے۔ یاسمین مجھے ملنے آتی رہیں لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد اسے زندگی کی مصروفیت نے ...پ کرلیا۔

رخشندہ نوید جب پہلی مرتبہ مجھے ملیں توان کے ہاتھ میں اپنی شاعری کا مسودہ تھا۔انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس پر دیباچہ لکھ دوں۔

''تم غلطی پر ہو رخشندہ۔ تمہارا مطلب یہ ہوگا کہ خاں صاحب تمہارے لیے پیش لفظ رقم کریں۔''

''نہیں بانو آپا، آپ ہی لکھ کر دیجیے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر لگا دیں گے۔''

مجھے اس کے چہرے پر ایسی حیا نظر آئی جس نے مجھے بڑا متاثر کیا اور میں نے مسودہ اس سے پکڑ لیا۔

ابھی خاں صاحب حیات تھے۔ایک دن میں نے ٹیلی ویژن لگایا تو سکرین پر سرفراز شاہ صاحب نظر آئے۔ رخشندہ نوید ان کا انٹرویو لے رہی تھی۔شاہ صاحب کچھ روحانی بصیرت کے حوالے سے لوگوں کے مسائل اوران کے حل پیش کر رہے تھے۔ابھی ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام کم ہوتے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا پروگرام تھا جو زاویے کے شانہ بشانہ چلتا رہا۔ پھر شاہ جی لندن چلے گئے اور یہ پروگرام سکرین سے مع رخشندہ نوید غائب ہو گیا۔اب مجھے معلوم نہیں کہ موصوفہ کہاں ہوتی ہیں۔ان کی نظمیں، غزلیں میں شوق سے رسالوں میں پڑھتی ہوں۔کچھ پرانے تعلق کی بنا پر۔کچھ اس کی شاعری میں اپنی ہی سلگاہٹ ہے جس کی تپش آسانی سے آپ تک پہنچ جاتی ہے۔

زندگی کا شکریہ جس نے مجھے ایسی محبت کرنے والی روحیں ملا دیں۔

احمد عقیل روبی

میرا خیال ہے کہ ہر پچیس تیس سال کے بعد ہر ملک کے مشاہیر بدل جاتے ہیں۔ جوں جوں نئی ایجادات فروغ پاتی ہیں۔معاشرہ غیر محسوس طریقے سے نئے رسم و رواج، لباس کی تراش خراش، زبان میں نئے الفاظ کی نمو، معیار زندگی میں نئے انداز اختیار کر لیتا ہے۔زبان جو ادیب کا ہتھیار ہے، اس میں بھی نئے الفاظ کی پنیری لگ جاتی ہے۔ انگریزی تو شہری زبان میں داخل ہو ہی رہی ہے لیکن اردو بھی اب انگریزی میں لکھے جانے پر مُصر ہے۔اسے فیشن کہہ لیجیے کہ وقت کی ضرورت کہ زبان پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے۔

اب آپ کو جگہ جگہ Bill Boards پر ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایسے اردو الفاظ کثرت سے نظر آئیں گے جو انگریزی میں اردو کو رواج دے رہے ہیں۔اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی دنیا ایک گلوبل ولیج بننے پر مصر ہے۔ صرف ایک مشکل ہے کہ ابھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس جیسی قدر نہیں بدلی۔ معاشرے میں انصاف کی بنیادی اہمیت کا اسلامی معاشروں کو نہ احساس ہے نہ وہ اس معاملے میں کوئی ذمہ داری ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم سب الفاظ کے استعمال میں فراخدل ہو رہے ہیں، لیکن عقیل روبی ایک نئی سمت سے اس تبدیلی

میں داخل ہوا ہے۔ عقیل روبی گریک Mythology میں سرتاپا کھویا ہوا ہے۔ اس نے ہندو دیو مالاؤں کی طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ Odepius, Trojen Wars بادشاہ اور ہیلن آف ٹرائے کے شہرہ آفاق حسن کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ میں ترجموں کی بات نہیں کر سکی۔ ورلڈ کلاسیک کا ترجمہ ایک بہت خوش آئند عمل ہے لیکن عقیل روبی نے صرف ترجمے کا سہارا نہیں لیا۔ ہمارے ادب کو گریک دیو مالاؤں سے رنگ برنگی روایات دکھانے کی کوشش کی ہے۔

عقیل روبی ہمارے گھر میں ممتاز مفتی کی وجہ سے آتے تھے۔ مفتی جی جب بھی لاہور آتے، اپنا میلہ ساتھ لاتے۔ خاں صاحب سے بھی ان آنے والوں کی ملاقات ہو جاتی۔ پھر کچھ لوگ مفتی جی کو نہ چھوڑتے اور کچھ ان سے بچھڑ کر خاں صاحب کے ارادت مند بن جاتے اور مفتی جی کونے سے لگ جاتے لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک مفتی جی جیتے رہے، عقیل ان ہی کے حلقۂ ارادات میں داخل رہے اور خاں صاحب کو بھی دوسرے درجے کی توجہ دی۔ اس بات کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ عقیل روبی نے مفتی جی پر "علی پور کا مفتی" تحریر کی لیکن انہیں کبھی خاں صاحب پر ایسی کوئی کتاب لکھنے کا خیال نہ آیا۔

ابدال بیلا اور عقیل روبی مفتی جی کے ایسے عاشق زار ہیں جنہوں نے اپنی محبت میں دوئی کا زہر نہیں ملایا۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں تنقید نگار نہیں ادیب ہیں اور وہ جب بھی لکھتے ہیں ان پر جذبات حاوی ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی چیز پر معروضی تبصرہ نہیں کر سکتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد عقیل روبی نے بڑی مروت سے مجھے ملنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب گویا چاہنے والوں کی محبت سے میری زندگی کا خلا پُر کر رہے تھے۔

ایک روز شام کے وقت عقیل روبی آیا۔ پتہ نہیں ہمارے ڈرائنگ روم کا مشرق کی جانب شیشے کی لمبی کھڑکی سے کیا تعلق ہے کہ عموماً یہاں ہی کچھ ایسے بھید کھل جاتے ہیں جو ہماری شعوری سوچ کا حصہ نہیں ہوتا اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایسے واقعے عموماً عصر اور مغرب کے درمیان کیوں ہوتے ہیں۔

جس روز شام کو عقیل آیا۔ کہیں مغرب کا وقت قریب تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔

"آپا جی...... باہر لان میں دیکھیے۔"

میں نے باہر نگاہ دوڑائی۔

"کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس وقت چاند نکلنے والا ہے کہ سورج طلوع ہونے کا عمل ہے۔"

"لو اس کا اندازہ لگانا تو آسان ہے۔ ابھی میں نے عصر پڑھی ہے۔ اب تو غروب آفتاب کا وقت ہے لیکن بادلوں کی وجہ سے سرخی نظر نہیں آ رہی۔"

"نہیں نہیں بانو آپا! آپ تو تجربے سے بات کر رہی ہیں۔ بھلا اگر کسی دوسرے ملک کے اجنبی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملکہ سبا کی طرح یہاں لے آیا جائے تو کیا وہ بتا سکے گا کہ سورج نکلنے والا ہے کہ ماہِ منیر۔"

"ہاں پھر تو مشکل ہے۔"

"میں کافی دیر سے ارضی و سماوی نباتات و جمادات، بہتے پانی، اونچے پہاڑ دیکھ رہا ہوں۔ بادلوں نے میرے

...ش گم کر دیئے ہیں۔ بانو آپا! جو راز مذہب کی جھولی میں چھپے ہیں ان کا مقابلہ تو کوئی دیو مالا نہیں کر سکتی، آخر فلسفی اور دیو مالائی ہیرو بھی تو زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں، لیکن جو معنی مذہب عیاں کرتا ہے اور ڈھانپ بھی رکھتا ہے اس سے ...ے اسرار، راز اور کہاں ہوں گے۔''

کچھ عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ عقیل روبی نے جو کچھ گریک Mythology سے حاصل کرنا تھا، غالباً کر لیا اور پگڈنڈیوں کا سفر چھوڑ کر بڑی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ اس کی شہادت یوں ملی کہ ایک روز وہ آیا تو اس کے ساتھ ''سورۃ ...حمد'' کا منظوم ترجمہ تھا۔

اصرار سے بولا۔ ''بانو آپا! اسے پڑھ کر ضرور بتائیے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟''

میں اسے کیا بتاتی کہ ترجمہ کیسا تھا۔ نہ مجھے مذہب کی سمجھ تھی نہ شاعری کی نہ ترجمے ہی کی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک روز عقیل ملنے آئے تو میں نے اپنے کچھ شکوک کا اظہار کیا۔

''عقیل...... نماز کے کچھ حصے میری سمجھ میں نہیں آتے۔''

''آپ سمجھ کے کیا لیں گی۔ ساری نماز حمد و ثنا ہے اور انسان کی عاجزی اور اللہ سے مدد مانگنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یقین جانیے بانو آپا! اللہ کو ہماری تعریف سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ضرور ہے کہ میرے لیے نماز پڑھو لیکن وہ ہرگز اس نماز کا محتاج نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم پانچ وقت اس کی مدد کے طالب رہیں اور ارض و سما کے ان لوگوں میں شامل رہیں جو اسی سے مانگتے ہیں۔ یہ نماز ہماری روح کو وضو کی طرح دھوتی ہے۔ اس کا فائدہ صرف ہمیں ہے۔''

میں عقیل روبی کی تبدیلیاں دیکھ کر حیران ہوں۔ ویسے تو ہر انسان تک رسائی مشکل ہے لیکن ایسا انسان جو واضح طور پر اتنی کروٹیں لے اس کا کیا پتا لگائیں۔

محمد یونس بٹ

آپ لوگ محمد یونس بٹ کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔ آج کے سٹ کام کے عہد میں جب آدمی کے جبڑے سخت، آنکھیں تنی ہوئی اور زبان لکنت کے آس پاس رہتی ہے۔ یہ ساری ٹینشن، ہلکے پھلکے مزاح سے دور کرنے کی کوشش میں محمد یونس بٹ ہی کامیاب ہے۔ وہ جملے الٹانے اور اس میں نئے معنی اور روح پھونکنے میں لاجواب ہے۔

لیکن میں محمد یونس بٹ کو اپنے محسن کے طور پر جانتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 1985ء میں مجھے بلڈ کینسر نے گھیر لیا تھا۔ میں یونس کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی خاں صاحب سے ملنے ڈرائنگ روم کی حد تک آیا کرتا تھا۔ غالباً وہ ہمیشہ سے ایک ہمدرد دل کا مالک ہے۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ مجھے خون کی شدید ضرورت ہے۔ سارا دن خون کی بوتل لگتی اور بلڈ کاؤنٹ کو بارہ تک لایا جاتا۔ پھر بیماری حملہ آور ہوتی اور میرا بلڈ کاؤنٹ گر کر چھ تک ہو جاتا۔

ہسپتال میں سب سے پہلا Donor اشتیاق کا بیٹا صائل پہنچا۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہیں پہلے میرا بلڈ گروپ اپنے لہو سے میچ کرا کر بی پوزیٹو لہو کی بوتل جمع بھی کرا دی تھی۔

دوسرا شخص جو ہسپتال میں موجود تھا۔ وہ یہی نوجوان یونس بٹ تھا۔ جس وقت میرے بازو میں صائل کے خون کا قطرہ قطرہ جا رہا تھا، یہ بڑی لجاجت سے داخل ہوا۔

''آؤ بھئی آؤ تم کہاں؟''

وہ بلا جھجک بولا...... ''ڈاکٹر جی کے پاس گیا تھا خاں صاحب۔ میرا خون بھی بی پوزیٹو ہے۔ میں خون دینا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹر جی کہتے ہیں آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔''

''او یار یونس! بیٹھو بیٹھو تم کس مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ لہو کی کمی ہو جائے گی خواہ مخواہ۔ جانے دو۔''

''جی نہیں۔ اشفاق صاحب! مجھے خون دینے دیں۔ میں شیخی مار سکوں گا کہ بانو قدسیہ ''راجہ گدھ'' کی مصنفہ کی رگوں میں میرا لہو دوڑتا پھرتا ہے۔ آپ مجھے اس اعزاز سے کیوں محروم کرتے ہیں؟''

اس کی خواہش میں کچھ ایسی سچائی اور طلب تھی کہ خاں صاحب انکار نہ کر پائے اور یونس کا لہو میری رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا۔

باقی دعا ہے کہ اللہ اسے اپنی آرزوؤں میں کامیاب کرے اور لوگ تادیر اسے یاد رکھیں۔ عموماً مزاح نگار لوگ سوڈے کی بوتل کی مثل ہوتے ہیں۔ جونہی کسی کی ٹینشن رفع ہو جاتی ہے، گیس نکل جاتی ہے۔ مزاح نگار بھی بھول جاتا ہے۔ مسکراہٹ اور آنسو میں یہی فرق ہے۔ ایک آنسو بھی یاد میں تادیر باقی رہتا ہے اور گھنٹہ بھر ہنسانے والا لمحوں میں بھول جاتا ہے۔

ایکٹروں کی دنیا

اللہ نے کچھ بیکار پیدا نہیں کیا۔ لطافت اور کثافت اپنے اپنے مقام پر ہوں تو فائدہ اور راحت پہنچاتے ہیں۔ بے وقت اور غلط مقام پر ان کے نتائج نہیں نکلتے۔ ایسے ہی وفاداری بے وفائی دونوں اپنے اپنے مقام پر خوب ہیں۔ یوں سمجھیے کہ گھنا چھتنار درخت ایک مدت ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی وفاداری آپ کے سامنے ہے۔ پرندے گھونسلے بنانے، مسافر آرام کرنے، لڑکیاں جھولے ڈالنے کے لیے ایسا ہی سایہ دار شجر تلاش کرتی ہیں۔

بہار کے دنوں میں کھلنے والے خوشبودار پھول دو روزہ مہمان بڑی بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن ان کے بغیر زندگی کا گلزار رنگ و بو سے آشنا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی الیکٹرونک میڈیا سے وابستہ فنکاروں کی بے وفائی ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے سکینڈل ان کی بے وفائیاں چسکے لے لے کر بیان کی جاتی ہیں۔ مارلین منرو ہو، ریما ہو، سب اپنے اپنے مقام پر اپنی جان پر کھیل کر آپ کی بے رنگ و بو زندگی میں رنگینیاں لے کر آتے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شہرت کا گلاب کتنی دیر کھلے گا اور کس وقت کوئی نیا چہرہ انہیں پچھاڑ کر گمنامی کے کنوئیں میں پھینک دے گا۔

ہم فقط ان کو دل لگی کا درجہ دیتے ہیں۔ عارضی وقت کٹی کا ذریعہ سمجھتے اور اپنے اخلاق اور کردار کو ان سے بہتر سمجھ کر ایک قسم کے احساسِ برتری میں چلے جاتے ہیں لیکن 1970ء کے لگ بھگ نہ معاشرہ اتنا بے رحم تھا نہ ناظرین اتنے

خودغرض۔ ٹیلی ویژن کی نئی کھیپ سر اٹھا رہی تھی۔ جب خاں صاحب نے ''ایک محبت سو ڈرامے'' شروع کیے تو کئی من موہنے چہرے اور بڑے آرٹسٹ ان کے قریب آ گئے۔

حبیب، فردوس، جمال، قوی، عابد علی، خیام، افضال، آفتاب احمد سب نہ صرف بڑے نام تھے۔ بڑے لوگ بھی تھے۔

عظمیٰ گیلانی، روحی بانو، خورشید شاہد، منور توفیق اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔

الیکٹرونک میڈیا ابھی پوجا پاٹ جیسی متبرک چیز تھی۔

اس میڈیا کو ابھی سٹارٹ ہونے میں دیر تھی۔ ہم لوگ 75۔ جی میں رہتے تھے۔ پتہ نہیں خاں صاحب کو کیا سوچ کر ''دھوپ سائے'' فلم بنانے کی سوجھی۔ اس کا یونٹ خود ایک معرکے کی چیز تھا۔ فلم کی ریکارڈنگ خواجہ جی نے کی۔ فوٹوگرافر فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن کسی نے بھی خاں صاحب سے ایک پیسے کی ڈیمانڈ نہ کی۔ گانے منیر نیازی نے لکھے اور اس کی دھنیں طفیل نیازی نے کمپوز کیں۔ منیر بھائی کی ایک نعتیہ نظم آج بھی بہت شہرت کی حامل ہے جس کا مکھڑا تھا

شامِ شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو

یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

سیٹ کے طور پر ایک پرانی کٹڑی کو معمولی سے کرائے پر لیا گیا۔ خاں صاحب دفتر سے گھر آتے۔ پھر مجھے اور بچوں کو کار میں لوڈ کرتے اور کٹڑی پہنچتے۔ میں حیران تھی کہ وہ ہمیں کیوں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک روز خود ہی کہنے لگے۔

''کبھی کبھی اردو بورڈ میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ شوٹنگ رک نہیں سکتی۔ میری جگہ تم ڈائریکٹ کر لیا کرو۔''

''دھوپ سائے'' کی مختصر کہانی یہ تھی کہ کٹڑی میں سوسائٹی کے راندہ درگاہ لوگ رہتے تھے۔ ان میں ایک طوائف اور ایک شرابی تھا۔ تائب طوائف (منور توفیق) بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھی۔ اسی کٹڑی میں ایک بدکار دو نمبری مصلی دوائیاں بیچنے والے (آفتاب) کا دفتر تھا۔

بچوں کی نفری جب پوری نہ ہوتی تو میرے تینوں بچے اور ان کے دوست عدنان قدیر سے گنتی پوری کر لی جاتی۔

جس روز منور بچوں کے ساتھ ایک بھاری درخت کے تلے ایک تھڑے پر بیٹھی تھی، شرابی (قوی) گا رہا تھا۔ ''شام شہر ہول'' سارا ہنگامہ ہوا۔ مصلی ادویات بنانے والے (آفتاب) نے طوائف کی بے عزتی کی اور شرابی (قوی) طوائف کو لے کر رخصت ہو گیا۔ یہاں ایک معرکے کا جملہ تھا جب قوی کہتا ہے:

''چل آپا زہرہ۔ ہم اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔''

خاں صاحب کی جملہ تحریروں میں ایک بات انتباہ کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ وہ بار بار پاکستانی معاشرے کو Warn کرتے تھے کہ دوسروں سے نفرت پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا کر کے اسے طبقوں میں بانٹ دے گی۔ پھر اس میں یکجہتی اور قومی مفاد کی پنیری لگانا مشکل ہو گی۔ جیو اور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر کے ہی بھانت بھانت کے لوگ اکٹھے رہ سکتے ہیں اور ایک منزل کے راہی بن سکتے ہیں۔

اسی فلم میں ایک بدنصیب لڑکی کے منہ سے خاں صاحب نے ایک ایسا جملہ کہلوایا جو بعد میں کئی مقامات پر انہوں نے خاص طور پر استعمال کیا۔ یہ بدنصیب لڑکی جو شرابی سے محبت کرتی ہے، تندور چلاتی ہے اور آرزو رکھتی ہے کہ شرابی شراب پینا چھوڑ دے۔ جب شرابی کٹڑی سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہتی ہے۔

''پہلے میں کہتی تھی کہ وہ پینا چھوڑ دے۔ اب میں کہتی ہوں وہ چاہے پیتا رہے لیکن یہیں رہے۔''

کچھ دیر بعد اپنے آپ کو سمجھانے کے انداز میں دلاسہ دیتی ہوئی کہتی ہے:

''جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنی محبت یہیں کہیں چھوڑ جاتے ہیں۔''

یہ جملہ اب مجھ پر صادق آتا ہے۔ خاں صاحب تو چلے گئے لیکن اپنی محبت یہیں کہیں آپ لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں جس کی بدولت زندگی قابل برداشت ہے۔

یہاں سے قوی، خاں صاحب کا ہم سفر بن گیا۔ قوی اور اس کی اہلیہ ناہید ابھی تک مجھے بڑی محبت سے ملتے رہتے ہیں اور ان کی محبت کا مجھے بڑا سہارا ہے۔ قوی چونکہ پٹھان آدمی ہے اس لیے اس کی غیرت وفاداری کی بنیاد بن گئی۔ ابھی تک اس کی نیازمندی میں کمی نہیں آئی۔

''دھوپ سائے'' سینما گھر میں ایک ہفتہ بھی نہ چلی، لیکن خاں صاحب اور میرے درمیان کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے مایوسی کی بُو آتی ہو۔ خاں صاحب زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور وطیرہ جانتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شکست آخری حرف نہیں۔ خم ٹھونک کر یا علی کا نعرہ لگا کر چیلنج قبول کرنے سے زندگی کی بازی جیتی جا سکتی ہے۔

خاں صاحب کی زیادہ توجہ جب فلم کے تجربے کے بعد ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف مبذول ہوگئی تو ''ایک محبت سو ڈرامے'' سے کھیل گرم ہوا۔ خاں صاحب پروڈکشن میں تو شامل نہ ہوئے لیکن ڈرامے کی ریڈنگ ضرور کراتے۔ ڈرامے کی کاسٹ ان کے گرد سکرپٹ ہاتھ میں لیے ریہرسل کرتی۔ وہ لب و لہجہ اور تلفظ ٹھیک کراتے۔ خود پڑھ کر سمجھاتے کہ Stress اور Pause کیا معنی رکھتے ہیں۔ جس طرح مکالموں کی ادائیگی میں وقف کی اہمیت ہے۔ کس مقام پر کتنی دیر توقف کرنا اہم ہے، ایسے ہی خاں صاحب اپنی کاسٹ کو رُکنے، تیز بولنے اور آواز گرا کر یا بلند کرنے کے مقامات سمجھاتے۔ یہ ریڈنگ ایکٹروں میں یگانگت اور مفاہمت کی ایسی فضا قائم کر دیتی کہ مسابقت کی جگہ پر معاونت سے کام سہولت سے ہو جاتا۔

پھر میں نے خاں صاحب کی نقل میں کھیل لکھنے شروع کر دیے۔ میرا ڈرامے سے لگاؤ اس وقت سے تھا جب میں انارکلی ڈرامہ مشکل سے پڑھ سکتی تھی۔ اس ڈرامے سے میرا قلبی لگاؤ 60۔ فیروز پور روڈ پر زندہ تعبیر بن چکا تھا۔ اب اتنا بڑا چانس ملا تو میں نے ٹی وی اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ ''دھوپ جلی'' اور ''خانہ بدوش'' لکھ کر مجھے محمود گیلانی، عابد علی اور حبیب کی شعبدہ بازی دیکھنے کا علم ہوا۔ تب ایکٹر لباس نہیں بدلتے تھے۔ اپنے اندر ایک نئے کردار کو بیدار کر اس کی طرح سوچنے، عمل کرنے اور اٹھنے بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

میرے ڈرامے ''زرد گلاب'' میں روحی بانو اور عابد علی کے کام کو ابھی بھی لوگ سراہتے ہیں۔ ''رات گئے'' میں فردوس جمال نے جو معرکہ سر کیا اسے لوگ نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ قوی خاں، بندیا، راحت کاظمی، ثروت عتیق، قمر

...میر، ساحرہ کاظمی، طلعت حسین، سکندر شاہین ایک پوری کھیپ ایکٹروں کی ایسی ہے جس کے ناموں سے بھی آج کی پود ...تف نہیں۔

خاں صاحب نے تو ٹیلی ویژن کے لیے اتنے فنکاروں کو روشناس کیا اور خود ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئے کہ ...س کتاب میں ان سب کا محاسبہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو کسی ایسے ٹی وی کے نامہ نگار کو زحمت کرنا پڑے گی جو ٹیلی ...ژن کی تاریخ مرتب کر رہا ہو۔ یہاں تو ''ایک محبت سو ڈرامے'' ''توتا کہانی'' ''اور ڈرامے'' ''من چلے کا سودا'' کو بھی ...رانہ نظر سے دکھایا نہیں جا سکتا۔ آخر برسوں کا سفر چند صفحوں میں کیونکر قید کیا جا سکتا ہے۔

حنا بابر علی

داستان سرائے کے کالے پھاٹک پر ان دنوں نہ رات کو تالا لگتا تھا نہ دن ہی کو کبھی اسے مقفل کیا جاتا۔ لوگ ...روک ٹوک اندر چلے آتے اور ہم دونوں اپنی نویافت شخصی شیخی کے تحت انہیں بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ اس وہم کا یہ ...م تھا کہ ہم اپنے اندر بھی اسی طرح کے گھیرے میں تھے کہ ہم کس قدر نیک، اچھے اور مددگار قسم کے بندے ہیں۔

ایک دن ہمارے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ میں اس وقت جھاڑن ہاتھ میں لے کر صوفے جھاڑنے میں ...صروف تھی۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے بھڑکتے سرخ رنگ کی پینٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہ سر پر سکارف تھا نہ گلے ...میں دوپٹہ۔ ایسی شعلہ رو لڑکیاں تب شاذ ہی ملتی تھیں۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور آنے کی وجہ تسمیہ پوچھی۔

حنا بابر علی نے کہا۔۔۔۔ ''Ann Arbor میں پڑھتی ہوں۔''

''وہ کہاں ہے بھئی؟''

''امریکہ کی ایک ریاست Seatle ہے۔ اس میں یہ کالج ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو لیکن اس کالج میں Co-educatio... نہیں ہے۔''

''اور تم کیا پڑھ رہی ہو؟''

''میں انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔''

اس نے میرے سامنے دھرے میز پر ایک کہانی رکھ دی۔ اس کہانی کا نام The Heed Seekers تھا۔

''یہ میرے Thesis کا حصہ ہے۔ میں نے آپ کی کہانی ''توجہ کی طالب'' پڑھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے ...سپروائزر نے اسے approve کر دیا ہے لیکن جب تک آپ تصدیق نہ کریں گی، یہ آگے بھیجی نہیں جا سکتی۔''

گرمیوں کے دن، جولائی کا مہینہ، یہ اس رابطے کا آغاز تھا جو سیدھی لائن بن کر ہمیں یہاں تک لے آیا ہے۔

اس پینٹ شرٹ میں ملبوس لڑکی میں عجب قسم کی انکساری اور عاجزی تھی۔ وہ جب اس کا جی چاہتا منہ اٹھا کر میرے ...پاس آ جاتی۔ تب مجھے اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کا کچھ علم نہ تھا۔ نہ چھان بین ہی کی عادت میں مبتلا تھی۔ میں نے اس سے کبھی نہ پوچھا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے۔ اس کا حسب نسب کیا ہے اور اسے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ گھر کا فرد ہی بن گئی۔

حنا بابر علی میں ایک خوبی اور بھی انکساری کے علاوہ تھی۔ وہ بہت Helpful تھی۔ کبھی صوفے پر چڑھ کر یوں بیٹھتی کہ اس کی دیکھ بھال اور خدمت کا بوجھ میزبان پر پڑ جائے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوتی وہ فوراً یہ کام میرے ہاتھوں سے لے لیتی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک روز میں فرش پر ٹاکی پھیر رہی تھی۔ اس نے فوراً گیلی ٹاکی میرے ہاتھ سے پکڑ لی اور فرش کو آئینہ کر دیا۔

پھر وہ صبح آنے لگی۔ انیس اس وقت یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں اس کا ناشتہ بنانے میں مشغول ہوتی کرتی۔ حنا کے آنے پر وہ فوراً انڈے میرے ہاتھ سے لیتی اور ایسا آملیٹ تیار کرتی کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔

پھر بسا اوقات وہ دوپہر کے وقت جیونی بہن کو اچھی اچھی ترکیبوں سے نئے نئے کھانے پکا کر دکھاتی۔ ہم سب اس طرح وہ کھانے کھاتے گویا کسی ریستوران میں بیٹھے ہوں۔ آج تک اس کے گھر سے پکے ہوئے دہی بڑے، بگھارے بینگن اور ان گنت سوغاتیں آتی رہتی ہیں۔ میں انہیں کبھی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرتی کیونکہ مجھے علم ہے یہ سلسلہ جاری ہے، کبھی لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی۔

کہانی سے میں تو مطمئن تھی لیکن وہ کبھی ترجمے سے مطمئن نہ ہوئی۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ ترجمہ انیق کو دکھایا۔ منظور قادر پھر باقاعدگی سے افسانہ دیکھنے آتے رہے۔ وہ چونکہ سکالر آدمی تھے، اس لیے انہوں نے کئی جگہ ترجمے کو اکھاڑ پچھاڑ دیا۔ دوستی کے ان مراحل سے گزرتے بالآخر مجھے علم ہوا کہ حنا بابر علی، سید بابر علی کی بیٹی ہے۔ میں نے بہت مدت بعد پیکجز کی فیکٹری کا بیرونی حصہ اور اس کے سامنے لگے ہوئے ان گنت ٹرک دیکھے جن پر Castle Rose، Petal اور پیکیجز کی دیگر مصنوعات مارکیٹ کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ اندر جانے کا اتفاق مجھے صرف ایک بار ہوا۔ خاں صاحب اور میں بابر علی صاحب کے پاس انیس خاں کی نوکری کے سلسلے میں گئے۔

حنا سے بہت پہلے مجھ سے منو بیگم اور واجد مل چکے تھے۔ منو کا اصل نام سائرہ تھا لیکن مجھے اس پیاری سی لڑکی کا اصلی نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پتہ نہیں واجد کب اور کہاں ملے لیکن رفتہ رفتہ وہ باقاعدگی سے ہمارے گھر آنے لگے۔

منو عموماً اس کالے گوتھڑے پر بیٹھ جاتی جو اوپر خاں صاحب کی لائبریری کی طرف جاتا تھا۔ واجد خاں صاحب کے ساتھ عموماً باورچی خانے میں بیٹھتا۔ یہ باورچی خانہ نہ جانے کیوں ہمیشہ ہمارے ڈرائنگ روم کا رول ادا کرتا رہا۔

ایک روز وہ اپنے ساتھ ایک لوہے کی کڑاہی مرغی اور کچھ مسالے لے کر آ گیا اور کہنے لگا کہ آج میں آپ کے لیے کڑاہی پکاؤں گا۔ برگر اور پیزا (Pizza) تو دور کی بات ہے ابھی کڑاہی، تکے اور توے کی ٹکیاں چانپیں بھی مڈل کلاس میں عام نہ ہوئی تھیں۔ اب کڑاہی تیار ہوئی۔ نان منگوائے گئے۔ ضیافت کا سا سماں بن گیا۔

بہت بعد میں جب حنا بابر علی مستقل طور پر ہمارے گھر آنے جانے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ منو بیگم اور واجد علی دراصل حنا کے رشتہ دار ہیں اور وہ بھی بہت قریبی یعنی سید بابر علی کے بھائی کی اولاد۔

حنا سے ملنے ملانے کے سلسلے میں میری ملاقاتیں پروین بابر علی سے ہونے لگیں۔ حنا کی والدہ پروین نے مجھے اپنے حسن سے اپنی فراخی اور وسعت قلب سے ہمیشہ disarm کیا۔ وہ بغیر کسی جھجک یا حجاب کے مجھے اپنا ازلی دوست

...کھنے لگیں۔ پرائیویٹ خطوط، واقعات، دوستوں کی باتیں، رشتہ داروں کا زائچہ ان ہی سے پتہ چلا۔

حنا کے دادا مراتب علی شاہ تھے جو ایک بڑے ہی سیلف میڈ آدمی تھے۔ انہوں نے سائیکلوں سے اپنا سفر شروع ...کر کے پیکجز کی بنیاد رکھی تھی۔ ان ہی کی رواداری اور عاجزی کے جرثومے (Genes) ابھی تک خاندان میں چلے آ رہے ...ہیں۔ شالیمار ہسپتال جو غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے اور بابر علی ٹرسٹ جو نادار لوگوں کی دادرسی میں ثانی نہیں، اس ...کی یاد زندہ کرتے ہیں جو جاتے وقت اپنی وراثت میں انہیں شامل کر گئے لیکن میں نے کبھی حنا کے لبوں سے نہ تو دادا کا ...تذکرہ سنا نہ ان مخیّر اداروں ہی کا۔ وہ تو عجب طور پر ادب سے وابستہ تھی اور ادیبوں کی پوجا میں مصروف رہتی تھی۔

مجھ سے بھی زیادہ اس کی وابستگی فیض صاحب سے رہی۔ فیض صاحب نے تو بڑی جانکاری سے فیض صاحب ...کے فیض کو اپنی ذات میں چار چاند لگانے کے لیے استعمال کر لیا لیکن حنا قدرے احمق ہے۔ اس نے میرے سوائے شاید ...ہی تعلق خاطر کا ذکر نہ کیا جو اسے فیض صاحب سے تھا۔

وہ جب امریکہ میں رہتی تھی۔ فیض کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ وہ زبانی اسے اپنی نظمیں ...سناتے۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے نوشِ جاں فرماتے۔ اس کی اردو کی نظمیں سنتے۔ غرض یہ کہ یہ تعلق ایک عرصہ تک قائم ...رہا لیکن حنا اس تعلق سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔

چلتے چلاتے اور ہوتے ہواتے وہ وقت آ گیا جب پروین کو بیٹی کی گھر بسائی کی فکر صبح و شام ستانے لگی۔ حنا ہر ...معاملے میں سعادت مند تھی، لیکن شادی کے معاملے میں وہ الف ہو جاتی اور کسی رشتے پر رضامند نہ ہوتی۔ پروین اسے ...سیدوں میں بلکہ بہت قریبی رشتہ داروں میں بیاہنا چاہتی تھی۔ حنا مغربی تعلیم کے زیر اثر ان باتوں کو فروعی اور غیر ضروری ...سمجھتی تھی۔ بیٹی کو منانے کا مرحلہ کافی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ ایک روز پروین بابر علی بھاگم بھاگ میرے پاس آئیں۔

''بانو آپا۔ میرے ساتھ گھر چلیے۔''

''کیا معنی؟ کیوں؟''

''بس جی Now or never۔''

میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تشفی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن ہوا کیا ہے؟''

''آج مجھے فیصل امام کا رشتہ آیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ، شائستہ اور بہت محنتی آدمی ہے۔ پہلے تو حنا انکار کرتی رہی۔ پھر ...پستول لے کر کمرے میں چلی گئی۔ میں کھٹکھٹاتی رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آتا؟''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''اس سے اچھا مل نہیں سکتا بانو آپا...... لیکن...... وہ کسی لمحے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھ سکتی ہے۔ ابھی چلیں ابھی۔''

ہم دونوں اسی وقت تیز رفتار گاڑی میں گھر پہنچے۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

میں ذرا سی خوفزدہ ہو گئی۔ ''حنا! میری بات سنو۔ دروازہ مت کھولنا لیکن بات سن لو۔''

مجھے لگا جیسے وہ دروازے کے پاس لگی متوجہ ہے۔

''سنو تم میرے گھر رات دن دوپہر جب بھی آتی ہو میرے دروازے تم پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ میں نے تمہیں اپنی ادبی اولاد سمجھا ہے۔ اگر آج تم نے میرے لیے دروازہ نہ کھولا تو شاید داستان سرائے کے دروازے تم پر بند ہو جائیں ہمیشہ کے لیے۔''

میں نے پروین کو اشارہ کیا کہ وہ غائب ہو جائیں۔

''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

''کوئی نہیں، دروازہ کھولو پلیز۔''

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ حنا نے دائیں بائیں جھانکا اور پھر مجھے اندر بلا کر دروازہ مقفل کیا۔

پستول لکھنے والی میز پر پڑی تھی۔

''مجھے کہیں بٹھاؤ گی کہ کھڑے رہنے کا حکم ہے۔''

اس نے جلدی سے ڈیسک کی کرسی باہر نکال دی۔ اب میرے تحمل کا ٹیسٹ تھا۔

''مجھے بتاؤ، کیا تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''کوئی خاص چوائس تو نہیں لیکن میں اپنی ماں کی بات ماننا نہیں چاہتی۔''

''یعنی تمہیں فیصل پر اعتراض نہیں۔ اپنی ماں کے انگوٹھے پر غصہ ہے جو تمہیں دبا رہا ہے۔''

''میری ماں ایسی ہی ہے بانو آپا۔''

''سنو حنا! میں نے آج تک تم سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ تم مجھے اپنی Foster Mother بھی کہتی ہو... ایک فیصلہ میری فرمائش پر کر سکتی ہو؟''

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

''تم فیصل سے شادی کر لو۔ وہ تعلیم یافتہ، شریف الطبع، اچھے کردار کا مالک ہے۔ اگر کہیں باہر شادی کی... بالکل اجنبی لوگوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ شاید وہ تمہاری سگریٹوں کا بوجھ بھی برداشت نہ کر سکیں۔ میری خاطر حنا... کے لیے یہ سہرا میرے سر باندھ دو...... کچھ تو میں پروین کو بھی تحفے میں دے سکوں!''

حنا کی شادی بخیر و عافیت فیصل امام سے ہو گئی۔

فیصل نے شادی کے بعد خانیوال میں مبارک ڈیری کھولی اور مبارک دودھ کو مارکیٹ کرنے لگا۔ کچھ دیر... اس نے خانیوال کونونٹ میں پڑھانے کی کوشش کی۔ حنا خانیوال چلی گئی اور بڑے سادہ سے گھر میں نہایت معمولی فرنیچر کے ساتھ متاہل زندگی شروع کی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ان دو کمروں کے گھر میں اس کے پاس صوفے تک نہ تھے... نے خالی کھوکھے بچھا کر ان کو تکیوں سے سجا لیا اور کوئی پروا نہ کی۔

لیکن فیصل بنیادی طور پر زمینوں اور سیاست سے وابستہ تھا۔ اس کا دل بزنس کی دلدل میں کبھی نہ پھنسا... دونوں لاہور آ گئے۔ فیصل امام نے کچھ عرصہ اپنے سسر کے کالج Lums میں بھی پڑھانے کی کوشش کی لیکن دل سیاست میں اٹکا رہا۔ پروین نے حنا کو ایک بہت خوبصورت عالیشان بنگلہ بنوا دیا۔ فیصل نے لاہور کی بے جان گہما گہمی کا حصہ...

...شش کی لیکن بے سود۔

وہ اپنے گاؤں میں لوٹ گیا جہاں اس کے پیارے مزارعے، مراثی، مٹھی چاپی کرنے والے مالشیے، ...ئے تندوروں پر روٹیاں پکانے والیاں، اندر باہر آنے جانے والوں کا ایک میلہ تھا۔ وہ ایک طرح سے حنا کا ...رنگ ہر بند بن گیا۔ آیا چند دن رہا اور پھر واپس جہانیاں۔ دونوں نے اس وضع کی شادی سے برضا و رغبت ...سمجھوتہ کرلیا۔

یوں سمجھیے کہ ہر خوبی مکمل طور پر خوبی نہیں ہوتی۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے خرابی ضرور در آتی ہے اور ہر خرابی میں ...پہلو ضرور ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے اندر سے فلاح اور بہتری کے لیے راستہ جاتا ہے۔ حنا نے پیکیجز میں نوکری کرلی۔ اب ...مصروف رہنے لگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نظمیں لکھنے کا وقت بھی زیادہ ملنے لگا۔

فیصل امام کے بڑے بھائی فخر امام اور عابدہ حسین بڑے فعال سیاستدان ہیں اور عابدہ جسے گھر والے ''چندی'' ...کہتے ہیں، نہ صرف چاند صورت ہے لیکن حنا کی طرح کچھ اندر سے بھولی بھولی اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی ہے۔ میں ...سے دو چار مرتبہ ملی ہوں اور مجھے تعجب رہا ہے کہ سیاست تو ترقی پذیر ممالک میں خرانٹ لوگوں کا پروفیشن ہے، پھر عابدہ ...یہاں کہاں؟

فخر امام اور عابدہ کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ فیصل ہمہ وقت سیاستدان بن جائے لیکن وہ ابھی زمینوں اور ...سیاست میں بٹا ہوا ہے لیکن حنا کو عجیب طرح سے سکون کا خزانہ مل گیا ہے۔

انسان کو غمِ تنہائی بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس غم کو اپنے لیے سونا بنا لیتے ہیں۔ کچھ اس آشوب آگہی کو ...ب کے حوالے کرکے وقت کو رائیگاں گزار دیتے ہیں۔ حنا ہولے ہولے اس طرف لو لگانے میں مصروف ہوگئی ہے جو ...ب کو سکون اور اطمینان دیتا ہے۔ ذکر فکر کی دولت سے مالا مال ہو کر اس کی سوچ یکسر بدل گئی۔ پہلے چہرے پر ملال کے ...ثرات تھے، ہولے ہولے ان کی جگہ عجب قسم کی روحانی طراوت نظر آنے لگی۔ نظموں کا رخ بھی یکسر بدل گیا۔ اسے نہ ...پڑھنے والوں کی اکثریت ڈرا سکتی تھی نہ اس بات کی پرواہی تھی کہ پڑھنے والا اس کی نظموں کو پڑھ کر دل سے لگاتا ہے کہ ...ردی میں بیچ دیتا ہے۔

اس کے میل جول میں بھی فرق آنے لگا۔ وہ بیکن ہاؤس کی انیسہ انجم سے رابطہ بڑھانے لگی جو مغرب میں جا کر ...اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے سمپوزیم کر رہی تھی۔ یہاں بھی جب وہ ہوتی تو گپ شپ اور غیبت سے پرہیز کرتی اور ...دا کی بندی بن کر زندگی بسر کرتی۔

اب یہاں پہنچ کر ایک اور فیصلہ حنا کو کرنا پڑا۔ اس نے پبلشرز کے پیچھے بھاگنا، ان کی تجویزیں ماننا یکدم ختم کر ...یا اور اپنی کتابیں چھپانے کا عزم کر لیا۔ اب پیکیجز سے اس کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ رہی ہیں۔ وہ اپنا اردو کلام بھی ...چھپنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی ان نظموں پر اسلم کولسری نظر ثانی کر چکے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اردو قاری ان نظموں کو ...پسند کریں گے۔

محترمہ نصرت بی بی

خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں محمد یحیٰ خاں کے بعد نصرت بی بی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ لوگ ہمت اور وقار کے ساتھ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ زندگی میں کبھی ہار نہیں مانتے۔ ایسا ہی گھرانہ نصرت بی بی کا ہے لیکن شروع میں میرا یہ خیال نہ تھا۔ ان دنوں میں اس گھرانے سے واقف نہ تھی۔

ایک درمیانی عمر کی خاتون سر پر سفید دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ڈرائنگ روم میں بیٹھی نظر آتی۔ وہ پیر خانے کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ خاں صاحب کو دل سے اس نے بابا جی سمجھ لیا تھا۔ خاں صاحب ہمیشہ صوفے پر ہوتے نصرت فرش پر ان کے قدموں میں ڈھیری سی ہوئی لگتی۔ کبھی خاں صاحب کے پاؤں دبا رہی ہوتی۔ کبھی ہاتھ چومتی نظر آتی۔ کبھی آنکھوں سے ان ہاتھوں کو مس کرتی۔ مجھے یہ منظر کبھی سکھ نہ پہنچا سکا۔ میرا خیال تھا کہ خاں صاحب یوں اپنی آرتی کر شرک اور تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور پوجا کرنے والے کی انا کو مجروح کرتے ہیں۔ تب مجھے نہ استاد کے مقام کا علم تھا جو آپ کو جہالت سے نکالتا ہے نہ ڈیروں کی تربیت ہی کی خبر تھی۔

شاید خاں صاحب سمجھتے تھے کہ تصوف محض اللہ کے حضور عاجزی اور انکساری کا درس سکھانے کا مکتب ہے۔ لوگ مرشد کے حضور اپنا آپ عاجزی اور انکساری سے پیش کر کے ماننے والوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے لیے اللہ کے سامنے اپنا وجود پیش کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح وہ شرک اور تکبر جیسے ناقابل معافی گناہوں سے بچ جاتے ہیں۔

انسان فرد کے طور پر آزادی کا خواہاں ہے لیکن گروہی اعتبار سے نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی تشکیل اس طور پر ہوتی ہے کہ لوگ معاشرے میں رہ کر وہی رنگ پکڑتے ہیں جو وہ دوسروں میں دیکھتے ہیں۔ ڈیروں کی تعلیم کا اہم ہے کہ یہاں ماننے والوں کی خصوصی تربیت کی جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے علم ہوا کہ دید اور شنید میں بڑا فرق تھا۔ نصرت عقیدت کے جس مقام پر تھی، وہاں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ نصرت بیگم اپنے خاندان کی بھلائی چاہتی تھی اور اسی لیے وہ دعا کے سلسلے میں محتاج تھی۔

کچھ عرصہ بعد جب نصرت بی بی ریٹائرڈ ہوئیں تو خاں صاحب نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس رقم سے گھر خریدے اور بچوں کو اس پیسے کا علم نہ ہونے دیں کیونکہ بچے اپنی ضرورتوں کا اتنا جال پھیلا دیتے ہیں کہ والدین مجبور ہو جاتے ہیں۔ نصرت کے شوہر نے غالباً ساری عمر کچھ اس کی خاطر خواہ کفالت نہ کی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مطمئن نہ تھی۔ اس لیے جب ریٹائر ہوئیں تو انہوں نے بڑی عقلمندی سے خاں صاحب کے مشورے کے مطابق ایک گھر خرید لیا جس میں اپنے بچے بسا لیے۔ بی بی نصرت کے سارے بچے ذہین اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایسے گھرانے میں جہاں ذہانت ہو اچھا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا بڑا اہم ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ چودہ پندرہ لاکھ روپیہ ان ہی اللّلوں تللّوں میں اڑ جاتا۔ نصرت بی بی کو خاں صاحب کے مشورے پر چل کر اچھا راستہ مل گیا اور وہ گھونسلے میں اپنے چنگی پوتوں کے ساتھ

sett... کر گئی۔

ہولے ہولے نصرت بیگم کے بچے بھی گھر آنے لگے۔ سب سے بڑی بیٹی رابعہ بے حد ذہین اور شدھ آرٹسٹ ...۔ وہ N.C.A. میں پڑھ بھی رہی تھی اور پارٹ ٹائم کچھ ٹیچنگ بھی کر رہی تھی۔ جب اشیر خاں نے اپنی ایجنسی Advertis... بونا سیرا شروع کی تو اس کے سارے سیٹ رابعہ ہی کے ڈیزائن کیے ہوئے تھے اور دیکھنے والے اس کی اور ...س کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے خاں صاحب کے دعائیہ سلوگن ''اللہ ...پ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے'' اس دعا کی اسے بہت خوبصورت تصویر بنا کر ...ں ٹانگ دی جو دیوار صوفے کے پشت پر تھی۔

رابعہ کا شوہر انجینئر تھا اور خانیوال میں رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رابعہ خانیوال میں اپنے سسرال میں رہے۔ ...ہ جانتی تھی کہ لاہور میں اس کو ترقی کے مقامات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اشرف نے زیادہ اصرار نہ کیا اور رابعہ کو نصرت بی بی ...ے قریبی لین میں مکان خرید دیا۔ اب رابعہ ہفتہ یا اتوار ملتان چلی جاتی۔ اب رابعہ لندن میں پی ایچ۔ڈی کرنے کا سوچ ...ی ہے۔ اللہ بہتر کرے۔ اس کی تصویر اب بھی دیوار کی زینت ہے۔ سامنے بیٹھنے والا تو چلا گیا لیکن تصویر ان کی یاد دلاتی ...تی ہے۔

نصرت بی بی کی منجھلی بیٹی عائشہ سے جب میں ملی، اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ ...۔ اس کا شوہر ٹھیک ٹھاک حیدرآباد میں رہتا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ عائشہ حیدرآباد چل کر بسے لیکن ترقی کرنے ...ں میں اپنی آزادی کی جو چنگاری سلگتی ہے وہ اسے پابندیوں میں رہنے کا راستہ نہیں دکھاتی۔ بہت منت سماجت کر کے ...ے حیدرآباد بھیجا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اپنے میاں سمیت لاہور آ گئی اور ماں کے ساتھ رہنے لگی لیکن اس کے میاں کو کچھ ...ی کے مسائل تھے۔ وہ پھر حیدرآباد چلا گیا اور عائشہ واپس میاں کے پاس رہنے لگی۔

خیر گاڑی چلتی ہی رہتی ہے۔ اونچ نیچ زندگی کے رنگ ہیں۔ اپنی اپنی عقل، فیصلے اور تجویز کے مطابق ہر انسان ...ں کے حل تلاش کرتا ہے اور اسی لیے ندزندگی کی رنگارنگی میں فرق آتا ہے۔ اللہ کا ارتقائی نظام چلتا رہتا ہے۔

تیسری بیٹی سائرہ مظلوم ہے لیکن مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ہار ماننے والی نہیں۔ پہلے تو سائرہ نے اپنے آپ کو ...ھ کے بچوں کے لیے وقف کر دیا لیکن اس کے لیے اس قدر ایثار بوجھ بننے لگا۔ آخر اسے اپنے مستقبل کے لیے بھی کچھ ...چنا تھا۔ سائرہ تھوڑی سی موٹی ہے اور اسی موٹاپے کو کم کرنے کے لیے وہ اچھرے سے ماڈل ٹاؤن آتی ہے اور وہاں سے ...میرے پاس آ جاتی ہے۔ اس کی شادی ابھی سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ بھی دعا برکت کے لیے یہاں آتی رہتی ہے۔ اسے ...یں کہ تیر بہدف دعائیں کرنے والا تو کبھی کا رخصت ہو گیا۔

نصرت کے دو بیٹے لندن میں ہیں اور دونوں چھوٹے بھی لندن اڑ جانے کے لیے ''بھرن پھسن'' بیٹھے ہیں۔ ...سبق ان کی زندگی دیکھ کر ضرور حاصل ہوتا ہے کہ زندگی سے ہارتا وہی ہے جو اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہی ...ے جیت جاتے ہیں، جو خود اعتمادی اور خوشی سے چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ واہ نصرت بی بی واہ!

چہار درویش

داستان سرائے کے لان میں اُگے ہوئے سندری کے درخت پر بھانت بھانت کے پرندے آ کر بیٹھتے۔ کبھی
کبھی گھونسلے بناتے اور اپنی اپنی مقررہ رُت میں چلے جاتے۔ گو مفتی جی مجھ سے ہمیشہ ناراض ہوتے تھے کہ تم اشفاق کو
چھتنار درخت کہہ کر اس کو بہت زیادہ مان دیتی ہو لیکن یقین جانیے کہ وہ واقعی ایک ایسا شاخوں بھرا درخت تھے جن پر لوگ
آ کر بیٹھتے، اپنے اپنے حصے کی برکتوں کا چوگا کھاتے اور اڑ جاتے۔ کبھی کبھی ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوتی۔ پھر کبھی یکجا بیٹھنے
والے باہم دوست بن جاتے اور آج ان کے جانے کے بعد بھی ان کا دوستانہ نہیں ٹوٹا۔

مجھے معلوم نہیں کہ چہار درویش علیحدہ علیحدہ اشفاق صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے کہ پہلے سے ان کا دوستانہ
تھا۔ میں اس طرح کی کنسوئیاں لینے کی عادی نہ تھی۔ گھر کے مددگار لوگوں سے پتہ چلتا کہ چار نوجوان خاں صاحب کے
پاس اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

ایک روز خاں صاحب اندر آئے کہنے لگے۔ ''قدسیہ! اندر کھانا نہ بھجوانا۔ میں درویشوں کے ساتھ باہر جا رہا
ہوں۔''

میں نے سوچا لمبی لمبی سفید داڑھیوں والے سروں پر ہیر ٹوپیاں پھنسائے، ٹخنوں سے اونچے چوغے پہنے ہوں
گے۔ ایک مدت تک میں اسی مغالطے میں رہی، لیکن ان کا عمل بابوں جیسا ہی تھا لیکن حلیہ یہ نہ تھا۔

وہ چاروں جب بھی آتے خاں صاحب کو ساتھ لے کر باہر کسی طعام گاہ میں چلے جاتے۔ سردار کے پائے،
اندرونِ شہر کے کباب تکے، نسبت روڈ کی ٹکا ٹک چانپیں اور کھیر، حلوے، دہی بھلّے ان کے علاوہ...... تب ابھی فوڈ سٹریٹ
کا رواج نہ ہوا تھا اور نہ میرا خیال ہے یہ لوگ اسے باقاعدگی سے نوازتے۔

یہ چاروں درویش تعلیم یافتہ تربیت شدہ مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ ان کی جیبوں میں دولت نہ اچھلتی تھی لیکن
انہیں کھانے کھلانے کا شوق تھا اور غالباً وہ خاں صاحب کو مسکین جان کر ان کی ادائے عاجزی و انکساری کے پیشِ نظر
باہر مدعو کرتے رہتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جیسے ان کے بینک اکاؤنٹ مجھے اچانک ملے ویسے ہی یہ عقیدت کا خزانہ بھی
میسر آ گیا۔ چہار درویش مجھ سے چھتنار درخت کی باتیں کرتے۔ داستان سرائے کی خاموشی، اداسی اور بندہ نوازی کا
ذکر کرتے تو دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا۔

خاں صاحب کے وصال کے بعد میں ان سے پہلی بار ملی تو مجھے حیرت ہوئی نہ کسی کے لمبی داڑھی تھی نہ سر پر ٹوپی
اور نہ لمبا چوغہ ہی...... وہ چاروں پروفیسروں کی طرح پینٹ شرٹ پہنتے تھے اور بڑی شستہ زبان بولتے تھے۔ ان چاروں
کے سردار قدوسی صاحب ہیں۔ میری ایک ہی شرط ہوا کرتی ہے کہ پہلے قدوسی صاحب قدم دھریں اور پھر ان کے ساتھی
درویش۔

میں ان کے ساتھ خاں صاحب کی طرح باہر تو نہیں جا سکتی لیکن وہ اپنی روایت قائم رکھتے ہیں۔ کبھی حلوہ کبھی

...ک، کبھی بسکٹ کبھی دوسری نعمتیں ان کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ میں لاکھ منع کرتی ہوں کہ آپ خاں صاحب کے دھوکے میں مجھے آسمان پر نہ چڑھائیں لیکن وہ پتنگ اڑانے کے شوقین ہیں۔ اڑائے چلے جاتے ہیں۔

وہ پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ انہیں آرتی اتارنے کے لیے بت درکار ہے۔ مجھے "ماں جی ماں جی" کہہ کر ...بجتے رہتے ہیں۔ برآمدے میں جوتے اتار، دست بستہ میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ عارف دنیا سے ...کی عقیدت ایک خیالِ خام ہے۔ حسن ظن بھی یہاں کچھ کام نہیں آتا!

ارشد مسعود قدوسی

میں (ارشد مسعود قدوسی) 25 اکتوبر 1959ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اور گریجوایشن گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں داخلہ لیا اور 1983ء میں ایم بی اے (مارکیٹنگ) کیا۔

فیصل آباد اور لاہور کی مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمت اختیار کی جو تاحال جاری ہے۔ اس دوران اپنے ملک پاکستان کے دوسرے شہروں پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ساہیوال، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد اور کراچی میں رہنے کا موقع ملا اور ایکسپورٹ مارکیٹنگ کے سلسلے میں بیرون ملک سنگاپور، کوریا، ہانگ کانگ اور چین کا سفر کرنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔ (اللہ کا کرم ہی ہے جس نے مجھے سود کی تعلیم حاصل کرنے اور سودی نظام ...نے سے بچائے رکھا۔)

شادی 1988ء میں ہوئی۔ اللہ کے کرم سے تین بیٹے (انس مسعود، معز مسعود، طٰہٰ مسعود) ہوئے۔ انس مسعود اے لیول کررہا ہے۔ معز مسعود ایس ای کررہا ہے اور طٰہٰ مسعود حفظ قرآن کے بعد ساتویں کلاس میں ہے۔ ایک اور کرم کہ اسی سال میری شریک حیات نے عالمہ کا کورس مکمل اور امتحان پاس کرلیا ہے۔

متوسط سے بھی کم درجے کے گھرانے سے پیدل لاہور آنے والے کے پاس اب اپنا گھر اور کار بھی ہے۔ اللہ نے اسی لاہور میں بابا اشفاق، ماں جی بانو قدسیہ اور بابا عرفان الحق ملائے تاکہ عاقبت بھی سنور جائے اور اس بیکراں ذات باری تعالیٰ کے کرم ہی کرم جاری ہیں اور میریاں موجاں ای موجاں۔

محمد عامر (ڈاکٹر)

میں (محمد عامر) لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم فیصل آباد سے حاصل کی۔ والد مکرم ڈاکٹر محمد ریاض حسین زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ جنوری 1976ء کو ہمراہ فیملی (والدہ چھوٹی ہمشیرہ اور بھائی) اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوگئے۔ میں بسلسلہ تعلیم میٹرک میں لاہور آگیا۔ F.Sc. لاہور سے کی۔

گریجوایشن (.B.Sc) گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ ماسٹر (.M.Sc) زکریا یونیورسٹی ملتان سے کی۔

بعدازاں ماسٹر ڈگری فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے گریڈ 17 (Class One Officer) سے ملازمت کا آغاز کیا۔ تاحال دوران ملازمت لاہور، ملتان، اسلام آباد پوسٹنگ رہی۔ اس دوران کچھ عرصہ جاپان بھی قیام رہا، جہاں سے اعلیٰ تعلیمی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

2 دسمبر 1993ء لاہور میں شادی ہوئی۔ بیوی راحیلہ عامر مقامی ہسپتال میں ڈاکٹری (.M.B.B.S) کی ملازمت کرتی ہیں۔ ایک بیٹی انعام عائشہ Convent School میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔

ڈاکٹر جہانگیر تمیمی (پنجاب یونیورسٹی) نے باباجی اشفاق صاحب کے پاس بھیجا۔ میری بے چینی کو سکون میسر آ گیا۔ طبیعت ٹھہر گئی اور زندگی بسر کرنے کا ایک نیا رخ متعارف ہوا۔ میں باباجی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے بھٹکے ہوئے گنہگار اور ادنیٰ حیثیت والے کو اپنے پاس جگہ دی اور بے پناہ شفقت سے نوازا۔

''ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔''

''جس نے بندے کا شکر ادا نہیں کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا۔''

(اشفاقیات)

عاصم بخاری

نام: عاصم نذیر بخاری

تاریخ پیدائش: یکم مئی 1959ء

آبائی گاؤں: امیر پور سادات ضلع لودھراں

پیشہ: کاروبار

تعلیم: M.B.A.

شادی شدہ: تین بیٹے (سید غیور احمد۔ سید فرقان احمد۔ سید سرمد احمد) ایک بیٹی (سیدہ فاطمہ زہرا) بڑا بیٹا NUST میں انجینئرنگ کر رہا ہے۔ ایک .F.Sc میں ہے اور دوسرا میٹرک میں۔ بیٹی تیسری کلاس میں ہے۔

بابا کے ساتھ تعلق بہت ہی پرانا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں جب میں شاید میٹرک کر رہا تھا، خط لکھا اور انہوں نے جواب دیا جو کہ آج تک محفوظ ہے اور پھر یہ تعلق آخری وقت تک قائم رہا اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔ زندگی کے سفر میں تمام تر مطلوب رہنمائی، آج بھی اسی طرح میسر ہے جس طرح ان کی حیات میں میسر تھی۔

پروفیسر محمد اعجاز چوہدری

میں نے 1989ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور اس وقت لاہور کے ایک کالج میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اب پی ایچ۔ڈی اکنامکس کے سلسلہ میں تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہوں۔
جون 2005ء میں ایک روحانی شخصیت کے حکم سے شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ عالیہ بھی ایک مقامی کالج میں اسلامیات کی لیکچرر ہیں۔ نومبر 2006ء میں اللہ کے فضل سے ایک بیٹا عطا ہوا جس کا نام محمد علی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے روحانی شخصیات کا قرب حاصل رہا۔ یہی طبعی رجحان اشفاق صاحب تک لے آیا۔ ان کی محفلوں میں زیر تربیت رہا جس کے سحر سے اب نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ خاں صاحب کی تربیت، محبت، شفقت ان کی کسی بھی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی۔

میں نے خاں صاحب کو ''زاویہ'' میں جس زاویہ سے دیکھا وہ مجھے ادبی شخصیت سے زیادہ روحانی طور پر قد آور نظر آئے۔ قاری ان کو ادب میں تلاش کرتا ہے اور میں انہیں روحانیت کے مراتب طے کرتے دیکھتا ہوں۔ دین کو سہل انداز میں پیش کرتے اور عملی زندگیوں میں اس کو لاگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

خاں صاحب کی ہمہ جہت شخصیت، محبت، مساوات، ہمدردی، ایثار اور آسانی کا جو عملی درس دیتی ہے، اس کا احساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت بظاہر تو ہم میں نہیں ہے مگر اس کی گفتگو ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ خاں صاحب کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ ہر کوئی خواص ہوں یا عوام ان کو اپنا محسوس کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اسی سے کرتے ہیں جو ان کے سامنے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مسعود قریشی

ریاض محمود کہتے ہیں کہ خاں صاحب جانتے تھے کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، اسی لیے ڈاکٹر تاج نے جب فاطمہ میموریل ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا تو کچھ کیے بغیر واپس ٹانکے لگا دیئے، لیکن خاں صاحب تشویش پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ بتایا کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، جو نا قابل علاج ہے۔

لیکن ابھی جب آپریشن تک نوبت نہیں آئی تھی، وہ ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور بڑے پُر امید، مثبت رویئے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب اپنی جادو کی پڑیاں لے کر آیا کرتے۔ ان کا کالج علامہ اقبال روڈ کے قریب محمد نگر میں تھا اور خاں صاحب ان سے ملنے ان کے کالج جایا کرتے تھے۔
ایک بار ڈاکٹر مسعود کے کالج میں بڑے دھڑلے کا فنکشن ہوا جس میں خاں صاحب نے صدارت کی اور مجھ پر اضافی مہربانی کے تحت مجھ سے ان طلباء کو ڈگریاں دلوائیں جو 2000ء میں چار سالہ کورس کے بعد پاس ہوئے تھے۔
اب 2007ء ہے۔ خاں صاحب رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر مسعود نے اس گھر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان

کے پوتے ڈاکٹر حامد الیاس مسعود باقاعدگی سے میرا علاج کرتے ہیں۔ میں نے آزمایا ہے کہ جن پر اللہ مہربان ہو اُن پہ خلق کو بھی مکمل مہربانی کے روپ میں بھیج دیتا ہے۔
شاید آپ مجھ سے مختلف رائے رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر طیب (سروسز ہسپتال)

ہر کام کا آغاز ہمیشہ خاں صاحب کرتے تھے اور پھر اپنے تجربے کو کسی Osmosis کے طریقہ سے مجھ تک منتقل کر دیتے تھے۔ 2000ء کے آغاز میں خاں صاحب بار بار آنکھیں ملنے لگتے۔ کبھی عینک اتار کر ایک طرف دھر دیتے اور پڑھنا لکھنا موقوف کر دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کی تشہیر تو کی ہی نہیں تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا۔

''کیوں خاں صاحب! آنکھ میں کچھ تکلیف ہے کیا؟''

''ہاں قدسیہ! بائیں آنکھ سے دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔''

''گھر بیٹھے بیٹھے کیسے پتہ چلے گا کہ آنکھ کو کیا ہے؟''

''ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اتنی خوش فہمی بھی ٹھیک نہیں۔ کل آپ میرے ساتھ سروسز ہسپتال جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''او بھائی مس قوالی...... یہ تیرا کیا سسٹم ہے۔ ادھر کا تا اُدھر لے دوڑے۔'' وہ بولے۔

''بس جی میں تو ایسی ہی ہوں۔ خوشی Play خوشی نا Play''

دوسری صبح قریباً دس بجے ہم سروسز ہسپتال پہنچے۔ سکندر جیسا وفادار ڈرائیور ساتھ تھا۔ وہ انکوائری سے پوچھ کر آیا تو پتہ چلا کہ آئی ڈیپارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اور اس کے انچارج ڈاکٹر طیب ہیں۔

ہم دونوں تھم تھم کر کے اوپر پہنچے۔ تیسری منزل پر ڈاکٹر طیب موجود تھے۔

صاحب رنگت، درمیانہ قد اور جسیم، دلنشین مسکراہٹ۔ خاں صاحب کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''زہے نصیب، زہے نصیب آئیے۔''

ان کا جونیئر ڈاکٹر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے کسی جونیئر کو خاں صاحب کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور خود ٹیسٹ لیا۔

''خاں صاحب! بائیں آنکھ فوراً توجہ چاہتی ہے۔ اگر ذرا بھی غفلت کی گئی تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔''

''آپ کا کوئی کلینک گلبرگ میں بھی ہے؟'' خاں صاحب نے کہا۔

''ناں ناں اشفاق صاحب آپ نے وہاں نہیں آنا۔ وہاں کے ڈاکٹر طیب کمرشل ہیں۔ وہ ایویں کچھ گڑبڑ کر دیں گے۔ یہیں ہسپتال میں آئیے۔ پھر سچی بات تو یہ ہے کہ سروسز کا Equipment Latest ہے۔ اس میں Risk کم ہے۔''

دوسرے دن ہم پھر ہسپتال گئے۔ اس آپریشن کے دوران انیس بیٹا سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہا۔ آپریشن

کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے انتہائی مشکور لوٹے۔ کچھ دن خاں صاحب نے کالی اندھیریاں آنکھوں پر جمائے رکھیں۔ پھر نئی عینک لگی۔ ان کی طبیعت کا پوچھنے ڈاکٹر صاحب گھر آتے رہے۔

لیکن ڈاکٹر طیب کی اصلی مروت خاں صاحب کے جانے کے بعد کھلی۔

آپ کو میں کئی بار بتا چکی ہوں کہ مجھے خاں صاحب کی نقل کی عادت تھی۔ جو کچھ وہ کرتے مجھ پر لازم ہو جاتا کہ میں بھی کروں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میری دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ میں نے دونوں بچوں کو نہ بتایا اور چوری چھپی سروسز ہسپتال پہنچی۔ وہی تیسری منزل پر تیسرا کمرہ۔ مجھے دیکھ کر ایک جونیئر ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنا چاہا لیکن اچانک کہیں سے ڈاکٹر طیب آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جونیئر ڈاکٹر کو منع کر دیا اور خود معائنہ کرنے مشین کے پیچھے گئے۔

''آپا کیا کیا جائے کہ آنکھیں تو دونوں خراب ہیں لیکن آپریشن باری باری ہو گا۔ لکھنے والے کی نظر کام نہ کرے یہ تو واقعی ظلم ہے لیکن یہی زندگی ہے۔ اس کی کوئی منطق نہیں نہ کسی کو اس کی کل ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آپ بروقت پہنچ جائیے گا۔ میں جو کچھ کر سکوں گا ضرور کروں گا۔''

مقررہ وقت پر انیس اور اثیر میرے ساتھ گئے۔ سب کو سفید کوٹ پہنا دیئے گئے۔ ماسک لگائے گئے۔ مجھے مریض کے بستر پر لٹا دیا گیا اور ڈاکٹر طیب نے بڑی پریت سے کامیاب آپریشن کر دیا۔ کارنیا کا لنز بدل دیا گیا۔ مجھ پر دوائیوں کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا۔ ان کا خرچ بھی نہ جانے کس بیٹے نے دیا، مجھے علم نہیں۔

بس کیا کیا جائے۔ زندگی کے جھمیلوں نے مجھے فرصت نہ دی کہ میں دوسری آنکھ کا آپریشن کرواؤں۔ مجھے مجبور کرنے کے لیے دونوں بیٹوں نے ایک روز اصرار کیا کہ اب بہت دیر ہو گئی۔ آپ پلیز ہمت کر کے دوسری آنکھ کا آپریشن کروا لیں۔ ہو سکتا ہے تاخیر سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ انیق چونکہ امریکہ میں تھے، اس لیے وہ فون پر بڑی لجاجت سے مناتے رہے۔

میں ان کی خوشی کی خاطر سر دھر گئی۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر طیب ایک عرصہ سے چھٹی پر ہیں۔ ان کے کلینک پہنچی تو کلینک پر تالہ پڑا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہوئی کہ شاید ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں اور اسی لیے چھٹی پر ہیں۔

گھر ڈھونڈ کر پہنچی تو گھر پر بھی تالہ پڑا تھا۔ ایک مفلوک الحال چوکیدار باہر بیٹھا تھا۔

''بھائی ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ تو بی بی جی دوبئی چلے گئے۔ یہاں تو نہیں آئے دو مہینے سے۔''

چلیے دوبئی والوں کی قسمت کھلی۔

اب 2007ء ہے۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ابھی نہیں ہوا۔ سوچتی ہوں کہ آپریشن کرواؤں یا یونہی چھوڑ دوں۔ شاید حسن خاتمہ قریب ہو۔

ڈاکٹر شاہد محمود

ڈاکٹر راشد لطیف کے ہسپتال میں ایک میرے محسن ڈاکٹر شاہد محمود بھی ہیں۔ میں شوگر کے ٹیسٹ لے کر ہسپتال

پہنچی تو مجھے ڈاکٹر راشد لطیف نے شاہد محمود صاحب کی طرف ریفر کر دیا۔

مین ہسپتال سے ذرا پیچھے فرٹیلٹی کے سیکشن سے پہلے جہاں کاریں پارک ہوتی ہیں، ڈاکٹر شاہد محمود کا دفتر ہے۔ کچھ سیڑھیاں اوپر چڑھ کر بائیں ہاتھ ایک بڑا سا ویٹنگ روم ہے۔ میں یہاں پہنچی تو ایک نوجوان ڈاکٹر مجھے ویٹنگ روم میں لے گیا۔ ابھی چند منٹ نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب خود آئے اور آپا آپا کہہ کر مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ اس آفس کے دو حصے ہیں۔ سامنے وہ حصہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مریض سے ملتے ہیں۔ دیوار پر ان کی ڈگریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ پیچھے ان کا معائنہ کرنے والا چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں بلڈ پریشر جاننے اور دیکھنے کے لیے مریض کے لیے ایک اونچا سا بیڈ ہے۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جب وہ اپنے آفس میں پہنچے تو یہاں دو تین مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''معاف کیجیے میرا اصول ہے کہ میں مریض کو باری باری دیکھتا ہوں لیکن اب مجبوری ہے، جگت آپا آ گئی ہیں۔''

اس کے بعد وہ مجھے اندر والے کمرے میں لے گئے۔ مریض کا بیڈ اونچا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر چڑھایا۔ نرس کو اشارے سے منع کیا اور خود میرا بلڈ پریشر لیا۔

اب میرا معمول ہے۔ میں دوسرے تیسرے ماہ ان کو ملتی ہوں۔ ان کی مروت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

ڈاکٹر احمد خاں

یہ بات کچھ کشف سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ ہومیوپیتھک علاج سے۔ جس وقت میری والدہ ملتان میں بیگم آف سکولز تھیں، ان دنوں وہاں ڈاکٹر احمد خاں بھی ہوتے تھے۔ جب مجھے ٹائیفائیڈ بخار چڑھا تو ڈاکٹر صاحب میرا علاج ہومیوپیتھک قطروں سے کیا کرتے تھے۔

پھر ہم 121۔سی میں آ گئے۔ ہمیں پرانے محسن مددگار بھول گئے۔ ایک روز صبح سویرے گھنٹی بجی۔ برآمدے کے پاس نیچے ڈاکٹر احمد خاں کھڑے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔

''آپ...... آپ یہاں ڈاکٹر صاحب!''

''بھائی یہ بتاؤ گھر میں کون بیمار ہے؟''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

''رات مجھے خواب میں آپا ذاکرہ نے بتایا کہ میرے گھر جائیے وہاں کوئی بہت بیمار ہے۔''

''اندر تو آیئے۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مریض چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''میں ڈاکٹر ہوں۔ شاید کچھ میں مدد کر سکوں۔''

''ضرور آجائیے۔''

وہ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے برآمدے میں چلنے لگے۔

''میرا ایک اور بھی تعارف ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''آپ کے مرزا عبدالرزاق کا میں بھتیجا ہوں۔''

لیجیے خیال حقیقت میں بدل گیا۔ ڈاکٹر عاطف سے اب ملنا کسی تکلف کا حامل نہ تھا۔ میں انہیں کسی فارملٹی کے بغیر خاں صاحب کے بیڈروم میں لے گئی۔

خاں صاحب، عاطف کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔

''قدسیہ! عاطف کو قہوہ پلاؤ۔ یہ گھرانہ تو کھانے پینے کا شوقین ہے۔''

لیجیے پہلی ہی ملاقات میں عاطف اور خاں صاحب کی دوستی ہو گئی۔ پتہ چلا وہ پروفیشنل آدمی ضرور ہیں مگر دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ شریعت کے پابند اور روحانیت کے قائل بھی ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ عاطف کی بیگم صاحبہ بھی ڈاکٹر ہیں اور اندرون شہر کسی کلینک پر کام کرتی ہیں۔ مجھے یہ انفرمیشن تازہ تھی کہ مجھے علم ہوا کہ بیگم عاطف مرزا نے کرشن نگر کا کلینک چھوڑ دیا ہے اور فرحت ہاشمی کی پیروکار بن گئی ہیں۔ حجاب اوڑھ لیا اور اب وہ ایک ایسا مکتب چلاتی ہیں جس میں گھریلو پردہ دار عورتوں کو فرحت ہاشمی کی تعلیم عنایت کرتی ہیں۔

زندگی عجب طور پر چلتی ہے۔ جو شخص ہر وقت خاں صاحب کے پاس آجاتا تھا اور میری تشفی کا باعث بنتا تھا 7 ستمبر کو جب خاں صاحب اس دنیا سے جانے والے تھے، میں نے قریباً آٹھ بجے صبح عاطف کو فون کیا۔

''عاطف...... ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ذرا زیادہ خراب ہے۔ آپ پلیز آجائیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی، میں کیا کروں؟''

''میں ضرور آجاتا لیکن میں تو ایئرپورٹ جا رہا ہوں اور بالکل ایئرپورٹ سے قریب ہوں۔''

خاں صاحب کے جانے کے بعد میں ان کی بیگم سے ملی۔ جس طرح کی عورت ان کے ساتھ بچتی ویسی ہی تھیں۔

جب عاطف مرزا کے والد فوت ہوئے۔ ان کے قل کی اطلاع ملی۔ میں ان کے گھر گئی۔ میں نے ان کو نئے روپ میں دیکھا۔ وہ بڑی اعجازی اور انکساری کے ساتھ شرعی انداز میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں مشغول تھیں۔

اب میری بیماری کا دور دورہ ہے۔ ڈاکٹر عاطف مرزا بڑے تواتر کے ساتھ اسی پرانے انداز میں بیگ اٹھائے آتے ہیں۔ جہاں بٹھاؤ بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے نسخے دیکھ کر دواؤں میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ دو تین مرتبہ وہ اپنی بیگم کو ساتھ لائے ہیں، لیکن عاطف مرزا ان لوگوں میں سے نہیں جو واقفیت کو بے تکلفی کا بہانہ بنا لیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ میں ان کے لیے کچھ مثبت کروں لیکن انسان اپنی خواہش کو ہمیشہ پورا بھی تو نہیں کر پاتا۔

ڈاکٹر اکرم زبیر

کچھ لوگ خوش نصیب ایسے ہیں جو بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹر آگے بڑھ کر مسیحا کا روپ دھار لیتے ہیں اور کچھ نصیب ڈاکٹروں کو چنگل سمجھتے ہیں۔ کچھ کو غلط Anesthesia کا ٹیکہ لگ جاتا ہے اور مریض آپریشن تھیٹر میں ہی دم توڑ تا ہے۔ کبھی غلط آپریشن، کبھی پیرامیڈیکل سٹاف کی غفلت...... یہ سب یقیناً ہم سب کے ساتھ ہے۔ کچھ ڈاکٹروں پر ے کرتے ہیں۔ انہیں رسوا کرنے میں وقت گزارتے ہیں۔

کچھ حضرات کو ڈاکٹر ملتے ہی گھر والے بھی بھول بھال جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ تو امیر غریب کا چکر بھی ہے، سوسائٹی کے وی آئی پی کو اور طرح کا رویہ ملتا ہے اور کچھ بے نوا روتے پیٹتے ہسپتالوں سے رخصت ہوتے ہیں اور بسا قات قرض کی لعنت میں بھی پھنس جاتے ہیں، لیکن اس ساری اونچ نیچ میں ایک فیکٹر غریبی بھی ہے۔ جہاں امداد غیبی اور کی رحمت آ پہنچتی ہے وہاں سارا تفرقہ مٹ جاتا ہے اور کسی کسی بے نوا کو وی آئی پی کا سلوک مل جاتا ہے اور کئی مرتبہ رہ وی آئی پی ہسپتال ہی بدلتا رہ جاتا ہے۔ کبھی لندن، کبھی امریکہ، کبھی یورپ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رنگ رنگ کی بیماری نے گھیرا لیکن مجھ پر ڈاکٹر صاحبان ہمیشہ مہربان رہے۔ جب بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو ہماری کسی سے میو ہسپتال میں جان پہچان نہ تھی۔ مجھے ہر روز ایک بوتل ن کی لگتی تھی لیکن دوسری صبح بلڈ کاؤنٹ پھر گر کر خطرے کی گھنٹی بجانے لگتا تھا۔

ان دنوں صبح عین نو بجے ڈاکٹر اکرم زبیر ہولے سے میرا دروازہ کھٹکھٹاتے اور چپ چاپ پلنگ کے ساتھ گی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ عموماً دن کے وقت اثیر خاں یا انیق میرے پاس ہوتے۔ رات کو خاں صاحب خود میرے پاس گزارتے۔ ڈاکٹر زبیر ہارٹ سپیشلسٹ تھے۔ ان کا کینسر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

جب مشتاق یوسفی صاحب کی مہربانی سے یہ طے ہوا کہ ہم لندن چلے جائیں گے اور میں گھر آ گئی تو ڈاکٹر زبیر میری طبیعت کا پوچھنے داستان سرائے آتے رہے اور جب خاں صاحب دل کے مریض ہو گئے تو ہم ڈاکٹر زبیر کے کلینک پر باقاعدگی سے جاتے۔ ڈاکٹر زبیر کو اطلاع ملتی تو وہ فوراً ہمیں اپنے آفس میں بلاتے، بڑی توجہ سے خاں صاحب کو چیک کرتے اور سسٹر سے کہتے ''ان کا ای سی جی میں خود کروں گا۔''

ڈاکٹر اکرم زبیر اتنے چپ چاپ آدمی تھے کہ شبہ ہوتا کہ گونگے ہیں۔ پر ان کے چہرے کی ملائمت بتاتی رہتی کہ وہ پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے ان کی بیگم میری گرویدہ ہو گئیں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ بڑی محبت سے مجھے ملنے آتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھے حیران کرنے کو کافی تھے لیکن ان کی بیگم کی محبت نے تو واقعی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

ڈاکٹر جاوید شیخ

مجھے معلوم نہیں ڈاکٹر جاوید شیخ کب خاں صاحب سے ملے، کب ان سے متعارف ہوئے اور ان دونوں کے

مابین محبت کا کیا رشتہ تھا لیکن جب میں بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو خاں صاحب کو مشتاق احمد یوسفی نے فون کر کے کہا ''اشفاق صاحب میں B.C.C.I. بینک کی طرف سے بول رہا ہوں۔ یہاں کے چیئر مین برنی صاحب آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ بانو قدسیہ کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں۔ وہ قومی سرمایہ ہیں۔ ہم یہاں لندن میں ان کا علاج چیرنگ ہسپتال میں کرائیں گے۔ یہاں ڈاکٹر شارپ ایک بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ وہ ہی ان کے بلڈ ٹسٹ لیں گے۔ آپ صرف میو ہسپتال کی رپورٹ ساتھ لے کر آئیں۔ آپ کو نہ قیام نہ طعام کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں''

یہ تو ایک دوسری کہانی ہے لیکن سفر سے پہلے پڑاؤ پر لندن ایئر پورٹ پر ہمیں جو شخص دوسری مرتبہ ملے وہ جاوید تھے۔ پہلی بار تو ہم یوسفی صاحب کے مہمان تھے لیکن اس دوسری بار ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب نکلے۔ وہ اپنی نئی مرسیڈیز لے کر موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ گھر پہنچے۔ لندن کی بھیڑ بھاڑ سے دور ڈاکٹر جاوید کا گھر تھا۔ باغوں سے گھرا خاموشی کی ردا اوڑھے۔ انہوں نے ہمیں اوپر والی منزل میں کمرہ دیا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سٹنگ روم بھی تھا۔

ان کی دوسری بیگم حسینہ قریب ہی کاؤنٹی کے ہسپتال میں کام کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھ سالہ بچی فاطمہ گھر پر موجود ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب لندن کے کسی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں کا معمول تھا کہ باری باری ایک بندہ گھر پر فاطمہ کے پاس رہتا اور ایک بندہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتا لیکن جونہی ہم گھر کا فرد بنے فاطمہ نے ہمیں دادا، دادی کا روپ بخش دیا۔ ہم بھی اس میں خوب مصروف رہے اور نئی جگہ کی اجنبیت ہمیں محسوس نہ ہوتی۔ ہسپتال کے چکر بھی وہ لگوا دیتے۔ ڈاکٹر شارپ کے پاس بھی وہی ڈیوٹی دیتے۔ اتنی اپنائیت سے انہوں نے ہماری دعوت کی جس میں لندن کے ادیبوں کو اکٹھا کیا۔ اگر ڈاکٹر جاوید نہ ہوتے تو یہ ملاقات ممکن نہ ہوتی۔

اب 2007ء میں جب وہ مجھے ملنے آئے تو فاطمہ کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اتنا وقت کتنی جلدی گزر گیا۔ یہ عجیب رابطہ تھا کہ اس پر اجنبیت کی ذرہ بھر دھول نہ گری!

ڈاکٹر راشد لطیف

جب میں لندن سے واپس لوٹی اور ڈاکٹر شارپ نے یہ طے کر دیا کہ مجھے بلڈ لوکیمیا ہے اور لاہور کے ڈاکٹروں کی تشخیص درست ہے تو معلوم نہیں کیسے ڈاکٹر راشد لطیف کو پتہ چل گیا۔ وہ خاں صاحب کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ خود ازخود ملے اور تفتیش کی کہ بلڈ کینسر کسی طور پر لہو سے نکلنے والی بیماری نہیں اور میں فوراً راشد لطیف ہسپتال پہنچوں۔ یہاں جب ہم دونوں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے ٹیسٹ لیے اور پتہ چلا کہ کینسر چوری چوری Glanes میں جا بیٹھا ہے۔ اب Lis tacteoy کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مقررہ وقت پر خاں صاحب، ثوبیہ اور میں راشد ہسپتال پہنچے۔ مجھے تیار کر کے جب اندر لے گئے تو ثوبیہ کو بھی ماسک اور کوٹ پہنا کر ساتھ لے گئے۔ اتنے بڑے آپریشن کا ڈاکٹر صاحب کم از کم ڈیڑھ لاکھ وصول کیا کرتے تھے مگر خاں صاحب سے انہوں نے ایک پائی بھی نہ لی۔

اس کے بعد ابھی پانچ چھ دن گزرے تھے کہ صبح دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں شفا کی آرزو کے ساتھ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرا حال چال پوچھا۔ حوصلہ دیا اور ہمت بڑھائی۔

میں نے کہا..... ''ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت کھچل کی۔ اتنی مصروفیت کے باوجود چلے آئے۔''

آہستہ سے بولے..... ''آپ کہہ کر تو آنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کریں مجبوری ہے۔''

راشد لطیف ہسپتال کے بائیں ہاتھ فرٹیلیٹی سنٹر ہے اور اس کے عقب میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ طلعت کو لے کر میری طبیعت کا پوچھنے آ گئے۔ اب تک ان کی مروت کا یہ عالم ہے کہ میں اگر کبھی ہسپتال جا پہنچوں تو وہ بہ نفس نفیس مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ کسی کے علاج کی سفارش کر دوں تو وہ بغیر چارج لیے اس کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ اب بتائیے اس مادی عہد میں ایسی مروت کی کس کو فرصت یا ضرورت ہے۔

دراز قد، ذہین چہرہ، مضبوط کاٹھی، پُراعتماد رویہ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اپنے پروفیشن میں ہی بے مثال نہیں، ساتھ ساتھ بیمار لوگوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔

نینی، ثنیہ، علی، ہاروی

اب مجھے ٹھیک طور سے یاد نہیں آ رہا کہ نینی ہماری زندگی کا حصہ کیونکر بنی۔ ہر ادھوری انفرمیشن چونکہ مجھے یا تو خود اخذ کرنا پڑتی تھی یا خاں صاحب کے اِکا دُکا جملوں اور ریمارکس سے مل جاتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ خاں صاحب کچھ امیرزادیوں کے ایک گروپ کا بڑا فعال حصہ بن چکے ہیں۔ یہ خواتین اللہ کی رحمتوں برکتوں سے کثیر رزق پر دسترس رکھتی تھیں۔ اُن کے شوہر اس قدر مصروف تھے کہ ان کے پاس خواتین کی مجلسی زندگی کے لیے قطعی وقت نہ تھا۔

ان چھ سات خواتین سے نینی نے خاں صاحب کو متعارف کرایا۔ جس طرح امیر لوگ قوالوں کو بلا کر یا موسیقار کو گھر مدعو کر کے اپنی محفل سجاتے تھے' اس طرح کبھی کبھار کسی ایسے مقرر کو بھی ذائقہ بدلنے کے لیے بلا لیا جاتا جو انہیں دین' روحانیت اور صوفی ازم کی باتوں سے محظوظ کرتے۔ ابھی ایسی محفلوں کا رواج عام نہ تھا۔ ابھی یہ وی وی آئی پی کی دل لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے معمول کے مطابق یہ فیشن بھی اُوپر والے طبقے سے سرایت کرتا مڈل کلاس میں پہنچا اور غریب طبقہ تو پہلے ہی مزاروں' خانقاہوں' سجادہ نشینوں' ڈیروں پر حاضری دینے کے عادی تھے اور اُن کی اس عقیدت کو امراء جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔

غالباً نینی اس گروہ میں خاں صاحب سے پہلے داخل ہوئی۔ وہ اُن دنوں باغِ جناح کے سامنے کسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ نسیم کے شوہر سعودیہ ایئر لائنز میں اپریٹر کے چیف تھے۔ اسی پوزیشن کے دھکے سے نسیم بانو کا ہر دروازہ کھل جاتا تھا۔ نینی کے شوہر فضلی زیادہ وقت جدہ میں رہتے تھے جہاں وہ سعودیہ ایئر لائنز کے Marketing & Agreements کے ڈائریکٹر تھے اور وہاں بڑی تندہی اور توجہ سے کام کرنا پڑتا۔

ان دعوتوں کا معمول تھا کہ پُرتکلف کھانے کے بعد خاں صاحب اس اندر سبھا میں پیر بادشاہ بن کر بیٹھ جاتے۔

پہلے تھوڑا سا لیکچر خاں صاحب اپنی مرضی کے مطابق سامعین کی نذر کرتے' پھر سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلتا۔ دنیاداری کی باتیں ہوتیں۔ مزاج کی چاشنی چلتی۔ میں ان محفلوں میں کبھی شریک نہ ہوئی۔

ایک روز خاں صاحب میرے پاس یہ کہنے آئے ''کچھ وقت ہو تو میری بات سن لو۔''

میں کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہوئی ''جی؟''

''بات یہ ہے کہ کل دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان خواتین آئیں گی۔ وہ بہت اعلیٰ کھانوں کی عادی ہیں مگر انہیں ڈیروں پر کھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارا داستان سرائے مان آدر میں تو کم نہیں' صرف ہمارے کھانے بہت سادہ ہیں۔''

''جی تو میں بازار سے قیمے کے نان' تکے منگوا لوں گی۔''

''ناں بھائی ناں! ایسا ظلم نہ کرنا۔ وہ بازاری چیزیں نہیں کھاتیں۔ اُن کے گلے خراب ہو جاتے ہیں۔ انہیں فوڈ پوائزننگ ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر تو..... جی..... مشکل ہے۔ میں تو سادہ سادہ کھانے جانتی ہوں۔''

''بس پلاؤ' آلو کا شوربہ' دال' کباب لیکن ایک شرط ہے۔''

''جی وہ کیا؟''

''تم کھانا خود پکاؤ گی..... جیونی بہن صرف پراٹھے بنائے گی۔''

جیونی بہن گو مجھ سے بہتر پکاتی تھی اور پکاتی ہے لیکن خاں صاحب کے فیصلے کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ان خواتین کا مجھ پر بن دیکھے ہی رعب پڑ گیا۔ کالا لمبا میز ڈرائنگ روم میں دروازہ کھلتے ہی لگایا گیا۔ حسب توفیق برتن سجائے گئے۔ ان دنوں میرے پاس تاجدار اور رفیق ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا دھیان رکھا۔ میں اندر نہیں گئی۔ سنا ہے عورتوں نے آلو گوشت کی بہت تعریف کی۔ باقی سب سے تو میرا تعارف نہ ہو سکا لیکن نینی آ گئی اور مجھ سے یوں ملی گویا برسوں کی سکھی سہیلی ہو۔

''بانو آپا! یہ آلو گوشت کیسے بنایا ہے۔ سب لٹو ہو گئی ہیں۔ ہم نے تو ایسا آلو گوشت نہ کبھی کھایا نہ پکایا۔''

میں نے شیخی میں آ کر ترکیب تفصیل سے بتائی اور تب سے اب تک اس زعم میں مبتلا ہوں کہ ہمارے گھر میں جو آلو گوشت کا شوربہ پکتا ہے' وہ بالکل لاثانی ہے۔

نینی اس طرح خاں صاحب سے سرکتی سرکتی میری اور بچوں کی دوست بن گئی۔ اُس کے علاوہ نسرین آفتاب بھی میری واقف بن گئی۔ نسرین امیر خواتین کی طرح بے مصرف زندگی گزارتے گزارتے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اشیاء انسان کو اطمینان یا سکون نہیں بخش سکتیں۔ وہ خوشی ضرور عطا کرتی ہیں لیکن یہ خوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ جیسے کسی اجنبی دیس میں سفر و قیام۔ انسان چاہے لاکھ آرام سے عیش سے کسی جگہ قیام کرے لیکن اوّل و آخر گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔

نینی ہمارے اور بھی قریب آ گئی' جب فضلی نے اُسے ماڈل ٹاؤن میں گھر خرید دیا۔ علی اور ثنیہ بڑی کلاسوں میں

ہو گئے تھے اور فضلی اُنہیں اُکھاڑ کر جدہ میں نئے سکولوں کے تجربے سے گزارنا نہ چاہتا تھا۔

اب ہمارے گھر میں ایک نیا رنگ اُبھرا۔ نوجوانوں میں دوستی ہو گئی اور اس میں وہ سارا جذبہ گوندھ دیا گیا جو صرف بلوغت کے عہد کا طرۂ امتیاز ہے۔ چھیڑ ڈالنا ہوئی چھیڑ ڈال لی۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے تو لڑائی کر لی لیکن رہے ہمیشہ اکٹھے۔ اس دوستی میں بیڈمنٹن کورٹ نے بہت فائدہ پہنچایا۔

گھر کے سامنے عین کالے پھاٹک کے پیچھے دنگا فساد مسابقت اور برتری جتانے کے لیے کورٹ بنایا گیا۔ اس میں لوہے کے ڈنڈے گاڑے گئے اور نٹ لگایا گیا۔ شٹل کاک اور خوبصورت ریکٹ بھی آئے۔ نہ جانے بچوں نے خود پیسے دیئے یا پھر کسی نے ان کی بے بسی کو سہارا دیا۔ بہر کیف ہر شام کھیل جاری رہنے لگا۔ اثیر احمد طبعاً کھلاڑی تھا۔ وہ کوئی کھیل بھی کھیلے اُس میں سٹائل اور پختگی خداداد صلاحیت کے باعث جلد پیدا ہو جاتی ہے۔

شام کو نینی اپنے دونوں بچوں سمیت ہمارے گھر آ جاتی۔ بیڈمنٹن چلتی۔ خوب شور و غوغا مچتا۔ ایک مرتبہ انیق اثیر سے کھیلتے کھیلتے جھگڑ پڑے اور آگے بڑھ کر اثیر کا ریکٹ توڑ دیا۔ بعد میں بہت پچھتائے اور اثیر سے چھیڑ ڈال لی۔ ثنیہ اور صبا کمزور کھلاڑی تھیں لیکن اُن کی کھیل کو لڑ کے سنبھال لیتے۔

اس گیم بازی کے بعد ہم ان سب کو پانی اور شربت پیش کر دیتے۔ وہ لوگ شاذ ہی ہمارے گھر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کے وقت سے پہلے ہی سب تتر بتر ہو جاتے۔

انیق کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں عام طور پر سسرال چلے جاتے۔ اثیر ان دنوں پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ غزل کی چھوٹی بہن صبا نے اثیر کو سوشل سٹڈیز پڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اُوپر لائبریری میں بیٹھ کر یہ دونوں پڑھتے تھے۔ یہاں سے ایک اور اُلجھن پیدا ہوئی۔ ثنیہ اور صبا دونوں اثیر پر ملتفت تھیں۔ نینی اور فضلی بھی اس بات کے خواہشمند تھے کہ ثنیہ کسی طرح ہمارے گھر کی بہو بنے لیکن اثیر اور صبا وعدے وعید تک پہنچ گئے اور ثنیہ والا معاملہ لٹکتا رہ گیا۔

لیکن بچوں کے معاملات کا ہم بڑوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نینی جب تب مزے دار کھانے پکا کر لاتی اور خاں صاحب جو نعمتوں کو دست بستہ قبول کرنے کے عادی تھے بڑے خضوع و خشوع اور رغبت سے انہیں کھاتے۔ نینی کی سہیلیوں کے طفیل علی اور اثیر میں بڑی دوستی ہو گئی۔ جب بھی نینی کو جدہ کا سفر درپیش ہوتا وہ ثنیہ کو تو ساتھ لے جاتی لیکن علی ہمارے پاس رہ جاتا۔

اثیر اور علی دونوں شہاب بھائی والے کاسنی کمرے میں اکٹھے ایک رضائی میں سوتے' ایک تھالی سے کھاتے' ایک گلاس سے پیتے۔ اسی نینی کے طفیل اُس کے دونوں بھائی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئے۔ نینی کے بھائی امجد اور نغمہ بڑے ہی محبت والے تھے۔ نغمہ کھانے پکانے کی ماہر تھی۔ یہ دونوں تب جدہ میں رہتے تھے۔ جب ہم دونوں پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو جدہ میں ان ہی کے پاس ٹھہرے۔ نینی کے بڑے بھائی آفتاب امریکہ میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور آتے خاں صاحب سے ملنے ضرور آتے۔

نینی کا خاندان مڈل کلاس تھا۔ اُن میں مشرقی اقدار تھیں۔ ہائی سوسائٹی میں گھسنے کے لیے نینی کے پاس خوبصورتی اور فضلی کا پاسپورٹ تھا۔ وہ اس پاسپورٹ کو استعمال کر کے وی وی آئی پی تو ضرور بن گئی لیکن اُس میں ایک عجیب

قسم کی عاجزی اور انکساری تھی جس نے اُسے کبھی زمینی حقیقتوں سے جدا نہ کیا۔

جب کبھی بچوں کو چھٹیاں ہوتیں نینی ان کو تفریح کی غرض سے کہیں نہ کہیں لے جاتی۔ فضلی ٹکٹ اور خرچ کا بندوبست کر دیتے اور یہ تینوں ہنستے کھیلتے روانہ ہو جاتے۔

ایسے ہی ایک سفر کی داستان سنیئے۔

نینی دونوں بچوں سمیت ممبئی گئی اور وہاں تاج محل ہوٹل میں ٹھہری۔ اس ہوٹل سے کچھ ہی قریب اُن دنوں کا ہارٹ بیٹ دھرمیندر رہتا تھا۔ وہ عام طور پر تاج محل میں جا کر اپنے پنکھوں (fans) کو درشن دیتا۔ اُن کے ساتھ پیتا' کھانا پینا ہوتا۔ ان ہی جھروکے درشنوں کے دوران نینی اور اُس کے بچے دھرمیندر کے بہت قریب آ گئے۔

ثنیہ فلور پر اُس کے ساتھ ناچنے لگی تو تمام تماشائی گھیرا ڈال کر اُن دونوں کا ناچ دیکھنے لگے۔ بڑی واہ واہ ہوئی اور ثنیہ میں خودستائی اور خود اعتمادی کا بیج بویا گیا۔ دھرمیندر نے اُنہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اس گھریلو دعوت نے بچوں کے دلوں میں اپنی بڑائی مستحکم کر دی۔ وہ اپنے آپ کو خاص اور special سمجھنے لگے۔

اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ جب واپس لوٹے اور اترائے اترائے ہمیں ملنے آئے تو خاں صاحب نے محسوس کیا کہ یہ سفر ان بچوں کے حق میں نہیں تھا۔ دونوں بچے اپنی پڑھائیوں سے غافل ہو چکے تھے اور اُنہیں ناچنے گانے بننے اور شوبزنس سے وابستہ ہونے کا شوق اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔

اگر پاکستانی معاشرہ اُس وقت الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے وہاں ہوتا جہاں وہ آج ہے تو غالب امکان تھا کہ اس وقت بہت اے ون ماڈل' ایکٹر یا کپڑوں کے ڈیزائنر بن چکے ہوتے اور نام و اکرام پاتے۔ لیکن معاشرہ ابھی تک اقدار سے جیسا کیسا بندھا تھا اور کوئی جنریشن رسی چھڑانے کے عمل میں تھی لیکن ماں باپ سے مکمل چھٹکارا ابھی ممکن نہ تھا۔

نو دس بجے کا وقت تھا۔ صبح صبح نینی اور ثنیہ گھبرائی ہوئی گھر آئیں۔ خاں صاحب دفتر جا چکے تھے۔ حسبِ معمول گھر شانت تھا۔ ثنیہ کی سانس برابر نہ تھی۔ حواس باختہ نینی اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں لگی تھی۔

''بانو آپا! علی بھاگ گیا ہے۔''

''ہیں؟'' میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''اُس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے..... پیر آف مکھڈ کا بیٹا اُس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ شاید..... مجھے پتہ ہے کہ وہ اُن کے گھر چھپا بیٹھا ہے۔''

''گھر پتہ ہے پیر آف مکھڈ کا؟''

''ہاں جی۔''

''اگر ہم میں سے کوئی گیا تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔ آپ سے وہ محبت کرتا ہے۔ اثیر کے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔ گہری دوستی ہے۔ آپ دونوں چلیں تو شاید بات بن جائے۔''

لیجئے جناب میں ان پریشان حال ماں بیٹی کے ساتھ پیر آف مکھڈ کے محل نما گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ اس گھر

...خوبصورت پتھروں سے آراستگی کی گئی تھی۔گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر اس بنگلے میں جب میں پہنچی تو میں بدحواس تھی۔ ...گ کے پاس کار میں نینی اور ثنیہ اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔اندر جاکر مجھے تھوڑی دیر انتظار کروانے کے بعد علی ...گیا۔محبت تو اس گھرانے کا خمیر ہے۔یہ لوگ محبت میں آکر کچھ بھی کرگزرنے والے ہیں۔

مجھے دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑلیا''آپ مجھے فون کر دیتیں بانو آپا آپ کیوں آئیں؟''

''کیوں نہ آتی؟ چلو گھر چلیں.....میری خاطر۔''

وہ چند لمحے متذبذب رہا.....''علی چلو! ثیر کی خاطر.....''میں نے علی کو بلیک میل کیا۔

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ.....کوئی مجھے پاکستان میں پڑھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔میں ایچی سن کالج نہیں جانا ...چاہتا۔میں وہاں جواب دے آیا ہوں۔''

''چلو تو سہی۔یہاں یہ باتیں تھوڑی طے ہو سکتی ہیں۔''

''آپ وعدہ کریں۔''

میں نے وعدے کا تاوان ادا کیا اور علی کو ساتھ لے کر آ گئی۔اس کے بعد علی گھر پر رہنے لگا۔کچھ عرصہ فضلی کو سمجھانے پر صرف ہوا کہ علی کو امریکہ بھیج کر اسے عالی شان تعلیم سے مزین کیا جا سکتا ہے۔یہاں کی تعلیم محض تضیع اوقات ہوگی۔

ابھی علی لاہور ہی میں تھا کہ ثنیہ بیگم کینیرڈ کالج سے بی اے کرگئی۔نینی کو اسے بیاہنے کی جلدی تھی۔اچھے سے اچھے رشتے چلے آ رہے تھے۔ثنیہ خوبصورت' باصلاحیت لڑکی تھی۔اپنی ماں کی طرح گھریلو خانہ داری اور کھانے پکانے کا ہنر جانتی تھی۔ایسی لڑکی کسی گھر کا جھومر بن سکتی تھی۔

نینی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب سے مشورہ کرنے آئی.....شکیل مسعود کا رشتہ آیا ہے خاں صاحب.....مجھے تو کچھ نہیں آ رہی۔''

''بہتر تو یہی ہے کہ ثنیہ سے پوچھ لیں۔''خاں صاحب بولے۔

''جی وہ حسن پرست ہے۔بس کہتی ہے مرد کو خوبصورت ہونا چاہئے۔لڑکا لمبا ہے قبول صورت ہے۔''

''اوبابا خوبصورتی کو چاٹنا ہے۔پتہ نہیں ان بچوں کو کیا ہو گیا۔ظاہری چیزوں پر ان کی جان نکلتی ہے۔اب اُسے ...ہرمیندر کہاں سے لادیں۔''

نینی بددل ہو کر گھر چلی گئی۔اُسے ہمارے گھر سے کوئی ترکیب استعمال نہ ملی اور اس طرح اُس نے یہاں سے مشورے لینے چھوڑ دیئے' لیکن ملنا جلنا جاری رکھا۔

ایک روز صبح کے وقت شکیل میرے پاس آیا۔لمبا' قبول صورت انتہا کا بردبار' شریف۔گودی میں ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

''جی آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔''

ایک اجنبی سے میں پہلی ملاقات میں مشورہ کیا دیتی؟

''جی فرمائیے.....میں حاضر ہوں۔''

بڑی دیر وہ گم سم سا رہا۔ میں بھی پہلو بدلتی رہی۔

پھر وہ بڑی شائستگی سے بولا..... ''آنٹی جی! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں شکیل مسعود ہوں.....ثنیہ کا رشتہ میرے لیے آیا ہے۔''

''تم نے اُسے دیکھا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی.....میں اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''میری والدہ کو اعتراض ہے کہ لڑکی ایکٹریس سی لگتی ہے۔ ایسی لڑکیاں گھر بار کے قابل نہیں ہوتیں۔''

''اوّل تو ساری خوبصورت لڑکیاں ایکٹریس ہی لگا کرتی ہیں۔ دوسرے یقین مانو اتنی اچھی لڑکی تمہیں کبھی نہیں ملے گی.....خانہ داری، کھانا پکانا روایات کی پاسبانی اُس سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا.....میری مانو تو فوراً ہاں کردو۔''

پتہ نہیں میری وجہ سے یا ثنیہ کی وجہ سے بات پکی ہوگئی۔

اب نینی کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا۔

ثنیہ نے اپنے سسرال میں رہنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ گھرانہ شکیل کی والدہ کے گرد گھومتا تھا۔ جوائنٹ سسٹم کے تحت بھائی بہن اکٹھے رہتے تھے۔ بند مٹھی میں طرحدار بہو کے لیے کھلنے کی گنجائش نہ تھی۔ ثنیہ نے کچھ دیر تو کوشش کی اور پھر شکیل کو لے کر اپنی والدہ کے گھر آ بسی۔

یہ عہد ہماری نظروں سے روپوش رہا۔ نینی گویا ہم سے کٹ گئی۔ علی امریکہ سدھارا۔ شکیل اور ثنیہ کو اللہ نے بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کردیا۔ ہمیں نینی کے گھر کی خبر اُڑتی اُڑتی ملتی تھی۔ ہم بھی دوستوں کے تعاقب میں اُن کی آزادی میں مخل ہونے والے لوگ نہ تھے۔ کبھی کبھار وہ ملنے آجاتی لیکن ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ کبھی دُکھ سکھ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

ایک روز پتہ چلا کہ شکیل نے بڑا خوبصورت گھر خرید لیا ہے اور اپنے بیوی بچے لے کر وہاں شفٹ ہوگیا۔ ثنیہ نے اپنی ذاتی کار لے دی ہے اور وہ بڑے ٹھسے کی زندگی بسر کرتی ہے۔

کچھ عرصہ گزرا تھا کہ شکیل ہمارے گھر آیا۔ وہ بابر کی ہائی نون ٹیکسٹائل ملز میں جنرل منیجر کی پوسٹ جوائن کرنے کی سوچ رہا تھا۔ ان دنوں میرا بیٹا انیس اور ثوبیہ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ شکیل اُن سے مل کر باہر والی سیڑھیوں سے جا رہا تھا۔ جب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔

''آپا جی! بابر ایک اچھا ایماندار جنرل منیجر تلاش کر رہا ہے۔ آپ اثیر سے کہیں یہاں جوائن کرلے۔ لاکھ سے زیادہ کا پیکیج ہے۔''

''تم کیوں نہیں چلے جاتے ہائی نون ٹیکسٹائل میں؟''

''میں ضرور چلا جاتا لیکن مجھے ''ڈان'' اخبار میں نوکری مل گئی ہے جو میرے مطلب کی ہے۔''

یوں شکیل ''ڈان'' اخبار میں چلا گیا اور اشیر نے بابر کی فیکٹری سنبھال لی۔

میرا خیال تھا کہ اب راوی چین ہی چین لکھتا رہے گا لیکن زندگی کچھ جنت کا چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے۔ یہاں بیماری، سوگواری، برائی، گمراہی، موت اور پیدائش غرضیکہ ان گنت آزمائشوں کا گھر ہے۔ ہر لحظہ کسی نہ کسی امتحان کا سامنا رہتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح نینی خاں صاحب کے پاس پریشان حال بیٹھی تھی اور مسئلہ بیان کر رہی تھی۔ میں نے چلے جانا چاہا تو خاں صاحب نے آواز دے کر بلا لیا..... ''سنو! اس ثنیہ نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔''

''اب کیا ہوا؟''

نینی نے بتایا کہ ثنیہ اب شکیل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور طلاق چاہتی ہے۔ کچھ دیر سے Separation چل رہی ہے۔ شکیل اُوپر والی منزل پر رہتا ہے۔ ثنیہ نیچے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

''ثنیہ کو ہوش کرنے بچوں کے مستقبل سے نہ کھیلے۔''

''آپ چل کر سمجھائیں خاں صاحب! میری کب سنتی ہے؟''

''دیکھو ایسے کرو نینی! تم امجد اور نغمہ کو بلاؤ۔ ہم بھی آ جائیں گے۔ پھر ثنیہ کو سمجھائیں گے۔''

صبح گیارہ بجے کے قریب ہم شکیل کے گھر پہنچے۔ نینی اور اُس کے مشیر نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہے۔ ثنیہ سب سے الگ تھلگ منہ تھتھائے گم سُم نہایت پریشان لگ رہی تھی۔ شکیل کو اُوپر والی منزل سے بلایا گیا۔ وہ بھی پریشان اپنی ذات سے نالاں ڈگمگاتا آیا۔

جیسے کسی بم کے پھٹنے سے پہلے فضا چارج ہوتی ہے ایسے ہی ماحول میں خطرہ تھا۔

مشکل سے ساری صورتِ حال سمجھائی گئی۔

میں نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر ثنیہ کا ہاتھ تھاما اور کرختگی سے کہا..... ''پتہ ہے تم کس آگ سے کھیلنے جا رہی ہو؟ یہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ چلو پاؤں پڑ جاؤ معافی مانگو، چلو۔''

ثنیہ آگے کم چل رہی تھی اور پیچھے زیادہ ہلکورے لے رہی تھی۔ شکیل اُسے دیکھ کر سروقد کھڑا ہو گیا۔ اُس کی خاندانی شرافت سر سے پاؤں تک جھلک رہی تھی۔ میں نے بدو بدی ثنیہ کو اُس کے قدموں میں انڈیل دیا تھا۔ تب تو کیا مجھے اب تک علم نہیں ہو سکا کہ انسان اگر اندر سے نہ مانے تو زبانی کلامی اعتراف کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔

ہم یہ سمجھے کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور شکیل اور ثنیہ میں پکی دوستی ہو گئی۔ لیکن بعد ازاں پتہ لگا کہ شکیل نے چالیس لاکھ دے کر بچے اپنے پاس رکھ لیے اور ثنیہ کو طلاق دے دی۔

لیکن یہ بعد کی کہانی ہے..... اس کے درمیان علی کی داستان بھی سن لیجیے۔ وہ گیا تو پڑھنے تھا لیکن طبعاً پڑھائی کی طرف راغب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہاروے نامی لڑکی سے مسجد میں جا کر نکاح پڑھوا لیا۔ ادھر لڑکی کا گھر ڈانواں ڈول تھا اور نینی پر یہ بجلی گری۔ بیچاری ڈھے گئی۔

علی اپنی پیاری سی دراز قد ہاروے کو لے کر لاہور آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان دونوں کو بڑی شفقت، احساس

تحفظ اور Support کی ضرورت تھی۔ یہ محبت اشفاق صاحب نے کھلے دل سے عطا کی۔ دونوں بچے عموماً صبح کے وقت ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ ہاروے ظہر کی نماز میرے ساتھ پڑھتی۔ اجنبی دیس میں، اجنبی علی کے ساتھ اجنبی کلچر میں اپنی جگہ بنانا آسان نہیں۔ اللہ اُس پر اور اُس کے بچوں پر ہمیشہ رحمت کا سایہ رکھے۔

شکیل مسعود ترقی کرتے کرتے ''ڈان'' اخبار میں جنرل منیجر کے عہدے پر پہنچا اور اب ''ڈان نیوز'' کا کرتا دھرتا ہے اور کراچی میں رہتا ہے۔ جب کبھی شکیل لاہور آتا ہے وہ بچوں کو ثنیہ کی طرف بھیج دیتا ہے۔ یہ وقت بچاری ماں بیٹیوں پر قیامت کا گزرتا ہے۔ بچوں کی آمد ان کی روانگی کے خوف میں بھسم ہو جاتی ہے۔

جب سے یہ حالات ہوئے ثویلہ اور انیس نے نینی کا بہت ساتھ دیا۔ میری بہو ثویلہ کو Underdog سے عشق ہے۔ وہ ٹوٹ کر ایسے لوگوں سے محبت کرتی ہے جن کو زندگی اور زندگی کے فیصلوں نے دغا دیا ہو..... گویا وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر اللہ کو قرض حسنہ دینے پر تل جاتی ہے۔

لیکن زندگی اونچ نیچ کا نام ہے..... جب سے خاں صاحب اس جہاں سے سدھارے اُس سے کچھ دیر پہلے تجھ چھٹم چھٹا ہوگئی۔ اب شکیل سے رابطہ ضرور قائم ہے لیکن دوسری پارٹی سے ایسی صورت میں ووٹ کی امید نہیں کیونکہ کوئی بھی ایسے فریقین کا ساتھ نہیں بن سکتا جن میں اینٹ کتے کا بیر ہو۔

حالات اتنے مخدوش ہونے کے باوجود علی کے ساتھ رشتہ برقرار ہے۔ اُسے امریکہ میں انیق بھائی اور عزیزہ بھابی کا سہارا ہے۔ پاکستان آیا تو ہم سے مل کر گیا۔ ہم وہاں گئے تو ایک دن کے لیے اُس کے گھر رہے۔ اُن دونوں نے ہمیں پریت سے رکھا..... اب اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ خط شکور عالم لائے ہیں۔ شکور عالم نیویارک میں ایک ٹریول ایجنسی چلاتے ہیں اور ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ علی کا خط انگریزی میں تھا۔ شکور عالم نے اس کا ترجمہ کر کے مجھے بھیجا ہے۔ نینی کا خاندان محبت کا اسیر ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

پیاری بانو آنٹی!

یقین کریں، مجھے لگتا ہے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ان دو لفظوں ''بانو آنٹی'' نے میری زبان کو چھوا تھا، میرے دماغ کو وسعت اور دل کو محبت کی گرمی سے روشناس کیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دل کا تعلق، جسمانی قرب، قلم کی بہترین تحریر یا دورِ حاضر کی موثر ترین برقی ایجادات کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔

اپنے پیاروں کی یاد، خیالات کی جنت کا ایک خوبصورت پھول ہے۔ جتنا اس کی گہرائی میں اُتریں اس کی خوشبو اور سرور اُتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔

اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے وجود کا اس کے تعلق کے حوالے سے ادراک ہو، یادوں کی یہ بہشت ایک بہت حسین پھول میں ڈھل جاتی ہے۔

کل کی بات لگتی ہے کہ پچیس سال پہلے آپ نے مجھ جیسے از خود رفتہ بھٹکے ہوئے نوجوان کو ماں کی پُر سکون آغوش سے روشناس کرایا۔ آپ کی محبت کسی بھی غرض و غایت یا میری استطاعت سے مبرا تھی۔ آپ کی کشادہ دلی ابتدا اور تجسس

قیود سے آزاد تھی۔ نہ جانے مجھ ایسے کتنے ہی علی آپ کی چوکھٹ پر پہنچے اور آپ نے سب کو بلا تخصیص اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی وقت سے نوازا۔

لیکن آنٹی! آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کے عطا کیے ہوئے اُس وقت سے فی الحقیقت ہم سب نے سکونِ دل کی وہ دولت حاصل کی جس کی ہر ایک کو تلاش رہی ہے۔ ہم کہ خود اپنے ہی دشمن بن چکے تھے ہمارے لیے روح و قلب کی بے چینی کا مداوا اگر کہیں تھا تو صرف اور صرف C-121 ماڈل ٹاؤن میں تھا۔

آپ کی توجہ اور محبت نے اس احساس کو جنم دیا کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دنیا بھر میں ایک اور صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم جیسے اپنی ذات کی کمینگیوں سے آلودہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک ماں کی محبت بھری آغوش اور ایک باپ کی شفقت ہمہ وقت منتظر ہے۔ جہاں ہمارا دُکھ نہ صرف سنا جائے' کوئی تنقید نہ ہو بلکہ گاہے گاہے ہمارے درد کی آگ کو آپ اپنے آنسوؤں کی ٹھنڈ سے سرد کر دیں۔

ہماری بے سروپا اور بے تکی داستانوں کو پوری توجہ سے سنا اور سمجھا جائے۔ اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہم جیسے گم کردہ راہ لوگوں کے لیے آپ کا گھر زندگی کے لق و دق صحرا میں پُرسکون سائے اور ٹھنڈے پانیوں کا سرچشمہ ثابت ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے ذاتی طور پر جن انعامات سے نوازا گیا اُن میں انکل اشفاق کی شفقت کے علاوہ نانا' نوکی بھائی' کیسی بھائی' سیری' جونی بہن' ثویلہ' جانو بھائی' رفیق بھائی' غفار بھائی اور نثار بھائی کی لازوال محبت کی یاد میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ میں آپ کے گھر میں کس طرح آزادی سے گھوما کرتا تھا۔ اس سے بھی تعجب کی بات یہ کہ آپ مجھے اس کی بخوشی اجازت دے دیتے تھے۔ انکل اشفاق اور بانو آنٹی کے گھر میں مجھے اپنائیت کا جو احساس ہوا وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بن چکا ہے۔

اگر شعوری طور پر نہیں تو میرے لاشعور میں علم و دانش کا وہ خزانہ ہمہ وقت موجود ہے جو میں نے آپ کے ہاں چاروں طرف بکھری کتابوں اور اُن سے باہر انکل اشفاق' مفتی جی' جناب واصف علی واصف اور ان سب کے سرخیل مردِ ابریشم جناب قدرت اللہ شہاب کی پُرکیف گفتگو اور محبت سے اپنے اندر جذب کیا۔

اس عظیم سرمائے کی بدولت آج گیارہ سال گزرنے کے بعد میں اس قابل ہوں کہ اپنے اندر بھرے ہوئے دُنیاوی کچرے کے ڈھیروں کو نکال سکوں۔ بلاشبہ آپ کے گھر کا نام ''داستان سرائے'' کا سب سے خوش رنگ' خوبصورت اور خوشبودار پھول ہیں' وہ سب خوش نصیب لوگ جن کو آپ سے ماں کی آغوش اور محبت نصیب ہوئی۔ آج بھی آپ کی لازوال قربت کی مٹھاس اور خوشبو اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں۔

اُس وقت میں نے متعدد ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جو فی الحقیقت میرے لیے ازحد مفید ثابت ہو سکتی تھیں نہ مجھے اس بات ہی کا ادراک تھا کہ جہاں میں زندگی کی وقتی اور ناپائیدار عیاشیوں میں مبتلا تھا۔ میرا دل ایک دوسرے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ گویا اس دوران وہ اندر ہی اندر آبِ حیات کے لازوال چشمے سے سیراب ہو رہا تھا جو اُن تمام

عظیم ہستیوں کے فیض سے تھا' جو داستان سرائے سے منسلک تھیں۔

اس کے بعد میری روح ایک طویل عرصے تک نیم جان سی رہی' لیکن اُس گوشہ عافیت سے دُور ہو کر میری زندگی پھر ایک نئی راہ پر گامزن ہوگئی۔ خدا کا شکر کہ اس طویل عرصے اور دُوری کے باوجود آبِ حیات کا وہ چشمہ جو آپ کا عطا کردہ تھا' مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔

دراصل اس کا ذریعہ تھا زاویہ' کھیل تماشہ' مردِ ابریشم' شہاب نامہ' لبیک' تلاش اور میری خوش بختی پیارے نوکی بھائی سے مسلسل قرب اور رابطہ۔ اس فہرست میں اور کتنے ایسے نام بھی ہیں جن سے تعلق محض اس احساس کے ذریعے تھا کہ اُن سے گفتگو' تعلقات' اُن کی خاموشی میں بھی مجھے ماورائی کیفیت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اُن کے ذریعے مجھے اُن راستوں کا ادراک ہوا جن پر چلنے کی مجھے خواہش تھی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو گامزن بھی ہو سکوں۔

مجھے یقین ہے کہ وہ دُعائیں جو عرصہ پہلے مجھے داستان سرائے سے ملی تھیں میری محافظ بنی رہیں اور بالآخر مجھے اس آبِ حیات سے روشناس کر دیا۔

ان تمام عنایات کے لیے میرا دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور پیغام محبت قبول کیجئے۔

اپنا دھیان رکھیے گا۔

علی

ڈیئر آنٹی بانو!

میں ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں میرے لیے آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میری رہنمائی کی۔ دوپٹہ اوڑھے آپ کا دلنشین چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

میرے لیے ماڈل ٹاؤن میں جنت اور دوزخ دونوں ہی موجود تھے۔ جنت صرف وہاں تھی جہاں آپ اور اشفاق انکل میرے رہبر تھے۔

آپ سے جدا ہونے سے پہلے مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ علم و ادب کی دنیا خصوصاً پاکستان میں آپ کا کتنا بڑا مقام ہے۔

میں یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ مجھ جیسی ناچیز اور بے علم ہستی کو آپ کیوں کر اپنے سایۂ عافیت اور حفاظت میں رکھتی تھیں۔ اس کے لیے میرا دل ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔ یہ آپ کے عطا کردہ پند و نصائح ہی تھے کہ آج میں ایک خوش نصیب بیوی اور ماں بن چکی ہوں۔

آپ نے مجھے سادگی کا درس دیا۔ آپ ہی کے طفیل میں اپنے شریکِ حیات کی حقیقی قربت سے فیضیاب ہوئی۔ یہ آپ ہی تھیں جنھوں نے مجھے محض ایک جمعدارنی سے وہ کچھ بنا دیا جو میں آج ہوں۔ یوں مجھے اپنے خاوند سے تعلقات مضبوط کرنے میں مدد ملی۔

عمیر نے پچھلے دنوں مجھے آپ کی کتاب ''مردِ ابریشم'' سے وہ اقتباس پڑھ کر سنائے جو دراصل میری ہی کہانی

تھی۔ آپ کے قلم نے اُسے جو ندرت عطا کی اُس کا احساس مجھ پر کپکپی طاری کر دیتا ہے۔

میں جتنے سال بھی پاکستان میں رہی' سوچتی ہوں کہ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ ہمدرد' لوگوں میں صرف اس لیے قابل قبول تھی کہ میں علی کی بیوی تھی۔ یہ خیال میرے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ لیکن پھر آپ اور انکل اشفاق میرے والدین بن گئے۔ مجھ میں اعتماد پیدا کیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ آپ میرے خیر خواہ بنے اور یوں میرا سب کچھ بن گئے۔

میں زندگی بھر آپ دونوں کے لیے نہ تو اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گی اور نہ آپ کے ان گنت احسانات کے بوجھ ہی سے نکل پاؤں گی۔

میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں۔

محبت کے ساتھ

ہاروی

یہ صفحات میں نے رہنمائی کے دو اصولوں کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ محبت دو طرح سے زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا اگر دکھاوے کی محبت بھی کرتا ہو وہ اپنی شیخی' برتری اور انا کی خاطر بھی محبت کا ڈھونگ رچاتا ہو تو بھی اس محبت کا اجر اُسے زیادہ ملتا ہے اور یہ سودا بھی جس میں نیت کی خرابی ہوتی ہے نفع کا باعث بنتا ہے۔ کبھی واپسی میں گھاٹے کا امکان نہیں۔

دوسری محبت جو اللہ کی مہربانی سے بابا لوگ خاص کر اور کوئی کوئی خوش نصیب عام طور پر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایسی محبت کا اجر خود اس انسان کی کیمیا گری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں محبت دینے کی بدولت ایک سدا بہار فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پُر اُمید' زندگی پر بھروسہ کرنے والا' مشکلات سے نہ گھبرانے والی روح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت' توانائی' تقویت اور استقامت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

ایسی دینے والی محبت عموماً ماں کے رُوپ میں دیکھنے کو ملتی ہے جو ایثار' قربانی اور خدمت کا مظہر ہوتی ہے۔ لیکن کسی پر احسان نہیں دھرتی۔ ایسی محبت کا رُوپ اُس باپ کی صورت میں بھی نظر آتا ہے جو ساری عمر جوتیاں چٹخاتا' محنتیں کرتا' بچوں کی خواہشات پر قربان ہوتا اور بیوی کی مشکلات کے آگے ڈھال بنا رہتا ہے۔

ایسا مرد بھی شجاعت' روحانیت اور استقامت کی تصویر بن جاتا ہے اور لوگ مدتوں اس مثالی رول ماڈل کو یاد رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اُس کی مثال دے دے کر راستے کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جسے آپ آزما کر تو دیکھیں۔ آزمانا شرط ہے۔ میں نے تو مُنی اور اُس کے گھرانے کو یہ نسخہ برتتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!

نور الحسن

جس شخص کا ٹیلی ویژن سے چھوٹا سا بھی رابطہ ہے' وہ نور الحسن کی شخصیت سے بخوبی نہیں تو سرسری طور پر ضرور واقف ہوگا' لیکن میں نے اس نوجوان کو ذرا مختلف انداز میں جانا ہے۔ خاں صاحب سے اُن کی زندگی میں ملنا رہا لیکن میں

نے اُسے نہیں دیکھا۔ جونہی خاں صاحب اپنے گھر سدھارے نورالحسن گربہ پائی سے داستان سرائے کی طرف بڑھنے لگا۔

ہمارے برآمدے میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے ساتھ ہی اس کمرے کی دیوار کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ دیوار نورالحسن کی ٹیک تھی۔ وہ پتہ نہیں کیسے اور کب آجاتا اس دیوار سے لگ کر لڑکیوں کی طرح رویا کرتا۔ ویسے بھی نورالحسن میں کم عمر لڑکیوں جیسی لجاجت اور حیا ہے..... مجھے یہ تو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ میں نورالحسن کے پاس بیٹھتی اور اُس سے رابطہ قائم کر لیتی..... لیکن اثیر احمد جو روز باپ کی قبر پر جاتے اور باپ کو بلاتے رہتے تھے اُنہوں نے نور کو پہچان لیا۔ اس دور میں جب باپ کو بھلانا مشکل تھا نور اور عکسی نے اثیر کے دل لگانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ عکسی مفتی ہر ہفتے لاہور آتے اور اثیر کے ساتھ لگ کر اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر سوتے.... نورالحسن نیچے قالین پر بیٹھ کر اثیر خاں کے پلنگ کے ساتھ جڑ کر اپنی پشت کو پلنگ سے ٹیک لگا کر بارہ بارہ بجے تک بغیر ہمدردی جتائے دوستی کا دم بھرے بغیر ٹکے رہتے۔ ایسے مہربان زندگی کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی بڑی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ گھر میں بڑی عاجزی اور انکساری سے داخل ہوتا اور ہاتھ جوڑے کندھے سکوڑے رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ میں ابھی نور کی شناخت سے محروم تھی۔ پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ عموماً تبدیلیاں لانے والے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی ہوا کرتے ہیں۔ پی ٹی وی نے اپنی چھیالیسویں سالگرہ کا فنکشن اسلام آباد میں منایا۔ مجھے خان صاحب کا ایوارڈ لینے جانا تھا۔ فرخ بشیر نے میرے ساتھ میرے قیام و طعام کا بندوبست میریٹ میں کر رکھا تھا۔ چونکہ میں ان دنوں بیمار تھی اس لیے میرے ساتھ اثیر بیٹے کی ٹکٹ اور رہنے کا انتظام بھی فرخ بشیر نے کیا۔

ہم دونوں ہوائی جہاز سے اسلام آباد پہنچے اور سیدھا عکسی مفتی کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بہت ضروری میٹنگ کے سلسلے میں لاہور چلے گئے ہیں۔ ہماری دیکھ ریکھ کی ذمہ داری وہ بی بی اُنیب اور روبینہ کو سونپ گئے تھے لیکن اثیر خاں نے واپس لاہور پہنچنے کو ترجیح دی اور مجھے بھی یہ مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر بسرام کروں اور اُن دونوں خواتین کو بلاوجہ بور نہ کروں۔

اس تبدیلی کا پروگرام بنانے کے لیے اثیر خاں نے اپنے نورالحسن کو فون کیا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل کے ڈیرے میں رہے۔ مجھے پروگرام کے وقت conduct کرے اور سارا وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔ اثیر بیٹے نے مجھے ہوٹل میں چھوڑا اور خود ایئر پورٹ سدھارا۔ اب میں ایک اغوا شدہ بچے کی طرح نورالحسن کی تحویل میں تھی۔

ہوٹل میں پہنچ کر نور نے مجھ سے کہا "اگر آپ چاہیں تو میں روبینہ یا پھر اُنیب کو آپ کے پاس چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی پی ٹی وی والوں نے مدعو کر رکھا ہے۔ میں آپ کے آس پاس ہی منڈلاؤں گا۔"

میں نے کچھ لمحے سوچ میں گزارے۔ اُنیب بیگم عکسی مفتی کی ماتحت ہیں اور لوک ورثہ میں "دبستانِ شہابیہ" کی ساری تزئین و آرائش کی انچارج ہیں۔ دو ایک بار وہ عکسی کے ساتھ ہمارے ہاں ٹھہر چکی تھی لیکن میں نے اُسے اس ایکسٹرا ڈیوٹی پر بلانا مناسب نہ سمجھا۔

روبینہ خالد مشہور و معروف رؤف خالد کی اہلیہ ہیں لیکن اس کے علاوہ اُس کی سب سے بڑی خوبی اُس کی فراخدلی اور سخاوت ہے۔ وہ اپنی ذاتی دولت کو اس خندہ پیشانی سے دوسروں پر لٹاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے..... میں نے سوچا وہ میرے پاس تحفوں سے لدی پھندی آئے گی اور میں اُس کی عنایات کا سوائے زبانی شکریہ کرنے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی اس لیے میں

نے نور سے کہا..... "بھائی! تم اُن دونوں کو رہنے دو۔ ہم دونوں ایک رات ایک دوسرے کی کمپنی کو زہر مار کر لیں گے۔"

نور اپنی عاجزی اور انکساری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جھٹ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا..... "ماں جی! میرے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کے متعلق میرے بچے بھی بڑے ہو کر شیخی مارا کریں گے لیکن مجھے معلوم ہے آپ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ یوں رہی نہیں۔ کہیں آپ کے لیے مشکل نہ ہو"

اب میں نے جھوٹ بولا..... "ناں بھئی نور! تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو..... اثیر کا کوئی دوست میرے لیے کیسے اجنبی ہو سکتا ہے؟"

نور الحسن، اُس کی بیوی صائمہ، بیٹے اویس اور خالد ہمارے ہاں آتے جاتے تھے۔ صائمہ نے اثیر احمد کو اپنا بھائی بنا رکھا تھا۔ جب بھی وہ آتی عموماً دوسری منزل پر یہ دونوں چلے جاتے۔ اثیر بچوں کو پا کر نہال ہو جاتا۔ اُن کے ساتھ کھیلتا۔ انہیں ٹافیاں لیمن ڈراپ دیتا۔ نور تو میرے قریب اس قدر نہ آ سکا لیکن صائمہ واقعی بیٹی بن گئی..... لیکن پی ٹی وی کے فنکشن کے بعد نور بھی گھر کا فرد بن گیا۔

فنکشن ہوٹل کے ہال میں تھا۔ بالکل سامنے مغرب کی طرف پشت کیے سٹیج تھا۔ اس پر فرخ بشیر اور جج صاحبان رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں سیڑھیاں تھیں جن پر سے انعام لینے والوں کو اُوپر جانا تھا۔ سٹیج کے دائیں جانب اُن لوگوں کے ڈیسک لگے تھے جن کو انعام حاصل کرنا تھا اور سامنے قطار در قطار ملک کے وی آئی پی، پریس کے نمائندے، صحافی دنیا کے جغادری، مقبول اور معروف ایکٹر پروڈیوسر، ڈائریکٹرز بیٹھے تھے۔ پھر اسلام آباد کے لوگ جو فنکشن شروع ہونے کے بعد تک آتے رہے۔

نور مجھے ہوٹل کے کمرے سے نیچے لایا۔ اُس نے مجھے صاحب لوگوں کی طرح بازو کا سہارا پیش کر رکھا تھا۔ میں اُس کا بازو اور ہاتھ تھامے اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب میں خاں صاحب کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ لینے گئی تو وہ مجھے سہارا دیے سٹیج تک لے گیا۔

فنکشن بہت لیٹ ہو گیا۔

جب فنکشن ختم ہوا تو ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ پتہ چلا کہ جو کوپن ہمیں دیے گئے تھے وہ تو نو بجے تک Valid تھے۔ اس کے بعد ہوٹل ہمارے طعام کا ذمہ دار نہ تھا۔ میں تو شاید مارے شرم کے بھوکی سو جاتی۔ یہاں پھر نور الحسن نے کاؤنٹر پر جا کر کھانا آرڈر کیا اور اُس کا بل بھی خود ہی چکایا۔

مجھے فکر تھی کہ میں شوگر کی وجہ سے بار بار غسلخانے جاتی ہوں نور تو میری وجہ سے بار بار جاگے گا، لیکن اُس رات مجھے پتہ چلا کہ نور الحسن تو بچوں کی طرح سوتا ہے۔ کوئی کھڑ کا دھڑ کا اُسے نہیں جگاتا۔ فجر کی اذان ہوٹل کے بالکل قریب ہی کسی مسجد سے آئی تو میں نے خدا کا شکر کرنے کی غرض سے کمرے میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ کئی بار کھانسی، پانی کے استعمال کے بعد میرا معمول ہے کہ بہت ساری چھینکیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نور گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔

پھر دن چڑھے ہمیں پی ٹی وی کی وین ایئر پورٹ چھوڑ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی ساری سیڑھیاں کیونکر چڑھوں گی۔ اس وقت بھی نور ہی آڑے آیا اور قریباً اُٹھا کر اُوپر اکونومی کلاس میں لا بٹھایا۔ مجھے کھڑکی والی نشست پر بٹھایا

اور خود درمیان والی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھا۔ گھر آ کر اُس نے ہمیشہ کی طرح گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اجازت چاہی۔ اس کے بعد
پھر اشیر کا حلقہ بگوش بن گیا۔

لیکن رات کے قیام اور ساتھ نے نور کو گھر کا ایک فرد بنا دیا..... اب وہ اور صائمہ باقی بچوں کی طرح میری توجہ کے
مطلوب بن گئے ہیں۔ صائمہ اچھے اچھے کھانے پکا کر اشیر خاں کی بیٹی زینب (مونو) کے لیے کپڑے ڈیزائن کرتی اور سو
ہے۔ دعوتوں پر باورچی خانے میں ہاتھ بٹاتی اور کام کرتی ہے۔ نور جتنی بار میں کمرے میں داخل ہونے کا اُسے چانس دو
کھڑا ہو جاتا اور اُس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک میں بیٹھ نہ جاؤں..... ڈیروں پر ایسے لوگ ملا کرتے تھے جن کے لیے
ادب آداب کا یہی طریق کار تھا' لیکن ہمارے شرفاء میں یہ مبالغہ آمیز اُٹھک بیٹھک خوشامد پر محمول کی جاتی ہے۔

میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ محبت کے اظہار میں اپنی جان کو تکلیف دینا کچھ آسان سا کام نہیں..... لیکن
سوچتی ہوں کہ ماسٹر آف Ceremonies بننا بھی تو کوئی عام پروفیشن نہیں..... یہ بھی تو اپنے آپ کو کمتر بنا کر دوسرے
انسان کی صلاحیتوں کو تاج پہنانے کا ہی کام ہے..... البتہ کچھ کمپیئر ایسے منہ زور ے اور شہ زور ے بھی دیکھے ہیں جو
مہمان کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اُسے مجرم صورت بھی پیش کر دیتے ہیں۔

(نورالحسن نے ٹیلی ویژن کے لیے ایک پروگرام کیا جس میں چار درویش محمد یحییٰ خاں' عکسی مفتی اور میں شامل
ہوئے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا پیش خدمت ہے)

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ اُن کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے۔ ابھی
چھوٹے سے تھے تو اُنہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے' اس کی کاپیاں بناتے اور منٹگمری کے سکول میں
جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب اُنہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اُردو کے دوران ہی اُن کی پہلی کتاب
محبت سوافسانے" آ گئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی تلقین شاہ لکھنا شروع
جو پورے 39 سال آن ایئر گیا۔ لیکن اُن کی تخلیقی قوتیں تلقین شاہ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ریڈیو
ڈرامے لکھے' پھر جونہی ٹیلی ویژن 1965ء میں ہماری زندگی کا حصہ بنا' اُنہوں نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ
نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمپیئرنگ کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ
موسیقی سے گہری دلچسپی نے "نکھار" جیسے پروگرام دیئے..... "زاویہ" سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی ہر دل عزیزی مختلف طبقوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے جس قدر
اُن کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں
وہ بھی "اُجلے پھول" اور "ایک محبت سوافسانے" جیسے۔ "صبحانے افسانے" سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

جنہیں تلقین شاہ سے عشق تھا وہ اُنہیں کسی اور رُوپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ البتہ "زاویہ" ڈور ڈور پھیلا
الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند کا

ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔

لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین' ناظرین کی محبت ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی کے عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی' برائی' کمی بیشی' اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو غالباً اسی لیے خدا کا سب سے بڑا رُوپ کہا جاتا ہے۔ محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔

ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کیڑے نکال کر کسی اور کا قد چھوٹا کر کے' کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناتے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے ہوں گے۔ یقیناً اُن میں حب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی۔ لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے حصولِ نفس میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو پنکھی جھل کر دہکانا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

لیکن لوگوں کی محبت کے کیا کہنے۔ آج بھی تین سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ ان کی بشریت پر دھیان نہیں دیتے بلکہ انہیں ایک بہت بڑا آدمی' برگزیدہ صوفی' ایک اصول ادیب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چیں لوگ اور محبتی مہربان سب خاں صاحب کی بہتری چاہتے ہیں۔ صرف طریقہ واردات مختلف ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے۔ عیب ڈھونڈنے والے سچ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پتہ نہیں خاں صاحب ان دونوں کا احسان کیسے اُتار پائیں گے۔ اتنے فاصلے کیسے طے کریں گے؟

مجیب الرحمٰن شامی + چودھری سردار محمد + حمید صاحب

ڈرائنگ روم کچھ کچھ زاویے کا رُوپ دھارنے کی کوشش میں تھا۔ کچھ لوگ خاں صاحب سے ملنے وقتاً فوقتاً آنے لگے تھے۔ ان میں مجیب الرحمٰن شامی' چودھری سردار محمد اور حمید صاحب عموماً اکٹھے آتے۔ میں ان کی صورتوں سے بھی واقف نہ تھی' لیکن ان کے آنے پر خاں صاحب خاص طور پر اندر آ کر کہتے:

''قدسیہ گوبھی کے پکوڑے بنا دو..... لیکن کسی اور کو تکلیف نہ دینا۔ یہ تم ہی کو پکانے ہیں۔''

یہ بڑے پُرتکلف دن تھے..... امیری اور غریبی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اسراف سے پرہیز اور فراخدلی سے خرچ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی میں درمیانی دروازے تک پہنچ کر سنتی تو اندر سے تعریف کے ڈونگرے برستے سنائی دیتے۔ ان میں سب سے اُونچی آواز شامی صاحب کی ہوتی۔ سردار صاحب پولی آواز میں ہاں سے ہاں ملا دیتے۔ کبھی کبھی ان کے جانے کے بعد خاں صاحب مجھ سے کہتے:

''قدسیہ! اگر کبھی تمہیں ان پر کچھ لکھنے کی حاجت پیش آئے تو اجتناب کرنا۔ یہ تم سے بڑے لکھاری اور بڑے انسان ہیں۔ میرا ان سے کتنا ہی سیاسی اختلاف کیوں نہ ہو میں ان کی بڑائی سے منکر نہیں ہوسکتا۔''

شاید اسی تنبیہ کی وجہ سے میں نے کبھی سردار صاحب کی کتابوں پر قلم نہیں اُٹھایا۔

مجیب الرحمٰن شامی

اب مجیب صاحب کا اپنا اخبار ہے۔ اُن کا بڑا نام ہے۔ جلد ہی آپ کو یہ اطلاع بھی ملے گی کہ ٹی وی پر ''پاکستان'' چینل کھل گیا ہے۔ اُن کا منجھلا بیٹا عمر شامی اخبار میں اُن کے ساتھ سب ایڈیٹر کے طور پر بڑی شہرت کما رہا ہے۔ بڑا بیٹا علی سافٹ ویئر کا اپنا کام کرتا ہے اور بیٹی کنیئرڈ کالج میں پڑھانے کے بعد یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ سب اپنے اپنے مقام پر مضبوطی سے مجیب الرحمٰن شامی کا کام اور نام روشن کر رہے ہیں۔

چودھری سردار محمد

سردار صاحب کے بیٹے ہارون جو بینک آف پنجاب میں جنرل منیجر ہیں' اُنہیں بارہا فون کیا کہ سردار صاحب کے کوئی بائیوڈیٹا اُن کا کوئی شناختی مضمون بھجوایئے لیکن اُن کی طرف سے چپ رہی۔ پھر میں نے ایڈن والا میں سید امجد حسین کو فون کیے کہ سردار صاحب کی بیٹی انجم جو اس وقت اسمبلی کی رُکن ہیں اور سید امجد حسین کی اہلیہ ہیں' میری رہنمائی کے لیے کچھ لکھ دیں۔ لیکن رفتار کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔

حمید صاحب

ان دونوں کے ہمراہ حمید صاحب تیسرے نمبر پر تھے۔ قد میں سب سے لمبے' گفتگو میں آخری نمبر پر اور تعریف کرنے میں صفر تھے۔ وہ کسی سافٹ ویئر کمپنی کو چلاتے تھے۔ مجھے خاں صاحب نے اُن کے متعلق کم کم ہی بتایا اس لیے کچھ گوش گزار نہیں کر سکتی۔

مسعود میاں

قریباً 1985ء یا 1986ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا نما شخص مجھے ملنے آیا۔ میں نے اُسے بار بار پوچھا کہ کہیں تمہیں خاں صاحب سے تو نہیں ملنا، لیکن اُس نے لجاجت سے کہا..... ''جی نہیں! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے۔''

اس مبارک شکل نوجوان سے میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے سوال کیا..... ''کوئی کام؟''

''جی نہیں کوئی کام نہیں۔''

عجیب سی بات ہے کہ آج 2008ء آ پہنچا' مسعود سے رابطہ قائم ہے لیکن اُس نے نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کوئی چیز ہی مانگی..... یہ ضرور اضافہ ہوا کہ اب وہ السر کا مریض ہے۔ ڈپریشن اُس کا ساتھی بن گیا ہے اور اُس کی آنکھوں میں اعتماد اور خوشی کے بجائے اُداسی اور حیرانی کی سی کیفیت رہتی ہے جیسے وہ کسی سے پوچھنا چاہے کہ آخر میں نے کیا کیا ہے جس کی یہ سزا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟

آج کے عہد میں یہ سوال بیشتر نوجوان پوچھ رہے ہیں۔ مسئلہ سارا شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی میں مضمر ہے۔ اُنہیں دنیاوی ترقی اور کامیابی کا وہ مقام درکار ہے جس کو حاصل کرنے میں ایک عمر لگتی ہے۔ تیز رفتاری کے اس زمانے میں اتنا لمبا انتظار ذہنی طور پر تھکا دیتا ہے۔ کبھی وہ بابوں کے ڈیروں پر دنیاوی ترقی کا تعویذ لینے جاتے ہیں۔ کبھی مستبیر کے دروازے کھٹکھٹاتے اور بے نیل ومرام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

مسعود اُس وقت Disillusioned نہیں تھا۔

میں نے اُس سے اُس کا حدود اربعہ پوچھا تو اُس نے لجاجت سے کہا..... ''والد صاحب نیشنل بینک میں چیف کیشئر ہیں اور کچھ ٹھیکے پر زمینداری ہے۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔''

میں نے کہا..... ''مسعود میاں! یہ کیا بات ہے کہ جو بھی بہاول نگر سے آتا ہے ہمیشہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے۔ کیا یہ وہیں کے بابوں کا اثر ہے۔ بہاء الدین ذکریاؒ وہاں کی مٹی میں قناعت کا بیج بو گئے ہیں کہ وہاں کے حاکم انصاف کو اس طرح بانٹتے رہے ہیں کہ لوگوں میں شکایت کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟''

''یہ تو جی آپ کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہم تو فی الحال فکرو فاقے سے آزاد موج میلا منا رہے ہیں۔''

چند دن کے بعد مسعود پھر آ گیا۔ اس بار کھلا کہ اُس نے کہیں سے ''راجہ گدھ'' پڑھ لی تھی اور حسنِ اتفاق سے اُس کے سحر میں پھنس گیا۔ اسی روز اُس نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ سا پکڑا دیا۔ میں سمجھی کہ شاید کوئی فرمائش درج ہوگی۔ کھول کر پڑھا تو ایک نظم صاف ستھری لکھائی میں رقم تھی۔ بہت سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مسعود کی لکھائی ویسی ہی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ نظم کے شاعر کا نام معلوم نہیں بہرحال آپ نظم ملاحظہ کیجیے:

''اِک کمال کی خواہش''

کس طرح سجاتے ہو
مصلحت کی شاموں میں
محفلیں محبت کی، اور محبتیں بھی وہ
سال بھر مہک جن کی
دل کی ساری گلیوں میں رقص کرتی پھرتی ہیں
کس طرح جلاتے ہو
آندھیوں کے موسم میں تم دیئے رفاقت کے
تم جو حبس موسم میں اِک ہوا کا جھونکا ہو
کچھ ہمیں بھی بتلاؤ، کچھ ہمیں بھی سکھلاؤ
ہم تمہارے جذبوں کے، نیک سی فضاؤں میں

پھول جیسے گیتوں کی رقص کرتی خوشبو کے
بے قرار شاعر ہیں

اس نظم کا مجھ پر بڑا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے فوراً عینک بدل لی اور مسعود کو بڑے شفیق شیشوں سے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا..... ''تمہاری تحریر سے لگتا ہے کہ تم لکھتے لکھاتے بھی ہو؟''

لڑکیوں کی طرح شرما کر وہ بولا..... ''جی کچھ سنجیدگی سے نہیں بس ایسے ہی شوقیہ۔''

کہنے کو تو مسعود نے کہہ دیا..... لیکن پتہ نہیں کیوں اُس کے چہرے پر وہ آرزو جھلکنے لگی جو تخلیقی قوتوں کے [illegible] فنکاروں میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مسعود میاں میری زندگی سے غائب ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زمینداری پر لوٹ گیا ہے اور مزے میں ہے۔ کافی دیر گزری کہ ایک روز مسعود میاں [illegible] وارد ہو گئے۔

میں نے تکلفاً اُس تاخیر کی وجہ پوچھی۔ مسعود نے بڑی نا اُمیدی سے کہا ''بانو آپا! والد صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد زمینوں کی ٹھیکیداری کے علاوہ Nesstle والوں کے ساتھ کنٹریکٹ کر لیا ہے دودھ کی سپلائی کا۔ ہم مختلف جگہوں سے دودھ اکٹھا کر کے Nesstle کمپنی کو سپلائی کرتے ہیں۔''

میں نے کہا..... ''یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں اتنا مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟''

مسعود کہنے لگا..... ''بانو آپا! مجھے خدشہ ہے کہ یہ کمپنی ہمارے لیے کہیں خدانخواستہ ایسٹ انڈیا کمپنی ثابت [illegible] کیونکہ والد صاحب نے ساری زندگی ملازمت میں گزار دی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کو عموماً کسی بھی طرح کے کاروبار [illegible] پہچان نہیں ہوتی۔ آپا جی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بے شمار لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی جمع پونجی تاج کمپنی میں [illegible] تھی یہ سوچ کر کہ مقدس کلام چھاپنے والی کمپنی ہے۔ یہاں اُن کا سرمایہ بڑا محفوظ رہے گا لیکن اُن کے ساتھ کیا ہوا [illegible] بیچارے دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو تاج کمپنی تھی ہم نے تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ کنٹریکٹ کیا [illegible] سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔''

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا..... ''دیکھو مسعود! مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ اللہ سب خیر کرے گا' میری [illegible] تمہارے ساتھ ہیں اور یاد رکھو ہر ناکامی سے کسی نہ کسی کامیابی کا پہلو ضرور نکلتا ہے اور ہر کامیابی کے ساتھ کوئی نہ کوئی [illegible] لگی ہوتی ہے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں پریشان نہیں ہونا' گھبرانا نہیں۔''

ایک مدت مسعود مجھے ملنے نہ آیا۔

پھر ایک روز اُس نے تجربے کے پانیوں سے سر نکالا اور مجھے آ کر بتایا..... ''آپا جی! ایسٹ انڈیا کمپنی نے یک طرفہ طور پر کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جو سرمایہ اس کاروبار میں لگایا تھا اُسے واپس نہیں نکال سکے۔ والد صاحب [illegible] صورتِ حال سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ بقول ترقی پسندوں کا تصوف یا روحانیت صرف ایک نشہ ہے۔ ابو جی اس [illegible] کے بعد اس نشے میں اور بھی زیادہ راسخ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بہادر شاہ ظفر کی طرح کنگال [illegible]

آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

میں نے دلاسہ دینے کے انداز میں کہا.... ''چلو مسعود! جسے تم نقصان سمجھ رہے ہو وہ بھی ایک طرح کا نفع ہے۔ بڑے ادیب کو ناکامی کا تجربہ کندن بنا دیتا ہے۔ تم لکھاری ہو اب تیزی سے منزل کی طرف بڑھو گے۔ اب تم بڑی سنجیدگی سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔''

شاید میری تھپکی کا اثر تھا کہ اُس کے اندر کا ادیب جاگ گیا تھا۔ وہ لکھنے لکھانے کی طرف سنجیدگی سے مائل ہو گیا لیکن مسعود نے مجھے کبھی نہ تو کتاب چھپوانے کے لیے کہا نہ کسی افسانے کو لکھنے کے لیے مجھے اُس پر تبصرہ کرنے کے لیے اصرار کیا۔ پھر اُس کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ اُس کی جھولی میں پکے بیروں کی طرح خود بخود تعریف کرنے والے fan گرنے لگے۔ نوے کی دہائی میں کہیں مسعود ہمارے ساتھ منسلک ہو گیا۔ خاں صاحب کا تلقین شاہ کتابی صورت میں edit کرنے کے لیے ایک ہمہ وقت ایڈیٹر درکار تھا۔ مسعود حاضر ہو گیا۔ اُس سے پہلے ہمارے پاس عمران موجود تھا۔ عمران وکالت کا امتحان دینا چاہ رہا تھا۔ اُسے کسی پارٹ ٹائم نوکری کی ضرورت تھی۔ وہی آ کر یہ کام کیا کرتا۔ لیکن جونہی عمران کورٹ میں می لارڈ کہنے کے قابل ہوا' یہ جگہ خالی ہو گئی۔

ہمارے گھر کے علاوہ وہ سنگ میل پبلشرز کے پاس بطور ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ چودھری افضال احمد اُسے میری اور خاں صاحب کی کتابوں کے علاوہ پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیتے ہیں جس پر وہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔

اب مسعود کا راستہ متعین ہو گیا..... داستان سرائے' سنگ میل اور ادب سے گہری شیفتگی!

☆☆☆

اشفاق احمد کی یاد میں

مسعود میاں

مجھے ساتھ والے گھر سے کسی لڑکی کی اُونچی اُونچی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ والا گھر ایک وکیل کا تھا۔ اُس کا نام تو ثمر تھا لیکن اُس کی بیوی کو ساری زندگی کوئی ثمر نہیں لگا۔ جب اُن کے ہاں کوئی بچہ ہی نہیں تھا تو پھر کسی لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دن کے وقت البتہ ایک لڑکی اکثر اُن کے ہاں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ شاید اُن کی کوئی رشتہ دار تھی۔ اُس کے بال بوب کٹنگ میں تھے اور سامنے والے دانتوں میں خلا تھا۔ وہ اُس خلا پر مسلسل اپنی زبان پھیرتی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کی نگاہ اُس کے دانتوں کے خلا میں اس طرح پھنس کے رہ جاتی تھی جیسے امرود کھاتے ہوئے آپ کے دانتوں میں اس کا کوئی بیج پھنس جاتا ہے۔ پھر اسے بڑی جدوجہد سے نکالنا پڑتا ہے۔ اکثر کوئی پھانس نہیں بھی نکلتی اور بڑے دنوں تک تکلیف دیتی رہتی ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ 1978ء کی ایک تاریک رات تھی۔ میں اپنے گھر اور پڑوس کی سانجھی دیوار

کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے لڑکی کے مکالموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ اُس بوب کٹنگ والی لڑکی کی آواز نہیں تھی۔ جب میں نے دیوار کے اُوپر سے دوسری جانب دیکھا تو وہاں گھر کے پچھلے برآمدے میں ایک تپائی پر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پڑا تھا اور اس میں اشفاق صاحب کے ڈرامے کا سین چل رہا تھا جس میں روحی بانو باغ میں کو اُڑاتی پھر رہی تھی اور پھر وہیں باغ میں لگے جھاکے سے مکالمے بولنے لگتی تھی۔

میری عمر اُس وقت آٹھ یا نو برس کی تھی۔ یہ میرا خاں صاحب کی کسی ڈرامائی تحریر سے پہلا تعارف تھا۔

یہ 1992ء کی بات ہے۔ میرے پاس ایک جاپانی ٹیپ ریکارڈر ہوا کرتا تھا۔ ابھی چائنہ میڈ چیزوں کا بہتات نہیں ہوئی تھی اس لیے جاپانی چیزیں عام دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ اُس ریکارڈر میں پلے کے بٹن کے ساتھ سرخ رنگ کا بٹن بھی تھا۔ جب دونوں بٹنوں کو بیک وقت دباتے تو ریکارڈنگ شروع ہو جاتی تھی۔

ہر ہفتے کی رات آٹھ بجے میں اس ریکارڈر کو لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنے پسندیدہ ڈرامے کی ریکارڈنگ کرتا۔ جب ڈرامہ ختم ہو جاتا تو پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور اُس ڈرامے کے ریکارڈ شدہ مکالمات کو کاپی میں اُن مکالمات کو لکھ کر یاد نہیں کرتا تھا یا پھر اداکاروں کی طرح اُن کو بولنے کی پریکٹس بھی نہیں کرتا تھا اس لیے کہ اداکاری کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں میرا لکھاری بننے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔

پھر میں وہ مکالمات آخر کیوں لکھا کرتا تھا۔ یہ وہ اہم سوال تھا جس کا جواب میرے لیے ابھی مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ وہ ڈرامہ اشفاق صاحب کا تحریر کردہ تھا اور اُس کا نام تھا ”من چلے کا سودا۔“

1997ء کو جب میں کراچی کینٹ سٹیشن پر اترا تو ایک بک سٹال پر رُک کر میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ نصرت فتح علی خان کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی سفر کے دوران دائم آباد کو جانے والے کسی مسافر کی خبر پڑھتے ہیں تو کتنا عجیب لگتا ہے۔ اچانک دل میں ایک حسرت جاگتی ہے کہ جانے والا ہمارے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہرتا تو کتنا اچھا ہوتا، مگر جانے والا تو جا چکا ہوتا ہے اور ہمارے دل میں بس ایک کسک سی چھوڑ جاتا ہے۔

جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو کر تاریک رات میں بدل چکے تھے اور ساتھ والے کمرے سے نصرت فتح علی کی آواز آ رہی تھی ”سُن چرخے دی مِٹھی مِٹھی گھوک ماہیا میٹوں یاد آوندا۔“

میرا یہ کمرہ ڈرگ روڈ سٹیشن پر بسم اللہ ہوٹل کی اُوپر والی منزل پر تھا۔ ہمارے کمرے میں ’میرے سلطان کا ٹی وی کسی خرابی کے باعث بند پڑا رہتا تھا۔ سلطان اور آس پاس کے کمروں کے لوگ رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے۔ میں جب اُن کے ساتھ رہائش پذیر ہوا تو تاش کے کھیل سے بالکل نابلد تھا۔

ایک روز چھٹی والے دن سلطان اپنے خراب ٹی وی کو کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ٹی وی میں تھوڑا سا فالٹ ہے جسے وہ خود ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔ وہ کہیں سے ایک کاویہ بھی لے آیا اور چھوٹے چھوٹے دو تین پوائنٹ ٹانکے لگانے کے بعد جب ٹی وی آن کیا تو وہ چل پڑا۔

رات ٹھیک ساڑھے دس بجے جب سب لوگ ساتھ والے کمرے میں تاش کی بازی میں مگن تھے میں

...ن کیا تو اُس پر ایک ڈرامہ چل رہا تھا جس میں صرف دو کردار تھے۔ ایک یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ اور دوسرا شاہ جی کا کردار تھا۔

سٹوڈنٹ پوچھتا ہے ''شاہ جی! آپ جدی پشتی زمیندار ہیں یا آپ نے انگریزوں سے زمینیں حاصل کی ہیں؟''

شاہ جی کہتے ہیں ''میں لعنت بھیجتا ہوں انگریزوں سے زمینیں لینے والوں پر۔ ہم تو جدی پشتی زمیندار ہیں۔''

سٹوڈنٹ کہتا ہے ''وہ کیسے جی؟''

شاہ جی بتاتے ہیں ''میرے لکڑ دادا کے دوست اکبر بادشاہ کے دربار میں وزیر تھے۔ اُنہوں نے میرے لکڑ دادا سے کہا کہ اگر آپ دین الٰہی قبول کر لو تو ہم بہت سی زمینیں تمہارے نام کر دیں گے۔ میرے لکڑ دادا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے اُنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔''

وہ کیوں جی؟'' سٹوڈنٹ پوچھتا ہے۔

شاہ جی بتاتے ہیں ''وہ اس لیے کہ دین الٰہی کو قبول کرنے کے لیے ایک ٹسٹ سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ایک کتے کی زبان کو شہد لگا دیا جاتا تھا اور جو بھی اُس کتے کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیتا وہ دین الٰہی میں داخل ہو جاتا۔ میرے دادا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے اُنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔''

''پھر کیا ہوا جی؟'' سٹوڈنٹ نے پوچھا۔

''وہ وزیر کیونکہ میرے دادا کے دوست تھے اس لیے اُنہوں نے اس شرط میں تبدیلی کر دی وہ یہ کہ اُنہوں نے شہد میرے دادا کی زبان کو لگا دیا اور کتے نے میرے دادا کے کندھوں پر اپنی اگلی ٹانگیں رکھ کر دادا کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیا۔ تو اس طرح ہم تو جدی پشتی زمیندار بن گئے اور ہم انگریزوں سے زمینیں حاصل کرنے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

یہ تلقین شاہ کا وہ پروگرام تھا جو خاں صاحب نے ٹی وی کے لیے لکھا تھا۔ اس پروگرام کے کچھ اور حصے بھی ٹی وی پر چلے لیکن ان میں بھارت اور امریکہ کے بجائے اپنے ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر تنقید بڑی سخت تھی اسی لیے اس پروگرام کو جلد ہی بند کر دیا گیا۔ اس پروگرام کا لکھنے والا اگر پیسہ کمانا چاہتا تھا یا صرف شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ کڑی تنقید کرنے کے بجائے باسانی ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کر سکتا تھا' لیکن اُس نے کبھی کسی مصلحت کو فن کے آڑے نہیں آنے دیا۔

''تلقین شاہ'' سے لے کر ''من چلے کا سودا'' تک کے مکالمات میں مجھے ایک ہیرو نظر آتا ہے۔ کوئی ہیرو ہمیں کیوں اچھا لگتا ہے؟ دراصل وہ ڈر اور خوف کی حدیں پھلانگ کر ایسے ایسے کارنامے کر جاتا ہے جس کا عام زندگی میں ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں ہیرو اچھا لگتا ہے۔ ''من چلے کا سودا'' میں موجود ہیرو جہادِ اکبر کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ میں خود اس جہاد میں حصہ لینے کے بارے سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہیرو میرا ابھی پسندیدہ ہیرو بن جاتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اشفاق صاحب کا مشہور ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' کتابی صورت میں مرتب ہو رہا

تھا اور میں اس کی پروف ریڈنگ کر رہا تھا۔ مجھے اُن کی مکمل رہنمائی حاصل رہی۔ میں جب کتاب ''زاویہ'' کا پہلا پروف لے کر خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے ''کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

میں نے عرض کی ''خاں صاحب! ''زاویہ'' کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں۔''

بڑے خوشگوار موڈ میں فرمانے لگے ''بھئی تم تو ہم پر تھانے دار لگ گئے ہو۔ ہمارا لکھا چیک کیا کرو گے اور غلطیاں پکڑا کرو گے۔''

یہ اُن کی محبت کا ایک خاص انداز تھا ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ غلطیاں دونوں سے ہوتی ہیں۔ کمپوزر سے بھی اور پروف ریڈر سے بھی۔ جہاں تک خاں صاحب کی غلطیوں کا معاملہ ہے تو میں نے اُن کے دستی لکھے ہوئے بہت سارے مسودات دیکھے ہیں۔ پہلے لفظ سے لے کر آخری حرف تک مجھے کبھی ایک کٹنگ بھی نظر نہیں آئی اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ خاں صاحب نے کبھی رف مسودہ تحریر نہیں کیا اس لیے بعد میں اُسے نیٹ کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

بات ہو رہی تھی ''زاویہ'' کے پہلے پروف کی۔ ہر بڑی تخلیق کے پیچھے اس کی ایڈیٹنگ کا بڑا عمل دخل ہوا کرتا ہے۔ ''ویسٹ لینڈ'' جیسی بڑی نظم بھی ایڈیٹنگ کے بعد ہی منظر عام پر آتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر بڑا ادیب ایڈیٹر بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ''زاویہ'' کی پروف ریڈنگ کا اعزاز مجھے حاصل رہا لیکن اس کی ایڈیٹنگ خاں صاحب نے خود کی تھی۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور اسے ایک بڑا آدمی ہی کر سکتا تھا۔

خاں صاحب کی ایڈیٹنگ کرنے کے بعد کتاب میں شامل ہر عنوان ایک مکمل قصے کی صورت اختیار کر گیا۔ ایسے قصے جو لطف تو افسانے کا دیتے ہیں لیکن وہ Reality Base پر کرتے ہیں۔ ''زاویہ'' میں تصوف کے مسائل پر پیچیدہ بحث نہیں کی گئی بلکہ یہ زندگی کی اُن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے منظر نامے ہیں جن کو عام آدمی بڑی آسانی سے نظر انداز کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں کرتا۔

بڑے فنکار کا یہ کمال ہوا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی اور معمولی باتوں کو ہمیشہ بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے اور اس قدر سلیقے سے بیان کرتا ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد وہ حقیقت جو بڑی معمولی اور غیر اہم سی لگتی ہے آپ کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کبھی آپ اُس حقیقت سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تب بھی اُسے احساس کی حد سے پرے دھکیلنا آپ کے لیے مشکل ضرور ہو جائے گا۔

ایک دفعہ جب خاں صاحب کی طرف جانا ہوا تو رکشے والے سے بڑی بحث ہوئی۔ 121۔سی پہنچ کر جب میں نے کرایہ ادا کیا تو اُس کے پاس چینج نہیں تھا۔ میں نے اُس سے پانچ روپے بقایا لینے تھے۔ بڑی دیر تکرار ہوتی رہی۔ آس پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی جہاں سے چینج مل سکتا۔ آخر میں اُسے صابری کی دکان پر لے گیا اور یوں بقایا پانچ روپے لے کر میں نے اُس کی جان چھوڑی۔

جب واپس خاں صاحب کے پاس حاضر ہوا تو انہیں سارا ماجرا بیان کیا۔ سن کر فرمانے لگے:

''یار! تم نے اُس سے بقایا کا تقاضا ضرور کرنا تھا۔ وہ پانچ روپے بھی اُسے دے دیتے'' پھر فرمایا ''مگر جب بقایا نہ لیا کرو۔ تم نے کون سا اپنے پلے سے دینا ہوتا ہے۔ دِتے میں سے ہی تو دینا ہے۔''

میں خاں صاحب کی اس بات پر ابھی تک عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ ایک روپیہ چھوڑ دینا بھی میرے لیے بڑا دشوار ہو جاتا ہے لیکن میرے دل کی یہ تمنا ضرور ہے کہ مجھ پر جلد از جلد ایسا وقت آئے کہ اس پر عمل کرنا میرے لیے آسان ہو جائے۔

جب کبھی میں اپنے گھر پر اکیلا ہوتا یا اپنے دوست احباب کے ساتھ! ہم سب ''زاویہ'' دیکھتے اور سنتے تو ایک عجیب و غریب سحر میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ ہمیں لگتا جیسے ہم سب ماضی کے قصہ گوئی کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔ ہم سب اپنی اس واپسی پر بڑا آنند محسوس کرتے تھے اور ہمیں یوں لگتا جیسے یہ داستانی طرز گفتگو ہماری جینز میں پہلے سے کہیں موجود ہے اور خاں صاحب نے اُسے پھر سے دریافت کر لیا ہے۔ اُنہوں نے بڑے منفرد انداز میں ہمارے ماضی کا ورثہ ہمیں لوٹا دیا ہے۔

آج کل لینڈ مافیا کے ہاتھوں تاریخی عمارتوں کا ورثہ تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ پرانی اور تاریخی جگہوں پر پلازے اور شاپنگ مال تعمیر ہو رہے ہیں۔ تاریخی ورثے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے والا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے میں خاں صاحب نے کم از کم داستان گوئی کے ورثے کو اس انداز سے اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیا ہے کہ اب کوئی مافیا بھی اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔

بہت سارے لوگ ملازمت یا دوسری مصروفیات کے باعث ''زاویہ'' میں شرکت کرنے کے لیے ٹی وی سٹیشن نہیں جاتے تھے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے خاں صاحب نے اپنے گھر پر بھی ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ نشست ہر جمعرات کے روز ہوا کرتی۔ مجھے بھی وہاں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔ بزنس کلاس' اساتذہ' خواتین' خاص کر نوجوان طبقے کی تعداد زیادہ ہوتی۔ عصر کے وقت ہم وہاں پہنچا کرتے' مغرب کے وقت نماز کا وقفہ ہوتا۔ خاں صاحب نماز کے لیے گھر کے اندر تشریف لے جاتے۔ جب وہ واپس محفل میں آتے تو سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ان محفلوں میں مجھے ایک بات کی بڑی کمی محسوس ہوا کرتی اور میں اکثر سوچا کرتا کہ واصف علی واصف صاحب کتنے خوش نصیب تھے جن کو اشفاق صاحب جیسے سننے والے میسر رہے' لیکن خود اشفاق صاحب کی محفل میں مجھے ایسا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا جو اُن کے Calibre کے مطابق اُن سے سوال پوچھتا۔ ہم جیسے پوچھنے والوں نے اپنی ذات سے بلند ہو کر کبھی اُن سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

ایک بار کسی نشست میں کوئی خاتون خاں صاحب کو بتا رہی تھی کہ اُس کا شوہر نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ میں نماز اپنے مطلب کے لیے اللہ سے مانگنے کے لیے پڑھتا ہوں۔

خاں صاحب فرمانے لگے'' بھئی آپ اُسے بتاؤ لیکن سختی سے نہیں نہایت نرمی سے بتاؤ کہ جب عام زندگی میں ضرورت پڑنے پر آدمی اپنے بھائی سے مدد مانگتا ہے یا کسی عزیز رشتے دار سے مانگتا ہے تو پھر اللہ پاک سے مانگنے میں کیسی شرمندگی۔ وہ تو خود فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔''

گورنمنٹ کالج کے ایک سٹوڈنٹ نے پوچھا'' سر! میں کالج میں شلوار قمیض پہن کر جاتا ہوں تو لڑکے اور ٹیچر

میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شلوار قمیض پہننے والا جاہل ہوتا ہے۔''

اشفاق صاحب نے اُس طالب علم سے فرمایا ''یار! تم اپنے مؤقف پر تو ضرور کاربند رہو لیکن دوسروں کو سختی سے جواب مت دو۔ تم اُنہیں بڑے دھیرج اور نرمی کے ساتھ بتاؤ کہ سر! میں تو پینٹ شرٹ پہننا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں، گھر میں بوڑھے والدین موجود ہیں جنہوں نے بڑی محنت اور محبت سے میری پرورش کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اب مجھے اُن کی خاطر اُن کی خواہش کے احترام کے پیشِ نظر مجبوراً شلوار قمیض پہننا پڑتی ہے۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں میں انہیں گھر سے نہیں نکال سکتا ناں؟''

خاں صاحب کی انہی محفلوں کی بات ہے کہ ایک روز دو نوجوان آئے۔

ڈرائنگ روم کا باہر والا دروازہ کھلتے ہی سامنے جو ٹیبل لیمپ نظر آتا ہے اُس کے ساتھ والے صوفے پر خاں صاحب تشریف رکھتے تھے۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو خاں صاحب نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کو جگہ دی اور اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ وہ مختلف طرز کے موضوعات پر ایک خاص ربطِ باہمی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے یوں لگتا کہ اُن مختلف موضوعات کا آپس میں کوئی بہت گہرا تعلق موجود ہوتا ہے جسے کوئی قادر الکلام ہی دریافت کر سکتا ہے۔ سننے والے تو ندرتِ کلام کے حصار میں ہوتے تھے۔

اتنے میں مغرب کی نماز کا وقفہ ہو گیا اور اُس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب اُن دونوں کی باری آئی تو اُن میں سے ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''سر! یہ میرا دوست ہے۔ بڑا اچھا ہے بیچارہ۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ یہ بڑے عرصے سے مجھے کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اس لیے آج میں خاص طور پر اسے اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ سر! میرے اس دوست کو مرشد کی تلاش ہے۔ یہ کسی کا مرید ہونا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ اس کی رہنمائی فرمائیں کہ اس کو کیا کرنا چاہیے؟''

اکثر لوگ خاں صاحب سے بابوں کا پتہ پوچھنے آیا کرتے تھے لیکن اُن کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ بابے کا پتہ نہیں پوچھ رہے بلکہ پانی کا گلاس مانگ رہے ہوں یا چائے کا کپ یا پھر کچھ اس طرح ''خاں صاحب! فلاں کتاب کس بک شاپ سے ملے گی۔ ذرا ہمیں اُس کا پتہ تو بتائیں پلیز۔''

کسی بک شاپ کے ایڈریس میں اور کسی بابے کے پتے میں یقیناً بڑا فرق ہوتا ہے اور لوگ اس فرق کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے۔ دراصل خاں صاحب کسی ایسے بابے کا پتہ جانتے ہی نہیں تھے جس نے اپنی کوئی دکان سجا رکھی ہو۔ اُن کا تعلق فقیروں سے تھا جن کے ڈیروں پر مخلوقِ خدا کو سیدھے راستے پر چلنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن دونوجوانوں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ انہوں نے تو اپنا مقصد ہی سامنے رکھ دیا تھا کہ وہ صرف پتہ ہی نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ مرید ہونے کے بھی آرزومند تھے۔ اس معاملے میں شہاب صاحب کا مؤقف قدرے سخت تھا۔ وہ کہا کرتے تھے ''یہ زمانہ بیعت ہونے کا نہیں ہے۔''

اس بارے میں پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تبع تابعین کے ہاں مرشدین نہیں تھے۔

بصریؒ حبیب عجمیؒ اور بایزید بسطامیؒ کا کوئی مرشد نہیں تھا۔ جنید بغدادیؒ نے براہِ راست کچھ درس حضرت سری سقطیؒ سے لیے تو پہلی مرتبہ ہمیں پیرو مرشد کا ایک تعلق نظر آیا۔ تو مرشد کا ہونا لازم نہیں ہے مگر جہاں علم میں کمی ہو اور معاملاتِ نفس پیچیدہ ہوں اور شدتِ حواس غالب وہاں اُستادوں کی ضرورت اعتدال کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ نوجوان اپنے آنے کا مقصد بیان کر چکے تھے۔ اب جواب کے منتظر تھے۔ اُن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باقی سب لوگوں کی تجسس بھری نگاہیں بھی خاں صاحب پر یوں مرکوز تھیں جیسے وہ کوئی بازیگر ہوں اور ابھی وہ کسی جانب اشارہ کریں گے تو مرشد نامی کردار سب کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔

تب خاں صاحب نے اپنے بائیں جانب بیٹھے نوجوان سے فرمایا ''بھئی! آپ آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ آپ تو اُستاد کا بھی ٹسٹ لینا شروع کر دیتے ہو۔ مرشد بھی ایک طرح کا اُستاد ہی ہوتا ہے جبکہ ٹسٹ لینا تو استاد کا کام ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی مرشد کے پاس جاؤ گے بھی تو اُس پر تجربات کرنے لگو گے جیسے میڈیکل کے سٹوڈنٹ لیبارٹری میں خرگوش اور مینڈک وغیرہ پر تجربات کرتے ہیں۔''

خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ''میرے خیال میں آپ لوگ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ اپنی سمت درست رکھو۔ دوسروں کی نہیں بلکہ اپنے آپ کو' کیونکہ جب ہم دوسروں کو ٹھیک کرنے چل پڑتے ہیں تو پھر اپنا آپ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب تمہارے عمل کی درستگی ایک خاص حد تک پہنچ جائے گی تب ایک روز ایسا آئے گا کہ مرشد خود چل کر تمہارے گھر آ جائے گا اور تمہارے دروازے کی کنڈی کھڑکا کر کہے گا کہ میں آ گیا ہوں..... بیعت کرنے کے لیے۔''

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب نے ڈرائنگ روم میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ جمعرات کی محفلوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب بھی لوگ اُن سے ملنے آتے تو اُن کو کبھی مایوس نہ لوٹنا پڑتا۔ انہیں سیدھا خاں صاحب کے بیڈ روم میں لے جایا جاتا تھا' جہاں وہ اپنی بیماری کے باوجود لوگوں کو اُمید بانٹتے اور حوصلہ دیتے رہتے۔

دراصل 121۔سی میں لوگوں کو ایک ایسا کندھا دستیاب تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے اپنے دُکھوں پر رویا کرتے تھے اور وہاں وہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر پھر دوسروں کے آنسو سمیٹنے والا کندھا بہت بیمار ہو گیا۔ تب اُس نے اپنے بیڈ روم کو ہی ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔

ایک روز جب میں اُس ڈرائنگ روم میں گیا تو خاں صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پھر میرے اُس افسانے کی تعریف کرنے لگے جو میں نے اُن دنوں لکھا تھا' لیکن میں حیران تھا کہ ایک نئے لکھنے والے کا افسانہ انہوں نے شدید نقاہت کے باوجود پڑھا تھا اور پھر اُس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری سمجھی۔ میرے لیے اُن کی شفقت کا یہ ایک انوکھا انداز تھا۔ پتہ نہیں اور کتنوں کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتے تھے یا پھر سب کے سب میری طرح ہی اُن کی محبت کو فقط اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتے ہوں گے۔

پھر بات میرے افسانے سے نور والوں کے ذکر کی طرف چل پڑی تھی۔

میں نے عرض کی ''خاں صاحب! بابا جی نور والے فرماتے ہیں ''نوٹ! دین صراطِ مستقیم ہے جو لوگ سیدھا

سوچتے ہیں وہ دین پر ہیں اور جو لوگ دائرے میں سوچتے ہیں وہ دین سے خارج ہیں۔'' خاں صاحب! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری سوچ دائرے میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ سوچ کی سمت کو سیدھ میں رکھنا مجھے آتا ہی نہیں ہے۔''

خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا ''تم جس طرف رہتے ہو وہاں سے تمہیں نہر کتنی قریب پڑتی ہے؟''

میں نے انہیں بتایا ''وحدت روڈ سے ہوتا ہوا میں فیروز پور روڈ پر آتا ہوں اور ایف سی کالج کے پل سے نہر کراس کر کے ماڈل ٹاؤن کی طرف ہو لیتا ہوں۔ پل پر ٹریفک کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نہر کو دیکھنے اور اُس کے پانی کی روانی یا تلاطم کو محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ مجھے اس ہجوم میں سے گزرتے ہوئے اشارہ بند ہونے سے پہلے پل کو پار کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔

میرے راستے میں نہر تو ہے لیکن میں اس کے ساتھ کوئی خاص گہرا اور مضبوط تعلق استوار نہیں کر سکا۔ اس پر سے روز گزر جاتا ہوں' پر اس سے میرا بندھن بس ایسے ہی لمحاتی اور کمزور سا ہے' جو میرے احساس پر کوئی دستک نہیں دیتا اور وہ بھی نہایت معمولی اور غیر محسوس آہٹوں پر بھلا کون سا دروازہ کھلتا ہے۔''

خاں صاحب میرا جواب سُن کر خاموش ہو گئے جیسے وہ شاعر جس کے کلام میں نہر ایک علامت ہو اور سننے والا اُس علامت نگاری کو سمجھتا نہ ہو۔ تو شاعر پر خاموشی کا طاری ہونا لازمی امر ہوتا ہے۔ کچھ توقف کے بعد خاں صاحب نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ اُن کے سامنے ٹی وی ٹرالی کے ساتھ والے میز پر لال رنگ کی مکسچر سے بھرا ایک چھوٹا سا گلاس پڑا تھا۔ بالکل اسی رنگ کی مکسچر ہمارے شہر کا ڈاکٹر منان بھی اپنے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے وہ گلاس اُٹھانے کو کہا۔ میں نے وہ مکسچر انہیں پیش کی تو انہوں نے اُس لال رنگ کے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس مجھے واپس پکڑاتے ہوئے میرے سوال کو دُہراتے ہوئے فرمایا ''کبھی تم اپنے اردگرد دیکھو تو تمہیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کی سوچ سیدھی نہیں ہوتی لیکن انہیں ساری زندگی اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ تمہیں کم از کم احساس تو ہے۔ تم سارے دن میں کسی ایک بات پر اپنی سوچ کو سیدھا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ پھر دیکھو تمہارے ہر کام میں کیسے برکت پڑتی ہے۔'' پھر فرمانے لگے ''یار! میں اب کچھ دیر لیٹنا چاہتا ہوں'' وہ اپنے مخصوص بیڈ پر لیٹ گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔

پھر وہ لطیف میموریل شفٹ ہو گئے۔ ایک روز جب میں شام کے وقت لطیف میموریل گیا تو وہاں بانو آپا کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہسپتال سے باہر ٹریفک رواں دواں تھی۔ گھروں کو لوٹتے سائیکل سوار آہستہ رو بوڑھے' ذِگ زیگ موٹر سائیکل چلاتے اور اشارہ توڑنے کی کوشش کرتے لڑکے' بھری ہوئی بسوں کے ساتھ لٹکے ہوئے مسافر۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی فیروز پور روڈ کے کنارے لطیف میموریل میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی موجود ہے جس نے اُردو ادب کو برسوں اعتبار بخشا ہے۔ آنے والے زمانے میں اس سے زیادہ صاحب علم تو آتے رہیں گے لیکن اس جیسی انشا پردازی اب کون کرے گا۔ اُس جیسی نثر لکھنا کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

اُس روز خاں صاحب ہسپتال کے بیڈ پر بیٹھے کسی خاتون کا ذکر کر رہے تھے کہ اُس کے جسم کے مختلف حصوں میں

بہت ساری پتھریاں تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اُن پتھریوں کی موجودگی سے اُس خاتون کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات وہ اس طرح سنا رہے تھے جیسے ہماری توجہ خود پر سے ہٹانا چاہتے ہوں یا پھر ہمیں حوصلہ دینا چاہتے ہوں۔

یہ میری خاں صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اُن کے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ کس طرح بڑے لوگ اچانک بھرا میلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو میلے سے تھے ہی نہیں بلکہ میلہ اُن کے دم قدم سے آباد تھا۔ اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد بانو آپا نے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا ان کو محمد خاں ٹرسٹ کو بھجوا دو۔ یہ کتابیں اُن بہت سی کتابوں کا حصہ تھیں' جو خاں صاحب کی موجودگی میں ہی ٹرسٹ کو بھجوائی جا چکی تھیں۔ اُن باقی رہ جانے والی کتابوں کو پہچانتے ہوئے میں نے بانو آپا سے کہا کہ یہ تو وہی کتابیں ہیں جو خاں صاحب نے ذاتی مطالعے کے لیے منتخب کی تھیں۔

آپا جی کہنے لگیں ''بیٹا! جب ان کو پڑھنے والا ہی چلا گیا تو اب ان کو رکھ کر کیا کریں گے۔ تم انہیں بھی بھجوا دو۔'' اور ان کے ساتھ خاں صاحب کی تمام لائبریری جس میں اُردو اور انگریزی کی ہزاروں نادر و نایاب کتب کا ایک قیمتی خزانہ تھا جو مختلف اداروں کو ڈونیٹ کر دیا گیا' یہاں تک کہ ان کتب کی الماریاں بھی دے دی گئیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منتخب لوگ جانے کے بعد بھی کس طرح دوسروں کو فیض یاب کرتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

اُن دنوں.....

(راجہ گدھ.....ایک تاثر)

مسعود میاں

اُن دنوں بہت سارے کرداروں سے میرا رابطہ رہا کرتا تھا۔ نائیلہ' شائیلہ' جمیلہ اور پروین۔ ان سب نے بری طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان سے تعلق کسی گہرے جذباتی سمندر کی بپھری ہوئی موجوں جیسا نہیں تھا بلکہ لق و دق صحرا کی صورت تھا جس کے طوفانی جھکڑوں میں' میں پھنس کر رہ گیا تھا اور مجھے ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُن دنوں میرے پاس ڈیسپا ہوا کرتا تھا۔ جب میں شہر میں نکلتا تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ جاننے والوں کی نظروں سے چھپنا بہت مشکل تھا اس لیے میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ دن اور رات کا زیادہ وقت بند کمرے میں بسر کرتا۔ کبھی کبھار بند کمرے کی وحشت سے اُکتا کر میں اُن کے ساتھ ستلج پارک میں چلا جاتا۔ وہ چھوٹا سا پارک تھا جس کی بہت سی زمین اب بھی گھاس کے بغیر ننگی پڑی ہے اور کسی مردہ چیچ کی طرح گرد اُڑاتی رہتی ہے۔

جب میں پارک کی بے کار صبحوں اور ویران دوپہروں سے گھبرا کر شہر کی سڑکوں پر نکلتا تو جھلسا دینے والے گرم لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے کسی زلف کا سائبان کام نہ آتا۔

نائیلہ شائیلہ میں سے کسی کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید میں کوئی رئیس زادہ ہوں۔ میرے باپ دادا کی بہت بڑی جاگیر ہے جس کا میں وارث ہوں اس لیے مجھے نہ تو ڈگریاں حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی نوکری کی فکر ہے۔

جبکہ میں ایک طرف تو اُن کرداروں کا عادی ہو چکا تھا۔ میرا کوئی دن بھی ان کے بغیر نہ گزرتا اور دوسری طرف میں ان سب سے بہت بور ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک جیسی تھیں۔ صرف نام مختلف تھے ورنہ ان سب کے نقش و نگار، چال ڈھال، اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، ان کا لباس سب ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ یہ سب کی سب سوچتی بھی ایک ہی طرح تھیں۔ ان سے میری بوریت اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ میں نے یہ تک سوچنا شروع کر دیا کہ میں کوئی ایسا سنگین جرم کروں اور مجھے جیل ہو جائے اور جب مجھے وہاں چکی پیسنی پڑے گی تو شاید اس طرح میں اس یکسانیت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

اُن دنوں میں جس لائبریری میں جایا کرتا تھا اُس کا نام تھا ''جاوید لائبریری۔'' یہ اُردو روڈ پر واقع تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی لگتا کہ شاید لائبریری کا نام بھی ''جاوید نامہ'' سے متاثر ہو کر ہی رکھا گیا ہوگا لیکن جب میں نے وہاں موجود کتب کے ذخیرے پر نظر ڈالی تو وہاں علامہ صاحب پر لکھی گئی کتابوں کا کوئی گوشہ نہ تھا۔

اُس زمانے میں کیبل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پی ٹی وی کی نشریات بھی رات گئے ناظرین کا ساتھ چھوڑ جاتیں۔ اس لیے لوگ لائبریری کا رُخ ضرور کیا کرتے تھے۔ اکثر لوگ وہاں آ کر کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتے شاید اس ڈر اور خوف کی وجہ سے کہ کسی کتاب کی کوئی سطر ان کو غور و فکر میں مبتلا نہ کر دے اس لیے وہ زیادہ تر وہاں سے رسالے ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے لے جاتے تھے۔ وہ ان رسائل کو اپنے سرہانے کے ساتھ رکھ لیتے اور جب رات کے وقت سہل پسندوں کو بڑی دیر تک کروٹیں بدلنے پر بھی نیند نہ آتی تب وہ رسالہ اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ پڑھتے وقت انہیں یوں لگتا جیسے کسی نے اُن کو لوری سنانا شروع کر دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سامنے موجود عبارت ان کی نظروں میں دھندلانے لگتی اور وہ رسالہ سائیڈ پر رکھ سو جاتے۔

اُس لائبریری میں خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور اُن کے نام عموماً نائیلہ شائیلہ پروین وغیرہ ٹائپ کے ہوا کرتے۔ اس زمانے میں خواتین بڑی تندہی اور جاں فشانی سے لکھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ہر ماہ کوئی نئی ناول لائبریری میں موجود ہوتا۔ میں یہ سارے ناول پڑھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں روز ہی چکر ضرور لگاتا کہ شاید کوئی نئی کتاب آئی ہو۔

لائبریری سے باہر آنے کے لیے جب میں دروازے کی طرف بڑھتا تو دروازے کے ساتھ والی بک شیلف پر اور کتابوں کے ساتھ ایک کتاب پڑی ہوتی تھی۔ میں دروازے سے باہر نکلتے وقت اُسے روز دیکھتا۔ تھوڑی دیر کو اُس کے قریب رُکتا، اُسے اُٹھاتا، اُس کو کھول کر سرسری طور پر دیکھتا اور پھر بند کر کے اُسے اُسی کی جگہ پر واپس رکھ دیتا۔ اُس پر لکھا تھا ''راجہ گدھ'' اور نیچے لکھنے والی کا نام ''بانو قدسیہ''۔

میں نے آج تک کسی خاتون رائٹر کے ناول کا ایسا نام پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی اور انوکھی بات

تھی اور میں اس انوکھی بات کو جاننے کے لیے ابھی تیار نہیں تھا۔

ایک زمانے میں عصمت چغتائی سے پہلے عورتیں مردوں کے قلمی ناموں سے لکھا کرتی تھیں۔ جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید کچھ کمرشل لکھنے والوں نے خواتین کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

بہت دن تک جب کوئی نئی کتاب نظر نہیں آئی تو ایک روز لائبریری سے نکلتے ہوئے اُس بک شیلف کے پاس رُک کر جس پر ''راجہ گدھ'' پڑا ہوتا تھا' میں نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ کتاب اتنی Interesting ہوئی کہ پڑھنے والے کو مجبور کردے اور پڑھنے والا اسے مکمل پڑھے بغیر رہ نہ سکے' تو میں اسے پڑھوں گا' ورنہ اُسے واپس کردوں گا' بغیر پڑھے.....اور مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا کہ یہ کتاب آپ نے کیوں نہیں پڑھی۔ حتیٰ کہ مصنف بھی نہیں کیونکہ لکھنے والے کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ کون اس کی کتاب کو پڑھتا ہے اور کون نہیں اور یہ اس کتاب کے نام سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف کو پڑھنے والوں کی اتنی فکر ہوتی تو پھر کتاب کا نام بھی.....نائیلہ' شائیلہ یا پھر ''بے وفائی کا زخم'' وغیرہ ہوتا۔

جب میں ''راجہ گدھ'' لے کر لائبریری سے باہر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے آس پاس موجود بے شمار قباحتیں جو مجھے دُھندلی دکھائی دیتی ہیں' اُسے پڑھ کر اور زیادہ واضح نظر آنے لگیں گی اور لاپروائی میں بسر ہونے والے شب و روز میں جو ایک سہل پسندی ہوتی ہے وہ عنقریب ختم ہو جانے والی ہے۔

جب میں نے ''راجہ گدھ'' پڑھنا شروع کیا تو اُن دنوں موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ ہم جس خطے میں رہتے ہیں یہاں موسموں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے اور یہی شدت پسندی جب ہمارے مزاجوں میں بھی در آتی ہے تو شاید وہیں سے دیوانگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جب کتاب کے اندر کا موسم اور اُس سے باہر کا موسم ایک جیسا ہو جائے تو پڑھنے والا لازمی طور پر خود کو کتاب کے اور زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔

رات کے وقت لحاف اوڑھے جب میں ''راجہ گدھ'' پڑھ رہا ہوتا تو گھر کی دوسری منزل کے کمرے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا.....رات' سردی اور لحاف' جب نعیم اور عابدہ کی ملاقاتوں سے میل کھاتے تو مجھے لگتا کہ عابدہ میرے بستر کی پائنتی کی طرف بیٹھی ہے اور اُس نے لحاف کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے مونگ پھلیوں سے بھرا لفافہ رکھ لیتی اور جس رفتار سے وہ باتیں کر رہی ہوتی اُتنی ہی تیزی سے مونگ پھلی کھا رہی ہوتی۔ فرش مونگ پھلی کے چھلکوں سے اور کمرہ اُس کی باتوں سے بھرتا جا رہا ہوتا۔

اُس کی باتوں کا مرکز زیادہ تر اُس کا شوہر ہی ہوتا۔ وہ اُس کی توجہ نہ ملنے اور وقت نہ دینے کا گلہ کرتی رہتی۔ اُس نے اپنے شوہر کو جس خطاب سے نواز رکھا تھا وہ تھا ''ماں کا یار۔'' اُس کی باتیں سن کر میں سوچتا جو مرد اپنی عورتوں کو توجہ دینے میں ناانصافی کرتے ہوں گے وہ ساری عورتیں بھی اپنے مردوں کو شاید اسی قسم کے خطاب سے نوازتی ہوں گی۔

جب میں کتاب سے باہر نکل کر دیکھتا تو عابدہ جا چکی ہوتی اور میں پائنتی کی طرف سرک جانے والے لحاف کو جلدی سے اپنے اُوپر کھینچ لیتا۔

ہمارے آس پاس موجود عابدہ جیسی بے شمار عورتیں ایک حوالے سے تو بہت خوش نصیب ہوتی ہیں کہ اُنہیں اپنے شوہروں کی گلہ گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مرد میسر آ جاتا ہے جبکہ مرد بے چارے اس لحاظ سے بڑے بدقسمت ہوتے ہیں

کہ وہ اپنے گھر کی بیٹھک سے لے کر دفتروں تک اور ہوٹلوں سے لے کر بازاروں تک اپنے ہی جیسے مردوں کے سامنے
اپنی عورتوں کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔

"راجہ گدھ" کے تین مرکزی کردار
سیمی، نعیم اور آفتاب

نعیم وہ عام سا کردار ہے جسے تخلیق کار کے قلم نے زیرو سے ہیرو بنا دیا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے تقریباً
نوجوان میں اگر نعیم کی سو فیصد خصوصیات نہیں تو ننانوے فیصد ضرور پائی جاتی ہیں۔

سیمی: اُردو ادب کے چند شاہکار کرداروں میں سے ایک ہے۔ جب میں نے "راجہ گدھ" میں سیمی کی داستان
پڑھی تو میں حیران رہ گیا اور مجھ پر لاحاصلی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی کیونکہ یہ ایک آئیڈیل
کردار ہے اور ایسے لوگ ہمیں عام طور پر اپنے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتے بلکہ دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اس
کیفیت سے فرار حاصل کرنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں اس ناول پر شک کا اظہار کرتا اور اسے پالتا۔ مثلاً یہ کہ
بانو قدسیہ نے لکھا ہی نہیں۔ اُسے کسی اور نے لکھا ہو گا اور انہوں نے اسے اپنے نام سے چھپوا لیا ہو گا لیکن پھر میں نے دیکھا
کہ اس شک کو پالنے سے بھی مجھے لاحاصلی کی کیفیت سے نجات نہیں ملی اور میں نامعلوم کی سولی پر بدستور لٹکا رہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں ملتان میں بوسن روڈ کے قریب گلگشت کالونی میں رہا کرتا تھا۔ یہ 1992ء کی بات
ہے۔ ایک دفعہ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تو میں نے ہومیوپیتھک سٹور سے دوائی لی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے بھی
کوئی خاص توجہ نہ دی اور سوچا کہ معمولی سا درد ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب رات کے دو بجے کا وقت تھا تو وہ
معمولی سا درد اتنا بڑھ گیا کہ میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس وقت کوئی رکشہ، ٹیکسی نہ ملا اور مجھے سائیکل پر
بٹھا کر ایک قریبی ڈاکٹر کے گھر پر لے جایا گیا، جس کا کلینک گھر کے اندر ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا
کہ یہ پیٹ کا درد نہیں بلکہ گردے کا درد ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُس نے مجھے ڈرپ لگائی اور کچھ انجکشن بھی۔
تب مجھے جا کر کچھ سکون ملا۔

اسی طرح جب "راجہ گدھ" پڑھنے کے بعد مجھ پر لاحاصلی طاری ہو گئی تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ
نامعلوم سی کسک مجھے راتوں کو تڑپانے لگے اُس کا کچھ علاج ہونا چاہئے۔ تب میں اپنے ایک دیرینہ دوست راؤ ساجد کے
پاس گیا۔ اُس جیسے لوگوں سے مل کر لگتا ہے کہ اس سے پہلے کی زندگی ہم نے بے وقوفوں کی سنگت میں بیٹھ کر رائیگاں ہی
گزار دی ہے۔

جب میں نے راؤ ساجد کے سامنے "راجہ گدھ" کے بارے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا
"تمہارے تمام شکوک بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بانو قدسیہ فی الواقعی اُردو ادب کی ایک بہت بڑی رائٹر ہیں اور "راجہ گدھ" ان
کی فنِ تخلیق کی معراج ہے۔"

راؤ ساجد کیونکہ بہت سمجھدار ہے اور میں اُس کی فہم و فراست کا بہت قائل ہوں اس لیے میرے پاس اُس کی
بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر جب میں نے اُس سے کہا ''یار! جب سے میں نے یہ ناول پڑھا ہے تب سے ایک بے نام اُداسی ہر طرف چھائی رہتی ہے۔ سیمی کے ملنے سے پہلے تک جتنے لوگ بھی مجھے ملے وہ سب عورت کی بے وفائی کے ڈسے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے میں عورت کو ایک بے وفا مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ لیکن یار! یہ سیمی تو بالکل ہی مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کو مرد کی محبت میں اس طرح دیوانہ ہوتے دیکھا نہ سنا۔ کیا مجھ پر چھایا حزن و ملال اس وجہ سے تو نہیں ہے؟ کیا یہ کسی آئیڈیل کو تلاش نہ کر سکنے کا لاحاصل احساس تو نہیں؟''

راؤ ساجد کہنے لگا..... ''تمہاری سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ تم نے نائیلہ اور شائیلہ جیسی کہانیاں پڑھتے پڑھتے اچانک ''راجہ گدھ'' جیسی بڑی کتاب کو پڑھ لیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اس طرف آنے سے پہلے ممتاز مفتی جی کی ''علی پور کا ایلی'' پڑھ لیتے۔ پھر تم میں کم از کم اتنا حوصلہ پیدا ہو جاتا کہ تم اتنی بڑی کتاب کو سہار سکتے۔''

میں نے اُس سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''یار! میں سمجھتا ہوں کہ کسی کتاب کو پڑھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اُسے ناقدانہ نظر سے پڑھیں۔ اس طرح دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح اُس کتاب کی خوبیاں اور خامیاں دونوں آپ کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن میں اسے اس طرح نہیں پڑھ سکا۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ ''راجہ گدھ'' کے کردار آپس میں اس طرح ملتے اور بچھڑتے ہیں جیسے یہ سب کچھ اُن کی تقدیر میں لکھا ہوا تھا اور ان مختلف کرداروں کو آپس میں ملانے اور جدا کرنے میں مصنف کی اپنی کوئی خاص کوشش کو دخل نہیں تھا۔

اس ناول کی مخصوص فضا نے مجھے ایک خاص طرح کے تحیر میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے کہ جب میں پوٹھوہار کے علاقے میں موجود ریت کے ٹیلوں کا منظر پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے آس پاس موجود تارکول کی پکی سڑکوں پر بھی ریت ہی ریت اُڑتی نظر آتی ہے اور میرے اردگرد پایا جانے والا سبزہ اور ہریالی ایسی خشک جھاڑیوں میں بدل جاتی ہیں جو برسوں سے بارش کی منتظر ہوں۔''

راؤ ساجد بڑے تحمل سے میری باتیں سن رہا تھا۔ یہ اُس کی بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت اچھا سننے والا تھا۔ ورنہ اکثر کرم فرما تو سنانے والے ہی ملتے ہیں' سننے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا..... ''یار! ''راجہ گدھ'' میں سیمی کے پاس جو رومال ہے نا! جسے چھپانے کے لیے اُسے کوئی جگہ نہیں ملتی' مجھے لگتا ہے وہ رومال میرے گلے کا پھندا بن گیا ہے اور اب میں زمین پر ہوں نہ آسمان پر۔ بس ہر وقت اس کے ساتھ خلا میں لٹکتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں اب اس پھندے سے میری نجات کب ممکن ہو گی۔''

وہ کہنے لگا..... ''پھندے سے نکلنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی پھندے میں بڑی مشکل سے آتا ہے آدمی۔ تمہارا سفر تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ بس پڑھتے رہنا۔ نکلنے کا تو نہیں کہہ سکتا کسی نہ کسی طرح پار ضرور لگ جاؤ گے۔''

''یار! دُعا کرو کہ یہ پھندا میرے لیے ایسا سبق نہ بن جائے کہ جسے یاد کرنے کے بعد چھٹی نہیں ملتی۔''

اسی طرح جب 1995ء میں ممتاز مفتی صاحب سے خط و کتابت شروع ہوئی تو اُنہوں نے بھی کچھ ایسے ہی مشورے سے نوازا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے..... ''پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھتے رہنا' پھر آسانی ہو جائے گی۔''

دراصل ابھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہی کا رومال جسے میں اپنے لیے پھندا سمجھتا ہوں، ایک دن یہی رومال میری
نجات کا باعث بننے والا ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب میں نے اشفاق صاحب کا ایک مضمون پڑھا جو انہوں نے
''سائیں مرنا'' پر لکھا تھا۔ یہ مضمون اُن کی کتاب ''عرضِ مصنف'' میں شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ رومال
میرے گلے میں سے اُتر گیا ہے اور اب اُس نے ایک رسّی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ بظاہر تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں
نے اس رسّی کو پکڑا ہوا ہے لیکن سچی اور اصلی بات یہ ہے کہ اُس رسّی نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ جب میں اس رسّی کا خیال کرتا
ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

بعد میں اسی رسّی کے ذریعے میں ''من چلے کا سودا'' سے گزرتے ہوئے ''زاویہ'' تک پہنچا۔

اُردو ادب میں ''راجہ گدھ'' بالکل مختلف اور منفرد ناول ہے ورنہ انتظار صاحب اور عینی صاحبہ کے ناول تو صرف
ہجرت کے مرثیے تک محدود ہیں۔ ''راجہ گدھ'' کے موضوعاتی طور پر منفرد ہونے کی وجہ سے اُس کی کراچی سے لے کر
تک دُھوم مچی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں 1997ء میں کراچی گیا۔ وہاں تقریباً سب احباب
نے ''راجہ گدھ'' پڑھ رکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ سب اس سے بے حد متاثر تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف صرف
بابوں کی وجہ سے ہوسکتا تھا۔ اگرچہ ان سب لوگوں کو بابوں کی باتیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ضرور کرتی تھیں اور لوگ بابوں کی
دانش بھری باتیں مانتے بھی تھے۔ بس ذرا اُن سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ بابوں کی باتوں سے اتفاق کرنے لگ
جاتے تو شاید اُن کی جدیدیت خطرے میں پڑ جاتی۔ اس جدیدیت کی خاطر وہ مانی جانے والی بات کو بھی رد کردیتے
تھے۔

آج کل تو کراچی بجلی کے بحران میں مبتلا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں یہ پیارا شہر گولیوں
کی زد میں تھا اور بوری بند لاشیں ہر طرف بکھری پڑی ہوتی تھیں۔

اُن دنوں میں شارع فیصل پر واقع ڈرگ روڈ سٹیشن پر اُترتا اور طحہٰ اکیڈمی میری منزل ہوا کرتی جہاں میں
کمپوزنگ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ اکیڈمی کے ہیڈ سے اس لیے جلد دوستی ہوگئی کہ انہوں نے ''راجہ گدھ'' پڑھ رکھا تھا۔ ایک دن
میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ چائے والا لڑکا آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے: ''یار! یہ لڑکا ایک دن چائے
دینے آیا تو کہنے لگا سر! یہ جو آپ کے ریسپشن پر لڑکی بیٹھی ہوئی ہے نا یہ ساری رات مجھے سونے نہیں دیتی۔ سر! میری تو ساری
رات اس کے تصور میں ہی گزر جاتی ہے۔ بھئی اس لڑکے کی بات سے مجھے یاد آیا کہ اکثر نیند تو مجھے بھی ساری رات نہیں
آتی۔''

میں نے پوچھا ''وہ کیوں سر؟''

کہنے لگے ''جب سے ''راجہ گدھ'' پڑھا ہے خاص طور پر اس میں اسلام کا جو تھیسز یعنی حرام حلال کا نظریہ جس
طریقے سے بیان کیا گیا وہ بہت متاثر کن ہے۔ یار اگر میں ''راجہ گدھ'' کے نظریے پر عمل کروں گا تو لوگ مجھے پتھر ماریں
گے اور اگر عمل نہیں کرتا تو میرا ضمیر مجھ پر سنگ باری کرتا رہتا ہے۔''

بہت بعد میں، میں نے پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی کتاب میں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے

طرح یاد کرو کو لوگ تمہیں دیوانہ سمجھیں۔

بس سٹاپ پر اُتر کر اکیڈمی کو جاتے ہوئے راستے میں پہلے ڈرگ سٹیشن کی بہت سی ریلوے لائنوں کو پار کرنا پڑتا تھا۔ ان لائنوں پر مال گاڑی کے بہت سے ڈبے کھڑے رہا کرتے تھے۔ رات کے وقت جب بھی میرا ان لائنوں پر سے گزر ہوتا تو رات کے اندھیرے میں کسی پٹڑی پر کھڑے ڈبے کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ ضرور یاد آتا۔ دراصل وہ قصہ اس علاقے میں کسی روایت کی طرح سینہ بہ سینہ چلتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا۔

ایک روز رات کے پچھلے پہر' جب چور اور نمازی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

پتہ نہیں وہ ریلوے پولیس کا سپاہی تھا' کوئی رات کی ڈیوٹی کا گارڈ تھا یا کوئی عام پولیس والا تھا۔ اُس نے ایک خالی ٹین کا ڈبہ لے کر اُسے رسّی سے باندھا اور مال گاڑی کی ایک بوگی کی طرف چل پڑا۔ اُس کا اندازہ تھا وہ بوگی تیل یا ڈیزل سے بھری ہوئی ہے اور وہ بآسانی اس میں سے ایک کنستر بھر لے گا۔ بوگی کے پچھلے حصے کی طرف موجود تیل کے اخراج کا راستہ باوجود کوشش کے اُس سے کھل نہ سکا ہوگا۔ پھر وہ بوگی کے اُوپر چڑھا ہوگا اور جہاں سے بوگی میں تیل ڈالا جاتا ہے وہاں لگے ہوئے چوڑے ڈھکن کو کھولنے میں وہ کامیاب ہو گیا ہوگا۔

جب اُس نے کنستر بوگی میں ڈالا تو تیل کی سطح اُس کے اندازے سے کافی نیچے تھی۔ لہٰذا کنستر کو تیل تک پہنچانے کے لیے اُسے خود بھی بوگی کے اندر جھکنا پڑا ہوگا۔ نجانے رات کا اندھیرا تھا' نیند کا خمار تھا یا تیل کی پھسلن' بیچارہ سپاہی' رات کی ڈیوٹی کرنے والا گارڈ یا جو کوئی بھی وہ تھا' اپنے کنستر کے ساتھ خود بھی..... بوگی کے اندر پھسل گیا۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔

اس نے کنستر کو پکڑنے کے لیے تو اس کے ساتھ رسّی باندھ رکھی تھی لیکن خود کو کسی رسّی سے باندھنا بھول گیا تھا' جس کے سہارے وہ بوگی سے باہر نکل سکتا۔ کئی دن بعد یا جب بھی کسی نے کھلے ڈھکن کا جائزہ لیا ہوگا تب جا کر اس بے چارے کی لاش باہر نکالی جا سکی ہوگی۔ ہمارے ہاں کروڑوں اور اربوں کے گھپلے ہوتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں پکڑا جاتا اور جب پکڑ ہونے پر آتی ہے تو پھر ایک تیل کے کنستر پر ایسی پکڑ ہو جاتی ہے۔ تیل کے بجائے لاش ہی واپس گھر جاتی ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ کبھی کبھی کسی روز جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو اُس دن ہم اپنے بہت سارے رُکے ہوئے ضروری کام کامیابی سے نپٹا لیتے ہیں اور شام کو گھر واپسی پر ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ آج کا دن تو ہمارا دن تھا۔ بالکل اسی طرح جو پکڑے نہیں جاتے اُن کے لیے وقت کی رسّی دراز ہوتی ہے اور پکڑے جانے والے جس دن گرفت میں آ جاتے ہیں وہ دن اُن کا دن نہیں ہوتا۔

میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ دنیا میرے لیے ایک بہت بڑی ساری بوگی ہے اور میں اپنے لیے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ایک کنستر بھرنے کے لیے اس میں اُترا ہوا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے کنستر کو پکڑنے کے لیے جو رسّی باندھ رکھی ہے، وہ بڑی کمزور اور پھسلنے والی ہے اس لیے باوجود کوشش کے کبھی پورا کنستر بھرتا ہی نہیں ہے۔ کبھی آدھا اور اکثر تو آدھے سے بھی کم پر گزارا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس ڈور نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ بڑی مضبوط ہے۔

میں اس وقت جہاں کھڑا ہوں یہ دنیاوی ضرورتوں سے بھری ایک بوگی ہے اور ان چھوٹی موٹی ضرورتوں نے میرے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا ہے، لیکن جب میں خود سے بندھی اُس مضبوط ڈور کے آخری سرے کی طرف نظر کرتا ہوں تو وہاں مجھے روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ایک دن میں اس ڈور کے سہارے خود کو دنیاوی ضرورتوں سے بھری بوگی کے اندھیروں سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ مضبوط ڈور ''راجہ گدھ'' سے شروع ہو کر مفتی جی کی ''لبیک'' سے ہوتی ہوئی اشفاق احمد صاحب کے ''زاویہ'' تک جاتی ہے اور اب خاں صاحب کے بعد یہ سلسلہ موقوف نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ اب پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں اپنی روشنی سے اس سلسلے کو جاری کر رہی ہیں۔

آخر میں مجھے اُن سب ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ایسی بصیرت افروز کتب تخلیق کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں سنگ میل پبلشرز کے افضال احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اُن لائق تحسین کتب کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا اور سب سے بڑھ کر میں اللہ کا احسان مند ہوں کہ جس نے مجھے اُن کتب کو سمجھنے کا شعور عطا فرمایا۔
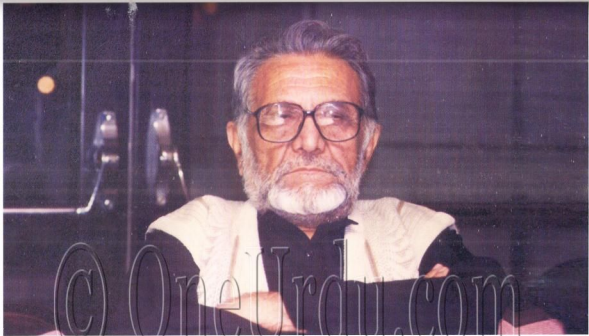
اشفاق احمد (2002ء)
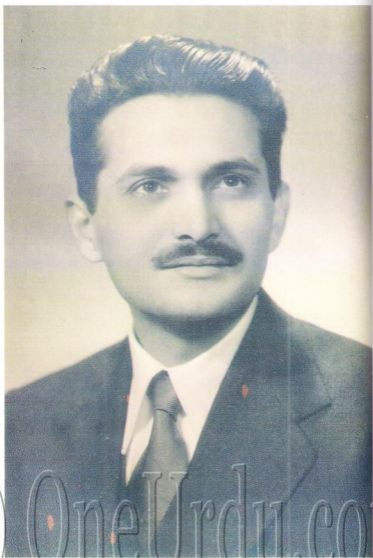
اشفاق احمد (بچپن)

اشفاق احمد
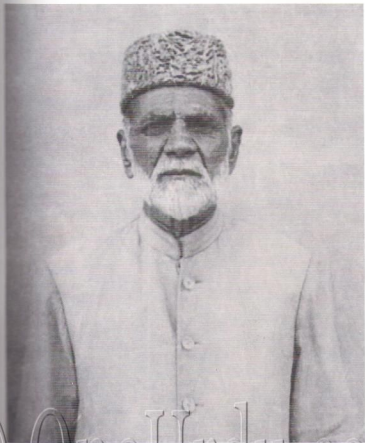
باباجی محمد خاں (ڈنگر ڈاکٹر) ___ والد اشفاق احمد

اماں جی سردار بیگم — والدہ جناب اشفاق احمد

ماسی رشیدہ (اماں جی کی چھوٹی بہن) ممتاز (ماسی رشیدہ کی بہو)
اُنزلا (گود میں) ماسی جی کی پوتی

121 سی خاں صاحب کے دوست ماسی رشیدہ کے بیٹے فہیم احمد خاں، ممتاز (بیگم فہیم ماسی رشیدہ کی بہو)

گورنمنٹ کالج فارویمن ماڈل ٹاؤن ۔ ممتاز نعیم (پرنسپل)، خاں صاحب

جدہ (جنگی کا گھر) عمرہ کا سفر۔ جنگی کی سب سے چھوٹی بیٹی (سمعیہ)، بانو آپا، منجھلی بیٹی (حنا)، جنگی (نعیم احمد خان)،
شہاب صاحب، خاں صاحب، جنگی کی بیگم (شینو)

عمرہ کے دوران جدہ کا مقام نعیم احمد خاں، جنگی کا گھر، جنگی کی بیوی (شینو)، جنگی کی بڑی بیٹی (ڈاکٹر ہما جہانگیر
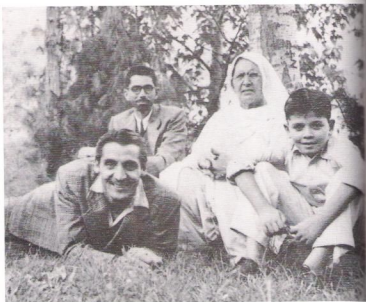
اماں جی، آفتاب (بھائی سب سے بڑے بیٹے) خالد آفتاب، اشتیاق احمد اور خالد آفتاب
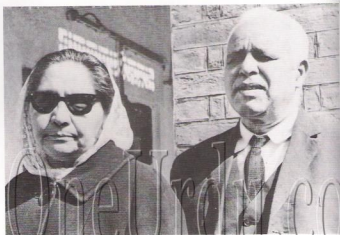
ڈاکٹر ایوب احمد خاں (آپا فرخندہ کے شوہر۔ ڈاکٹر جواد ساجد ہارٹ سرجن کے والد)

آپا فرخندہ (پہلوٹھی کی بیٹی)
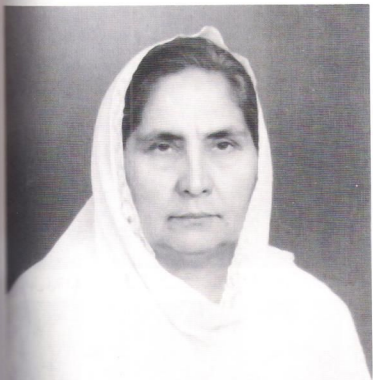
ڈاکٹر ایوب اور آپا فرخندہ کا بیٹا ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن) ــــ 36 جی۔

آپا فرحت

آپا فرحت کی بیٹی سیمی

آپا فرحت کے بیٹے جاوید طارق خاں

آپا فرحت کے بیٹے جاوید طارق کی پہلی بیوی جاوید کی بیوی صدیقہ

جاوید طارق کی پہلی بیگم (صدیقہ)

جاوید طارق کی بڑی بیٹی ثویلہ (خاں صاحب کی بہو، بیٹے انیس کی بیگم)

اقبال بھائی سے چھوٹے بھائی اسحٰق خان

ججو بھائی کی بیگم ذکیہ

کینڈا (اسحٰق بھائی کا گھر) ٹورنٹو۔ بانو آپا، ذکیہ جی، اسحٰق بھائی، خاں صاحب
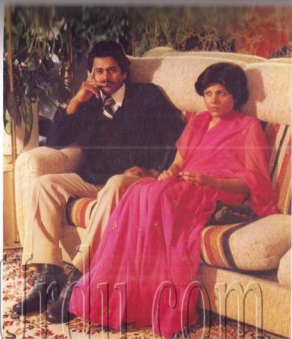
اسحٰق بھائی (بجو کے بچے)، واصف — بیٹی سارا

اسحٰق بھائی کے بیٹے واصف خاں

اسحٰق بھائی کی بیٹی سارا خان

ریزی، معظم، اشتیاق، خاں صاحب، لالو (پیچھے) — 75 جی کینال پارک

اشتیاق، اماں جی

اشتیاق احمد خاں

121 سی، نہانے کے بعد تقو

تقو کے بڑے بیٹے صائیل (سائیکل) احمد خاں

تقو کے بیٹے نبیل احمد خاں
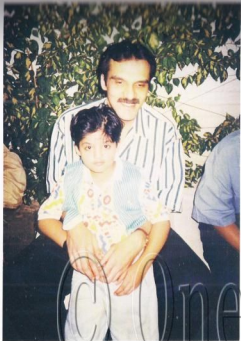
تقو کے سب سے چھوٹے بیٹے واصف احمد خاں

نانا، ریزی، کاکی (2 ٹمپل روڈ)

اشفاق احمد، تو مرجی (روم) — 56 این سمن آباد

بانو کے بھائی ریزی ماموں

جمیلہ ظفر (ٹوٹو، بانو) — لیڈی میکلگین کالج
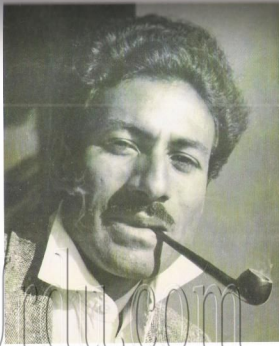
بانو قدسیہ، معظم، ریزی، خاں صاحب — 75.جی کینال پارک

اشفاق احمد، مفتی جی — 75.جی ماڈل ٹاؤن
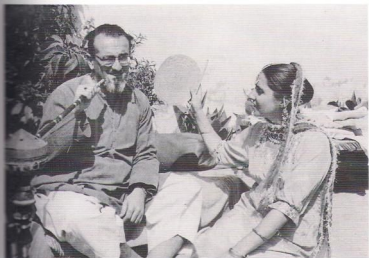
السا باؤ سانی — 75 جی ماڈل ٹاؤن

غلام محی الدین اثر، السا اندرو باؤ سانی — 75 جی ماڈل ٹاؤن
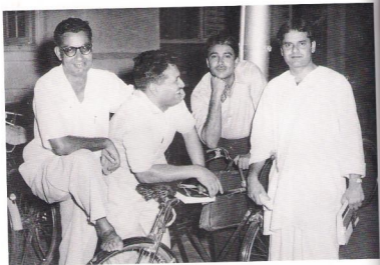
اے حمید' انشا جی' منیر نیازی' اشفاق احمد —— 56 این سمن آباد

اے حمید' خاں صاحب —— 56 این سمن آباد

آپا فرحت کی بیٹی، بیٹی ندیم ـــ اثیر احمد کی ساس

آپا فرحت کی دوسری بیٹی بیا اور انیق خان

افتخار احمد خاں (کھکھو ڈیڈی)
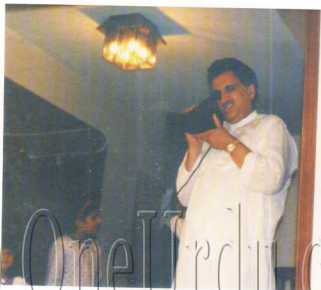
افتخار بھائی کے بیٹے ننگا گو ڈاکٹر طارق بن افتخار (خاں صاحب کی تصویر اور آپا جی کی مشہور تصویر کھینچتے ہوئے)

ڈیڈی جی کی بہو وردا، پوتا ارسلان، پوتا ملحان، پوتی سویرا

ڈیڈی جی کے بڑے بیٹے (ڈاکٹر طارق بن افتخار ککو) سویرا، بانو چچی، اشفاق چچا، وردا (اقبال بھائی کی بیٹی)

افتخار بھائی کے بیٹے جنید بن افتخار

افتخار بھائی کی بیٹی عائشہ

افتخار بھائی کے بیٹے عدنان

(طارق ــــ گگو کے گھر) Cruz کا پرلطف منظر ــــ بانو آپا، اشفاق احمد

میڈسن (امریکہ) نو کی بیٹے کے گھر مہمان
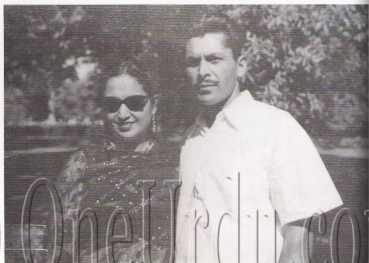
اقبال بھائی (بیگم) باجی ضیاء

خاں صاحب کے بڑے بھائی آفتاب بھائی (ابّی جی)، اقبال بھائی، اسحٰق بھائی
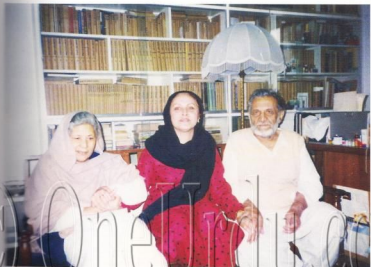
اقبال بھائی کی بیٹی صولت

اقبال بھائی کے بیٹے رومیو بیگم عرفات

اقبال بھائی کے بیٹے فاروق

مِنّو، رخشندہ (ماما اکرام کی بیٹی)

اقبال بھائی کے بیٹے رومیو، عرفات — اشیر بیٹے

اسحٰق احمد خان

امر بیل رونمائی — صدارت فیض صاحب — 75جی ماڈل ٹاؤن

اُردو سائنس بورڈ
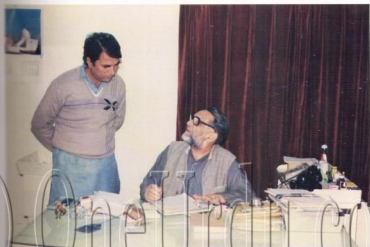
اُردو بورڈ خان صاحب' اسلم کولسری

کوئٹہ ـــــ ثاقبہ رحیم الدین، اشفاق احمد

داستاں سرائے، 121 سی
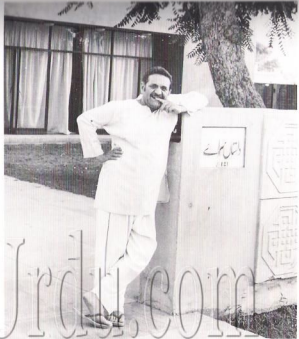
بانو آپا، 121 سی

انشاجی' شہاب صاحب' اشفاق صاحب—121 سی

(کھڑے) مورلاک، خاں صاحب (بیٹھے) بانو آپا، خواجہ جی—121سی-ماڈل ٹاؤن

121 سی (باہر کی لان) انشاجی، شہاب صاحب، بانو، خاں صاحب

پرانا ائیر پورٹ بانو آپا، خاں صاحب

121 سی-بلال احمد خان، دادی (دادا کا کمرہ)
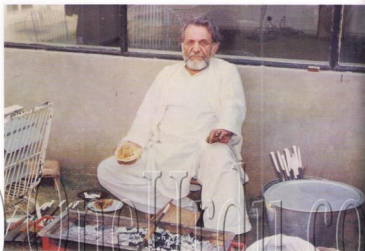
121 سی، خاں صاحب کباب پارٹی
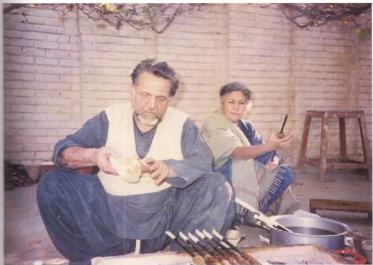
121 سی، کباب پارٹی، خاں صاحب، بانو آپا
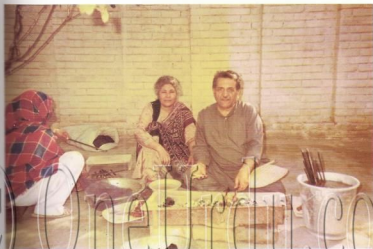
121 سی، اشفاق احمد صاحب (کبابیہ) بانو آپا (مددگار) جیونی بھین (مددگار)

دلیپ کمار، خاں صاحب

اشفاق احمد، وردہ خان، عابدہ پروین اور بانو قدسیہ — 121 سی-ماڈل ٹاؤن

بانو، جمیلہ ہاشمی —121 سی-ماڈل ٹاؤن

ناہید کی بیٹی

121 سی۔ خان صاحب، انیق کی بیٹی ارسلا
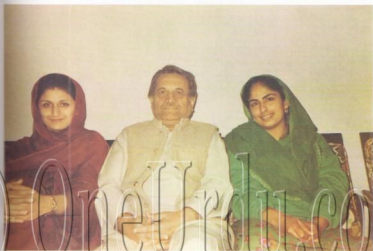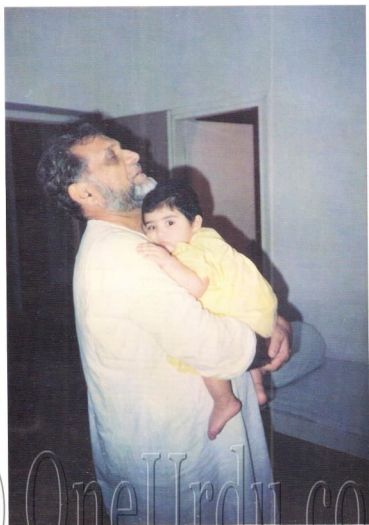
2002ء ارسلاء، انیق احمد
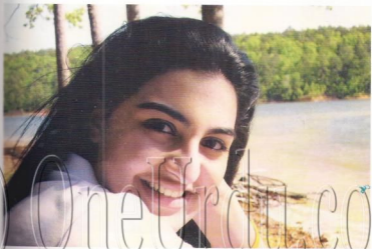
میڈسن۔ انیق کی بیٹی ارسلاء انیق

اشفاق احمد

بابا صاحبا، زاویہ 1، زاویہ 2، زاویہ 3، گڈریا، ایک محبت سو افسانے، وداع جنگ، ایک ہی بولی، صبحانے فسانے، توتا کہانی، بند گلی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمان سرائے، من چلے کا سودا، سفر در سفر، اُچے بُرج لاہور دے، ٹاہلی تھلے، حسرت تعمیر، جنگ بجنگ، سفرینا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدہ، شاہلا کوٹ، کھیل تماشا، گلدان، کھٹیا وٹیا، دھینگا مشتی، شوراشوری، ڈھنڈورا، عرضِ مصنف، شہر آرزو

بانو قدسیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آسے پاسے، دوسرا قدم، آدھی بات، دست بستہ، حوا کے نام، سورج مکھی، پیا نام کا دیا، آتش زیر پا، امر بیل، بازگشت، مردابریشم، سامانِ وجود، ایک دن، پُروا، موم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تماثیل، فُٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابل ذکر، کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ، پھر اچانک یوں ہوا، چھوٹا شہر بڑے لوگ، راہِ رواں، ہجرتوں کے درمیان

Rs. 1200.00

www.sang-e-meel.com
ISBN-10: 969-35-2315-6
ISBN-13: 978-969-35-2315-7

www.sang-e-meel.net